اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

ہمایوں بابت ماہ مارچ ۱۹۳۸ء

تصاویر:۔ ٹیکسلا کے تین منظر

چندہ سالانہ صہ۔ ششماہی سے (مع محصول)　　قیمت فی پرچہ ۸ر

خیالات

برسوں میں خیالات لکھتا رہا!

پھر میں نے خیال کیا کہ خیالوں کو خیرباد کہوں کہ شاید اسی طرح عملوں کی طرف رجوع ہو!

اب بہ مدت کے بعد آج میں نے اپنے خیال کے گھوڑے کو تازیانہ لگایا ہے — نہیں معلوم یہ محض خیال ہے یا کوئی عمل؛

خدا سے!

"تُو نے کیوں مجھے اس ملک میں پیدا کیا؛ اے میرے خدا! جہاں گائے اور باجے اور تعزیے پر لڑائی ہوتی ہے۔

جہاں مرد عورت پر ظلم کرتا ہے —— جہاں بچے بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں —— جہاں مزدور بھوکوں مرتے ہیں

—— جہاں توہمات کا نام مذہب ہے؟

خُدا کا جواب

"اچھا! اور تُو نے مجھے اس ملک میں کیوں پیدا کیا؛

مجھے تو اس سے وہ ملک اچھے جہاں وہ مجھے مانتے نہیں لیکن جانتے ہیں!

دلیری —— خوبصورتی —— مصروفیت ——

میں پیرس میں کسی خوش منظر چوراہے پر کھڑا ہوتا ہوں کہ لاہور کی کسی تنگ گلی میں ایک اوباش کسی بیوہ پر آوازہ کستا ہے وہ

ڈر کر مجھے پکارتی ہے، میں وہاں سے بھاگا آتا ہوں۔

اُف! تُو نے کیوں مجھے اس ملک میں ؛ ؛ ؛؟

دُنیا وہی ہے لیکن میں وہ نہیں!

دُنیا ابھی تک حسین ہے لیکن میں اب عشق سے خالی ہوں!

نہیں دُنیا وہی نہیں کچھ اور ہے اور حسن و عشق کے سوا اس میں اور بھی بہت کچھ ہے۔

پھر تُو وہ نہ سہی اور عشق سے بھی خالی ہو لیکن دل و رُوح میں پھر اپنا آپ ڈال دے اور کچھ اور بن جا جو تُو پہلے کبھی نہ تھا!

بشیر احمد

جہاں نما

پُرانی روایات سے نئی دنیا کی تخلیق

"دَوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو!"

مغرب کی بہ نسبت ہندوستان میں نئی تہذیب کی خودکشی کی تیز رفتار کو روکنے کا زیادہ امکان ہے۔ ہندوستان میں ابھی تک غیرمادی قدر
ے احترام کا گہرا جذبہ موجود ہے۔ ایف۔ جی پیرس نے اپنے ایک مضمون میں جو "بیسویں صدی" میں شائع ہُوا ہے "یوگ" کی اہمیت
بحث کی ہے۔ "یوگ" سے اُس کی مراد وہ اصول یا طریقہ ہے جس سے انسان اپنے من کی دُنیا پر اختیار حاصل کر سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے!۔

"اگر ہم اس بھید کو پالیں کہ "اصلِ حیات" واحد اور غیر منقسم ہے اور "انانیت" ہمارے اپنے محدود ذہن کی تخلیق ہے تو کیا اس کے
بعد ہم زندگی کے اُس نظام کو جائز قرار دے سکتے ہیں اور برداشت کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے بنی نوعِ انسان کا تین چوتھائی حصہ باقی ایک
چوتھائی کے بوجھ کے نیچے کراہ رہا ہے؛ کیا اس کے بعد ہم کسی قسم کی غلامی اور ظلم کو گوارا کر سکتے ہیں؛ یہ ٹھیک ہے کہ ظلم کرنے والوں اور غلام
بنانے والوں سے نجات حاصل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں لیکن ہم انہیں ان انسانیت سوز کاموں سے روکنے کی کوشش کر سکتے ہیں
کیا یہ کام آرام کرسی پر بیٹھے بٹھائے ہو سکتا ہے؛

ہمیں اس بات کا احساس نہیں کہ دُنیا کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنا، سیاسی اور معاشی انقلابات پیدا کرنا یا تعلیم دینا
سب کا فرض ہے۔ وہ لوگ بھی جن کا کام صرف دیکھ بھال ہے ایک قسم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ناممکن نہیں
بیٹھ کر سوچنے والے بھی اپنا فرض پُورا کر رہے ہیں۔ ایک آرٹ جسے مغرب نے فراموش کر کے بہت نقصان اُٹھایا ہے اور جس کی
حیثیت مغرب کی پیروی کی وجہ سے مشرق میں بھی خطرے میں ہے سوچ بچار کی عادت ہے اور اگر یہ عادت مقصود بالذات نہ ہو
بلکہ کسی اور مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہو اور وہ مقصد "انا" کے دھوکے سے نجات حاصل کرنا ہو تو یہ بیک وقت ایک اعلےٰ درجے
کا آرٹ اور سائنس بن جاتی ہے"۔

"وہ شاعر جس نے لکھا تھا کہ مشرق لشکروں اور فوجوں کی گرج کے درمیان اپنے خیالات کی دُنیا میں گُم تھا اگر اس وقت زندہ ہوتا
مسٹر ہوڈ کی کتاب پڑھتا تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ انہی لشکروں کی گرج اور ان کے سائنٹیفک تباہی لانے والے ہتھیاروں کے
بارے سے جدید سائنس کا ایک مغربی مصنف کس طرح تہذیبِ مغرب کے انجام کی پیش گوئی کرتا ہے۔ اور اگر وہ سُنتا کہ اس مصنف اور

اس کے اکثر معاصرین کو یقین ہے کہ تہذیب کو بچانے کا واحد ذریعہ اُنہی باتوں کی تلاش ہے جن کی جستجو میں مشرق ایسے نازک وقت میں اپنے خیالات کی دُنیا میں گم تھا جب مغرب فاتحانہ انداز میں آگے بڑھ رہا تھا تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہتی۔"

مضمون کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔

"ہندوستان کو ان باتوں کی تلاش میں خاص سہولتیں حاصل ہیں۔ اُس اُصول کی روایات جس نے ہندوستانی تہذیب کو اپنی ہمعصر سامری اور مصری تہذیبوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی عرصہ دراز تک زندہ رکھا آج بھی اس ملک میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ اسی قسم کے کم از کم تین اہم اصولوں کی روایات یہاں موجود ہیں اور وہ یہ ہیں:۔ (۱) بدھ مت کا نفسیاتی نظام، (۲) یوگ (۳) تصوف، چونکہ ان کا تعلق عام طور پر مذہب اور مذہبی نظاموں سے ہے اس لئے زیادہ تر یہ اُن لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں جو مادی حقائق کی دُنیا سے پناہ ڈھونڈھتے ہیں۔ جو لوگ ان مادی حقائق کا مقابلہ کر کے دُنیا میں انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ انہیں اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے یہ اُصول دُوسرے قسم کے لوگوں کے لئے مفید ترین ہے کیونکہ اگر صحیح طور پر غور کیا جائے تو اس کا اثر اُن باتوں کے بالکل منافی ہے جو انسان کو موجودہ طرزِ زندگی کے عملی مسائل سے رُوگردان کر رہی ہیں۔ یہ اُس قدامت پسند مذہبی نظام کا بالکل اُلٹ ہے جسے مارکس ایک نشہ آور چیز سے مشابہ کرتا ہے۔ یہ رُوح، دل اور جسم کو از سر نو زندگی اور صحت دیتا ہے۔ بنی نوع انسان میں اپنے مستقبل کے متعلق خود اعتمادی کے جذبات پیدا کرتا ہے اور اخوت اور آزادی کا پیغام لاتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ "قوتِ حیات" جس وقت چاہے اور جس طرح چاہے اپنی قدرت کے مکمل اظہار کے لئے اپنے آپ کو نئی سے نئی شکلوں میں اور بڑے سے بڑے پیمانوں پر ظاہر کر سکتی ہے۔ یہ حقیقت کہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے اس بات کی کافی دلیل ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا اور ناکامیوں اور خامیوں کے باوجود زندگی کی یہ رَو نَو بنَو قوت کے ساتھ جاری رہے گی۔"

جل ترنگ

جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
گومتی پر کشتیوں میں ہیں بتانِ شوخ و شنگ
بے دریغ و بے درنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
ساحلوں پر پھول سے برسا رہی ہے چاندنی
نقرئی لہروں میں غوطے کھا رہی ہے چاندنی
آج ہے ہر شے پہ رنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
ساز و نغمہ ، ساغر و مے ، کیف و رُومان و بہار
الحذر جوشِ جوانی ، الاماں آغوشِ یار

دل ہُوا جاتا ہے تنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
جا رہی ہیں کشتیاں پانی پہ لہراتی ہوئی
ڈگمگاتی، جھومتی، مڑتی ہوئی گاتی ہوئی
دل میں ہے تازہ اُمنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
بچھ رہا ہے نیلگوں موجوں میں یوں تاروں کا جال
بہ رہے ہیں کہکشاں پر ہم یہ ہوتا ہے خیال
ہو رہی ہے عقل دنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ
شام کی رنگینیوں میں بج رہا ہے جل ترنگ
جل ترنگ
بج رہا ہے جل ترنگ

جلال ملیح آبادی

اس مضمون کا ابتدائی حصّہ "یومِ اقبال" کی تقریب پر ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو کے لاہور سٹیشن سے براڈکاسٹ کیا گیا۔ ب ل

یہ لاہور ہے، لاہور جہاں اُردو کا شہرہ آفاق شاعر اقبال رہتا ہے۔ جہاں میں بول رہا ہوں وہاں سے بمشکل ایک میل کے فاصلے پر وہ شخص اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے جس پر آج ایک دُنیا کی نظریں جمی ہیں۔ وہ پلنگ پر لیٹا یا بیٹھا ہوا ہے وہ عام طور پر اپنے گھر کے اندر ہی رہتا ہے صحت کی کمزوری نے اُسے اِس خانہ نشینی پر مجبور کر دیا ہے لیکن یہ نہ سمجھئے کہ وہاں وہ تنہا ہے۔ لوگ جب موقع پاتے ہیں وقتاً فوقتاً اُس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اُسے ان کی ملاقات سے عار نہیں کیونکہ وہ حقیقت میں ایک بڑا انسان ہے جو عموماً اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے ہم جنس سے بھی ملنے سے انکار نہیں کرتا، وہ ایک آزاد خیال شخص ہے جس پر حکومت کے زور یا دولت کی شیخی کا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا اُس کے لئے بڑے چھوٹے سب برابر ہیں کیونکہ وہ ایک بڑا اور سچا انسان ہے!

اقبال کی صحت اور جسم کمزور ہو لیکن اُس کے دل و دماغ ابھی خوب مضبوط ہیں اور جب وہ باتیں کر رہا ہو، زندگی کے مسائل پر اپنا نقطۂ نظر بیان کر رہا ہو، موجودہ حالات پر تبصرہ کر رہا ہو یا مغربی حکمت یا سیاست کی بعض تازہ ترین کتابوں پر تنقید کر رہا ہو تو اُس کی وسیع نظری اور جوش اور انہماک اور معلومات کو دیکھ کر اس بات کا گمان بھی نہیں گزرتا کہ اُس پُرزور شخصیت کی جسمانی صحت کسی طرح کمزور ہے۔

اس عظیم الشان انسان کی صحبت، یا اُس سے ملاقات ایک ایسی نعمت جس سے صرف بڑے اور سمجھدار آدمی ہی نہیں بلکہ معمولی آدمی بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور اُٹھاتے ہیں۔ کئی دفعہ شہر کے بعض آدمی حاضر ہوتے ہیں اور صرف یہ سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے قومی شاعر کی چند منٹ کے لئے مٹھی چاپی کریں۔ خوش قسمتی سے قومی شاعر باوجودیکہ وہ ایک بنگلے میں رہتا ہے سرمایہ داروں یا امیروں کا سا مزاج نہیں رکھتا کہ صرف صاحب حیثیت آدمیوں سے ملنا گوارا کرے۔ اس لحاظ سے موجودہ زمانے کا یہ شاعر موجودہ اور گزرے ہوئے وقتوں کے علم و اخلاق کا آئینہ ہے۔

اقبال کی عمر اس وقت ۶۱ سال ہے۔ وہ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ وہاں ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے اُنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے پاس کیا اور وہیں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کئے گئے۔ اسی زمانے میں ان کی شاعری بھی چمکنے لگی۔ اسی زمانے کا وہ مشہور شعر ہے جسے سُن کر مرزا ارشد نے اس نوجوان کے حقیقی شاعر ہونے کا اعلان کیا تھا ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اُردو کے نقطۂ نظر سے اقبال کی شاعری کو پانچ حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا جسے مخزن کا دَور کہا جا سکتا ہے ۱۹۰۱ء

سے ۱۹۰۵ء تک تھا۔ اس زمانے میں اُنھوں نے اِدھر شیخ عبدالقادر صاحب کے مشہور رسالے مخزن میں لکھنا شروع کیا اور اُدھر انجمن حمایت اسلام لاہور میں اپنی دردناک نظمیں سنانی شروع کیں۔ حب الوطنی کی نظمیں بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ دوسرا انگلستان کا دَور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک تھا جب وہ یورپ میں تعلیم کی غرض سے مقیم رہے۔ اس دَور میں مغربی تہذیب سے اُن کی مٹھ بھیڑ ہوئی جس سے اُن کے کلام پر خاصا اثر ہُوا اور وہ مغربی تمدّن کے ایک زبردست نقاد بن گئے۔ تیسرا دَور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۳ء تک تھا جب وہ اپنی قومی و ملّی نظموں سے قوم کے ایک سرگرم رہنما بن گئے۔ شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور شاعر، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام یہ سب اسی عہد کی نظمیں ہیں۔ لیکن اسی دَور میں اقبال فارسی کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں اُنھوں نے "اسرارِ خودی" شائع کی۔ اس کے بعد پے در پے "رموزِ بیخودی" اور "پیامِ مشرق" شائع ہوئیں۔ چوتھا دَور ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۵ء تک تھا جب ایک طویل عرصے کے لئے اُنھوں نے اُردو سے مُنہ پھیر لیا۔ "زبورِ عجم"، "جاویدنامہ"، "مسافر" اور اسلام پر انگریزی میں چھ لیکچر اس زمانہ میں لکھے گئے۔ ۱۹۳۵ء سے پھر اُردو کی باری آئی اور پہلے "بالِ جبریل" اور پھر "ضربِ کلیم" شائع ہوئی۔

اقبال محض ایک شاعر نہیں وہ ایک زبردست قومی رہنما ہے، وہ ایک مخلص قومی پیغامبر ہے وہ ایک فلسفی شاعر ہے وہ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے لئے اور ساری نوعِ انسان کے لئے ایک پیغام لے کر آیا ہے۔ ایک دفعہ نہیں کئی بار میں نے ۱۹۳۵ء سے پہلے اُن سے شکایت کے طور پر عرض کی کہ آپ نے اُردو کو چھوڑ دیا ہے اور اُردو کا آپ پر خاص حق تھا اور ہے۔ فارسی والے فارسی میں لکھیں، اُردو کو اُردو والوں کی ضرورت ہے اور بہت سخت ضرورت۔ وہ یہ سُن کر مُسکرا دیتے تھے۔ بہت اصرار پر اُنھوں نے کہا تو یہ کہا کہ اوّل تو میری اُردو بھی فارسی نما ہوتی ہے، دوسرے شاعر مصلحتوں کو مدِّ نظر نہیں رکھتا، اُسے تو ایک پیغام دینا ہے جس زبان میں بھی موزوں ہو جائے اور جہاں تک بھی پہنچ سکے!

اقبال کا فلسفہ جدوجہد کا فلسفہ ہے۔ زندگی انفرادی چیز ہے، خدا سب سے عظیم الشان فرد ہے، کائنات ایک عجیب و غریب کارنامہ ہے، وہ مکمل نہیں، اُس کا کام برابر جاری رہتا ہے اور ہر فرد اس میں اپنے انوکھے پن کے ساتھ حصّہ لیتا ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو فروغ دے، اُسے چمکائے اُسے بڑھائے اور اُسے جماعت اور نوعِ انسان کی خدمت میں صرف کرے۔ زندگی تحریک ہے اپنے میں سب کچھ جذب کرنے والی اور عشق اس تحریک کا سب سے زبردست جذبہ ہے۔ زندگی ہمیشہ آگے کو بڑھتی ہے: ؎

چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

زندگی آزادی کے لئے ایک مسلسل کوشش ہے اور صحیح زندگی صرف وہی ہے جو بے جھجک ہو کر خطروں میں سے ہو گزرے اور اَور زیادہ تندہ و تابندہ ہو جائے: ؎

نگر خواہی حیات اندر خطر زی

اقبال کے کلام پر ایک سرسری سی نظر ڈالو تو جا بجا مناظرِ قدرت، حبِ وطن، رموزِ فطرت، موجودہ تمدن اور قومی عروج و زوال کی جاگتی جیتی تصویریں نظر آئیں گی حسن و خوبی کے نظارے، جد و جہد کے نعرے، عشق و ایماں کے شعلے جا بجا جلوے ہیں!

سب سے پہلے مجموعے بانگِ درا کا آغاز یوں ہوتا ہے: ؎

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں ۔۔۔ چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں ۔۔۔ تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

گویا اپنے ملک کی محبت کو معرفت کا درجہ دے دیا ہے!

"پرندے کی فریاد" بچوں کے لئے ہے، ہم میں سے اکثر نے اسے سکول میں پڑھا ہے: ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

لیکن جیسی بچوں کے لئے ہے ویسی ہی بڑوں کے لئے بھی ہے، صرف اُن کے لئے اس کے معنی کچھ ہیں اور ان کے لئے کچھ اور یہی ایک بڑے شاعر کی خوبی ہے کہ ایسی بات کہے جو سب کے لئے موزوں اور سب کی دل پسند ہو۔ ایسی ہی نظم "ایک آرزو" ہے: ؎

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب! ۔۔۔ کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری ۔۔۔ دامن میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں ۔۔۔ چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ ۔۔۔ پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

یہ اور اور اشعار جو یہاں درج کئے جاتے ہیں اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ اُن کا دُہرانا لاحاصل معلوم ہوگا لیکن یہی ہمارے شاعر کی عظمت ہے کہ باوجودیکہ وہ ایک فلسفی شاعر ہے۔ اُس کے ہزاروں شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ چکے ہیں اور بعضوں کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں۔

وطن کے درد سے شاعر کا دل معمور ہے: ؎

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

اور وہ بے اختیار کہتا ہے: ؎

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو ۔۔۔ کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو ۔۔۔ تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

قوم و وطن کی بیماری کے لئے شاعر کے پاس علاج بھی ہے:۔

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے — کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

ترانۂ ہندی کو کون نہیں جانتا؟ اسے کون نہیں سمجھتا، اسے کون نہیں گنگناتا اور گاتا؟:۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

بلاشبہ یہی اس وقت ہندوستان کا قومی ترانہ ہے!

عشق و معرفت اور عقل و دل پر کیسے کیسے موتی بکھیرے ہیں:۔

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں — وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا — یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے — نظارے کی ہوس ہے تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے — او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبال مسلسل کوشش اور مسلسل زندگی اور مسلسل تغیّر کا قائل ہے:۔

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں — ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

میرے والد محترم جسٹس شاہ دین ہمایوں (مرحوم) سے جن سے اقبال کو خاص تعلق تھا خطاب کرتے ہوئے اُن کی وفات کے بعد لکھتے ہیں:۔ اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی — تیری چنگاری چراغ انجمن افروز تھی

اس نظم کا آخری شعر ہے کہ۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی — ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

مغرب کی تہذیب پر کیا کھری کھری باتیں کہی ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہی زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس کے مقابل میں شاعر کا نصب العین [illegible] نہیں بلکہ۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے　　میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

وطنیت اور مغرب پرستی کی غلامانہ روش سے بیزار ہو کر اقبال ایک زیادہ ہمہ گیر معاشرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس میں صحیح آزادی اور مساوات اور محبت اور عدل و ہمدردی کے عناصر ہوں اور یہ محض ایسے افراد کے ایثار اور کوششوں سے وجود میں آسکتی ہے جو اپنی خودی سے بخوبی آگاہ ہوں: ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تقدیریں نہ تدبیریں　　جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم　　جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

اشتراکیت کی جھلکیاں بھی نظر آنے لگتی ہیں: "ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو" اور "قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے"۔

بالِ جبریل میں شاعر مصر و حجاز اور پارس و شام یعنی ہر قسم کی قیدِ مقام سے بہت بلند پرواز کرنے لگتا ہے۔ اس زمین کے رہنے والے کی آواز سے آسمان بھی گونج اُٹھتے ہیں: ؎

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں　　غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

اسلامی نصب العین سامنے ہے ؎

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الّا اللہ　　خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الّا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند　　بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الّا اللہ

لیکن اس میں بھی آزادگی کا رنگ صاف جھلکتا ہے ؎

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے　　صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الّا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری　　نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الّا اللہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں　　مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الّا اللہ

اسلامی نصب العین ضرور سامنے ہے لیکن اقبال کے لئے مسلمان وہ نہیں جیسا کہ آج کل کا مسلمان ہے بلکہ وہ جیسا کہ مسلمان کو ہونا کیا اس تعریف کے تحت میں بعض غیر مسلم بھی شامل نہ ہونا چاہیں گے: ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے　　یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب　　یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں

کہا جاتا ہے کہ ضربِ کلیم میں شاعری نہیں محض وہی فلسفہ سا ہے دُہرایا [illegible] کے ساتوں شعراسی دیوان سے میں [illegible]

زیادہ زندگی بخش شعر اور کون سے ہوں گے ؟

غرض اسلامی نصب العین ضرور سامنے ہے لیکن یہ امر غور کرنے کے قابل ہے کہ اس نصب العین کی تلاش میں اقبال اس قدر بلند ہو گیا ہے کہ وہ مسلم وغیر مسلم سب کے لئے زندگی کا ایک فلسفی رہنما بن چکا ہے۔ مثال کے طور پر بالِ جبریل اور ضربِ کلیم سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

خدا سے گلہ ہوتا ہے :۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؛
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؛

فلک کی گردش اور زمانے کا انداز اب نرالا ہے اور ہونا چاہئے : ؂

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی
پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ جہاں وہ چاہیئے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز
حدیثِ بے خبراں ہے "تو با زمانہ بساز" زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز۔

یعنی زمانہ اگر راست نہیں تو اُسے راست بنانا انسان کا کام ہے۔ انسان کی حیرت انگیز قوت و ہمت کا جا بجا نعرہ بلند کیا ہے ؂

چیتے کا جگر چاہئے شاہیں کا تجسس

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ آزادی و یک رنگی اے ہمتِ مردانہ
دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے پھر اس میں عجب کیا کہ تُو بے باک نہیں ہے
کب تک ہے محکومیٔ انجم میں مری خاک یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے
خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

سب سے بڑھ کر یہ کہ ؂

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کیا یہ آج کل کے ایک عام مسلمان کی سی محدود و کمزور مسلمانی ہے؛ نہیں یہ وہ زندگی پیدا کرنے والا رگوں میں خون دوڑانے والا ہمہ گیر بلند نظر مذہب ہے جس کے آگے شاید انتہا پسند اشتراکی بھی فخر کے ساتھ اپنا سر جھکا دیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقبال کو محض ایک فرقے کا شاعر کہنا پرلے درجے کی غلطی ہے وہ نوعِ انسان کا پیامبر اور نوعِ انسان کا بے بدل شاعر ہے۔

پنجاب کے دہقان سے یوں خطاب کرتا ہے کہ ؎

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز؛ ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز!
اسی خاک میں دب گئی تیری آگ سحر کی اذاں ہو گئی اب تو جاگ!

یعنی خدا کے حضور جاتا ہے اور شکایت کرتا ہے تو فرشتے بھی نئے انداز میں گیت گاتے ہیں اور اس شکایت کی حمایت کرتے ہیں۔ اُدھر
خدا کہ اسی حسنِ طلب کا منتظر تھا فرشتوں کے نام اب اپنا انقلابی فرمان جاری کرتا ہے کہ ؎

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

یہ سب اس لئے کہ اقبال جمود و سکون و سکوت کا قائل نہیں مُسلسل تغیّر کا علمبردار ہے: ؎

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اِک حرفِ محرمانہ!

ضربِ کلیم کا سرنامہ ہے ؎

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

یعنی اب ہر انسان کو کلیم بننا اور کلیم بن کر دکھا دینا ہے: ؎

دلِ مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ

یہ مُردنی کیوں چھائی ہوئی ہے اس لئے کہ ؎

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس

اس زنداں سے نکلنا ہے لیکن اپنے آپ کو معطّل نہیں جانا کہ خود آگاہی ہی انسانیت کی ضامن ہے۔ اپنے چہیتے بیٹے جاوید سے
خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

شاخِ گل پہ چہک ولیکن کر اپنی خودی میں آشیانہ

رسمی مسلمانی درکار نہیں: — "دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!"

اقبال کے نزدیک صرف جرأت اور طلب اور ہمت ہی صحیح زندگی کی رہنما ہے: ؎

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے ۔۔۔ اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

ہے آبِ حیات اسی جہاں میں ۔۔۔ شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے ۔۔۔ جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

اقبال کا فلسفہ ہے کہ انسان اپنے سیاہ و سفید کا مالک ہے، وہ فنا کو بقا میں تبدیل کرسکتا ہے، وہ زمانے کی رَو کو جدھر چاہے موڑ سکتا ہے اور اس سے زیادہ کسی انسان نے کیا کہا ہوگا کہ ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے ۔۔۔ یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ!

ارادہ نہ تھا کہ اقبال کے فارسی کلام پر کچھ لکھا جائے۔ راقم نے مدتوں کوشش بھی کی کہ اُس سے رُوگردانی کی جائے لیکن سر ذوالفقار علی خاں کے مختصر انگریزی تبصرے "مشرق سے ایک آواز" کے سرورق پر مرقومہ بالا شعر پڑھ کر نہ رہا گیا اور "اسرارِ خودی" کو پہلے فارسی اور پھر انگریزی میں بھی پڑھا اور بعد میں دوسری فارسی مثنویوں سے بھی فیض یاب ہوا۔ "من صدائے شاعرِ فرداستم" کی کہانی اور پھر فارسی کی زبانی! سچ یہ ہے کہ زبان کے جھگڑے کو بالکل بھول گیا اور زندگی سے دوچار ہوا۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی ست ۔۔۔ ہرچہ می بینی ز اسرارِ خودی ست

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد ۔۔۔ آشکارا عالمِ پندار کرد

سوزِ پیہم قسمتِ پروانہ ہا ۔۔۔ شمع عذرِ محنتِ پروانہ ہا

خامۂ او نقشِ صد امروز بست ۔۔۔ تا بیارد صبحِ فردائے بدست

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت ۔۔۔ تا چراغِ یک محمدؐ برفروخت

خیزد انگیزد پرد تابد رمد ۔۔۔ سوزد افروزد کشد میرد دمد

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی ست ۔۔۔ زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی ست

از محبت می شود پائندہ تر ۔۔۔ زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

در جہاں ہم صلح و ہم پیکارِ عشق ۔۔۔ آبِ حیواں تیغِ جوہر دارِ عشق

از نگاہِ عشق خارا شق شود ۔۔۔ عشقِ حق آخر سراپا حق شود

خاک گشتن مذہبِ پروانگی ست — خاک را اب شو کہ ایں مردانگی ست
از گلِ خود آدمے تعمیر کن — آدمے را عالمے تعمیر کن
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذتِ تخلیق قانونِ حیات
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ اُو بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ اُو جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نَو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند
آزماید صاحبِ قلبِ سلیم — زورِ خود را از مہماتِ عظیم

لیکن زندگی اضداد کا مرکب ہے۔ "خودی" کا زور دکھا کر شاعر "بے خودی" کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ "شمع و شاعر" میں وہ برسوں پہلے کہہ چکا ہے کہ ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اب "رموزِ بیخودی" میں ربطِ فرد و ملت کے معنی بیان کرتا ہے: ؎

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہرِ اُو را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

اُن اسباب کا ذکر کرتا ہے جن سے افراد اور قومیں تباہ ہوتی ہیں: ؎

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو ست — زندگانی محکم از لَا تَقْنَطُوا ست
اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر — از نبی تعلیمِ لَا تَحْزَنْ بگیر
گر خدا داری ز غم آزاد شو — از خیالِ بیش و کم آزاد شو

نظامِ ملت کے لئے آئین کی ضرورت ہے: —

ملتے را رفت چوں آئیں ز دست — مثلِ خاک اجزائے اُو از ہم شکست
برگِ گل شد چوں ز آئیں بستہ شد — گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد

نغمہ از ضبطِ صدا پیداستے ضبط چوں رفت از صدا غوغاستے

اور جمعیتِ حقیقی صرف کسی نصب العین سے ممکن ہے ؎

مدعا گردد اگر مہمیزِ ما ہمچو صرصر می رود شبدیزِ ما

اور وہ مدعا یہ ہے کہ ؎

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے گر مسلمانی نیاسائی دمے

لیکن اس مسلمانی کے صحیح معنی یہ ہیں کہ ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

مشرق کے لئے اس کا "پیام" تجدیدِ حیات ہے لیکن عشق و محبت کے ساتھ :؎

بیا اے عشق اے رمزِ دلِ ما بیا اے کشتِ ما اے حاصلِ ما

کہن گشتند ایں خاکی نہاداں دگر آدم بنا کُن از دلِ ما

جو نقاد اس بات کے شاکی ہیں کہ اقبال کے کلام میں نغمے کی کمی ہے وہ "پیامِ مشرق" پر ایک نظر ڈالیں :۔

چہ خوش ست زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن دلِ کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن

ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے رہِ آسماں نوردن بہ ستارہ راز کردن

فصلِ بہار کی آمد دیکھو ؎

(۱)

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

مستِ ترنم ہزار

طوطی و دراج و سار

بر طرفِ جوئبار

کشتِ گل و لالہ زار

چشمِ تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

(۲)

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید

بادِ بہاراں وزید
مرغ نوا آفرید
لالہ گریباں درید
حسنِ گلِ تازہ چید
عشق غمِ نو خرید
خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید

کشمیر جنت نظیر کی تصویر یوں کھینچی ہے:

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر — سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج — صلصل و سار زوج زوج بر سرِ نارون نگر

ستاروں کا گیت کس قدر دلکش ہے

ہستیٔ ما نظامِ ما — مستیٔ ما خرامِ ما — گردشِ بے مقامِ ما — زندگیٔ دوامِ ما
دورِ فلک بکامِ ما می نگریم و می رویم

گرمیٔ کارزار ہا — خامیٔ پختہ کار ہا — تاج و سریر و دار ہا — خواریٔ شہریار ہا
بازیٔ روزگار ہا می نگریم و می رویم

خواجہ ز سروری گزشت — بندہ ز چاکری گزشت — زاری و قیصری گزشت — دورِ سکندری گزشت
شیوۂ بت گری گزشت می نگریم و می رویم

پیشِ تو نزدِ ما کے — سالِ تو نزدِ ما دمے — اے بکنارِ تو یمے — ساختۂ بہ شبنمے
ما بتلاشِ عالمے می نگریم و می رویم

"زبورِ عجم" میں شاعر بیداری کا پیام دیتا ہے

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز — کاشانۂ ما رفت بہ تاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن از بانگِ اذاں خیز — از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

فریاد زافرنگ و دل آویزیٔ افرنگ — فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزیٔ افرنگ — معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ حرم خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

اور پھر انقلاب کا نعرہ بلند کرتا ہے:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب — از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب اے انقلاب!

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام — آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ وتاب
انقلاب!
انقلاب اے انقلاب!

جاوید نامہ میں ہمارا شاعر عالمِ فلکی کی سیر کرتا ہے اور رُوحوں سے قمر اور عطارد اور زہرہ اور مریخ اور مشتری اور زحل میں اور "آنسوئے افلاک" میں ملاقات کرتا ہے۔

کتاب کا دیباچہ یہ ہے:

خیالِ من بہ تماشائے آسماں بُود است — بدوشِ ماہ و بہ آغوشِ کہکشاں بُود است
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست — کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بُود است

زحل کی منحوس فضا میں شاعر رُوحِ ہندوستاں کو نالہ وفریاد کرتے سُنتا ہے:

شمعِ جاں افسرد در فانوسِ ہند — ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند
مردکِ نامحرم از اسرارِ خویش — زخمۂ خود کم زند بر تارِ خویش
بر زمانِ رفتہ می بندد نظر — زآتشِ افسردہ می سوزد جگر

اور اُس سے کہتا ہے کہ

بگذر از فقرے کہ عریانی دہد — اے خنک فقرے کہ سلطانی دہد

الحذر از جبر و ہم از خوئے صبر — جابر و مجبور را زہر است جبر
ایں بہ صبرِ پیہم خوگر شود — آں بہ جبرِ پیہم خوگر شود

ہر دو را ذوقِ ستم گردد فزوں
وردِ من یَا لَیْتَ قَوْمِی یَعْلَمُوْن

آخری فارسی نظم "مسافر" (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) سیاحتِ چند روزہ افغانستان کا ثمر ہے۔ اقوامِ سرحد سے خطاب کرتے ہوئے شاعر پھر اپنے سازِ خودی کو چھیڑتا ہے:—

چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش
زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

آخری دیوان ضربِ کلیم کی آخری غزل کا مطلع ہے:—

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی — یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

اور آخری شعر یعنی اقبال کا تازہ ترین کلام یہ ہے:—

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا — تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی!

بشیر احمد

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
م اقبال

بسنت

پھر نسیم جابجا فرشِ گُل بچھا گئی | پھر بہار پھول کو تخت پر بٹھا گئی
پھر نویدِ زندگی سب کو گدگدا گئی | پھر ادائے دلبری معجزہ دِکھا گئی

پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر ہُوا ہے خیمہ زن کاروانِ رنگ و بُو | پھر کلی کے لب پہ ہے داستانِ رنگ و بُو
پھر زمینِ باغ ہے آسمانِ رنگ و بُو | پھر ہے نخلِ طور پر آشیانِ رنگ و بُو

پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر مرے کریم نے گنجِ زر لُٹا دیا | پھر چمن کے فرش کو عرش پر بٹھا دیا
پھر جہانِ آرزو دِل رُبا بنا دیا | پھر حریمِ ناز کو آئینہ دِکھا دیا

پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر سُرور کی گھٹا چھا گئی ہے چارسُو | پھر فضائے دہر میں دلکشی ہے چارسُو
پھر صدائے واشُد بُوا گونجتی ہے چارسُو | پھر طرب ہے جابجا پھر خوشی ہے چارسُو

پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

پھر خمارِ زندگی کیف میں بدل گیا | پھر سُرورِ بیخودی جھومتا نکل گیا
پھر فسونِ فصلِ گُل میکشوں پہ چل گیا | پھر عقیق دیکھئے بوتلوں میں ڈھل گیا

پھر بسنت کی ہوا ہر چمن میں آ گئی

جوش ملسیانی

شیریں کا سبق

شیریں۔ ماسٹر صاحب! میرے ایک نوجوان دوست کا یہ خط آیا ہے۔ پڑھئے اور مجھے مشورہ دیجئے۔

(ماسٹر خط پڑھتا ہے)

شیریں! تمہارے لئے کبھی کچھ نہ کرسکا۔ میرے پاس دن نہیں ہیں صرف نیند سے خالی چند راتیں ہیں وہ تمہاری نذر ہیں۔۔۔

(ماسٹر خط پڑھنا چھوڑ دیتا ہے)

ماسٹر۔ تمہارا نام شیریں تو نہیں اس نے تمہیں یہ نام کیسے دیا؟

شیریں۔ ایک دن یونہی کسی چاء پارٹی میں یہ نوجوان بھیڑ میں سے کھسکتا ہُوا میرے پاس آنکلا، تعارف ہُوا نہ تھا میں کچھ ہچکچا سی رہی تھی کہ یہ نوجوان بالکل بے تکلفی سے پوچھنے لگا "آپ کا نام شیریں ہے نا؟" مجھ سے کچھ جواب بن نہ پڑا اور یہ حضرت بغیر جواب کا انتظار کئے کہنے لگے "شیریں! یہاں بھیڑ میں دبکے رہنے سے باغ میں پھرنا بہتر ہے۔" میں پھر بھی چُپ تھی کہ اتنے میں کسی لیڈی نے تعارف کی رسم ادا کردی۔ اس دن سے وہ مجھے شیریں ہی کہتا ہے شیریں ہی لکھتا ہے۔ مگر آپ باقی خط تو پڑھئے۔

ماسٹر۔ میں اس قسم کے لغو خط نہیں پڑھتا۔ سبق شروع کرو۔

شیریں۔ جی بہت اچھا۔ یہ اس کتاب میں کیا لکھا ہے کہ اپنے آپ کو جانو۔ اپنے آپ سے انجان کون ہے؟

ماسٹر۔ کتاب کا مطلب یہ ہے کہ دِل کی نقاب ہٹاؤ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ زبان کھولنے سے دِل کا گھونگٹ بھی کھُل جاتا ہے، یہ غلط ہے۔ عام طور پر جتنی زبان کھُلتی ہے دل اتنا ہی زیادہ اور چھُپتا ہے۔

شیریں۔ وہ پُرانے زمانے کے دل ہوں گے۔ آج کل تو ہم لوگ دل میں کوئی بات رکھتے نہیں۔

ماسٹر۔ افسوس ہے کہ تم میں سوچنے کا مادہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔

شیریں۔ مگر سوچنے سے کیا فائدہ؟ جو بات ہوئی وہ صاف صاف کہہ دی۔ جو سمجھ میں نہ آئے اس کے لئے انسان کیوں مغز ماری کرے۔ خواہ مخواہ کیوں زندگی کو مداری کا کھیل بنایا جائے کہ ایک بکس کے اندر دوسرا اور دوسرے کے اندر تیسرا۔ دل میں پیار آیا پیار کرلیا، نفرت ہوئی نفرت کا اظہار کردیا۔

ماسٹر۔ میں تمہارے ابا سے کہہ دُوں گا کہ مجھ سے یہ لڑکی کچھ نہیں سیکھتی۔

شیریں۔ شوق سے کہہ دیجئے۔ آخر آپ سکھاتے کیا ہیں؟ یہی نا کہ اگلے لوگ یہ کرتے تھے اور یوں رہتے تھے! کرتے

ہونگے مگر مجھے اس جھنجھٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جو ان کے جی میں آیا وہ کر گئے جو ہمارے جی میں آئے گا ہم کریں گے۔ نہ انھوں نے ہم سے پوچھا نہ ہم ان سے پوچھیں۔

ماسٹر۔ گویا تمہارے خیال میں علم ایک فضول چیز ہے۔ جب تمہارا یہ خیال ہے تو میں تمہارا اخلاقیات کا معلم کیا سکھاؤں؛

شیریں۔ جس طرح کا علم آپ علم بیان فرماتے ہیں وہ تو فضول ہی نظر آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے اس خط کا اخلاقی جواب لکھنا آجائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ دل کو بے نقاب کرو۔

ماسٹر۔ تمہارا دل کیا جواب لکھنے کو کہتا ہے ؛

شیریں۔ اگر آپ سے نہ پوچھا ہوتا تو میں صاف لکھ دیتی کہ مجھے ایسی فضول باتیں نہیں آتیں۔ پوری نیند سوتی ہوں۔ تم ورزش کرو یا علاج کراؤ۔ ہاں اور یہ بھی لکھ دیتی کہ سنما کم جایا کرو۔

ماسٹر۔ تم میرے لئے بالکل معما ہو۔ میں تمہیں کوئی مشورہ نہ دوں گا۔ پڑھنا ہے تو پڑھو نہیں تو بیہودہ وقت مت ضائع کرو۔

شیریں۔ پڑھنا تو میں چاہتی ہوں مگر ایسا پڑھنا جو میرے جاگتے کے خوابوں کی آرزوؤں میں کامیاب ہونے میں مدد دے۔ نہ ایسا پڑھنا کہ مجھے ابھی سے بڑھیا بنادے۔

ماسٹر۔ تمہیں زندگی کا کچھ بھی علم نہیں۔

شیریں۔ اچھا نہ سہی مگر آپ ہی زندگی کی تعریف فرما دیجئے۔

ماسٹر۔ زندگی کی تعریف تو بہت مشکل ہے یوں سمجھ لو کہ تم زندہ ہو اور یہ پیتل کی میز زندہ نہیں۔

شیریں۔ اس سے اچھی تعریف تو میں کر دوں۔

ماسٹر۔ کرو تو جانوں۔

شیریں۔ سنئے۔ زندگی شوخی کا وہ نشہ ہے جو پتلی سبز شاخ سے سرخ گلاب کا پھول نکالتا ہے۔

ماسٹر۔ اچھی تعریف ہے کہاں سے سیکھی۔

شیریں۔ سیکھنے سے تو خاک نہیں آتا۔ خود بخود دل سے ابھی پیدا ہوگئی۔

ماسٹر۔ کیا ان حضرت کے علاوہ اور بھی تمہارے نوجوان دوست ہیں۔

شیریں۔ کئی ہیں مگر اس نوجوان میں یہ خصوصیت ہے کہ بڑے مزہ سے جھڑک دیتا ہے۔

ماسٹر۔ مثلاً

شیریں۔ مثلاً وہی سوال جو آپ سے کیا تھا ان سے بھی کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو جانو؛ چھوٹتے ہی بولا کہ اپنے

آپ کو جانو کہ تم اُلو ہو اور اُلو ہی رہو گی۔

ماسٹر۔ اس جواب سے تمہیں غصہ نہ آیا؟

شیریں۔ غصہ کی کیا بات تھی! (کچھ تامل کے بعد) اوہو۔ اب میں سمجھی جن لوگوں کی اخلاقی تعلیم آپ مجھے سکھارہے ہیں انہیں غصہ بہت آتا تھا۔ کوئی ذرا کچھ کہہ دے تو پشتوں تک قبائل میں عداوتیں قیامت ڈھاتی تھیں۔

ہاں اور اب میں سمجھی کہ تبھی آپ کی اخلاقی تعلیم میں سوچ کر بات کرنے پر اس قدر زور ہے۔ ہم آجکل کے نوجوان اس قدر صاف دل ہیں کہ کوئی سوچ کر بات کرے تب بھی ہمیں غصہ نہیں آتا۔ یہ سمجھ کر کہ بات کرنے کا شعور نہیں درگزر کر دیتے ہیں۔ ناولوں میں البتہ دغا شعار لوگ بہت سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں اور جس انسان کو جرم کرنا ہو اسے واقعی سوچ کر ہی قدم دھرنا چاہئے مگر ہم جیسوں کو جن کو غصہ نہ ہو کینہ نہ ہو سوچنے سے کیا غرض، ہم تو خوش رہنے خوش رکھنے کے لئے ہیں۔

ماسٹر۔ کیا واقعی آج کل کی نوخیز ہستیوں میں غصہ کم ہے۔

شیریں۔ جی ہاں، کم کیا، ہے ہی نہیں۔ ہم لوگ تو ہنستے مسکراتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی کو غصہ ہوتے دیکھا ہی نہیں۔

ماسٹر۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو واقعی کمال کی ترقی ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر تمہارے ابا کو پتہ چل جائے کہ تمہیں اس قسم کے خط آتے ہیں تو پھر۔

شیریں۔ (ہنسکر) ماسٹر صاحب آپ عجیب نقطۂ خیال کے مالک ہیں۔

ماسٹر۔ کیوں؟

شیریں۔ کیا ابا نے شباب میں اس قسم کے خط نہ لکھے ہوں گے؟ اچھے خاصے فیشن ایبل ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ اب بھی لکھتے ہوں۔ خدانخواستہ بوڑھے نہیں ہو گئے۔

ماسٹر۔ (طیش میں آکر) لاحول ولا قوۃ۔ تم بہت سخت زبان دراز ہو۔

شیریں۔ ماسٹر صاحب۔ ترشروئی کی کیا بات ہے۔ مہربانی کر کے مجھے آرام سے سمجھائیے۔ آپ تو اخلاقیات کے معلم ہیں۔

ماسٹر۔ آرام سے تمہیں کیا سمجھاؤں کہ تمہیں اتنا بھی علم نہیں کہ آج سے پچاس برس پہلے تو یہ خیال بھی ناممکن تھا کہ کسی شریف زادی کو محبت کا خط لکھا جائے۔

شیریں۔ تو کیا اس زمانے کے لوگ صرف بدذاتوں سے ہی محبت کرتے تھے۔ بڑے مزہ میں تھے اس زمانے کے بدذات اور بڑے بدمعاش تھے اس زمانے کے شریف۔

ماسٹر۔ تم ہر بات کو غلط طور پر پلیٹ لیتی ہو۔

شیریں - میری غلطی ہو تو معاف کر دیجئے مگر کیا یہ واقعی صحیح ہے کہ میرے ابا کو کبھی پیار کا خط لکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔
ماسٹر - بیس سال تو ان کی شادی کو ہو چکے - چالیس سال کی ان کی عمر ہے - مجھے تو یقین نہیں آتا کہ اُنھوں نے اس قسم کی کج اخلاقی کی ہو۔
شیریں - (زیر لب انگریزی میں) *Poor dear! I must love him more than ever.*
ماسٹر - (نہ سمجھ کر) کیا کہا؟
شیریں - کچھ نہیں - ہم لوگوں کی دُہری ذمہ داری ہے - وہ مسرتیں جو ہمارے بزرگ کھو چکے زندہ کریں اور وہ غصہ اور جھوٹ کی عادتیں جو زندہ ہیں انہیں دفن کریں۔

"فلک پیما"

اعجازِ بہار

بہشتوں سے چلی اِک ساحرہ مسحور کرنے کو
طلسمِ یاس کو بزمِ جہاں سے دُور کرنے کو
ادا و ناز سے مستانی دُھن میں جھومتی گاتی
سُہانی مسکراہٹ سے خُوشی کے پھُول برساتی
عجب انداز سے دکھلاتی اعجازِ مسیحائی
زمیں پر آسمانوں سے وہ مستِ نازِ اُتر آئی
حیاتِ نَو عطا کی خشک و پژمردہ زمینوں کو
سجایا سبزہ و گُل سے پہاڑوں کی جبینوں کو
گلستانِ جہاں کو رشکِ جنّت کر دیا یکسر
فضا کو اور ہوا کو بوئے گُل سے بھر دیا یکسر
اُتارے تاجِ برفانی سروں سے کوہساروں نے
ترانے چھیڑے ہیں مدھم سُروں سے رُودباروں نے

عیاں ہر چار سُو سے فیضِ اعجازِ بہاری ہے
کہ گلبانگِ عنادل نغمۂ سازِ بہاری ہے

تاجور سامری

ہونے دے بدنام

شیش محل میں رقصاں ہے وہ دیکھو اِک گلفام
وہ جس کے ہر زمِ تبسم سے خنداں ہے جام
مینا کی قلقل میں سنتا ہوں اُس کا پیغام
اب کیا فکرِ فردا مجھ کو اور غمِ انجام
ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام

بجلی بن کر کیف کی دیوی۔ میخانوں میں رقصاں
مستانی۔ الھڑ دوشیزہ بستانوں میں رقصاں
جلتی پھرتی آگ کے شعلے۔ پیمانوں میں رقصاں
ساقی بھی ہے۔ اور ساون کی بھیگی بھیگی شام
ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام

میخانے کی چوکھٹ ہی پر ہو اِک خون پسینا
دُرد ملے۔ یا باقی ساقی! جو مِل جائے پینا
میخانے میں مرنا ساقی۔ میخانے میں جینا
میخواروں کے زمرہ میں تو لکھ لے میرا نام
ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام

تو ساقی۔ تو جام۔ صراحی۔ تُو مَے اور میخانہ
تیرا پیکر کیف کی دُنیا اور آنکھیں مستانہ
جس میں مدھرا پریم کی جھومے وہ ہنستا پیمانہ
میں پیاسا ہوں۔ اس مدرا سے بھر دے میرا جام
ہوتا ہوں بدنام۔ تو اچھا۔ ہونے دے بدنام

منظور

آجکل کا لاہور

ذیل میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی وہ تقریر درج ہے جو اُنہوں نے ۲۴ جنوری کی شام کو لاہور ریڈیو سٹیشن سے نشر کی۔

الف لیلہ میں جو سوتے جاگتے کا قصّہ ہے وہ اکثر لوگوں نے سُنا ہوگا۔ اگر لاہور کا کوئی باشندہ آج سے اسّی نوّے برس پہلے سکھوں کے عہدِ حکومت میں گہری نیند سو جاتا اور اس کی آنکھ اس ۱۹۳۸ء میں آکر کُھلتی تو اُسے بار بار آنکھیں ملنے پر بھی اپنی بیداری کا یقین نہ ہوتا۔ چھ سو چالیس ایکڑ زمین کی جس بستی میں وہ سویا تھا وہ اس کے آنکھ کھولتے کھولتے پُرانی کہانیوں کے بھوتوں کی طرح اِس قدر پھیل چکی ہے کہ دس بیس نہیں، چالیس پچاس مربع میل پر چھا گئی ہے۔ شہر کے اردگرد جو میدان اور کھیت تھے وہ غائب ہیں اور ان کے بجائے صاف سُتھری سڑکوں کا ایک جال بچھا ہُوا ہے۔ مزنگ کا پُرانا قصبہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اب شہر کا ایک محلّہ ہے۔ نواب محمد قاسم خاں کا مقبرہ جہاں کبھی اکھاڑے جمتے تھے اور جہاں شہر کے من چلے دو تین میل باہر آکر کسرت کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے، اب لاہور کے حاکم کا محل ہے اور لوگ اسے "لاٹ صاحب کی کوٹھی" کہتے ہیں۔ غرضکہ ہمارے سونے والے کو آنکھ کھولتے ہی ایک نئی زمین اور نیا آسمان نظر آتا کیونکہ ہوا میں بھی اب اُس کے اپنے ہی بھائی بند کوّوں اور چیلوں کی طرح اُڑتے پھرتے ہیں۔ البتہ شہر کے اندرونی حصّے میں جا کر اُس کی کچھ ڈھارس بندھتی۔ جو پیچ دار اور تنگ گلیاں وہ چھوڑ گیا تھا۔ وہ ابھی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ان میں سے بعض کی تنگی کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ انسان کے گزرنے کے لئے نہیں، اُس کے پھنس جانے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اِن گلیوں میں پھیری یا خوانچے والا آتا ہے تو عورتیں اور بچے سودا خریدنے کے لئے مکانوں کی اوپر کی کھڑکیوں میں سے چھینکے لٹکاتے ہیں۔ پاپڑ اور پُوری، چنا اور ریوڑی، ہر چیز اسی ذریعے سے اوپر پہنچتی ہے۔

ہمارا لمبی نیند سونے والا ایک اور چیز کو بھی دیکھ کر خوش ہوگا وہ یہ کہ مغلوں کی شاندار اور خوبصورت عمارتیں اور مسجدیں بڑی حد تک اُسی طرح کھڑی ہیں جس طرح سونے سے پہلے اُس نے اُنہیں دیکھا تھا۔ شہر کا کوئی حصّہ ایسا نہیں جہاں قریب ہی کہیں مغلیہ عہد کی کوئی مسجد یا باغ یا مقبرہ یا کوئی اور یادگار نہ ہو۔ سچ پوچھئے تو لاہور کی رونق اور خوبصورتی کو پہلے پہل مغلوں ہی نے چار چاند لگائے، ورنہ اکبر کے زمانے سے پہلے لاہور کی حیثیت چند بکھرے ہوئے دیہات سے زیادہ نہ تھی۔ مثلاً چودھویں صدی کے وسط میں جب مشہور سیّاح ابن بطوطہ ہندوستان آیا تو اس نے لاہور کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ سیر کے لئے اِدھر سے گزرتا جائے۔ اسی طرح ڈیڑھ سو سال بعد شہنشاہ بابر نے اپنی "تزک" لکھی تو اس نے لاہور کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ سمرقند، کابل اور دلی کی تعریف کرتے اُس کا قلم نہیں تھکتا۔ اکبر

کی تخت نشینی کے بعد جو ایک صدی گزری اُس میں لاہور کی شہرت مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل گئی۔ ذرا غور کیجیے کہ ایک تو وہ دن تھے جب ابن بطوطہ نے تمام ہندوستان کی سیر و سیاحت کے باوجود لاہور کو اپنی آمد کا شرف نہ بخشا، اور ایک وہ دن بھی آیا کہ انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے اورنگ زیب کے زمانے میں جب اپنی مشہور نظم (Paradise Lost) لکھی تو اُس میں ایک مقام جہاں میکائیل آدم کو باغ فردوس کی ایک بلند پہاڑی سے زمین کے پھیلتے ہوئے میدانوں پر نظر ڈالتے ہیں، وہاں شاعر کی نگاہ لاہور کو آگرے کے پہلو بہ پہلو مغلیہ شان و شوکت کا نمونہ قرار دیتی ہے۔

یہ اکبر اور اُس کے تین جانشینوں ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے کہ زمانۂ حال کا لاہور قدرتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے: مغلیہ لاہور اور انگریزی لاہور۔ مغلیہ لاہور وہ ہے جو سرکلر روڈ کے اندر آباد ہے اگرچہ اُس کے آثار عمارتوں، مقبروں اور باغات کی شکل میں شہر کے گرد کئی کئی میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اکبر نے اس کے چاروں طرف اینٹوں کی ایک پختہ دیوار تعمیر کرائی تھی۔ جو تقریباً پندرہ فٹ بلند اور تین میل کے قریب لمبی تھی۔ اس دیوار کے شکستہ آثار شہر کے شمالی حصے میں اب بھی نظر آتے ہیں۔ شہر پناہ سے باہر شہر کے گرد ایک خندق تھی جو بعد میں بھروا دی گئی ہے۔ اس خندق کی جگہ پر شہر کے تقریباً چاروں طرف خوشنما اور شاداب باغ لگا دیے گئے ہیں۔ شہر کا صرف وہ گوشہ جو قلعہ کی جانب ہے۔ سبزے کے تختوں اور سایہ دار درختوں کے حاشیے سے خالی ہے۔

سکھوں کے زمانے کے بعد گزشتہ صدی کے وسط میں جب لاہور پر انگریزی عملداری قائم ہوئی تو لاہور کے بازاروں کی عجیب حالت تھی۔ کوئی محکمۂ صفائی مقرر نہ تھا۔ کوچوں اور بازاروں میں کوڑیاں اور میلے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ محلوں میں جا بجا مردہ کتوں اور بیل کی لاشیں پڑی سڑتی تھیں۔ اور برسات میں بارانِ رحمت کے ریلوں کا بہاؤ ہی غلاظت کے اس انبار کی صفائی کرتا تھا۔ بازاروں کی نالیاں بیچ میں تھیں جن کی وجہ سے بہت کیچڑ رہتی تھی۔ اُمرا جب اپنے گھوڑوں ہاتھیوں پر سوار ہو کر نکلتے اور ان جانوروں کے سُم بازار کی موریوں میں پڑتے تو اتنی چھینٹیں اُڑتی تھیں کہ بارہا راہگیروں کے کپڑے لت پت ہو جاتے۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں انگریزوں نے شہر کی اصلاح پر توجہ شروع کی۔ بازاروں کی درمیانی موریاں موقوف ہوئیں اور ماہی پشت فرش باندھے گئے۔ تقریباً تیس برس بعد جب واٹر ورکس کا انتظام ہوا تو بازاروں سے اینٹوں کے فرش اُکھڑوا دیے گئے اور کنکر کوٹ کر نئی سڑکیں تیار ہوئیں۔

انگریزی قبضے کے بعد شہر لاہور نے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلی توسیع فوجی ضروریات کے لئے ہوئی۔ انارکلی کے مقام پر انگریزی فوج کی چھاؤنی تیار ہونے لگی۔ یہ میاں میر کا نقشِ اول تھا۔ بارکیں اور کوٹھیاں تعمیر ہوئیں اور ایک پختہ بازار تیار ہوا۔ جسے صدر بازار کہتے تھے۔ یہ ہمارا موجودہ انارکلی بازار ہے۔ جلد ہی انگریزوں نے دیکھا کہ انارکلی کا میدان فوج کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ چھاؤنی میاں میر میں منتقل ہوئی اور فوجی بارکیں سرکاری دفتروں اور محکموں کے کام آنے لگیں۔ انھیں میں سے ایک چھوٹی سی بارک سنہ ۱۸۵۲ء میں لاہور کے پاگل خانے کے طور پر استعمال ہونے لگی۔ اب ٹھیک اسی پاگل خانے کے موقع پر پنجاب کا یونیورسٹی ہال اور یونیورسٹی کا کیمیائی تجربہ خانہ ہے۔ گورنمنٹ کالج کا افتتاح آج سے تقریباً ۷۰ برس قبل ہیرا منڈی میں ہوا۔ جب اسے

دھیان سنگھ کی حویلی سے کالج کی عمارت کا کام لیا گیا۔ چودہ پندرہ برس بعد یہ کالج اپنی موجودہ خوبصورت عمارت میں منتقل ہو گیا۔ انگریزی دور کے آغاز کے بعد انارکلی کے علاقے میں وزیر خاں کی بارہ دری جس کے ساتھ ایک باغ بھی شامل تھا مختلف طریقوں پر استعمال ہوتی رہی۔ آخر میں اس نے کچھ عرصے تک انارکلی کے یورپین باشندوں کے لئے ایک کلب کا کام دیا۔ آج کل ہم اسے پنجاب پبلک لائبریری کہتے ہیں۔

اب لاہور کی ٹھنڈی سڑک کی داستان بھی سُن لیجئے۔ ۱۸۵۱ء میں یہ تجویز ہوئی کہ انارکلی سے میاں میر تک ایک سیدھی سڑک تیار کی جائے۔ شروع شروع میں اس سڑک کے دونوں طرف وہ شاندار اور خوبصورت عمارتیں نہ تھیں جن پر نیا لاہور آج کل فخر کرتا ہے۔ اس سڑک کے آس پاس اُس وقت زیادہ تر بنجر میدان تھے۔ جس میدان میں اب ہائی کورٹ کی عمارت اور اُس کے دلکشا مینارے نظر آتے ہیں اُس کے قریب صرف ایک عمارت یعنی شاہ چراغ کی مسجد تھی اس سے آگے سڑک کے دونوں طرف اچھے خاصے فاصلے تک کھیت ہی کھیت نظر آتے تھے۔ یہی سڑک بعد میں مال روڈ کے نام سے مشہور ہوئی۔ لیکن اُس وقت یہ لارنس روڈ کہلاتی تھی۔ اُس زمانے میں اصلی مال روڈ موجودہ لوئر مال تھی۔ اسی کے قرب و جوار میں لاہور کی یورپین سوسائٹی اپنے ہنگامے گرم رکھتی تھی اور گول باغ میں اسی طرح بینڈ بجتا تھا جس طرح اب لارنس گارڈن میں بجتا ہے۔

غرض اس طریقے پر آہستہ آہستہ مغلیہ لاہور کے ساتھ انگریزی لاہور کا پیوند لگتا گیا۔ شہر کے مشرق میں ریلوے سٹیشن قائم ہوا اور ریلوے کی بستی کئی میل میں پھیل گئی۔ جنوب میں سول سٹیشن کی رونق اور وسعت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یورپین آبادی لارنس گارڈن کو عبور کر کے نہر کے کنارے تک پہنچ گئی جہاں انگریزوں اور خوش حال ہندوستانیوں کے رہنے کی کوٹھیاں اپنی دلکشی اور نفاست کے لئے اپنی نظیر آپ ہیں۔ فنِ تعمیر کے لحاظ سے انگریزی عہد کی عمارتوں میں بہت سی عمارات قابلِ دید ہیں۔ میکلوڈ روڈ اور بالخصوص ٹھنڈی سڑک پر ان عمارتوں کی کثرت ہے اور ان میں سال بسال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اچھی مثالوں کے طور پر بڑا کیتھولک گرجا یا اورینٹل بلڈنگ دیکھئے۔ اسی طرح لکشمی مینشنز کا ماتھا یا چیئرنگ کراس کے تھانے کی محراب لاہور میں اپنی قسم کی نئی چیزیں ہیں۔

یہ تو یورپین لاہور کے پھیلاؤ کی کیفیت تھی۔ لیکن لاہور کا ہندوستانی حصّہ بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہا بلکہ بہت زیادہ سرگرم ثابت ہوا ہے۔ پچاس برس پہلے لاہور کی آبادی لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اب ساڑھے چار لاکھ کو پہنچ گئی ہے اور ابھی اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اضافہ محض شرحِ پیدائش کی زیادتی کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ باہر کے لوگ اس کثرت سے آ کر لاہور میں آباد ہوئے ہیں کہ اُن کی آبادی کا تناسب تقریباً ساڑھے چار سَو فی مربع میل تک پہنچ گیا ہے۔ اندرونِ شہر کی آبادی اس قدر گنجان ہے کہ وہاں ایک ایکڑ زمین تقریباً سوا دو سَو اشخاص کے حصّے میں آ رہی ہے۔ ان حالات میں شہر کا اپنی قدیم حدود سے باہر پھیلنے لگنا بالکل قدرتی تھا۔ پچاس ساٹھ برس پہلے اکبری دروازے کے باہر کوئی آبادی نہ تھی۔ اب بہت سے آباد محلّے اور گلیاں سٹیشن تک پھیل گئی ہیں۔ ریلوے سٹیشن سے لُہاری دروازے کو اسلامیہ کالج کے پاس سے جو سڑک جاتی ہے اور جسے اب عام طور

یڈرتھ روڈ کہا جاتا ہے۔ اُس کی یہ حالت تھی کہ رات کے وقت کوئی اکا دُکا اُس پر سے گزرنے کی جراُت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس وقت نہ کالج تھا
وک کے دونوں طرف عمارتیں۔ کیلے کے گھنے درختوں کی قطاریں دونوں طرف کھڑی تھیں۔ اور یہ سڑک کیلوں والی سڑک کہلاتی تھی۔ رفتہ
شہر کے مضافات گنجان محلّوں میں تبدیل ہونے لگے۔ جہاں خالی میدان تھے وہاں کرشن نگر اور محمد نگر، رام گلی اور اسلام گلی میں چلتی پھرتی
رنگی کے جلوے نظر آنے لگے۔ اب لاہور کی آبادی شمال میں فاروق گنج مصری شاہ اور فیض باغ سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ مغرب
جنوب میں اس کا قدم قصور پورے اور کرشن نگر سے آگے بڑھتا نظر آتا ہے جو لوگ لاہور کی تنگی فضا کی تاب نہ لا سکے۔ اُنہوں نے لاہور سے
ات میل جنوب کی طرف ایک چھوٹے سے صاف ستھرے شہر کی بنیاد ڈال دی جسے ماڈل ٹاؤن کہتے ہیں۔ ماڈل ٹاؤن کے خوبصورت نکھرتے
ہوئے بنگلوں نے اسے لاہور کے قابلِ دید مقامات میں شامل کر دیا ہے۔ بعد میں لاہور اور ماڈل ٹاؤن کے درمیان مسلم ٹاؤن اور گارڈن ٹاؤن
کی تعمیر ہوئی ہے جس کی وجہ سے لاہور کی آبادی کا سلسلہ برابر ماڈل ٹاؤن تک چلا جاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اِن تمام تبدیلیوں کا لاہور کی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ لاہور کی زندگی کے سب سے نمایاں پہلو اس کی سیاسی و
تعلیمی اور علمی و ادبی سرگرمیاں ہیں۔ لاہور سے کم از کم اُردو کے اتنے اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں جتنے ہندوستان کے اور کسی
شہر سے نہیں ہوتے۔ ایڈیٹروں کی وہ بہتات ہے کہ بعض دفعہ امنِ عامہ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ شہر کے بے شمار مدرسوں سے قطع نظر
کالجوں کی تعداد چھبیس ہے۔ جو کالج شاعری سکھاتے، دین دھرم کا پرچار کرتے یا موسیقی کے سُر الاپتے ہیں وہ اِن چھبیس کالجوں کے
علاوہ ہیں۔ اسی سلسلہ میں چند اور اعداد و شمار سنئے:۔

ہسپتال ——— پندرہ

بنک ——— اکتیس

بیمہ کمپنیاں ——— تینتیس

چھاپہ خانے ——— اڑتیس

مختلف سوسائٹیاں اور سبھائیں وغیرہ ساٹھ کے قریب (مگر کالجوں کی بے شمار سوسائٹیاں اس گنتی میں شامل نہیں ہیں)۔ چودہ ہوٹل (یہ
صرف بڑے بڑے ہوٹلوں کا ذکر ہے ورنہ چھوٹے ہوٹل، قہوہ خانے اور بالخصوص تنور جو لاہور کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کا پیٹ
بھرتے ہیں اُن کا کوئی شمار ہی نہیں ہے)۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے لاہور میں ایک بھی مستقل سینما ہاؤس نہیں تھا۔ اب سولہ سینما موجود ہیں جو بڑی حد تک لاہور کے کالجوں
کے سر پر چل رہے ہیں۔ تفریح کی اور بھی کوئی نہ کوئی شکل لاہور میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔ مثلاً گذشتہ دنوں میں منٹو پارک میں آل انڈیا
نمائش جاری رہی۔ نمائش نہ بھی ہو تب بھی منٹو پارک طرح طرح کے ہنگاموں سے خالی نہیں رہتا۔ یہاں یا پریڈ کے میدان میں کبھی دنگل

کے جوڑ ہوتے ہیں، کبھی دیکھئے تو مُرغ اور تیتر اور بٹیریں چلی آتی ہیں تا کہ اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائیں۔ کنکوے بازی کے جمگھٹے الگ لگتے ہیں اور زندہ دِلانِ لاہور یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ان کے نعرے اور جیکارے محض سیاسی لیڈروں کے اعزاز تک محدود نہیں ہوتے لاہور کے اس حِصے کی چہل پہل کے دو مرکز اور بھی ہیں، حمام اور اکھاڑے۔ یہاں ہر معزز آدمی خلیفہ، استاد یا پہلوان کہلاتا ہے۔ صبح صبح کسی حمام میں چلے جائیے یا شام کو کسی اکھاڑے میں۔ لاہور کے اندرونی محلوں اور دشوار گزار کوچوں کی مقامی سیاسیات پر بڑے بڑے بگاڑی خلیفے اور توندل پہلوان اُستادانہ تبصرہ کرتے نظر آئیں گے۔

یہ اُس لاہور کی تصویر کا ایک پہلو ہے جو شہر کے تیرہ دروازوں کے اندر واقع ہے۔ ان دروازوں میں سے دو کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ شاہ عالمی دروازہ جو اورنگ زیب کے بیٹے شاہ عالم کے نام سے موسُوم ہے ہندوؤں کی معاشرت کا نقشہ پیش کرتا ہے موچی دروازہ جو در اصل نہ تو دروازہ ہے اور نہ کسی موچی سے نسبت رکھتا ہے شہر کے مسلمانوں کی زندگی کے مرقعے دکھاتا ہے۔

شاہ عالمی دروازے میں داخل ہوتے ہی ہم ہلدی اور سونٹھ اور مہندی، قسم قسم کی بوؤں اور خوشبوؤں سے دوچار ہوتے ہیں۔ لوگوں میں ایک خاص کاروباری سلیقہ اور ضابطہ نظر آتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بھیڑ بھاڑ کے باوجود متانت کی فضا طاری ہے۔ موچی دروازے کی بوئیں اور خوشبوئیں اتنی چٹپٹی نہیں ہیں جتنی شاہ عالمی دروازے کی۔ تاہم جلد ہی انسان کو کھولتے ہوئے گھی اور مٹھاس کی آمیزش کا خوشگوار احساس ہو جاتا ہے، متانت کے بجائے زندہ دلی اور قہقہے اور چہچہے زیادہ نظر آتے ہیں۔ لوگ محض گفتگو کے لطف کے لئے تنوروں اور دُکانوں کے پاس کھڑے زندگی کی نعمت کی قدر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

کشمیری بازار یا لوہاری دروازے کے اندر کی سیر کیجئے تو بہت سے کتب فروشوں کی دُکانیں نظر آئیں گی۔ ان میں سے بعض بہت مشہور ہیں اور بعض کم مشہور مگر سب خاموشی سے اپنا اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ علمی اور تنقیدی کتابیں، ادبی اور دلچسپ کتابیں فنی اور کارآمد کتابیں کثرت سے شائع ہوتی ہیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی کتاب کئی کئی رُوپ بدل کر لوگوں کے سامنے آتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے "صابون سازی" یا "شادی نامہ" شائع کیا تو ایک دوسرے شخص نے اسی مضمون میں ہیر پھیر کر کے ایک نئی تالیف "مکمل شادی نامے" کے نام سے پیش کر دی۔ تیسرے شخص نے اسی چیز میں کچھ اور ادل بدل کیا اور "جدید مکمل شادی نامے" سے دُنیا کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا۔ مصنفوں کا تو لاہور میں کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ اگر ہر شخص کے ماتھے پر اُس کا پیشہ لکھا ہوا ہو تو ہر گلی کے موڑ پر آپ کو ایک آدھ بھولا بھٹکا مصنف ضرور نظر آ جائے۔ لاہور میں بے شمار ادبی انجمنیں ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہی بزرگوں کے سہارے چل رہی ہیں۔ انہیں پر کیا موقوف ہے۔ لاہور میں ہر پیشے اور وضع و قماش کے لوگ بس رہے ہیں۔ جوہری اور گداگر، فلسفی اور دیوانے، انجنیئر اور نقب زن، شاعر اور ساحر، واعظ اور شرابی، لیڈر اور چور، پروفیسر اور طالب علم بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔

آج کل کا لاہور جو کچھ کرتا ہے دل لگا کر کرتا ہے۔ میلوں ٹھیلوں پر طبیعت آجاتی ہے تو بسنت اور چراغاں، دسہرے اور دیوالی سے

فضا کو اس قدر جگمگا دیتا ہے جیسے دُنیا کی تمام رنگینی اور خوش طبعی اسی کے حصّے میں آئی ہے۔ لیڈروں کے جلوس اور جلسے اس دھوم دھام سے برپا کرتا ہے کہ سیاسی سرگرمیوں کے سوا اسے کوئی اور کام معلوم ہی نہیں ہوتا۔ شعروادب اور فلسفہ وحکمت کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو بغداد ویونان کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ یہ تمام انقلاب گذشتہ تیس چالیس برس کی پیداوار ہے۔ اس عرصہ میں زندگی کا کوئی شعبہ اس انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ ایک سڑکوں کی آمدورفت ہی کو دیکھئے۔ اس صدی کے آغاز میں نہ بسیں تھیں نہ موٹر کاروں کی یہ کثرت۔ تانگے البتہ چلتے تھے مگر ان سے کہیں زیادہ بمبوکارٹ یا ٹمٹم کا رواج تھا۔ لاہور میں پختہ عمر کے لوگوں کو وہ زمانہ ابھی یاد ہے جب بائیسکل کا رواج نیا نیا ہوا تھا۔ لوگ بائیسکل کو بڑے شوق اور تعجب سے دیکھا کرتے اور بائیسکل کے سوار کو بہت معزز سمجھتے تھے۔ اب وہ زمانے لد گئے ہیں اور بائیسکل سوار کی وہ پرانی عظمت لوگوں کے دلوں میں نہیں رہی۔ ہر تانگے والا اور پولیس کا سپاہی اگر چاہے تو بائیسکل والے کو "او سیکل!" کہہ کر پکار سکتا ہے جس کا نہایت ناقص اور بے رنگ اُردو ترجمہ "ابے او سائیکل والے" ہوگا۔ تیس چالیس برس میں زمانہ اس قدر بدلا ہے کہ اب بھنگی اور سقّے اور گھوسی کبھی کبھی جھاڑ دیا مشک بغل میں دبائے یا گھاس کی گٹھڑی سر پر رکھے سڑک پر دوچرخی گھماتے اور ہوا میں فراٹے بھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غرض ادنےٰ سے لے کر اعلےٰ تک تمام طبقے لاہور کی زندگی کی رونق اور چہل پہل کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ اہلِ پنجاب کو بجا طور پر "زندہ دلانِ پنجاب" کا نام دیا گیا ہے مگر پنجاب کا دل لاہور ہے اور جو صدا اس دل سے نکلتی ہے اُس کو سارا ہندوستان سنتا ہے ⁂

حمید احمد خاں

داغ ۔ اقبال ۔ جوش

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے ۔۔۔ لیعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

(اقبال)

اپنی کوشش سے نہیں ہے، جو فلک سیر اقبال ۔۔۔ اُس کو اُوپر لئے جاتا ہے زمیں سے کوئی

(سجاد حیدر)

جو بیاں کرتا ہے حالِ دلِ مرا ۔۔۔ اس زمانے میں فقط اِک جوش ہے

(دلگیر اکبرآبادی)

(ح - ۲)

غزل

خشک ہوئے جب آنکھ سے آنسو آہوں نے دل تھام لیا
حیف ہے اس جینے پر اپنے ہم نے بھی کیا کام لیا

قسمت کتنی سیدھی ہے کیوں رشک نہ آئے حسینوں پر
گاہک بن کر نکلے لیکن جس کو لیا بے دام لیا

چلتے چلتے چونک پڑے ہم شوق تمنا کیا کہئے
کل جو کسی نے جاتے جاتے راہ میں تیرا نام لیا

اور کوئی دل ڈھونڈا ہوتا اس دل میں کیا رکھا ہے
کیسی ہلکی چیز پہ تم نے چوری کا الزام لیا

صبر نہیں آرام نہیں پھر پہلی سی بے چینی ہے
دل نے شاید آج کسی حسرت کا دامن تھام لیا

آج تمہارے تیرِ نظر پر جان ہی دے دی بسمل نے
ناز کرو اس بخت پہ اپنے قتل کیا انعام لیا

در در دیکھا گھر گھر جھانکا بادِ صبا کے ساتھ پھرے
جب تک تیرا بھید نہ پایا ہم نے کب آرام لیا

ہم کو اُس کے لطف و کرم سے قاصد کی حاجت نہ ہوئی
آنکھوں نے پیغام سنایا آنکھوں نے پیغام لیا

اِس میں گرفت ہی کیا ہے سیفی اپنی اپنی مرضی سے
تم نے خوشی پر ہاتھ بڑھایا ہم نے غمِ ایام لیا

سیفی نوگانوی

اُردو حروفِ تہجّی کی ایک نئی ترتیب

(یہ مقالہ انجمن اُردو پنجاب کے اُس جلسے میں پڑھا گیا جو ۲۵ نومبر ۱۹۳۷ء کو زیرِ صدارت سید
امتیاز علی تاج ودائی ایم ۔ سی ۔ اے لاہور کے بورڈ روم میں منعقد ہوا۔)

چھوٹے چھوٹے بچوں کو اُردو پڑھانے اور لکھانے کے شوق کی وجہ سے مجھے محکمۂ تعلیم پنجاب اور دیگر مقامات کے منظور شدہ قاعدوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ میں سبق کو غور سے دیکھتا۔ اُس میں سے غیر ضروری الفاظ کو کاٹ چھانٹ کر نئے الفاظ بھر دیتا۔ اس کے علاوہ حروف کا ربط سکھلانے کے لئے مجھے ابجد کو تختیوں میں بانٹنا پڑا۔ جہاں اسباق کی ترتیب ہی غلط ہوتی وہاں بہت دقت پیش آتی جو قاعدے "ڈائرکٹ میتھڈ" پر چلتے ہیں اُن میں تو کسی نظام کو سوچنے کی تکلیف ہی نہیں کی گئی۔ حروف کے ربط کا کوئی طریقہ ہی نہیں سکھایا گیا۔ اس کے بجائے بچّوں کے حافظے پر ناگوار بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ چونکہ اُردو میں ایک حرف مثلاً "ب" باقی حرفوں سے ملتے وقت بہت سی مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے آسانی اسی میں ہو سکتی ہے کہ "ب" اور "ب" کی طرح جڑنے والے دیگر الفاظ کی تختی کا دوسرے حروف کے ساتھ ربط علیحدہ علیحدہ سبقوں میں سکھایا جائے۔ بالخصوص اُردو سیکھنے کے لئے صرف یہی طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پس تین باتیں قابلِ غور ہیں:۔

۱۔ ابجد کی ترتیب ایسی ہو کہ حرف کا جوڑ یا ربط سمجھنے میں آسانی ہو۔

۲۔ اسباق اِس ترکیب سے لکھے جائیں کہ ربط سمجھنے میں آسانی رہے۔

اس لئے مندرجہ ذیل ترتیب ٹھیک ثابت ہو گی:۔

(ا) زبر زیر پیش کو پوری طرح ذہن نشین کرایا جائے۔

(ب) بعد میں ایسے الفاظ جن میں جوڑ نہ ہو مثلاً دم۔ دل۔ رک وغیرہ، اس کے بعد ط ظ کے جوڑ۔ کیونکہ یہ حروف پورے پورے استعمال میں آتے ہیں ان کے سرے نہیں مثلاً طب۔

(د) س ش ص ض وغیرہ جن کے سرے ذرا آسان ہیں۔

(ر) پھر ب پ ت ٹ ث ن کے سرے جن کی مختلف شکلیں بنتی ہیں مختلف سبقوں میں سکھائی جائیں۔

(گ) ایسے الفاظ جن کی جوڑتے ہوئے شکل بدل جاتی ہے۔ مثلاً د، ر، ع۔

(پ) پھر لمبی آوازیں۔ اور پھر ساکن اور تشدید اور نونِ غنہ وغیرہ۔

۴۔ لفظوں کا چناؤ ایسا ہو جس میں جوڑ آسان ہوں۔ مہمل الفاظ استعمال کرنے کی بالکل ضرورت نہیں سادہ جوڑ والے فارسی الفاظ کا کوئی حرج نہیں۔ بچے لفظ سگ کو بآسانی بول اور پڑھ سکتے ہیں "تٹ ٹت ٹٹ" کو نہیں۔ دوسرے پرندوں اور جانوروں کے نام، بچوں کے نام، گھر کی چیزیں وغیرہ۔ مطلب یہ کہ ذخیرہ بہت ہو تاکہ لڑکا یاد نہ کرسکے اور نہ یاد کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اُس اصول کو سمجھے جس اُصول سے دو حروف آپس میں ملے ہیں۔ ساتھ ہی اُستاد کے لئے بھی الفاظ کا ایک ذخیرہ مہیا کرنا چاہئے جو ہدایات میں دیا ہوا ہو۔ ہدایات کافی ہونی چاہئیں کیونکہ ہمارے پرائمری کے اُستاد اکثر اتنا شوق نہیں رکھتے کہ وہ خود نئے نئے طریقے سوچیں۔ مشقوں میں خوب نظمیں وغیرہ ہونی چاہئیں کیونکہ بچوں کی زندگی ایک مجسم راگ ہوتی ہے اور وہ راگ کو بہت پسند کرتے ہیں۔

لیکن اس وقت میں مؤخر الذکر دونوں باتوں کو چھوڑ کر صرف اُردو الف، بے، تے کی ترتیب اور ربط کے متعلق کچھ کہوں گا۔

ہم مختلف زبانوں کے حروفِ تہجی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ جُدا جُدا حروف کو پڑھانے کے لئے خاص خاص طریق سے آسانی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ حروف بالکل بے ترتیب نہیں بلکہ کچھ توجہ اور بعض حالتوں میں نہایت غور کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آسانی کے لئے میں انگریزی زبان کو لیتا ہوں۔ اگر آپ ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کو بولتے ہوئے ہم ایک آہنگ پر چلتے ہیں، اے، بی، سی، ڈی، ای، ایف، جی، ایچ وغیرہ وغیرہ۔ اگر ہم تین تین یا پانچ پانچ الفاظ کو اکٹھے پڑھیں تو وہ Rhythm گم ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ تین تین کا جوڑ بنا کر اسی میں Rhythm پیدا کیا جاسکتا ہے۔ جیسے اے بی سی۔ ڈی ای بی۔ یا اے بی سی۔ کے ڈی ای وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ دو دو حروف کے جوڑ میں آسانی رہتی ہے اور ساتھ ہی چار چار کے جوڑ بھی خواہ مخواہ بن جاتے ہیں اس لئے دو دو حروف کے جوڑوں کو ہی عموماً مناسبت دی جاتی ہے۔ اُردو کی ابجد کو لیجئے۔ اس میں بھی اسی Rhythm کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کا اثر ہم سب پر ظاہر ہے۔ بچے آسانی سے ابجد کو حفظ کرسکتے ہیں۔

دوسری بات جو ہمیں اے بی سی پر غور کرنے سے نظر آتی ہے، وہ ہے حروف کی بناوٹ۔ اے اور ڈی، سی اور ای، آئی اور جے، ایم اور این، پی اور کیو، وی اور ڈبلیو، وائی اور زیڈ کا نزدیک نزدیک ہونا ان کی بناوٹ کو جلدی سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اسی طرح ب پ ت ٹ ث، ج چ ح خ، د ڈ ذ وغیرہ کا نزدیک ہونا تو اُردو کی ابجد کو بآسانی یاد کرنے میں بہت ہی مدد دیتا ہے۔

اب سنسکرت یا ہندی زبان پر غور فرمائیے۔ وہاں بھی کوئی نظام سوچنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ نظام اپنے نقطۂ نگاہ سے مکمل ہے۔ پہلے حروفِ علت، پھر گلے میں بولے جانے والے الفاظ۔ پھر (۱) گلے میں (۲) تالو میں (۳) تالو سے آگے (۴) دانتوں سے (۵) ہونٹوں سے، آخر میں Semi Vowel۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اُردو زبان میں جس طریق پر ابجد کو قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں کون کون سی تبدیلی واقع ہوسکتی ہے جس سے اُس طریق میں تبدیلی واقع نہ ہو، یا کوئی ایسا طریقہ سوچا جائے جو کہ ایک نظام کے مکمل طور پر ماتحت ہو۔ اُردو ابجد کی موجودہ

ترتیب عربی و فارسی ابجد سے لی گئی ہے۔ اور چونکہ اُردو زبان کو بہت سی زبانوں کے زیور پہننے کا حق ملنا تھا اس لئے اس میں خالص ہندی حروف کا اضافہ کر دیا گیا مثلاً ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ہی ایک ہی آواز کے اُن حروف کو برقرار رکھا گیا جو کہ فارسی کی زینت تھے مثلاً ث ص س اور ذ ز ض ظ وغیرہ۔ یہ جانتے ہوئے کہ اُردو حروف کی بناوٹ ابتدا ترتیب اور ربط فارسی اور عربی ابجد سے لیا گیا ہے یہ لازم ہے کہ اسی حالت میں اِس میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ اس کی ترتیب ہندی حروف کی ترتیب کے مطابق نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندی میں अ آواز ایک ہی نشان سے وابستہ ہے اُردو میں अ آواز کو شروع میں بتائی ہوئی تین جدا جدا آوازوں کی مدد لی جاتی ہے۔ अ ، [illegible] ، [illegible]۔

اگر اسے ہندی کی طرح अ پڑھا جائے اور 'بے' کو ब اور 'پ' کو प تو 'ث' "س" "ص" وغیرہ میں تفریق کرنا ازحد مشکل ہو جائے گا اور چھوٹے بچے کے لئے ابجد کو سمجھنا بہت ہی مشکل ہو جائے گا۔ اور جن اصحاب نے ایسا کرنے کی کوشش کی ہے، اُردو زبان کے پڑھنے میں رُکاوٹ ڈالی ہے۔

پس اُردو حروف کی نئی اور آسان اور باقاعدہ ترتیب کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہئے:۔

(۱) اُردو زبان کے حروف کی ترتیب و ربط عربی و فارسی کے ڈھنگ پر ہے۔

(۲) حروف کو پڑھتے وقت اُن میں ایک Rhythm برقرار رکھا جائے۔

(۳) حرفوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے وقت ان کی بناوٹ کا خاص خیال رکھا جائے اور ایک بناوٹ کے الفاظ نزدیک نزدیک واقع ہوں۔

قدیم نظام کو بدلنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی اُس کی وجہ اُوپر بیان کی ہوئی تینوں وجوہات کا مجموعہ ہے۔ جس Rhythm (آہنگ) سے لڑکوں اور اُستادوں کے کان آشنا ہو چکے ہیں اُس راگ کو ہٹا کر ایک نیا راگ پیش کرنا اگر غریب نہیں تو تکلیف دہ ضرور ہے۔ بناوٹ کے لحاظ سے اُردو حروف میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی جا سکتی۔ البتہ معمولی معمولی تبدیلیاں ضرور ہو سکتی ہیں جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ چونکہ اُردو کا لکھنا ایک قسم کا short-hand ہے جس میں دیگر زبانوں کی طرح پورے پورے حروف استعمال نہیں کئے جاتے بلکہ اُن کی علامتیں یا صرف ایک ایک حصہ ہی دکھایا جاتا ہے اور وہ جزو بھی جدا جدا حالات میں جدا جدا اشکال اختیار کر لیتے ہیں اس لئے حروف کا ربط اُردو زبان کے لکھنے میں سب سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تبدیلی کی ضرورت صرف حروف کے ربط کی طرف غور کرنے سے ہی پیدا ہوتی ہے اور میں یہ کہوں گا کہ اس بات کی طرف ماہرین تعلیم نے بہت کم توجہ دی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ موجودہ حالت میں انہیں حروف کے ربط سمجھنے میں کوئی نمایاں دقت پیش نہیں آتی۔

پیشتر اس کے کہ میں نئی ترتیب پیش کروں، اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قدیم صوری رسم الخط کی ابتدا کیسے ہوئی اور

اس کے ذریعے حروفِ تہجی کس طرح ظہور میں آئے کیونکہ اس سے ثابت ہوگا کہ حروف فرضی علامات ہیں جنہیں ہم جب چاہیں بدل سکتے ہیں:

الف عبرانی ( ) ، عربی ا معنی بیل عبرانی

ب بیت معنی گھر۔

ج جمل (اُونٹ)

ح عربی قبیلہ

د 4 یونانی ∆، عربی د، مصری تصویر ہاتھ، عبرانی دالت دروازہ

ر مصری رُد معنے منہ 9 کلدانی سے 7

س مصری عبرانی سن معنی نیلوفر مصری

ک عبرانی ہتھیلی عربی ک

ل یورپی زبانوں میں L عبرانی عربی مل عبرانی لمد معنی آنکس۔

م عبرانی مم پانی۔

ن عبرانی نون مچھلی نئی شکل ن ن

و دو مچھلی پکڑنے کا آنکڑہ

ہ ہت جنگل۔

ی عبرانی انگشت عبرانی ید معنی ہاتھ

ان حروف کی بناوٹوں سے ظاہر ہے کہ ایک چیز کی شکل سے ہم اس کے سادہ نشان کی طرف دوڑتے چلے آئے ہیں اور موجودہ شکلوں میں بھی ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کرنے کا حق حاصل ہے۔

اگر آپ صرف 'نون' کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ صرف ب پ ت ٹ ث کے بالکل مشابہ ہے۔ اگر یہ 'ں' اس شکل سے 'ن' یہ شکل اختیار کر لیتا تو لکھنے اور سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ نون کی موجودہ شکل اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ دائرہ کا ایک مرکز ہوتا ہے اور مرکز کے بغیر دائرہ خوبصورت نہیں لگتا۔ جس طرح ایک قوم یا جماعت ایک باہمی نصب العین کے بغیر اچھی نہیں لگتی۔ لیکن ن کی یہ شکل ں صحیح طور پر موزوں قرار دی جا سکتی ہے۔ پس یہ ثابت ہوا کہ نون اُس بستی کا رہنے والا ہے جس میں ب پ وغیرہ رہتے ہیں اور ہماری غلطی سے ہی اس کو اتنی دیر ملک بدر رکھا گیا ہے۔ اور ہمارے راج میں اسے وطن کو لوٹ آنے کی اجازت مل

جانی چاہئے۔

جانی چاہیئے۔

اسی طرح 'سی' اے' بھی ایسے حروف ہیں جو نشانی کے طور پر دو نقاط سے ہی ظاہر کئے جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صحیح آواز کے طور پر اُردو میں بہت کم استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ حروفِ علت ہیں۔ تاہم اُن کی اصلی جگہ اُن کی علامت کے لحاظ سے ب پ کے ساتھ ہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی آپ کے غور کے لئے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ وُہ ہے اِن کو بولنے کا طریق۔ بجائے چھوٹی یے بڑی یے کہنے کے اگر ہی اور یے پڑھایا جائے تو مجھے اس بات میں آسانی نظر آتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فارسی کی سی بات اس میں نہ رہے گی لیکن فارسی کی طرز تو اب بھی اس میں نہیں پائی جاتی۔ وہاں اس کی آواز علامت زبر اور زیر پر منحصر ہے، یے چاہے بڑی لکھی جائے چاہے چھوٹی Rhythm (آہنگ) کو قائم کرنے کے لئے ایک اور حرف درکار ہے۔ وہ بھی مل جاتا ہے گو وہ عین ب پ ت وغیرہ کے خاندان کا نہیں ہے۔ اگر آپ حرف ہ کو دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی کئی صورتیں بنتی ہیں اور یہ اُردو کے مشکل ترین حروف میں سے ہے۔ اس کی مختلف اشکال ہیں۔ ہ ہر ہہ ہہ اور ہہ تاہم ا، ب ... ث ن ی ل ک گ د ڈ ذ، ر ڑ ز ژ کے ساتھ ملتے وقت اس کی وہی صورت رہتی ہے جو ب پ وغیرہ کی۔ اس لئے اسے بھی وہیں جگہ دی جا سکتی ہے بہرحال یہ جگہ اُس کی پُرانی بے معنی جگہ سے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ا، ب، پ کو ایسے پڑھا جائے .... یہ

آگے چلئے۔ ج چ ح خ کے ساتھ کوئی حرف بھی ملے تو وہ م کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اسی طرح م کے ساتھ ملتے ہوئے بھی حروف کی وہی حالت ہوتی ہے۔ پس م کو ج چ ح خ کے نزدیک رکھنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ لیکن یہ پانچ حروف ہو جاتے ہیں اور Rhythm (آہنگ) میں فرق آ جاتا ہے اور دیگر حروف میں سے کوئی حرف بھی اِس فہرست کا نہیں اِس لئے ایک اور حرف ڈھونڈنا پڑے گا۔ وہ حرف میں آگے چل کر بتاؤں گا۔

اس کے بعد د ڈ ذ آتے ہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ اس جگہ بچوں کی راگ کی دلدادہ رُوح کے کچلے جانے کی آہ کو سُنا ہی نہیں گیا۔ یہاں تین حروف ہونے کی وجہ سے جو سکتہ پڑتا ہے اُس کی جگہ پُر کرنے کے لئے وہ معصوم آہ بھر لیتے ہیں۔ یہ ہم سب پر ظاہر ہے کہ د ڈ ذ کے بعد اگر کوئی بھی حرف لکھا جائے تو وہ نئے سرے سے شروع ہوگا اور ان کے ساتھ نہیں ملے گا اور 'و' بھی عین ویسا ہی حرف ہے اور شکل میں بھی مشابہت رکھتا ہے اس لئے یہ وہاں رہ کر بہت خوش ہوگا اور اسے پڑھنے والے بچے بھی۔

اب 'ر ڑ ز ژ' اور 'د ڈ ذ' پر غور کرنے سے پتہ چلے گا کہ ان سے پہلے کوئی حرف اگر ان کے ساتھ ملایا جائے تو ان کی شکل بدل جاتی ہے۔ اسی طرح ع اور غ کی شکل میں بھی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اس لئے د ڈ ذ ر ڑ ز ژ کے بعد درجہ ع غ کا ہے نہ کہ س ش کا اس کے بعد ط ظ کے لکھے جانے کا حق ہے کیونکہ یہ حروف جڑتے وقت پُورے کے پُورے استعمال میں آتے ہیں ان کے سرے نہیں۔ اس کے بعد س ش، ص ض، ف ق، ک گ کی باری آتی ہے۔ اب ل بیچارہ اکیلا رہ گیا ہے، اس کا کوئی ساتھی نہیں

لیکن اس میں ایک میم چھپا ہؤا ہے اس لئے میم کے پاس رہتا ہؤا یہ سہانا لگے گا اور اسے بولنے میں آسانی ہوگی۔ باقی رہا "ء"۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ء آدھا الف ہے جس طرح آ تین الف کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ بذاتِ خود حرف نہیں بلکہ ایک علامت ہے۔ اس بنا پر اِسے اب، اپ سے نکالا بھی جا سکتا ہے یا مدّ کو اب پ میں داخل بھی کیا جا سکتا ہے اور وزن قائم رکیا جا سکتا ہے۔

چند اور تبدیلیاں بھی میرے دماغ میں ہیں مثلاً اب، اپ، ات کی جگہ ا ب ت پ ث ٹ ن ی ے ہ پڑھا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔ ایک تو ہ کا جھگڑا نکل جائے گا اور اسے بیے تک تختی علیحدہ ہو جائے گی دوسرے نقاط کی ترتیب کچھ بہتر ہو جائے گی۔ و د ذ ڈ پڑھنا بھی د ڈ ذ و سے بہتر ہے کیونکہ و علیحدہ رہ جاتا ہے اور شکل بدلنے والے حروف کی تختی علیحدہ ہو جاتی ہے۔ ع غ کو م ل کے بعد رکھا جائے تو وزن اچھا ہو جاتا ہے۔ پھر 'د' کا جھگڑا درمیان میں آ جاتا ہے۔ اس لئے ساری تختی کو ہی اور جگہ دینی چاہئے۔ پس اب پ کا آخری سانچہ میری نظروں میں اوپر بیان کئے گئے اصُولوں کے مطابق .... یہ ہونا چاہئے۔

موجودہ ترتیب	نئی ترتیب
ا	ا
ب پ ت ٹ ث	ب ت پ ث ٹ
ج چ ح خ	ن ی ے ہ
د ڈ ذ	ط ظ
ر ڑ ز ژ	و د ذ ڈ
س ش	ر ز ژ ڑ
ص ض	ع غ ل م
ط ظ	ج چ ح خ
ع غ	س ش ص ض
ف ق	ف ق ک گ
ک گ	
ل م ن	
و ہ ء	
ی ے	

اوم پرکاش ایم اے

کیلاش کنول

تراجم از "پیامِ مشرق" ——— حسبِ اجازت علامہ اقبال

(۲۴)

رہے در سینۂ انجم کشائی
ولے از خویشتن نا آشنائی
یکے بر خود کشا چوں دانہ چشمے
کہ از زیرِ زمیں نخلے برآئی

(ترجمہ)

تارے کے جسم سے راہ نکالی
اپنے سروپ پہ آنکھ نہ ڈالی
بھومی سے بیج نے پیڑ اُگایا
کیوں نہ وہ بیج سی آنکھ کھلا لی

---

(۲۵)

سحر در شاخسارے بوستانے
چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے
برآور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالۂ، آہے، فغانے!

(ترجمہ)

صبح کو پیڑ پہ ایک چمن میں
ہُوک بھرے تھی یہ کویل تن میں
بہر دے ہیں جو کچھ ہولا باہر
راگ کہ بین ہو تیرے مَن میں!

([illegible] بمعنی [illegible])

---

(۲۶)

شنیدم در عدم پروانہ می گفت
دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را
ولیکن سوز و سازِ یک شبم بخش

(ترجمہ)

سُنا کہے تھا پتنگ عدم میں
دم بھر کو جیون کی تپن دے
چاہے اُڑا دے راکھ سویرے
رین تو آگ سے بھر تن من دے!

(یہ [illegible] پڑھا جائے۔

(۲۳)

بہ کوئش رہ سپاری اے دل اے دل
مرا تنہا گذاری اے دل اے دل
دمادم آرزوہا آفرینی،
مگر کارے نداری اے دل اے دل!

(ترجمہ)

راہ اُسی کی لگا آہ اے دل
چھوڑ کے مجھکو چلا آہ اے دل
آس پہ آس اُبھاری مَن میں
کام نہ اور تھا کیا آہ اے دل

---

(۲۸)

ترا از خویشتن بیگانہ سازد
من آں آبے طربناکے ندارم
بازارم مجو دیگر متاعے
چو گُل جز سینۂ چاکے ندارم

(ترجمہ)

تجھ کو جو آپے[1] آپ بھُلا دے
پاس رکھوں نہ وہ مَن مَوجی رس
میری دُکان میں اور نہیں کچھ
پھُول سے ٹوک[2] ہیں دِل کے اور بس!

[1] خود بخود۔ طرب ناک۔ مست۔ نشے سے بھرا ہوا
[2] درد بھرے ٹکڑے، سینۂ چاک

---

(۲۹)

زیاں بینی ز سیرِ بوستانم
اگر جانت شہیدِ جستجو نیست
نمایم آنچہ ہست اندر رگِ گُل
بہارِ من طلسمِ رنگ و بُو نیست

(ترجمہ)

میرے چمن میں نہ پائے تو آنند
کھوج نہیں جو ترے جیون میں
بھید بتاؤں میں پھُول کی رَگ کا
رنگ کو لاؤں نہ باس کو مَن میں!

---

(۲۶)

تُرا یک نکتۂ سربستہ گویم
اگر درسِ حیات از من بگیری
بمیری گر بہ تن جانے نداری
وگر جانے بہ تن داری نمیری

(ترجمہ)

تجھ کو بتاؤں میں ایک چھپا گُر
جیون پاٹھ[1] جو تو پڑھ جائے
جان[2] بنا تن ہو تو مرے تُو
تن میں ہو جان تو مَوت نہ آئے

[1] سبق، درس + [2] یہاں جان سے مراد عشقِ روحانی ہے

"گذشتہ موسم بہار میں مجھے سرحد کے آزاد قبائل میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے ہمراہ افضل صاحب جالندھری، محمد نصر اللہ خاں صاحب اور محمد سبطین شاہ صاحب تھے۔ راستہ میں ہم ٹیکسلا دیکھنے کے لئے ٹھہرے۔ ذیل میں ٹیکسلا کے تاریخی حالات درج کئے جاتے ہیں۔ اگر قارئین کرام نے پسند کیا تو آزاد قبائل کے حالات بھی جو نہایت دلچسپ ہیں، پیش کروں گا۔

میں محمد سبطین شاہ صاحب قبلہ کا نہایت ممنون ہوں جن کی وجہ سے میں اُس جگہ پہنچا جہاں شاید بہت کم ہندوستانی بھائیوں کو جانے کا اتفاق ہوا ہوگا۔"

رفیع جالندھری

ہندوستان میں محکمہ آثار قدیمہ کا سب سے بڑا کام ٹیکسلا کے محلِ وقوع کا پتہ چلانا ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں یہ شاید اپنی قسم کا پہلا اور لاثانی واقعہ ہے کہ ٹیکسلا کا سا مشہور اور عظیم شہر صفحۂ ہستی سے تقریباً تیرہ سو سال کے لئے اس طرح ناپید ہو جائے کہ اُس کا ذکر بھی لوگوں کی زبانوں پر نہ رہے حتےٰ کہ مقامی حکایات اور اساطیر تک اُس کے ذکر سے قطعی اجنبیت کا اظہار کریں۔ تعجب ہے کہ ایسا عظیم شہر اور اس قدر جلد فراموش کر دیا جائے لیکن یہ ایک امرِ واقعی ہے کہ ۵۰۰ء سے (جب ٹیکسلا کو ہُن قوم نے نذرِ آتش کر کے تباہ کر دیا) گذشتہ ستر سالوں تک اس شہر کا نام بھی ذہنِ انسانی سے محو ہو گیا تھا۔ ٹیکسلا کی عظمت اور اس کی شہرت سے مندرجہ بالا سطور کا اذعان مشکل ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ کئی سو سال تک ٹیکسلا کا نام تاریخی کتب یا سفرناموں کے علاوہ کہیں نظر نہ آتا تھا۔ زمانہ نے اس کا نشان اس طرح مٹایا کہ ان چند سو سالوں کے دَوران میں اس کے نقوش تک کا پتہ چلانا بھی ناممکن تھا۔ زمانہ نے شاید ٹیکسلا کو تہذیبِ انسانی پر ایک بدنُما دھبا خیال کیا جو اسے اس طرح روئے زمین سے مٹا دیا۔ لیکن حقیقتہً ٹیکسلا انسانیت پر کوئی بدنُما دھبا نہ تھا۔ برعکس اس کے اس شہر کی تمدنی، سیاسی اور معاشرتی ترقی رہتی دُنیا تک مثال بنی رہے گی۔ اس کی مدنیت پر آج بھی ہندوستان نازاں ہے اور ہندوستانی اس پر جس قدر بھی فخر و مباہات کا اظہار کریں زیبا ہے۔

۱۸۶۳ء میں جنرل کننگھم نے قطعی طور پر ٹیکسلا کی جائے وقوع کو شناخت کر لیا۔ قدیم اربابِ سیَر کی کتب اور سفرناموں سے اُسے ٹیکسلا کی موجودہ جگہ دریافت کرنے میں بے حد مدد ملی۔ پالینی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیکسلا حسن ابدال کے مقام پر شاہ ڈھیری سے آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے لیکن اُس کا یہ خیال غلط ہے۔ فاہیان اپنے سفرنامہ میں اسے ٹو۔ چا۔ شی۔ لو یعنی ٹیکشا سیلا کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ شہر گندھارا سے سات روز کی مسافت پر واقع ہے۔ چینی زبان میں اس کے معنی "سر بُریدہ" کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مہاتما بدھ جب بدھستوا تھے تو بودھی حاصل کرنے کے لئے اُنہوں نے اپنا سر کسی شخص کو دے دیا تھا۔ اس لئے

ٹیکسلا کے آثار

(۱) سرکپ کا ایک منظر (۲) جولیاں کی خانقاہ کا
ایک حصہ (۳) مرادو کے موڑے کا بارہ فٹ بلند ستوپا

اس جگہ کا نام ٹیکشا سیلا پڑ گیا۔ لیکن جیمز لیگی (James Legge) کے خیال میں ٹکشا سیلا جس کا ذکر فاہیان کے سفرنامہ میں آتا ہے دریائے سندھ کی مغربی جانب واقع تھا اور غلطی سے ٹیکسلا شمار کیا جانے لگا۔ اسے ٹیکسا شرا لکھنا چاہئے۔ اور چینی تلفظ بھی اس کی اجازت دیتا ہے علاوہ ان کے ہیون سانگ اور سنگ یُن کی کتب سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ سر جان مارشل لکھتا ہے:۔

"ٹکاسیلا یا ٹکشا سیلا سنسکرت کے لفظ ٹکشا سیلا سے ماخوذ ہے جس کے معنی "سنگِ تراشیدہ کا شہر" ہے۔ ٹیکسلا کا ذکر سنسکرت لٹریچر میں بھی پایا جاتا ہے"۔ پانینی (Panini) بھی ٹیکشا سیلا کا ذکر کرتا ہے۔ یہ لفظ رامائن اور مہابھارت میں بھی کئی دفعہ آتا ہے۔ بدھوں اور جینیوں کی کتب میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ اس شہر کے محلِ وقوع کا اندازہ تو پیشتر ہی ایسے ذرائع سے لگایا جا چکا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد ایک پُرانے اور منہدم ستوپا کے کتبے سے جنرل کننگھم کا خیال پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس کتبے سے یہ بات مکمل طور پر ثابت ہو گئی کہ محولہ بالا ستوپا ٹیکسلا میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا لہٰذا یہیں کھُدائی شروع کر دی گئی۔

کھُدائی کا کام گذشتہ صدی کے اواخر میں ہی شروع کر دیا گیا تھا لیکن فی الحقیقت کھُدائی ۱۹۱۳ء میں شروع ہوئی۔ اس سال سر جان مارشل نے ستوپاؤں، خانقاہوں اور مکمل شہروں کو اُن کے مدفن سے نکالا اور بیس سال کی مسلسل محنت و مشقت کے بعد ٹیکسلا کی دیرینہ عظمت کے نشانات ہماری آنکھوں کے سامنے ظاہر کر دیئے۔ آج سیاحوں کے لئے ٹیکسلا تو پہلی سے زیادہ کشش رکھتا ہے یہاں کا موجودہ عجائب گھر ہندوستان کی گذشتہ عظمت اور زمانۂ قدیم کی معاشرت و مدنیت کا جامع ہے، یہاں سنگ تراشی کے نمونے، قدیم سکہ جات، زیورات اور دیگر ایسی ہی چیزیں نہایت قابلِ دید ہیں۔

ٹیکسلا کے عرُوج و زوال کی داستان کا اندازہ انہی اشیاء سے لگایا جاتا ہے بلکہ کسی حد تک تو یہی کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ کی بنا (۵۰۰ ق۔م سے ۵۰۰ء تک) انہی برآمد شدہ اشیاء پر قائم ہے۔ پُرانے یونانی اور چینی سیاحوں کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰۰ ق م میں ٹیکسلا اپنی ایک شاندار یونیورسٹی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا۔ ٹیکسلا ایک نہایت سر سبز و شاداب وادی میں واقع ہے جہاں پانی کی بہتات ہے۔ اور یہ بیرونی حملہ آوروں کی مدافعت کے لئے نہایت مناسب جگہ ہے۔ ٹیکسلا اس شاہراہ پر واقع ہے جو زمانۂ قدیم میں وسط ایشیا سے اندرونِ ہند کو جاتی تھی۔ اس لئے یہ تجارتی شہر تھا۔ اب اس پُرانی شاہراہ کی جگہ گرانڈ ٹرنک روڈ اور نارتھ ویسٹرن ریلوے نے لے لی ہے۔

۵۰۰ ق۔م سے ۵۰۰ء تک یعنی ایک ہزار سال کے دوران میں ٹیکسلا یکے بعد دیگرے تقریباً سات اقوام کے زیرِ نگیں رہا۔ سب سے پہلے ایرانیوں نے اپنی حکومت یہاں قائم کی جن میں سے دارا وغیرہ مشہور بادشاہ ہوئے۔ اسی دوران میں (۵۶۳–۴۸۳ ق۔م) مہاتما بُدھ پیدا ہوئے اور وفات پائی۔ بعد ازاں یونانی آئے۔ سکندرِ اعظم کے زمانہ میں پنجاب کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور ٹیکسلا صرف اُس تھوڑے سے حصے کا دارالخلافہ تھا جو دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع ہے۔ اس لئے اس

زمانہ میں فوجی نقطۂ نظر سے اس کی وہ حیثیت نہ تھی جو آج کل راولپنڈی یا دیگر چھاؤنیوں کی ہے۔ لہٰذا سکندرِ اعظم نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر راجہ امبھی سے ٹیکسلا حاصل کر لیا۔ اس کے بعد پورس سے لڑائی ہوئی لیکن چند سال کے عرصے میں ہی چندر گپت نے یونانیوں کو نکال باہر کیا اور موریا خاندان کی بنا ڈالی۔ اسی خاندان میں اشوک اعظم یا پیادسی (حبیبِ خدا) پیدا ہؤا۔ اس کے بعد شمال سے باخترین آئے جنہوں نے تقریباً ایک صدی تک حکومت کی اور شمالی ہند کے فنون پر اپنے گہرے اثرات چھوڑ گئے۔ اُن کے بعد پارتھین اور کشان قوم کا دَور دَورہ ہؤا۔ اُنہوں نے ٹیکسلا کے علاوہ پنجاب اور سندھ کے وہ علاقے بھی فتح کر لئے جو باخترین کے ماتحت تھے۔ ۱۲۵ء میں کشان خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ کنشک تخت نشین ہؤا جس کی سلطنت وسط ایشیا سے بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ آخر کار یہ وسیع سلطنت بھی زوال پذیر ہوئی اور ہُن قوم نے ہندوستان کو تاخت وتاراج کرنا شروع کیا۔ اس قبیلہ کے لوگ ابتداً وسطِ ایشیا کے پہاڑوں میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے اور بہت خونخوار اور وحشی تھے۔ اس حملہ کے بعد ٹیکسلا اپنی گذشتہ عظمت پھر دوبارہ کبھی حاصل نہ کر سکا۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب ہیون سانگ ہندوستان میں آیا تو اُس نے تمام ستوپاؤں اور خانقاہوں کو برباد شدہ حالت میں پایا۔ وہ لکھتا ہے "چونکہ شاہی خاندان معدوم ہو چکا ہے اس لئے اُمرا، طاقت سے برسرِ اقتدار آ گئے ہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ علاقہ کشمیر کا باجگذار ہو گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمام خانقاہیں غیر آباد پڑی ہیں اور مُجاری بہت کم نظر آتے ہیں"۔
اس سے آگے ٹیکسلا کی بابت تاریخ بالکل خاموش ہے۔ آہستہ آہستہ خاک نے اس سرزمین کو چشمِ انسان سے بالکل پوشیدہ کر دیا۔ اور کوئی ایک عمارت بھی ایسی نہ چھوڑی جس سے شہر کا کچھ نشان مل سکتا۔ حتیٰ کہ ٹیکسلا کا نام بھی حضرتِ انسان نے اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا گوارا نہ کیا۔

ٹیکسلا کے کھنڈر راولپنڈی سے تقریباً بیس میل شمالاً واقع ہیں۔ اس وادی کو دریائے ہرو اور اُس کے معاون سیراب کرتے ہیں اور گردونواح کی پہاڑیاں اس جلالِ گذشتہ اور عظمتِ دیرینہ کی حفاظت میں سینہ سپر ہیں۔ زمانۂ قدیم میں جب وسط ایشیا اور ہندوستان کے درمیان تجارت عروج پر تھی تو تمام قافلے اسی وادی سے گزرتے تھے۔ اس بیان سے اس شہر کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس وادی میں تین مختلف شہروں کے کھنڈر تمیز کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے سے تقریباً ساڑھے تین میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اِن شہروں کے علاوہ بے شمار ستوپے اور خانقاہیں زمین سے کھود کر نکالی گئی ہیں۔ متذکرہ بالا شہروں میں سب سے قدیم شہر میوزیم اور سرائے کالا ریلوے سٹیشن سے قریب ہی واقع ہے۔ یہ شہر یونانیوں سے بھی کئی صدی قبل آباد تھا۔ دوسری صدی قبلِ مسیح میں یونانیوں نے اس سے چند میل کے فاصلے پر سرکپ کو دارالخلافہ بنایا۔ کُھدائی سے اس شہر کے تمام معابد، سڑکیں، بازار، دوکانیں اور مکانات صاف نظر آنے لگے ہیں۔ سرکپ کی بیرونی فصیل بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں کے سنگتراشی کے نمونے نہایت اعلیٰ اور دلکش ہیں۔ اس شہر کی ایک ایک دیوار کھودی جا چکی ہے۔ دیواریں چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنائی گئی ہیں۔ کہیں کہیں اُن میں بڑے

سلیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ دیواریں ماہرینِ فنِ تعمیرات کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہیں۔ قیاس ہے کہ جب یہ شہر آباد ہوں گے توان دیواروں پر چُونا اور پلستر کیا ہُوا ہوگا۔

ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے مطابق ان عمارات کی بالائی تہیں کشان خاندان کے عہد کی یادگار ہیں۔ ان سے زیریں تہ پارتھین قوم سے متعلق ہے اور اصل زمین تک پہنچنے سے پیشتر دو اور تہیں نظر آتی ہیں جو یونانی حملوں کی یاد دلاتی ہیں۔ سرکپ کے مکانات سے جیسا کہ خیال کیا جا سکتا ہے سکہ جات، ظروف، جواہرات، کھلونے، کُرسیاں اور ہزارہا دیگر اشیاء برآمد ہوئی ہیں۔ یونانی طرز کا چاندی کا ایک چمچہ بھی دریافت ہُوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی نمُونے کے چمچے پومپی سے بھی ملے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے جو برتن زمین کے اندر سے یہاں دستیاب ہوئے ہیں اُن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اس قدر طویل امتدادِ زمانہ کے ان کے رنگ و روغن کی آب و تاب وہی باقی ہے۔ سرکپ کے درمیان سے ایک بڑی شاہراہ گزرتی ہے جو شہر کو دو حصّوں میں منقسم کر دیتی ہے۔

اس سلسلے کا تیسرا شہر سرسکھ ہے جو سرکپ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ شہر کنشک کے زمانہ میں (۱۲۵ئہ) آباد کیا گیا تھا۔ چونکہ یہاں کی زرخیز زمین ابھی تک مقامی زمینداروں کی مقبوضہ خیال کی جاتی ہے اس لئے یہاں کھدائی کا کام اعلےٰ پیمانہ پر شروع نہیں کیا جا سکا۔

اس ایک ہزار سال کے دَوران میں یہاں بُدھ مت ہی رائج تھا اس لئے اسی مذہب کی یادگاریں اس وادی میں مدفون ہیں۔ تمام خانقاہیں، ستوپے اور پگوڈے اسی مذہب کی یاد دلاتے ہیں۔

جنڈیال کے کھنڈروں سے ایک بڑا مندر کھودا گیا ہے۔ بدل پور اور لال چک کے مقامات پر خانقاہیں مدفون تھیں جو اب نکالی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں جولیاں اور مرادو کے موڑے کی کھُدائی سے نہایت زبردست انکشافات ہوئے ہیں اور یہاں سے نہایت مفید اور لاثانی یادگاریں برآمد ہوئی ہیں۔ یہ خانقاہیں قدرے بہتر حالت میں ہیں اس لئے ان کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے حافظے یا تصور سے زیادہ کام نہیں لینا پڑتا۔ ان کا تقدس اور ظاہری شان و شوکت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی اُس زمانہ میں تھی۔ دیواروں پر پچی کاری کی گئی ہے۔ یہاں لکڑی کا منقش کام اور بُدھ کے ہزارہا مجسّمے قابلِ دید ہیں۔ اس جگہ سے سنگتراشی کے نہایت اعلےٰ نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان سب پہ یونانی اثرات نمایاں ہیں۔ مرادو کے موڑے میں ایک بارہ فیٹ بلند ستوپا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ یہ ستوپا نقش و نگار سے مزیّن ہے اور اس پر مہاتما بُدھ مختلف حالتوں میں دکھائے گئے ہیں۔

اس وادی کے تمام ستوپاؤں میں سے دھرم راجیکا ستوپا نہایت مشہور ہے۔ یہ حضرت مسیحؑ کے زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس بڑے ستوپا کے اِردگرد کئی چھوٹے ستوپے ہیں جن میں بے شمار مقدس آثار مدفون ہیں۔ عموماً ستوپے میں سے ایک چھوٹی سی ڈبیا برآمد ہوتی ہے جس میں سے چند ہڈیاں اور بیش قیمت جواہرات نکلتے ہیں۔ دھرم راجیکا سے ایک ظرف دستیاب ہُوا تھا جس میں سے

ایک کتبہ اور چھوٹی سی طلائی ڈبیہ برآمد ہوئی۔ اس ڈبیہ میں چند ہڈیاں تھیں اور کتبے سے جو خروشتی رسم الخط میں تحریر تھا۔ اس راز کا انکشاف ہؤا کہ وہ ہڈیاں مہاتما گوتم بُدھ کی یادگار تھیں۔ یہ ہڈیاں برما کے بُدھوں کو تحفتہً پیش کر دی گئیں۔ اب یہ مانڈے کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر پگوڈے کے اندر محفوظ ہیں۔ اسی جگہ شیشے کی مانند شفاف اینٹیں بھی مدفون تھیں۔ یہ سیاہ، سفید اور زرد رنگ کی تھیں۔

میرا مضمون تشنۂ تکمیل رہے گا اگر یہاں ٹیکسلا کی رسوم اور مذہب و مدنیت کا اجمالاً کچھ ذکر نہ کیا گیا۔ یونانی سیاح جب پہلے پہل یہاں وارد ہوئے تو اُنہیں یہاں کی کئی رسمیں عجیب معلوم ہوئیں جنہیں اُنہوں نے نہایت دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔ پہلی چیز جو اُنہیں عجیب معلوم ہوئی ستی کی رسم تھی۔ سٹرابو (Strabo) لکھتا ہے "میں نے بعض ایسی کہانیاں سُنی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ کی عورتیں اپنے خاوندوں کی موت پر زندہ چتا میں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتیں اور نہ رنج و ملال کا اظہار ہی کرتی ہیں"۔ سٹرابو کے علاوہ ارسطوبلس (Aristobulus) اور دیگر یونانی سیاح بھی ایسا ہی کچھ بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکسلا کے لوگ مُردوں کو باہر پھینک دیتے تھے تاکہ اُنہیں گِدھ یا دیگر شکاری جانور کھا جائیں۔ اگر ان رسوم کو بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیکسلا کی تہذیب و مدنیت مجموعہ تھی مختلف ممالک کی رسوم کا۔ اس میں بابلی، ایرانی اور تبتی رسوم کا عنصر قدرے غالب نظر آتا ہے۔ اگر ایک طرف مُردوں کو گِدھوں کے آگے پھینکنے کی رسم پارسیوں یا تبتیوں سے لی گئی تھی تو رسم ستی کا ماخذ سیتھین قوم معلوم ہوتی ہے۔ سکندرِ اعظم کے زمانہ میں پنجاب کو کئی اقوام نے اپنا وطن بنا رکھا تھا۔ اگرچہ اُس وقت برہمنی مت یہاں اپنے قدم جما چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی آتش پرست بھی آباد تھے۔ چنانچہ اُن کا ایک بڑا معبد سرکپ کے شمالی دروازہ سے چند سو گز کے فاصلہ پر دریافت کیا گیا ہے۔ آتش پرستوں کے علاوہ دُوسرے مذاہب بھی ترقی پر تھے۔ اس سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ٹیکسلا کی تہذیب و مدنیت اُس وقت اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس جگہ ایک اعلےٰ اور متموّل قوم کے تمام فنون و رسوم رائج تھے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستانی معاشرت اور تہذیب و تمدن کس قدر دیرینہ روایات کے حامل تھے۔

"جاتکاؤں"[1] کی شہادت سے یہ بات پایۂ یقین کو پہنچ چکی ہے کہ ٹیکسلا ہندوؤں کا علمی مخزن تھا۔ یہاں ملک کے گوشہ گوشہ سے لوگ ویدوں اور پورانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ دستورِ زمانہ کے مطابق شاہزادے اور متموّل برہمنوں کے لڑکے سولہ سال کی عمر میں تکمیلِ تعلیم کے خیال سے ٹیکسلا بھیجے جاتے تھے۔ یہ یونیورسٹی خصوصاً طب کی تعلیم کے لئے مشہور تھی۔ اور یہاں بڑے بڑے لائق اور تجربہ کار اُستاد مقرر تھے۔

---

[1] وہ کہانیاں جو بدھ کی پیدائش سے متعلق ہیں جاتکائیں کہلاتی ہیں۔ رفیع

آج کل محکمہ آثارِ قدیمہ کے اربابِ بست وکشاد کی توجہ سے ان تمام چیزوں کے چند نقوش نظر آسکتے ہیں جن سے ٹیکسلا کی عظمتِ گذشتہ کا قدرے اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ یہ شہر ایک نہایت قدیمی تہذیب کا مدفن ہے ۔

وہ بھی کیا دن ہونگے جب یہ وادی اپنے مکینوں سے آباد ہوگی اور یہاں کی ہر چیز تجارت، تمدن اور سیاست اپنے پورے عروج پر ہوگی ۔ جو چیزیں دستبردِ زمانہ سے اب تک محفوظ ہیں ان سے اس زمانہ کے فنِ تعمیر کی ترقی اور یہاں کی تہذیب کا پورا پورا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔

رفیع الزّمان خاں جالندھری

اس مضمون کی طیاری میں مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے :-

1. Fa Hien —— A Record of Budhist Kingdoms
Translated by James Legge.

2. Hiuen Thsang —— Budhist Records of the Western World.
Translated by Samual Beal.

3. Rapson, E. J. —— Ancient India.

4. Oxford History of India, by Smith, V.S.

5. A Guide to Taxila, by Sir John Marshell.

6. Archaeological Survey of India, Report (1914-15)
by Sir John Marshell.

ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا وہ باغ تھا
گردوں نے جس جا خرابے کیے ہیں اس کے آگے

درد

قطع تعلّق

اچھا تجھے منظور یہی ہے تو چلی جا
اور جب تجھے جانا ہے بالآخر تو ابھی جا

لیکن مجھے واپس مرا آرام دیئے جا
اور جیب و گریباں کا مرے چاک سیئے جا

تجھ بِن یہ بُجھا رہتا ہے اس درجہ کہ توبہ
جا، دِل کو مگر خوگرِ تنہائی کئے جا

ایسا نہ ہو رہ جائے تری یاد مرے پاس
جاتی ہے تو جا، پر اسے ہمراہ لئے جا

گو خود تو پڑا کشمکشِ ہجر کے پالے
جا، کرتا ہوں تجھ کو مگر اللہ کے حوالے

مرزا یاور علی

غالب اور بیدل

(بہ سلسلۂ اشاعتِ جنوری)

غالب نے محض اپنی نظم کا اندازِ بیان ہی بیدل سے مستعار نہیں لیا بلکہ معنوی طور پر بھی وہ ایک نمایاں حد تک بیدل سے متاثر ہوا ہے۔ اس معنوی مناسبت کی ایک دلیل وہ بہت سے مخصوص الفاظ اور ترکیبیں ہیں جو بیدل اور دورِ اول کے غالب میں مشترک ہیں۔ بیدل کے ان الفاظ و اصطلاحات کو غالب کسی کور ذوق اور فرومایہ نقال کی طرح بے سمجھے بوجھے استعمال نہیں کرتا بلکہ جن فلسفیانہ تصورات پر یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں، اُن کے تمام پہلوؤں سے پوری طرح لُطف اندوز ہوتا ہے اور اُنہیں اپنی شخصیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً جوہر اور عرض کے باہمی تعلق کی بہت سی ممکن صورتیں اس کے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں اور ان صُورتوں کو وہ اس طرح بار بار قیدِ شعر میں لانا چاہتا ہے جس طرح کوئی بچہ چکنی مٹی کو رہ رہ کر ایک نئی شکل دیتا ہے۔ ان مخصوص ترکیبوں میں سے بعض کو تو خود بیدل ہی نے وضع کیا ہے اور بعض اگرچہ نئی نہیں ہیں مگر بیدل نے کثرتِ استعمال سے انہیں ایک خاص مفہوم دے دیا ہے۔ غالب کو ابتدائی دَور میں یہ الفاظ و تراکیب بہت مرغوب ہیں اور ان کے استعمال کے ساتھ ساتھ بیدل کے خیالات کا اثر تقریباً ہر جگہ شامل ہے۔ ان میں سے صرف چند کا ذکر یہاں کافی ہوگا۔

جوہر۔ عرض۔ تأمل (بمعنی مطالعۂ باطن)۔ پرافشاں، بیضۂ طاؤس، بالِ طپیدن، کاغذِ آتش زدہ، دامِ خیال، غبارِ شیشۂ ساعت، یک الف کم اور یک الف بیش وغیرہ۔ اسی طرح خوں شدہ دل اور غنچے کی تشبیہ غالب نے بکثرت استعمال کی ہے مثلاً ؎

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل — خوں کیا ہُوا دیکھا، گُم کیا ہُوا پایا

اس کا ماخذ بیدل کے اس قسم کے اشعار ہیں ؎

غنچہ گردیدیم گلشن در گریباں ریختیم — عشرتِ سربستہ از دلہائے خونیں بودہ است

(ہم نے غنچہ بن کر باغ کی بہار خود اپنے گریبان میں دیکھ لی، — عشرتِ پنہاں کا مزہ کچھ خوں شدہ دل ہی میں آتا ہے)

غالب کا وہ شعر جس میں اس نے دل کو ایک ٹپکنے ہوئے قطرۂ خوں سے مشابہ قرار دیا ہے بہت مشہور ہے۔ اس کا سُراغ بھی بیدل کے ایک مقطع تک پہنچتا ہے:

زاحوالِ دلِ غم دیدۂ بیدل چہ می پرسی — کہ ہست ایں قطرۂ چوں غنچہ محروم از چکیدنہا

(بیدل کے غم زدہ دل کا حال کیا پوچھتے ہو۔ — یہ ایک ایسا قطرہ ہے جو غنچے کی طرح ٹپکنے سے محروم ہے)

اگرچہ تشبیہ کا تعلق دراصل نظم کے صوری عنصر سے ہے لیکن مندرجہ بالا تشبیہات کے استعمال میں معنوی اشتراک کی جھلک صاف نظر آتی ہے اس سے قطع نظر ہمیں کئی ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں دونوں شاعروں نے ایک ہی مضمون ادا کیا ہے مثلاً بیدل کے ان دو شعروں پر غور کیجئے

دلِ آسودۂ ما شورِ امکاں در قفس دارد گہر دزدیدہ است ایں جا عنانِ موجِ دریا را

(ہمارے پرسکوں دل میں تمام کائنات کے ہنگامے بند ہیں یہاں موتی نے موجِ دریا کی باگ اپنی طرف پھیر لی ہے)

اضطرابِ موج آخر محوِ گوہر می شود درکمین ما دلِ بے مدعا اُفتادہ است

(دریا کا اضطراب آخر کار گوہر میں محو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری ہنگامہ خیزیوں کی تاک میں بھی دلِ بے مدعا پڑا ہے)

ان دونوں شعروں کے ساتھ غالب کے حسب ذیل شعر کا تعلق بالکل واضح ہے ؎

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگئ جا کا گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اسی طرح بیدل ایک اور جگہ کہتا ہے ؎

تنگنائے بیضہ بیدل گوشۂ آرام بود شد پریشاں مُرغِ ما تا بال و پر آوردہ است

غالب نے اسی مضمون میں پرکشائی کی زیادہ وسعت پیدا کی ہے ؎

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کُنجِ قفس از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جایئے

یہاں صرف چند اور مثالوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا ؎

بیدل:۔ چوں غبارِ شیشۂ ساعت تسلی دشمنم از مزاجِ خاکِ ما ہم بردہ اند آرام را

(مجھے اطمینان و سکون سے اتنا ہی بیر ہے جتنا بالو جنتر کی ریت کو میری مٹی کے خمیر ہی میں سے آرام نکال لیا گیا ہے)

غالب:۔ نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

بیدل:۔ صدائے کہ پیچیدہ بر سازِ ہستی چہ دارد بجز نالہ زنجیر خانہ!

(تو ایک صدا ہے جو زندگی کے ساز سے پیدا ہوئی زنجیر خانے میں نالے کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے!)

غالب:۔ بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم!

بیدل:۔ رمزِ فرصت بہ کفِ من بہ تو حیراں بودم آنقدر دست نہ دارم کہ تواں سود بہم

غالب:۔ فرصتِ آئینہ صد رنگِ خود آرائی ہے روز و شب یک کفِ افسوسِ تماشائی ہے

بیدل:۔ ہر چند دستگاہ بود بیش، حرص بیش از موجِ بحر تشنہ لبی می کشد زباں

(جب تمام اسباب میسر ہوں تو حرص اور بڑھ جاتی ہے سمندر کی موج سے دراصل تشنہ لبی زبان پھیلاتی ہے)

غالبؔ:۔ ہُوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

جس حد تک غالب کے اپنے ارادے کو تعلق تھا، اُس نے سنِ بلوغ کو پہنچنے سے کچھ پہلے بیدل کی تقلید ترک کر دی۔ اگرچہ اندازِ بیان برسوں کی مشقِ سخن اور طبیعت کے تخیلی میلان کی وجہ سے جس روش پر پڑ چکا تھا، اس سے علیحدہ ہونا ابھی اور چند سال تک عملاً غالب کے لئے ناممکن تھا۔ لیکن جب وہ زمانہ آیا کہ مرزا بیدل اور خیال بند شعرا کی روایت سے قطع نظر کر کے غالب نے اپنے ذاتی اجتہاد کی بنا پر اُردو میں ایک نیا (مگر کسی قدر ملتا جلتا) اسلوبِ بیان پیدا کر لیا، اُس وقت بھی اس نے اپنی اوّلین شاعرانہ عقیدت کو بالکل خواب فراموش نہیں بنا دیا اب فارسی میں غالب خود پایۂ اُستادی کو پہنچ چکا تھا اور بیدل کی فارسی گوئی کے متعلق گاہ بہ گاہ کوئی حقارت آمیز اشارہ کرنے میں اسے باک نہیں تھا۔ تاہم اس کے عہدِ طفلی کے شاعر کی روح کبھی کبھی اس کے خیال کی دُنیا میں پھر داخل ہوتی تھی۔ بڑھاپے میں مرزا ہرگوپال تفتہ کو ایک خط لکھا ہے جس میں یہ عبارت نظر آتی ہے، "ایک چرخ ہے جو چلا جاتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ ہُوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے ..... مرزا عبدالقادر بیدلؔ خوب کہتا ہے ؎ رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام۔ زیں ہوسہا بگذر یا نگذری می گزرد"

پہلے دَور سے آگے بڑھ کر بھی غالب کے کلام میں بار بار یہ شہادت ملتی ہے کہ ابھی بیدلؔ کی آواز اُس کے دل و دماغ میں گونج رہی ہے۔ مثال کے طور پر بیدلؔ کا یہ شعر دیکھئے ؎

تا بہ کے بے مدعا چوں شمع باید رفتنت جادۂ خود را نسازی محو در منزل چرا!
(تو کب تک شمع کی طرح بے مدعا راہ پیما رہے گا؛ کیوں نہیں اپنے راستے کو منزل میں محو کر دیتا)

ظاہر ہے کہ یہ غالبؔ کے اس شعر کا نقشِ اوّل ہے ؎

رنجِ رہ کیوں کھینچئے؛ واماندگی کا عشق ہے! اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

بیدلؔ کا شعر ہے ؎

نیست بیدلؔ غیر از اظہارِ عدم اندر جہاں تا خموشی پردہ از رُخ برفگند آواز بود
(بیدل! دُنیا میں عدم کے ظہور کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے جب خاموشی چہرے سے نقاب اُلٹتی ہے تو آواز ہو جاتی ہے)

غالبؔ کہتا ہے ؎

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

بیدل کا ایک اور شعر ہے ؎

نفیِ خود میکنم اثبات بروں می آید تا کجا رنگِ تواں باخت بہارست اینجا

اس کے مقابل میں غالب کا شعر اتنا بلند نہیں ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ کسی پیچ در پیچ طریقے پر بیدلؔ کا اثر اس کے دماغ میں کام کر رہا تھا۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا   دی ہے جائے دہن اُس کو دمِ ایجاد نہیں

غالب کے دورِ پختگی کا ایک اور بہت مشہور شعر ہے جو صاف طور پر بیدل کے ایک شعر کا ترجمہ ہے۔ بیدل کہتا ہے ؎

بہ ہستیِ تو اُمیدست نیستی ما را   کہ گفتہ اند اگر ہیچ نیست اللہ است

(تیرے ہونے سے ہیں نیستی پر بھی اُمید ہے۔   کیونکہ کہتے ہیں کہ اگر کچھ نہ ہو تب بھی خدا ضرور ہو)

غالب کے ترجمے میں منطقیانہ استواری کی شان زیادہ نمایاں ہے۔ بیدل کی نظر آئندہ امکانات کی دُنیا پر بھی ہے۔ اس کے برعکس غالب نے بالکل قدرتی طور پر آغازِ کار کا جائزہ لیا ہے۔ یہاں خیال بند شاعر کا لبریز جذبات استدلال اپنی پوری شاعرانہ کیفیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خُدا ہوتا   ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!

در اصل لڑکپن میں جو چیز غالب کو سب سے زیادہ باعثِ کشش معلوم ہوئی، وہ بیدل کے فلسفیانہ مضامین تھے۔ تحلیلی اندازِ طبیعت کا منطقی نتیجہ فلسفہ دانی ہے۔ بیدل اور غالب دونوں کی طبیعت میں تحلیل وتجزیہ کا مادہ اس شدت سے موجود ہے کہ بیدل کا کلام تو تمام تر فلسفیانہ خیالات سے بھرا ہؤا ہے اور غالب کی شاعری میں بھی فلسفے کو ایک امتیازی مرتبہ حاصل ہے۔ بیدل کی مابعد الطبیعی دلچسپی نے غالب کو شروع ہی میں بتا دیا کہ یہاں ایک ہم آہنگ روح موجود ہے چنانچہ دَورِ اوّل میں جو اغلاق اور پیچیدگی نظر آتی ہے اُس کی ایک وجہ وہ فلسفیانہ باریک بینیاں ہیں جو بیدل کے مضامین کی تقلید میں ناگزیر ثابت ہوئیں۔ ارسطو کہتا ہے کہ فلسفے کا آغاز استعجاب وتجسس سے ہوتا ہے۔ غالب کے فطری فلسفیانہ میلان کا ثبوت اس سے زیادہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ لڑکپن میں بھی فلسفیانہ تجسس کا عنصر اُس کے کلام میں بڑی وضاحت کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا۔ وہ کائناتی سوال جنھوں نے اُس کے ذہن کو ہمیشہ بےچین رکھا اور جن کے لئے شعرائے اُردو کی صف میں اُسے ایک ممتاز رتبہ حاصل ہے تقلیدِ بیدل کے دَور میں بھی اس کے لئے خاص اہمیت حاصل کر چکے تھے۔ اگر بیدل یہ پوچھتا کہ ؎

کو مقامے کہ تواں مرکزِ ہستی فہمید   از زمیں تا فلک آغوش کشیدست عدم

(وہ مقام کون سا ہے جسے مرکزِ ہستی قرار دیا جا سکے؛   زمین سے آسمان تک تو عدم کا آغوش پھیلا ہؤا ہے)

تو غالب بھی پکار اُٹھتا تھا کہ ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب؛   ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بہت سے فلسفیانہ تصورات ایسے ہیں جنھیں غالب واضح طور پر بیدل سے اخذ کرتا ہے مثلاً زندگی کے لئے پابندیِ نظام کی ضرورت کا تصور۔ بیدل کہتا ہے ؎

قطرہ ہا در ضبطِ موج آئینہ دار گوہر اند — تا شود روشن کہ سعیٔ خامشی بیہودہ نیست

(قطرے موج سے وابستہ ہو کر موتی بن جاتے ہیں۔ — یہ اس کا ثبوت ہے کہ خاموشی محض ایک سعیٔ نامشکور نہیں ہے)

غالب نے اسی خیال کو بہتر پیرائے میں ادا کیا ہے ؎

بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندیٔ گوہر — وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُرنم ہے!

بیدل اور غالب کے دو دو اور شعر جن میں فلسفیانہ مضمون کی مناسبت موجود ہے یہاں درج کیے جاتے ہیں: ؎

بیدل:- در تکلم از ندامت ہیچ کس آسودہ نیست — جنبشِ لب یک قلم جز دست برہم سودہ نیست

(بات کرنے میں کوئی شخص ندامت سے محفوظ نہیں رہتا — جنبشِ لب کو یہی سمجھو کہ (حسرت سے) ایک ہاتھ کو دوسرے پر مل رہے ہو)

غالب:- زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے — کشاد و بستِ مژہ سیلیٔ ندامت ہے

بیدل:- قطرۂ ما تا کجا سامانِ خودداری کند — بحر ہم از موج ایں جا می شمارد دام ہا

(ہمارا قطرہ کب تک اپنے نفس کو بچا تا رہے — یہاں تو سمندر اپنی موج میں بھی دام چھپائے ہوئے ہے)

غالب:- دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ایک بڑی حد تک اسی فلسفیانہ رمز شناسی کی بدولت غالب اور بیدل دونوں اپنے آپ کو عوام سے برتر سمجھتے تھے۔ غالب کی روشِ عام سے علیحدگی بہت مشہور ہے مگر بیدل کو بھی اس معاملے میں اپنی ذات پر کچھ کم اعتماد نہ تھا۔ ایک مرتبہ نواب شکراللہ خاں کی مجلس میں مرزا بیدل اور شیخ ناصر علی دونوں جمع تھے۔ بیدل کے اس مطلع کا ذکر آگیا ؎

نشد آئینۂ کیفیتِ ما ظاہر آرائی — نہاں ماندیم چوں معنی بچندیں لفظ پیدائی

(آرائشِ ظاہری نے ہماری اندرونی کیفیت کو کبھی آشکارا نہ کیا — اتنے لفظوں کے ہوتے ہوئے بھی ہم معنی کی طرح پنہاں رہے)

ناصر علی نے کہا کہ دوسرا مصرع خلافِ دستور معلوم ہوتا ہے کیونکہ معنی لفظ کے تابع ہے، لفظ جب بھی ظاہر ہوتا ہے معنی خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔ بیدل نے ایک حقارت آمیز تبسم کے ساتھ جو جواب اپنے نامور معاصر کو دیا وہ کسی ایسے ہی دماغ سے نکل سکتا تھا جو فلسفیانہ خیالات سے منجھا ہوا ہو اور جسے اپنی فوقیت کا پورا احساس ہو۔ اس نے ناصر علی سے مخاطب ہو کر کہا: وہ معنی جسے آپ تابعِ لفظ قرار دیتے ہیں اس کی اصلیت بھی ایک لفظ سے زیادہ نہیں۔ جو چیز حقیقت میں معنی کہلاتی ہے وہ کسی لفظ میں نہیں سما سکتی۔ مثلاً انسان کی ماہیت اُن شرحوں اور تفصیلوں کے باوجود جو کتابوں میں درج ہیں، بالکل نہیں کھل سکی۔" بچارے شیخ ناصر علی یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے۔

بیدل عوام کا شاعر نہیں ہے۔ عجب نہیں کہ عوام کی روش سے علیحدگی کی خواہش نے بیدل کی طرف غالب کے میلان کو مزید تقویت

پہنچائی ہو۔ بہرحال اس خاص معاملے میں غالب اور بیدل کی طبیعت کا اشتراک بالکل روشن ہے۔ دونوں کے دل میں کسی نہ کسی وجہ سے عوام کے متعلق حقارت کا شدید احساس موجود ہے۔ بیدل کہتا ہے

زابنائے جہاں بیہودہ درد سر مکش بیدل | اگر بارے نداری التفافت چیست باخرہا؟
(بیدل! تم دُنیا والوں کے ساتھ کیوں بے کار سر کھپاتے ہو؟ | تمہارے پاس کوئی بوجھ تو ہے نہیں، پھر گدھوں سے کیا کام؟)

اسی طرح غالب ایک فارسی رباعی میں تمام دُنیا کے جاہلوں کو گدھے قرار دیتا ہے اور ان کے مختلف طبقوں کے درمیان صرف اتنا فرق کرتا ہے جتنا خرِ عیسےٰ اور خرِ دجال میں ہے۔

بیدل اور غالب کے متعلق ایک اور بنیادی حقیقت ایسی ہے جس کو پیشِ نظر رکھ کر دونوں کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے دونوں کی فطرت میں وہ خاص روحانی کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے جسے غالب کہیں وارستگی اور کہیں خود بینی، آزادی یا آزادہ روی کہتا ہے۔ یہ کیفیت دوسرے لفظوں میں اپنی روح کے عزم و ہمت اور شخصی غرور و طاقت کا وہ احساس ہے جو مصائبِ حیات کو خاطر میں نہیں لاتا، جو اسبابِ ظاہری سے مرعوب یا مغلوب ہو جانے میں اپنی توہین سمجھتا ہے اور ناکامیوں کو ایک "رئیسانہ" شان سے نظر انداز کرنے یا حقارت سے ٹھکرانے کی کوشش کرتا ہے۔ مرزا غالب کے لئے (برعکس مرزا بیدل کے) خاندان و نسب کا غرور بھی اس احساس کی پشت پر موجود تھا۔ بیدل کی صورت میں اس احساس کو اُس کے فلسفۂ خودی اور جذبۂ حرکت و عمل سے بہت گہرا تعلق ہے بیدل کی شاعری میں (دوسرے مضمونوں کے ناپید ہونے کی وجہ سے) یہ مضمون اس قدر نمایاں ہے کہ میں اُس کے کلام میں سے صرف دو تین مثالیں دینے پر اکتفا کروں گا۔

بہ شوخی آمد از بے دست گاہی احتیاجِ من | درازی کرد دست آخر ز کوتہ آستینی ہا
(بے وسیلہ ہونے کی وجہ سے آخر میری غربت ہی شوخی میں آگئی، | گویا میں نے اپنی کوتاہ آستینی کی وجہ سے دراز دستی کی)

مقامِ وصل نایاب است، راہِ سعی ناپیدا | چہ می گردیم یارب گر نہ بودے نارسیدنہا
(یہیں منزلِ محبوب نہیں ملتی اور سعی و ہمت کا راستہ گم ہے؛ | خدایا! اگر نارسائی بھی نہ ہوتی تو ہم غریبوں کا کیا حشر ہوتا)

اس پر غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے جسے بعض حضرات اُس کی "قنوطیت" کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن جس میں در اصل یہی احساسِ وارستگی غالب کے دماغی پس منظر کے طور پر صاف نظر آتا ہے

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور | رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم!

بیدل کا ایک اور شعر ہے
واماندگی ز عافیتم بے نیاز کرد | بال آں قدر شکست کہ از آشیاں گزشت
(مصیبتوں نے مجھے عیش و آرام سے بے پروا کر دیا۔ | میرے پر اس قدر ٹوٹے کہ آشیاں سے باہر جا پڑے)

غالب کے ایک مشہور شعر میں کچھ اسی قسم کا خیال ظاہر کیا گیا ہے :۔

رنج سے خوگر ہُوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ شعر غالب کے آخری دورِ شاعری سے ماخوذ ہے۔ لیکن پہلے اور دُوسرے دَور میں بھی اس طرزِ احساس کی کچھ کمی نہیں۔ مثلاً پہلے دَور کا یہ شعر دیکھئے ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

اسی طرح دوسرے دَور کے ایک شعر میں کہا ہے :؎

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اگر ایک طویل نظم میں یہ دیکھنا ہو کہ انتہائی درد و کرب کے احساس کے ساتھ ساتھ غالب کی یہ وارستگی و آزادگی کیا کیا مختلف اور متعدد شکلیں اختیار کر تی ہے تو غالب کا وہ فارسی ترکیب بند پڑھنا چاہئے جو اس نے دہلی کی انگریزی عدالت سے سزائے قید پانے کے دو ڈھائی مہینے بعد غالباً ستمبر ۱۸۴۷ء میں جیل خانے کی دیواروں کے اندر بیٹھ کر لکھا۔ یہاں عزیمت و وارستگی کا احساس بھی ہے، اور ظرافت کی وہ شان بھی، جس کی کوئی جھلک بیدؔل کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے رئیسِ شہر اور شریف النسب ہونے کا احساس غالب کے لئے بیک وقت سرمایۂ قوت اور سرمایۂ عذاب ہے۔ مگر یہ نظم اپنے متنوع نفسیاتی پہلوؤں کے لحاظ سے بہت پیچیدہ ہے جن کے تفصیلی تجزیے کا یہ موقع نہیں۔

جن کیفیات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ان کے علاوہ ایک اور شخصی جوہر ایسا ہے جو بیدؔل اور غالؔب دونوں کی فطرت کے خمیر میں داخل ہے۔ یہ استغنا کا جوہر ہے جو غالب کے اس قسم کے اشعار میں کارفرما ہے ؎

نہ ستائش کی تمنّا، نہ صِلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دردِ منت کشِ دوا نہ ہُوا میں نہ اچھا ہُوا، بُرا نہ ہُوا

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالؔب کو بیدؔل کی طرف جو کشش ہوئی اُس میں طبیعت کے اس رنگ کو خاص دخل تھا۔ بیدؔل اپنے استغنا کے لئے بہت زیادہ مشہور ہے کیونکہ اس کی زندگی شروع سے آخر تک عملاً اسی استغنا کا مرقع تھی۔ وہ خود بڑی دھوم دھام سے کہتا ہے ؎

آخر ز فقر بر سرِ دُنیا زدیم پا خلقے بہ جاہ تکیہ زد و ما زدیم پا

(آخر دُنیا کو ہم نے اپنے پائے فقر سے ٹھکرا دیا۔ لوگوں نے جاہ و حشمت کا سہارا ڈھونڈا اور ہم نے اسے پاؤں سے ٹھوکر مار دی۔)

بعض لوگ جو غالب کی آخر عمر کی قصیدہ خوانیوں کو غیر متناسب اہمیت دینے کے خوگر ہیں، یہ سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں کہ

بیدل جیسے قناعت شعار اور مستغنی المزاج انسان کے ساتھ اسے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ اس طرزِ خیال کے لوگوں کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ بیدل عہدِ اورنگ زیب کا شاعر ہے، جب ہندوستان ابھی "گولڈن انڈیا" کہلاتا تھا۔ بہادر شاہ کا ہندوستان بڑی حد تک مفلس ہندوستان تھا۔ حال ہی میں "مکاتیبِ غالب" کا جو نسخہ رام پور سے شائع ہؤا ہے اس کے مندرجہ خطوط میں سے بعض غالب کے بڑھاپے کی مالی پریشانیوں پر دردناک انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ غالب کا افلاس اور بڑھاپا انتہائی تکلیف تک پہنچ گیا ہے اور اُسے پچاس روپے کی حقیر رقموں کے لئے نواب صاحب رام پور کو جس عجز و ابرام کے ساتھ خط لکھنے پڑتے ہیں وہ بے حد عبرت انگیز ہے۔ اس کے مقابلے میں بیدل کا ماحول دولت وثروت سے مالامال تھا، تمام بڑے بڑے اُمرا اس کے دروازے پر آنا اور اس کی خدمت میں تحائف پیش کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ مجموعۂ رام پور کے بعض مکاتیب پر غور کیجیئے اور اس کے ساتھ محمد حسین آزاد کی زبان سے بیدل کی زندگی کا یہ واقعہ سنیئے:۔

ایک کابلی سوداگر انار ہندوستان میں بیچنے کو لایا۔ اتفاقاً سب انار اس کے گل گئے۔ حیران ہو کر چند انار جو باقی تھے بطریقِ نذر مرزا (بیدل) کے پاس لایا اور عرضِ حال کیا۔ مرزا نے ایک شعر اسے لکھ دیا اور نواب لطف اللہ خاں کے پاس بھیج دیا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

بخیۂ کفشم اگر دنداں نما شد عیب نیست   خندہ دارد چرخ ہم بر ہرزہ گردی ہائے من

نواب اسے حسنِ طلب سمجھے کہ شاید مرزا کی جوتی ٹوٹ گئی ہے اور نہایت غنیمت سمجھے۔ اسی وقت ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا۔ مرزا نے کل روپیہ اُسی کابلی کو دے دیا۔

جس شخص کے حالات یہ ہوں اُس کی زندگی کی بنیاد اگر استغنا پر قائم رہی تو کیا تعجب ہے!

یہ سچ ہے کہ عزو جاہ کی جو طلب غالب میں نظر آتی ہے وہ بیدل میں مفقود ہے اور اس بنا پر دونوں کی سیرت میں یقیناً ایک امتیاز قائم ہے۔ اس فرق کی بنیاد یہ ہے کہ غالب کو دُنیا کی لذتیں لذیذ معلوم ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کی نعمتوں اور مسرتوں کا حریص ہے اور بڑی بڑی حد تک ان سے لطف اُٹھانا چاہتا ہے، اُس کے پاس استغنا تو ہے مگر قناعت نہیں ہے۔ اس کے برعکس بیدل کے لئے لذائذِ دنیوی سرے سے کوئی کشش ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ خود کہتا ہے ؎

کافرم گر مخمل و سنجاب می باید مرا   سایۂ بیدے کفیلِ خواب می باید مرا

(مخمل اور سنجاب کی حرص کس کافر کو ہے۔ میرے آرام کے لئے تو بید کے درخت کا سایہ کافی ہے)

ایک اور شعر میں اس سے بھی زیادہ خوبی کے ساتھ یہی مضمون ادا کیا ہے ؎

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویش   من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

(مجھے اگر دولتِ دنیا بھی دیں تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلوں ہمیں نے پاؤں میں قناعت کی مہندی لگا رکھی ہے)

غالب کچھ اپنے حالات اور کچھ اپنی اُفتادِ طبیعت کی وجہ سے قناعت کی اس بلندی تک کبھی نہ پہنچا۔ لیکن ساتھ ہی بیدل کا جنونِ استغنا اتنا پختہ بھی نہیں ہے جتنا بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ اُس کے رقعات کو دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ دوستوں کے تحائف وہدایا کے معاملے میں وہ کچھ ایسا بے نیاز نہیں تھا۔ اس کے علاوہ نظام الملک آصف جاہ اول کی استادی قبول کرنا بھی استغنا کی خاص دلیل نہیں ہے باقاعدہ مدح گوئی اس نے اگرچہ نہیں کی لیکن اُسے امراء کی خوشنودی حاصل کرنے سے عار نہیں تھا۔ امیر الامراء سید حسین علی خاں کی تعریف میں اُس کے دو شعر میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرۂ شعراء میں موجود ہیں۔ بیدل ایک عمل دور کا شاعر ہے اس لئے اپنے ممدوح کے لئے "نشۂ پیمانۂ قدرت" کی خوبصورت ترکیب استعمال کرتا ہے۔ وہ دو شعر یہ ہیں۔

اے نشۂ پیمانۂ قدرت! بچہ کاری — ہستی اثری یا پئے تاراجِ خماری

مے در قدح، گل بسری، جام بدستی — رنگِ چمنی، موجِ گلی، جوشِ بہاری!

غالب کو اس قسم کے قدردان نہ مل سکے جیسے خوبیِ قسمت سے بیدل کو میسر آئے۔ بیدل دائیں ہاتھ سے لے کر بائیں ہاتھ سے دے سکتا تھا۔ غالب کو اس قسم کی فیاضانہ داد و دہش کی حسرت ہی رہی ؎

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد — بہر بار زر پیل بارم دہد

کہ چوں پیل زانجا برانگیزمے — زرش برگدایاں فرو ریزمے

لیکن قسمت کی ان تمام کوتاہیوں اور ایک ہلکے سے فرقِ سیرت کے باوجود یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بیدل اور غالب استغنا کے معاملے میں بحیثیتِ مجموعی متحد تھے۔ اگر بیدل نے شاہزادۂ محمد اعظم کی ملازمت کو ایک اصول کی خاطر ٹھکرا دیا تو غالب نے بھی حکومتِ ہند کے چیف سکرٹری مسٹر ٹامسن کی پیشکش کو اپنی آن پر قربان کر دیا اور جب کعبۂ حکومت کا دروازہ اُس کے لئے وا نہ ہوا تو وہ اُلٹے پاؤں واپس چلا آیا۔ جو لوگ مکاتیبِ رام پور سے غالب کی طبیعت کا اندازہ کرنا چاہیں وہ اس واقعے کو بھی نظر انداز نہ کریں۔ جو کلکتے جاتے ہوئے اُسے لکھنؤ میں نائب السلطنت اودھ کی ملاقات کے سلسلے میں پیش آیا۔ نائب السلطنت آمادۂ لطف و کرم تھا مگر آدابِ ملاقات کے سلسلے میں جو شرطیں اس نے لگائیں انہیں غالب کی خودداری قبول نہ کر سکی چنانچہ مسٹر ٹامسن کی طرح اُسے بھی غالب کی ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔

غالب میں استغنا کا یہ جوہر تقلیدِ بیدل کے دور ہی میں واضح ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس عہد کا ایک شعر ہے ؎

وہ بے دماغِ منتِ اقبال ہوں کہ میں — وحشت بہ داغِ سایۂ بالِ ہما کروں

اسی زمانے کے قریب کا ایک اور شعر ہے ؎

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

تشریحات بالا سے شاید یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ دورِ اوّل میں غالب محض بیدل کی صدائے بازگشت ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ غالب نے بیدل کے اندازِ بیان کی کامل تقلید تو ضرور کی ہے لیکن اپنی جامع الصفات شخصیت کو بیدل کی زیادہ طوفانی مگر کمتر شخصیت میں بالکل ضم نہیں کر دیا۔ اس زمانے میں وہ ایسے مضامین بھی لکھ جاتا ہے جو بیدل کی زبان سے کبھی ادا نہیں ہو سکتے تھے، مثلاً دورِ اوّل کی ایک غزل ہے جس میں بیدل سے صاف طور پر اظہارِ عقیدت کیا ہے:؎

آہنگ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدل — عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

لیکن اسی غزل کے ایک شعر میں بڑے زور سے ایک ایسی آزاد خیالی کی بات بھی کہہ دی ہے جس کا متحمل بیدل کا اسلامی فلسفہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ شعر یہ ہے:۔

کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا! — سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ!

یہ اختلافات تقلیدِ بیدل ترک کر دینے کے بعد اور نمایاں ہو گئے ہیں۔ مثلاً بہشت پر اگرچہ غالب اور بیدل دونوں کو اعتراض ہے مگر دونوں کی صورتوں میں وجوہِ اعتراض مختلف ہیں۔ بیدل کو اقبال کی طرح بہشت میں بھی آرزوؤں کی گرمی اور انسانی زندگی کے ہنگاموں کی تلاش ہے۔ چنانچہ کہتا ہے؎

گویند بہشت است و ہمہ راحتِ جاوید — جائے کہ بداغے نہ طپد دل چہ مقام است

(کہتے ہیں کہ بہشت میں راحتِ جاودانی کا سامان ہے — مگر وہ بھی کیا جگہ ہوئی جہاں دل میں داغِ آرزو کی تپش پیدا نہ ہو)

طالبِ صحبتِ معنی نظراں باید بود — خاک در صحنِ بہشتے کہ نہ دارد آدم!

(اہلِ معرفت کی صحبت تلاش کرنی چاہئے — ایسی بہشت پر خاک پڑے جس میں آدمی نہ ہو)

بہشت پر غالب کے اعتراض کے وجوہ بہت سے ہیں مگر سب بیدل سے مختلف۔ اس موضوع پر غالب کے اردو شعروں سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ میں اس موقع پر اُس کے صرف ایک فارسی شعر کا حوالہ دوں گا۔ بیدل بہشت سے اس لئے گھبراتا ہے کہ وہاں راحت ہی راحت ہے۔ غالب کو یہ شکایت ہے کہ جنت کی راحتیں اُس معیار پر پوری نہیں اُترتیں جن کا تقاضا انسان کے آلامِ حیات کی تکلیفیں کرتی ہیں؎

جنت نکند چارۂ افسردگیِ دل — تعمیر باندازۂ ویرانیِ ما نیست!

یہیں سے بیدل اور غالب کی فطرت کا ایک اہم فرق شروع ہو جاتا ہے۔ غالب میں ایک نزئی جذبات، ایک ذکاوتِ حس، ایک لطافت ایسی ہے جو بیدل میں قطعی طور پر مفقود ہے۔ زندگی بیدل کے لئے حرکت، عمل اور پیہم تگ و دو ہے۔ سکون و راحت کو اس کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ملتی؎

غالبؔ راحت مزن کزیں کفِ خاک ہر چہ آسودہ تر فسردہ تر است

سرِ ہوائے اقامت دریں چمن مفراز بہ ہوش باش کہ تیغِ گزشتنی تیز است

غالب اس لطفِ خرام اور ذوقِ رفتار سے آشنا ہے مگر سکون و راحت کی لذتوں سے بھی یکسر بیگانہ نہیں ہے۔ راقم الحروف کو اس مسئلے پر ایک دفعہ علامۂ اقبال سے گفت گو کرنے کا موقع ملا۔ علامۂ ممدوح نے فرمایا کہ "غالب اور بیدل کی صوفیانہ شاعری میں بہت فرق ہے۔ بیدل کے تصوف میں حرکت ہے مگر غالب کا تصوف مائل بہ سکون ہے۔ بیدل میں یہ حرکی عنصر اس قدر نمایاں ہے کہ اس کا معشوق بھی صاحب خرام ہے۔"

یہ ذوقِ سکون خصوصیت کے ساتھ اس وقت واضح ہوا جب غالب نے بیدل کی تقلید بالکل ترک کر دی، ورنہ غالب کے دورِ اوّل میں اس قسم کے اشعار کی کچھ کمی نہیں سے

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

بیدل کے انداز سے روگرداں ہو کر غالب کی ذہنیت میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ ایک الگ بحث کا موضوع ہیں جن کے لئے کسی اور صحبت میں گنجائش نکالی جائے گی۔

حمید احمد خاں

اُردو

اَے زبانِ مادرِ ہندوستاں اُردو زباں اے کہ تیری مدح میں ہندی ہیں سب رطب اللّساں

تُو ہی ہندی، ہندوی، ہندوستانی بھی تُو ہی مُسلم و ہندو کی وحدت کا ہے تُو واحد نشاں

اِتحاد و ربط کی تصویر ہیں تیرے حروف تیرا ابجد ہے محبت کی سراپا داستاں

اِشتراک و جذبۂ قومی سے ہے تیرا وجود تُو ہی گنجِ مشترک ہے تُو ہی ہے قومی زباں

تجھ میں ہی قومی ترانے گائے جانے چاہئیں اے حُدی خواں تو ہوا اور قوم و وطن کا کارواں

تجھ سے غداری ہے غداری وطن اور قوم سے جو ترا دشمن ہے وہ ہے دُشمنِ ہندوستاں

تیرا جادہ اِس قدر کامل برائے اِرتقا! آسمانِ نیلگوں پر جیسے کوئی کہکشاں

تیری خدمت، فرض ہر ہندی کا ہونا چاہئے تیری سیوا سے بنے جنت نشاں ہندوستاں

یا خُدا توفیق دے ہادی کو اپنے لُطف سے

خدمتِ اُردو میں ہو بیگانہ سُود و زیاں

منوہر لال ہادی

(دفتر میونسپل کمیٹی نئی دہلی)

محبّت گرم گرم آنسو، محبّت سرد سرد آہیں!

امّی کی موت کا کتنا غم ہے۔ اس محبت پر تو کئی سال گزر گئے تھے۔ اُن خوشیوں کو کیا کہوں جو بس اپنی جھلک دکھلا کے معدوم ہو گئیں! زندگی کی اندھیری اور کٹھن وادی میں روشنی کی ایک شعاع نظر آئی۔ وہ شعاع غیر محدود تاریکیوں میں جذب ہوئی جاتی ہے جیسے سورج دھیرے دھیرے مشرق سے اُبھر کر شرق میں ڈوب جائے!

بچپن زندگی کی ساری دلآویزیوں کی آمیزش سے اپنی جوانی کے خواب کی تعمیر کرتا ہے۔ محبت اپنی ایک ادا سے، جوانی ہی نہیں، زندگی کی طویل، پُراسرار، اور شاید کبھی ختم نہ ہونے والی راہ کو غم کی سیاہ گھٹاؤں سے بسا دیتی ہے!

میں نے اپنی منگیتر کو بادلوں میں چھپ کے نکلنے والے چاند کی طرح دیکھا ہے۔ اُس کا دراز قد، اُس کے چہرے کی سُرخی، اُس کے لانبے اور کالے بال! پہلے پہل میں نے عورت میں کشش محسوس کی، تو ایک موہوم سی تصویر اپنے خیال میں بنالی۔ اوروں کے لئے ہر عورت، عورت تھی۔ میرے لئے اُس تصویر میں کچھ ایسا جادو بھرا تھا کہ دن رات اُسی کا تصور رہتا۔ رُوح پر دام پھینکے گئے اُس کو سلامت لے آیا۔ ہوس پرستی کی دعوت تھی۔ خیال کی عظمت اور رنگینی میں نے قربان نہ ہونے دی۔ زبیدہ میرے خواب کی تعبیر تھی۔ اب میں نے جانا زندگی کسے کہتے ہیں جیسے پھول بننے سے پہلے کلی مُرجھا گئی ہو، اور اُس کی پتی پتی بکھرنے کو ہو! میری زبیدہ، نوبہار میں، موت کے مُنہ میں لپکی ہوئی جا رہی ہے! میری زندگی کی شمع گُل ہونے کو ہے۔ یہ تازہ، ہری بھری شاخ کوئی دن میں سُوکھ کے رہ جائے گی۔ کائنات آخری سانس لے رہی ہے۔

نہ خدا ہے، نہ میں ہوں: نہ یہ کائنات!

ہمارے دل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، تو کیوں مجھے اُس کے پاس جانے نہیں دیا جاتا؟ اُسے یقین تو ہو، اور تسکین بھی، کہ اس کا منگیتر، اُس کے جسم کی تازگی پر نہیں، اُس پر فدا ہے۔ روتی کے سرہانے پر سر رکھ کر نہیں، وہ میری آغوش میں جان دے! ہماری محبوب چیزیں جو ہم سے چھن چکی ہوں اُن کے غم سے اُن کی یاد آئے، تو غم سے کس طرح محبت نہ کریں؟ اُس کے لئے میری زندگی ایک غم ہوگی۔ اُس کی ایک نگاہ، شاید آخری نگاہ، جو میری محبت سے متاثر ہو کر میری طرف اُٹھے!

وہ کہتے ہیں کسی اور سے بیاہ کرلوں۔ گویا عورت ایک مادّی کھلونا ہے۔ جیسے دل کی دُنیا میں رانی بنے بغیر وہ رہ سکتی ہے! اور زبیدہ ـــــ یہ سُن کر وہ جیتے جی قبر میں نہ پہنچ جائے گی!

جیسے برسات کی تاریکیوں میں زہرہ کے طلوع سے ہلکی ہلکی ضَو دمکتی ہو، زبیدہ کا سراپا میری زندگی کی کالی رات میں ایک نورانی تارا ہے جس کی دھیمی دھیمی، خنک روشنی، سکون، دوستی، کے ہزار جام ــ [illegible]

تماشا

(ایک گیت)

دُنیا ایک تماشا

بس

دُنیا ایک تماشا

پھول کھِلے کھِل کر مُسکائے — اُڑتا گاتا بھونرا آئے

نازک کلیوں میں سو جائے

پائے من کی آشا

بس

دُنیا ایک تماشا

گرم ہوا کے جھونکے آئیں — پھول گریں۔ گِر کر مُرجھائیں

بھونرے کے بھی پر جل جائیں

نکلے اُس کا لاشا

بس

دُنیا ایک تماشا

کیوں کرتے ہو عیش پرستی — رنگ بدلتی ہے یہ بستی

آج بلندی اور کل پستی

تولا پل میں ماشا

بس

دُنیا ایک تماشا

احمد ندیم قاسمی بی اے

نوائے شاعر

نفس کے ساز کا ہر تار گو شکستہ ہے　　ہنوز نغمۂ دلدوز اس سے پیدا ہے

وہ نغمہ جس سے زمانے میں حشر برپا ہے　　وہ نغمہ جس پہ عنادِل کو رشک آتا ہے

وہ نغمہ جس میں ہے مضمر حیاتِ نَو کا پیام　　وہ نغمہ مردہ دلوں کے لئے جو عیسے ہے

وہ نغمہ جس میں ہے صہبائے تُند کی تیزی　　جو مثلِ برق ہر اک رگ میں دوڑ جاتا ہے

وہ نغمہ جس سے تموج ہے قلبِ ساحل میں　　وہ نغمہ جوش در آغوش جس سے دریا ہے

وہ نغمہ جس سے قدم تیز تیز اُٹھتے ہیں　　وہ نغمہ جس کی ہر اِک تان ہمت افزا ہے

وہ نغمہ ہوتی ہے تخلیق آرزو جس سے　　جو نغمہ روح کو اور دِل کو گدگداتا ہے

وہ نغمہ حسن کو جو آشنائے ناز کرے　　وہ نغمہ عشق میں جس سے نیاز پیدا ہے

سُنا رہا ہے پیام اپنا شاعرِ دانا　　سُنو کہ تم کو بھی اس گلستاں میں جینا ہے

چمن میں تم کو ضرورت ہے چار تنکوں کی　　تمہیں بھی اپنا یہاں آشیاں بنانا ہے

نہاں ہے جوہرِ مقصد عمل کے معدن میں　　عمل کرو جو گہر کی تمہیں تمنا ہے

تمہیں بھی ہوش کبھی ہوش آئے گا کہ نہیں
خبر بھی ہے کہ زمانے کی اب روش کیا ہے

جب کمبل ہٹا ــــ ؟

تماشا گاہِ عالم میں ہر روز ایسے عجیب وغریب واقعات ہوتے رہتے ہیں جو کوئی افسانہ نویس اپنے تخیل کے زور سے پیدا نہیں کر سکتا۔ فوق العادت واقعات جن کا آسانی سے یقین نہیں آسکتا۔ اور جن کے آغاز سے واقف ہو کر، انسان انجام کو پانے کی سعی کرتا ہے مگر بعض اوقات تمام عمر کی انتھک کوششوں سے بھی معلوم نہیں کر سکتا اور یہ خیال اُس کے لئے ایک مستقل خلش بن جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ مجھے بھی پیش آیا۔

۳۔ اَپ فرنٹیئر میل لاہور کے پلیٹ فارم کو چھوڑ رہی تھی جب میں لپک کر ایک درمیانہ درجہ کے ڈبہ میں داخل ہوا۔ حواس درست ہونے پر میں نے بیٹھے ہوئے مسافروں پر نظر دوڑائی۔ بظاہر تمام ڈبہ خالی تھا۔ مگر غور سے دیکھنے پر اُس کے کونے میں دبکا ہوا ایک آدمی نظر آیا۔ بادی النظر میں وہ بوڑھا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے بڑھ کر گاڑی کی بتیاں روشن کر دیں۔ میری نگاہوں نے اندھیرے میں بھی دھوکا نہ کھایا تھا، وہ واقعی ایک بوڑھا آدمی تھا، پتلا، دُبلا، اُس کے سر اور ڈاڑھی کے بال سفید تھے۔

گاڑی شاہدرہ کے قریب پہنچ رہی تھی۔ اس وقت اس نے اچانک مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا تم کرامات پر یقین رکھتے ہو؟"

گورنمنٹ کالج لاہور کی فورتھ ایر کلاس کا طالب علم ہونے کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کرامات ایسی لغویات پر یقین رکھوں یہ اگلے وقتوں کی من گھڑت کہانیاں ہیں اور ان پر ضعیف الاعتقاد بوڑھے لوگ ہی یقین کر سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔

اس نے پھر سوال کیا "تم شاید گورنمنٹ کالج کے طالب علم ہو؟"

اس سوال پر مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ آخر اُسے کس طرح معلوم ہوا کہ میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم ہوں! میں ابھی اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ اُس نے ایک اَور سوال کیا "اور تم فورتھ ایر میں پڑھتے ہو؟"

میرے اللہ! یہ کیا غضب ہے آج سے پہلے کبھی میری اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر اُسے کس طرح معلوم ہو گیا کہ میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم ہوں اور فورتھ ائیر میں پڑھتا ہوں۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ میرے حواس مختل سے ہو رہے تھے اور وہ میری اس پریشانی سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُس کے چہرہ پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی لیکن شاید اس کی ابھی تسلی نہ ہوئی تھی چنانچہ اس نے ایک تیسرا سوال کیا "مسٹر اعجاز! آخر تم اتنے کھوئے کیوں گئے ہو؟"

"یہ میرا نام بھی جانتا ہے ــــ گورنمنٹ کالج کا طالب علم ــــ فورتھ ایر کلاس ــــ اعجاز۔ یہ سب

باتیں جانتا ہے ـــــ سب۔ مگر کس طرح؛ کیونکر؟" میں نے اعترافِ شکست کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس نے سابقت کی اور کہا "اس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے مسٹر اعجاز۔ شاید تم سمجھتے ہو کہ یہ بھی کوئی کرشمہ ہے، شاید تم باوجود منکر ہونے کے یہ سوچ رہے ہو کہ یہ بھی کوئی کرامت ہے۔ مگر نہیں، میرے دوست۔ یہ کرامت نہیں اور نہ میں اس فیضانِ الٰہی سے بہرہ ور ہوں، یہ محض آنکھیں کھول کر دُنیا میں رہنے کی برکت ہے"۔

میں نے نہایت عاجزانہ لہجے میں کہا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"

"ذرا تم اپنے بائیں طرف نگاہ ڈالو۔ شاید جان جاؤ"

میں نے اُس کے کہنے کے مطابق عمل کیا مگر پھر بھی کچھ نہ سمجھا اور اس بات کا اظہار میں نے اپنی خاموش نگاہوں سے کر دیا۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا "تمہاری جیب میں ایک کتاب تھی جو تم نے روشنی کرنے کے بعد گدیلے پر رکھ دی تھی۔ ذرا اُس کی جلد پر تو نظر ڈالو۔"

مَیں نے تعمیل کی۔

"اعجاز ـــــ فورتھ ایر ـــــ گورنمنٹ کالج لاہور؛" کتاب کی جلد پر یہ الفاظ پڑھ کر میں مسکرایا اور اس سے کہا "سچ پوچھئے تو میں تو اسے آپ کی کرامت ....

اُس نے میرا فقرہ مکمل نہ ہونے دیا اور بولا "مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بھی کرامات پر یقین نہیں رکھتا۔ تم اُسے خللِ دماغ کا نام دو یا کوئی اور۔ مگر میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ دُنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے ریاضت کے بل پر ایک ایسی طاقت حاصل کر لی ہے جس سے وہ موت کے سوا ہر ایک چیز پر قادر ہو جاتے ہیں۔

گاڑی شاہدرہ پر رُکی۔

میں نے کہا "میں حیران ہوں کہ اس قدر فہم و بصیرت کے باوجود بھی آپ ایسی باتوں پر یقین رکھتے ہیں"۔

اس نے جواب میں کہا "سنو! میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اور اس کی سچائی کے متعلق شاید اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ یہ میرا چشم دید واقعہ ہے۔ سُنا سنایا نہیں"۔

اب مجھے اس کونے والے بُڈھے سے کچھ دلچسپی سی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے بڑے اشتیاق سے کہا "فرمائیے"۔

"ذرا گاڑی کو حرکت میں آلینے دو"۔

چند منٹ رُکنے کے بعد گاڑی شاہدرہ سے آگے بڑھی اور اُس نے اپنا بیان یوں شروع کیا "اس وقت میں تحصیل پالم پور میں تحصیلدار کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اصل واقعہ سے کچھ مہینے پہلے میں دَورہ پر ایک گاؤں کے باہر خیمہ لگا کر ٹھہرا ہوا تھا۔ میرے قیام کے دَوران میں وہاں ایک سادھو میرے خیمہ سے کچھ دُور ایک درخت کے نیچے آکر اُترا۔ تم جانتے ہو کہ گاؤں کے لوگ کس قدر سیدھے سادے

اور اوہام پرست ہوتے ہیں۔ اس کی آمد کی خبر قریب کی بستیوں میں جنگل کی آگ کی سی تیزی سے پھیل گئی اور ضعیف الاعتقاد مرد وزن کا انبوہ اُس کے اردگرد اکٹھا ہونا شروع ہوا۔

"وہ ایک ہٹا کٹا آدمی تھا ــــ اُس کی آنکھیں بڑی موٹی موٹی اور سُرخ تھیں جب وہ کسی کی طرف دیکھتا تو یُوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ دِل کی گہرائیوں تک اُتر گیا ہے اور تمام پوشیدہ رازوں سے واقف ہو گیا ہے۔ بدن پر راکھ ملے، جٹوں میں خاک ڈالے دھونی رمائے، وہ سادھو کسی کو اولاد، کسی کو شفا، کسی کو دولت تقسیم کرتا رہتا تھا۔ میں اپنے خیمہ میں بیٹھا یہ تمام منظر دیکھتا رہتا۔

اس سادھو کے متعلق ایک روایت زبان زدِ عام تھی اور وہ یہ کہ اگر کسی وقت بھی کوئی اُس کے پاس جائے اور یہ کہے کہ مجھے فلاں فلاں قسم کا کھانا درکار ہے۔ تو سادھو چند ہی منٹ میں وہ چیزیں مہیا کر دیتا۔ اُس کی یہ کرامت اس قدر مشہور ہو گئی کہ شدہ شدہ ڈپٹی کمشنر صاحب اور کپتان صاحب پولیس کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ ایک دن مجھے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کی طرف سے حکم نامہ موصول ہوا کہ وہ میرے علاقہ کا دورہ فرمائیں گے نیز یہ کہ وہ اور کپتان صاحب اُس سادھو سے بھی ملاقات کریں گے۔ مقررہ دِن دونوں صاحب تشریف لے آئے۔ کپتان صاحب تازہ تازہ ولایت سے تشریف لائے تھے اس لئے اُنہوں نے اردگرد کے چند تھانوں کا معائنہ شروع کر دیا۔ اس سے فراغت پانے کے بعد وہ سادھو کی جھونپڑی کی طرف چلے۔ میں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔

وہاں پہنچ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے سادھو کو اپنے جھونپڑے کے باہر بیٹھے ہوئے پایا اور یہ کہتے ہوئے سنا کہ "مجھے آپ کی آمد کی اطلاع مِل چکی تھی اور میں آپ ہی کا منتظر تھا۔ آپ میرا امتحان لینے آئے ہیں نا۔ فرمایئے۔ کس قسم کا کھانا حاضر کیا جائے؟"

کپتان صاحب نے ولایت کے مشہور ہوٹل "رٹز" (RITZ) کی بنی ہوئی خاص پڈنگ کی فرمائش کی۔

سادھو نے کہا "بہت اچھا۔ لیکن سفر لمبا ہے۔ اس لئے آپ کو چند منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔"

پندرہ منٹ کے بعد سادھو نے دونوں صاحبوں کو اپنی جھونپڑی کے اندر مدعو کیا۔ دو پلیٹیں چارپائی پر رکھی ہوئی تھیں اُن کے ساتھ دو کھانا کھانے کے رُومال اور دو چمچے تھے۔ پڈنگ بالکل وہی تھی ــــ وُہی خوشبو، وُہی مزا اور بالکل تازہ پلیٹوں رومالوں اور چمچوں پر اُسی ہوٹل کا نام کندہ تھا ــــ کپتان صاحب کی اُس ہوٹل کے مالک سے واقفیت تھی اس لئے اُنہوں نے اُسی دن ایک بحری تار اُس کے نام روانہ کیا کہ آیا اُس روز اُس نے اُس قسم کی پڈنگ بنا رکھی تھی نیز یہ کہ کسی ہندوستانی نے بھی وہ خریدی۔ جواب ملا "ہاں ــــ دو ہندوستانیوں نے دو پلیٹیں، پڈنگ، دو چمچے اور دو رومال خریدے تھے۔"

اس واقعہ کی صحت کے متعلق اب بھی ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے اُن الفاظ سے پتہ چل سکتا ہے جو اُنہوں نے اُس دن میری "معاینہ کی کتاب" میں درج کیے۔

رفتہ رفتہ میں بھی سادھو کی رُوحانیت کا قائل ہو گیا اور ہفتہ عشرہ میں ایک دفعہ ضرور اُس سے ملاقات کرتا۔
چند ماہ اسی طرح کٹ گئے ایک دن سادھو کی زیارت کے لئے میں پالم پور سے پاپیادہ روانہ ہُوا۔ وہاں سے سادھو کی جھونپڑی چار یا پانچ میل کے فاصلے پر تھی۔ کوئی ڈیڑھ دو میل چلنے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے کوئی میرے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ میں نے اُس طرف نگاہ پھیر کر دیکھا۔ پچاس فٹ کے فاصلہ پر ایک اور سادھو چلا آرہا تھا۔ مجھے اُس پر کچھ شک سا پیدا ہُوا۔ میں نے سوچا کہ اُس کے پاس ناجائز افیون وغیرہ ضرور ہوگی اس لئے اُسے گرفتار کر لینا چاہئے۔ میں نے اپنی رفتار آہستہ کر دی تاکہ وہ میرے قریب پہنچ جائے۔ میں سر جھکائے بے فکری کے عالم میں اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ یکایک قدموں کی چاپ بند ہو گئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اُس کے بعد میری نگاہیں سامنے کی طرف اُٹھیں مجھ سے پچاس قدم آگے وہی سادھو جا رہا تھا۔ میں نے تیز تیز چلنا شروع کیا تاکہ آگے بڑھ کر اُسے گرفتار کر لوں۔ میرا شک یقین کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ اُس کے پاس ضرور کوئی ایسی چیز ہوگی جبھی تو وہ مجھ سے کترا رہا ہے۔ پگڈنڈی کا ایک موڑ مڑ کر میں نے دیکھا کہ وہ غائب تھا اور کسی کے چلنے کی آواز میرے پیچھے سے آرہی تھی۔

کونے والے بڈھے نے یہ داستان سناتے ہوئے میرے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار دیکھ کر کہا "تم بے شک مُسکراؤ. بڑی خوشی سے ایک زوردار قہقہہ بلند کرو مگر جو واقعہ میں تمہیں بتا رہا ہوں تم آج بھی دھرسالہ جا کر پولیس ریکارڈ میں اُس کا ذکر دیکھ سکتے ہو"

میں نے کہا "میں نادم ہوں، میرا مقصد آپ کو رنج پہنچانا نہ تھا"

اُس نے سلسلۂ کلام کو جاری کرتے ہوئے کہا "اب تو میرے بھی اوسان خطا ہونے لگے کہ یا الٰہی یہ انسان ہے یا کوئی جن بھوت جو ایک لمحہ میں میرے پیچھے پیچھے ہوتا ہے اور دوسرے میں مجھ سے آگے ظاہر ہو جاتا ہے، میں نے اور تیز تیز چلنا شروع کیا مگر وہ پھر بھی کبھی میرے آگے آجاتا کبھی پیچھے ہو جاتا۔ اس وقت میری حالت قابلِ رحم تھی۔ تھک ہار کر میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اب وہ خود ہی میرے پاس آگیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "کیوں جناب۔ آپ تو مجھے گرفتار کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور اب آپ بیٹھ گئے۔ اُٹھیے نا کر لیجئے گرفتار!"

مَیں نے گڑگڑا کر اپنے قصور کی معافی مانگی۔

اس نے سوال کیا "تم اُس جھونپڑے والے سادھو کے درشن کو جا رہے ہو نا؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگا "وہ بڑا بدمعاش ہے۔ اُس نے دو معصوم رُوحوں کو قید کر رکھا ہے۔ کتنا ہی عرصہ میں اُس کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں مگر وہ مجھ سے بچ کر نکل جاتا رہا۔ آج اُس کا آخری دن ہوگا"

"بدمعاش ہے! —— آج اُس کا آخری دن ہوگا!"

"جاؤ ملاقات کر لو شاید پھر کبھی اُس سے نہ مل سکو۔"

میں نے تعمیل کی، جب میں جھونپڑے کے اندر پہنچا، سادھو جی مہاراج مجھے دیکھ کر کہنے لگے "آج آخری بار بابا کے درشن کر لو۔"

دس بارہ منٹ کے بعد میں نے رخصت چاہی۔ خلافِ معمول آج سادھو جی مہاراج مجھے کٹیا کے دروازہ تک پہنچانے کے لئے میرے ساتھ ہی چلے آئے۔ دروازہ کے باہر دوسرا سادھو کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آگ کے شرارے نکل رہے تھے۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔

"بدمعاش، پاجی، مردود، آج میں نے تجھے پا لیا ہے۔ اب تو کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتا۔" اُس نے اپنی چلم کٹیا والے سادھو پر پھینکتے ہوئے کہا "یہ لے اور نرگ کی جوالا میں اپنے کرموں کا پھل چکھ۔" چلم کے لگتے ہی کٹیا والے سادھو کے سر سے خون کا فوارہ بہ نکلا اور اُس نے گھاس پر تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اس سے فراغت پا کر سادھو روانہ ہونے لگا۔ میں نے بڑھ کر عرض کی۔ "مہاراج! آپ نے ایک قتل کیا ہے . . . . . ."

اُس نے میری بات کاٹ کر کہا "نہیں۔ میں نے دو معصوم رُوحوں کو اُس خبیث کے چنگل سے آزاد کر دیا ہے۔"

"جی ہاں، مگر قانون . . . ."

"ہمارے لئے کوئی قانون وانون نہیں۔"

"ست بچن مہاراج۔ مگر مجھ غریب پر تو آفت آ جائے گی۔ اوّل تو اُن کا قاتل میں ہی ٹھہرایا جاؤں گا اور بہ فرضِ محال میں سچے حالات بتا بھی دوں اور اُن پر یقین بھی کر لیا جائے تو بھی مجھے اس الزام میں دھر لیا جائے گا کہ ایک سرکاری افسر ہوتے ہوئے میں نے آپ کو گرفتار کیوں نہیں کیا۔ میرے بال بچے ہیں مہاراج —— معصوم بال بچے۔"

اُس کو رحم آ گیا۔

"سادھو کسی کو دُکھ نہیں دیا کرتے۔ ہم تمہیں کوئی دُکھ نہیں دینا چاہتے اور نہ کسی الزام میں پھنسانا چاہتے ہیں۔ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

"مہاراج۔ بس اتنا کہ میں پالم پور کے تھانہ سے پولیس کو بُلا لاؤں اور آپ پولیس والوں کے سامنے اصل بات بیان کر دیں۔"

"اچھا۔ تمہاری خاطر ہمیں یہ منظور ہے۔" اُس نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہم اُس درخت کے نیچے بیٹھتے ہیں، تم پولیس کو بُلا لاؤ۔"

میں وہاں سے روانہ ہو گیا اور تھانے میں پہنچ کر رپٹ درج کرائی۔ ایک سب انسپکٹر، ایک حوالدار اور دو سپاہی میرے ہمراہ [illegible] کی طرف

روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچنے پر دیکھا کہ سادھو حسبِ وعدہ اُسی درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ پولیس نے اُس کا بیان لکھا۔

بیان لکھے جانے کے بعد اُس نے پوچھا" بس۔ بیان لکھ لیا۔ اب میں جاسکتا ہوں؟"

تھانیدار نے کہا" نہیں مہاراج آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا پڑے گا ہم کپتان صاحب کو تار دے کر بلالینگے۔ پھر آپ بڑی خوشی سے تشریف لے جائیگا"

"کتنے دن میں تمہارے کپتان آجائیں گے؟"

"کوئی ایک دو دن میں"

"اتنا عرصہ ہم نہیں ٹھہر سکتے"

اب تھانیدار کی منت سماجت کرنے کی باری تھی۔

تھانیدار نے عاجزانہ لہجے سے کہا" مہاراج! اگر آپ چلے گئے تو ہم سب کو ملازمت سے جواب مل جائے گا"

"اچھا"

تھانیدار میں جرأت نہ تھی کہ اُس کو ہتھکڑی پہنا سکے۔ سادھو ہمارے ساتھ چل پڑا تھا۔ تھانہ میں پہنچ کر ایک ضروری تار کپتان صاحب کو روانہ کیا گیا اور لکھا گیا کہ فوراً تشریف لے آیئے۔ دُوسرے دِن کپتان صاحب آگئے۔ تھانیدار نے کُل ماجرا بیان کیا اور اس کی میں نے تصدیق کی۔ سادھو حوالات میں تھا۔ کپتان صاحب اُس کے پاس پہنچے۔ اُس نے بھی وہی بیان دیا جو اس سے پہلے دے چکا تھا۔ گفتگو کے خاتمہ پر سادھو نے پھر اپنا سوال دُہرایا" اب میں جاسکتا ہوں؟"

کپتان صاحب نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا" اب آپ کہاں جائیں گے۔ سادھو جی مہاراج! یہیں رہنا پڑے گا —— یہیں اور پھر جیلخانہ میں پھانسی کے تختے تک تکلیف فرمانا ہوگا۔ سمجھے آپ!"

سادھو نے کہا" نہ جانے دو" اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

تھانیدار چلّایا" وہ جا رہا ہے"۔ میں بھی چلّایا" وہ جا رہا ہے" سپاہیوں نے بھی بیک آواز کہا" وہ جا رہا ہے"۔

کپتان صاحب نے کہا" حماقت" اور حوالات کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے" وہ کہیں نہیں جا سکتا"

گاڑی رُکی۔

کونے والے بُڈھے نے کہا" کونسا اسٹیشن ہے؟"

میں نے جواب دیا" گوجرانوالہ"

اُس نے گھبرا کر دُہرایا" گوجرانوالہ" اور اپنا ہینڈ بیگ سنبھال گاڑی سے باہر نکل یہ جا وُہ جا۔

"تعجب کمبل ہٹا —— پھر کیا ہوا؟" اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اسی سوال کی خلش میرے دِل میں رہتی ہے۔

التجا

(۱)

چھیڑ ایسی ہی کوئی رندوں کے پیمانے میں ہو! — جس سے سرشارِ یقیں ہو جو بھی میخانے میں ہو!
عشق کی ہنگامہ آرائی ہے حسنِ شوخ سے — یادِ لیلیٰ کارفرما اپنے دیوانے میں ہو

(۲)

بے نیازِ بیکسی بیگانۂ حرماں بنیں! — ہم سراپا اک تمنائے جنوں ساماں بنیں!
دیکھتے ہی بھانپ لیں تقدیر کی اُفتاد کو — روشناسِ جوہرِ آئینۂ امکاں بنیں!

(۳)

بیخودی ایسی کہ جو ہو مطلعِ مہرِ شعور! — توڑ ڈالے اک نظر میں جو طلسماتِ ظہور!
سرمۂ تسخیر وہ ہو چشمِ بینا کے لئے! — جو حقیقت بیں ہو نفیِ غیب اثباتِ حضور!

(۴)

تشنہ کاموں کو مئے پندار پینے کو ملے! — ہم تہی جاموں کو آخر کچھ تو جینے کو ملے
خلعتِ نَو کے الٰہی ہم بھی ہیں اُمیدوار! — آج تک تو چاک ہی کمبخت سینے کو ملے

امینِ حزین سیالکوٹی

محفلِ ادب

ایک شہزادہ کی شہنشاہیت سے نفرت

(مشہور مدبّر بلیتھو کے خیالات)

موجودہ دَور میں نہ صرف عوام بلکہ بادشاہ اور شہزادے بھی شہنشاہیت کو ایک لعنت سمجھتے ہیں۔ شہنشاہیت کے خلاف یورپ کی رائے عامہ کس قدر بیدار ہو چکی ہے اس کا اندازہ مسٹر بلیتھو کے مندرجۂ ذیل خیالات سے ہو سکتا ہے جو آپ نے شہنشاہ ایڈورڈ کی تخت سے دستبرداری کے سلسلہ میں شائع کئے ہیں۔ جس میں آپ نے صاف الفاظ میں یہ ظاہر کیا ہے کہ شاہ ایڈورڈ کی دست برداری کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ جمہوری خیالات رکھتے تھے۔ مسٹر بلیتھو کے خیالات ملاحظہ ہوں:۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں جب برطانیہ عظمیٰ کی سلطنت کے ولیعہد میدانِ جنگ سے واپس آئے تو وہ قدیم نظمِ زندگی کے خلاف باغی بن چکے تھے۔ اُس وقت کسی کو یہ تغیر محسوس نہیں ہوا اس لئے کہ قدامت کے خلاف نوجوانوں کی اس قسم کی بغاوت اس زمانہ میں ایک بالکل عام بات تھی۔ ہزارہا نوجوان میدانِ جنگ سے ایک ہی ذہنیت لے کر واپس آئے تھے۔ اُنہوں نے زندگی کے واقعات کی انتہا درجہ تیز رفتار اور موت کی سرعت کو دیکھا تھا اب وہ اس کے لئے تیار نہ تھے کہ کسی دفتر یا کارخانہ میں خاموشی کے ساتھ کام کر سکیں۔

جنگ کے بعد لوگوں کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ ہزارہا گھروں کے اندر یہ بغاوت جاری ہے مگر اس کی کسی کو خبر نہ تھی کہ خود ولیعہدِ سلطنت بھی ان باغیوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ مگر ایسا کیوں نہ ہوتا آخر وہ بھی اور نوجوانوں کی طرح ایک نوجوان تھے۔ اپنے گھر پر وہ اپنے والدین کی سخت نگرانی میں رہے۔ کالجوں اور مدارس میں ان کی سیرت کے ہر پہلو کی نگرانی کی جاتی تھی اور اس طرح نوجوان شہزادہ قدیم خیالات کی زنجیروں میں بندھا ہوا پرورش پاتا رہا۔ لیکن جنگِ عظیم شروع ہوئی اور اس نے ان زنجیروں کو توڑ ڈالا۔ فرانس میں شہزادہ کے اندر ایک نئی زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور ان کے خیالات میں ایک عجیب آزادی نے جنم لیا۔ مسٹر بلیتھو لکھتے ہیں کہ جنگ نے قدیم اور جدید نسلوں کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بادشاہ اور اُن کے ولیعہد کے درمیان بھی خیالات اور سیرت کی ایک خلیج پیدا ہو گئی۔ جنگ سے واپس آ کر شہزادہ نے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ جو دربارِ شاہی کی قدیم روایات سے بہت بعید تھا۔ شاہی درباروں کے قدیم طریقوں سے شہزادہ نے بھاگنا شروع کیا اور قدیم رسم و رواج اور قدیم صحبتوں سے وہ اُکتانے لگے۔ اپنے دادا کی طرح شہزادہ نے اپنی صحبت کو خاص خاص دوستوں تک محدود کر لیا اور انہی میں اُن کو تفریح اور خوشی حاصل ہونے لگی۔

رفتہ رفتہ قدیم سوسائٹی نے شاہزادہ کی اس عادت کو ناپسند کرنا شروع کیا۔ ولیعہد بڑے بڑے رؤسا کے گھروں میں مہمان ہو کر قدامت پسند جماعتوں کے ممتاز افراد سے ملنا پسند نہ کرتے تھے اور اُن کے مزاج میں جس قدر آزادی بڑھتی گئی وہ اپنی عادت میں بھی سخت ہوتے گئے۔ چنانچہ وہ اکثر رسمی صحبتوں سے روگرداں ہونے لگے۔

حقیقت یہ تھی کہ جنگ نے شہزادہ کی زندگی کے معیار کو بدل دیا تھا اور اُنہوں نے اپنی زندگی کا معیار ایسا قائم کر لیا تھا جس سے قدیم اور رسم و رواج کے پابند افرادِ قوم کو تکلیف ہوتی تھی مگر یہ معیارِ زندگی وہی تھا جو اس زمانہ کے تمام نوجوانوں کا تھا۔ جس طرح شاہزادہ کے جنگ سے تھکے ہوئے بہت سے ہمعصر محسوس کرتے تھے اسی طرح شاہزادہ کے اندر بھی ایک ایسا احساس پیدا ہو گیا کہ وہ قدیم رسم و رواج سے گھبرانے لگے۔ درباریوں کے مشوروں کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اور ان کو یقین ہو گیا کہ یہ پرانے زمانے کے لوگ ہی دُنیا کے مصائب کا باعث ہوتے ہیں۔

شہزادہ کے دل میں محبت اور دوستی کے جذبات جن لوگوں کے لئے پیدا ہوئے وہ یا تو جنگ سے واپس آئے ہوئے بے روزگار سپاہی تھے یا فلاکت زدہ غربا۔ یا نو آبادیوں کے بے فکرے جن سے شاہزادہ کو اپنی سیاحتوں میں بارہا ملنے کا موقع ملا تھا۔

رفتہ رفتہ شاہزادہ کے جمہوری رجحانات ساری دُنیا کو معلوم ہونے لگے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر نظریں پہنچنے لگیں۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اس فرق کو سمجھ لیا کہ ایڈورڈ ہفتم ہمیشہ اپنی رعایا کو رعایا کے نام سے یاد کرتے تھے اور شاہ جارج نے اپنی رعایا کو امیری قوم کے نام سے یاد کیا۔ اور شاہ ایڈورڈ نے تخت نشین ہو کر ان کو ہم جنس انسانوں کے نام سے موسوم کیا اور شاہی زاویۂ نظر کا یہ تدریجی فرق ساری دُنیا نے محسوس کیا۔

شاہزادہ کی طبیعت میں سب سے بڑا انقلاب ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوا جب وہ ایک دفعہ خیراتی باورچی خانوں کا معائنہ کرنے گئے اور وہاں اُنہوں نے ہزارہا بھوکوں کو کھاتے دیکھا۔ اُنہوں نے اپنی عمر میں پہلی دفعہ انسانوں کی اس مصیبت کا اندازہ کیا جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ لغور ان بھوکوں کی حالت کو دیکھتے رہے اور اس کے بعد اُنہوں نے بے روزگاروں کی حالت کو سُدھارنے کے لئے اپنے اوقات وقف کر دیئے۔ تقریریں کرتے تھے۔ خیراتی کاموں میں حصہ لیتے تھے اور اُن وزرا پر سے الزامی جرح کرتے تھے جن کو وہ قدامت پسند سمجھ کر ناپسند کیا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اب وہ شاہی درباروں کے رسم و رواج اور قدیم روایات سے گھبرانے لگے۔ بلکہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ جب وہ جنوبی افریقہ سے واپس آئے تو اُنہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر ان کو ذاتی طور پر آزادی نہ دی جائے گی تو وہ ولیعہدی سے دست بردار ہو جائیں گے اور کسی نو آبادی میں جا کر سکونت اختیار کر لیں گے۔

مگر قدامت کی قوی طاقتیں ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں حتیٰ کہ گھوڑے پر سوار ہونے اور شکار کھیلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ ہوائی جہازوں میں تنہا سفر کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ ایک دفعہ تو اُنہوں نے صرف اس ممانعت کے خلاف احتجاج کرنے

کے لئے تنہا سفر کیا۔ غرض وہ سلطنت کے وزراء کو خصوصاً آرچ بشپ کو اپنی آزادی کا دشمن سمجھنے لگے اور یہ سمجھنے لگے کہ یہ ایک سازش ہے تاکہ ان کی آزادی کو محدود کیا جائے۔ اُن کی فطرت میں ضد پیدا ہو گئی اور وہ یہ کوشش کرنے لگے کہ ان (بوڑھوں) کو ہر معاملہ میں شکست دی جائے۔ ان کی تقریروں میں تلخی پیدا ہو گئی۔ کان کنوں کی بدحالی کے متعلق حکومت کی بے پروائی پر اُنہوں نے صاف صاف تنقید شروع کر دی۔ وہ ایک دفعہ برطانیہ کے سب سے بڑے جہاز 'کوئن میری' کا معائنہ کرنے گئے اور حکومت کے اراکین کو یہ سخت صدمہ پہنچایا کہ اس عظیم الشان جہاز کی تیار کرنے والی دنیا کا توازن اُن غرباء کی گندہ آبادیوں سے کیونکر قائم رکھا جائے جو ابھی ہم دیکھ کر آئے ہیں۔

ان حالات میں وہ تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اور جب اُنہوں نے تختِ سلطنت پر قدم رکھا تو وہ بہت بے یار و مددگار تھے۔ مسٹر بلیتھو لکھتے ہیں کہ ان کو ایسے وقت تاج و تخت حاصل ہوا جبکہ ملک سویا ہوا تھا۔ اگر وہ کسی جنگ یا کسی نازک سیاسی زمانہ میں تخت نشین ہوتے تو وہ ان توہمات سے اپنے کو آزاد کر لیتے جو ان کو گھیرے ہوئے تھے مگر وہ ایسے زمانہ میں برسرِ اقتدار آئے جبکہ وہ پرانے اور نسبتہً تھکے ہوئے لوگوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ان کا وزیرِ اعظم ایسا شخص تھا جو صرف احتیاط اور بے عملی چاہتا تھا۔ اور آرچ بشپ ان کے مخالف سمجھے جاتے تھے۔

اس زمانے سے کچھ پہلے مسز سمپسن سے شاہزادہ کی دوستی شروع ہوئی تھی۔ پس جس وقت وہ تخت نشین ہوئے اسی وقت سے قدامت پسند حلقوں میں سرہائے جانے لگے اور مُنہ بنائے جانے لگے جب انہوں نے اپنے محل کے قدیم ملازمین کو الگ کر کے نئے ملازم رکھنے شروع کئے تو لوگوں نے اور بھی زیادہ اعتراض کیا۔ غرض یہ کہ ان کی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔ ہر طرف سے وہ ایسی فضا میں گھرے ہوئے تھے جو ان کی دماغی فضا کے خلاف تھی۔ جب ان کی شادی کا سوال پیدا ہوا تو پھر اُنہوں نے سمجھا کہ ان کی شخصی آزادی پر حملہ کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ضد شروع کی اور اس ضد میں غلطیاں کرتے چلے گئے اور باوجودیکہ یہ معاملہ بہت ہی خفیف اور ذاتی تھا اور ضد بہت سخت تھی مگر کوئی شخص ان کے ارادوں کی دیانت کو مشتبہ نہیں سمجھتا۔ درحقیقت تخت و تاج سے ان کی دست کشی جاننے والوں کے لئے کوئی عجیب بات نہ تھی۔ مسز سمپسن کا نام آنے سے پہلے ہی لوگ سمجھتے تھے کہ ایک دن ان کو دست بردار ہونا پڑے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنے منصب کی پابندیوں کو گوارا نہ کریں گے۔

آئندہ کیا ہو گا خدا ہی کو معلوم ہے۔ مگر مسٹر بلیتھو کا خیال یہ ہے کہ ڈیوک آف ونڈسر ایک ایسے ویرانہ میں چلے گئے ہیں جہاں وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے کہ تنہائی کے سوا بھی کوئی اور صورت زندگی بسر کرنے کی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ ان کی معروف طبیعت اور زندگی کے معاملات سے ان کی دلچسپیاں اور بحیثیت ایک شاہزادہ کے ان کی تربیت شادی اور محبت کے محدود دائرے کے لئے کبھی موزوں ثابت نہ ہو گی۔

بس یہی نہیں

امرت دہارا اور اُس کے مرکبات (لوشن - بام - مرہم وغیرہ) بھی ماہ مارچ میں ¾ قیمت پر مل سکتے ہیں

ایک اور نرالی سکیم

... کچھ روپیہ جمع کروا دینے سے آپ سال بھر جب جب چاہیں اپنے اور اپنے خاندان کے علاج کیلئے اسی رعایتی قیمت پر حسب ضرورت جو دوا چاہیں تب تک منگوا سکتے ہیں جب تک آپکا روپیہ ...

بڑی فہرست ادویات و کتب اور رسالہ مخصوصہ مہربانی مفت منگوائیں

ڈاک و تار کا پتہ - امرت دھارا لاہور

شفا
شفا
وہ لوگ استعمال کرتے ہیں
جو آئے دن معدے کی تکالیف میں مبتلا رہتے ہوں۔ جنہیں ہمیشہ پیٹ میں درد رہتا ہو۔ غذا کے بعد متلی ہوتی ہو۔ پاخانہ کبھی وقت پر نہ آتا ہو بعض اوقات دست لگ جاتے ہوں ریح اور باؤ گولہ کی وجہ سے پیٹ تنا رہتا ہو۔ تھوڑا کھانے سے پیٹ بھر جاتا ہو صبح اُٹھتے وقت مُنہ بدذائقہ لیسدار رطوبت سے بھرا رہتا ہو۔ غذا کے بعد بدن گرم اور ہلکا ہلکا بخار معلوم ہو۔ مراق یا مالیخولیا کے دورے ستاتے ہوں۔ دل و دماغ تبخیرِ معدہ و جگر کی وجہ سے متاثر ہو جاتے ہوں۔ تبخیر کی وجہ سے نیند نہ آتی ہو اور ساری رات آنکھوں میں گزار دیتے ہوں
یا
جو لوگ آئے دن سفر کے عادی ہوں۔ جنہیں وقت اور بے وقت کھانا ملے اور غذا کی بے قاعدگی کی وجہ سے اکثر متلی، پیٹ درد، بدہضمی ہیضہ اور دیگر ایسی تکالیف میں مبتلا رہتے ہوں۔
علاوہ ازیں
چونکہ شفا آب، ہوا اور پانی لاگ کے ناموافق اثر سے خاص طور پر محفوظ رکھتی ہے اس لئے برّی اور بحری سفر کرنے والے لوگوں کیلئے تو آبِ حیات سے کم نہیں۔ مقدارِ خوراک ۳ رتی۔ ترکیب استعمال نہایت سادہ اور آسان۔ ذائقہ خوشگوار ہے۔ بچے۔ بوڑھے۔ عورتیں مرد سب بخوشی استعمال کر سکتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ۱۲ آنے۔ محصولڈاک ایک سے دو شیشی تک ۷ ؍
ملنے کا پتہ:۔
حمیدیہ فارمیسی لاہور

کمزور بچوں کی طاقت کے لئے
بچوں کو
ڈونگرے کا بال امرت
دینا چاہئے
ملنے کا پتہ: ہر بڑے دوافروش کے ہاں بکتی ہے

جدید فہرست کارخانہ طلب فرمایئے

طبقۂ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر عروس نہایت مقبول ہو رہا ہے

اعلیٰ طبقہ کی خواتین، سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ تیل استعمال کرتی ہیں

یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر و منیجر رسالہ ہمایوں نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۴۴-۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

R. L. No. 1363.

قواعد

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

منیجر رسالہ ہمایوں
۲۳- لارنس روڈ- لاہور

The Picture and Title Page, Printed at the Half-tone Press,
Ram Nagar Langley Road, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامۂ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوںؔ مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

نمبر (۴)

فہرستِ مضامین

ہمایوں بابت ماہ اپریل ۱۹۳۸ء

تصویر:- ہم آہنگ نغمے

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

"ہمایوں" کے ایک خریدار —— نہیں یہ ادب او رفیشن کے خلاف ہے —— لکھو "معاون" بلکہ "سرپرست"! کتنی مشکل ہے!
ہے تو یہ ایک سودا ہی، ادبی سودا سہی، لیکن نہیں ہمارے غایت درجہ حساس ادب کا تقاضا ہے کہ ادب میں بازاری زبان استعمال نہ ہونی چاہئے، خریدار بازار میں ہوتا ہے اس لئے "خریدار" بازاری لفظ ٹھہرا —— اس سے بہتر ہے "معاون"۔ کیسا معاون؟ دریائے سندھ کے معاونوں کی طرح کا معاون، جو دور سے بصد ناز آ کر جذب ہو جائے؟ نہیں بلکہ وہ جو پانچ روپے دے کر دور ہی سے صاحب سلام کہے اور سو سو شکایتیں زبان پر لائے۔ لیکن اُردو ہندی جھگڑے کے اس عہد میں ہمیں مصلحتہً اس جنس کی اتنی خوشامد منظور ہے کہ ہم "معاون" چھوڑ اسے "سرپرست" کہنے پر بھی مجبور ہیں ——

غرضکہ قصہ کوتاہ آمدم بر سرِ مطلب ہمایوں کے یہ ایک "سرپرست" جو مدیر کے دوست بھی ہیں —— ادب کے سلسلے میں دوستی کا ذکر آتا ہے تو کیسے کیسے واقعات یاد آ جاتے ہیں۔ کبھی کوئی غیر ادب پسند دوست ملتا ہے اور ہمیں دیکھ کر ہمایوں کا لفظ اس کے ذہن میں گدگدی کرتا ہے تو محض ہمیں خوش کرنے کے لئے بلکہ ہم پر احسان کرنے کے لئے کہتا ہے کہ بھئی وہ تمہارا ہمایوں تو مدتوں سے دیکھا ہی نہیں، اب ادھر ہم یوں تو ایک ایسے "بے ادب" کے منہ سے ہمایوں کا ذکر سن کر خوش ہو جاتے ہیں کہ شکر ہے یہ بھی اردو سے تعلق پیدا کیا چاہتے ہیں لیکن اُدھر جب یہ خیال آتا ہے کہ محض ایک بے پیسے والے سرپرست ہیں تو ہمایوں کے بجٹ کا تصور کر کے طبیعت میں انقباض سا پیدا ہو جاتا ہے سو ناچار ایک بے معنی سی مسکراہٹ حضرت کی نذر کر دیتے ہیں اور پھر دونوں خوش خوش کسی اور بات کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض ادیب دوست اور بھی زیادہ بوجھل ثابت ہوتے ہیں۔ ادیب تو خیر وہ جیسے ہوتے ہیں ہوتے ہی ہیں لیکن نیم دوستی کے بھروسے پر وہ ہمایوں میں مضمون شائع کرانا ہمارا خوش گوار فرض اور اپنا الٰہی حق سمجھتے ہیں۔ ہم اُن سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک مضمون کا مطالبہ ہے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اُن کے خط پر خط آنے شروع ہو جاتے ہیں، ایک میں مضمون کا وعدہ، دوسرے میں مضمون، تیسرے میں نظم، چوتھے میں ترجمہ ہوتا ہے اور پانچویں میں جواب نہ آنے کا گلہ جائنٹ ایڈیٹر کی شکایت اور یہ اطلاع ہوتی ہے کہ جس جس پرچے میں اُن کے ارشادات شائع ہوں وہ ٹھیک اس پتے پر روانہ کر دیئے جائیں۔ دستخط کے بعد ایک ایزادی تحریر مندرج ہوتی ہے کہ افسوس ہے کہ فی الحال آٹھ دس روز تک انہیں اور مضمون لکھنے کی بالکل فرصت نہیں۔ یہ تو محض ایک قسم کے ادیب دوست ہیں دوسری قسمیں گنوانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اور بے دوست ادیبوں کا کبھی پھر ذکر کیا جائے گا جن میں ایک

ایسے بد دماغ شہرۂ آفاق شاعر بھی ہیں جن کے ۲۱ اشعار کی غزل میں سے ۲ شعر ۱۹۲۲ء میں ہمایوں میں حذف ہو گئے تو وہ آج تک ہم سے گستاخ ایڈیٹر ہمایوں سے ادبی راہ و رسم رکھنا خلافِ شان سمجھتے ہیں ـــــــ الغرض ہمارے ایک سرپرست دوست جو نام خدا ابھی ادیب نہیں بنے جو پہلے ہمیں انگریزی میں خط لکھتے تھے اور جواب واقعی محض ہماری خاطر اور قومی ہمدردی کے طور پر اُردو میں خط لکھنے لگے ہیں اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں:-

۷۸۶

گ کالج - ل
۱۶ر جنوری ۳۸ء

مکرمی تسلیم

خدا کرے ۱۹۳۸ء میں آپ کو میسر ہو:-

وہ قلم
جو کسی کا دل نہ دکھائے بلکہ ہزار دکھی اس سے سکھ پائیں
جاہلوں کا راہبر - علم والوں کا دوست
مظلوموں اور ستم رسیدہ دل کا ہمدرد و معاون
ظالم و غدار اُس سے خائف
حُسن اُس سے اور بھی تاباں و درخشندہ
ظلمت و گناہ پراگندہ و پریشاں
بادِ نسیم کی طرح دلوں کی کلیاں کھلا دے
دُنیا کو روح افزا خوشبو سے معطر کر دے۔
انسان کو "اسفل السافلین" سے بچائے - انسانیت سکھا دے
امن کا حامی - لڑائی کا دشمن -
ہمہ گیر محبت کا مؤثر پیغام بر

دل چاہتا تھا کہ یہ خط یکم جنوری کو آپ کے ہاتھ میں ہوتا لیکن حالات مانع رہے - آپ کا مشاعرہ نہایت کامیاب رہا - اگر ۹ ہر دسمبر کو آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو غالباً میری بیوی اور میں" . . . . . وغیرہ وغیرہ

اِن حضرت دوست سے جواباً عرض ہے کہ دل تو چاہتا تھا کہ اس خط کا جواب یکم فروری تک ہمایوں کے ذریعے سے آپ تک پہنچ جاتا لیکن ادھر بھی "حالات مانع رہے"۔ مزید گزارش ہے کہ حالات کا یہ امتناع بڑا "ظالم و غدار" ہے لیکن بسا اوقات "ہمدرد و معاون" بھی ثابت ہوتا ہے - مثال کے طور پر غور فرمائیے کہ یہ جواب آپ کو انشاء اللہ یکم اپریل کو ملے گا - اس کے جو معنی ہیں وہ آپ سے پروفیسر کالج پر صاف ظاہر ہونگے - ہاں آپ کی اور سب دعائیں تو ہمارے قلم کے سر آنکھوں پر لیکن براہِ کرم ایک وہ "بادِ نسیم" والا کام یعنی "دلوں کی کلیاں کھلانے" والی ڈیوٹی اپنے برقی پنکھے یا اپنی ہی رفیقِ زندگی کے سپرد فرما دیجئے تو عین عنایت ہوگی!

بشیر احمد

جہاں نُما

دُنیا کا سب سے بڑا پہلوان : گاما

ہندوستان کے مشہور پہلوان گاما کے متعلق امریکا کے ایک اخبار میں مسٹر جیک کوفوڈ کا ایک دلچسپ مضمون شائع ہؤا ہے جس میں اُنہوں نے ثابت کیا ہے کہ دُنیا میں آج تک گاما سے بڑا کوئی پہلوان پیدا نہیں ہؤا۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ اہلِ یورپ و امریکا اپنے جن پہلوانوں کی طاقت پر ناز کرتے ہیں، وہ گاما کے سامنے بالکل ہیچ ہیں۔ دُنیا کا سب سے بڑا پہلوان وہ شخص کہلا سکتا ہے جس نے کسی مقابلہ میں کبھی نیچا نہ دیکھا ہو۔ یورپ اور امریکا کا کوئی پہلوان اس قسم کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ دُنیا کا سب سے بڑا پہلوان گاما ہے جس میں یہ خصوصیت موجود ہے۔ اگرچہ اُس کا قد صرف ۵ فٹ ۹ اِنچ ہے لیکن اس کا وزن تین من سے زاید ہے اور اس میں چھٹانک بھر بھی چربی نہیں۔ اس کا پورا جسم طاقتور پٹھوں کا ایک جال ہے۔ اس ڈیل ڈول کے باوجود بھی وہ بلّی کی طرح پھُرتیلا ہے۔ جب ایک شخص میں بن مانس کی قوت، چیتے کی تیزی اور اس کے ساتھ غیر معمولی ذہانت جمع ہو جائے تو پھر اس کا مغلوب ہونا تقریبًا ناممکن ہو جاتا ہے۔ گاما ان صفات کا مجموعہ ہے۔ اس کی عمر زیادہ ہو چکی ہے یعنی وہ تقریبًا ساٹھ سال کا ہے مگر پینتیس سال سے اب تک وہ مسلمہ طور پر ہندوستان کا سب سے بڑا پہلوان ثابت ہوتا آیا ہے حالانکہ ہندوستان دُنیا کے عظیم ترین پہلوانوں کا گہوارہ ہے۔ ساٹھ سال کی عمر میں بھی وہ چاق و چوبند ہے۔ اس کے جسم کا رنگ کمائے ہوئے چمڑے کی طرح ہے۔ اس کے لبوں پر بڑی بڑی مونچھیں اس کے دانتوں کی دودھیا سفیدی کو اُجاگر کرتی ہیں۔ اس کے چہرے پر کوئی جُھرّی یا لکیر نہیں ہے۔ چہرہ اس کے دلی اطمینان کا آئینہ ہے لیکن کشتی کے وقت یہ اطمینان غائب ہو جاتا ہے اور اُس کا بشرہ ایک حیوانی تندی و خشمناکی کا رُوپ بھر لیتا ہے۔ اپنے مقابل کو جلد از جلد مغلوب کر لینے کی آتشیں خواہش سے اس کا جسم انگارے کی طرح دہکنے لگتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تین ہزار سے زاید کشتیوں میں آج تک کوئی اس سے بازی نہیں لے جا سکا۔

تحقیق سے ثابت ہے کہ کشتی قدیم ترین کھیل ہے۔ یہ کھیل سب سے زیادہ قدیم ہی نہیں بلکہ اس کے لئے سب سے زیادہ مہارت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لئے زبردست بل بوتا، ہاتھ پاؤں اور آنکھ کی غیر معمولی تیزی اور داؤ پیچ کا وسیع علم درکار ہے۔ اگرچہ گاما بوڑھا ہو چکا ہے لیکن اب بھی وہ امریکا کے ہر نوجوان پہلوان کو بہت آسانی سے پچھاڑ سکتا ہے۔ سالہا سال قبل بھی اُسے اِس بات کا موقع میسر ہؤا تھا کیونکہ مشہور امریکن امیر اور فنِ پہلوانی کے شوقین جیک کرلی نے اُسے امریکا کے سفر کے لئے ایک لاکھ ڈالر پیش کئے تھے۔ گاما چونکہ ہندوستان کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا اس نے اس پیشکش کو رد کر دیا۔ لیکن پٹیالہ میں زبسکو سے
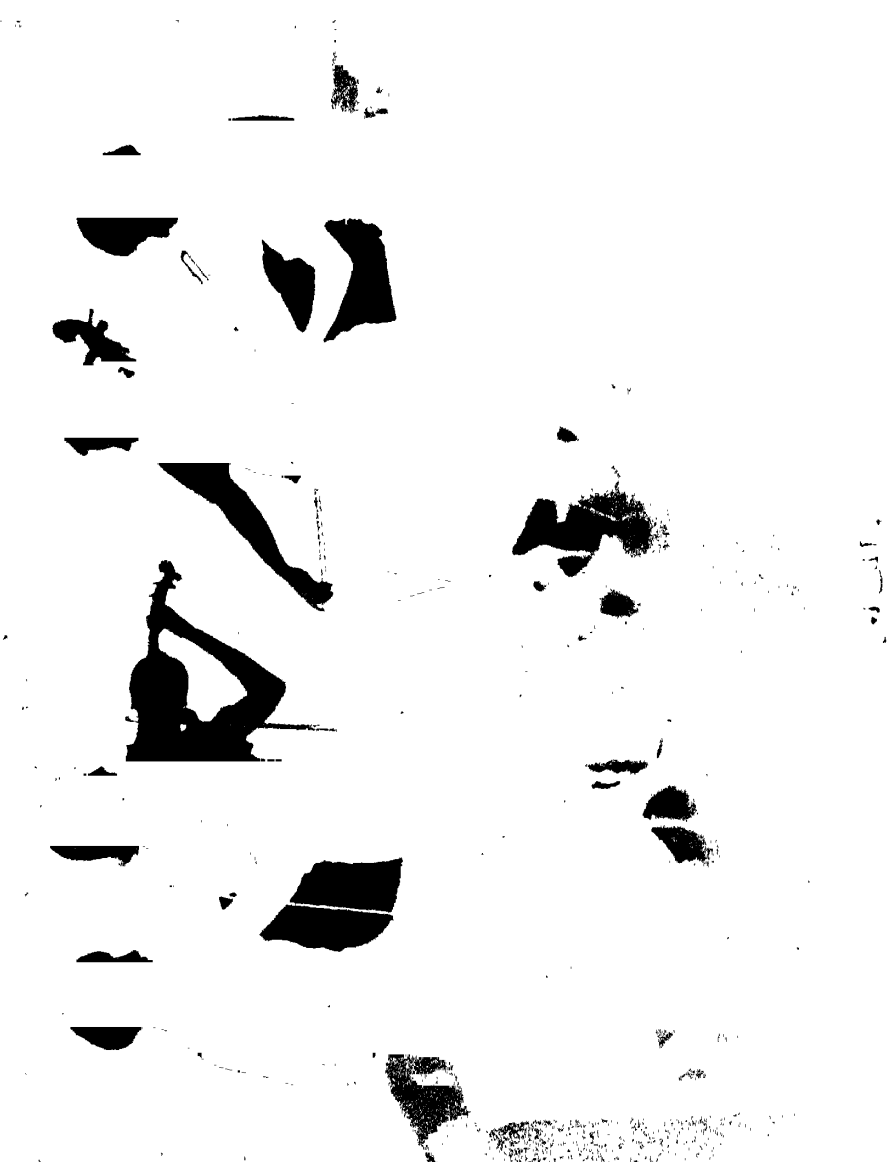
کشتی لڑکر گاما نے بتادیا کہ امریکا کے سفر کا کیا نتیجہ نکل سکتا تھا۔

زبسکو اور گاما کی کُشتی

زبسکو جو پی۔ ایچ۔ ڈی ہونے کے علاوہ درجن بھر زبانیں جانتا ہے مسلمہ طور پر دُنیا کے چند بہترین پہلوانوں میں سے ہے۔ اسے غیر معمولی قوت کے ساتھ غیر معمولی ذہانت بھی حاصل ہے۔ وہ گاما سے مرعوب بھی نہیں تھا۔ جب اسے ایک کُشتی کے لئے دس ہزار پاؤنڈ پیش کئے گئے تو وہ مقابلہ کے لئے ہندوستان پہنچا۔ پولینڈ کے اس پہلوان کو یقین تھا کہ وہ مشرق پر مغرب کی برتری ثابت کردے گا۔ ہندوستان میں کُشتی کے قواعد مغرب سے مختلف ہیں۔ اس کے باوجود زبسکو کو اپنی ذات پر ہر طرح کا اعتماد تھا۔ لیکن گاما سے روبرُو ہونے کے بعد اور اس کا بعید از قیاس چوڑا چکلا سینہ اور اس کے بازوؤں کی مہیب جسامت دیکھ کر زبسکو کو معلوم ہو گیا کہ اس کا مقابلہ کسی عام انسان سے نہیں۔ زبسکو جن مغربی پہلوانوں کو اپنا کس بل دکھا چکا تھا وہ اُسے گاما کے مقابلے میں کئی خون کے دُبلے پتلے مریض معلوم ہونے لگے۔ جسم کے ہیبت ناک نشوونما کے ساتھ گاما کی حرکات میں ایک عظیم الہیئت بلّی کا سا پھرتیلا پن تھا وہ چلتا نہیں تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بہتا یا تیرتا تھا۔ وہ قدم نہیں اُٹھاتا تھا بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاؤں بہ سرعت پھسلے چلے جاتے ہیں۔

کُشتی کے اذن کے ساتھ ہی گاما جھپٹ کر آگے بڑھا۔ زبسکو نے اس کے بے پناہ ہاتھوں کی گرفت محسوس کی۔ اس کا جسم دُنیا کے سب سے زیادہ خوفناک بازوؤں کی جکڑ میں آچکا تھا۔ اب وہ اپنے آپ کو ایک چھوٹے بچے کی طرح ناتواں محسوس کرنے لگا وہ بالکل ہل جل نہیں سکتا تھا۔ اتنے میں ایک تھپکی کی آواز آئی اور طرفۃ العین میں زبسکو زمین پر چاروں شانے چِت گرا تھا۔ یہ تمام واقعہ دس سیکنڈ میں پیش آیا۔ گاما کی عمر ان دنوں پچاس سال کے قریب تھی اس کے باوجود اس نے اس پہلوان کو جسے مغربی لوگ دُنیا کا بہترین پہلوان سمجھتے تھے اس طرح عاجز کر دکھایا۔

مغربی پہلوانوں کو کُشتی کی دعوت

مدت کا ذکر ہے، ایک دفعہ گاما کشتیوں کے مقابلہ میں شریک ہونے کے لئے بڈاپسٹ گیا۔ وہاں دُنیا کے بہترین پہلوان جمع تھے، یورپ، جاپان، افغانستان اور ٹرکی کے دیو قامت پیل تن دنگل میں آئے تھے۔ سب پہلوان بڑھ بڑھ کر اپنے کارناموں کا ذکر کرتے رہے لیکن گاما خاموش رہا۔ اس کو بولنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ سب پر اس کی عظمت کا رُعب طاری تھا۔ اُن میں سے کسی کو بھی گاما سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اُن پر گاما کا ہاتھ پڑ گیا تو اُن کی شہرت کی درخشاں قبائیں چاک چاک ہو جائیں گی۔ گاما نے باری باری ایک ایک کو مقابلے کی صلا دی لیکن اس کی قوت کسی انسان کی قوت نہ تھی ایک دیوتا کی قوت تھی۔ کوئی روبرو آنے کا حوصلہ پیدا نہ کر سکا۔ اب گاما نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اُس نے اس اجتماع کے

دس بہترین پہلوانوں سے یکے بعد دیگرے کشتی لڑنے اوران سب کو ایک گھنٹے کے اندر اندر پچھاڑ دینے کا دعویٰ کیا۔ لیکن پھر بھی کسی نے ہمت نہ کی کہ سامنے آئے۔

یہ بات یقیناً حیرت انگیز ہے کہ کوئی شخص تین ہزار کشتیاں لڑے اور ایک دفعہ بھی مغلوب نہ ہو۔ تین ہزار دفعہ بلا استثناء اس نے اپنے حریفوں کی پیٹھ زمین سے لگائی ہے۔ اس کے حریفوں میں جاپان کے وہ زبردست پہلوان بھی شامل تھے جن کا شمار دُنیا کے بہترین پہلوانوں میں ہے اور جن میں سے بعض کا قد تقریباً سات سات فٹ اور وزن چھ چھ ساڑھے چھ چھ من کے قریب تھا۔ دُنیا میں اور کسی پہلوان کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ نوجوانی سے شروع ہوکر جوانی کی عمر گزر جانے کے بعد تک کبھی ایک دفعہ بھی اپنے حریف سے نہ پچھڑا ہو۔ گاما اس لحاظ سے دُنیا کا فقید النظیر پہلوان ہے۔ اُس کا ایک بیٹا بھی ہے جس کا قد اس سے چھ انچ بلند اور وزن پندرہ سیر زیادہ ہے۔ پہلوانی کے مشرقی ماہروں کا خیال ہے کہ وہ اپنے باپ کے بعد دُنیا کا بہترین پہلوان ہے۔ اب تک بیٹا اپنے باپ کو پچھاڑنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا۔

مغرب کے بعض مشہور پہلوان بیس بیس سال سے گاما کو پچھاڑنے میں کامیاب ہونے کے لئے آتش رشک سے جل رہے ہیں۔ جب گاما پہلوانی میں کمال حاصل کرچکا تھا ان میں سے بعض اس وقت ابھی نوعمر لڑکے تھے۔ اب وہ بالکل جوان ہیں اور گاما عمر رسیدہ ہوچکا ہے لیکن اب بھی وہ یا کوئی اور پہلوان گاما پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ گاما اب بھی مسلّمہ طور پر اس فن کا حکمت اُستاد اور دُنیا کا بہترین پہلوان ہے۔ بقول کوفوڈ یہ امر مسلّم ہے کہ گاما سے بڑا پہلوان آج تک پیدا نہیں ہوا۔

عورتیں اور عہدے

کالستھوپاٹ شالا کالج یونین الہ آباد میں مسٹر چنتامنی کے زیرِ صدارت ایک پُرلطف مباحثہ ہوا۔ موضوع بحث یہ تھا کہ عورتوں کو اُمورِ عامہ کے محکموں میں عہدے ملنے چاہئیں یا نہیں۔ صدر نے مباحثہ کے بعد اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ عورتوں کے لئے ملازمتوں کے دروازے کھول دینا اور بات ہے اور اُن کو ملازمتیں قبول کرنے پر مجبور کرنا دوسری بات ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ انسانی فطرت بدل نہیں سکتی۔ اس لئے اس تحریک کے مخالفین کو اس لحاظ سے مطمئن رہنا چاہئے کہ جب تک انسانی فطرت یہی ہے جو ہے عورتوں کی صرف ایک معمولی سی اقلیت ہی اُمورِ عامہ کے عہدوں کو خانہ داری کے کاموں پر ترجیح دے گی۔

اس کے ساتھ ہی عورتوں اور اُن کے حامیوں کو بھی مطمئن رہنا چاہئے کیونکہ ممالک متحدہ آگرہ واودھ کی مثال ہی کافی حوصلہ افزا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ عورتیں سخت پردے میں بیٹھی تھیں لیکن اب یہ حالت ہے کہ یہاں عورتیں مجسٹریٹ کے عہدوں پر فائز ہیں اور ایک خاتون وزیر بھی ہے۔ عورتوں نے گزشتہ پندرہ سال میں بے انتہا ترقی کی ہے اور یہ ترقی آئندہ یقیناً تیز تر رفتار سے جاری

رہے گی۔ غرض عورتوں کے لئے مناصب عامہ کے حامی اُن کی گزشتہ ترقی کو پیش نظر رکھ کر مطمئن ہو سکتے ہیں اور مخالفین اپنے دل کی تسلی یوں کر سکتے ہیں کہ عورتوں کی صرف ایک نہایت قلیل تعداد ہی عہدے قبول کرنے کی آزادی سے فائدہ اُٹھائے گی اور اکثریت فطرۃً خانہ داری کے کاموں کو ترجیح دے گی۔

باتونیوں کے لئے خوش خبری

نائیس کے ایک قابل ڈاکٹر نے جو پھیپھڑے کے امراض کا ماہر ہے، یہ بتایا ہے کہ باتیں کرنا بہترین تفریح ہے۔ بہت سی انسانی بیماریاں پھیپھڑوں کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں اور زیادہ باتیں کرنے سے پھیپھڑوں کو بہت تقویت پہنچتی ہے۔ عورتیں چونکہ عموماً زیادہ باتونی ہوتی ہیں، اس لئے مردوں کے مقابلہ میں اُن کی صحت بہتر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں رنڈوے مردوں کے مقابلہ میں بیوہ عورتیں بہت زیادہ ہیں۔

ہندوستان کے گیت

مسٹر ہری بہادر نے ہندوستان کے گیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس ملک کی شاعری میں دماغ نہیں بلکہ روحانی بالیدگی کے جوہر ہیں۔ یہاں کے گیت عموماً خدا سے مِل جانے کی غیر فانی آرزو پر مشتمل ہوتے ہیں اور اُن کا مقصدِ حیات میں ایک عارضی سا ہیجان پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ ہندوستانی شاعر اس دُنیا کی چیزوں کی طرف سے عجیب و غریب طور پر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اپنی پوری توجہ روحانی دُنیا کی طرف منعطف کر لیتا ہے۔

ہندوستان کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ طربیہ ہے کسی گیت کا ہیرو ابتداءً خواہ کتنے مصائب میں گرفتار ہو بالآخر اس کا انجام اچھا ہوتا ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی شعراء کو خدا کے وجود کا پورا یقین ہوتا ہے، اُن کا اعتقاد یہ ہے کہ خدا راست کردار آدمی کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا۔ اس لئے ہمیشہ صداقت کی فتح ہوتی ہے۔ ہندوستان میں المیہ نظمیں تقریباً معدوم ہیں۔ ہندوستانی شاعری کی ایک اور خصوصیت تشبیہ و تمثیل کے ذریعہ سے اخلاقی اصلاح کا کام ہے، ہمارے شاعر مزاحیہ گیتوں میں بھی عموماً کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دیتے ہیں۔ ہندوستانی گیتوں کی ایک اور خصوصیت استغنائی ہے مغربی نقاد عقلی دلائل کی بنیاد پر استغنائی کے مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں ایک نظم میں بار بار کسی مصرع کا دُہرانا فضول ہوتا ہے اور آدمی اس سے اُکتا جاتا ہے لیکن ہندوستان کی شاعری زیادہ تر خدا کی محبت کے نغموں پر مشتمل ہے اور دوسرے تمام جذبات کا درجہ اس کے بعد ہے۔ عاشق کے کانوں کو محبت کا دُہرایا ہوا نغمہ بھی ہر بار نیا معلوم ہوتا ہے۔ خود مغرب میں بعض غیر فانی عشقیہ گیت محض اپنی استغنائی کی وجہ سے شیریں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے لئے کوئی بات جس قدر محبوب ہو۔ اسی قدر ہم اُسے بار بار سننا چاہتے ہیں اور اس سے اکتانے نہیں پاتے۔

حامد علی خاں

توحیدِ وجودی

کہیں سر ہوں میں اور کسی جا قدم ہوں
کہیں ہوں حدوث اور کسی جا قدم ہوں

کہیں چشمِ فتاں کی تصویر ہوں میں
کہیں مدِ ابرو کی شمشیر ہوں میں

کہیں جلوۂ ماہِ رخسار ہوں میں
کہیں خال بن کر نمودار ہوں میں

کہیں صورتِ لب، کسی جا ذقن ہوں
کسی جا دہن ہوں، کسی جا سخن ہوں

کہیں شکلِ دل ہوں، کسی جا زباں ہوں
کہیں پوست ہوں، اور کہیں استخواں ہوں

کہیں شان ہوں میں کہیں آن ہوں میں
کہیں جسم ہوں، اور کہیں جان ہوں میں

کسی جا تخیل، کسی جا بیاں ہوں
کسی جا عیاں ہوں کسی جا نہاں ہوں

وجود ایک ہے، اور تعین ہزاروں
مری ایک ہستی کے ہیں گن ہزاروں
ہے مرآۃِ مطلق کا جوہر تعین
ہویت کا ہے خاص مظہر تعین
ہے توحید اصلی، دوئی اعتباری
بنے نورِ واحد سے نوری وناری
بمن منکشف گشت ایں نکتہ ناگاہ
ز الحمد للہ ——— الحمد للہ[1]

امجد حسین امجد

[1] چونکہ تمام تعینات ایک ہی ذاتِ مطلق کے شیون ہیں اس لئے ہر تعریف کی مستحق وہی ایک ذاتِ مطلق ہے۔ دیکھو تفسیر رب العالمین۔

منشی پریم چند کی کہانیوں میں کردار نگاری

کہانیوں کے لئے پلاٹ، اس کی ترتیب اور تحریک کو جتنی اہمیت دی گئی ہے، اس سے کہیں زیادہ ضروری اور اہم خود افسانوی کردار ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کہانی کا پلاٹ اس لئے دلکش اور مرغوب بن جاتا ہے کہ اس کو ہم انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے حاصل کرتے ہیں اور اس کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے ہمیں کرداروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ افسانہ نگار کے کمال کا مظاہرہ جہاں اور بیسیوں جگہ کیا جا سکتا ہے وہاں کردار نگاری سے خصوصاً کہیں زیادہ زور کے ساتھ اس کے کمال کی جھلک رونما ہوتی ہے اور فنی حیثیت سے افسانہ نگار کے لئے یہ کام اگر سب سے زیادہ دشوار نہیں تو کم از کم ایک بیحد دشوار کام ضرور ہے۔

کہانیوں میں کردار نگاری کی اہمیت کا اندازہ جیمز لن کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے افسانہ کی فنی تعریف کرتے وقت ایک جگہ پیش کیا ہے۔

"افسانہ کسی ایک کردار کی زندگی کے سب سے اہم موقع کو ڈرامائی صورت میں مختصر طور پر پیش کرنے کا نام ہے۔"

افسانہ کی اس تعریف سے کرداروں کی اہمیت صاف ظاہر ہے اور فن افسانہ نگاری میں کردار نگاری کا جو مرتبہ ہونا چاہئے وہ بھی عیاں ہے۔ کردار نگاری کے معنی یہ ہیں کہ کہانی کے لوگوں میں کچھ ایسی خاص عادتیں اور خصلتیں پیدا کر دی جائیں کہ اُن کی ہستی دوسرے لوگوں سے پہچانی جا سکے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کہانی یا ناول کے کردار اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب افسانہ نگار کے مدِ نظر کوئی خاص مقصد ہو اور وہ اس مقصد کو واقعات کے ذریعہ سے پیش کرنے کے لئے افراد افسانہ میں خاص خصائل اس طرح پیدا کر دیتا ہے کہ اس کا مقصد بحسن و خوبی پورا ہو جائے۔ چنانچہ جب وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ حریص اور لالچی پنڈتوں کو کھانے سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہے اور یہ جذبہ شوق ان پر اس درجہ غالب ہے کہ انہیں اپنی عزت اور آبرو کی بھی پروا نہیں رہتی تو کہانی لکھنے والا بعض خاص واقعات کو ایک شخص کے سوانح حیات سے وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح اُن کو زندہ اور مجسم صورت میں پیش کرتا ہے۔ پنڈت موٹے رام شاستری کا کیریکٹر[1] ملاحظہ فرمائیے جس سے اس بیان کی تصدیق ہو جائے گی۔

غرضکہ کردار نگاری کا مقصد یہ ہے کہ اشخاصِ قصہ کی طبیعت، عادات اور ان کے خصائل میں ایسی امتیازی خصوصیات پیدا کر دی جائیں، جن سے وہ چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے انسان معلوم ہوں اور ان کی سیرت پر اصلیت کا دھوکا ہو جائے۔

[1] دعوت۔ از خاک پروانہ۔ پریم چند ۱۲

منشی پریم چند نے اپنی کہانیوں میں صدہا کیرکٹر پیش کئے ہیں اور سچ پوچھئے تو بنی نوع انسان کے افراد میں سے کون سا ایسا فرد ہے جس کا کیرکٹر ان کی کہانیوں میں موجود نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف دو ایک مثالیں بیان بالا کی تائید میں انہیں کے افسانوں سے پیش کرتے ہیں۔ کیرکٹر ملاحظہ فرمائیے اور انصاف کیجئے کہ پڑھنے والا ان کو پڑھ کر کس قدر مغالطے میں پڑ جائے گا اور ان کے کیرکٹر پر نہ صرف اصلیت کا دھوکا ہوگا بلکہ من وعن سچے معلوم ہوں گے۔ ہندو گھرانے کی ایک بوڑھی ساس کا کیرکٹر ملاحظہ ہو۔ وقت وہ ہے جب کہ ٹھاکر صاحب گرہن اشنان کی طیاری کر رہے ہیں اور ٹھکرائن بھی ان کے ہمراہ جانے والی ہیں۔ بہوئیں زادِ سفر کی طیاری میں مشغول ہیں۔ ساس پرانے خیال کی سیدھی سادی بھگتن ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بہوؤں پر نئی روشنی کا اثر غالب آ رہا ہے یا وہ جوان ہیں اور جوانی دیوانی ہے۔ شاید وہ گرہن کے موقعہ پر مذہبی فرائض ادا نہ کر سکیں یا اُن کے ادا کرنے میں تساہل کریں ساس اپنا فرض اس طرح ادا کرتی ہے:۔

"بوڑھی ٹھکرائن بچوں کو پھسلاتی تھیں اور بیچ بیچ بہوؤں کو سمجھاتی جاتی تھیں۔ دیکھو خبردار! جب تک اُگرہ[2] نہ ہو جائے گھر سے باہر نہ نکلنا۔ ہنسیا، چھُری، کلہاڑی انہیں ہاتھ سے مت چھونا۔ سمجھائے دیتی ہوں ماننا چاہے نہ ماننا۔ تمہیں میری بات کی کیا پروا ہے منہ میں پانی کی بوند نہ پڑے۔ نارائن کے گھر بپت پڑی ہے۔ جو سادھو بھکاری دروازے پر آ جائے اسے پھیرنا مت۔"[1]

ایک اہیر[3] کا کیرکٹر ملاحظہ فرمائیے:۔

"گوپال ذات کا اہیر تھا۔ نہ پڑھا نہ لکھا۔ بالکل اکھڑ۔ دماغ روشن ہی نہیں ہوا تھا تو شمع جسم کیوں گھُلتی۔ پورے چھ فیٹ کا قد۔ گٹھا ہوا بدن"۔

خیر یہ باتیں تو ایسی ہیں جن کو ہر کس و ناکس جانتا ہے اور ہر کہانی لکھنے والا کر سکتا ہے۔ مگر منشی جی کی کردار نگاری کے کمال کا علم ان چند الفاظ سے ہوگا جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اور جو بغیر اعلیٰ مشاہدہ کے ناممکن ہے۔ آگے چل کر وہ اس گوپال کے کیرکٹر کی تکمیل اس طرح کرتے ہیں:۔

"ملکار رگاتا تو سننے والے میل بھر پر بیٹھے ہوئے اس کی تانوں کا مزہ لیتے۔ گانے بجانے کا عاشق۔ ہولی کے دنوں میں مہینہ بھر تک گاتا۔ ساون میں ملار اور بھجن تو روزمرہ کا شغل تھا۔ نڈر ایسا کہ بھوت اور پشاچ[4] کے وجود پر اسے عالمانہ شکوک تھے لیکن جس طرح شیر اور پلنگ بھی سُرخ شعلوں سے ڈرتے ہیں اسی طرح سرخ صافے سے اس کی رُوح لرزاں ہو جاتی تھی۔"

پیاگ، ایک گنجڑی بھنگڑی کا کیرکٹر جس خوبی سے منشی جی نے مزار[5] آتشیں میں پیش کیا ہے کیا اس کو پڑھ کر کہانی پر سچائی اور حقیقت کا گمان نہیں ہو جاتا۔ ہم طوالت کے خیال سے پورا کیرکٹر لکھنا نہیں چاہتے مگر صرف وہ حصہ نقل کر دیتے ہیں جو عام افسانہ نگاروں

---

[1] صرف ایک آواز۔ پریم پچیسی حصہ دوم۔ [2] گرہن کا ختم ہوجانا۔ [3] اندھیر: پریم پچیسی۔ [4] (پریت۔ بھوت) [5] خاک پروانہ۔

ے لئے اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں تک ان کا تخیل نہیں پہنچ سکتا۔
پیاگ گانجے کا دم لگا کر کھیت کی طرف جا رہا ہے اور اس حالت میں جو بھجن اس کے دماغ میں چکّر لگا رہا ہے ملاحظہ ہو:۔

"ٹھگنی کیوں نینا جھمکاوے ——— کدو کاٹ مِردنگ بنائے
ٹیسو کاٹ مجیرا ، ناچے بالم کھیرا

اتنا لکھنے کے بعد ہم کردارنگاری کی فنی لطافتوں اور کردارنگار کے فرائض سے مختصر طور پر بحث کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھلائیں گے کہ منشی پریم چند ان فرائض سے کہاں تک عہدہ برا ہوئے جو ایک کہانی لکھنے والے کے لئے ضروری ہیں۔

کردارنگاری کی اتنی ماہیت سمجھ لینے کے بعد ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مختلف قسم کی ادبیات میں کردارنگاری کو ایک دوسرے سے امتیاز کر سکیں کیونکہ کردارنگاری اپنے وسیع مفہوم میں نہ صرف کہانی بلکہ ادب کے دیگر شعبوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً تاریخ، نظم، ڈراما، ناول وغیرہ۔ اور انہیں پر کیا منحصر ہے۔ تمام پلاٹ دار ادبی کارناموں میں اس سے کچھ نہ کچھ مدد ضرور لی جاتی ہے۔ اس لئے ہمارے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ڈرامائی کردارنگاری اور ناولی کردارنگاری میں فرق کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ افسانوی کردارنگاری کی ممتاز حیثیت کو جان سکیں۔

ڈرامائی کردارنگاری اور ناولی کردارنگاری میں یہ فرق ہے کہ ڈراما میں کسی کردار کے ترکیبی عناصر نہایت شرح و بسط کے ساتھ نہیں بیان کئے جا سکتے اور ناول میں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مختصر افسانوں یا کہانیوں میں کسی کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت لے کر اُسے مختلف حالتوں میں بیان کرنا افسانہ نگاری کا بہتر اور پسندیدہ طریقہ ہے کہانی لکھنے والے کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ تھوڑے وقت میں ناول کی طرح اپنے پیش کئے ہوئے کرداروں کی پوری زندگی دکھا سکے۔ اس لئے کہانی لکھنے والا اپنے کرداروں کو مختلف طریقوں سے پیش کرتا ہے اور اپنے کردار کے جس پہلو کو زیادہ نمایاں کرنا چاہتا ہے اس میں ڈرامائی اثرات کی مدد سے پڑھنے والے کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ مختلف طریقے یہ ہیں:۔

(۱) بیانی (Descriptive) یہ طریقہ بہت عام ہے اور بے حد مقبول۔ سچ پوچھئے تو یہ طریقہ ہے بھی نہایت عمدہ کہ افسانہ نگار سب سے پہلے اپنے افسانوی کردار کو ایسے الفاظ میں اپنے پڑھنے والے کے سامنے پیش کر دے کہ اس کے بعد وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اسے اس طرح بیان کرے کہ پڑھنے والا اس کو دلچسپ خیال کرے۔ منشی پریم چند کی کہانیوں میں اس قسم کی صدہا اور بہت عمدہ عمدہ مثالیں موجود ہیں مثلاً مامتا، بڑے گھر کی بیٹی، عالم بے عمل، آہ بے کس، صرف ایک آواز، بانکا زمیندار، کرموں کا پھل، ستا ؤن، مزار آتشیں، فکرِ دنیا، خودی، تالیف، کپتان، وغیرہ۔ ہم یہاں اُن کی ایک کہانی کپتان[۲] کے ہیرو جگت سنگھ کو پیش کرتے ہیں جس کا تعارف انہوں نے کہانی کے شروع میں اس طرح کرایا ہے:۔

---

[۱] ۔۔۔ صفحہ ۔۔۔ نگار ۔۔۔ لکھنؤ۔ [۲] خاک پروانہ۔

"جگت سنگھ کو کتابوں سے نفرت تھی، وہ سیلانی آوارہ گرد، گھمکڑ نوجوان تھا۔ کبھی امرود کے باغوں کی طرف نکل جاتا اور باغبان کے ساتھ شوق سے گالیاں کھاتا، کبھی دریا کی سیر کرتا اور ملاحوں کی کشتیوں میں بیٹھ کر اس پار نکل جاتا۔ گالیوں میں مزا آتا تھا۔ اسے بینڈ باجا بہت پسند تھا۔ بینڈ کا کوئی دن ناغہ نہ کرتا۔ آوارگی اور مسرفی دونوں ہمزاد ہیں اور مسرفی کا سرقہ سے گاڑھا رشتہ ہے۔ جگت سنگھ کو جب موقع ملتا گھر سے روپیہ اڑا لے جاتا، نقد نہ ملے تو برتن نکال لے جانے میں اسے دریغ نہ تھا۔ گھر میں جتنی شیشیاں اور بوتلیں تھیں سب اس نے صاف کر دیں۔ پرانے وقتوں کی کتنی ہی چیزیں اس کے یہاں پڑی تھیں جگت نے ایک ایک کر کے ان کا خاتمہ کر دیا۔ اس فن میں ایسا شاطر اور ہوشیار تھا کہ اس کی جدت اور مشکل پسندی پر حیرت ہوتی تھی۔ ایک بار وہ باہر ہی باہر اپنے دومنزلہ مکان کی چھت پر چڑھ گیا اور اوپر ہی سے ایک پیتل کی تھالی لے کر اتر آیا۔ گھر والوں کو خبر تک نہ ہوئی۔ اس کے باپ لڑا کر جگت سنگھ اپنے محلے کے ڈاک خانے کے منشی تھے۔ جگت سنگھ قوی الجثہ ہونے پر بھی چپکے سے مار کھا لیا کرتا تھا! لیکن مار پیٹ، تنبیہ، فہمائش کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ جونہی گھر میں قدم رکھتا چاروں طرف سے کاؤں کاؤں مچ جاتی۔ ماں دور دور کر کے دوڑتی، دو بہنیں گالیاں دینے لگتیں۔ بیچارہ الٹے پاؤں بھاگتا۔ کبھی کبھی وہ دو دو تین تین دن بھوکا رہ جاتا۔ گھر والے اس کی صورت سے جلتے تھے۔ آوارہ گردی نے اسے تکلیفوں کا خوگر بنا دیا تھا۔ جہاں نیند آجاتی وہیں پڑا رہتا۔ جو کچھ مل جاتا وہی کھا لیتا۔"

اتنی تفصیل کے بعد کہانی شروع ہوتی ہے۔ مگر یہ بیانی تفصیل غیر ضروری نہیں، بلکہ نہایت اہم، کیونکہ کہانی لکھنے والے نے جو کچھ کہا ہے اس سے آنے والے واقعات پر کافی روشنی پڑتی ہے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ دیکھیں ایسے لڑکے کا کیا انجام ہوگا۔ اس قسم کے تفصیلی بیانات میں اس بات کا خیال رکھنا چاہئیے کہ جو کچھ کہا جائے اس کا تعلق براہ راست کہانی کے پلاٹ اور اس کے نتیجے سے ہو۔

ان باتوں کو مد نظر رکھ کر اگر ہم "کپتان" کا جائزہ لیں تو اس کا تعلق پلاٹ سے صاف ظاہر ہے کہ ایسے لڑکے کا حشر کیا ہوگا؛ اور ایک نہ ایک دن وطن کو خیر باد کہنا اس کا لازمی نتیجہ ہوگا چنانچہ جگت سنگھ اپنے باپ کی جیب سے ایک انشیورڈ اڑا لیتا ہے اور بمبئی کی راہ پکڑتا ہے۔ ڈاک خانہ کے منشی پر جو واقعات پیش آئے ہوں گے وہ بھی اس تفصیل سے آسانی سے اخذ کئے جا سکتے ہیں یعنی محکمہ کی طرف سے غبن کا چارج لگنا، چنانچہ چارج لگتا ہے اور سزا ہو جاتی ہے۔ اب رہا نتیجہ اور انجام کا سوال اور اس کا اس تفصیل سے تعلق۔ اس کے لئے یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ منشی پریم چند ٹریجڈی کو زیادہ ہولناک نہیں بنانا چاہتے اور اس لئے اپنے افسانوی کردار کو کسی نہ کسی طریقہ سے اس سخت حالت سے نجات دلانے کی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا؛ جگت سنگھ فوج میں ملازم ہو گیا اور سات آٹھ سال کے عرصہ میں وہ کپتان ہو گیا۔ باپ کی سزا کا خاتمہ ہو گیا اور اس کو رہائی کا حکم ملا۔ وہ ایک شش و پنج میں تھا کہ جائے تو کہاں جائے کہ بیٹا یعنی کپتان جگت سنگھ جس کی شوخی اور شرارت اب سنجیدگی سے بدل چکی تھی، باپ کو لینے آتا ہے اور کہانی کا خاتمہ طربیہ طور پر ہوتا ہے

منشی پریم چند نے جگت سنگھ کا کیرکٹر پیش کرنے کے بعد اس کو فوج کا کپتان بنایا، جو بالکل فطری ہے اس کو کسی کالج کا پروفیسر یا ڈاک خانہ کا بابو نہیں بنایا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے لئے ایسے ہی محکمے موزوں ہوا کرتے ہیں۔

اسی طرح بڑے گھر کی بیٹی، عالم بے عمل، آہ بیکس، صرف ایک آواز، کرموں کا پھل، بانکا زمیندار، مناؤن، مرہم وغیرہ میں منشی پریم چند نے تفصیلی بیانات کی مدد سے کیرکٹر پیش کئے ہیں اور نہایت خوبی کے ساتھ۔

(۲) مکالمہ (*Dialogue*) اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ بعض اوقات کسی شخص کے طرز گفتگو اس کے حرکات و سکنات اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے بھی ہمیں کیرکٹر کا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ کہانی لکھنے والے بھی اپنے کرداروں کے کیرکٹر پیش کرنے میں مکالمہ اور حرکات و سکنات سے بہت زیادہ مدد لیتے ہیں۔ مکالمہ کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ حقیقی اور اصلی معلوم ہو یعنی کہانی لکھنے والے نے اپنے کرداروں سے جو کچھ کہلوایا ہے وہ ہو بہو وہی ہو جو اُن موقعوں پر اصلی زندگی میں لوگ کہا کرتے ہیں۔ افسانوی گفتگو اپنے کردار کی فطرت کے بالکل مطابق ہونی چاہئے۔ تاکہ اس کی زبان سے ادا کردہ الفاظ اجنبی نہ معلوم ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں ایک انفرادی شان پائی جائے۔ اب ذرا منشی پریم چند کی کہانیوں میں ان کے مکالموں کو دیکھئے اور ان کے کمال کی داد دیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو بات جس افسانوی کردار کے مُنہ سے نکلتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کھڑا بول رہا ہے خصوصاً وہ افراد جن کا تعلق دیہات سے ہے۔ مزارِ آتشیں[1] میں بیاگ اور اس کی بیوی کا ایک مکالمہ ملاحظہ فرمائیے اور ان کے کردار اخذ کیجئے:۔

بیاگ۔ لا کچھ پیسے مجھے دے دے دم لگا آؤں۔

رکمنی نے مُنہ پھیر کر کہا۔ دم لگانے کا شوق ہے تو کام کیوں نہیں کرتے۔ کیا آج کل کوئی بابا نہیں ہیں؟

بیاگ۔ بھلا چاہتی ہے تو پیسے دے دے۔ نہیں اس طرح تنگ کرے گی تو ایک دن میں نکل جاؤں گا تب روئے گی۔

رُکمنی۔ روئے میری بلا۔ تم نکل جاؤ گے تو میں کبو کوں نہ مر جاؤں گی۔ اب بھی چھاتی پھاڑ کر کماتی ہوں۔ تب بھی چھاتی پھاڑ کر کماؤں گی۔

بیاگ۔ تو یہی پھیلا ہے۔

. . . .

پنڈت موٹے رام شاستری[2] کا کیرکٹر مکالمہ کے ذریعہ اس طرح پیش کیا گیا ہے:۔

موٹے رام۔ اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام۔ داس ملوکا کہہ گئے کہ سب کے داتا رام۔

سونا نے مسکرا کر کہا۔ "کیا کوئی میٹھی تازی خبر ہے کیا؟"

موٹے رام نے پینترا بدل کر کہا۔ "ایسا تاک کر کہ چاروں شانے چت۔ سارے گھر کا نیوتہ ہے سارے گھر کا! وہ بڑھ بڑھ کے

---

[1] خاک پروانہ [2] فیصلہ [3] دعوت از خاک پروانہ

ہاتھ ماروں گا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں۔"

سونا نے کہا۔ "کہیں پہلے کی طرح اب بھی دھکا نہ ہو۔ بڈھا بوڑھا کر لیا ہے نا؟"

موٹے رام نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ "ایسا اشگن منہ سے نہ نکالو۔ بڑے جپ تپ کے بعد یہ شبھ دن آیا ہے۔ جو طیاریاں کرنی ہیں کر لو!"

. . . .

بچوں کے مکالموں میں بڑے بڑے ماہر فن بہک جاتے ہیں، مگر منشی جی نے جو نمونہ بچوں کی گفتگو کا پیش کیا ہے وہ خود اپنی نظیر ہے:-

شیاما[1] نے پوچھا۔ "کے بچے ہیں بھیا؟"

کیشو۔ "تین انڈے ہیں، ابھی بچے نہیں نکلے۔"

شیاما۔ "ذرا ہمیں دکھا دو بھیا کتنے بڑے ہیں"؟

کیشو۔ "دکھا دوں گا۔ پہلے ذرا چیتھڑے لے آ۔ نیچے بچھا دوں۔ بچارے انڈے تنکوں پر پڑے ہیں۔

شیاما دوڑ کر کپڑے لے آتی ہے۔)

شیاما۔ "ہم کو بھی دکھا دو بھیا"

کیشو۔ پہلے ذرا ٹوکری تو دے دے اوپر سایہ کر دوں۔

شیاما نے ٹوکری لا کر دے دی اور بولی۔ "اب تم اُتر آؤ میں بھی دیکھوں۔"

کیشو نے کہا۔ "جا دانہ اور پانی کی پیالی لے آ۔"

بڑے بھائی کا چھوٹی بہن سے اس طرح بار بار کام لینا اور اس غریب کا اس لالچ میں دوڑ دوڑ کر کام کرنا کہ بھیا ہمیں بچے دکھا دینگے کس قدر فطری اور حقیقی ہے۔ پھر ان کی بات چیت۔ اگر ایکٹ کی جائے تو مجسم حقیقت نظر آتی ہے۔

ان مکالموں سے صاف ظاہر ہے کہ بیانات اور مکالموں کے علاوہ کہانیوں کے افراد کی خصوصیات اور ان کے کیرکٹر نمایاں کرنے کے لئے ایک کہانی لکھنے والا عمل یا ایکشن سے بھی مدد لیتا ہے۔

اسی طرح بعض اوقات تحریکات اور کشمکش کے ذریعہ سے بھی کیرکٹر پیش کئے جاتے ہیں۔ منشی جی نے اپنی ایک کہانی نغمۂ[2] روح میں رانی منورما اور مانجھی کے کیرکٹر اسی طور پر پیش کئے ہیں۔

---

[1] نادان دوست از خاک پروانہ۔ [2] خاک پروانہ ۱۲

کبھی کبھی افسانہ نگار کو شخصی کیرکٹر کی بجائے کسی جماعت، قوم یا فرقہ وغیرہ کا کیرکٹر پیش کرنا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں افسانہ نگار کی نظر افراد کی بجائے جماعت پر ہوتی ہے اور وہ اس کو فردِ واحد تصور کرکے اس کا کیرکٹر پیش کرتا ہے۔ اس قسم کی کردار نگاری کا نمونہ منشی پریم چند کی ایک کہانی تالیف[1] میں ملتا ہے جس میں انہوں نے مسلمانوں کی تبلیغی انجمنوں اور ہندو سبھاؤں کے امتیازی خصوصیات اجتماعی حیثیت سے پیش کئے ہیں۔ مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس میں زیادہ غور اور مشاہدہ کو دخل نہیں دیا ورنہ وہ اس سے زیادہ مکمل ہو جاتے۔

کردار نگاری کے ترکیبی عناصر میں حسب ذیل باتیں شامل ہیں :-

(۱) مکالمہ جس کے متعلق ابھی لکھا جا چکا ہے۔ (۲) اشخاص قصہ کے نام۔ اعلےٰ درجہ کے افسانہ نگار اپنے افسانوں میں کوئی چیز ایسی نہیں رکھتے جس سے کوئی نہ کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ چنانچہ نام بھی کرداروں کی مخصوص انفرادی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور بعض اوقات یہی نام افرادِ قصہ کے کیرکٹر بتلاتے ہیں۔ قدیم افسانہ نگاروں کے افسانوں میں یہ خصوصیت بھی پائی جاتی ہے چنانچہ انوارِ سہیلی میں فرخ فال، خجستہ رائے وغیرہ اسی قسم کے اسم بامسمّٰی نام ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد رح کے اکثر افرادِ قصہ اسی نوعیت کے ہیں۔ نصوح، ظاہر دار بیگ، حمیدہ، صالحہ، سلیم، کلیم، مبتلا وغیرہ۔ منشی پریم چند نے بھی اس خصوصیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور ان کی کہانی میں اسی قسم کے نام پائے جاتے ہیں جن سے ان کے اخلاق و کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ رگھوبیر سنگھ[2]، ہری داس، ارجن سنگھ، سائیں دیال، دیا شنکر[3]، گرجا، شان سنگھ[4]، دوجی کیلاش وغیرہ اسی نوعیت کے نام ہیں جو بالکل اسم بامسمّٰی ہونے کے علاوہ اپنی اپنی جگہ نہایت موزوں اور مناسب ہیں۔

(۳) کرداروں کی ظاہری شکل وصورت کا بیان واضح طور پر پیش کرنا بھی کردار نگاری کا ایک بہت بڑا جز ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تفصیلات کی بھرمار کردی جائے۔ اپنے کردار کی اس مادی یا جسمانی خوبی کا ذکر کرنا چاہئے جس سے کہانی کی تحریک کو خاص تعلق ہو۔ حسن کا تفصیلی ذکر بھی زیادہ اچھا نہیں۔ منشی پریم چند نے اس اصول کو مدنظر رکھ کر کس خوبی سے مُنّی[5] کی شکل و شباہت پیش کی ہے:

"لڑکی کی صورت بہت پیاری تھی جو اُسے دیکھتا موہ جاتا۔"

صرف ایک لفظ سے مُنّی کے حسن کا جو نقشہ پڑھنے والے کی آنکھوں میں پھر جائے گا وہ شاید کسی طویل جملے سے ناممکن ہے یا مثلاً رانی سارندھا میں انرُدھ سنگھ کی شکل وصورت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :۔

"اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک لمبے قد کا سجیلا جوان اندر داخل ہوا"

یہاں 'لمبے قد کا سجیلا جوان' جیسا فقرہ وہ کام دیتا ہے جس کی افسانے کے لئے ضرورت تھی یا اسی طرح انہوں نے اپنی ایک کہانی

---

[1] خاکِ پروانہ۔ [2] دشمن کو سحر کرنے والا۔ از بانکا زمیندار نمیم چھپی۔ [3] کرموں کا پھل [4] منائن [5] مریم۔ [6] خودی از خاکِ پروانہ۔

مرتہم میں شان سنگھ اور گمان سنگھ کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے :۔

" دونوں بھائی قوی ہیکل، اور غضب کے جفاکش تھے "

اوران کی بہن دوجی کی شکل وشباہت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف اتنا ہے :۔

" نہایت نازک اندام، سر پر گھڑا رکھ کر چلتی تو کمر بل کھاتی "

اس میں "سر پر ...... " بظاہر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل یہاں دکھانا یہ مقصود ہے کہ باوجود نزاکت مفلسی کے باعث اس کو یہ کام کرنا پڑتا تھا اور اس کا اثر یہ ہوتا تھا۔

(۴) لباس اور اس کی اہمیت ۔ آدمی کے لباس سے بھی اس کی اخلاقی حالت کا پتہ لگتا ہے ۔ صاف ستھرے لباس سے پہننے والے کی نفاست مزاج ظاہر ہوتی ہے ۔ مرد کے لئے رنگیں اور گوتے پٹھے کا استعمال اس کی دوسری حالت کو ظاہر کرتا ہے عورتوں میں سبک اور نفیس زیورات کا استعمال ان کے مہذب ہونے اور جدید روشنی کی دلدادگی کو ظاہر کرتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کردار نگاری میں لباس سے بہت مدد ملتی ہے ۔ یہاں آغا حیدر صاحب دہلوی کے ایک مضمون[۲] کا اقتباس دینا بے جا نہ ہوگا جس سے کردار نگاری میں لباس اور ظاہری شکل وصورت کی اہمیت کا صحیح طور پر اندازہ ہوگا۔

" اب جلسہ کی روح رواں سروجنی کی بابت سنو ۔ ٹھمکا ٹھمکا لوٹا سا قد ۔ گول گول گدرایا ہوا ڈیل ۔ کھلتی چمپئی رنگت ...... خوب گہری گہری کالی کالی جٹی بھویں ۔ جٹ کے اوپر چھوٹا سا کسم کا ٹیکا ۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھیں کچھ جھکی جھکی سی ۔ بالوں میں کالی کنگھیاں لگائی گئی تھیں، جن میں ہیرے کی طرح چمکتے ہوئے سفید نگ جڑے تھے جو مہین بنارسی ساڑھی کے اندر سے پٹ بیجنیوں کی طرح جھم جھم کر رہے تھے ...... سانچے میں ڈھلی باہیں اور اچھی گول گول نازک کلائیاں جن میں پھنسی پھنسی چمکتے ہوئے زبرجدی رنگ کی جاپانی ریشمی چوڑیاں ۔ بیچ میں نیم کے پھول کے ممبئی کی جلادار اشرفی کے سونے والی چوڑیاں ..... گلے میں رت لڑے کی وضع کی کنٹھی تھی جس میں جگنو کی جگہ یاقوت کی جڑائی کا چاند ۔ اور پکھراج کی جڑائی کا تارا سا لگا ہوا تھا ۔ کانوں میں ہیرے کے چھوٹے چھوٹے بندے تھے، جو بجلی کی روشنی میں حرکت کے ساتھ پڑے جھمر جھمر کرتے تھے ...... "

جناب آغا صاحب موصوف کا ایک دوسرا رنگ ملاحظہ ہو :۔

" چلانے والی ایک بی بی کوئی تیس تیس برس کی، پھنسا ہوا سفید آڑا پاجامہ نیچا نیچا مہین آب رواں کا سفید کرتا پہنے جس میں کٹاؤ کا کام اور گلشن کی بیل لگی ہوئی، دوپٹہ کچھ کندھے پر پڑا کچھ فرش پر جھاڑو دے رہا تھا ۔ پیازی رنگ کا تھا ۔ تین چار دن کے بدلے ہوئے کپڑے تھے ۔ ہاتھوں میں کالی کریالی نخیں اور گھنڈی کے منہ کے کڑے ۔ گلے میں بادامی دانے کی چمپا کلی، کانوں میں ایک ایک ہیرا کاٹ کی بالی ...... "

---

[۱] بچھڑوں کی جگ بیتی از علی گڑھ منتھلی جلد ۲ ۱۹۱۹ء ۔ [۲] از چیانزں پیاری

کیا پڑھنے والے ان بیانات میں لباس اور وضع قطع کی مدد سے دونوں کے کیرکٹر کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہماری رائے ناقص میں تو ایک ادنیٰ تامل سے ان کا کیرکٹر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ افرادِ قصہ کو سمجھنے میں لباس کو کہاں تک دخل ہے۔

منشی پریم چند نے جہاں اس سے کام لیا ہے کسی دوسرے سے پیچھے نہیں رہے اور جو کچھ دکھایا ہے نہایت موزوں اور مناسب طور پر۔ انہوں نے جو لباس افرادِ قصہ کے لئے پیش کیا ہے اس کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:۔

"گاڑھے کی ڈھیلی مرزئی، گھٹنوں تک چڑھی ہوئی دھوتی۔ سر پر ایک گرانبار اُلجھا ہوا صافہ۔ کندھے پر چنوٹی اور تمباکو کا وزنی بٹوا . . . . "

امرت میں عائشہ کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے:۔

"سانولا رنگ تھا۔ چہرہ ایک متین ملاحت سے منور تھا۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھوں سے اخلاقی تہذیب کی روشنی جھلکتی تھی۔ قد میانہ سے کچھ کم۔ اعضا سُبک . . . . "

یہی وہ چیزیں ہیں جن سے کہانی لکھنے والا اپنے افرادِ قصہ کے لئے مواد فراہم کرتا ہے۔ اور ان میں مشاہدہ کی بہت سخت ضرورت ہے۔ اچھے افسانہ نگار ہمیشہ اپنے گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہو کر اپنے لئے مواد فراہم کر لیتے ہیں۔ وہ جن لوگوں سے ملتے جلتے ہیں یا جو لوگ ان کے گرد و پیش نظر آتے ہیں، ان کی ہر حرکت کا مطالعہ بغور کرتے ہیں، ان کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں۔ اگر کوئی چیز ایسی مل جاتی ہے جسے وہ دلچسپ سمجھتے ہیں تو فوراً اسے اپنے افسانے کے لئے رکھ لیتے ہیں۔

اس کے علاوہ افسانہ نگار کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اشخاصِ قصہ کے غیر اختیاری افعال اور حرکات کو بھی مدِ نظر رکھے مثلاً رونے ہنسنے، بیہوش ہونے، غصہ کرنے وغیرہ سے بھی افرادِ قصہ کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ حرکات کس موقع پر کیسی ہونی چاہئیں اس کا جائزہ لینا افسانہ نگار کا فرض ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ قلبی کیفیتوں کے اظہار کے یہ ذرائع گفتگو سے زیادہ واضح اور مؤثر ہونے کے علاوہ عین فطری ہوتے ہیں۔

منشی پریم چند نے اپنی کہانیوں میں جابجا اس قسم کے غیر اختیاری افعال سے کیرکٹر نگاری میں مدد لی ہے اور نہایت خوش اسلوبی سے نباہا ہے، مگر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے جو لطف پیدا کیا ہے وہ منشی جی کے وہاں نہیں۔

اظہر علی فاروقی

اظہارِ عشق

میں آج کل اپنے گاؤں ضلع سرگودھا میں مقیم ہوں۔ گاؤں کے سادہ تمدن نے میرے دل و دماغ پر جو اثرات چھوڑے ہیں اُن کو ناظرین ہمایوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ الطاف

اس طرح جرأت کروں گا عشق کے اظہار کی

کھیت کو جب جائے گی تُو چھاچھ لیکر دھوپ میں — مُسکراؤں گا جوانی بن کے تیرے رُوپ میں

بانسری کی لَے میں تُو ہو جائیگی گُم جس گھڑی — مَیں تری آنکھوں میں بن جاؤنگا ساون کی جھڑی

رات کو چھیڑیگی جب چرخے کا تُو رنگیں ستار — مَیں ترے نغموں میں بن جاؤں گا ہلکا سا خمار

صبحدم جب گائیگی چکّی پہ تُو میکے کا راگ — مَیں ترے سینے میں بن جاؤنگا امیدوں کی آگ

تُو نہائے گی جو چھُپ کر کیکروں کی باڑ میں — بُلبلے کی شکل بن کر میں رہوں گا تاڑ میں

رات کے ہنگام سو جائے گی جب تُو کھاٹ پر — خواب میں بن کر کوئی چھیڑونگا تجھ کو گھاٹ پر

جب کبھی تُو جائے گی گرمی میں گیہوں کُوٹنے — بجلیاں بن بن کے گالوں سے لگوں گا ٹوٹنے

دِن ڈھلے جب لے کے چارہ آئیگی تو گاؤں میں — بن کے سبزہ لیٹ جاؤں گا میں تیرے پاؤں میں

دودھ دُہنے کی صدا پر جب لگے گی جھُومنے — بن کے گیسُو سرخ گالوں کو بڑھوں گا چُومنے

جب برستی رات میں گائے گی تُو میٹھے ملار — میں تری آنکھوں میں بن جاؤں گا ہلکی سی پھوار

اس طرح جرأت کروں گا عشق کے اظہار کی

الطاف مشہدی

برہا

سیمابی اور عنابی چھبتے ہیں اندھیری راتوں کے
جیسے منتر ہوں جنگل کے جادوگر کی باتوں کے
یا ساون کی کالی گھٹاؤں کی تیکھی برساتوں کے

دل پر چھانے والے نغمے، بیہوشی لانے والے!

ایسی راتیں: چند اگھونگٹ کاڑھے چپکے سوئے ہیں،
اور گنتی کے چند ستارے نیند میں کھوئے ہیں،
پیڑ اور پتّے، ٹہنی ٹہنی تاریکی میں دھوئے ہیں،

دل کو ڈرانے والے سائے، دل کو دہلانے والے!

سائے ـــ کالے کالے سائے رینگ رینگ کر چلتے ہیں،
اور ان کالے سایوں سے بھوتوں کے جھنڈ اُبلتے ہیں،
دل میں اندھے، بے بس، بے پایاں جذبات مچلتے ہیں،

گیت بنانے والے، نغمے چاہت کے گانے والے!

میرا جی

چوپٹ راجہ

ہندوستان کا ایک قدیم روایتی قصہ ڈرامے کی شکل میں

افرادِ تمثیل

گرو	بھگوان کے بھگت
چیلا	گروجی کا ناخلف اور پیٹو پیروکار
حلوائی	اندھی نگری کا دکاندار
بڑھیا	جس کا بچہ دب کر مر گیا
معمار	جس نے دیوار بنائی
بھٹے والا	جس نے مسالہ دیا
چوپٹ راجہ	اندھی نگری کا حکمران
منتری	چوپٹ راجہ کا مشیر کار
فالتو لوگ	گاہک، بھکاری، رعیت، چوبدار، خدام وغیرہ

پہلا منظر

(گرو اور اُن کا چیلا اُس بستی سے چل کر اندھی نگری میں داخل ہوتے ہیں، جہاں وہ تپ کیا کرتے تھے۔)

چیلا - کیوں گروجی! چوپٹ راجہ کی اندھی نگری یہی ہے؛

گرو - ہاں بیٹا - چوپٹ راجہ کی اندھی نگری یہی ہے - یہاں ہمیشہ سے اندھیر ہوتا چلا آرہا ہے اور اسی لئے اس کا نام اندھی نگری پڑ گیا ہے - اجنبی اور نئے آدمی کے لئے معاملہ بڑا کٹھن ہوتا ہے - بعض دفعہ تو بپتا کے چکر میں ایسا پھنس جاتا ہے کہ شنوائی تک نہیں ہوتی -

چیلا - واہ گروجی! یہ آپ نے کیا کہا؟ آپ کے ہوتے کسی کی مجال ہے کہ میرا بال بیکا کر سکے؟ آپ کے کرم سے

سب میری دل سے عزت کریں گے اور تھوڑے دنوں
کے اندر اندر میرے نام کا ڈھول یوں پٹنے لگے گا کہ دُور
دُور تک چرچا ہوگا۔ سب لوگ میرے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے

گرو۔ مجھے تو ایسی آس نہیں بلکہ کھٹکا ہے کہ کہیں تو اینچ پیچ میں
نہ آجائے اور پھر جان پر بن جانے کی نوبت نہ پہنچے۔

چیلا۔ اجی واہ گروجی! کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے۔ آپ تو
بات بات پر جی چھوڑ دینے کے عادی ہو گئے ہیں اور ساتھ
ہی مجھے بھی پھسڈی بنا رہے ہیں۔ بھلا یونہی بیٹھے بٹھائے
بلاوجہ میں اینچ پیچ میں آسکتا ہوں؟ اگر کوئی مجھے اس میں
لانے کی کوشش کرے تو وہیں کچومر نکال دوں۔

گرو۔ تُو تو نرا کاٹ کا اُلو ہے۔ نہ سمجھتا ہے نہ سوچتا ہے،
ذرا خیال تو کر کہ اتنی دُور سے چل کر آنے کی کونسی بیگاری
پڑی تھی؟

چیلا۔ واہ گروجی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بھلا بیگاری
ہی کوئی نہیں تھی، دھیان دیجئے کہ ایک تو اس نگری کے
باسی دھرم کو بھول بھال بھٹکتے پھر رہے ہیں اور دوسرے پرتا
کے کرم سے ٹکے سیر بھاجی اور ٹکے سیر کھاجا بکتا ہے۔ کھانے
پینے والے آدمی کے لئے مزے ہیں اور خوب گہرے ہیں۔

گرو۔ بس رہنے دے۔ اتنی سی بات پر اتنا ڈُن۔

چیلا۔ واہ گروجی! کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ اتنی بڑی بات
اور آپ اسے اتنی سی بنا رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ
آپ کے لئے اتنی سی ہو لیکن میرے لئے تو بہت بڑی ہے۔

گرو۔ پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ مجھے نظر آرہا ہے کہ
یہ نگری تجھے راس نہیں آئے گی اور تیرے ساتھ وہ معاملہ
ہوگا کہ دمڑی کی گڑیا، ٹکا سر منڈائی۔

چیلا۔ واہ گروجی! آپ نے تو غضب ڈھا دیا۔ سچ تو یہ ہے
کہ آپ دھرم پجاری ٹھیرے اور میں پیٹ پجاری۔
دیکھئے دونوں میں کتنا فرق ہے زمین آسمان سے بھی زیادہ۔

گرو۔ تیری اچھیا۔ تُو تو پکا ہٹ دھرم ہے۔ ہمیشہ اپنی بات
کی پچ کیا کرتا ہے۔ جو جی میں آئے کر! ہم تجھے روکتے
ٹوکتے نہیں۔ پھر بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنا اور
خوب چوکس ہو کر رہنا۔

چیلا۔ ہاں مہاراج! یہ تو مجھے کرنا ہی پڑے گا۔ ایسا نہ کیا تو
جگہ جگہ نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

گرو۔ بس ٹھیک ہے۔ دُکھ درد کا وقت آپڑے تو بھگوان
کا نام لے کر ہماری طرف دھیان لگالینا اور پندرہ بیس
بار ہمارے نام کی مالا جپ لینا پھر سب کشٹ دُور ہو جائینگے
اب تو بیشک جدھر جی چاہے چل پھر کیونکہ ہم نے تجھے
جہاں کہا تھا وہاں پہنچا دیا ہے اب ہم واپس جاتے ہیں۔

چیلا۔ ابھی سے کیا؟ نہیں مہاراج۔ دو چار دن تو ٹھیرئے
یہاں کا حلوا بڑا مزیدار ہوتا ہے اور پھر ٹکے سیر بکتا ہے۔
آپ دو چار سیر چکھ جائیے۔ یاد تو رہے گا۔

گرو۔ بس بیٹا! بھگوان تجھی کو دیں۔ ہمیں اس کا لوبھ نہیں۔
پربھو تیرا کلیان کریں۔ ہمیں واپس اپنی بستی میں جاکر
چلّہ کاٹنا ہے۔ لے ہم چلتے ہیں۔

(آناً فاناً گروجی غائب ہو جاتے ہیں)

چیلا۔ اوہ، گرو جی غائب بھی ہو گئے۔ چلو پنڈ چھٹا۔ اب تو آرام اور عیش کے دن بسر کروں گا۔ نہ کوئی فکر نہ کوئی دکھ۔ رات دن مزے ہی مزے ہوں گے۔ سکھ میں زندگی کٹے گی۔ اتنا حلوا کھاؤں گا کہ تھوڑے ہی دن میں یہ ہڈیاں چھپ جائینگی۔ اور ان پر اتنا ماس چڑھے گا کہ پورا بھینسا بن جاؤں گا۔

دُوسرا منظر

(سامنے حلوائی کی بہت بڑی دکان ہے جس پر گاہکوں کی خوب بھیڑ لگ رہی ہے۔ چیلا بھی ادھر ہی کا رُخ کرتا ہے)

حلوائی۔ اے لونڈے! یہ پکڑ آدھ پاؤ حلوا اور لو جی تم اپنا تین پاؤ کا دونا۔

بھکاری۔ بابا کچھ ہمیں بھی بھگوان کے نام پر دو۔

حلوائی۔ چلو چلو آگے بڑھو۔ اپنا رستہ لو۔ ہاں سادھو جی آپ کو کیا دوں۔

چیلا۔ دینا کیا ہے جو بیچتے ہو وہی دو۔ اور ہاتھی یا بیل تھوڑی دے سکتے ہو۔ یہ لو ایک دھیلا۔ کھرا کھوٹا ابھی سے دیکھ لو پھر نہ کہنا۔

حلوائی۔ اس کا حلوا پون پاؤ ملے گا۔

چیلا۔ وہ کس حساب سے؟ پاؤ بھر دو۔

حلوائی۔ دیکھئے نا آپ کے دھیلے میں چھید ہے۔

چیلا۔ چھید سے کیا ہوتا ہے؛ کوئی بھُس تھوڑی مل جاتا ہے، مال سے تو کھرا ہے۔

حلوائی۔ واہ کھرا کیسے ہوا؛

چیلا۔ اچھا تو لاؤ دھیلا واپس کر دو۔ میں اگلی دُکان جاتا ہوں۔

حلوائی۔ اچھا آدھ چھٹانک اور لے لو۔

چیلا۔ پورا ایک پاؤ دینا ہے تو دو۔ ورنہ سادھو کو خراب نہ کرو۔

حلوائی۔ اچھا مہاراج پورا پاؤ بھر لیجئے! تاؤ میں نہ آیئے۔

چیلا۔ واہ تاؤ میں کیسے نہ آؤں تم نے بات جو ایسی ہی کی۔

(حلوائی ترازو میں باٹ چڑھا کر حلوا تولتا ہے)

چیلا۔ ڈنڈی کیوں مارتے ہو؛ کیا کم دو گے،

حلوائی۔ نہیں مہاراج! نہ میں ڈنڈی مارتا ہوں، نہ کم دیتا ہوں آپ تو ناحق بے وار ہو رہے ہیں۔

چیلا۔ اچھا تو پھر بیچ بیچ میں سے گرم گرم تو دو گھی بھی آنے دو۔

حلوائی۔ گھبرایئے نہیں، سب کچھ آجاتا ہے۔ یہ لیجئے۔

(تولنے کے بعد سادھو کے ہاتھ میں دونا پکڑا دیتا ہے)

چیلا۔ ارے رے رے! یہ اس میں مکھی کیسی؛

حلوائی۔ یونہی آگئی ہو گی، نکال پھینکئے اسے باہر؛

چیلا۔ پھر اس کا بھی حصّہ دو۔ یہ بھی تول میں آئی ہے۔

حلوائی۔ یہ لیجئے اس کا بھی حصّہ۔

(حلوائی تھوڑا سا حلوا ڈال دیتا ہے)

چیلا۔ بس بس۔

(حلوا لے کر سادھو ایک طرف چلا جاتا ہے۔ چھوٹا سا پتھر دیکھ کر اس پر بیٹھ جاتا ہے اور حلوا کھانے لگ جاتا ہے۔ حلوا گرم ہونے کے باعث زبان جل جاتی ہے۔)

چیلا ۔ اوہ اوہ! جبہ جل گئی ۔ جبہ جل گئی ۔ لیکن مزا آگیا۔ واہ گروجی! خوب جگہ پہنچا گئے ۔ دن رات آنند سے حلوا کھایا کروں گا اور آپ کے گن گایا کروں گا لیکن کتنے دُکھ کی بات ہے کہ میں تو اس وقت چٹخارے لے لے کر حلوا کھا رہا ہوں اور آپ کسی برگد کی کھوہ میں بیٹھے تپ کر رہے ہوں گے (آدمے کے قریب حلوا ختم ہو چکتا ہے) اب اسی طرح کھاتے کھاتے بستی کو جی بھر کر دیکھنے نکل چلیں تو ٹھیک ہے ۔ ذرا یہاں کے باسیوں کے طور طریقے اور چوپٹ راجہ کے رنگ ڈھنگ دیکھیں ۔ آخر پتہ تو چلے کہ یہ بستی اندھی نگری کے نام سے کیوں مشہور ہے ۔

(سادھو وہاں سے اُٹھ کر چلا جاتا ہے ۔)

تیسرا منظر

(اندھی نگری کے قلب کا وہ حصہ جہاں کے مکان نہایت خستہ ہیں، اتفاق سے ایک مکان کی دیوار گرنے کو ہے کسی کا بچہ اسی دیوار کے نیچے آکر کھیلنے لگ جاتا ہے سادھو حلوا کھاتا کھاتا ادھر آنکلتا ہے ۔)

چیلا ۔ (دیوار گرتی دیکھ کر) ارے ارے دیوار گری ۔ اوہ اوہ کسی کا بچہ دبا ۔ ہائے ہائے ۔ بھاگو رے لوگو! نہیں تو بچہ اگلی دُنیا میں جا کر دم لے گا ۔ جلدی آؤ ۔ رے کوئی ہو تو! کتنے بے رحم ہو تم ۔ مرتی ہوئی جان کو نہیں بچا سکتے ۔

(کوئی مرد اِدھر آنکلتا ہے)

مرد ۔ تمہیں بچا لو نہ جو کھڑے مُنہ تک رہے ہو اور دوسروں کو بے رحم اور نہ جانے کیا کیا بنا رہے ہو ۔

چیلا ۔ اے واہ، آنکھوں پر پٹی باندھ کر پھر رہے ہو ۔ دیکھ بھی نہیں سکتے کہ میرے ہاتھ رُکے ہوئے ہیں ۔ ایک ہاتھ میں حلوا ہے اور دوسرے سے حلوا کھا رہا ہوں ۔ اگر کہیں تمہاری طرح میرے ہاتھ خالی ہوتے تو بچے کو دیوار کے نیچے ہی نہ آنے دیتا ۔

(لوگ آتے ہیں اور بچے کو نکالتے ہیں ۔ سادھو بھی وہاں آجاتا ہے)

چیلا ۔ اُف ، بیچارہ مر کر ہی رہا ۔

مرد ۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہؤا ۔ تم اگر تھوڑی دیر کے لئے مُنہ بند کر لیتے تو بچہ کبھی نہ مرتا ۔

چیلا ۔ اے واہ ۔ آنے میں تم لوگوں نے دیر کی اور اُلٹا مجھ سے اُلجھ رہے ہیں ۔ اگر میں آوازیں نہ دیتا اور چلّا چلّا کر نہ پکارتا تو تم کیسے آتے اور بچے کو بچاتے ۔ یہیں پڑا پڑا گل سڑ جاتا ۔

(اتنے میں بچے کی ماں آجاتی ہے)

ماں ۔ ہائے رے میرا بچہ، میرے دل کا ٹکڑا، میرا پیارا میرا تارا مجھ سے چھن گیا ۔

چیلا ۔ بڑھیا یوں بین نہ کر ۔ اس سے کچھ نہیں بنے گا ۔ کال کی چکی اسی طرح گھوما کرتی ہے ۔ اس کی ہتھی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے ۔

ماں ۔ مگر سادھوجی! میری تو زندگی کا یہی ایک سہارا تھا جس سے میں آس لگائے بیٹھی تھی ۔ اب میرے لئے جینا بیکار ہے

مرد۔ نہیں بڑھیا یوں دل نہ توڑ بلکہ حوصلہ کر! شاید بھگوان اس کا بدلہ تجھے کسی اور طرح دے دیں۔ یا اگلے جنم میں تجھے عوض دیں۔ دیکھ منتری جی ادھر آرہے ہیں، ان سے فریاد کر!

(منتری جی آ پہنچتے ہیں)

ماں۔ منتری جی مَیں بڑھیا عورت اس نامراد بڑھاپے میں آکر لٹ گئی۔ میرا ایک ہی بچہ تھا وہ دیوار تلے آکر دب گیا۔

منتری۔ تو پھر بھگوان سے کہہ جس نے یوں کیا، ہم نے تھوڑی دیوار گرائی ہے کہ تیرا بچہ دب گیا ہو۔

ماں۔ مہاراج اب تو آپ ہی میرے لئے بھگوان ہیں۔ کرنا چاہیں تو سب کچھ کرسکتے ہیں۔

منتری۔ اچھا تو کل آجانا۔ اس سامنے کے پنڈال میں مہاراج کا دربار لگوا دیں گے۔ تو اپنی فریاد ان سے کہہ دینا۔

ماں۔ اچھا مہاراج۔

(منتری جی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بڑھیا بچے کی نعش کو اُٹھا کر روتی پیٹتی گھر چل دیتی ہے۔ سادھو حلوا کھاتا کھاتا بستی کی سیر کرنے لگ جاتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔)

چوتھا منظر

(آج صبح ہوتے ہی ایک وسیع میدان میں چوپٹ راجہ کا دربار لگ گیا ہے۔ زریں تخت بچھ گیا ہے۔ مہاراج اس پر متمکن ہیں۔ خادم چنور کر رہا ہے۔ دائیں جانب منتری اور بائیں جانب دیگر امراء ایستادہ ہیں۔ اردلی، سپاہی اور محافظ دست بستہ سرنگوں کھڑے ہیں۔ میدان کے بیچوں بیچ پھانسی گاڑ دی گئی ہے۔

لوگ ہر چہار طرف سے ہجوم کر رہے ہیں۔ چیلا بھی تازہ تازہ حلوے کا دونا پکڑے آجاتا ہے۔)

چیلا۔ کیوں بھئی یہ ٹھٹ کیوں لگ رہا ہے۔ کوئی میلہ ہے یا کسی نٹ کا تماشا جو تمام لوگ ٹوٹ رہے ہیں۔

آدمی۔ میلہ یا تماشا ایسا ہوتا ہے۔

چیلا۔ اور کیا اس کے سر سینگ ہوتے ہیں۔

آدمی۔ سادھو مہاراج! یہ دربار لگا ہے۔ کل جو تمہارے سامنے بڑھیا کا بچہ دیوار تلے دب کر مر گیا ہے اُس کا فیصلہ ہوگا۔

چیلا۔ اے واہ، ایک دو دن کا 'پسکا' مرا ہے اور اس کے بعد اتنا دُن مچ رہا ہے کہ جیسے آفت ہی تو آگئی ہو۔

آدمی۔ آفت، آفت نہیں تو اور کیا! دیکھنا، تمہارے سامنے سامنے ہی کتنے لوگوں کو سامنے لگی ہوئی پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔

چیلا۔ واہ، یہ کیوں؛ بچہ مرا اپنی مرت، بھلا پھانسی کس بات کی؛ نہ کسی نے اسے جان بوجھ کر ہلاک کیا اور نہ کسی نے اسے مارنے کی کوشش کی۔

آدمی۔ بس دیکھتے ہی رہئے کیا ہوتا ہے۔

چیلا۔ پھر تو خوب موقع ہاتھ آیا۔ آج تو مزے لے کر اسی تماشے کو دیکھتے ہیں کہ کس طرح فیصلہ کیا جاتا ہے اور کس کس آدمی کو پھانسی چڑھایا جاتا ہے لیکن بھئی یہ تو بتاؤ، یہ

سامنے سنگھاسن پر کون بیٹھا ہے؟

آدمی۔ یہ اس نگری کے بدھیان راجہ ہیں۔

چیلا۔ بدھیان، واہ یہ بھی خوب کہی۔ ان کی تو اُونٹ کی طرح کوئی کل سیدھی ہی نہیں، یہ بدھیان کدھر سے ہیں؟

آدمی۔ بس جی، چھوڑو اس بات کو۔ نقیب ڈھول پیٹنے لگا ہے، خاموش ہو کر سب کچھ دیکھتے جاؤ۔

(ڈھول پٹتا ہے۔ بڑھیا دست بستہ سامنے حاضر ہو جاتی ہے)

راجہ۔ بڑھیا! تیرا بچہ کیونکر مرا؟

بڑھیا۔ مہاراج دیوار تلے آ کر۔

راجہ۔ پھر قصور کس کا ہوا؟

بڑھیا۔ مہاراج دیوار بنانے والے کا جس نے بے پروائی سے کچی دیوار کھڑی کر دی۔

راجہ۔ ٹھیک ہے۔ کہاں ہے دیوار بنانے والا۔ دیکھو پنڈال میں ہے۔

چوبدار۔ مہاراج وہ کھڑا ہے گھنے بڑ کی جڑ میں۔

راجہ۔ وہ جس کے ہاتھ میں تیشہ اور کرنی ہے۔

چوبدار۔ جی مہاراج۔

راجہ۔ بلاؤ اُسے، فوراً سامنے آئے۔

(دیوار بنانے والے کو حاضر کر دیا جاتا ہے۔)

چوبدار۔ حاضر ہے مہاراج!

راجہ۔ کیوں بے تُو نے دیوار کچی کیوں بنائی؟ تجھے پھانسی لگنے سے کونسا عذر بچا سکتا ہے؟ جلدی بول!

معمار۔ مہاراج میرا اس میں قصور ہی کوئی نہیں۔ سارا قصور تو بھٹے والے کا ہے جس نے مجھے کچا اور ردی مسالہ دیا۔

راجہ۔ اچھا تو پھر بھٹے والے کا پتہ دے یا اسے لا کر سامنے حاضر کر نہیں تو اس کے عوض تجھ کو پھانسی لٹکا دیں گے اور اسے تب پھانسی دیں گے جب وہ مل جائے گا۔

معمار۔ مہاراج، بھٹے والا تو وہ سامنے ہے۔ دیکھئے اونچے سے ٹیلے پر ایک پتھر کے ڈھیر پر بیٹھا ہے۔

راجہ۔ اچھا تو چوبدار تم اسے حاضر کرو تاکہ ہم اسے پھانسی پر لٹکائیں! بغیر کسی کو پھانسی دیئے خالی پھانسی کو نہیں اکھاڑیں گے۔

(چوبدار تھوڑی ہی دیر میں بھٹے والے کو حاضر کر دیتا ہے۔)

چوبدار۔ بھٹے والا حاضر ہے مہاراج!

راجہ۔ کیوں بے تجھے ہم نے اس لئے بھٹا بنانے دیا تھا کہ تو لوگوں کو کچا مسالہ دے جس سے کچی دیواریں بنیں اور بچے ان کے تلے دب کر مر جائیں۔

بھٹے والا۔ نہیں مہاراج! یہ بات نہیں ہے۔

راجہ۔ پھر کیا بات ہے؟

بھٹے والا۔ قصور سارا اس بڑھیا کا ہے۔

راجہ۔ بڑھیا کا؟

بھٹے والا۔ جی مہاراج۔

راجہ۔ وہ کیسے؟

بھٹے والا۔ وہ ایسے کہ اگر وہ بچے کی حفاظت کرتی تو نہ بچہ مرتا نہ مہاراج کو دربار لگانے کی بپتا اٹھانی پڑتی اور نہ مہاراج کے آرام میں خلل پڑتا۔

راجہ۔ شاباش! شاباش! خزانچی۔ اس بھٹے والے کو کل سے

تنخواہ دینا شروع کر دو اور یہ آج سے ہمارے منتریوں میں شمار ہوگا۔ اس نے ہمیں بڑے پتے کی بات بتائی۔ اصلی شکار تو اب پکڑا ہے۔ ہم ناحق دماغ کو پریشان کر رہے تھے۔ بس اب بڑھیا! تجھے پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔

بڑھیا۔ مہاراج!

راجہ۔ مہاراج وہراج کچھ نہیں، جلاد اس بڑھیا کو پھانسی پر لٹکا دو۔

(ایک آدمی سامنے آتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر کورنش بجا لاتا ہے)

آدمی۔ مہاراج اگر سچ پوچھیں تو قصور اس بڑھیا کا نہیں ہے۔

راجہ۔ بڑھیا کا نہیں ہے تو پھر اور کس کا ہے؛

آدمی۔ قصور اس حلوا کھانے والے سادھو کا ہے جس نے بچے کو نیچے آتا دیکھ کر جھٹ سے اسے بچا نہ لیا۔

راجہ۔ یہ بھی ٹھیک بات ہے۔ لیکن سادھو کہاں ہے اس کا پتہ دو نہیں تو اس کے عوض تمہیں پھانسی چڑھنا ہوگا۔

آدمی۔ مہاراج! سادھو وہ . . . . اس طرف بائیں کھونٹ پر کھڑا ہے۔

راجہ۔ چوبدار! بس پھر اسی کو پکڑ لاؤ!

(چوبدار سادھو کو لے آتا ہے)

چیلا۔ اے واہ مہاراج، مجھے آپ کیوں پھانسی پر لٹکایا چاہتے ہیں؛

راجہ۔ چپ رہو جی! ہم اکتا چکے ہیں اور اب کسی کا عذر سننے کو تیار نہیں۔ دن ڈوبنے کو آیا اور اب تک پھانسی پر ایک بھی نہیں چڑھا۔

چیلا۔ لیکن مجھے اپنا قصور معلوم ہونا چاہئے!

راجہ۔ ہمارا نہ تو اب دماغ کام کرتا ہے اور نہ اب ہم قصور وصور بتاتے ہیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ موت تمہارے لئے یقینی ہے اور کوئی طاقت تمہیں اس کے پنجے سے چھڑا نہیں سکتی شور مچانے کی بجائے بھگوان کی طرف دھیان دو اور اپنے کئے ہوئے پاپ بخشوا لو۔

چیلا۔ یونہی ہے تو میری دو آرزوئیں ہیں۔

راجہ۔ وہ کیا؛

چیلا۔ وہ یہ کہ اوّل تو حلوا کھا لینے دیجئے اور دوسرے اپنے گرو کو یاد کر لینے دیجئے۔

راجہ۔ ہاں تمہاری دونوں باتیں ہم منظور کرتے ہیں۔

(چیلا جلدی جلدی حلوا کھا لیتا ہے)

چیلا۔ چلو حلوا تو کھا لیا اب گرو جی سے نمٹ لوں۔

(آنکھیں بند کر کے گرو کی طرف دھیان دیتا ہے)

اے گرو جی! میں نے بڑا کیا جو آپ کی بات نہیں مانی، میری نادانی اور ہیٹوپن نے مجھے موت کے مُنہ میں ڈال دیا اب اس بھری دُنیا میں آپ کے سوا اور کون ہے جو مجھے پڑی ہوئی بپتا کے ہاتھوں سے چھڑا لے۔ آپ جھپ سے آیئے اور مجھے مصیبت سے نکالئے۔

(گرو جی کا ظہور)

گرو۔ کیا ہُوا ہے بیٹا؛

چیلا۔ گرو جی ہُوا کچھ نہیں، یہ لوگ بلا وجہ مجھے پھانسی دے رہے ہیں۔

گرو۔ تجھے تو ہم نے کہا تھا کہ یہاں ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔

چیلا۔ یہ تو ٹھیک ہے گروجی! پر اس وقت کچھ جتن کیجیے۔

گرو۔ اچھا تو لا پھانسی کا پھندا ہمارے حوالے کر!

چیلا۔ نہیں مہاراج! اگر یہی بات ہے تو پھر میں ہی ٹھیک ہوں۔

گرو۔ ہٹ دکر۔ پھندا میرے حوالے کر۔

چیلا۔ اوں ہوں، آپ پھانسی چڑھ گئے تو میں آپ کے بغیر کیسے جی سکوں گا۔ مہاراج پھانسی میں ہی چڑھوں گا۔

راجہ۔ یہ جھگڑا کیسا ہے؟

چوبدار۔ مہاراج جھگڑا یہ ہے کہ ایک کہتا ہے کہ میں پھانسی چڑھوں گا اور دُوسرا کہتا ہے میں چڑھوں گا۔

راجہ۔ کیوں سادھو کیا بات ہے؟

چیلا۔ مہاراج بات صرف سورگ کی ہے۔

راجہ۔ سورگ کی، وہ کیسے؟

چیلا۔ وہ ایسے کہ آج کے دن جو کوئی بھی پھانسی لگے گا، وہ سیدھا سورگ میں پہنچے گا اور بھگوان اسے درشن دیں گے۔

راجہ۔ اچھا یہ بات ہے؟

چیلا۔ ہاں مہاراج یہ بات ہے۔

راجہ۔ اچھا تو لاؤ پھانسی مجھے چڑھنے دو۔

منتری۔ مہاراج یہ آپ کیا کرنے لگے۔

راجہ۔ منتری، تم دُنیا کے لوگ اس میں دخل مت دو۔

چوبدار۔ مہاراج یہ کیا!

راجہ۔ چُپ رہو!

(راجہ تخت سے اُتر کر پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لیتا ہے)

آوازیں۔ مہاراج! مہاراج!! مہاراج!!!

(ایک ہی جھٹکے میں راجہ کا دم نکل جاتا ہے)

پانچواں منظر

(نگری کے ایک طرف)

چیلا۔ بس گروجی، آپ کی کرپا سے سارا پاپ کٹ گیا۔

گرو۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں۔

چیلا۔ اچھا گروجی! (گروجی غائب ہو جاتے ہیں) گئے۔ ارررر۔ یہ بھی بوجھ ہلکا ہوا۔ ذرا دھوتی میں سے حلوا تو کھول لوں، کہیں ٹھنڈا نہ ہو گیا ہو۔ نہیں نہیں گرم ہے، آہا مزا آ گیا۔

(ایک بڑ کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھتا ہے اور گانے لگ جاتا ہے)

جھوٹا سب سنسار

پیارے

رین بسیرا یہ دُنیا ہے دم بھر میں دم پار

کھانا ہے تو کچھ کھا پی لے باقی دن دو چار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

(پردہ گرتا ہے)

جھُوٹ

مَوت کے بعد آئیگی
اَور بھی اِک زِندگی
جاودانی زندگی!
غیرفانی زندگی!
اِک بہارِ بے خزاں
اِک نشاطِ بے کراں
لذّتیں، کیفیتیں!
راحتیں ہی راحتیں!
کتنا دلکش ہے یہ جھُوٹ!

سعید احمد اعجاز

انقلاب

تو مائلِ جفا نہیں، کیا انقلاب ہے
میں قائلِ وفا نہیں، کیا انقلاب ہے

میں التفات خواہ نہیں کتنا ظلم ہے
تُو صبر آزما نہیں، کیا انقلاب ہے

تسلیم کر رہا ہوں کہ ننگِ وفا ہُوں میں
تُو میرا ہمنوا نہیں، کیا انقلاب ہے

ہوں دست کش میں تیری محبت سے بیدریغ
اور تجھ کو کچھ گلا نہیں، کیا انقلاب ہے

میں ہوں مُصر کہ ظلم کی تجدید چاہیئے
تجھ کو مگر روا نہیں، کیا انقلاب ہے

تُو کر رہا ہے میری محبّت کا احترام
اور مجھکو اعتنا نہیں، کیا انقلاب ہے

وہ بدگمانیاں، وہ تغافل، وہ بے رُخی
وہ شیوۂ جفا نہیں، کیا انقلاب ہے

اب کیوں نہیں تسلسلِ وعدہ کا اہتمام
کیوں شوقِ التوا نہیں کیا انقلاب ہے

غم اتنا بڑھ گیا ہے کہ مِٹتا نہیں عدمؔ
اب مے بھی غم رُبا نہیں، کیا انقلاب ہے

عدمؔ

فلسفہ اور اُس کے نقّاد

سماج کی ترقی کا راز یہ ہے کہ بعض افرادانسانی اوسط سے ہمیشہ مختلف و ممتاز ہوتے ہیں - اب ان کا یہ اختلاف یا امتیاز چونکہ بیشتر نہایت جاذبِ توجہ یا مفید ہوتا ہے اس لئے ان کے قبائل انہیں اپنا قائد بنا لیتے ہیں اور وہ یوں نئے نئے نصب العین قائم کرنے لگتے اور محسُود یا محبوبِ خلائق بن جاتے ہیں -

ایسے ہی لوگوں میں ان محدود افراد کا بھی شمار ہے جو نظریوں کے غیر معمولی دلدادہ ہوتے ہیں اور جن سے کوئی انسانی نسل خالی نہیں ہوتی یہ لوگ ایسے معاملات میں حیران اور پریشان ہوتے ہیں جن میں دوسروں کو کوئی حیرانی اور پریشانی محسوس نہیں ہوتی ان کا تخیل توجیہات ایجاد کرتا، اور انہیں باہم ملاتا رہتا ہے - وہ اپنے زمانہ کے جُملہ علوم پر کافی عبور رکھتے ہیں، آیندہ کی باتیں بتلاتے ہیں، تنبیہیں کرتے ہیں اور عقلاء کہلاتے ہیں، انہی کی کارگزاری کا نتیجہ فلسفہ ہے جو اشتقاق اور مادہ کے لحاظ سے "دانائی کی محبت" کا مفہوم ادا کرتا ہے - ان سے وہ اشخاص بھی دلی رغبت اور عقیدت رکھتے ہیں جو نہ ان کی باتوں کو سمجھتے ہیں اور نہ ان کے حقائق پر یقین لاتے ہیں -

اس طرح فلسفہ ایک نسلی ورثہ اور علوم کا ایک نہایت زبردست مجموعہ ہے - ایسی صُورت میں اس سے کیمیا اور فلکیات جیسی مخصوص حکمتوں کو جُدا کر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا مگر عام طور پر چونکہ مخصوص حکمتوں کو فلسفہ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اس لئے میں یہاں یہی بتلاؤں گا کہ ایسا کیوں کیا گیا مخصوص حکمتوں کو فلسفہ سے نکال دینے کے بعد باقی جو چیز بچ رہتی ہے اس کو فلسفہ سے ہی شخص تعبیر کر سکتا ہے جس کی اغراض نہایت وسیع ہوں -

مخصوص حکمتوں کو جب فلسفہ سے خارج کر دیا گیا تو اس کی وسعت میں خاصہ فرق پیدا ہو گیا - اب وہ عبارت ہو کر رہ گیا صرف کُلی تصورات سے کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس کا منتہا کیا ہے؟ انسانی علم کی شرطیں کیا ہیں؟ عمل کے عام سے عام قواعد کونسے ہیں؟ دیوتاؤں، انسانوں، حیوانوں اور پتھروں میں کون عناصر مشترک ہیں؟ اور توجیہ کے وہ اصول کونسے ہیں جو جملہ چیزوں کی تہ میں مستور ہیں؟ یہ وہ مسائل ہیں جو عام طور پر اعلےٰ درجہ کے فلسفیانہ مسائل خیال کئے جاتے ہیں - اور فلسفی وہ ہے جو ان کے متعلق بہت کچھ کہتا اور کہہ سکتا ہے - متداول درسی کتابوں میں فلسفہ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ "اشیاء کا اشیاء کی انتہائی علّتوں کے ذریعے ایک ممکن الحصول علم ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ فلسفہ کا مقصد کائنات کی توجیہ ہے، اس کی جزئیات کا بیان نہیں - ایسی صُورت میں کسی خیال کے فلسفیانہ ہونے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں :-

(۱) ایک یہ کہ وہ بہت زیادہ وسیع ہو -

(۲) دوسری یہ کہ وہ اور خیالات سے زیادہ ربط رکھے۔ اور

(۳) تیسری یہ کہ اپنی صفائی میں وہ ایسے اصُول پیش کر سکے جو قریبی یا وسطانی نہیں بلکہ انتہائی اور ہمہ گیر ہوں۔

اس اعتبار سے دُنیا کا ہر ایک ہمہ رس نظریہ فلسفہ ہے خواہ وہ مبہم ہی کیوں نہ ہو۔ یوں فلسفہ تصورِ کائنات ہے یعنی زندگی کی ایک عقلی حیثیت۔ پروفیسر ڈیوے کہتا ہے کہ فلسفہ سے عقل اور ارادہ کی مجموعی تربیت کا اظہار نہیں ہوتا کیونکہ اس تربیت کے حدود بہ خوبی متعین ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ ان دونوں کے ایک خاص انداز، ایک خاص مقصد اور ایک خاص مزاج کی چغلی کھاتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اپنے اس قول میں جملہ حقیقی فلسفوں کی ترکیب کو جس بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے وہ اظہر کالشمس ہے[۱]۔

کوئی تعلیم اُس وقت تک اعلےٰ کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں دو امُور کا خاص اہتمام نہ ہو۔ ایک تو انسانی فکر کے جملہ مختلف مگر اہم شئوں کے پورے علم کا اور دوسرے ان شئوں کی موافق دلیلوں کے کامل وقوف کا۔ تعلیم یوں تو خشک ادعائی طریقوں پر بھی ہو سکتی ہے اور فلسفیانہ طریقہ پر بھی۔ لیکن ان میں جو فرق ہے وہ کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جس شخص نے کسی فنی مدرسہ میں تعلیم پائی ہو وہ اس میں شک نہیں کہ بعض امُور کو مشینی انداز میں انجام دینے کی بہترین صلاحیت اپنے میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن وہ ذہنی مجد و شرف جو صرف اعلےٰ تربیت و تہذیب ہی کا لازمہ ہے کبھی اس میں پایا نہ جائے گا۔ سو و نزاہد صورہے گا شائستہ کبھی نہیں ہوگا۔ پھر عقلی اعتبار سے بھی اپنے مخصوص موضوع کی لکیر کا فقیر ہوگا۔ معانی سے سروکار نہ رکھے گا، الفاظ پر جان چھڑکے گا۔ جو کچھ ایک مرتبہ دیکھ لیا اس سے اختلاف کے امکان کا قائل نہ ہوگا، تخیل سے معذور، اخلاقی ماحول سے عاری، اور ذہنی تدبر سے عاجز اور قاصر رہے گا۔

افلاطون اور ارسطو کے قول کے بموجب فلسفہ چونکہ حیرت سے شروع ہوتا ہے اس لئے وہ ہر چیز کو اس کی حقیقت سے مختلف خیال کر سکتا ہے، وہ مالوس کو نامانوس اور نامانوس کو مانوس سمجھ سکتا ہے، وہ بہت سی باتیں اختیار کر سکتا اور پھر انہیں تج سکتا ہے۔ اس کے سر میں ایک ایسا سودا سمایا ہوا ہے جو اسے کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ بلکہ ہر موضوع پر چھا جانے کے لئے یکساں اُکساتا رہتا ہے، وہ ہمیں اپنی پیدائشی ادّعائی نیند سے جگاتا اور ہمارے پختہ تعصبات کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے وہ انسانی ذوق کی اُن چار مختلف قسموں کے باہمی تصادم کا نتیجہ ہے جنہیں ہم سائنس، شاعری، مذہب اور منطق کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ اس نے سخت کوشش اور محنت طلب استدلال کے ذریعہ ایسے نتائج کی بے حد چھان بین کی ہے جو جذباتی لحاظ سے قابلِ قدر اور سُود مند ہوں۔ انہی تمام باتوں کے پیشِ نظر اس سے کچھ نہ کچھ مس رکھنا اور اس کے اثر و نفوذ کو سمجھنا ادب اور حکمیات دونوں کے متعلمین کے لئے کافی مفید ہے، اپنی شاعری کے ذریعہ وہ ادبی ذوق رکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن اس کی منطق انہیں سخت کاربناتی اور ان کی نزاکت اور سادگی دُور کر دیتی ہے۔ اپنی منطق کے ذریعہ وہ ماہرینِ حکمیات کی توجہ کو جذب کرتا ہے لیکن اپنے دوسرے پہلوؤں سے

---

[۱] فلسفہ اور نفسیات کی لُغت مرتبہ بالڈون میں فلسفہ کا مقالہ ملاحظہ فرمایئے۔ مصنّف

ان میں ملائمت پیدا کرتا اور انہیں اصطلاحات کی خشکی اور گرانباری سے بچا لیتا ہے، لہٰذا ادب اور سائنس دونوں کے طلبہ کو چاہئے کہ وہ فلسفہ سے ایک زندہ جوش، ایک نئی قوت، اور ایک خوش نما پس منظر حاصل کریں۔ سچ اسٹون نے ایک دفعہ ایک گڈریے سے پوچھا تھا "اماں تجھ میں کچھ فلسفہ بھی ہے؟" اور یہ سوال ایسا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کو دوسرے سے ہمیشہ پوچھتے رہنا چاہئے جس انسان میں کچھ فلسفہ نہیں وہ سخت منحوس اور بڑا بے فیض شخص ہے۔

باوجود ان تمام فائدوں کے جن کو میں نے سطور بالا میں گنایا ہے فلسفہ کے باقاعدہ دشمن بھی بہت سے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد کسی زمانہ میں اتنی زیادہ نہ تھی جتنی کہ آج کل ہے۔ اس کی کچھ ذمہ داری تو سائنس کی معین فتوحات اور فلسفیانہ نتائج کی صریح غیر محدودیت پر عاید ہوتی ہے اور بقیہ انسان کے ذہن کی اس پیدائشی ناہمواری پر جو مصطلحات اور تجریدیات کا مضحکہ اُڑانے میں ایک شیطانی لطف محسوس کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ بہت سوں کے نزدیک صرف مدرسیت کی اصطلاحی بولی اور جدلیات کے مترادف ہے۔ اشیا کی ماہیت اور علتوں کے متعلق فلسفی کے خیالات چونکہ ہمیشہ مبہم اور غیر یقینی ہوا کرتے ہیں اس لئے اُسے ایک ایسے اندھے آدمی سے تشبیہ دی گئی ہے جو ایک تاریک کمرہ میں اس سیاہ بلی کی تلاش کر رہا ہے جو وہاں موجود نہیں اور اس کے پیشہ کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ مسلسل بھٹکنے اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچنے کا فن ہے۔

اس قسم کی دشمنی صرف ایک حد تک درست ہو سکتی ہے چنانچہ میں ذیل میں ان چند اعتراضوں کے جواب دینے کی کوشش کروں گا جو فی زمانا رائج اور عام ہیں۔ ان کو میں سلسلہ سے یکے بعد دیگرے پیش اور رد کروں گا کیونکہ ان کے رفع کرنے میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہماری رسائی اپنے موضوع کے قلب کی گہرائیوں تک بآسانی ہو سکتی ہے۔

پہلا اعتراض:۔

حکمتیں مستقل اور مسلسل ترقی کرتی ہیں اور ان کے استعمال سے بے نظیر فایدے حاصل ہوتے ہیں لیکن فلسفہ نہ تو کوئی ترقی کرتا ہے اور نہ اس کے استعمال سے عملی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

اس کا جواب:۔

یہ اعتراض ناانصافی پر مبنی ہے کیونکہ مخصوص حکمتیں فلسفہ ہی کے درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔ جب سوالوں کے جواب صحت کے ساتھ یعنی بالکل نپے تُلے انداز میں ادا ہونے لگے تو ان جوابوں کو حکمی کہا گیا اس طرح جس کو ہمارے زمانہ میں لوگ فلسفہ کہتے ہیں وہ ان سوالوں کا تلچھٹ اور مجموعہ ہے جو ابھی قطعی جواب کے شرمندہ نہیں ہوئے۔ نفسیات اور حیاتیات کی حکمتوں نے ابھی ابھی مادرِ فلسفہ کی آغوش سے علیحدگی اختیار کی ہے اور اپنے استقلال کا جشن منایا ہے۔ ایک جامع اور مانع فلسفہ میں ہمیشہ مخصوص حکمتوں کی تفصیلی جزئیات بہ تمام وکمال موجود نہیں ہو سکتیں کیونکہ وہ ان پر اپنا اتنا وقت صرف نہیں کر سکتا جتنا کہ کوئی مخصوص حکمت کر سکتی ہے۔

اس جگہ اگر ہم فلسفہ کے ارتقاء پر ایک سرسری نظر ڈال لیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ ہر خطۂ زمین کے ابتدائی فلاسفہ جامع العلوم عقلاء تھے وہ عام طور پر "محبانِ دانش" کہلاتے تھے۔ ان میں سے بعض پر مذہبی یا اخلاقی رنگ بے حد غالب تھا اور بعض اس سے بالکل کورے تھے۔ وہ نہایت عدل پرور تھے۔ ان میں تجسس اور کھوج کا مادہ حاضر علمی ضروریات کی حد سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان کے سامنے مخصوص مسائل نہ تھے بلکہ وہ خود مسائل پیدا اور پیش کر رہے تھے۔ اس قسم کی بزرگ محترم اور دانشمند ہستیاں یوں تو چین، ایران، مصر اور ہندوستان میں بکثرت ہو گزری ہیں لیکن جن عقلاء نے مغربی قوتِ فکر کو حال حال تک اپنا بندۂ بے دام بنا رکھا وہ سب یونان کی پاک اور مردم خیز سرزمین کے سپوت تھے، ابتدائی یونانی فلسفہ کی عمر تقریباً ڈھائی ہزار سال ہے یعنی یہ دور ۶۰۰ ق۔م سے ۳۵۰ ق۔م تک قائم رہا طالیس ہرقلیطوس، فیثاغورث، برمانیدس، انیکساغورث، انباذقلس اور دیمقراطیس اسی عہد کی پیداوار ہیں۔ یہ سب کے سب ریاضیات، الٰہیات، سیاسیات، فلکیات، اور طبیعیات کے ماہر تھے گویا ان کے زمانہ کا پورا علم ان کا خانہ زاد و غلام تھا۔ فلاطون اور ارسطو نے انہی کی روایات کو زندہ اور برقرار رکھا۔ اور قرونِ وسطیٰ کے فلسفیوں نے تو ان روایات کے انطباق اور اطلاق کے دائرہ کی توسیع کے سوا اور کچھ کام ہی نہیں کیا۔ اگر ہم اکویناس کی "الٰہیاتِ عامہ" کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں ہر چیز کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ خدا سے لے کر مادہ تک کوئی چیز ایسی چھوٹنے نہیں پائی جس پر اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔ فرشتے، انسان اور شیطان سبھی کچھ اس لپیٹ میں آگئے علاوہ اس کے ہر چیز کے ساتھ دوسری چیز کے تعلقات پر، معلوم کے ساتھ عالم کے تعلقات پر، مخلوقات کے ساتھ خالق کے تعلقات پر، صُور کے ساتھ جواہر کے تعلقات پر، جسم کے ساتھ ذہن کے تعلقات پر اور نجات کے ساتھ گناہ کے تعلقات پر بھی کافی سرمغزنی کی گئی ہے غرضکہ اس کتاب میں فرائض اور اخلاق کے نظام کی، الٰہیات کی اور نفسیات کی جملہ جزئیات بہ تمام و کمال بیان کردی گئی ہیں طبیعیات اور منطق سے البتہ زیادہ اعتنا نہیں کیا گیا۔ بلکہ صرف ان کے کُلّی اصُول قائم کردیئے گئے ہیں، اس کتاب کے مطالعہ کا قاری پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اس کے مصنف کو مافوق الانسانی عقل کا مالک سمجھنے لگتا ہے لیکن اکویناس نے واقعات یا مفروضہ واقعات سے بحث کرنے کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ آج کل کے رائج اسلوب سے بے حد مختلف ہے۔ اس نے ہر چیز کو یا تو مقررہ عقلی اصُولوں سے ثابت اور مستنبط کیا ہے یا پھر کتب مقدس سے بمثال کے طور پر اجسام کے خواص اور تغیرات کو لیجیے جن کی توجیہ اس نے ارسطو کی تقلید میں مادہ اور صورت کے ذریعہ کی ہے۔ مادہ ذی کمیت، تعین پذیر اور انفعالی عنصر تھا اور صُورت ذی کیفیت، تعین بخش اور فعلی۔ ہر فعلیت کی ایک غایت تھی اور اشیاء ایک دوسرے پر اسی وقت عمل کرسکتی تھیں جب کہ وہ ایک دوسرے سے متصل ہوتی تھیں۔ اشیاء کی انواع کی تعداد معین تھی اور ان کے اختلافات مستقل تھے وغیرہ وغیرہ۔[1]

---

[1] جے۔ رکابی کی تصنیف "مابعد الطبیعیاتِ عامہ" (مطبوعہ لانگ مینز گرین اینڈ کو) میں قدیس ٹامس اکویناس کے فلسفۂ فطرت کی عام پسند تلخیص پیش کی گئی ہے۔ ٹامس جے ہاڑ کی کتاب "مدرسیت کی مابعد الطبیعیات" (مطبوعہ میکملن) میں بہت زیادہ تفصیلات مذکور ہیں۔ (مصنف)

سترھویں صدی کی ابتدا کے ساتھ ہی لوگوں میں مدرسیت کی مخالفت کا رجحان عام ہو گیا۔ وہ اس کے دقیق حضوری اسالیب سے اُکتا گئے۔ سُواریز کے رسالے بھی مخالفت کی اس آگ کو بجھا نہیں سکے۔ ڈی کارٹ کے نئے فلسفہ نے اگرچہ مدرسی تعلیمات کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکا اور یورپ کے علمی مطلع پر حیرت انگیز سرعت رفتار کے ساتھ چھا گیا۔ لیکن اس میں پھر بھی ہمہ گیری کی وہی پچھلی روح کام کر رہی ہے، ڈی کارٹ کو ہم اس زمانہ میں ایک ایسا ماہر مابعد الطبیعیات جانتے ہیں جس نے من اندیشم پس من ہستم کہہ کر ذہن اور مادہ کے متضاد جواہر میں فرق کیا اور خدا کی ہستی کا ایک نیا ثبوت بہم پہنچایا لیکن اس کے ہم عصر اس کی نسبت وہی رائے رکھتے تھے جو آج کل ہم ہربرٹ اسپنسر کی نسبت رکھتے ہیں یعنی وہ ایک ایسا شخص سمجھا جاتا تھا جو کائناتی ارتقار کا قائل تھا اور جس نے مادہ کو پھر سے مادہ و حرکت میں تقسیم کر کے اور تصادم کے قوانین سے کام لے کر افلاک کی گردش کی، خون کے دَوران کی، جسم اور ذہن کے ارتباط کی، روح کے نفوذ کی، اور نور کے انحراف کی توجیہ باحسن الوجوہ کر دی۔

ڈی کارٹ نے ۱۶۵۰ میں وفات پائی اور لاک کی کتاب فہم انسانی ۱۶۹۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت سے فلسفہ کی تاریخ کا ایک بالکل نیا باب کھلا، یہ باب عملیات کا تھا جس پر غور کرنے سے فلسفہ تنقیدی بنتا گیا۔ ہر چند کہ لائب نز جیسے آفاقی عاقل کا دبستان ہمہ گیری کی روایت کا پورا پورا حامل تھا اور وُولف نے طبیعی اور اخلاقی مباحث پر متعدد رسالے تصنیف اور شائع کئے تھے لیکن یہ موضوعی رُجحان پھر بھی ترقی پاتا رہا۔ لاک نے اپنا سجادہ ہیوم کے حوالہ کیا جس نے اپنی تشکیک سے کانٹ کو ادّعائی نیند سے جگایا۔ کانٹ کے زمانہ سے فلسفہ کا لفظ طبیعی نظریوں سے زیادہ عقلی اور اخلاقی قیاس آرائیوں پر دلالت کرنے لگا چنانچہ حال حال تک فلسفہ کو "ذہنی یا اخلاقی فلسفہ" یا صرف "انسانی ذہن کا فلسفہ" کہا جاتا تھا تاکہ اس میں اور فلسفۂ فطرت یا طبیعیات میں امتیاز قائم رہے۔

لیکن قدیم روایت بہتر بھی ہے اور مکمل بھی۔ جس دُنیا میں ہم رہتے سہتے ہیں اس کی خصوصیات کا جاننا اتنا ہی اہم ہے جتنا یہ جاننا اہم ہے کہ وہ ممکن کیسے ہے؟ اس کے باوجود کانٹ کے بیشتر متاخرین کا خیال تھا کہ مؤخر الذکر علم ہی صحیح معنوں میں فلسفیانہ علم ہے۔ عام انسان اس سوال کو کہ "فطرت کیسی ہے؟" اتنا ہی دلچسپ سمجھتے ہیں جتنا کانٹ کے اس سوال کو کہ "فطرت ممکن کیسے ہے؟" لہٰذا فلسفہ اگر انسانی التفات سے محروم نہیں ہونا چاہتا تو یہ ضروری ہے کہ وہ موضوعیت کی بیڑیوں کو اُتار پھینکے اور خارجی دُنیا کی طرف متوجہ ہو۔ کیونکہ معروضیت کی طرف لوگوں کا میلان بڑھ رہا ہے[1]۔

فلسفہ کے حقیقی معنی انسانی سوچ کے ہیں، یہ سوچ عموماً کلیات سے تعلق رکھتا ہے جزئیات سے نہیں۔ لیکن اس کا تعلق خواہ کلیات سے ہو یا جزئیات سے انسان کے سوچنے کے اسالیب ہمیشہ یکساں رہے ہیں، وہ ہمیشہ مشاہدہ کرتا ہے، امتیاز کو بروئے کار لاتا ہے تعمیم سے کام لیتا ہے، تبویب کا عمل انجام دیتا ہے، علل کا متلاشی رہتا ہے، مماثلتوں کا پتہ لگاتا ہے اور انتزاعات ترتیب

---

[1] پاسن نے "مقدمۂ فلسفہ" میں اس زاویۂ نظر کی بہترین ترجمانی کی ہے ملاحظہ ہوں ص ۱۹ تا ۴۴۔ مصنف

دیتا ہے لیکن فلسفہ کو اگر سائنس سے مختلف خیال کیا جائے تو پھر اس کا کوئی خاص اسلوب نہیں رہتا۔ ہمارا فکر ابتدا سے موجودہ صورت میں نہیں ہے اس نے تاایں دم کئی پلٹے کھائے ہیں جن میں سے دو نہایت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے یقینیات کے اظہار میں وہ پس و پیش کرنے لگا اور دوسرا یہ کہ ان کی تصدیق اور توثیق کے کھوج کا عادی ہو گیا[1]۔

اس جگہ اگر ایک سرسری نظر فکر کے ارتقاء پر ڈال لی جائے تو مناسب ہو گا کیونکہ اس سے ہمیں بہ آسانی پتہ چل جائے گا کہ ہمارا فکر کن جولانوں سے ہوتا ہوا موجودہ حالت کو پہنچا ہے۔

آگست کومت ایک فرانسیسی فلسفی ہے، اس نے ایک فلسفہ ایجابی فلسفہ[2] کے نام سے مرتب اور پیش کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسانی فکر یکے بعد دیگرے تین مرحلوں سے گزرا ہے گزرتا ہے۔ پہلا مرحلہ الٰہیات کا ہے دُوسرا مابعد الطبیعیات کا اور تیسرا حکمیات کا۔ الٰہیاتی مرحلہ میں وہ مظاہر کی توجیہ بھوت پریت کے ذریعہ کرتا ہے کیونکہ وہی اس کے نزدیک ان مظاہر کے مسبب ہیں۔ مابعد الطبیعیاتی مرحلہ میں وہ مظاہر کے ذاتی خواص کو مجرد تصورات کی صورت میں تبدیل کرتا اور یہ مانتا ہے کہ وہ مظاہر کی توجیہہ کئے دیتے ہیں اور حکمیاتی یا ایجابی مرحلہ میں وہ مظاہر کو سائنٹیفک طور پر یعنی سیدھے سادے انداز میں بیان کرتا ہے۔ یوں گردش سیارگاں کا الٰہیاتی نظریہ یہ ہو گا کہ سیارے ارواح عالیہ ہیں اور انسانی قسمت کا دروبست ان کے اختیار میں ہے مابعد الطبیعیاتی نظریہ یہ ہو گا کہ ان میں کشش ہے اور ایجابی نظریہ یہ ہے کہ وہ کلیۃً مرتبات کے تابع ہیں۔

کومت کا بیان نہایت نپا تلا ہے۔ چنانچہ انسانیات کا مطالعہ شہادت دیتا ہے کہ انسان نے ابتدا میں الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کو بے طرح گڈمڈ کر دیا ہے۔ معمولی چیزوں کے لئے اس کے نزدیک کسی توجیہ کی ضرورت نہ تھی البتہ انوکھی چیزیں مثلاً موت، مرض اور مصیبت البتہ ایسی تھیں جنہیں توجیہہ طلب سمجھا جاتا تھا۔ اشیاء کی پُراسرار قوت ان کے اثر کی ذمہ دار تھی جو چیز جتنی زیادہ خوفناک ہوتی تھی اتنی ہی یہ پُراسرار قوت اس میں زیادہ پائی جاتی تھی۔ ہر بڑی چیز میں یہ "منؔ"[3] لازماً موجود ہوتا تھا۔ لہٰذا انتہائی قدیم زمانہ میں جو چیز فلسفہ تھی وہ اب "ہم احساسی سحر" کہلاتی ہے یعنی اگر آپ کسی چیز پر اثر ڈالنا چاہتے تو یہ لازمی تھا کہ آپ کوئی ایسی چیز حاصل کرتے جو اس کے ساتھ رہ چکی ہے یا پھر اس کے مشابہ ہے۔ اس طرح اگر آپ اپنے دشمن کا پتلا بناتے یا اس کے کچھ بال یا ناخن یا ایسی چیزیں حاصل کر سکتے یا اس کا نام ہی کسی پرچہ کاغذ پر لکھتے اور اس کو جلاتے یا اور طرح کی تکلیف دیتے تو آپ اپنے دشمن کو نقصان پہنچا سکتے تھے گویا

---

[1] جی۔ ایچ۔ لیویس کی کتاب "ارسطو" کا باب چہارم دیکھئے۔ مصنف

[2] فلسفہ ایجابی۔ چھ جلدوں میں۔ مطبوعہ پیرس۔ ۱۸۳۰ - ۱۸۴۲۔ مصنف

[3] آسٹریشیائی زبانوں کے گھرانے میں ایک زبان پولی نیشیائی ہے۔ منؔ اسی پولی نیشیائی زبان کا ایک لفظ ہے۔ جزائر پولی نیشیا کے قدیم باشندوں کا عام اعتقاد یہ تھا کہ سرداروں طبیبوں اور مشاہیر وقت میں ایک پُراسرار قوت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں یہ قوت بے جان چیزوں اور جانداروں سے بھی منسوب کی جاتی تھی۔ مترجم

قائم مقام کو نقصان پہنچانا اصل کو نقصان پہنچانا تھا۔ اسی طرح اگر آپ بارش چاہتے تو زمین پر چھڑکاؤ کرتے اگر ہوا چاہتے تو سیٹی بجاتے وغیرذالک اگر آپ کی یہ خواہش ہوتی کہ آپ کے باغ میں اردیاں خاطرخواہ پیدا ہوں تو یہ ضروری تھا کہ آپ ایک ایسا پتھر باغ میں نصب کرتے جو اروی کے مماثل ہوتا۔ اگر آپ یرقان کا علاج کرنا چاہتے تو مریض کو ہلدی استعمال کرانی پڑتی جو اشیاء کو پیلے رنگ میں رنگ دیتی ہے یا اگر درد سر کا علاج مقصود ہوتا تو آپ کو خشخاش کا نسخہ تجویز کرنا پڑتا کیونکہ اس کے ڈوڈے سر کے مشابہ ہوتے ہیں۔ غرضکہ علامتیت کا یہ نظریہ طب کی شروعات میں بےحد رائج تھا اور اسی پر وہ جملہ علوم و فنون متفرع ہیں جن میں سائنس اور سحر بے طرح گھلے ملے ہوئے ہیں۔ ہم احساسی کے نظریہ کا وجود ہمارے زمانہ میں بھی ہے۔ علمی فلسفہ کے ایک موجودہ مذہب کو یہ دعویٰ ہے کہ افکار اشیاء ہیں یعنی یہ کہ جو چیز آپ چاہتے ہیں اس کے خیال کو اگر آپ تقویت دیں اور ہر موقع و محل پر اس خیال کا اظہار کرتے رہیں تو اس سے ہوگا یہ کہ اس کے مماثل خیالات کہیں اور سے اس کی مدد کو آئیں گے اور آپ کی خواہش پوری ہو جائے گی، واضح رہے کہ یہ مذہب مجموعی حیثیت سے ایک نفیس مذہب ہے[1]۔

اس کے بعد غور و فکر کے نسبتہً ایجابی طریقے رواج پاتے گئے۔ مظاہر کے مشترک عناصر کی چنائی اور چھانٹ شروع ہوئی اور ان سے تعمیمات مرتب کی گئیں لیکن پہلے پہل ان عناصر کو زیادہ ڈرامائی بننا پڑا۔ اشیاء یا تو گرم ہوتی تھیں یا سرد یا خشک یا تر۔ حرکت دو طرح کی تھی طبعی اور غیر طبعی۔ افلاک دائروں میں گردش کرتے تھے کیونکہ دوری حرکت اکمل حرکت تھی۔ بیرم کی توجیہہ میں اس کے بڑے بازو کی حرکت کو بنائے استدلال بنایا گیا[2]۔ سورج سرما میں جنوب کی طرف اس لئے سرک جاتا تھا کہ سردی سے محفوظ رہے۔ قیمتی اور خوبصورت چیزوں میں خاص خواص ودیعت تھے۔ مور کا گوشت سڑاند قبول نہ کرتا تھا اگر مقناطیس کے قریب اعلےٰ درجہ کا الماس لایا جاتا تو وہ اپنے سینہ سے چپٹائے ہوئے لوہے کو فوراً دور کر دیتا تھا۔ وقس علیٰ ہذا۔

یہ خیالات آج ہمیں بےسروپا معلوم ہوتے ہیں لیکن سوچئے کہ اگر ہمارے علم دوست اجداد ہماری رہنمائی کے لئے کوئی نشان کوئی نقش یا کوئی لکیر نہ چھوڑ جاتے تو ہمارا کیا حال ہوتا؟ سترھویں صدی کے آغاز تک انسان نے اس کی نہ لی۔ پرانی لکیر ہی کو پیٹا کیا۔ ہم میں سے چند ہی کو یہ معلوم ہوگا کہ سائنس کتنی کم عمر ہے، آج سے تقریباً چار سو سال پہلے کوپرنیکس کا سیاروی نظریہ کسی کے شان

---

[1] اگر کوئی صاحب اس موضوع پر تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہیں تو انہیں چاہئے کہ پرینٹس ملفورڈ وغیرہ سے رجوع کریں۔

قدیم ہم احساسی سحر کے بارے میں ذیل کی کتابوں کا مطالعہ فائدہ بخش ثابت ہوگا:۔ (۱) نفسیات کے واقعی اور افسانوی اجزا از جے جیسٹرو خصوصیت سے باب تمثیل کی سفارش کی جاتی ہے۔ (۲) تاریخ مذہب کا مقدمہ مصنفہ ایف۔ بی۔ جیونز خاص کر باب چہارم لائق مطالعہ ہے۔ (۳) شاخ زریں مصنفہ جے۔ جی۔ فریزر۔ (۴) باب مذہب از آر۔ آر۔ میریٹ اور (۵) اے۔ ر۔ لووجوائے کا مضمون رسالہ The Monist میں جلد ۱۶ ص ۳۵۷۔

[2] استقرائی علوم کی تاریخ از وہی ویل ن۔ ا۔ ک۔ ا۔

(مصنف)

گمان میں نہ تھا۔ خون کے دوران کا، ہوا کے وزن کا، حرارت کے ایصال کا اور حرکت کے قوانین کا کسی کو علم نہ تھا معمولی پمپ توجیہہ کی دسترس سے باہر تھا، گھڑیوں کا کوئی وجود نہ تھا، تپش پیما عنقا تھے، تجاذب عامہ سے کوئی واقف نہ تھا، دُنیا کی عمر پانچ ہزار سال تھی ستاروں پر ارواح کا تصرف تھا اور ملہوسی، جادوگری اور نجوم ہر ایک کے معتقدات میں داخل تھے۔ جدید سائنس کی ابتداء ۱۶۰۰ء کے بعد ہوئی ہے اور کیپلر، گیلی لی او، ڈی کارٹ، ٹایکوبریٰی، پکل، ہاروے، نیوٹن، ہوئی گنس اور بوائل اس کے بانی مبانی ہیں۔

استخواص کے یہ داعی حقیقی معنوں میں فلسفی تھے یعنی سنساری عقلاء، چنانچہ گیلی لی او کہتا ہے کہ اس نے جتنے برس فلسفہ پر صرف کئے اتنے مہینے ریاضیات پر نہیں کئے، ڈی کارٹ تو مسلمہ سنساری فلسفی تھا۔ لیکن جدید خیالات نے حقیقت کے بعض خاص شعبوں کو اتنی ترقی دی کہ وہ تفصیلات سے بہت زیادہ گراں بار ہو گئے، اتنے زیادہ گراں بار ہو گئے کہ سنساری ذہن ان کا احاطہ نہ کر سکے۔ اس طرح میکانیات، فلکیات اور طبیعیات کی حکمتیں فلسفہ سے جُدا ہوئیں۔ ان ہمہ گیر فلسفیوں نے جن کے نام میں نے اُوپر گنائے ہیں فلسفہ کے ریاضیاتی پہلوؤں پر بہت زیادہ زور دیا ہے کیونکہ یہ پہلو سودمند بہت تھے چنانچہ انہی کی بدولت گیلی لی او، پکل، بوائل، نیوٹن، اور ڈی کارٹ نے وہ عظیم الشان انکشافات انجام دیئے جنہوں نے ان کا نام ہمیشہ کے لئے امر کر دیا، بار ہما کی بلندی کے ساتھ ارتفاع کی مناسبت (پکل) فاصلہ کے ساتھ اسراع کی مناسبت (نیوٹن) دباؤ کے ساتھ ہوا کی دبازت کی مناسبت (بوائل) اور منحرف شعاع کے جیب التمام کے ساتھ اس کے جیب کی مناسبت (ڈی کارٹ) یہ سب فلسفہ کے ریاضیاتی پہلو کی پیداوار ہیں۔ فطرت سے بحث کرنے کے اس نئے طریقہ میں عوامل باہم احساسی کے خیالات کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ طریقہ متلازم تغیرات کا طریقہ تھا اور اس کے استعمال سے علم کی قسمیں دو ہو گئیں (۱) سائنس (۲) عام فلسفہ۔ سائنس میں نپے تلے اور معین قوانین رواج پانے لگے اور فلسفہ نے انہیں قبول نہیں کیا۔ اس واقعہ نے وہ ذہنیت پیدا کی جو آج ایجابی کہلاتی ہے اور جس کا نعرہ ہے "فلسفہ مردہ باد!" اس ذہنیت کے لوگ کہتے ہیں کہ "ہمیں ضرورت صرف قابلِ پیمائش واقعات یعنی مظاہر کی ہے، ذہن کی تعبیرات اور توجیہات درکار نہیں" اور یہ اعتراض انہی کا ہے کہ "فلسفہ نے کوئی ترقی نہیں کی"

مگر جب فلسفہ کا ہر وہ سوال جس کا ایک جواب مُعین ہو جاتا ہے فلسفہ نہیں رہتا بلکہ سائنس یعنی کوئی ایک "یات" بن جاتا ہو تو ظاہر ہے کہ صرف وہی مسئلے فلسفہ کہلائیں گے جن کا ابھی کوئی قطعی جواب تجویز نہیں کیا گیا اور ہو یہی رہا ہے، اس طرح فلسفہ کا اطلاق اب ایسے سوالوں کے مجموعہ پر ہونے لگا ہے جن کے معین جوابات معرضِ وجود میں نہیں آئے۔ اب اگر ان سوالوں میں سے بعض کی عمر دو ہزار سال کی ہے اور وہ ابھی قطعی جوابوں کے منت کش نہیں ہوئے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کبھی قطعی جوابوں کے منت کش ہونگے ہی نہیں۔ دو ہزار سال کا عرصہ ہماری فانی عمروں کے لحاظ سے معلوم بہت بڑا ہوتا ہے مگر ہے وہ اصل میں ایک لمحۂ مختصر کیونکہ انسان کی عقل آرائی کی عمر اس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ گذشتہ تین صدیوں کی غیر معمولی ترقی کا راز صرف ریاضیات کے استعمال میں

مضمر ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ فلسفہ بھی میکانی یا ریاضیاتی ہو جائے حقیقت مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے اور اسے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے رہنا چاہئے لیکن اگر ہم یہ چاہیں کہ ہر چیز کو ریاضیات کی عینک سے دیکھیں تو اس کا مطلب یا تو یہ ہوگا کہ ہم ریاضیاتی حکمتوں کے سوا کسی اور چیز کو دیکھنا ہی پسند نہیں کرتے یا پھر یہ کہ حقیقت کی جائز آزادی پر بے جا قیود عاید کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی فعل منصفانہ نہیں۔ روحانی سوالوں کو حل کرنے کے اچوک فلسفیانہ طریقے بھی رفتہ رفتہ دریافت ہو جائیں گے ہمیں مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

بعض لحاظ سے سائنس نے فلسفہ کے مقابلہ میں بہت کم ترقی کی ہے، اگر ارسطو اور ڈی کارٹ کو پھر سے دُنیا میں آنے کی اجازت کسی نہ کسی طرح مِل جائے تو سائنس کے عام ترین تصورات ان کے لئے نئے اور حیرت انگیز نہیں ہونگے۔ وہ عناصر سے اشیاء کی ترکیب کے خیال سے موجودات کے ارتقاء کے تصور سے بقائے توانائی کے اصل الاصول سے اور ہمہ گیر جبریت کے مسئلہ سے ناآشنا نہیں ہوں گے، البتہ خردبینیں، برقی روشنی، ٹیلیفون (دور گو)، ہوائی جہاز، لاسلکی، زہریلی گیس، آہنی قلعے، ریڈیو، ٹیلی وژن (دور نظری)، اور حکمتوں کی ذیلی جزئیات ان کے لئے ہیبت ناک چیزیں ہوں گی اس کے برعکس اگر وہ مابعدالطبیعیات کی جدید کتابوں کا یا ہمارے فلسفیانہ لٹریچر کا معاینہ کریں تو ہر چیز ان کے لئے عجیب و غریب ہوگی۔ ہمارے زمانہ کا تصوری یا انتقادی انداز ان کے لئے بالکل انوکھا ہوگا۔ اور اس کا احاطہ کرنے کے لئے انہیں ایک زمانہ درکار ہوگا۔[1]

دوسرا اعتراض :-

فلسفہ تحکیمی ہے۔ وہ صرف عقل کے ذریعہ مہمات امور کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے، حالانکہ حقائق کے حصول کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہ ہے کہ تجربہ کو "خضرِ راہ" بنایا جائے۔ سائنس نے اسی طرح ترقی کی ہے، وہ واقعات کو اکٹھا کرتی ہے۔ انہیں ابواب میں تقسیم کرتی ہے اور ان کی تعلیل انجام دیتی ہے۔ فلسفہ اس طرح عمل نہیں کرتا اور گردِ کارواں کی طرح سدا منزلِ مقصود سے دُور رہتا ہے۔

اس کا جواب :-

یہ اعتراض تاریخی حیثیت سے وزنی ہے کیونکہ بیشتر فلاسفہ نے فلسفہ کے ایسے نظامات مرتب کئے ہیں، جو کامل اور حضوری ہیں جنہیں بے خطا ہونے کا دعویٰ ہے۔ اور جن کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قبول یا رد جو بھی کئے جائیں پورے کے پورے کئے جائیں۔ برعکس ان کے حکمتوں کا حال یہ ہے کہ وہ افتراضات استعمال کرتی ہیں۔ مشاہدہ و اختبار کے ذریعہ ہمیشہ ان کی تصدیق اور توثیق چاہتی ہیں، اور غیر محدود طور پر ان کی صحت اور ترمیم کے لئے تیار رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کے زمانہ میں تحکیم پرستوں کی کوئی نہیں سنتا۔ ان کے لئے اپنے

---

[1] جیمز وارڈ نے رسالہ مائنڈ (ج ۱ شمارہ ۸۵) میں "ارتقائے فلسفہ" کے عنوان سے جو نفیس مضمون حوالہ قلم کیا ہے وہ اس ضمن میں ہر آئینہ دیکھنے کے لحاظ ہے کیونکہ اس بارے میں اس نے مجھ سے بہت کچھ زیادہ کہا ہے اور حق یہ ہے کہ خوب کہا ہے۔ (مصنف)

نظاموں کی قطعیت کا دعویٰ کرنا اور تعلیم یافتہ طبقہ میں قبولِ عام پانا سخت دشوار ہو گیا ہے اعتراض اور تصدیق سائنس کی خاص چیزیں ہیں۔ اور ان چیزوں نے علمی طبقوں کی نگاہوں میں ایک خاص اعتبار پیدا کر لیا ہے۔

مگر فلسفہ اور سائنس کے بنیادی فرق کو نظر انداز کر دینا پھر بھی ایک بڑی جرأت ہوگی۔ کیونکہ فلسفی معاملاتِ دنیوی پر ایک وسیع انداز میں نظر کرتا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اسے ہر اسلوب کے استعمال کی آزادی حاصل ہو۔ فلسفہ کو حکمتوں کی حکمت اسی لئے کہا جاتا ہے۔ پھر بھی فلسفہ اگر تحکیمیت کو چھوڑ دینے پر بھی زندہ رہ سکتا ہے تو اسے لازم ہے کہ وہ افتراضی بننے کی کوشش کرے۔

تیسرا اعتراض :-

فلسفہ کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ زندگی کی ضرورتوں سے نہیں بلکہ بار دیگر تجریدات سے سروکار رکھتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا ہر دم بدلتے رہنے والی، تکلیف دہ، اور پیچیدہ ہے لیکن بلا استثنا، ہر فلسفی یہی کہتا ہے کہ وہ عمدہ، بسیط، اور کامل ہے۔ والٹیر اور شوپن ہائر نے فلاسفہ کا جو مذاق اُڑایا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ایک لاعلاج رجائیت کے مریض ہیں۔ شوپن ہائر کی کامیابی اور ہر دلعزیزی کا راز صرف یہ ہے کہ اس نے اپنے نفس اور دوسروں کے نفوس کو دھوکا نہیں دیا۔ اور زندگی کی بپتاؤں اور برائیوں کو چھپایا نہیں۔

اس کا جواب :-

یہ اعتراض بھی تاریخی حیثیت سے کافی وزنی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا یہ کیوں فرض کر لیا گیا کہ فلسفہ آئندہ بھی حقیقت یا زندگی سے ایسی ہی چھوت برتے گا، وہ جیسے جیسے ترقی کرتا جائے گا ویسے ویسے اس کے طور طریق بدلتے جائیں گے۔ موجودہ مُردہ تجریدات کے بعد یقیناً زندہ تعبیرات کا دَور آئے گا کیونکہ زمانہ بہترین معالج ہے۔ وہ ایسے اسباب اور اسالیب خود مہیا کر دے گا جن کی زندہ تعبیرات کی تعمیر میں ضرورت ہو گی لہٰذا فلسفیوں کو آخر میں زندگی کی تلخیوں سے ویسا ہی قرب حاصل ہو جائے گا جیسا قرب کہ واقعیت پسند ناول نگاروں کو حاصل ہے۔

خاتمہ :-

ابتدا میں فلسفہ کا لفظ کائنات کے مکمل علم کا مفہوم ادا کرتا تھا اور وہ آج بھی اسپنسر کی زبان میں "وحدت یافتہ علم کا نظام" بن سکتا ہے۔ ضرورت صرف مختلف حکمتوں کے نتائج میں مطابقت پیدا کرنے کی ہے اور یہ کچھ مشکل نہیں۔ لیکن آج کل فلسفہ سے مابعد الطبیعیات یعنی علم اور وجود کی حکمت مراد لی جاتی ہے، جو حکمتوں سے بیّن تناقض رکھتی ہے لہٰذا پہلا مفہوم ہی کچھ زیادہ عمدہ اور دل لگتا ہے۔ کیونکہ وہ سائنس، مابعد الطبیعیات، اور مذہب تینوں کو ملا سکتا ہے اور ایک زیادہ شاندار تصویر دُنیا کی پیش کر سکتا ہے۔

لیکن اس مفہوم کی طرف رجوع کرنے کا فی الحال کوئی رُجحان یا امکان نہیں۔

(ترجمہ بہ تصرف) مرزا محبوب بیگ

غزل

پھر ذوقِ تماشا کو مرہونِ اثر فرما
فرصت ہو تو دل پر بھی پھر قصدِ نظر فرما

جب جان فدا کر لوں تو عشق کو رُسوا کر
جب میری خبر آئے تو شرحِ خبر فرما

یہ تیری خموشی بھی گو عینِ تکلّم ہے
مشتاقِ تکلّم سے کچھ پھر بھی مگر فرما

فرمانِ سحر تیرا ہر شام پہ جاری ہے
یارب شبِ غم کو بھی تاکیدِ سحر فرما

فانیؔ نے تجھے چاہا تو بندہ نوازی کر
فانیؔ نے خطا کی ہے تو قطعِ نظر فرما

فانیؔ بدایونی

غزل

جب اپنے دل پہ اپنا کچھ اختیار دیکھا
بیگانہ خو حسیں کو بیگانہ وار دیکھا

پیہم تجلّیوں کی مجھ میں سکت کہاں تھی
نظریں چُرا چُرا کر سوئے نگار دیکھا

آج اپنی بیخودی کو عرفاں کی روشنی میں
اُس ماہِ سیمتن کا آئینہ دار دیکھا

تیری عنایتوں سے انجام بیں نظر نے
آغازِ عشق ہی میں انجام کار دیکھا

یہ بھولی بھولی صورت اچانک پھر بھی تُو نے
میری طرف سے اپنے دل میں غبار دیکھا

حُسنِ شباب پرور کس درجہ سحر زا ہے
دیکھا ترا زمانہ اسے گلعذار دیکھا

اُس شوخ کی گلی میں منظورِ تفتہ جاں کو
پھر بے قرار پایا پھر اشکبار دیکھا

علی منظور
حیدرآبادی

خزاں کی آمد

سرزمینِ جرمنی کے ایک باغ پر خزاں کی ایک شام کو شفق کا ملگجا سا خونی رنگ چھا رہا تھا۔ گزشتہ دو برس سے یورپ جنگِ عظیم کے مغرور قدموں تلے بے رحمی سے روندا جا رہا تھا لیکن اس سرسبز و شاداب باغ کی سایہ دار روشیں ابھی جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں سے محفوظ تھیں۔ پتھر کی ایک نشست پر دو محبت کرنے والے دل بیقراری سے دھڑک رہے تھے اور سورج کی آخری ہلکی گلابی شعاعیں ان کے معصوم اور زرد چہروں پر ضیا پاشی کر رہی تھیں۔ دونوں جوان تھے۔ گریچن نازک اور دُبلی پتلی تھی اور لمبے لمبے گھنے ریشمیں بال متلاطم پانی کی طرح اس کے کندھوں پر لہرائے ہوئے تھے، پائیٹر نے اپنی زندگی میں بیس سے زیادہ بہاریں نہ دیکھی تھیں۔ خدمتِ وطن کا بار اس کے کندھوں پر پڑ چکا تھا۔ اس کی فوجی وردی پر لفٹنٹ کے ستارے درخشاں تھے۔

گریچن کہہ رہی تھی۔ "میرے پیارے! مسرت کے سات روز پلک جھپکتے ہی ختم ہو گئے۔ محبت کی ابتدا میں مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ میں کسی شخص کے دامِ اُلفت میں اس طرح اور اتنی جلدی گرفتار ہو جاؤں گی۔"

"مجھے کیوں بناتی ہو۔"

"میں سچ کہتی ہوں کہ تم نے ہمیشہ میرے جذبات کا احترام کیا ہے اور میری خوشی کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ خدا کرے جُدائی کا زمانہ جلد کٹے اور ہم پھر ایک دوسرے سے ملیں۔"

"ہاں اگر ہمیں اس کا موقع دیا گیا تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"پائیٹر! ابا تو ہماری شادی سے بے حد شاداں ہیں۔ وہ کل ہی کہہ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔"

پائیٹر نے زہر خند ہنسی سے کہا "میرا اشارہ تمہارے ابا جان کی طرف تو نہ تھا۔"

"تو اور کس کی طرف تھا؟"

"انگریزوں کی طرف"

"خدارا بدشگونی کی باتیں زبان پر نہ لاؤ۔ وہ تمہیں! ۔ ۔ ۔ ۔ گرفتار نہیں کر سکیں گے۔ تم بن میری زندگی بے لطف ہے، بیکار ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مایوسانہ انداز میں بیقراری سے پائیٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جب اُس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پائیٹر کے چہرہ کی طرف اُٹھیں تو اُن کی افسردہ و غمناک گہرائیوں میں آرزوؤں اور ارمانوں کی ایک دُنیا جھلکتی ہوئی نظر آئی۔

پائیٹر ان لوگوں میں سے تھا جن کے لب اکثر محبت آمیز الفاظ سے ناآشنا رہتے ہیں۔ ایک کرنیل کے بیٹے کی حیثیت سے

اس کی تمام تربیت فوجی نظام کے ماتحت ہوئی۔ وہ تمکنت سنجیدگی اور مہنود رخاندان کی شاہانہ اور شاندار روایات کا حامل تھا۔ اُنیس برس سے اس نے ایک باقاعدہ نظام کے مطابق زندگی بسر کی تھی اور اب وہ اس کا اہل سمجھا جاتا تھا کہ انسانوں پر حکومت کر سکے۔ ایک ماہ کے اندر روسی برفوں اور فلینڈرز کی غلیظ دلدلوں کے درمیان اس کی قابلیت اور قوتِ برداشت کا امتحان ہونے والا تھا۔ ان حالات میں اس جیسے متین و سنجیدہ شخص کا شاہراہِ محبت پر جہاں قدم قدم پر ذاتی قربانیوں کی بھینٹ چڑھانی ہوتی ہے اور نامرادیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، گامزن ہونا ایک عجیب بات تھی۔

لیکن ایک شاندار ہفتہ کے لئے اُس نے اُلفت کی اور جواب میں محبت سے نوازا گیا۔ دُنیا کی حاسد نظروں سے اوجھل دونوں چاہنے والے اس پُر فضا باغ میں مصروفِ راز و نیاز رہے اور دُنیا اپنے محور کے گرد گھوم گھوم کر ہر صبح کو کنارِ شام تک لے آتی رہی۔

. . . . . صبح سنہری دُھند سے جھلملاتی ہوئی اور شام خون آشام شوخ رنگوں سے گھبرائی ہوئی۔

ان سات دنوں میں گریچن نے دُنیا کو ایک نئے رنگ میں ڈوبے ہوئے دیکھا۔ اس مختصر سے وقت میں اس نے جان لیا کہ محبت کیا ہے، محبت میں کیا لطافتیں پنہاں ہیں اور نسائیت کا منتہا کیا ہے؛

اب یہ رنگین باب ختم ہو رہا تھا۔ کل پائیٹر اپنی رجمنٹ میں شریک ہونے جا رہا تھا اور شقی القلب جنگ اُسے چھین کر گریچن کی دسترس سے دُور اُلفت کی دلنوازیوں سے بہت دُور لے جا رہی تھی۔ شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں دونوں دلوں کو اُداسی نے گھیر لیا۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے یہ باور کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کا مستقبل بالکل تاریک نہیں۔

گریچن نے کہا "میں سوچ رہی ہوں، سینکڑوں برس سے یہ باغ چلا آ رہا ہے۔ کیا پہلے بھی اس نے کبھی ایسا تماشا دیکھا ہے؛

"میرے خیال میں تو اس محبت کی مثال ملنی محال ہے"۔

"ہمارے علاوہ بھی تو عشاق ہو گزرے ہیں"۔

"لیکن ہماری طرح کے نہیں"۔

"وہ کیوں؟"

"صرف تمہاری وجہ سے۔ تمہارا نہ کوئی ثانی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے"۔ یہ الفاظ پائیٹر نے ہچکچاتے ہوئے کہے اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ الفاظ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے اور گریچن اس کے جذبات کو بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

گریچن نے کچھ توقف کے بعد کہا —— "آہ پائیٹر تم بہت ہی پیارے ہو! لیکن آئندہ سال کیا ہو گا —— شاید جنگ ختم ہو چکی ہو گی اور ہم تم دونوں اسی طرح یہاں بیٹھے ہنسی خوشی زندگی کے دن بسر کر رہے ہوں گے۔ دُنیا کی تمام مسرتیں اس وقت ہمارے قدموں میں کھیل رہی ہوں گی"۔

"اگر انہوں نے ہمیں اس کی مہلت دی"۔ اس نے پھر اپنا پہلا خیال دہراتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

"وہ ضرور مہلت دیں گے۔ وہ اتنے بے رحم نہیں ہو سکتے کہ تمہیں مجھ سے چھین لیں۔ اگلے سال اس موسم میں ان شاء اللہ تم واپس آ گئے ہو گے"

"شاید ..... لیکن مجھے خوف ہے کہ کہیں تمہیں اس سیبوں سے لدے ہوئے باغ میں اگلے سال اکیلے ہی چہل قدمی نہ کرنی پڑے"۔

گریچن نے بہ جبر مسکرا کر کہا۔ "اچھا تو پھر میں تمہیں سیبوں کا ایک بہت بڑا بکس بھیجوں گی۔ انہیں کھا کر تمہارے ذہن میں ان ایام مسرت کی یاد تازہ ہو جائے گی.... اور باغ کا ایک حصّہ ایک طرح سے تمہارے پاس پہنچ جائے گا اور جب میں یہاں باغ میں ہوں گی تو ہم تم دونوں ایک ہی باغ میں یکجا ہو جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا"۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی لیکن شدتِ جذبات اور وفورِ غم سے اس کی حسین آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ یہ اس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کا محبت بھرا دل غمِ مفارقت کے بوجھ سے بیٹھا جا رہا تھا اور وہ اپنے جذبات کو چھپانے سے قاصر تھی۔

"آہ پائیٹر!! جان سے پیارے پائیٹر!! ہم کتنے خوش تھے۔ اور اب مسرت کا دور ختم ہو رہا ہے"۔

"نہیں! ہرگز نہیں!!"

"خدا خیر کرے تمہارا خیال درست ثابت ہو۔ میرا دل خوف سے دھڑک رہا ہے"۔

جنگ کے حالات سے وہ گریچن سے بھی زیادہ باخبر تھا اس لئے خاموش رہا۔ صرف اپنی باہیں اس کی گردن کے گرد حائل کر دیں۔ ہراساں گریچن اس کے کندھے سے چمٹی ہوئی تھکے ہوئے زخمی جانور کے مانند ہانپ رہی تھی۔ اس کی نسائی کمزوریاں مردانہ استقلال سے سکون مستعار لے رہی تھیں۔

بتدریج شفق کی سرخی سرد رات کی تاریکی میں منتقل ہو گئی۔ گریچن نے کانپتے ہوئے کہا "چلو اندر چلیں۔ سردی ہو رہی ہے"۔

چند منٹ کے سکوت کے بعد انہوں نے مکان کا رخ کیا۔ دروازہ پر پہنچ کر انہوں نے کچھ توقف کیا اور پیچھے پھر کر باغ پر جس کی آغوش میں ان کی ہزاروں مسرتیں اور آرزوئیں کھیل چکی تھیں ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی۔

گریچن نے کہا "کیا اچھا زمانہ تھا"۔

"بیتے ہوئے دنوں میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جس میں ذرہ بھر بھی تغیر کی آرزو کروں۔ گریچن! میری حسین تتلی مجھے تم سے الفت ہے۔ بے حد الفت، تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا"۔ یہ کہتے ہوئے نوجوان نے اسے اپنی مضبوط باہوں میں تھام لیا اور اس کے نرم و نازک کانپتے ہوئے لبوں کو چوما۔

اس نے پھر دبی زبان سے کہا "کاش وہ ہمیں مہلت دیں ــــ کاش ہمیں پھر موقع ملے"۔

(۲)

اکتوبر کے آخری ایام نے پائیٹر کو شب و روز کی محنت و مشقت کے باعث رونما یا میں تھکا ماندہ اور خستہ حال دیکھا لیکن اس کی تربیت آڑے وقت اس کے کام آئی جنگ کی جگر پاش تباہ کاریاں اور ہولناک ہلاکت آفرینیاں وہ اپنی آنکھوں سے روزمرہ بغیر کسی خوف و ہراس کے دیکھ رہا تھا۔ اپنی زندگی سے بے نیازی اور بے پروائی اس کی فطرت میں ودیعت ہو چکی تھی۔ تمام عمر اسے خاموشی اور متانت سے احکام کی تعمیل کی تعلیم دی گئی تھی اور یہ سبق اس نے خوب سیکھ لیا تھا لیکن ہر ہلاکت خیز دن اور بے خواب رات کو گریچن کی شیریں یاد اس کے ہمراہ رہتی تھی۔ محبت اس کے لئے گڑیوں کا کھیل نہ تھی۔ محبت سے پہلے سے اس کا دل فولاد کے مانند سخت رہ چکا تھا اور بالآخر جب اس سنگلاخ زمین میں محبت کے محل کی بنیاد رکھی گئی تو وہ اس قدر مضبوط اور پائدار تھی کہ تیز و تند طوفانوں کی زد میں بھی متزلزل نہ ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ احساس کُش جنگ جو طوفان زدہ دریا کی طرح ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہی تھی اس پر اثر انداز نہ ہو سکی۔

کرسمس کے قریب وہ معمولی طور پر زخمی ہوا اور اسے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ گریچن کی تیمارداری اس کے زخموں کے لئے مرہم سے کم نہ تھی۔ اکثر وہ آگ کے سامنے بیٹھ کر ماضی و مستقبل پر غور کیا کرتے تھے، اور دہکتے ہوئے کوئلوں کی روشنی میں آرزو و دل سے لبریز حسین و مسرت آگیں لیکن شبنم کی طرح گریز پا خوابوں کو ترتیب دیا کرتے تھے۔

لمحاتِ مسرت اپنی ضرب المثل تیز رفتاری سے گزر گئے اور ایک مرتبہ پھر وہ فرقت کے صدمے سہنے پر مجبور تھے۔

پائیٹر نے کھڑکی سے پھلدار درختوں کی شاخوں کو جن سے بارش کے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے دیکھ کر کہا "اس مرتبہ تو ہم جی بھر کے باغ کی سیر بھی نہ کر سکے۔"

"سرما کی شدت گزر جانے کے بعد بہار کے خوشگوار دن دُور نہیں ہوں گے اس وقت تک مجھے رُخصت کا حق حاصل ہو چکا ہوگا۔"

"خدا نخواستہ اگر تمہیں چھٹی نہ ملی تو میں سیب ضرور بھیجوں گی۔"

"ہاں گزشتہ مسرتوں کی یاد کے لئے یہ نعمتِ غیر مترقبہ ہوگی۔"

(۳)

فروری کا مہینہ آیا اور چلا گیا۔ موسمِ بہار نے بھی یورپ میں قدم رکھا لیکن کشت و خون کا بازار بدستور گرم رہا۔ بسا اوقات ہجومِ مصائب سے گھبرا کر پائیٹر کے پائے استقلال میں بھی لغزش پیدا ہو جاتی۔ گرد و پیش کے روح فرسا واقعات زندگی کی بے اعتباری اور بے ثباتی کے آئینہ دار تھے۔ ماہِ ستمبر میں اس کے پہلو بہ پہلو لڑنے والوں ساتھیوں میں سے ایک بھی میدانِ جنگ میں باقی نہ تھا

کچھ زخمی ہو چکے تھے۔ کچھ ناکارہ اور اکثر حشرات الارض کی خوراک بن چکے تھے۔ بھلا ہزاروں نفوس کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اُترتے دیکھ کر وہ خود کو روزمرہ کے آفات سے محفوظ کیونکر خیال کر سکتا تھا۔ آج سے ایک برس پہلے اسے اپنی زندگی کی پروا نہ تھی۔ مگر اب وہ اپنی زندگی کا مالک خود نہ تھا بلکہ گریچن اس کی مالک تھی۔

پائیٹر، اشرف المخلوقات کو جسے خدا نے دُنیا میں امن قائم کرنے کے لئے بھیجا تھا، خاک و خون میں غلطاں کبھی قاتل اور کبھی مقتول دیکھتا، تو ان بہیمانہ افعال کے خلاف اس کی پاکیزہ روح صدائے احتجاج بلند کرتی اور اسے ان بُرے افعال سے باز رہنے کی تلقین کرتی، لیکن یہ کمزوری کی گھڑیاں بھی گزر جاتیں اور اس کی جابر طبیعت ضمیر کی اس آواز کو دبا دیتی۔

آہستہ آہستہ کڑکڑاتا جاڑا ختم ہو گیا اور مختصر سی بہار کے بعد چلچلاتی دھوپ کے دِن آ گئے۔ اگست، جب جرمنی میں خزاں کی آمد آمد ہوتی ہے اور زمستانی سرد ہوائیں باغوں کے پتوں میں سرسراہٹ اور پژمردگی پیدا کرتی ہیں، پائیٹر کے لئے اُمیدوں کا مہینہ تھا کیونکہ اسی مہینہ سے اسے رُخصت کا حق حاصل ہونے والا تھا۔

گریچن نے لکھا۔ "میرے پیارے پائیٹر۔ آنے والے دن یقیناً ہمیں ایک مرتبہ پھر یکجا دیکھیں گے۔ جُدائی کے ایام بیشک ہمارے لئے سوہانِ روح ہیں لیکن آنے والی مسرتوں کا دھیان ہمیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ قسامِ ازل کے خلاف ایک حرفِ شکایت بھی زبان پر نہ لائیں۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ تکالیف کے بعد معمولی سی خوشی بھی غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ زمانۂ حال سے بے نیاز ہو کر مستقبل پر نگاہ رکھیں!"

پائیٹر کی چھٹی منظور ہونے سے پیشتر انگریزی فوجوں نے فلینڈرز پر پے درپے شدت سے حملے کرنے شروع کر دیئے اور پائیٹر کی رجمنٹ کو نہایت عجلت سے شمال کی جانب بھیج دیا گیا۔

روانگی سے تین روز بعد وہ عین میدانِ جنگ میں ایک پہرہ چوکی میں تعینات تھا۔ یہاں ٹھہرنا موت سے کھیلنے کے مترادف تھا کیونکہ اگر غنیم فتحیاب ہو کر ان کی حد سے گزر بھی جائے تو انہیں وہاں ٹھہرے رہنا چاہئے تھا، ان کے لئے پسپائی کا کوئی حکم نہ تھا۔ اب ان کی اُمیدیں صرف اس بات سے وابستہ تھیں کہ جب تک وہ کسی دوسری جگہ منتقل نہ کر دیئے جائیں دشمن حملہ نہ کریں۔ خوف کے دن ایک ایک کر کے گزرتے گئے۔ دونوں جانب سے سخت گولہ باری ہوتی رہی لیکن عام یلغار جس کا خطرہ تھا معرضِ وجود میں نہ آئی اور مُردہ اُمیدوں میں پھر جان پڑنے لگی۔

ان کو اس محاذ سے سبکدوش ہونے میں دو دن باقی تھے۔ پائیٹر کو سامانِ رسد کے ہمراہ ایک بہت بڑا سیبوں کا پارسل گریچن کی جانب سے موصول ہوا، ساتھ ہی گریچن کا خط تھا جس میں تحریر تھا "میرے پیارے پائیٹر! آخر مجھے یہی دکھائی دیتا ہے کہ اس سال تم گھر نہیں آسکو گے۔ وعدہ کے مطابق اپنے پیارے باغ سے سیب بھیج رہی ہوں۔ تمہاری جُدائی میرے لئے بعید مایوس کن

اور شاق ہے لیکن اسی اُمید پر جی رہی ہوں کہ ایک نہ ایک دن جنگ ختم ہو گی اور اس وقت یہ فرقت کا زمانہ نہایت ہی مختصر معلوم ہو گا۔"

"نہایت ہی مختصر" پائیٹر نے الفاظ کو دُہرایا۔ "نہایت ہی مختصر۔"

. . . .

اگلی صبح سارجنٹ نے پائیٹر کو بیدار کرتے ہوئے کہا "آج بمباری نہایت شدت سے ہو رہی ہے۔"

"ہاں آج قدرے شور زیادہ ہے۔ لیکن ایک گھنٹے کے اندر اندر معمول کے مطابق خود ہی خاموش ہو جائیں گے۔"

لیکن ہلاکت خیز گولہ باری کا سلسلہ بہیم بڑھتا گیا۔ توپوں کی دھنا دھن، مشین گنوں اور رائفلوں کی بے پناہ بوچھاڑ، شور، چیخ پکار اور گرد و غبار کو دیکھ کر روزِ حشر کا منظر پیش نظر ہو رہا تھا۔

"زخمیوں کی مت پروا کرو۔" "سمت مت بھولو۔" "دیکھو وہ آ رہے ہیں"

پائیٹر اور سارجنٹ ایک دوسرے کا مُنہ تک رہے تھے۔

"وہ دیکھو فوج پسپا ہو رہی ہے۔ سارجنٹ۔ کون لوگ ہیں یہ۔"

"اپنی فوج ہے جناب۔ اگر اجازت ہو تو ان پر توپ چھوڑ دوں۔ شاید بھگوڑوں کا رُخ بدل جائے۔"

"نہیں۔ کوڑے کرکٹ کو گزر جانے دو۔"

پائیٹر بے باک نگاہوں سے حلیفوں کی پسپائی۔ توپوں کی آتش باری اور موت کے ہاتھوں انسانوں کی ذلت و رسوائی کو خاموشی سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ دشمن دھوئیں اور گرد و غبار کی اوٹ میں تھے۔ توپ کا استعمال بے سُود تھا کیونکہ دشمنوں کی جگہ اپنے آدمیوں کو مار گرانے کا زیادہ احتمال تھا۔ چُپ چاپ انتظار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہ گریچن کو اس کے محبت نامہ کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔

سپاہی سرگوشیاں کر رہے تھے۔

"قیاس تو کرو دشمن کون ہیں۔"

"خدا کرے کینوس سکاچ نہ ہوں۔"

"وہ گرفتار نہیں کرتے۔"

"کیا ہم ڈٹ کر ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

"شاید"

پائیٹر نے یہ سُن کر دانت پیسے اور زیر لب کہا "کسی جرمن کی قومی حمیت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ گرفتار ہو کر قیدی بنے میں تیر ہرگز قیدی نہ بننے دوں گا۔"

سارجنٹ نے چیخ کر کہا "خندق کے تمام راستے مسدُود ہو چکے ہیں"
پائیٹر خط زمین پر پھینک کر کھڑا ہو گیا۔ بڑھتے ہوئے غنیم کی قطاریں کھڑکی میں سے مدھم سی دکھائی دے رہی تھیں۔ چند منٹ وہ نہایت ہوشیاری اور قابلیت سے توپ چلاتا رہا۔ اس نے پیدل فوج کا ایک حصّہ صحیح نشانے پر گولوں کی بوچھاڑ سے ریزہ ریزہ کر دیا لیکن دشمن بھی غافل نہ تھا۔ دشمن کا ایک گولہ آکر توپ کے قریب گرا۔ توپ اور سارجنٹ دونوں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔
پائیٹر نے پُرعزم اور بلند آواز سے دست بدست لڑائی کی تیاری کا حکم دے دیا۔ خندق کے چاروں سمت دشمن قابض تھے دستی بم ہاتھوں میں تھامے ایک ایک کر کے سپاہی موت کے مُنہ میں کُود رہے تھے۔ آخری آدمی خوف سے کانپتا ہُوا باہر نکلا اور پائیٹر اس کے عقب میں روانہ ہونے کو تیار ہُوا۔ ایک لمحہ کے لئے اسے خیال آیا کہ اس عیار دُنیا نے چند مہینوں کے لئے کیا کیا خوشنما رنگ اس کے سامنے پیش کئے۔ مجسّمۂ محبت گریچن کی تصویر۔ باغ کی سایہ دار روشوں کا خاکہ اور عیش کے بیتے ہوئے دن اس کے پیشِ نظر تھے۔ اسے خوش آئند اُمیدوں اور آرزوؤں کا دھیان آیا، گریچن کے فرستادہ سیب بغیر چھوئے ویسے ہی دھرے تھے۔
. . . . . پھر یہ ہجوم اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، دنیا تاریک دکھائی دینے لگی اور وہ چھلانگ لگا کر خندق کے باہر آگیا۔
چند منٹ تک تو اس نے دستی بموں اور پستول کی گولیوں سے دشمن کو روکے رکھا، پھر کثرت نے غلبہ پایا اور سنگینوں نے جی بھر کر خون پیا۔

(۴)

اسی شب اس نئے فتح کردہ محاذ کو مضبوط کرنے کی غرض سے دشمن نے مشین گن کا ایک دستہ یہاں تعینات کر دیا۔ کیچڑ میں لت پت اور تھکے ماندے سپاہی دروازہ پر جمع تھے۔
ایک نے کہا "اسے فتح کرنے میں کافی دقت اُٹھانی پڑی"
"ہاں! اور ذرا دشمن کے نقصان کا بھی اندازہ لگاؤ۔ ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں"
"اچھا خاصہ لالہ زار بن رہا ہے"
ایک افسر نے پکار کر کہا "سپاہیو! ان تمام لاشوں کو گولہ باری سے پیدا شدہ گڑھوں میں ٹھونس دو۔ اس جگہ کو ہر طرح سے آرام دہ بنانے کی کوشش کرو۔ خیال رہے کہ ہمیں چند دن یہاں قیام کرنا ہے"
آج سے تین برس پہلے بیشتر سپاہی لاشیں اُٹھاتے ہچکچاتے لیکن اب جنگ نے انہیں احساس ندامت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ گھناؤنے اور عریاں مذاق کرتے ہوئے وہ چھلنی ہو چکی ہوئی لاشوں کو دفن کرنے میں مصروف ہو گئے۔
"اِن میں سے ایک افسر ہے"

"خوب۔ اس کی چیزیں اس معرکہ کی یادگار کے طور پر کام آئیں گی۔"

"پچھلے سال" سوم" کے معرکہ میں مجھے ایک سنہری گھڑی ملی تھی لیکن جب میں زخمی ہُوا تو ہسپتال کے ایک حرامخور اردلی نے اُڑا لی۔"

افسر نے گرج کر کہا" یادگاریں جمع کرنے کو کل بہت وقت ہوگا۔ آج پہلے ان جرمنوں سے نپٹ لو۔"

مشرق میں صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ سپاہی نہایت اشتیاق سے یادگاریں ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔ ہر نئی دریافت پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ سارجنٹ نے اچانک کہا" اہا ہا! ادھر آؤ، سیبوں کے اس بکس کو دیکھو" سپاہی اس کے گرد جمع ہو گئے۔" اس کی بڑھیا نے یہ تحفہ بھیجا ہوگا۔"

"اگر اس وقت وہ ہمیں یہ سیب کھاتے دیکھے تو کیا کہے۔"

"اس تحفہ پر اس نے بڑی رقم خرچ کی ہوگی۔"

سارجنٹ نے کہا" جناب ایک آپ بھی کھائیے۔"

افسر نے سیب لے لیا مگر اس کا دھیان اور طرف تھا، وہ ساکت و صامت بیٹھا پائیٹر کا ناتمام خط پڑھ رہا تھا۔ وہ خود جوان تھا اور عشق کا زخم خوردہ بھی، خط کے چست فقروں اور موزوں الفاظ کے پیچھے وہ عشق کی آگ کے شعلے دہکتے دیکھ رہا تھا جن کے سامنے الفاظ محض چنگاریاں تھیں۔ عین اس کی کھڑکی کے سامنے جرمن افسر کی لاش دفنائی گئی تھی۔ ... مردہ ... بیکار محض۔ حشرات الارض کی خوراک بننے کے لئے گوشت کا ایک تودہ ... لیکن چند گھنٹے پہلے وہ زندہ تھا ... محبت کے بحرِ بیکراں کا شناور ...

اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ میں سیب دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ لہو کا ہے اور یہ" جنگ" ہے۔

(۵)

گرد و غبار کے پردے سے آہستہ آہستہ فلینڈرز کے میدانوں میں جو خاک و خوں میں غلطاں اور لاشوں سے پٹے پڑے تھے خورشید عالمتاب طلوع ہُوا، اور اس کی سنہری کانپتی ہوئی کرنیں" عشاق کے باغ" میں بھی جو شبِ گذشتہ باد و باراں کے تھپیڑے کھا چکا تھا درخشاں ہوئیں، گرینچن نے کھڑکی میں سے جھانکا اور بارش میں بھیگے ہوئے اور ہوا میں تھرتھراتے ہوئے زرد پتوں کو دیکھ کر محسوس کیا کہ موسمِ گرما اس دُنیا کو خیرباد کہہ چکا ہے اور اب خزاں کی آمد آمد ہے۔

"اب اُس کے آنے کی توقع موہوم ہے، اگر وہ آئے بھی تو باغ میں وہ رونق نہ ہوگی۔ بہار کے لئے اگلے سال کا انتظار ہی کرنا ہوگا، چشم زدن میں سال گزر جاتا ہے۔ شاید اُس وقت تک جنگ ختم ہو جائے۔"

حقیقت میں گرینچن کے نقطۂ نظر سے جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن خزاں کے بعد بہار کی کوئی اُمید نہ تھی۔

(ترجمہ) ——— عتیق اللہ خاں

گلشن تصوّر

پہاڑوں کی محفل:

رات کو جب سننے والا کوئی نہیں ہوتا
یہ کالے کالے بلند پہاڑ
جو اس وقت چُپ چاپ بیٹھے ہیں۔
آپس میں گزرے زمانے کی باتیں کرتے ہیں

انتظار:۔

سرما کی سرد ہوا تیزی سے چل رہی ہے
چھوٹے چھوٹے بچے چولہے کے پاس بیٹھے
آگ تاپ رہے ہیں
ایک نیلی ساری والی نوجوان لڑکی
دیسے گھر کی ایک لڑکی
سے دلچسپ باتیں کر رہی ہے
مگر بچوں کا بڑا بھائی ابھی تک کالج سے واپس نہیں آیا

جگنو نے کہا:۔

جگنو نے کہا
میں شاعر کا دلِ مضطرب ہوں
جس میں محبوب کا خیال آتے ہی
چمک پیدا ہوتی ہے

میری دونوں بیویو!

میری دونوں بیویو!

مجھے تم سے برابر برابر محبت ہے
جب میں روتا ہوں تو ایک آنکھ سے تمہارے لئے! ـــــ
جو میرے دائیں پہلو میں بیٹھی ہو
اور دوسری آنکھ سے تمہارے لئے! ـــــ
جو میرے بائیں پہلو میں بیٹھی ہو۔

وطن سے آنے والے!

میرے وطن سے آنے والے مسافر
گاؤں کے کھیتوں میں اُگا ہوا
بید کا ہرا بھرا درخت
کیا اب بھی برسات کی بھیگی ہوئی
ہواؤں میں خوشی سے جھوما کرتا ہے

افسانے:۔

اس چٹیل میدان کے ویران ٹیلوں پر بکھری ہوئی
ہزارہا بارشوں سے دُھلی ہوئی ٹھیکریاں
پرانے غمناک افسانے سناتی نظر آتی ہیں
کہ کس طرح آج سے صدیوں پہلے
ہرے بھرے درختوں کی چھاؤں میں
یہاں ایک کنواں آباد تھا
جس پر گاؤں کی نوخیز لڑکیاں
چہلیں کرتی ہوئی
پانی بھرنے کے لئے
آیا کرتی تھیں

ڈاکٹر رام لال اگروال - ایم - اے - ایل - ایل - ڈی ——— صدر

سہیل احمد ——— مقرّر

بشیر
نذیر
منیر
مجید ——— کالج کے طلبہ - چار دوست

سیکرٹری ——— (انجمن نوجوانانِ ہند، جس کے زیرِ اہتمام جلسہ ہو رہا ہے)

دیگر حاضرین ———

جگہ ——— لاہور کا ایک ہال اور پھر اُس کا برآمدہ

وقت ——— آج کل کی ایک شام

(ہال کے ایک طرف سیمنٹ کا بنا ہوا چبوترہ ہے، جس پر دری بچھی ہوئی ہے چبوترے کے عین درمیان ایک میز ہے جس پر بھدے سے رنگ کی بانات کا میزپوش پڑا ہے۔ میز پر ایک گلدان ہے جس میں نرگس کے پھول رکھے ہیں، میز کے دوسری طرف دو کرسیاں ہیں، دائیں طرف ایک لکڑی کا سٹینڈ ہے جس پر کہنیاں ٹیک کے مقرر تقریر کرتا ہے۔ ہال میں بہت سے آدمی جمع ہیں مسلمان بھی اور ہندو بھی، اگرچہ اکثریت مسلمانوں کی ہے، ان میں کالجوں کے طلبہ کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ درمیانی راستہ کے دونوں طرف جو کرسیاں اور بنچ بچھے ہوئے ہیں ان میں سے ایک بنچ پر ذرا پیچھے ہٹ کے بشیر، نذیر، منیر اور مجید چار دوست بیٹھے ہیں، بشیر ایک اُنیس سال کا نوجوان ہے، پتلا سا بدن ہے، عینک لگی ہوئی ہے، سانولا رنگ ہے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور ذکی۔ ہونٹوں پر ایک خفیف سا استہزائی تبسم دائمی طور پر موجود رہتا ہے۔ نذیر سفید رنگ اور موٹے موٹے نقوش اور تنگ پیشانی والا ایک اسی عمر کا نوجوان ہے جو لباس کے لحاظ سے سب سے ممتاز ہے۔ منیر تُرکی ٹوپی اور اچکن پہنے ہوئے ہے۔ اس کا چہرہ لمبوترا ہے اور ناک لمبی اور خمیدہ، چوڑی اور مضبوط ٹھوڑی اور رنگ سیاہی مائل ہے۔ بہت تیز تیز باتیں کرتا ہے۔

مجید کا دماغ ہر وقت کسی نہ کسی تخریبی عمل میں مشغول رہتا ہے۔ اس کے نزدیک کوئی مضمون یا کوئی شخصیت ایسی نہیں جس کا مذاق نہ اُڑایا جا سکے۔ چنانچہ لوگوں کے پوشیدہ سے پوشیدہ حالاتِ زندگی بھی اس کے لئے تمسخر کا سامان پیدا کر دیتے ہیں۔

چبوترہ کے سامنے دونوں طرف گدے دار کرسیاں اور سوفے پڑے ہیں۔ ایک طرف چند مستورات بھی بیٹھی ہیں۔ ابھی تقریر شروع ہونے میں کچھ منٹ باقی ہیں۔ ہال میں سبھی اپنی بساط کے مطابق آپس میں گفتگو کرنے میں مشغول ہیں۔ سب کی آوازیں مل کر ہال میں کافی گونج پیدا کر رہی ہیں۔ بشیر اور اس کے رفقا بھی باتوں میں مشغول ہیں۔ اس ڈرامے کا مرکز انہیں حضرات کی جائے نشست ہے۔)

بشیر۔ (کلائی کی گھڑی دیکھ کے) یہ کم بخت کب شروع کرینگے۔ وقت تو ہو گیا۔

منیر۔ (ہال کے کلاک کو دیکھ کر) ابھی کہاں وقت ہؤا ہے، ابھی تو سات بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ پانچ منٹ کم از کم مقرر صاحب کے انتظار میں اور دس نہیں تو پانچ تو صدر صاحب کے لئے چھوڑ دو۔ جلسہ سوا سات بجے شروع ہوگا۔

نذیر۔ شاید صدر صاحب تو آ چکے ہیں۔ میں نے ان کی صورت دیکھی ہے، وہی ہیں نا لمبے سے بڑی سی توند والے؟

مجید۔ (جو اِدھر اُدھر لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا) ارے وہ کون ہے، وہ، ادھر سیاہی صورت۔

بشیر۔ کون؟

منیر۔ ارے کدھر تبلا رہے ہو؟

مجید۔ (بشیر سے) تم تو اندھے ہو تمہیں خاک نظر آئیگا۔ میں اُسے بتا رہا ہوں، وہ جو سیاہ اچکن پہنے بائیں طرف سب سے پہلی قطار میں بیٹھا مونچھوں پہ تاؤ دے رہا ہے۔

نذیر۔ وہ تو نہیں جو کبھی کبھی ان عورتوں کی طرف بھی دیکھ لیتا ہے؟

بشیر۔ (نذیر کی طرف دیکھتے ہوئے، اپنی مخصوص مسکراہٹ سے) یہ تو پتہ کی بات کہی تم نے، اب تو میں ضرور پہچان لوں گا، عورتوں کی طرف کہا تم نے؟

مجید۔ بجومت۔ میرے خیال میں وہی صدر صاحب ہیں۔

منیر۔ تو بس جان لو کہ مقرر صاحب نہیں آئے۔

مجید۔ اوہ! مقرر! میں جانتا ہوں اس کو، وہ تو ایک ایکٹر ہے، وہ تو کبھی وقت پر نہیں آئے گا۔ وہ اس وقت آئیگا جب ہال میں ایک ایک شخص اس کی طرف دیکھے۔

بشیر۔ تم اسے کیسے جانتے ہو؟

مجید۔ بس ایسے ہی، یہیں کا رہنے والا ہے۔ دیر سے اس کے متعلق سُنتا آیا ہوں۔

بشیر۔ کیا؟

مجید۔ بہت کچھ؟

منیر۔ (جو اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا) میں سمجھتا ہوں جلسہ شروع ہونے والا ہے۔ سٹیج کے نزدیک کچھ ہل چل پڑ رہی ہے۔

نذیر۔ (جس کی نظر ایک ہی سمت لگی ہے) واللہ کتنی خوبصورت ہے!

منیر۔ کون؟

بشیر۔ (مجید سے) پھر بھی کچھ تو بتاؤ۔

نذیر۔ (منیر سے) تمہیں کیا نظر آئے گی، وہ کہہ رہا ہوں، وہ

سبز ساڑھی والی

صدر۔ (بشیر سے) کیا کروں کہ میں نے ... یہ ... اب تو مقرر بنا بیٹھا ہے . . . . . .

(اس وقت سکرٹری انجمن نوجوانانِ ہند بلند آواز میں سب لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔)

سکرٹری: میں اب ڈاکٹر رام لال اگروال صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کرسیِ صدارت کو زینت بخشیں۔

(ڈاکٹر رام لال اگروال اسٹیج پر پہنچ جاتے ہیں اور کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

مسٹر رام لال: حضرات، آج شام ہم سب یہاں جناب سہیل احمد صاحب کی تقریر بعنوان "تعلیم نسواں" سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ سہیل احمد صاحب کی شخصیت تعریف کی محتاج نہیں، آپ بہت دیر سے ملکی معاملات میں حصہ لے رہے ہیں اور مختلف موضوعات پر تقریریں کر چکے ہیں۔ امید ہے آپ حضرات ان کی تقریر کو غور سے سنیں گے۔ اب میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی تقریر شروع کریں۔

(سہیل احمد سامنے کے صوفے سے اٹھ کر اسٹیج پر چلا جاتا ہے۔ اس کی عمر تیس پینتیس برس کے قریب ہو گی۔ قد لمبا ہے اور بدن چھریرا مگر جامہ زیب۔ اس وقت وہ ... کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ انداز سے جوشیلی طبیعت کا معلوم ہوتا ہے۔ بال کچھ بے ترتیب ہیں جو اس کے جوش میں آنے پر پھیل جاتے ہیں۔ وہ میز سے دائیں جانب کھڑا ہو جاتا ہے۔ تقریر کے دوران میں بھی لوگ باتیں کرنے سے باز نہیں رہتے۔ وہ چار دوست بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ان تک مقرر کی آواز آس پاس کے لوگوں کی سرگوشیوں کے گھنے بادل میں سے گزر کر پہنچتی ہے۔ ان کی اپنی باتیں بہت مدھم آواز میں ہوتی ہیں)

سہیل: جنابِ صدر اور معزز حاضرین! میری تقریر کا موضوع ہے "اعلیٰ تعلیم نسواں"۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مسئلہ نیا ہے یا میں اس پر کوئی نئی روشنی ڈال سکتا ہوں، مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ عام طور پر اس مسئلہ کے خلاف یہی اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ ہماری لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے خانہ داری کے قابل نہیں رہتیں۔ اگر خانہ داری سے مراد چولھا جھونکنا اور ہنڈیا پکانا ہے تو شاید یہ اعتراض کسی حد تک صحیح ہے مگر میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اعلیٰ تعلیم کے مقابلہ میں آپ روٹی پکانے اور سینا پرونے کو ترجیح دیں گے . . . . . .

منیر۔ (زور سے) کیوں نہیں؟ (اس کے دوست اسے کھینچ کے بٹھا دیتے ہیں۔)

صدر۔ حضرات خاموشی سے سنئے

سہیل۔ (منیر کی جانب دیکھتے ہوئے) اگر آپ کی نظر میں یہ دونوں اوصاف ایک ہی وقعت رکھتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے . . . . (اس پر ہال میں کہیں کہیں ہنسی کی آواز بلند ہوتی ہے)

منیر۔ (آہستہ سے مگر اتنی آہستگی سے نہ کہ اگلی اور پچھلی بنچ والے

سن نہ سکیں ، اُن کا پیٹھا ! لوگ پیچھے مڑ کے دیکھتے ہیں)

سہیل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کھانا پکانا ایک ضروری کام ہے مگر غالب
اہم ترین کام نہیں ، تعلیم سے مُراد قوائے ذہنی کا بہترین استعمال
ہے ، ظاہر ہے کہ کھانا پکانے میں خاص ذہانت اور عقل
صرف نہیں کی جاتی ۔ اگر ہماری عورتیں اپنی تمام ذہانت
اسی کام تک محدود رکھیں تو یہ ایک ظلم ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔

منیر۔ (جو ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا ، اسی مدھم آواز میں) نہیں
لوگ کھانا ہوٹلوں میں کھا آیا کریں ۔ (اس پر آس پاس کے
لوگ ہنسی کرتے ہیں)

بشیر۔ بھئی چپ بھی رہو ۔ اس کمبخت کو کچھ کہنے بھی دو ۔

منیر۔ کہتا کیا ہے ۔ بک رہا ہے ۔

نذیر۔ (جو ایک نظر مقرر پر رکھتا ہے تو دوسری ہال کی ایک
خاص جانب) منیر یار تم بہت بدمزگی پیدا کرتے ہو ۔

سہیل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اعلیٰ تعلیم سے مراد فقط کالجوں کی تعلیم
ہی نہیں ۔ آپ گھر پر بھی اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دے
سکتے ہیں ۔ مگر عام والدین کو نہ اتنی فرصت اور نہ ان میں
اتنی استعداد ہی ہوتی ہے ۔ دوسرے استاد گھر پر رکھ کر
پڑھانے کی شاید ہم میں سے بہتوں کو مقدرت نہ ہو ۔
اس لئے خواہ موجودہ نصابِ تعلیم کو آپ اچھی نظر سے نہ
بھی دیکھیں ، آپ کو اس سے استفادہ کرنا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔

مجید۔ میاں سہیل کو تو فقط کالج کی لڑکیاں ہی پسند ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

بشیر۔ (اپنی استہزائی مسکراہٹ سے) سبھی کو پسند ہوتی ہیں
تمہیں نہیں ؟

مجید۔ میں سب چار کی شمار و قطار میں ہوں ۔

بشیر۔ تو سہیل کو کیا کسی سے دلچسپی ہے ؟

مجید۔ (جس کی آواز اب مدھم نہیں رہتی) اسے تو شاید کوئی
اعتراض نہ ہو مگر یہ ممکن ہی کہاں ہے ؟
(اس پر آس پاس کے لوگ ان کی طرف دیکھتے ہیں اور یہ
ایک منٹ کے لئے چپ ہو جاتے ہیں)

سہیل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اعلیٰ تعلیم کا یہ مطلب نہیں کہ ہر گھر میں میاں
بیوی کے درمیان بجائے اختلاط کے فلسفیات پر بحث
ہو یا اگر کسی بچے کو زکام ہو جائے تو اس کی تعلیم یافتہ ماں
اسے پرہیز اور علاج کے مسئلہ پر نہایت مدلل و عظ سنانے
یا خاوند کی خرابیٔ رفو کرنے کی بجائے وہ اسے اقتصادیات
پر لکچر دینا شروع کر دے ۔ اعلیٰ تعلیم سے یہ تو ممکن ہو سکیگا
کہ ہم لوگوں کی ازدواجی زندگی میں جسمانی وظائف کے
علاوہ کچھ روحانی تسکین کے سامان بھی پیدا ہونے کی صورت
ہو جایا کرے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

منیر۔ (اس آواز میں کہ جو اتنی اونچی تو نہیں کہ سہیل اسے
سن سکے اور نہ اتنی پست ہی ہے کہ اس کے رفقا کے
سوا اور کوئی نہ سُنے) بے شرم !

نذیر۔ (جو ان ازدواجی حالات کو غور سے سُن رہا تھا چونک
کر منیر سے) کیا ؟

بشیر۔ (منیر سے) آہستہ بھئی آہستہ ۔ کیا یہاں سے اٹھوا کے
رہو گے ۔

مجید۔ (بشیر سے) منیر غلط تو نہیں کہتا ۔ یہ سہیل ہے ہی

بے شرم ۔ میں نے سنا ہے جب یہ کالج میں پڑھتا تھا تو لڑکیوں کے پیچھے یونہی آوارہ پھرا کرتا تھا۔

بشیر ۔ (آہستہ سے) آوارہ ؟ اگر لڑکیوں کے پیچھے پھرتا تھا تو آوارہ کیسے ہو گیا ؟

مجید ۔ (اسی آواز میں) اس کا بھی عجیب قصہ ہے۔

بشیر ۔ کیا ؟

مجید ۔ ہے تو مزے کی بات مگر یہاں کانا پھوسی کرنے میں لطف ضائع ہو جائے گا۔

بشیر ۔ تو کون سنتا ہے ، تم کہے جاؤ۔

ہم جلیس ۔ صاحب آپ ہمیں تو سننے دیجئے۔

(ایک منٹ کے لئے پھر یہ ٹولی چپ ہو جاتی ہے)

سہیل ۔ ..... بعض احباب کہتے ہیں کہ عورتیں پڑھ کے کیا اچھی کریں گی ؟ میں ان سے کہوں گا حضرات کیا آپ تعلیم کو فقط روٹی کمانے کا آلہ ہی سمجھتے ہیں ، کیا آپ اسے ایک دماغی زیور ، ایک خانگی زینت ، ایک روحانی سرور نہیں تصور کر سکتے ؟ کیا شائستگی اور مذاق سلیم آپ کے نزدیک بیہودہ چیزیں ہیں .....

بشیر ۔ (آہستہ سے) بھئی بتاؤ نا ، وہ قصہ کیا ہے ؟

مجید ۔ (اسی آواز میں) اسی سہیل کے عشق کی داستان ہے۔

بشیر ۔ اچھا ؛ خوب ! تو سناؤ ۔

مجید ۔ جن دنوں یہ کالج میں پڑھا کرتا تھا تو یہ اور بھی رومانی تھا ، اب تو یہ روحانی سرور کی باتیں کرتا ہے ، تب میں نے سنا ہے اسے روحانی عشق کا سودا تھا ۔

بشیر ۔ وہ کیا ہوا ؟

مجید ۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو ، میں تو جانتا نہیں ، روحانی عشق کس جانور کا نام ہے۔

بشیر ۔ مگر کس سے تھا اسے روحانی عشق ؟

مجید ۔ ایک ساتھ دو لڑکیوں سے اور لطف یہ کہ دونوں آپس میں بہنیں تھیں ۔

بشیر ۔ (بہت تعجب سے) کیا ؟

مجید ۔ یہی اور کیا ۔

نذیر ۔ (جو عشق کے لفظ کو سن کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا ہے) دونوں سے ؟

منیر ۔ (جو نذیر کے ادھر مڑنے پر خود بھی آگے کو جھک کے مجید کی بات سننے لگ گیا ہے) لاحول ولا قوۃ !

مجید ۔ کم از کم میں نے تو یہی سنا ہے ۔ ایک شخص نے جو اس کا بہت گہرا دوست اور راز دار ہوا کرتا تھا ، مجھے یہ قصہ سنایا تھا ۔

بشیر ۔ مگر کیسے ؟

مجید ۔ کیسے کیا ؟

بشیر ۔ بھئی ان سے عشق کیسے ہوا ۔ وہ کون تھیں ؟

مجید ۔ معلوم نہیں اس کی رشتہ دار تھیں یا ......

منیر ۔ (بات کاٹ کے) بے شرم کہیں کا ! ضرور رشتہ دار ہی ہوں گی ۔

نذیر ۔ (جو ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا) مگر دونوں سے !

مجید ۔ تو اور کیا ؟

بشیر۔ مگر بتایا تو ہے نہیں تم نے کہ کیسے ؛

مجید۔ یہ تو معلوم نہیں کہ کیسے ہُوا مگر یہ ان دنوں بہت بیکار بنا رہتا تھا اور ان کی برادری بہت لمبی چوڑی ہے۔ کسی رشتہ دار کے ہاں زیادہ آنا جانا ہو گیا۔ بس وہاں آپ کو دونوں سے عشق ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بشیر۔ سمجھی یقین تو نہیں آتا۔

نذیر۔ دونوں سے ! میں نہیں مانتا۔

منیر۔ ایسے شخص کا کیا پتہ ! مجھے تو بدمعاش دکھائی دیتا ہے

مجید۔ (جاری رکھتے ہوئے) شاید پہلے اسے بڑی بہن سے محبت تھی۔ اس کا ان کے گھر میں بہت آنا جانا تھا، پہلے تو شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں دعوتِ عشق دیتا رہا مگر بڑھتے بڑھتے نوبت خط و کتابت تک بھی پہنچ گئی ۔ ۔ ۔ ۔

منیر۔ تبھی حرامزادہ تعلیم کا اتنا دلدادہ ہے۔

نذیر۔ مگر دوسری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(رفتہ رفتہ ان کی آوازیں بلند ہوتی گئی تھیں حتے کہ پھر لوگوں نے ان کی طرف دیکھ کر خاموش خاموش کہا اور پھر سہیل کی آواز اس گوشہ تک آئی۔)

سہیل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا بچوں کی تربیت، ان کی اخلاقی اور ذہنی نشو و نما میں ماں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، کیا آپ یہ نہیں پسند کریں گے کہ ہماری عورتیں میل ملاقات کے وقت بچوں کی بیماریوں، خاوندوں کی عادات اور دوسروں کی غیبت کے علاوہ کسی اور مضمون یا مسئلہ کے متعلق بھی گفتگو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بشیر۔ تو پھر ؛

مجید۔ وہ چھوٹی بہن بڑی کی رازدار تھی، اگر یہ اپنا رقعہ بڑی کو نہ دے سکتا تو چھوٹی کو دے دیتا اور وہ بڑی کو دے دیتی۔ بہن کے خط پڑھتے پڑھتے، چھوٹی کو بھی اس سے الفت ہونی شروع ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

منیر۔ اس سے ؛

نذیر۔ پھر تو مرتے ہو گئے ہوں گے !

بشیر۔ (نذیر کو تیز آنکھوں سے دیکھتے ہوئے) نذیر تمہارا دماغ بہت حقیقت پرست ہے !

نذیر۔ (بشیر کے الفاظ پر زیادہ غور نہ کرتے ہوئے) کاش ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی قصّہ ہو جائے !

منیر۔ نذیر شرم کرو۔ دونوں بہنوں سے شادی کرو گے کیا ؛

نذیر۔ شادی ؛

مجید۔ (اس بحث کو پسند نہ کرتے ہوئے) اگر میری بات نہیں سننا چاہتے تو تقریر ہی سنو (خود سہیل کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے)

سہیل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سیاسیات میں عورتیں حصّہ لیں یا نہ لیں، یہ علیحدہ بحث ہے مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بشیر۔ کسی نے گیدڑ سے کہا ۔ ۔ ۔ ۔

مجید۔ میری کوئی سنتا بھی ہے۔

منیر۔ لو اب اکڑو مت، سناتے جاؤ۔

مجید۔ اچھا ! پہلے تو اسے عرصہ تک معلوم ہی نہ ہُوا۔ کیونکہ چھوٹی بہن نے اپنی محبت کو چھپائے ہی رکھا۔ ایک تو بڑی بہن سے شرم اور ایک یہ خیال کہ سہیل کو عشق تھا

ہی بڑی کے ساتھ۔ مگر یہ آخر یہ بات چھپتی کہاں ہے آنکھوں
سے ہی پتہ لگ جاتا ہے، ورنہ لہجہ ہی سے، ایک آدھ لفظ
ہی سے . . . . . .

بشیر۔ بڑی مصیبت ہوگی اس کے لئے۔

مجید۔ شاید اخیر، جب اسے اس بات کا احساس ہونے
لگا تو بہت پریشان ہوا۔ اس لئے بھی کہ اس سے پہلے
اس نے چھوٹی کو اس نظر سے دیکھا ہی نہ تھا۔ یوں عزیز
اسے دونوں ہی تھیں، اور ان دونوں کا بھی آپس میں سلوک
بہت اچھا تھا، اور بڑی کو تو ابھی تک پتہ ہی نہ تھا۔ اُسے
تو یہی خیال تھا کہ چھوٹی سہیل کے آنے پر جو خوش ہوتی
ہے اور اس کے جانے کے بعد اس کی باتیں اُس شوق
سے کرتی ہے تو فقط میرے لئے کرتی ہے۔ مگر چھوٹی کی
طبیعت بہت شوخ تھی وہ . . . . .

ایک آواز۔ کیوں صاحب آپ سننے بھی دیں گے یا اپنی
باتیں ہی کئے جائیں گے۔

(ایک منٹ کے لئے مجید چپ ہو جاتا ہے اور تقریر
کے کچھ جملے ان کے کان پڑتے ہیں۔)

سہیل۔ اعلےٰ تعلیم سے ہم اپنے ادب میں ایک نسائی عنصر
بھی شامل کر سکیں گے، جو طبقۂ اناث کے خیالات کی ترجمانی
کرے گا اور ہماری شاعری اور ہمارے ادب میں ایک
بہت لازمی جزو . . . .

مجید۔ کیا خرافات بکتا ہے، چلو یار چلیں یہاں سے مفت
میں اتنا وقت ضائع کیا۔

نذیر۔ (ہال کے ایک کونے کی طرف دیکھتے ہوئے) یار کچھ
تو اور ٹھہر جاؤ۔

منیر۔ نہیں بھئی چلیں۔ میں تو دیر سے تنگ آ چکا ہوں (ذرا
آواز اونچی کر کے) ایک بھی معقول بات نہیں کہی کم بخت نے

بشیر۔ (مسکراتے ہوئے) اور جو کہی وہ تم نے سُنی نہیں۔ چلو
چلیں، آخر ہم یہاں کر ہی کیا رہے تھے؛

مجید۔ (اُٹھتے ہوئے) مجھے تو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ یہ
چغد کوئی کام کی بات نہیں کہے گا، اور پھر ایسا فرسودہ مضمون!

منیر۔ (دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) تم نے غلطی کی جو اُس
وقت مجھے کھینچ کے بٹھا دیا۔ ورنہ میں نے جبھی اِس کی
سٹی گم کر دی تھی۔

نذیر۔ (جاتے ہوئے) کچھ نہیں یار تم لوگ کسی چیز کا لُطف
نہیں اُٹھانے دیتے۔

بشیر۔ ارے میاں اور کہیں دیکھ لینا، ایسی بھی کیا حُور پری
تھی!

نذیر۔ تم سے کور ذوق کو کیا خبر!

مجید۔ (باہر نکلتے ہی) چلو اس بک بک سے تو چھٹی ہوئی۔

منیر۔ اگر تم مجھے دو ایک سوال کرنے دیتے تو میں اس کا
ناطقہ بند کر دیتا۔

بشیر۔ یا ہم سب کا قافیہ وہ انجمن والے تنگ کر دیتے۔

نذیر۔ کچھ نہیں طبیعت ہی خراب ہوئی۔ اس سے تو سینما
ہی ہو آتے۔

مجید۔ (جسے سہیل کی 'داستان' سے بے اعتنائی بحیثیت

قصّہ کو پسند نہیں آئی) تصور بھی تو محض اس کی عورت پرستی
کی ایک دُوسری صُورت تھی۔

بشیر۔ (قدرتہً) ہاں تو پھر وہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ ان لڑکیوں
کا کیا حشر ہوا۔

مجید۔ پہلے یہ تو بتاؤ اب چلنا کہاں ہے۔

نذیر۔ ابھی تو آٹھ ہی بجے ہیں، چلو تمہارے ہاں چلتے ہیں،
برج کی ایک ربر ہی کھیلیں گے۔

منیر۔ (جو ابھی سہیل کو بھولا نہیں) بھئی اس اُلو کے پٹھے نے
تو ساری شام ہی برباد کر دی۔

بشیر۔ (مجید سے) تو وہ کہانی سناتے جاؤ۔

مجید۔ کہانی کیا ہے، سہیل جیسے آدمی سے سلوک ہی ایسا ہونا
چاہیئے تھا، چھوٹی بہن، میں کہہ رہا تھا نا بہت شوخ تھی۔۔۔

نذیر۔ (بات کاٹ کے) کیا نام تھا اس کا؟

مجید۔ (ایک لمحہ سوچ کے) نام تو مجھے یاد نہیں پڑتا۔ کچھ عرصہ
ہی ہو گیا، مجھے یہ قصّہ سُنے ہوئے۔

منیر۔ چلو جانے دو نام میں دھرا ہی کیا ہے۔

مجید۔ خیر نام کچھ بھی ہو، ہمیں کیا؛ وہ چھوٹی ایک تو شوخ تھی
دوسرے کچھ نوخیز ہونے کی وجہ سے اس میں بے تابی بہت
تھی۔ بہرحال جہاں اس کی بڑی بہن نے جو محض رِثائی عشق
کی پجارن تھی، آہیں بھرنے اور فرقت میں آنسو بہانے
تک ہی اپنی محبّت کو محدود رکھا۔۔۔۔

نذیر۔ بیوقوف!

مجید۔ ۔۔۔ چھوٹی نے اشارۃً کنایتہً، سہیل کو اپنے
جذبات سے آگاہ کرنا شروع کیا، پہلے تو شاید بے اختیارانہ
طور پر اور پھر ارادتہً حتےٰ کہ بڑی بہن کو بھی کچھ شک ہو
گیا۔ مگر چھوٹی نے معنی خیز نظروں اور اپنے بے باختہ پن
سے سہیل کو لبھانے کی کوشش جاری رکھی۔ اب سہیل
کی حالت بہت متغیر تھی، محبت دراصل اسے بڑی سے
ہی تھی مگر چھوٹی کا حُسن ایسا جارحانہ طور پر اس کے درپے
تھا کہ وہ چھوٹی کی دلکشی سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ
سکا۔۔۔۔

منیر۔ } (ایک ساتھ) لعین کہیں کا
نذیر۔ } مزے ہو گئے پھر تو

بشیر۔ (نذیر کے الفاظ پر) لاحول ولا قوۃ!

مجید۔ ۔۔۔ بہرحال اس کے لئے مشکل یہ ہوئی کہ ان
کے ہاں نہ جائے تو اس کے دل کو قرار نہ تھا اور جائے
تو وہاں دونوں کو یکساں طور پر کیسے ملے؟۔۔۔

منیر۔ مگر ان لڑکیوں کے ماں باپ کہاں تھے جو یہ یوں روزانہ
اُن کے پاس جا بیٹھتا تھا۔

مجید۔ بھئی وہیں کہیں ہونگے، مگر یہ تو میں نے نہیں کہا کہ
سوائے باتوں کے وہ اور بھی کچھ کیا کرتا تھا۔

نذیر۔ اوہ! فقط باتیں ہی!

بشیر۔ بھئی نذیر تمہارا دماغ ان پاکیزہ لذتوں تک نہیں
پہنچتا۔ تم۔۔۔۔

نذیر۔ بکو نہیں۔

مجید۔ (جھنجھلا کے) اچھا تو تم پہلے فیصلہ کر لو۔

بشیر۔ نہیں نہیں، تم کہے جاؤ۔

مجید۔ کہنا اور کیا ہے، اس حالت میں یہ بہت دن رہا۔ ان کے ہاں جاتا تو وہاں اس کی مرضی کے بغیر چھوٹی کی شوخیاں اور اُس کا حُسن اسے مسحور کر لیتا اور گھر آتا تو بڑی کی آنکھیں اور اس کی محبت اسے بے چین کر دیتی تکلیف اس بات سے اور بھی ہوتی کہ جب ان کے ہاں جاتا تو بڑی لڑکی کی آنکھیں کبھی آنسوؤں اور کبھی شکایتوں سے پُر ہوتیں پھر جب سہیل کا التفات چھوٹی سے کم نہ ہُوا تو بڑی پہلے کی نسبت اس کا خیر مقدم اتنے تپاک سے نہ کرتی۔ ستم یہ ہُوا کہ جب بڑی نے دِل پر جبر کر کے ذرا ضبط کرنا شروع کیا تو چھوٹی کی باتیں اور بھی محبت آمیز ہونے لگیں حتیٰ کہ سہیل کے لئے وہاں جانا بھی اتنا ہی تکلیف دہ ہو گیا جتنا نہ جانا . . . . . .

منیر۔ اچھا ہُوا۔

نذیر۔ مگر دونوں! اور کیا چاہئے تھا اس گدھے کو؟

مجید۔ (توجہ نہ دیتے ہوئے) کچھ عرصہ تو ایسے ہی گزرا پھر شاید گرمی کی چھٹیاں آگئیں اور یہ کہیں پہاڑ پر یا اور کہیں چلا گیا یا کچھ اور بات تھی، مگر کچھ عرصہ کے لئے یہ انہیں مِل نہ سکا۔ اور اگر ایک آدھ دفعہ سرسری سی ملاقات ہوئی بھی تو اس کی تسکین نہ ہوئی۔ کیونکہ حقیقتہً محبت اسے بڑی سے ہی تھی۔ چھوٹی کے البیلے پن میں کشش تو بہت تھی مگر بڑی بہن کی آنکھوں میں کچھ ایسا سحر تھا کہ وہ اسے بھول نہ سکتا تھا۔ البتہ اس دوریِ کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جب وہ کچھ دیر کے بعد لاہور واپس آیا تو اسے محسوس ہُوا کہ اس عرصہ میں سب نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ بڑی کا دل شاید سہیل کی طرف سے پہلے ہی کھٹا ہو چکا تھا اب جو سیماب صفت چھوٹی نے دیکھا کہ بڑی نے سہیل کی طرف سے مُنہ موڑ لیا ہے تو اسے بھی سہیل میں کوئی جاذبیت نظر نہ آئی اور رفتہ رفتہ سہیل نے دیکھا کہ وہ دونوں ہی کے دل سے اُتر گیا ہے . . . . .

نذیر۔ سچ مچ . . . . . پھر؟

بشیر۔ پھر کیا؟ اس کے بعد بھی اور کچھ ہے؟

منیر۔ مجھے تو اس قصہ میں ذرا لطف نہیں آیا۔

بشیر۔ (اُسی استہزائی مسکراہٹ سے) بھئی اوروں کے قصے بے ذائقہ ہی ہُوا کرتے ہیں۔

سیّد فیاض محمود

مزدور خدا کے حضور میں

جب یہ بندہ اپنے رب کے پاس جا کر روئے گا
حاملانِ عرشِ اعظم کو رُلا کر روئے گا
جب یہ اہلِ خانہ کے فاقے جتا کر روئے گا
جب یہ اپنی داستانِ غم سُنا کر روئے گا
اپنا خالی پیٹ مولا کو دِکھا کر روئے گا
انتہائے درد و غم سے بلبلا کر روئے گا
نوعِ انسانی کی پامالی سُنا کر روئے گا
ابنِ آدم کی ستم رانی بتا کر روئے گا
اُن کی دولت کی فراوانی جتا کر روئے گا
اپنی محرومی کے افسانے سنا کر روئے گا
جب یہ اپنی نیم عُریانی دکھا کر روئے گا
جب اسے داور کلیجے سے لگا کر روئے گا

چیخ اُٹھے گا آسماں کا ذرّہ ذرّہ۔ انقلاب

انقلاب اے ساکنانِ بزمِ دُنیا انقلاب

زیب عثمانیہ لدھیانوی (گرانڈ یڈسٹ انجمنِ اُردو پنجاب)

اقبال

ذیل کی نظم ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو "یوم اقبال" کی تقریب پر پڑھی گئی۔

ترے اعجاز سے اے واقفِ اسرار و رموز! عقل کی بزم میں ہے عشق کی روشن قندیل
عشق افراد کو پیغامِ حیاتِ جاوید! عشق سے وحدتِ اقوام و ملل کی تشکیل!
تری کشتی کو ہے وہ قلزمِ زخّار پسند! جس کی موجیں ہیں فرات و جمن و دجلہ و نیل!
نوعِ انساں ہے تری قوم، وطن تیرا جہاں! کارواں دہر ہے، نغمے ترے آوازِ رحیل!
پاشکستہ کو تری صوتِ خودی بانگِ درا! راہ گم کردہ کو مشعل ترے افکارِ جمیل!
دلِ پُرسوز ترا جنسِ محبّت کا امیں! چشمِ نمناک تری دولتِ عرفاں کی کفیل!
نگہِ پاک تری آئینۂ حسنِ یقیں! حرفِ بیباک ترا ہمّتِ عالی کی دلیل!
جس کی بُرِش میں نہاں ہے اثرِ ضربِ کلیم! ترے قبضے میں خودی کی ہے وہ شمشیرِ اصیل!
کردیا فاش زمانے پہ وہ رازِ ہستی جس سے ہوتی ہے عیاں فکرِ بشر کی تکمیل

ترا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل! (غالب)

حفیظ ہوشیارپوری

خیالاتِ پریشاں

حکمت یہ نہیں کہ ہم زندگی کو دیکھیں بلکہ یہ کہ ہم زندگی کو پرکھ لیں۔

اکثر لوگوں کی دوستی اتنی گہری نہیں ہوتی جتنی اُن کی نفرت سخت ہوتی ہے۔

آؤ آؤ ہم پیچھے رہ گئے۔ کیا تم گھنٹہ بجنے کی آواز نہیں سُنتے؟

وقت چھین لیتا ہے بہت سی ایسی چیزیں جو کبھی خوشیاں تھیں اور انہیں تبدیل کر دیتا ہے مصیبتوں میں۔

میں سمجھتا ہوں کہ صنعت کی لاکھوں ایکڑ کھیتی کو جوت کر پامال کر دیا جاتا ہے جب کہیں جا کر بہار کے نقش ونگار کی ابتدا ہوتی ہے۔

کسی بڑے کام کو سرانجام دینے کے لئے انسان کو نہایت محنتی ہونے کے ساتھ ہی کبھی کبھی بیکار بھی رہنا چاہیے۔

ازدواجی زندگی میں لَے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ ہم آہنگی کی۔

دانائی انسان کے پاس خود چلی آتی ہے خواہ وہ اس کی خواہش کرے یا نہ کرے۔

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ خوف نے میری صحیح رہنمائی کی ہو میں نے سینکڑوں بار اس کی مطابعت کی مگر انجام کار شکست ہی ہونا پڑا۔

ہم انہیں تو معاف کر سکتے ہیں جن سے ہم اُکتا گئے ہوں، مگر ہم اُنہیں ہرگز معاف نہیں کر سکتے جو ہم سے اُکتا گئے۔

(ترجمہ) غلام یٰسین (از لدھیانہ)

جوگیا گیت

چنتا[1] من سے گئی، نیند نین سے سُدھ لو رے شیام منوہر پیارے

کوک کوئل کی بھالے مارے

گگن[2] بیچ جس کال[3] پکارے

آئے برہا کے بادر کارے

گیدھ گرین جس پنکھ پسارے

چنتا من سے گئی، نیند نین سے سُدھ لو رے شیام منوہر پیارے

برہ اگن کے بھاؤ ہیں نیارے

نین بہا دے جل کے دھارے

جیون جل ہلکورے مارے

اب تو کال ہی پار اُتارے

چنتا من سے گئی، نیند نین سے سُدھ لو رے شیام منوہر پیارے

رات کٹی گن گن کے تارے

سپنے میں دیکھا چندر سکارے[4]

بھگت[5] یہ نوکھی بات بچارے

اب جاگیں گے بھاگ تمہارے

چنتا من سے گئی نیند نین سے سُدھ لو رے شیام منوہر پیارے

سید مقبول حسین احمد پوری

[1] چنتا معنی سکون، چین۔
[2] گگن معنی آسمان
[3] کال معنی موت
[4] سکارے معنی صبح کے وقت
[5] بھگت معنی پرہیزگار

پیر گوگا[1]

ہندوستان میں عام لوگوں کی زبان پر جو پرانے قصے کہانیاں جاری ہیں اُن میں گوگا پیر کی داستان کو بڑی اہمیت حاصل ہے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے خانہ بدوش قبیلوں کے لوگ گوگا کی کتھا جاننے والے شخص کو بہت قابلِ احترام سمجھتے ہیں خاکروبوں کو بالخصوص گوگا سے بہت وابستگی ہے اور ہندوستان بھر کے مہترا سے اپنا سب سے بڑا پیر اور دیوتا مانتے ہیں۔ بھادوں کے دنوں میں جب گوگا کا عرس ہوتا ہے مہتر گروہ در گروہ ہو کر اس کی کتھا گاتے اور گوگا چوہان کے نام کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں۔ چرکیں نے مہتروں کی اسی عقیدت کو مدِ نظر رکھ کر کہا ہے :-

چلیں گے دیکھنے جس وقت گوگا پیر کا میلا   بنے گا مہتروں کا لوٹ کرا تختِ رواں اپنا

لیکن گوگا کا حلقۂ ارادت مہتروں اور سپیروں اور دیگر خانہ بدوش قبائل ہی تک محدود نہیں بعض مسلمان اور ہندو بھی اس کے عقیدتمندوں میں شامل ہیں۔

جیسا کہ مہتروں کے نعرے سے معلوم ہوتا ہے گوگا راجپوتوں کی چوہان قوم سے تھا، یہ سانپوں کے علم کا زبردست ماہر گزرا ہے اور اسے سانپ کے کاٹے کے عجیب وغریب علاج معلوم تھے۔ گوگا محمود غزنوی کے زمانے سے بہت پہلے دادریڑہ تحصیل راج گڑھ علاقہ بیکانیر میں پیدا ہوا اور نوجوانی میں اپنے باپ سے لڑ کر نوہر کے پرگنے میں چلا آیا۔ مرنے کے بعد وہیں اُس کا مزار بنا، اُسے گوگا پیر کے علاوہ راجہ گوگا، گوگا چوہان، ظاہر پیر اور گوگا کراماتی بھی کہتے ہیں۔

عوام کا عقیدہ ہے کہ گوگا سانپوں کا راجہ ہے اس لئے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کوئی سانپ اس کے حکم کے بغیر کسی کو کاٹ نہیں سکتا۔ گوگا کے مرید اُس کے نام پر بکرے کی قربانی دیتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ یوں آدمی سانپ کے اثر سے دائمی طور پر محفوظ ہو جاتا ہے اگر کسی شخص کو سانپ ڈس جائے تو سپیرے ایک دھاگے پر گوگا کا نام پڑھ کر زخم کی جگہ باندھ دیتے ہیں۔ پنجاب میں دھاگے پر اس قسم کے منتر پڑھے جاتے ہیں :-

زمیں تے لکھ۔ سپاں ٹھُوئیاں گُگّے دی ہتھ

مطلب غالباً یہ ہے کہ سانپ اور بچھو گوگا کے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہیں کر سکتے۔ اُس کے سامنے اُن کی حقیقت زمین پر گرے ہوئے تنکوں سے زیادہ نہیں۔

---

[1] یہ مضمون ۱۲ر مارچ ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو سٹیشن لاہور سے نشر کیا گیا اور حسب اجازت جناب سٹیشن ڈائرکٹر صاحب لاہور "ہمایوں" میں شائع ہوا۔

گوگا کے مریدوں کا خیال ہے کہ وہ اولاد اور مال و دولت میں بھی برکت دے سکتا ہے۔ اس غرض سے جمعرات یا جمعہ کے دن گوگا کے نام کی نیاز دلوائی جاتی ہے۔ نیاز میں کھیر، ملیدہ، دودھ، ناریل، پیاز یا پنکھا بھی دیا جا سکتا ہے۔ بعض جنم جلے پوتے اولاد حاصل کرنے کے لئے گوگا کے مزار پر جا کر بھی چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ عوام کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص گوگا پیر کی نیاز ملان کر نہ دلوائے تو اس کی اولاد بھی مر جاتی ہے اور کاروبار بھی تباہ ہو جاتا ہے۔

گوگا کی پیدائش کے متعلق دو مختلف اور عجیب و غریب روایتیں مشہور ہیں۔ پہلی روایت سنیئے:۔

کہتے ہیں بیکانیر میں کوئی راجہ جیور گزرا ہے۔ اس کی دو رانیاں تھیں۔ ایک کا نام باچھل تھا اور دوسری کا نام کاچھل۔ اتفاق سے دونوں بانجھ تھیں۔ باچھل نے بڑی عبادت کے بعد خدا سے اولاد کے لئے دعا مانگی۔ اس کی دعا سے گُرو گورکھ ناتھ وہاں آکر نولکھی باغ میں اُترے۔ یہ باغ سوکھ کر ویران ہو چکا تھا لیکن گُرو کے قدموں کی برکت سے دیکھتے دیکھتے ہرا ہو گیا۔ باچھل بارہ برس تک گُرو کی سیوا کرتی رہی۔ تیرھویں برس گُرو گورکھ ناتھ جانے لگے تو باچھل کی سوت کاچھل کو کسی طرح خبر ہو گئی۔ کاچھل یہ چال چلی کہ باچھل سے اُس کے سیوا کے کپڑے مانگ کر خود گُرو کی خدمت میں جا پہنچی اور اُن کے چیلے کانیپا کی زبانی کہلایا کہ مجھے آپ کی سیوا میں کھڑے کھڑے دیمک لگ گئی۔ اب آپ جا رہے ہیں۔ جیسے آپ نے اُجڑا باغ ہرا کر دیا اسی طرح میری گود بھی ہری کر دیجئے۔ گُرو نے کاچھل کو باچھل سمجھ کر چیلے کو حکم دیا کہ اسے کچھ دے دے۔ کانیپا نے اُسے جَو کے دو دانے دیتے ہوئے کہا جا تیرے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوں گے۔ کاچھل اس فریب سے اپنا مطلب نکال کر باچھل کے پاس آئی اور کپڑے دے کر بولی، تو نے اتنا عرصہ جوگیوں کی سیوا کی، وہ آج چلے بھی گئے۔ تجھے کیا ملا۔ باچھل یہ سنتے ہی اپنے کپڑے پہن کر گُرو کی تلاش میں نکلی، بارہ کوس کے فاصلے پر جا کر اُس نے گُرو کو جا لیا اور کہا مہاراج مجھے کیا دے چلے۔ گُرو نے بگڑ کر فرمایا، دُور ہو کمبخت، ہم تجھے ابھی دے کر تو آئے ہیں۔ باچھل بولی مہاراج، مجھے تو کچھ نہیں ملا، میری سوت کاچھل دھوکے سے کچھ لے گئی ہو گی۔ کتھا میں عوام کے کوی نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے ؎

جس ٹھگنی نے موئے ٹھگا او ہی ٹھگ لائی تو نے
بارہ برس سیوا کری گرو جی کیا دے چلے موئے

گرو نے ماتھے پر بل ڈال کر کانیپا سے پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے"۔ چیلے نے کہا "رانی سچ کہتی ہے" یہ سُن کر گُرو نے باچھل کو گوگل کی ایک گولی دی اور کہا جا تیرے گوگا پیدا ہو گا، وہ کاچھل کے جڑواں بیٹوں کو ہلاک کرے گا اور چاروں کھونٹ اُس کی پیری مانی جائے گی

اب گوگا کی پیدائش کے متعلق دوسری روایت بھی سنئے جو پنجاب میں زیادہ عام ہے۔ کہتے ہیں سانپوں کا سب سے پہلا گُرو تشھر و بید تھا۔ اس کے سوا لاکھ چیلے تھے اس کو یہ کرامات حاصل تھی کہ گردن کے سوا اُس کے جسم پر کسی جگہ سانپ کے زہر کا اثر نہ ہو سکتا تھا۔ اس گرو نے سانپوں کو چُن چُن کر مارنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سانپوں کی صرف تین ذاتیں باقی رہ گئیں:۔

(۱) کوہ مار۔

(۲) تلیر۔

(۳) بھسرا۔

اب ان تین ذاتوں کو فکر ہوئی کہ تنہتر وید نے ہماری تمام نسلوں کو فنا کر دیا ہے اس کا بھی کچھ علاج ہونا چاہئے۔ سب سے پہلے کوہ مار نے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا اور ایک دن جب تنہتر اپنے چیلوں کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کوہ مار سونے کی چھڑی بن کر اس کے رستے میں لیٹ گیا۔ جب تنہتر کی نظر اس سنہری چھڑی پر پڑی تو اس نے چیلوں سے کہا اسے کوئی ہاتھ نہ لگائے، یہ ایک آفت ہے۔ ایک چیلے نے جو سب سے پیچھے تھا دل میں کہا گروجی تو بادشاہ آدمی ہیں۔ یہ چیز چھوڑ دینے کی نہیں چنانچہ یہ چیلا سونے کی چھڑی اٹھا کر گرو کے پیچھے دوڑا اور ہانپتے ہوئے بولا مہاراج اسے کیوں چھوڑے جاتے ہیں مگر تنہتر کی پشت کے قریب پہنچتے ہی چھڑی دفعتہً ایک پھنپھناتے ہوئے سانپ میں تبدیل ہو گئی اور اس نے اچک کر تنہتر کی گردن پر ڈس لیا۔

جب تنہتر وید کی موت کا وقت قریب ہوا تو اس نے اپنے چیلوں کو جمع کر کے کہا کہ مرنے کے بعد میرے بدن کی بوٹی بوٹی کرنا اور اسے پکا کر کھا لینا۔ اس کے کھانے سے میرے بجائے سوا لاکھ تنہتر وید پیدا ہو جائیں گے۔ چیلوں نے تنہتر کے مرنے کے بعد اس کے حکم کی تعمیل کی اور اس کی لاش کی بوٹی بوٹی کر کے اسے ہنڈیوں میں پکانا شروع کیا۔ سانپوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے ایک جگہ جمع ہو کر کہا، یہ تو بڑی خرابی ہوئی۔ صرف ایک تنہتر ہی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا اگر سوا لاکھ تنہتر پیدا ہو گیا تو قیامت ہو گی۔ بچاؤ کا کوئی ڈھنگ نکالنا چاہئے۔ اس پر تلیر سانپ بولا یہ کام تم میرے سپرد کر دو۔ اب میری باری ہے۔ چنانچہ تلیر نے ایک سو سال کے بوڑھے پروہت کا روپ دھارا۔ ایک ہاتھ میں پوتھی ایک میں عصا، ہانپتا کانپتا چیلوں کے جھنڈ میں جا گھسا اور صدا لگائی کہ ہے کوئی جو بھگوان کے نام پر کچھ دے۔ چیلوں نے کہا آج ہم دان نہیں دیں گے۔ گرو کا حکم ہے۔ اس پر پروہت نے گھوم کر اپنی پوتھی کھولی اور کچھ پڑھنے لگا۔ چیلے یہ دیکھ کر مرعوب ہو گئے اور کہنے لگے یہ پروہت تو بڑا انتر جامی معلوم ہوتا ہے۔ ایک چیلے نے آگے بڑھ کر ادب سے کہا، آپ نے جو کچھ دیکھا ہے اگر سچ سچ بتا دیجئے تو خیرات مل جائے گی۔ پروہت نے بھویں چڑھا کر جواب دیا۔ اچھا لو سنو۔ پہلے تمہارے گرو کو سانپ نے سونے کی چھڑی بن کر ڈسا اور وہ مر گیا۔ اب یہ جو کچھ تم پکا رہے ہو زہر ہے زہر! کھاتے ہی مر جاؤ گے۔ اپنی خیر چاہتے ہو تو ہنڈیاں اٹھا کر دریا میں الٹ دو۔ بس بابا ہمیں بھکشا نہیں چاہئے۔ ہم رستے ہیں۔

یہ کہہ کر پروہت تو یہ جا وہ جا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور تنہتر کے چیلے لگے ہنڈیاں اٹھا اٹھا کر دریا میں ڈالنے۔ اتفاق سے ایک ہنڈیا تیرتی ہوئی راجہ جیور کے محل کے نیچے پہنچی اور ایک لونڈی کے ہاتھ لگی۔ وہ اسے اٹھا کر راجہ جیور کی رانی واچلاں (یعنی باچھل) کے پاس لے گئی۔ تنہتر کا گوشت خدا کی قدرت سے اس وقت تک گرم تھا، باچھل نے اسے انگلی سے چھوا تو انگلی جل گئی۔ بس پھر بے اختیار

اس نے اپنی انگلی مُنہ میں ڈال کر چوس لی۔ رانی بانجھ تھی لیکن شور رہا گئی انگلی چوسنے کا نتیجہ یہ ہوُا کہ وہ گربھ وتی ہوگئی اور گوگا اس کی کوکھ میں پڑگیا

یہ دونوں روایتیں تو گوگا کے ماں کی کوکھ میں پڑنے کے متعلق ہیں۔ اب اس سے آگے کا حال سنئے :-

انہیں دنوں راجہ جیور رانی باچھل سے سخت بدگمان ہوگیا۔ اس کی سوتن کاچھل نے بھی موقع پاکر راجہ کے کان بھرنے شروع کئے انجام یہ ہوُا کہ باچھل کو اُسی حالت میں دیس نکالا دیا گیا۔

رانی دو بیلوں کی ایک بہلی میں بیٹھ کر اپنے بھائی باسک دیو کے ملک کی طرف روانہ ہوئی جو سانپوں کا بادشاہ تھا۔ اُسی رات باسک نے خواب میں دیکھا کہ کسی نے اُسے تخت سے اُٹھا کر دے مارا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنی راجدھانی کے بڑے بڑے سانپوں کو بُلا کر یہ خواب سنایا اور تعبیر پوچھی۔ سانپوں نے باسک کو تنہتر وید کی ساری داستان سُنا کر کہا کہ اب یہ نیا فتنہ بن کر ادھر آرہا ہے۔ اس پر باسک نے تمام سانپوں کو جمع کیا اور کہا جو گوگا کو مارے گا اُس کو آدھا راج دے دوں گا۔ یہ سُن کر سانپوں کی تیسری ذات یعنی بھسرا ناگ نے بیڑا اُٹھایا۔ یہ بالشتی سانپ بن کر روانہ ہوُا۔ باچھل ابھی راستے ہی میں تھی کہ بھسرا اس کی بہلی کے پاس جا پہنچا۔ پہلے اس نے دونوں بیلوں موہنی اور سوہنی کو ڈسا، پھر گرڈھ والے کو کاٹا۔ اس کے بعد گوگا کا خاتمہ کرنے کے لئے سوتی ہوئی باچھل کے مُنہ میں گھسنے کو تھا کہ گوگا نے پیٹ سے ہاتھ نکالا اور بھسرا کا پھن داب کر سارا زہر نچوڑ لیا۔ نتیجہ یہ ہوُا کہ بھسرا کیچوا بن گیا۔ پھر گوگا نے خواب میں ماں سے کہا تو کس نیند سوتی ہے۔ اُٹھ دیکھ بیلوں کو کیا ہوُا اور گرڈھ والا کس حال میں ہے۔ باچھل چونک کر اُٹھی تو دیکھا کہ بیل اور گرڈھ والا سب مرے پڑے ہیں۔ بے کسی کے عالم میں بے چاری گھبرا کر رونے لگی کہ اب بھائی کے پاس کس طرح پہنچوں گی۔ اتنے میں گوگا نے اسے کوکھ میں سے آواز دی "گوگا کے نام کی بھینٹ مان اور اپنے موباف کا دھاگا بیلوں اور گرڈھ والے کے پاؤں میں باندھ۔ یہ سب زندہ ہوجائیں گے۔" باچھل نے ایسا ہی کیا اور وہ سب زندہ ہوکر باسک دیو کے ملک میں جا پہنچے۔ یہاں باسک نے پہلے ہی سے ایک تہ خانے میں سانپ بچھو وغیرہ چھوڑ کر باچھل کے لئے کچے سُوت کا پلنگ بچھوا دیا تھا تاکہ وہ مر جائے اور گوگا پیدا نہ ہو مگر وہ پلنگ خالص سونے کا بن گیا اور سانپ بچھو سبھی مر گئے۔

بارہ برس تک باچھل بھائی کے ہاں رہی لیکن گوگا پیدا نہ ہوُا۔ آخر ایک دن گوگا نے خواب میں ماں سے کہا "تو کس خیال میں ہے میں یہاں پیدا ہو کر ننھیال (یعنی نانا کے گھر کا جنا ہوُا) نہیں کہلانا چاہتا جس طرح ہوسکے میرے باپ کے دیس کو چل۔

باچھل بولی، مہاراج مجھے وہاں گھسنے ہی کب دیں گے۔ ایسی تدبیر کر کہ وہ خود یہاں آکر مجھے لے جائیں۔

گوگا نے جس طرح خواب میں باسک کو تخت سے اُٹھا کر دے مارا تھا ویسا ہی سلوک جیور سے بھی کیا اور کہا کہ میری ماں کو لے کر آ۔ راجہ جیور اس واقعہ سے بہت ڈرا اور جا کر رانی باچھل کو لے آیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد گوگا پیدا ہوُا۔

جوان ہونے پر گوگا بڑا جری اور بہادر نکلا اُسے سیر و شکار اور جنگلوں میں پھرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کئی لڑائیاں بھی لڑا لیکن کاچھل کے جڑواں بیٹوں ارجن اور سرجن سے اس کی لڑائی بڑی معرکے کی ہوئی۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ گوگا اپنے نیلے گھوڑے پر سوار کئی دن سے شکار کے لئے دور دراز جنگلوں کی طرف نکل گیا تھا۔ اتفاق سے انہیں دنوں اس کا باپ مر گیا اور ارجن سرجن باچھل کے پاس آکر راج پاٹ کا حصہ مانگنے لگے۔ گوگا کو غیب سے خبر ہو گئی کہ کوئی راج مانگ رہا ہے چنانچہ کتھا پڑھنے والوں کے الفاظ میں اس نے اپنے نیلے گھوڑے سے کہا:۔

چل رے نیلے اُلٹے چلیں اُلٹی موڑیں باگ
بھُم کے بانٹے ہو رہے ماتا بکس رہی گھر بار

گوگا گھر پہنچا تو باچھل نے کہا۔ ارجن سرجن کو کچھ دے دو۔ لیکن گوگا نے کہا، یہ راج کے لائق نہیں، ہم ان کو کچھ نہیں دے سکتے۔ اس پر ارجن اور سرجن سخت برہم ہوئے اور سازشیں کرنے لگے۔ انہیں دنوں گوگا قریب کے ایک راجہ کی حسین بیٹی سریل کے رشتے کا خواستگار ہؤا۔ کاچھل کے جڑواں بیٹے بھی اسی لڑکی کے خواہشمند تھے۔ لیکن لڑکی کے باپ نے گوگا کو پسند کیا اور سریل کی شادی گوگا سے ہو گئی۔ اب ارجن اور سرجن اور بھی غضب ناک ہوئے اور پوری طرح جنگ پر آمادہ ہو گئے۔

اُن دنوں دلی کا راجہ بڑا طاقت ور تھا۔ ارجن سرجن نے اسے بھڑکایا کہ گوگا عنقریب تم سے دلی چھیننے والا ہے۔ راجہ یہ سُن کر جھلا گیا اور ساری دلی کو لے کر گوگا پر ٹوٹ پڑا۔ ارجن سرجن نے اپنے توڑ جوڑ سے گوگا کے باپ کی فوج کو بھی ورغلا لیا۔ چنانچہ ساری فوج اُس سے پھر گئی اور گوگا کے صرف چار ساتھی رہ گئے۔

(۱) گھوڑے کا سائیس بھجّو چمار۔

(۲) نرسنگھ برہمن

(۳) گوگا کا بھانجا بالا

(۴) اور اُس کا چچیرا بھائی فتح سنگھ۔

اس لڑائی میں گوگا کی طاقت عجیب و غریب طریقے سے ظاہر ہوئی۔ دشمن کی آدھی فوج تو اکیلے بالا ہی نے فنا کر دی لیکن کچھ دیر بعد پانسا پلٹا اور گوگا کے چاروں ساتھی یکے بعدِ دیگرے موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ اب اکیلا گوگا بارہ دن تک دشمن کی بقیہ فوج کا مقابلہ کرتا رہا لیکن تیرھویں دن لڑتے لڑتے جب اُس نے دم لینا چاہا تو اُس کو پناہ دینے کے لئے زمین اُس کے اشارے سے یکدم پھٹ گئی اور وہ پانچوں ہتھیاروں سمیت اس میں غائب ہو گیا۔

دوسرے دن گوگا پھر بڑی طاقت کے ساتھ ظاہر ہؤا۔ اب پھر اس نے تنہا دشمن کی ایک جرار فوج پر حملہ کیا اور صفوں پر

صفیں اُلٹنے لگا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ میدان اُسی کے ہاتھ رہا اور دشمن فنا ہو گئے۔

گوگا کو ظاہر پیر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ غائب ہو کر دوبارہ ظاہر ہُوا تھا۔ اُس کے بھگتوں کا عقیدہ ہے کہ غیر فانی گوگا جب چاہے دوبارہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ جس جگہ وہ زمین میں سما گیا تھا کہتے ہیں وہاں محمود غزنوی کے زمانے میں بعض کرامتیں ظاہر ہوئی تھیں مثلاً گائیں وہاں آ کر خود بخود دودھ کی دھاریں مار جاتی تھیں۔ یہ دیکھ کر اُس جگہ ایک مزار بنا دیا گیا جو اب بھی تو ہر میں موجود ہے، یہ چھوٹی سی عمارت گنبد کی صُورت میں ہے۔ ہر سال بھادوں کی نویں کو یہاں بڑا عظیم الشان میلا ہوتا ہے اور لوگ اس میں شامل ہونے کے لئے دُور دُور سے آتے ہیں۔ اس موقع پر یہاں ایک منڈی بھی لگتی ہے جس میں ناگور، مارواڑ اور بیکانیر کے بیل اور اونٹ وغیرہ کثرت سے فروخت کے لئے آتے ہیں۔

مزار پر ہر عقیدت مند سوا پانچ روپے یا ایک بکرے کا چڑھاوا چڑھاتا ہے۔ قبر کے پجاری چاہل کہلاتے ہیں جو برائے نام مسلمان ہیں۔ چڑھاووں کا نصف حصّہ مسلمان چاہل اور نصف حصّہ ہندو برہمن لیتے ہیں۔

گوگا کی بیسیوں کرامتیں مشہور ہیں مثلاً اس کے مزار پر جو کثیر التعداد سانپ رہتے ہیں، اُن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کسی کو نہیں کاٹ سکتے۔ گوگا کے بھگت مالا کی طرح انہیں گلے میں لٹکا لیتے ہیں۔

ایک اور کرامات یہ بیان کی جاتی ہے کہ انگریزوں نے گوگا کے مزار تک ریل پہنچانے کی کوشش کی لیکن لاکھ جتن کے باوجود بھی گاڑی بال برابر اُس طرف نہ سرک سکی کیونکہ گوگا کو یہ منظور نہیں کہ اُس کے بھگت گاڑی میں سوار ہو کر اُس کے پاس آئیں۔

میں نے ایک مہتر سے گوگا کا حال پوچھتے ہوئے کہا معلوم نہیں گوگا کی چھپی ہوئی کتھا بھی کہیں سے مل سکتی ہے یا نہیں۔ مہتر نے گھبرا کر کانوں کو ہاتھ لگائے اور کہا ہرے رام! حضور گوگا کی کوئی بات تو چھاپے میں آ ہی نہیں سکتی۔ آپ کہتے ہیں ہم اس کی کتھا ریڈیو باجے پر گائیں گے مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ اسے کتاب میں نہ چھاپ دیں۔ پھر وہ کھانس کر بولا۔ اگر میری بتائی ہوئی کوئی بات کتاب میں آ گئی تو میرے سب بچے مر جائیں گے اور حضور پر بھی یہی آفت آئے گی۔

حامد علی خاں

محفلِ ادب

سرشکِ تبسّم

اُٹھا ساغر کہ انساں کشتۂ آلام ہے ساقی — یہ ربط ہے، یہ مے آگے خدا کا نام ہے ساقی
نہ جانے نوعِ انساں کیوں اجل سے خوف کھاتی ہے — اجل کہتے ہیں جس کو زحمتِ یک گام ہے ساقی
حقیقت کیا سمجھ میں آسکے اشیائے عالم کی — فقط اک شکل ہے ساقی، فقط اک نام ہے ساقی
سناؤں سازِ حکمت کے ترانے کس توقع پر — کہ اب تک نوعِ انساں بندۂ اوہام ہے ساقی
صداقت آج بھی پوشیدہ ہے اولادِ آدم سے — دروغِ مصلحت آمیز اب بھی عام ہے ساقی
اُدھر یہ قول، ہم نے شرح کر دی ہے حقائق کی — ادھر اب تک وہی ابہام کا ابہام ہے ساقی
اُدھر "تکمیلِ دیں" کا ہو چکا ہے دعویٰ مُحکم — اِدھر ایماں تھا جیسا خام، اب تک خام ہے ساقی
اُدھر شدّت کے ساتھ اعلان ہے "اتمامِ نعمت" کا — اِدھر ہر سانس اب تک زہر کا اک جام ہے ساقی
کہا جاتا ہے مجھ سے زندگی انعامِ قدرت ہے — سزا کیا ہوگی اُس کی جس کا یہ انعام ہے ساقی
شکایت کیا کسی خوں ریز چنگیز و ہلاکو کی — خود اپنا دل ہی جب خوں ریز و خوں آشام ہے ساقی
عمل کا رشتہ ہے جب دستِ ماحول و وراثت میں — تو پھر کیوں آدمیت موردِ الزام ہے ساقی
جسے کہتے ہیں عرفِ عام میں تخلیقِ انسانی — یہ کس آغاز کی سعیٔ زبوں انجام ہے ساقی
وہاں بخشا گیا ہے میرے دل کو ذوقِ آزادی — جہاں موجِ ہوا تک مُرغِ زیرِ دام ہے ساقی
تبسم اک بڑی دولت ہے، میں بھی اس کا قایل ہوں — مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی
جسے اربابِ مذہب بادۂ توحید کہتے ہیں — وہ آبِ صاف بھی افسردۂ اصنام ہے ساقی
مزدشِ گریہ ہی حایل نہیں غمہائے پنہاں کا — یہاں تو ساز کے پردے میں بھی کہرام ہے ساقی
لڑکپن ضد میں روتا تھا، جوانی دل میں روتی ہے — نہ جب آرام تھا ساقی، نہ اب آرام ہے ساقی
تمنائیں جگاتی ہیں تو ناکامی سُلاتی ہے — نہ اپنی صبح ہے ساقی، نہ اپنی شام ہے ساقی

بڑی دریادلی کے ساتھ ہر خوں ریز طاقت کو　　　　مشیت کی طرف سے اذنِ قتلِ عام ہے ساقی

یہ کس کی مُہرِ ہیبت ثبت ہے گیتی کے سینے پر　　　　کہ ہر ذرہ ازل سے لرزہ براندام ہے ساقی

ادب کر اس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں

جوش ملیح آبادی　　　　کہ وہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی　　　　"کلیم"

شفاءالملک حکیم فقیر محمد مرحوم کی پھبتیاں

پھبتی تشبیہ کی ہی ایک قسم ہے۔ تشبیہ میں یہ ضروری ہے کہ مشبّہ ادنیٰ ہو اور مشبہ بہ اعلیٰ لیکن پھبتی کا حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی اعلےٰ کو ادنیٰ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یوں تو شاید ہم اور آپ بھی غور کریں تو اچھی اچھی بہت سی پھبتیاں سوچ لیں۔ لیکن وقت پر اچھی پھبتی بڑی مشکل سے سُوجھتی ہے اور حکیم صاحب کا تو یہ حال تھا کہ وقت پر ایسی برجستہ پھبتی دماغ سے اُتار لیتے تھے کہ جو سنتا تھا حیران رہ جاتا تھا۔

ایک دن آغا حشر اور حکیم صاحب آم کھا رہے تھے، آغا آم کھاتے جاتے تھے اور اپنی عادت کے مطابق کہتے جاتے تھے کہ بمبئی کے الفانسو کا جواب نہیں۔ لکھنؤ کا سفیدہ اس کے آگے کیا مال ہے۔ حکیم صاحب نے کہا، جی ہاں۔ لیکن ہم تو بنارس کے لنگڑے پر لٹو ہیں۔ آغا پھڑک گئے۔ بات یہ تھی کہ آغا مرحوم بنارس کے رہنے والے تھے، اور ایک ٹانگ سے لنگڑے، اس لئے "بنارس کے لنگڑے" کی پھبتی ان پر ایسی بیٹھی جیسے انگشتری میں نگینہ بیٹھتا ہے۔

حکیم صاحب ایک مرتبہ کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ ایک کالا بھجنگ معمر آدمی جو صاحب خانہ کا قریبی رشتہ دار تھا، لڑکوں کی پٹی سے لگا بیٹھا تھا۔ حکیم صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری لیکن کچھ کہہ نہ سکے۔ جب مریض کو دیکھ کر چلنے لگے تو اس شخص کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔ یہ صاحبزادے کس درجہ میں پڑھتے ہیں۔ صاحب خانہ نے کہا حکیم صاحب۔ انہیں آپ نے صاحبزادہ کیسے کہہ دیا ان کی عمر تو پچپن سال کے لگ بھگ ہو گی۔ حکیم صاحب نے کہا، اچھا۔ یہ سلیٹ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ اس لئے میں یہ سوال کر بیٹھا۔

میں جن دنوں تہذیب نسواں میں نیا نیا گیا تھا، ایک مرتبہ حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگے کوئی نئی خبر سناؤ میں نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔ میں نے کہا صاحب۔ میں خود کئی کئی دن اخبار نہیں دیکھتا۔ ہنس کے فرمایا۔ سچ ہے

عشق کا حال بیوا جانیں　　　　ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

چراغ حسن حسرت

مطبوعات

اسلامی طب مرتبہ (از معین الدین صاحب رہبر فاروقی) سلاطین اسلامیہ نے فن طب کی جو خدمات انجام دیں اور اُن کے زمانے میں اس فن نے جو ترقی کی یہ کتاب اس کی مختصر لیکن دلچسپ اور جامع تاریخ ہے۔ واقعات کی ترتیب بہت دلآویز ہے اور بعض جگہ تاریخ میں افسانے کا لطف محسوس ہوتا ہے۔ قابل مؤلف نے مسلمان سلاطین و اطباء کے علمی و فنی کارناموں کے علاوہ اس کتاب میں یونانی، سریانی، عربی، فارسی اور ہندی زبانوں کی نادر طبی کتابوں کے متعلق اُردو میں نہایت مفید معلومات جمع کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایسی طبی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کے ذریعے سے اُردو کی لسانی تحقیقات بھی ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب مطالعہ کے قابل ہے قیمت عہ مجلد عہ (علاوہ محصول) مؤلف سے حسب ذیل پتے سے طلب فرمایئے:۔ سن برج ہاؤس۔ عابد بلڈنگ۔ مصطفےٰ بازار۔ حیدر آباد (دکن)۔

۱۔ اچھے گیت
۲۔ تب تم اچھی بچی ہو

} یہ دونوں کتابیں میاں عبد المجید بھٹی ایڈیٹر ہونہار لاہور نے لکھی ہیں۔ اچھے گیت میں بچوں کے لئے نہیں نہایت سبق آموز گیت درج ہیں۔ دوسری کتاب میں چھوٹی بچیوں کے لئے ایک لمبی سبق آموز نظم شائع کی گئی ہے۔ گیتوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں صاحب کو بچوں کے لئے گیت لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ اُردو میں بچوں کے لئے اس سے اچھے گیت ہماری نظر سے نہیں گزرے۔ زبان سادہ سلیس، دلکش اور موضوع کے لئے ہر طرح موزوں ہے کہیں کہیں تسامحات ہیں جن سے ان کتابوں کو پاک ہونا چاہئے مثلاً اچھے گیت کے صفحہ ۲۸ پر ایک مصرع یوں درج ہے ع "اور خود غرض بنا دیتا ہے" ہماری رائے میں یہ کتابیں تمام چھوٹے بچوں اور بچیوں کے ہاتھ میں ہونی چاہئیں۔ یہ کتابیں اس قابل ہیں کہ محکمہ تعلیم ان کی سرپرستی کرے قیمت علی الترتیب ۴ر اور ۲ر۔ حضرت مصنف سے طلب کیجئے۔

شہریت۔ یہ کتاب بریگیڈ میجر جے ولاٹ۔ ایم سی۔ ایم اے کی تالیف ہے۔ جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی نے شائع کیا ہے یہ کتاب رومن حروف میں چھپی ہے، اور جو لوگ اُردو کو رومن حروف میں لکھا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اُن کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے کتاب ہندوستانی شہری کے حقوق و فرائض سے متعلق ہے۔ زبان بہت شستہ اور قابل تعریف ہے۔ شہریت میں قابل مؤلف نے ہندوستانی شہریوں اور دیہاتیوں کے لئے نہایت مفید اور کارآمد معلومات جمع کر دی ہیں قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی سے طلب کیجئے۔

"Since Our Fall" یہ کتاب مسٹر عبد اللہ انور بیگ ایم۔ اے، ایل ایل بی، نے انگریزی زبان میں لکھی ہے فاضل مؤلف نے اس میں اسلام کے عروج و زوال کے اسباب پر غور کرتے ہوئے اسلامی ہند کی گذشتہ و موجودہ تاریخ پر ایک غائر نظر ڈالی ہے۔ اسی سلسلے میں

میں اسلاموسم کی تحریک کے متعلق بھی اظہارِ خیال کیا ہے اور مسلمانوں کی کوتاہیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیئے۔
کتاب پُر از معلومات اور قابلِ مطالعہ ہے۔ قیمت مجلد عہ ہے۔ اُردو اکیڈیمی بیرون لوہاری دروازہ لاہور سے طلب فرمایئے۔

جامِ طہور - یہ جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی کی رُباعیات وقطعات کا مجموعہ ہے جسے تاج کمپنی لاہور نے نہایت نفیس کتابت وطباعت اور خوبصورت جلد کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ابتدا میں حضرتِ اثر صہبائی نے خود بیس صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے، جو نہایت دلچسپ ہے اور ان کی شاعری کے مطالعہ کے لئے نہایت مفید معلومات سے پُر ہے۔ ایسا دیباچہ شاعر کے علاوہ دوسرا کوئی شخص شاید ہی لکھ سکتا۔ اثر صہبائی پنجاب کے موجودہ نوجوان شعرا میں نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ خیام، حافظ، اقبال، ٹیگور وغیرہ سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان شعراء کی تعلیمات کے نہایت روشن نقوش اُن کے کلام میں جابجا ملتے ہیں۔ اثر صہبائی فلسفہ اور شاعری کو نہایت خوش اسلوبی سے سمو دیتے ہیں۔ ناظرینِ "ہمایوں" اُن کے دل آویز طرزِ خیال سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے نمونۂ کلام کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اُمید ہے کہ اچھے کلام کے شائقین اس مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ قیمت مجلد عہ۔ تاج کمپنی لاہور سے طلب کیجئے۔

سراجِ سخن - مرتبہ عبدالقادر سروری اُستادِ اُردو جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن)۔ یہ کتاب "سلسلۂ انتخاباتِ شعرائے دکن" کی چوتھی جلد ہے۔ جس میں سید شاہ سراج الدین (۱۱۲۷ھ - ۱۱۷۷ھ) اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔
شروع میں "دکن کی اُردو شاعری" کے عنوان سے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا مقدمہ ہے جس میں دکن کی اُردو شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ہر دَور کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس تقسیم کی رُو سے سراج چوتھے دَور کا شاعر ہے۔
مرتب نے اپنے مقدمے میں سراج کے حالاتِ زندگی اور اُن کی شاعری کی خصوصیات مختصر طور پر بیان کی ہیں۔ اس کے بعد سراج کے نمونۂ تحریر کا عکس دیا گیا ہے۔ انتخابِ کلام میں غزلیات، رباعیات، مستزاد، مثنوی سب کچھ شامل ہے۔
اہلِ دکن کی یہ کوشش قابلِ قدر و ستائش ہے کہ وہ موجودہ زمانے کو اپنے قدیم شعراء سے روشناس کرا رہے ہیں۔ قیمت ۱۲ آنہ مصنف سے طلب کیجئے۔

پریت افسانے - یہ سردار گوربخش سنگھ صاحب ایڈیٹر "پریت لڑی" لاہور کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو نفیس کتابت وطباعت کے ساتھ مجلد شائع ہوا ہے۔ حجم ۲۰۴ صفحات ہے۔ سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار صاحب کو سادہ اور سلیس زبان لکھنے پر پوری قدرت حاصل ہے۔ انہیں باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر مذہب و ملت کے ہندوستانی اُردو زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا بہترین وسیلہ سمجھتے ہیں۔ جناب مؤلف ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ نفیس مجلد کتاب کی قیمت ۱۲ آنہ ہے۔ مندرجہ بالا پتے سے منگوایئے۔

Shifa شفا

معدہ اور آنتوں کی تمام خرابیوں کو دُور کرنے کیلئے کامیاب دوا ہے!

اور اپنی مندرجہ ذیل خصوصیات کے باعث نہایت مقبول ہے

۱۔ امراضِ معدہ کے لئے چوٹی کی اکسیر دوا ہے۔

۲۔ ہیضہ، متلی، قے وغیرہ سے فوراً شفا بخشتی ہے۔

۳۔ بھوک بڑھانے اور غذا کو ہضم کرنے کے لئے ایک بہترین تحفہ ہے۔

۴۔ معدے کی فضول رطوبتوں اور لیسدار مواد کو جو خواہ کسی سبب سے ہوں دُور کر کے معدے کو پاک صاف کر کے غذا ہضم کرنے کے قابل بناتی ہے۔

۵۔ آب و ہوا اور پانی لاگ کے ناموافق اثر سے محفوظ رکھتی ہے اور اس لئے بری اور بحری سفر کرنے والے لوگ اسے بیدھڑک استعمال کر سکتے ہیں۔

۶۔ تبخیر معدہ اور جگر کی وجہ سے دل اور دماغ متاثر ہو جاتے ہوں اور دل کا دھڑکنا، سر کا درد، سر میں چکر، بے خوابی یعنی نیند نہ آنا وغیرہ لاحق ہو کر مراق یا مالیخولیا کے دورے ستاتے ہوں تو اس کی دو تین خوراکوں سے ہی نمایاں فائدہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

۷۔ معدہ کی پُرانی تکالیف کا اس خوبی سے قلع قمع کرتی ہے کہ مردہ معدہ زندہ ہو کر مریض کو نئی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

۸۔ ہر روز غذا کے بعد اس کی ایک خوراک کھا لینے سے پیٹ درد، ریح، باؤ گولہ، کھٹے ڈکار، قے، دست اور قراقر معدہ سے دائمی نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں صبح اُٹھتے وقت منہ بدذائقہ لیسدار رطوبت سے بھرا رہتا ہو، تھوڑا کھانے سے پیٹ بھر جاتا ہو تو اس کا استعمال یقیناً تسلی بخش ثابت ہوگا۔

۹۔ ایک مزے دار اور خوشبودار سفوف ہے جسے بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد سب خوشی سے استعمال کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ اس کی تعداد خوراک بہت کم، قیمت معمولی اور فوائد بے شمار ہیں۔

قیمت فی شیشی ۱۲؍ محصولڈاک ۲ شیشی تک ۷؍

منیجر حمیدیہ فارمیسی لاہور سے منگائیے

دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری

مرتبہ

انجمن ترقی اردو (ہند)

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے۔ اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے۔ چند خصوصیات ملاحظہ ہوں:۔

یہ بالکل جدید ترین لغت ہے۔ انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تمام کے تمام اس میں آ گئے ہیں۔

اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے۔ اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں۔

ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں اور امتیاز کے لئے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دے دیا گیا ہے۔

ایسے الفاظ جنکے مختلف معنی ہیں اور انکے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا، ان کی وضاحت مثالیں دے کر کی گئی ہے۔

اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لئے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم [illegible] طور سے ادا کر سکے اور اس غرض کے لئے تمام اردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے۔ یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی۔

ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو زبان کا ذخیرہ انگریزی مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کئے گئے ہیں جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں۔

اس لغت کے لئے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا ہے جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے۔ طباعت کے لئے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کئے گئے ہیں۔ جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے۔

[illegible] سائز۔ صفحات (۱۵۱۳ + ۳۳) قیمت سولہ روپے (۱۶ [illegible]) کلدار۔ علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ

دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)

کمزور بچوں کی طاقت کے لئے
بچوں کو
ڈونگرے
کا بال امرت
دینا چاہئیے
ملنے کا پتہ:- ہر بڑے دوا فروش کے ہاں بکتا ہے۔

خیالات کی پریشانی اور پراگندگی آنکھ کی تنزلی کی وجہ ہو جاتی ہے
یہ پریشانی اور پراگندگی دل و دماغ اور معدہ میں حرارت کی زیادتی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اگر خوراک چائے بیڑی سگریٹ پان تمباکو
وغیرہ زیادہ استعمال کرنے سے خون میں تپش پیدا ہو کر آتشیں مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور حرارت زیادہ ہو کر قبض پیدا کر دیتا ہے جس سے انسان زیادہ پریشان
ہو جاتے ہیں تو ایسی حالت میں آپ اپنی حفاظت کے لئے صحت افزا اور مسرور جڑی بوٹیوں کے مرکب سے تیار شدہ امرتار لنواولیہ استعمال کریں۔
امرتار لنواولیہ جسم سے گرمی کی زیادتی کو دور کر کے آتشیں مادہ دور کرتا ہے۔ امرتار لنواولیہ خون بکثرت پیدا کر کے جسم کو مضبوط بنا دیتا ہے
امرتار لنواولیہ دل و دماغ، معدہ کو طاقت بخشتا ہے۔ امرتار لنواولیہ خیالات کی پراگندگی، اعضا جسم کا ڈھیلا پن اور چہرے کی بے رونقی
قوت حافظہ کی کمی، کاہلی وغیرہ کو دور کر کے حیرت انگیز فرحت اور رونق عطا کرتا ہے ایک مرتبہ آزمائش کر کے اطمینان حاصل کریں۔
قیمت فی ڈبیہ ۲۰ تولہ دو روپے (عہ) علاوہ محصولڈاک
المشتہر آتنک نگرہ فارمیسی جام نگر کاٹھیاواڑ

R L. No. 1363

قواعد

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳- لارنس روڈ- لاہور

The Picture and Title Page, Printed at the Half-tone Press,
Ram Nagar Langley Road, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

نمبر (۵)

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ مئی ۱۹۳۸ء

تصویر:- علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

چندہ سالانہ صر ششماہی سے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

اُن لوگوں کے لئے جنہیں ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات کا شرف حاصل تھا اُن کی وفات پر اُن کی شاعری کو یاد کرنا اُس پر تبصرہ کرنا، اُن کے شہرۂ آفاق اشعار کا دُہرانا اور گنگنانا کم از کم تھوڑے عرصے کے لئے نہایت دشوار بلکہ دلخراش ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب اپنی شاعری سے الگ ایک زبردست نہیں نہیں ایک محبوب شخصیت کے مالک تھے۔

میں فخر سے محسوس کرتا ہوں کہ میرا شمار بھی اُن ہزاروں افراد میں تھا جنہیں اُن سے گاہے گاہے طُول طویل گفتگو کا موقع ملا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ "شرف" اور "موقع" کا ذکر ایک ایسے شخص کے متعلق کرنا جس کے دروازے ہر وقت ہر کہ و مہ کے لئے کھلے رہتے تھے لغو ہے اور یہ "فخر" کا احساس بھی شاید ایک گناہ کے برابر ہے۔

پھر بھی جی یہی چاہتا ہے کہ فی الحال اُس شاعرِ بے بدل کا ذکر نہ کروں جس کے اشعار سے ایک دُنیا کے دِل گرما گئے بلکہ اُس نگاہ کو یاد کروں جو دل میں اُتر جاتی تھی اُس شیریں آواز کو یاد کروں جو دل میں گھر کر لیتی تھی۔ اور اُس ہمیشہ کے لئے چھپ جانے والے چہرے کو گردن جُھکا کر دل کے آئینے میں دیکھوں اور بار بار دیکھوں۔ اور میری طرح یہاں ہزاروں اور ہیں جن کی یہی کیفیت ہے اور مجھ سے بھی زیادہ دردبھری اُن کی داستان ہوگی جنہوں نے پچھلے چند سالوں میں اپنے قومی شاعر کی مٹھی چاپی کی۔ "یومِ اقبال" والے شفیع صاحب کے ہاتھوں کو پوچھو جنہوں نے اُن کے جسمِ زار و نزار کی لمبی راتوں میں گھنٹوں مالش کی۔ بادشاہی مسجد میں رات کی تاریکی میں قبر میں اُتارتے وقت بیسیوں ہاتھ تھے جو کانپے، سینکڑوں آنکھیں تھیں جن میں آنسو ڈبڈبا آئے اور یہ اس لئے نہیں کہ اِک "یقیں محکم عمل پیہم" کہنے والا خاموش ہو چکا تھا بلکہ اِس لئے اِسی لئے کہ ایک "محبت فاتحِ عالم" کا امانت دار جو سے

پُرسوز و نظرباز و نکو بین و کم آزار   آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

تھا ہمیشہ کے لئے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

میرا ڈاکٹر صاحب سے جو تعلق تھا اُس سے سینکڑوں اوروں کا ذاتی تعلق بہت زیادہ گہرا ہوگا پھر نہیں معلوم مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ میرا تعلق ضرور ایک خاص تعلق تھا۔ اتنا ضرور ہے کہ والدِ مرحوم سے ایک دِلی تعلق کی بنا پر مجھ پر اُن کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ افسوس میں نے اس سے بہت کم فائدہ اُٹھایا۔ حضرتِ ہمایوں کی وفات کے برسوں بعد تک میں محض کبھی کبھی اُن سے مِلا لیکن ایک "بالِ جبریل" چھپنے کے بعد اور پھر مسلم لیگ کے لکھنؤ کے اجلاس کے بعد میں خوش قسمتی سے اکثر اُن کے پاس جانے

لگا یہ محسوس کرکے کہ ہمارے عین درمیان ہم سے اس قدر قریب دُنیا کی ایک عظیم الشان ہستی موجود ہے اور ہم کم بخت اُس کی نادر صحبت سے ذرا فیض نہیں اُٹھاتے۔ مسلمانوں نے اپنے قومی شاعر کی بڑی قدر کی گو گزشتہ سردیوں میں میں نے بعض دفعہ اُن کے پاس جا کر اُن کی تنہائی اور بیکسی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اُن کی آواز میں باوجود ہمت و استقلال کے اب اتنی محبت اور رقت کے جذبات بھرے رہتے تھے کہ اُنہیں یاد کرکے اُن کی طرف اپنی کوتاہیوں پر شرم سی آنے لگتی ہے۔ سچ ہے انسان کی قدر مرنے کے بعد ہی آتی ہے!

کس قدر قانع اور حوصلہ مند طبیعت پائی تھی ؎

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں ۔۔۔ نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

اور بے نیاز: ؎

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی ۔۔۔ گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق ۔۔۔ نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش ۔۔۔ میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

اور پھر وہی: ؎

پُرسوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار ۔۔۔ آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ذرا اپنے ہی بعض اور لیڈروں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھئے، کس طرح گمنامی اور ترکِ دُنیا کے ذریعے سے بھی اپنا پروپیگنڈا کرتے ہیں لیکن مرحوم کو یہی خوشی تھی کہ ؎

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری ۔۔۔ وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے؛

اس کے ساتھ ہی اُنہیں اپنے حیات بخش پیغام کی اہمیت کا احساس تھا، اپنے مزار کے لئے یہ کتبہ چھوڑ گئے ہیں: ؎

چو رخت خویش بر بستم ازیں خاک ۔۔۔ ہمہ گفتند با ما آشنا بود

ولیکن کس ندانست ایں مسافر ۔۔۔ چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

اور اپنی رحلت سے چند منٹ پیشتر یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید ۔۔۔ نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے ۔۔۔ دگر دانائے راز آید کہ ناید

جنابِ حفیظ ہوشیارپوری نے اُن کی یہ تاریخیں کہی ہیں:۔ "ڈاکٹر سر محمد اقبال مُرد" ۱۳۵۷ھ "پیغمبرِ دینِ خودی" ۱۹۳۸ء

بشیر احمد

شہیدِ ملّت حضرتِ اقبال علیہ الرحمۃ

تاجدارِ اقلیمِ سخن کی بارگاہ میں ایک گدائے بے نوا کا خراجِ عقیدت

جنہیں رفعت سے آنکھیں بھی ملانے کا نہ تھا یارا
انہیں پھر لے اڑی یہ کس کی تخئیلِ سپہر آرا؟

گرے میراثِ آبا کھو کے یوں ہم خاکِ حسرت پر
کہ تھا دُنیا کی آنکھوں کیلئے عبرت یہ نظّارا

"کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تُو نے"
ترے دل کو بنایا قلبِ مسلم کس نے دوبارا؟

گداؤں کو جہانبانی سکھانے کیلئے کس نے
خزانہ حکمتِ گم گشتہ کا پھر پا لیا سارا؟

ہوئے افراد پھر احیائے ملّت کیلئے قرباں
حق آگاہی تجھے بخشی خود آگاہی نے دوبارا

در آیا پھر فسونِ عشق یغمائے دل و جاں کو
ہوس کے قافلے کو لے کے بھاگا نفسِ امّارا

نقیبِ آفتابِ تازہ و تابندہ تر آیا
کہ ابھرا ہے افق سے پھر ترا ڈوبا ہوا تارا

علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ
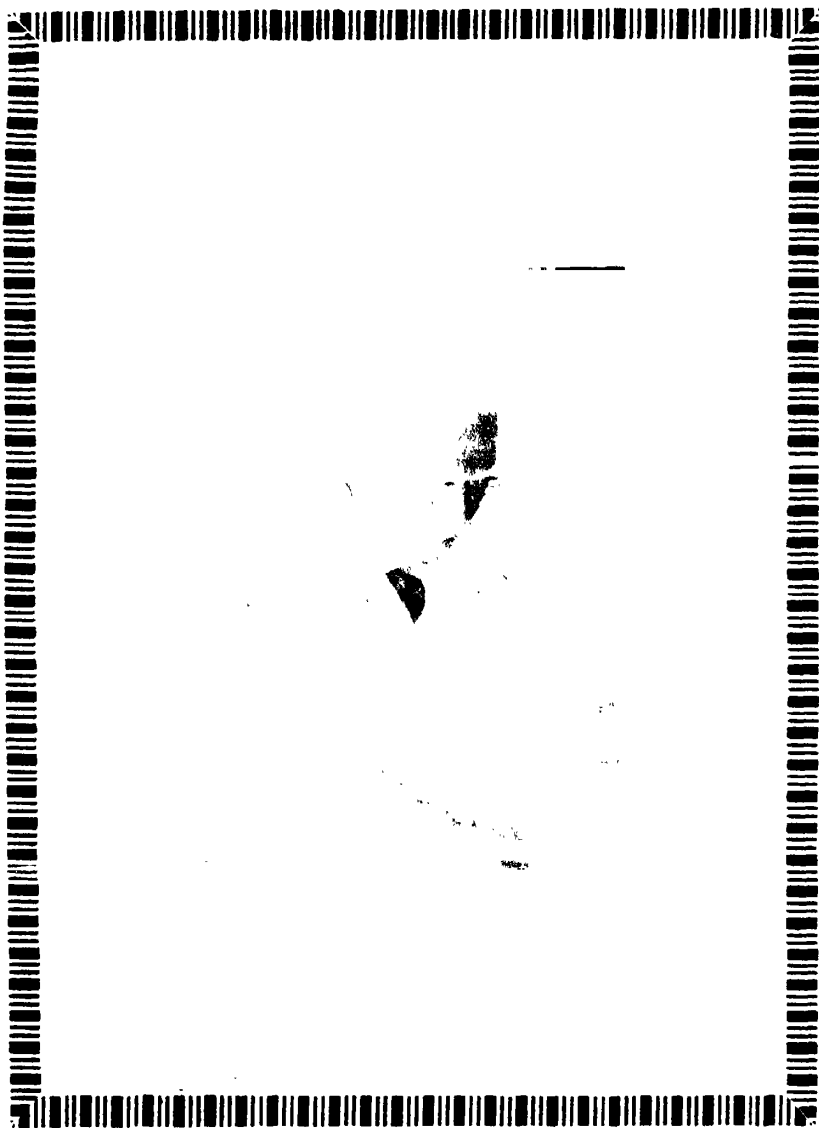
در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

(ملک الشعراء گرامی مرحوم)

فلک سے جا ملا پھر طاقِ قصرِ ملّتِ بیضا
ترا اقبال ہے اور سطوتِ کبریٰ کا نقّارا

بنایا اپنے دل کو گنجِ اسرارِ بقا جس نے
اور اُس کو اُمّتِ مرحوم کی تقدیر پر وارا

سرورِ سینۂ ملّت، فروغِ دیدۂ دُنیا،
خدائے پاک کا پیارا، نبیؐ کی آنکھ کا تارا

نواسازِ خودی! تیری نوا کی گونج اُٹھی ہی تھی
کہ ٹھکرانے لگے پھر بے نوا تاجِ سرِ دارا

ترے "ذوقِ یقیں" نے کارفرمائے جہاں پائے
وہی دل دیدۂ بخت نے پایا جن کو ناکارا

ریاضِ ہند کو تُو نے لہو رو رو کے سینچا ہی
ادا تُو نے کیا ملّت کی تقصیروں کا کفّارا

گیا ہر باغِ ملّت میں شمیمِ جاں فزا لے کر
ترا جوشِ اخوت اور صبا کا خیل آوارا

ترے سوزِ محبت کی فسوں سازی نے پگھلائے
وہ بے حس دل کہ تھے قرنوں سے ننگِ سینۂ خارا

حامد علی خاں

ل یہ نظم جو ۱۹۳۲ء میں لکھی گئی تھی "یومِ اقبال" کی گزشتہ تقریب پر مجلسِ عام میں پڑھی گئی۔

علامۂ اقبال کے ہاں ایک شام

گذشتہ ماہِ رمضان کی ایک سُہانی شام کو جب ہوا کے جھونکے گُلابی جاڑے کی تازگی اور کیفیت سے بس رہے تھے ہم علامۂ اقبال سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے، میرے ساتھ میرے شعبۂ انگریزی کے رفیق پروفیسر عبدالواحد اور صدرِ شعبۂ فلسفہ ڈاکٹر سعید اللہ تھے۔ خزاں کا آغاز تھا مگر موسم میں وہ جولانی تھی جو لاہور کا فرحت بخش آسمان بھی صرف کبھی کبھی زمین والوں کو عطا کرتا ہے، ساڑھے چار بج چکے تھے۔ سُورج کے غروب ہونے میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا۔ فضا اُجلی اور نکھری ہوئی تھی۔ مگر مغرب کی طرف ابر کی چند قرمزی اور نارنجی دھاریاں اُفق پر ایک لہریا سا بنا رہی تھیں۔ ہم امپرس روڈ سے ہوتے ہوئے اُس چھوٹی سی سڑک پر چل رہے تھے۔ جو ریلوے کے بڑے دفتر کے جنوبی رُخ کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ وہ سہ راہہ آیا جہاں یہ سڑک میورو روڈ سے ملتی ہے۔ اور ساتھ ہی ہم نے اُس مختصر سے سفید مکان پر نظر ڈالی جہاں دَورِ حاضر میں حقیقت کا سب سے بڑا ترجمان اپنی خاموش مگر ہنگامہ خیز زندگی بسر کر رہا ہے۔ سڑک کے ساتھ صحن کی چھوٹی سی دیوار، اور اُس کے پیچھے یوکلپٹس کے چار پودے جو ابھی اپنے پورے قد و قامت کو نہیں پہنچے، پھر سبزے کا ایک مختصر سا تختہ جس کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے ہم مکان کی ڈیوڑھی کے پاس جا کر رُک گئے۔ اِس ڈیوڑھی کی تین محرابیں اپنے ہشت پہلو ستونوں پر سڑک سے صاف نظر آتی ہیں۔ ڈیوڑھی کے ساتھ ہی مکان کا برآمدہ ہے جس کے سفید پیل پائے طبیعت کو رُعب و وقار کے بجائے حسن و لطافت کا اثر زیادہ دیتے ہیں۔ ہمارا پُرانا دوست علی بخش[2] ہمیں دیکھ کر صحن کے ایک بغلی حجرے میں سے نکلا۔ اس نے جا کر علامۂ اقبال کو ہماری آمد کی اطلاع دی، اور پھر فوراً واپس آ کر ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔

برآمدے سے گزرتے ہی ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ اِس کمرے کا سامانِ آرائش بہت سادہ اور تکلف و تصنع سے پاک تھا۔ رواق پر شاعرِ مشرق کی ایک تصویر، دو تین فٹ اونچی، فوراً نظر کے سامنے آ گئی۔ اِسی کمرے سے ملحق بائیں ہاتھ کو علامۂ اقبال کی خواب گاہ ہے۔ اس خواب گاہ کی ایک کھڑکی برآمدے کی طرف کھُلتی ہے۔ جس کے ساتھ مِلا ہُوا علامۂ مرحوم کا بستر بچھا رہتا ہے۔ اب ایک عرصہ ہو گیا تھا کہ ہم جب آتے تھے۔ علامۂ اقبال کو اِسی بستر پر کبھی کبھی بیٹھے ہوئے مگر زیادہ تر لیٹے ہوئے پاتے تھے۔ لیکن مجھے وہ دِن بھی یاد ہیں کہ میکلوڈ روڈ کے قیام کے دنوں میں حضرتِ علامہ اپنے خرمنِ فیض کے خوشہ چینوں کو کسی اَور رنگ میں صلائے عام دیتے تھے۔ میں سڑک سے مڑتا تھا تو کوٹھی کے صحن میں داخل

[1] یہ مضمون اب سے تقریباً دو مہینے قبل لکھا گیا تھا۔ [2] علامۂ مغفور کا قدیم وفادار ملازم۔

ہوتے ہی، اور بعد کے دنوں میں اُس لمبی روش پر چند ہی قدم چل کر جو مکان تک پہنچاتی تھی۔ ہمیشہ برآمدے کے ایک مخصوص گوشے میں ڈاکٹر صاحب ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے دُور سے نظر آجاتے تھے۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے علی بخش پہلے سے جمی ہوئی محفل میں حسب ضرورت ایک یا دو کرسیوں کا اضافہ کر دیتا تھا۔

آج ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ہم کسی قدر ٹھٹکے۔ ایک یورپین خاتون ڈاکٹر صاحب کے بستر کے برابر کرسی پر بیٹھی تھیں اور ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی بچی کو گود میں لئے ہوئے تھیں۔ ہم کو دیکھتے ہی وہ اٹھیں اور مقابل کا پردہ اُٹھا کر مکان کے اندر چلی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بستر پر لیٹے ہوئے تھے اُنہوں نے تکیے کے سہارے لیٹے لیٹے ہمارے سلام کا جواب دیا۔ ہم تینوں بستر کے برابر کرسیوں پر بیٹھنے ہی کو تھے کہ ڈاکٹر صاحب ہم سے مخاطب ہوئے:۔

"کون صاحب ہیں؟"

یہ سوال سُن کر میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گاہ بگاہ حاضر ہوتے اب سات آٹھ برس ہو گئے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب ہمیشہ شفقت و عنایت سے پیش آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا سوال میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس لئے اپنے استعجاب کو چھپاتے ہوئے میں نے جواب دیا" جی میں ہوں حمید احمد خاں، سعید اللہ اور عبدالواحد" اور یہ کہہ کر ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے ہم نے ڈاکٹر صاحب کے مزاج کی کیفیت پوچھی۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک سکوت رہا۔ جس کو ڈاکٹر صاحب نے معمول کے مطابق اپنی اُس لمبی اُستادانہ "ہُوں" سے توڑا، جس میں بالعموم گفتگو کے لاتعداد امکانات مضمر ہوتے ہیں۔ میں نے اُس تپائی پر نظر ڈالی جو بستر کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی پانچ سات کتابیں اس کے اُوپر تھیں اور دو ایک نیچے فرش پر پڑی تھیں۔ میں نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر ان کتابوں پر ڈالی اور تھوڑے سے وقفے کے بعد پُوچھا:۔

"ڈاکٹر صاحب! آج کل پڑھنے پر زیادہ توجہ ہے یا کبھی کبھی آپ کچھ لکھتے بھی ہیں۔"

"پڑھنا کیسا! کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اگر کچھ دیکھ سکوں تو پڑھوں"

"نظر نہیں آتا؟" ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ میں نے بے حد حیرت و استعجاب کے لہجہ میں دُہرائے۔

"ہاں! جب آپ لوگ میرے کمرے میں داخل ہوئے ہیں تو میں آپ کو نہیں دیکھ سکا۔ اب تھوڑی دیر گزرنے پر آپ کی صورتیں کسی قدر دُھندلی نظر آرہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ (Senile Cataract) (موتیا بند) اُتر آیا ہے سعید اللہ۔ ان گرمی کی چھٹیوں سے پہلے آپ نے ذکر کیا تھا کہ Senile Cataract اُتر آنے کا خطرہ ہے،

مگر یہ خیال نہیں تھا کہ اس قدر جلد اُتر آئے گا۔

ڈاکٹر صاحب۔ جی ہاں۔ عام طور پر لوگوں کو دیر سے اُترتا ہے۔ مجھے ذرا پہلے اُتر آیا ہے۔ میرے والدِ مرحوم کو جو سَو سال سے کچھ زیادہ زندہ رہے اسّی برس کی عمر میں اُترا تھا۔

مَیں۔ اس کے علاج کی کوئی صورت تو آپ کر رہے ہوں گے؟

ڈاکٹر صاحب:۔ اب اس کا آپریشن ہوگا۔ لیکن جب تک یہ پک نہ جائے آپریشن نہیں ہو سکتا۔ پکنے میں اسے پانچ مہینے لگ جائیں، یا پانچ سال لگ جائیں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بہرحال لکھنا پڑھنا بالکل موقوف ہے کیونکہ میری داہنی آنکھ تو شروع ہی سے بیکار تھی۔

"شروع ہی سے بیکار تھی"! اب حیرت کے ساتھ اس فقرے میں ہمارا تأسف و اضطراب بھی شامل تھا۔

"جی ہاں، دو سال کی عمر میں میری یہ آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ مجھے اپنے ہوش میں مطلق یاد نہیں کہ یہ آنکھ کبھی ٹھیک تھی بھی یا نہیں۔ ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ داہنی آنکھ سے خون لیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے بینائی زائل ہو گئی۔ میری والدہ کا بیان ہے کہ دو سال کی عمر میں جونکیں لگوائی گئی تھیں۔ تاہم مَیں نے اِس آنکھ کی کمی کبھی محسوس نہیں کی۔ ایک آنکھ سے دن کو تارے دیکھ لیا کرتا تھا (اس کے بعد ایک ایسے تبسم کے ساتھ جو گویا تاریکی کی قوتوں کے خلاف بےنظیر اُمید کا نعرۂ خاموش تھا) اب اگرچہ مَیں پڑھتا نہیں ہوں مگر پڑھنے کے بجائے سوچتا ہوں جس میں وہی لُطف ہے جو پڑھنے میں (پھر ذرا سرگرمی کے ساتھ تکیے سے سر اُٹھا کر) عجیب بات یہ ہے کہ جب سے بصارت گئی ہے میرا حافظہ بہتر ہو گیا ہے"!

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی کچھ اور باتیں ہوئیں۔ اُس یورپین خاتون کا ذکر ہوا جو تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں ہمیں نظر آئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے بچوں کی گورنس ہیں۔ اور علی گڑھ کے کسی پروفیسر کی سفارش پر ڈاکٹر صاحب نے انہیں ملازم رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "بیچاری اپنے حالات کی وجہ سے مصیبت میں تھی اور ہے بڑی شریف عورت۔ بہت اچھی منتظم ہے۔ بچوں کی تعلیم کے علاوہ اس نے گھر کا بہت سا اور کام کاج بھی سنبھال لیا ہے۔ ذرا فرصت ملتی ہے، تو مکان کے جھاڑنے پونچھنے میں لگ جاتی ہے، یا باورچی خانے میں جا کر ہاتھ بٹاتی ہے۔ میرا باورچی خانے کا خرچ اب ایک تہائی کم ہو گیا ہے۔ کبھی مجھے انگریزی میں خط لکھنا ہوتا ہے تو اسی کو لکھوا دیتا ہوں۔ اُردو خط جاوید لکھ دیتا ہے ——— ہاں اس سلسلہ میں ایک بڑا لطیفہ ہوا۔ میری لڑکی مُنیرہ اپنی گورنس کے ساتھ سیر کے لئے کسی طرح نہیں جانا چاہتی تھی۔ بہت دفعہ کہا مگر اُسے گورنس کے ساتھ سڑک پر نکلنا بالکل منظور نہیں تھا۔ آخر کئی دن بعد یہ راز کُھلا جب مُنیرہ نے کہا "لوگ مجھے کہیں گے میم کی بیٹی ہے"۔

انہیں باتوں میں سوا پانچ بج گئے۔ علی بخش نے آکر مہر صاحب اور سالک صاحب کے آنے کی اطلاع دی۔ دونوں صاحب تھوڑی دیر میں اندر داخل ہوئے۔ اور ہمارے قریب ہی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان دنوں تھوڑا ہی عرصہ پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک اہم اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا اور پنجاب کی یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے باہمی میثاق کے چرچے تھے مدیران "انقلاب" کے آتے ہی گفتگو کا رخ سیاسیات کی طرف پھر گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس اثنا میں افطار کا وقت قریب آگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجا کر اپنے ملازم رحما کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ افطار کے لئے سنگترے، کھجوریں، کچھ نمکین اور میٹھی چیزیں جو کچھ ہو سکے سب لے آئے۔

سالک صاحب۔ اتنا یہ سب کچھ منگوانے کی کیا ضرورت ہے۔ کھجوریں کافی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ (ایک ایسی شوخی سے جس میں طفلانہ معصومیت کا انداز جھلکتا تھا) سب کچھ کہہ کر ذرا رعب تو جما دیں کچھ نہ کچھ تو لائے گا۔

"رحما" نے ڈاکٹر صاحب کی ہدایات کی لفظ بہ لفظ پابندی ضروری نہ سمجھی اور قریب قریب سالک صاحب کی خواہش کی پاسداری پر قناعت کی۔

ان سیاسی مباحث کے بعد خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے توڑا اور کہا "ڈاکٹر صاحب گرمی کی چھٹیوں سے پہلے ہم حاضر ہوئے تھے تو آپ نے غالب اور بیدل کے متعلق فرمایا تھا کہ آپ کی رائے میں غالب نے بیدل کو سمجھا ہی نہیں۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ بیدل کا تصوف *Dynamic* (حرکی) ہے اور غالب کا *Static* (سکونی)۔

ڈاکٹر صاحب *Inclined to Static* (مائل بہ سکون)

میں۔ جی ہاں۔ اس سے آپ کا کیا مطلب تھا؟

ڈاکٹر صاحب۔ بیدل کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ حرکت پر زور ہے۔ یہاں تک کہ اس کا معشوق بھی صاحب خرام ہے اس کے برعکس غالب کو زیادہ تر اطمینان و سکون سے الفت ہے۔ بیدل نے ایک شعر لکھا ہے جس میں "خرام می کاشت"[1] کی ترکیب استعمال کی ہے گویا سکون کو بھی بہ شکل حرکت دیکھا ہے۔ مثالیں اس وقت یاد نہیں ہیں۔ لیکن اگر آپ بیدل کا کلام پڑھیں تو بہت سے اشعار ہاتھ آجائیں گے۔ میں جن دنوں انارکلی میں رہتا تھا میں نے بیدل کے کلام کا انتخاب کیا تھا۔ وہ اب میرے کاغذوں میں کہیں ادھر ادھر مل گیا ہے۔ نقشبندی سلسلے اور حضرت مجدد الف ثانی سے بیدل کی عقیدت کی

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے جس شعر کی طرف اشارہ کیا وہ یہ ہے:۔ ہر گہ دو قدم خرام می کاشت ۔۔ از نقش قدم عصا بہ کف داشت

بنیاد بھی یہی ہے۔ نقشبندی مسلک حرکت اور رجائیت پر مبنی ہے۔ (Dynamic and Optimistic) مگر چشتی مسلک میں قنوطیت اور سکون کی جھلک نظر آتی ہے۔ (Pessimistic and Static) اسی وجہ سے چشتیہ سلسلے کا حلقۂ ارادت زیادہ تر ہندوستان تک محدود ہے مگر ہندوستان سے باہر افغانستان، بخارا، ترکی وغیرہ میں نقشبندی مسلک کا زور ہے۔ دراصل زندگی کے جس جس شعبے میں تقلید کا عنصر نمایاں ہے۔ اس میں حرکت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ تصوّف تقلید پر مبنی ہے۔ سیاسیات، فلسفہ، شاعری، یہ بھی تقلید پر مبنی ہیں۔ لیکن نقشبندی سلسلے کے شعراء مثلاً ناصر علی سرہندی کو دیکھئے، ناصر علی کی شاعری تقلیدی نہیں ہے۔ اسی لئے حرکت والی قوموں میں وہ زیادہ ہر دلعزیز ہے۔ ہندوستان میں ناصر علی کی کچھ زیادہ قدر نہیں ہے۔ لیکن افغانستان اور بخارا کے اطراف میں لوگ اس کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں بیدل کو بھی افغانستان کے لوگ بہت مانتے ہیں۔

مَیں۔ اُس کے کلام کے حرکی عنصر کی وجہ سے؟

ڈاکٹر صاحب۔ (مسکراتے ہوئے) میرا خیال ہے کہ بیدل کے کلام کو سمجھنے میں انہیں مشکل پیش آتی ہے اس لئے۔

سعید اللہ۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو غالب نے شروع شروع میں بیدل کی طرح مشکل گوئی کی؟ کیا یہ صرف اس دعوے کے لئے کہ مَیں بھی مشکل لکھ سکتا ہوں؟

اس موقع پر تہر صاحب نے سالک صاحب کی طرف دیکھا اور دونوں صاحبوں نے بہ اتفاق ڈاکٹر صاحب سے رخصت کی اجازت چاہی۔ چنانچہ قبل اس کے کہ ڈاکٹر صاحب سعید اللہ کے سوال کا جواب دیں کہ "ہاں جوانی میں انسان طبعاً مشکل پسند ہوتا ہے۔" دونوں حضرات ڈاکٹر صاحب کی خواب گاہ سے نکل کر ڈرائنگ رُوم تک جا پہنچے تھے۔ ان کی رخصت و برخاست کی وجہ سے گفتگو میں قدرتاً ایک اور وقفہ آیا۔ اس کے بعد سعید اللہ نے کہا "آج کل ہندوستان کے نیشنل انتھم کے متعلق بڑی بحث ہو رہی ہے۔ آپ کی اس مسئلے کے متعلق کیا رائے ہے؟"

ڈاکٹر صاحب:۔ "نیشنل انتھم" تو اُس صُورت میں ہو کہ کوئی "نیشن" ہو۔ جب سرے سے "نیشن" ہی کا کوئی وجُود نہیں ہے۔ تو "نیشنل انتھم" کہاں ہو سکتا ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ہندوستان کو کسی "نیشنل انتھم" کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

سعید اللہ۔ "بندے ماترم" پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایک تو یہ بنگالی ہے۔ دُوسرے اس کے آہنگ میں گرمی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ (ذرا گرمی سے) آپ ہندوؤں کی شاعری میں گرمی ڈھونڈتے ہیں؛ ہندو شاعری کے تمام دفتر

دیکھ ڈالیے۔ کہیں گرمی نظر نہیں آئے گی۔ ہندو کو ہر جگہ شانتی کی تلاش ہے۔ ہندوؤں کی ادبی پیداوار میں میرے نزدیک اس کی صرف ایک استثنا ہے۔ رامائن، اور وہ بھی بعض بعض حصوں میں۔

عبدالواحد:۔ مگر ہندوستان کی موسیقی تو خاصی ہیجان انگیز ہے۔ قوالی میں یہی موسیقی کافی گرمی پیدا کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب۔ میں اسے مصنوعی گرمی کہتا ہوں جس طرح کسی قسم کے نشے سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کر لے۔

عبدالواحد۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ وجد و حال کی کیفیت مصنوعی ہے؟ مثلاً ہمارے ہاں سیالکوٹ میں نوشاہیوں کا میلہ ہوتا ہے۔ وہاں قوالی سے بعض لوگ یک دم حال میں آجاتے ہیں۔ کیا وہ آپ کے نزدیک محض دکھلاوا ہے؟

ڈاکٹر صاحب:۔ ان لوگوں نے وجد و حال کو ایک Custom (دستور) بنا لیا ہے۔ یہ کیفیت ان پر واقعی طاری ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے جوشِ جذبات کو اس طرح فرو کر لیتے ہیں، تو پھر ان میں باقی کچھ نہیں رہتا اور نہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔ دراصل مسلمان جب عرب سے نکلے اور انہیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ کرتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں۔ ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے۔ اور حال انہیں فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ صوفیوں کے سلسلوں میں قوالی کو جو دخل ہے وہ صرف اسی وجہ سے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اس وقت تمام اسلامی ممالک میں اپنا اپنا مقامی فن موسیقی رائج ہے، مسلمان جہاں جہاں پہنچے وہیں کی موسیقی انہوں نے قبول کر لی۔ اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فنِ تعمیر کے سوا فنونِ لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی رُوح نہیں آئی۔ اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آئی۔ البتہ پچھلی مرتبہ یورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا۔ اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقع ملا۔ ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بُت بھی تھے۔ جن میں قوت اور ہیبت کی ایک ایسی شان تھی۔ جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمرؓ کی مسجد اور دلی کی مسجد قوۃ الاسلام بھی پیدا کرتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا جب میں نے مسجد قوۃ الاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مگر جو اثر میری طبیعت پر اس وقت ہوا وہ مجھے اب تک یاد ہے، شام کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ اور مغرب کا وقت قریب تھا۔ میرا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں۔ لیکن مسجد کی قوت و جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فعل ایک جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا۔ مسجد کا وقار مجھ پر اس طرح چھا گیا کہ میرے دل میں صرف یہ احساس تھا

کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔

اُندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قوائے شل ہوتے گئے، تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضُعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصرِ زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ مہذب دیووں کا مگر الحمراء محض مہذب انسانوں کا!"

پھر ایک تبسم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"میں الحمراء کے ایوانوں میں جابجا گھومتا پھرا، مگر جدھر نظر اُٹھتی تھی دیوار پر "هُوَ الْغَالِبُ" لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا، یہاں تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے۔ کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو۔"

اس کے بعد پھر تھوڑی دیر تک ہندوستان کی اسلامی عمارات کا ذکر ہوتا رہا۔ تاج محل کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

"مسجد قوۃ الاسلام کی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی۔ بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کو ضُعف آگیا ہے، اور دراصل یہی قوت کا عنصر ہے جو حُسن کے لئے توازن قائم کرتا ہے۔"

سعید اللہ۔ دِلّی کی جامع مسجد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

ڈاکٹر صاحب۔ وہ تو ایک بیگم ہے!

ہم اس فقرے پر ہنسے اور ڈاکٹر صاحب بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس منزل پر اسلامی تعمیرات کے متعلق یہ دلکشا بحث ختم ہوئی۔ اب شام کے ساڑھے سات بج چُکے تھے، اور تین گھنٹے کی اس مسلسل نشست کو طول دینا کچھ ایسا مناسب بھی نہیں تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اُن "مشورہ طلب" نگاہوں سے دیکھا جنہیں ہم نے معمولاً ڈاکٹر صاحب سے اجازت لینے کا پیش خیمہ قرار دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حسبِ معمول ہم سے کہا "اچھا! چلتے ہیں آپ؟" اور اس کے بعد ہم رُخصت ہوئے۔

حمید احمد خاں

"تاریخِ علامہ"

۱۳۵۷ھ

رخت بربست ازجہاں اقبالِ ما — آں امینِ سوزِ مشتاقی نماند
ما تہی پیمانہ واماندیم حیف! — "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"
درد مندِ مسافر، گفت خود سالِ وفات — "صدق و اخلاص و صفا باقی نماند"

۱۳۵۷ھ

علامہ مرحوم کی ایک مشہور رباعی

حفیظ ہوشیارپوری

جہاں نما

اُردو اور اتحادِ ہندو مُسلم

اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی اُس ناچاقی کے اسباب پر غور کیا جائے جو اس مُلک کی ذلّت اور غلامی کا موجب بنی ہوئی ہے تو اس کا سب سے بڑا سبب یہی نظر آتا ہے کہ گزشتہ ایک ہزار سال کے قرب کے باوجود بھی یہ دونوں قومیں ایک دوسری کو سمجھ نہیں سکیں اور ایک قوم دوسری کے جذبات و محسوسات اور خیالات و عقاید سے اتنی ہی بیگانہ ہے جتنی سمندر پار کی کوئی قوم۔

مُغلوں کے دَورِ حکومت میں یہ دونوں قومیں ایک دوسری سے کسی قدر قریب آ گئی تھیں اور نتیجۃً ایک مشترک کلچر بھی پیدا ہُوا تھا جس کا ذریعۂ اظہار اُردو زبان بنی۔ خیال یہ تھا کہ آئندہ چل کر اُردو زبان اتحادِ ہندو مسلم کا سنگم قرار پائے گی لیکن عیار دشمنوں کی پُرکاری اور نادان دوستوں کی سادگی آجکل اُسی زبان کو جو اس مُلک میں بسنے والی اِن دو عظیم الشان قوموں کو ایک دوسری سے قریب تر لا رہی تھی صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تُلی ہوئی ہے۔

حال ہی میں سر تیج بہادر سپرو نے جماعتی فسادات کا تذکرہ کرتے ہوئے کیا خُوب کہا ہے کہ ہندوستانی اگر دل سے چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان متحد ہو جائیں تو انہیں چاہئے کہ وہ اُردو زبان کو مُلکی زبان بنائیں، اِس کی اصلاح و ترقی کی کوشش کریں اور بلا تمیزِ مذہب و ملّت اسے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیں۔

سر تیج بہادر سپرو نے اسی سلسلے میں یہ حقیقت بھی بیان کی کہ" اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبان ہے دونوں قوموں نے مِل کر اسے پیدا کیا اور اب دونوں کا فرض ہے کہ اسے ترقی دیں اور پھیلائیں۔ آخر میں سر سپرو نے فرمایا کہ" اُردو زبان محض اس لئے وجود میں آئی تھی کہ اس کے ذریعے سے ہندوؤں اور مُسلمانوں کو متحد کیا جا سکے۔ اب یہ کس قدر رنج کا مقام ہے کہ خود یہی ذریعۂ اتحاد بنائے نفاق بنا ہُوا ہے اور اتحاد و ترقی کی کوششوں کے بجائے اس مُلک کے گوشے گوشے میں ؏

یا بحث ہے اُردو ہندی کی یا قُربانی یا جھٹکا ہے

مغلوں کے عہد میں ہندوستان کی خوشحالی

فرانسیسی سیاح برنیر نے اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں ہندوستان کی سیاحت کی۔ اُس نے ہندوستان میں جس خوشحالی

اور فراغ بالی کا مشاہدہ کیا اس کا اندازہ ذیل کی چند سطور سے ہو سکتا ہے جو اس نے سرزمینِ بنگالہ کی زرخیزی اور دولت مندی کا تذکرہ کرتے ہوئے سپردِ قلم کی ہیں:-

"تاریخ کے ہر دور میں یہ خیال عام رہا ہے کہ مصر دُنیا کا سب سے زیادہ زرخیز خطہ ہے اور آج کل کے مصنفین بھی یہی کہتے ہیں کہ دُنیا کا کوئی دوسرا خطہ قدرت کے انعامات سے مصر کی طرح مالامال نہیں۔ لیکن بنگال کی سلطنت کی سیاحت کے سلسلے میں دو دفعہ جو معلومات مجھے حاصل ہوئی ہیں اُن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں بلا تامل یہ کہہ سکتا ہوں کہ دُنیا میں زرخیزی کے لحاظ سے جو مرتبہ مصر کو دیا گیا ہے اس کا اصلی حقدار بنگال ہے۔ یہاں چاول اس کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ اندرونی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد ان سے نہ صرف ہمسایہ خطوں کی بلکہ دُور دُور کے علاقوں کی طلب پوری کی جاتی ہے۔ شکر بھی یہاں اس کثرت سے پیدا ہوتی ہے کہ اس سے نہ صرف گولکنڈے اور کرناٹک کی سلطنتوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں (کیونکہ ان کے ہاں خود بہت کم شکر پیدا ہوتی ہے) بلکہ بنگال کی شکر ہی عرب، عراق اور بندر عباسی کے راستے سے ایران کو بھی بھیجی جاتی ہے۔ بنگال مٹھائی کے لئے بھی خاص طور پر مشہور ہے۔ ملکی ضروریات کے مطابق گیہوں کی کاشت بھی کی جاتی ہے اور اس سے ارزاں بسکٹ بھی بنا کر فروخت کیے جاتے ہیں۔ عوام کی عام خوراک مختلف قسم کی سبزی، چاول اور مکھن ہے اور ان چیزوں کی قیمت بالکل بے حقیقت ہے۔ ایک روپے میں بیس یا اس سے بھی زیادہ مُرغیاں مل جاتی ہیں۔ ہر قسم کی تازہ اور خشک مچھلی کی بھی اتنی ہی افراط ہے۔ مختصر یہ کہ بنگال میں ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی نہایت کثرت سے موجود ہیں۔ میں نے اور کسی ملک میں ہر چیز کی اتنی بہتات نہیں دیکھی۔ قیمتی پیداوار میں شکر کے علاوہ ریشم اور کپاس کی وہ کثرت ہے کہ بنگال کو ہم نہ صرف تمام ہندوستان یا سلطنتِ مغلیہ کی ضروریات کا کفیل قرار دے سکتے ہیں بلکہ یورپ کی ضروریات کا کفیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ کس کثرت سے بنگال کا ریشمی یا سُوتی، سفید یا رنگین موٹا یا باریک کپڑا لاہور اور کابل تک تمام سلطنتِ مغلیہ میں بھیجا جاتا ہے اور اس کے علاوہ کتنی بڑی مقدار میں اس کی برآمد غیر ممالک کے لئے بھی کی جاتی ہے۔ بنگال کی اسی زرخیزی کو مدِ نظر رکھ کر پرتگالی، ولندیزی اور انگریز کہا کرتے ہیں کہ "بنگال میں داخل ہونے کے لئے سینکڑوں دروازے ہیں لیکن باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں"۔

ابراہام لنکن

۱۸۴۱ء کے نوروز کی تقریب پر سپرنگ فیلڈ (امریکا) میں مسٹر ایڈورڈز کے گھر میں بہت گہما گہمی اور چہل پہل نظر آتی تھی اُس شام مسز ایڈورڈز کی بہن میری ٹاڈ کی شادی ہونے والی تھی جس کی خوشی میں رات کی ضیافت اور اس کے بعد رقص کی محفل کا اہتمام

بھی ہو رہا تھا۔

دُلہن تیار ہو چکی اور مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا لیکن اب تک دُولہا کہیں نظر نہ آتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد لوگ دُولہا کی تلاش میں نکل گئے کیونکہ وہ غائب تھا۔

اپنی اس توہین اور ذلت سے متاثر ہو کر میری ٹاڈ جا کر اپنی خوابگاہ کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئی۔ مہمان چہ میگوئیاں کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ کھانے کو کسی نے ہاتھ بھی نہ لگایا اور رقص کا کمرہ بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ یکے بعد دیگرے گھر کے کمروں کے چراغ بجھنے لگے اور گھر والے اپنی اپنی خوابگاہوں میں چلے گئے۔

دُولہا کہاں تھا؛ وہ رات کے وقت ایک جنگل میں پھر رہا تھا۔ اس کے دل میں دو مختلف جذبات کے درمیان ایک زبردست جنگ ہو رہی تھی، زندہ سے پاس عہد اور مُردہ سے پاس وفا کے متصادم جذبات اسے کسی طرح چین نہ لینے دیتے تھے۔

وہ ایک لڑکی کے غمناک تصوّر میں ڈوبا ہوا تھا ـــ سیاہ چشم اور چنچل میری ٹاڈ نہیں بلکہ ایک غریب سرائے دار کی نوخیز شیریں حرکات لڑکی این رٹلج۔ یہ نیلی آنکھوں اور سُرخی مائل بھورے بالوں والی ایک دُبلی پتلی خوبصورت لڑکی تھی، لوگ کہا کرتے تھے، اس کا دِل فرشتوں کی طرح معصوم اور پاکیزہ ہے۔

پریشان حال نوجوان دل میں کہہ رہا تھا، اب این واقعی فرشتوں میں شامل ہو چکی ہے۔ مرنے کے وقت این نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مرنے سے چند ہی دن پہلے این نے اُس پر اپنی محبّت کا راز افشا کیا تھا۔ نوجوان کا سر جُھک گیا تاریکی میں بتیس سال کا یہ جوان آہستہ آہستہ اپنے بوجھل پاؤں گھسیٹ رہا تھا۔ وہ دِل میں کہہ رہا تھا" میں بھی کتنا احمق ہوں، جاہ پرستی نے مجھے گمراہی کے جال میں پھنسا لیا ہے۔

وہ ایک وکیل اور حکومت کی مجلس وضع قوانین کا رُکن تھا لیکن اس کے پاس نہ دولت تھی، نہ خاندانی اعزاز، وہ امریکا کے بہت ادنیٰ طبقے سے اُٹھا تھا اور بیچارے نے نہایت محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے والدین کا تعلق سوسائٹی کے اس طبقے سے تھا جسے امریکا کے حبشی غلام بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اسے اب تک اپنی ماں لوسی ہینکس یاد تھی، اگرچہ جب اس کا انتقال ہوا اس کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی۔ یہ عورت ورجینیا کے ایک زمیندار کی غیر قانونی بیٹی تھی۔ اس کو مذہب سے بہت لگاؤ تھا اور ہر وقت گہرے خیالات میں ڈوبی رہتی تھی۔ بیٹے کو بھی ماں کی سی طبیعت ورثہ میں ملی چنانچہ ایک زمانے میں اس نے یہ الفاظ کہے تھے" میری ماں پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں، میں جو کچھ بنا یا آئندہ بنوں گا اس کے لئے میں اپنی ماں کا ممنونِ احسان ہوں"۔

وہ اس قدر غریب تھے کہ جس چوبی جھونپڑی میں رہتے تھے اس میں دِیا بھی نہ جلا سکتے تھے۔ اِن کے ہاں صرف ایک

کتاب تھی یعنی انجیلِ مقدس ۔ یہ لڑکا جسے آئندہ چل کر وکیل بننا تھا، چولھے کے سامنے لیٹ جاتا اور اس کی لَو میں ایک لکڑی کے تختہ پر کوئلے سے لکھنا سیکھتا ۔

جب یہ ذرا بڑا ہُوا تو بہت طاقتور نکلا۔ ایک مدت تک وہ درخت کاٹتا اور لکڑی کے جنگلے بنا کر اپنا پیٹ پالتا رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ طرح طرح کی سختیاں جھیل کر اپنی تعلیم کا بھی انتظام کرتا رہا۔ آخر اس تمام محنت و مشقت کا نتیجہ کامیابی کی صُورت میں ظاہر ہُوا۔

مگر آج یہ صُورت تھی کہ وہ اس عورت کی رُسوائی کا مُوجب بنا ہُوا تھا جو اُس کی شادی کی درخواست منظور کر چکی تھی ۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا "کاش میں شادی کی درخواست نہ کرتا یا کاش وہ اسے منظور نہ کرتی"۔ اصل میں دونوں جاہ پرست تھے محنت کش وکیل نے معاشرہ میں بلند حیثیت حاصل کرنے کے خیال سے اس عالی نژاد حسینہ کے سامنے شادی کی تجویز پیش کی اور دُور اندیش لڑکی یہ بھانپ چکی تھی کہ اس نوجوان کے سینے میں وہ چنگاری دبی ہے جسے ہوا دے کر میں اپنے نام کو شہرت و عظمت کے آسمان کا درخشندہ ستارہ بنا سکتی ہوں۔

لیکن اس وقت جنگل میں یہ نوجوان خودکشی کا ارادہ کر رہا تھا۔

دوسرے دن دوستوں نے اس کو ڈھونڈ پایا اور اسے ساتھ لے کر گھر پہنچے ۔ اس کے بعد کئی دن تک اس کی کڑی نگرانی کی گئی کہ یہ کہیں خودکشی نہ کرلے ۔

آخر نوجوان دوبارہ اپنے کاروبار میں لگ گیا اور ایک خیر خواہ خاتون کی کوشش کے طفیل میری ٹاڈ سے اس کی مصالحت ہوگئی۔ اور پھر یہ دونوں دُولہا دُلہن بھی بن گئے ۔

دولہا کے دل میں مسرت کی کوئی رمق نہ تھی لیکن وہ احساسِ فرض کے خیال سے مجبور تھا۔ ایک چھوٹے لڑکے نے اسے شادی کا لباس پہنے ہوئے دیکھ کر سوال کیا "آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے جواب دیا "شاید جہنم کو جا رہا ہوں"۔

آخر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے شادی کے رجسٹر پر دستخط کئے ـــــ ایبراہام لنکن ۔

میری ٹاڈ کو وہ مرتبہ حاصل ہُوا جس کا اس کی جاہ پسندی نے بھی خواب تک نہ دیکھا تھا۔ وہ مُلک کی سب سے بڑی خاتون کی حیثیت سے "وائٹ ہاؤس" میں رہی لیکن لنکن اس کی کوششوں سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی قابلیت سے "صدر جمہوریہ امریکا" کے مرتبہ تک پہنچا ۔

لنکن نے ایک نہایت نازک دَور میں صدارت کا منصب حاصل کیا ۔ امریکا کی خانہ جنگی کے دَوران میں اُس نے شمالی علاقے کی قیادت کی اور یونین کو بچا لیا۔ اس نے غلاموں کو آزاد کیا اور کامیاب ہوجانے کے بعد وہ ایک قاتل کی گولی سے ہلاک ہوگیا ۔

آج اپنے کارناموں کی وجہ سے اس کا شمار دُنیا کی چند بڑی بڑی شخصیتوں میں کیا جاتا ہے۔

حامد علی خاں

"بابوجی"

اس وقت میری عمر یہی کوئی آٹھ ایک برس کی ہوگی۔ سردیوں کے دن تھے اور شام کا وقت۔ ہم سب چولہے کے گرد بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ بھائی صاحب شاید ہمیں اپنی درسی کتاب کی کوئی کہانی سنا رہے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ سُن کر میں نے باہر کی طرف نظر دوڑائی اور ابا جان کو آتے دیکھ کر پھر کہانی کی طرف متوجہ ہوگیا...... "کبوتروں نے کہا ہم سب سے زیادہ زور لگا رہے ہیں۔ کوّے بولے ہمارا تو لہو پسینہ ایک ہوا جاتا ہے، اگر ہم زور لگانا چھوڑ دیں تو جال دھم سے......"

"لڑکو تمہارے ماموں آئے ہیں" ابا کے اس فقرہ نے کہانی، سردی اور آگ سب کچھ بھلا دیا۔ میں دوڑ کر ماموں سے جا لپٹا۔ جب کبھی ماموں آتے ہمارے لئے نئے نئے کھلونے لایا کرتے اور اسی وجہ سے ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

رات کو دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دورانِ گفتگو میں میرا بھی ذکر آگیا۔ ابا نے شکایت کی یہ سکول جانے سے بہت جی چُراتا ہے۔ والدہ نے کہا "کیا کرے۔ ایک میل جانا، ایک میل آنا۔ بچہ ہے، تھک جاتا ہوگا، اس میں شکوہ شکایت کی کونسی بات ہے؟" ابا نے بتایا کہ گاؤں والوں نے ایک درخواست بورڈ کو بھیجی ہے کہ گاؤں میں مدرسہ کھولا جائے۔ ماموں نے کہا "ان باتوں کو رہنے دیجئے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا، گھر کے پاس ہی مدرسہ ہے۔ وہاں اس کا جی پڑھنے میں لگ جائے گا، اور ہمارا بھی دِل بہلے گا، کیوں بھئی منظور، تمہیں منظور ہے نا؟" میں ہنس رہا تھا۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا اور اگلے دن میں ماموں کے گاؤں میں آگیا۔

(۲)

ماموں کا گھر نمبردار کے مکان کے عین سامنے واقع ہے، اور مدرسہ بھی بالکل قریب ہے۔ اس گھر میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ ایک ہی ماموں زاد بھائی تھا، سردار، جو عمر میں مجھ سے بہت بڑا تھا اور قصبہ کے سکول میں دسویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ قصبہ گاؤں سے میل بھر کے فاصلے پر تھا۔ وہ ہر روز صبح پڑھنے چلا جاتا اور شام کو لوٹ آتا۔ میں بہت خوش تھا کہ یہاں مجھے اپنے گاؤں کی طرح یا بابوجی کی طرح ہر روز سفر نہیں کرنا پڑتا تھا (میں سردار کو بابوجی کہا کرتا تھا) گھر سے نکلے تو مدرسے، مدرسہ سے نکلے تو گھر۔ بابوجی مجھ سے بہت پیار کرتے تھے اور جب وہ رات کو لیمپ جلا کر پڑھنے کے لئے بیٹھتے تو میں بھی ان کے پاس اپنا بستہ لے کر بیٹھ جاتا، اور ان کی کتابوں کی تصویریں دیکھتا رہتا۔ بابوجی اندر باہر جاتے وقت نمبردار کے گھر کے اندر ضرور ایک نظر ڈال لیا کرتے تھے، اور کئی دفعہ ان کے گھر جا کر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ نمبردار کے گھر کئی بچے تھے۔ محلے کے سب بچے

اکٹھے ہو کر نمبردار کے گھر کے وسیع صحن میں کھیلا کرتے اور ان سب کے کھیل کود میں میں بھی ہر وقت شریک رہتا۔ جب ہم آنکھ مچولی کھیلتے تو بی بی ہمیں چھپنے کی عجیب عجیب جگہیں بتایا کرتی۔ کسی کو چارپائی کے نیچے چھپا دیا۔ کسی کو غلّہ کی کوٹھی کے پیچھے اور کسی کو بستر میں لپیٹ دیا۔ بی بی نمبردار کی سب سے بڑی لڑکی تھی۔ عمر میں بالوجی اتنی بڑی ہوگی۔ اس کا نام تو عائشہ تھا مگر سب لوگ اسے بی بی کہا کرتے تھے۔ بعض دفعہ بالوجی بھی ہمارا کھیل دیکھا کرتے تھے۔ ان کی موجودگی سے کھیل کا لطف زیادہ ہو جاتا تھا۔ اتوار کا دن تو تمام کا تمام کھیلنے کودنے میں ہی صرف ہو جاتا۔ ایک دفعہ میری باری تھی۔ میں کنویں کو ہاتھ لگا کر جب اندر آیا تو بالوجی بی بی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بالوجی نے کہا "دیکھو جو رہے شفیع کپاس کے پیچھے ہے۔ عمری اس ستون کے پیچھے۔ کاکا ادھر، حیات ......" ابھی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ سب بچے شور مچاتے ہوئے نکل آئے "ہم نہیں کھیلتے، ہم نہیں کھیلتے"۔ بی بی بالوجی کی طرف مڑی۔ وہ ہنستے ہنستے دو ہی پھلانگوں میں اپنے گھر کے اندر تھے۔

میں تو ان کے کھیلوں میں اب شامل ہوا تھا۔ اور یہ تمام بچے اور بالوجی اور بی بی پتہ نہیں کتنے لمبے عرصہ سے باہم کھیلا کرتے تھے۔ بالوجی ہمیشہ بڑوں کی نظر بچا کر بی بی کو دیکھتے رہتے اور جانے کیوں وہ دونوں بغیر وجہ کے اکثر مسکرا دیا کرتے جب کبھی بالوجی کو اپنے کام کی وجہ سے ہمارے کھیل دیکھے دو تین دن ہو جاتے تو بی بی مجھ سے کہتی "اپنے بالوجی سے جا کر کہو ہمارا کھیل دیکھیں"۔ جب وہ آتے تو آہستہ سے مسکرا کر کہتی "آپ تو عید کا چاند ہو گئے"۔ وہ باتیں کرتے رہتے اور ہم کھیل میں مشغول رہتے۔ چاندنی راتوں میں ہمیں "دھوپ چھاؤں" کھیلنے میں بہت مزا آتا۔ کئی دفعہ میں اور عمری ساتھی بن جاتے۔ بی بی ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی اور ہم دوسروں کو پکڑتے پھرتے۔ بعض اوقات ہم دونوں ایک دوسرے کو ہی مضبوطی سے پکڑ لیتے اور جب آنکھوں سے پٹیاں اتار کر دیکھتے تو شرمسار ہو کر پھر پٹیاں آنکھوں کے آگے کر لیتے۔ بالوجی اور بی بی ہنس ہنس کر لوٹن کبوتر بنے جاتے۔

کبھی کبھی بی بی کی ماں اسے بغیر کسی کام کے بلا لیتی اور پاس بٹھا کر کہتی "تو اچھی لگتی ہے چھوٹے بچوں میں کھیلتی —— جیسے اور کوئی کام ہی نہیں ——"

بی بی نے مسجد کے مولوی صاحب سے قرآن پڑھا تھا اور اپنے بڑے بھائی سے حساب اور اردو بھی سیکھی تھی۔ اس کا بڑا بھائی گاؤں سے بہت دور کسی مدرسہ میں منشی تھا اور اپنے بچوں کے ساتھ وہیں رہا کرتا تھا۔ کبھی کبھار مہینے دو مہینے بعد وہ آیا کرتا تھا۔ عمری اسی منشی کی لڑکی تھی اور منشی کے ساتھ جانے کے بجائے اپنی بڑی اماں کے پاس رہا کرتی تھی۔

ہمارے سکول کے منشی نے ماموں سے کہا "منظور جماعت میں بہت کمزور ہے، اس سے کہئے اپنے بالوجی سے سوال سمجھا کرے۔ ورنہ پاس نہیں ہو سکے گا۔ بالوجی نے ماموں سے کہا "میں خود پاس ہونے کی فکر کروں یا اسے پاس

کراؤں ؟" اور باہر جاکر مجھ سے کہا کہ بی بی کے پاس جاکر اس سے سوال سمجھ لیا کرو اور تیز روشنی والے لمپ کے پاس بیٹھنا ہو تو اسے بھی یہیں بُلا لیا کرو۔"

میں نے بی بی سے کہا "بی بی آپا! رات کو ہمارے یہاں آکر مجھے سوال تو سمجھا دیا کرو۔" مگر اس کی ماں نے کہا "بیٹا یہیں آکر سمجھ لیا کرو۔ تم یہاں کیا نہیں آسکتے ؟" اس کے بعد میں روزانہ یا دوسرے دن بی بی سے سوال سمجھنے جاتا۔ وہ سوال بھی سمجھایا کرتی اور کبھی کبھی بابوجی کا بھی ذکر کیا کرتی ——— "جب تم آئے تھے تو تمہارے بابوجی کیا کر رہے تھے؟ . . . . . . اپنے بابوجی سے کہنا میرے لئے لائبریری سے کوئی اچھی سی کہانیوں کی کتاب تو لا دیں . . . . تمہارے بابوجی کو نگوڑی پڑھائی اب فرصت ہی نہیں دیتی کہ کبھی آکر چچا کے پاس بیٹھیں ——— اور کیا منظور، تم میری یہ باتیں بابو جی کو بتایا کرتے ہو؟ . . . . . بتا دیا کرو، مجھے کیا ڈر ہے! سوال حل کر لیا؟ کیا جواب ہے؟"

جب میں بابوجی کے پاس بیٹھا ہوتا تو وہ بھی کسی نہ کسی بہانے بی بی کا ذکر کر ہی لیتے۔ ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ بی بی ہمارے گھر شاید کوئی برتن دینے آئی تھی یا کوئی چیز لینے کے لئے۔ جب وہ ہماری نشستگاہ کے قریب سے گزری تو میں نے کہا "بی بی! ذرا یہ ایک سوال تو سمجھاتی جاؤ۔" وہ اندر آگئی اور میری حساب کی کتاب دیکھنے لگی۔ بابو جی جانے کیوں بار بار کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتے۔ بی بی سلیٹ پر حل کیا ہوا سوال دیکھنے لگی۔ "یہاں پھر جمع کی غلطی ہے۔ تین اور پانچ؟"

"آٹھ"

"آٹھ اور نو؟"

میں نے اُنگلیوں پر گن کر کہا "سترہ"

"تو پھر یہاں چھ کیوں لکھ دیا؟ . . . . . سلیٹ پر دیکھو۔ میرے ماتھے پر کیا لکھا ہے؟"

بابوجی آہستہ سے بولے "میری زندگی کا افسانہ۔"

بی بی نے بابوجی کی طرف دیکھا۔ دونوں مسکرا دیئے اور بی بی یہ کہتی ہوئی چلی گئی "تو خدا کرے میری پیشانی بہت روشن ہو۔" یہ ایک دو باتیں میری سمجھ میں نہ آئیں۔ میں تو کاپی پر سوال نقل کرنے لگ گیا مگر بابوجی کچھ دیر تک کسی خیال میں محو رہے۔

(۳)

مجھے ماموں کے ہاں رہتے ہوئے چار پانچ مہینے کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ہمارے کھیل تو جاری رہے مگر اب بی بی ہم کو

کھلانے نہیں آیا کرتی تھی، شاید بڑی اماں نے سختی سے منع کر دیا ہو کیونکہ معمولی منع کئے جانے کے باوجود وہ ہمیں کھلاتی ہی رہی تھی۔ بالوجی کے سامنے وہ اب زیادہ ہنستی نہ تھی۔ کم ازکم ان کے آنے پر وہ بار بار گھر والوں کی طرف ضرور دیکھا کرتی۔

مارچ کے مہینہ میں بالوجی کا امتحان شروع ہو گیا۔ ایک دن میں نے گلی میں بالوجی کو آہستہ سے یہ کہتے سنا "بی بی دعا کرنا میرا امتحان اچھا ہو جائے"۔ میں اس وقت شاید دُکان سے دال لا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ بی بی نماز کے بعد بالوجی کے لئے ضرور دُعا مانگتی ہو گی۔ میرا بھی امتحان انہی دنوں ہؤا اور میں پاس ہو کر تیسری جماعت میں ہو گیا۔ دو مہینے بعد بالوجی کا نتیجہ نکلا۔ وُہ بھی پاس نکلے تھے۔ اس دن ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ ہم نے محلے میں بتاشے بانٹے۔ بی بی اور اس کی ماں مبارک باد کہنے آئیں۔ بی بی مجھے اس دن بہت زیادہ خوش معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اپنی خوشی ظاہر تو نہیں کرتی تھی مگر اس کا بات بات پر ہنسنا اس بات کا شاہد تھا۔

اب بالوجی کے بارے میں ماموں فکر کرنے لگے۔ کوئی کہتا اسے کارخانے میں بھیجو۔ کسی کا خیال تھا کہ نارمل پڑھ کر منشی بن جائے تو اچھا ہے۔ مسجد کے مولوی صاحب نے کہا "لاہور میں شیرانوالے دروازے میں ایک مولوی صاحب رہتے ہیں جو بہت بڑے عالم ہیں اور انگریزی خواں بابوؤں کو بہت اچھا واعظ اور عالم بنا دیتے ہیں۔ منظور کو وہاں بھیج دو۔ دین اور دُنیا دونوں میں نیکنام ہو گا"۔ نمبردار کہتا تھا "ہمارے گاؤں کا ایک تو لڑکا پڑھ لکھ کر تحصیلدار بن جائے۔ حوالدار صاحب (میرے ماموں فوج کے پنشنر حوالدار ہیں) تم پر اللہ کا ترس ہے۔ خدا نے بہت کچھ دیا ہے۔ جب تم میں پڑھانے کی ہمت ہے تو لڑکے کو آگے کیوں نہیں پڑھاتے؟"

والد صاحب کو بھی ماموں نے خط لکھا۔ انہوں نے مبارکباد لکھ بھیجی اور بالوجی کو کالج میں داخل کرانے پر زور دیا۔

(۴)

اب بالوجی شہر کے کالج میں داخل ہو گئے تھے جو گاؤں سے پچیس تیس کوس کے فاصلے پر ہے اور ریل کا اسٹیشن جہاں سے شہر کو گاڑی جاتی ہے چار کوس کے قریب دُور ہے۔ بالوجی اب کالج کے ہوسٹل میں رہا کرتے تھے۔ داخل ہونے کے چند دن بعد وہ کتابوں اور کپڑوں کے لئے خرچ وغیرہ لینے کے لئے گھر آئے۔ رات کی رات ٹھہرنا تھا۔ دیر تک ہمیں کالج اور شہر کی باتیں بتاتے رہے۔ نمبردار نے بھی حال احوال پوچھنے کے لئے بُلایا اور جب اُن کو وہاں گئے دیر ہو گئی تو مامی نے مجھے بُلانے کو بھیجا۔ میں گیا تو وہ ڈیوڑھی میں کھڑے تھے۔ "آ جاتا ہوں۔ ہر وقت میرے پیچھے ہی بھاگتا رہتا ہے"۔ بالوجی نے جانے کیوں مجھے اس طرح جھڑک کر جواب دیا۔ اور پھر میرے ساتھ ہی آ گئے۔ میں نے یونہی مڑ کر دیکھا تو بی بی ڈیوڑھی کے پاس صحن میں لکڑیوں کے ڈھیر کو درست کر رہی تھی۔

صبح بالوجی کو اسٹیشن پر جانا تھا۔ اور ماموں کا گھوڑا تھانیدار صاحب نے منگوا رکھا تھا۔ شاید ڈپٹی کمشنر دورہ پر آیا تھا۔ لال کھتری کی گھوڑی بھی وہیں گئی ہوئی تھی۔ اس لئے ماموں ایک اُونٹنی لے آئے اور مجھ سے کہا تم بالو کے ساتھ جاؤ تاکہ اسٹیشن سے اونٹنی کو واپس لے آؤ۔ ہم دونوں اونٹنی پر بیٹھ گئے۔ جب نمبردار کے کوٹھے کے قریب سے گزرے تو میرے کان میں آواز آئی :۔

" ڈاچی والیا موڑ مہار وے!"

میں نے اُوپر کو دیکھا تو بی بی کھڑی تھی مگر بالوجی نے اوپر کو نہ دیکھا۔ سامنے سے نمبردار آ رہا تھا۔ بالوجی نے اس کو سلام علیکم کہا اور اس کے پوچھے بغیر ذرا بلند آواز سے کہا " اب میں گرمی کی چھٹیوں میں آؤں گا۔ بس ایک مہینے تک چھٹیاں مل جائیں گی"۔ ذرا آگے جا کر بالوجی بار بار پیچھے کی طرف دیکھتے تھے۔

بالوجی کے جانے کے چند روز بعد بی بی کی پھوپھی آئی اور ایک دو دن ٹھہر کر چلی گئی۔ اس کے بعد اس کی شادی کے متعلق بات چیت ہونے لگی۔ نمبردار کی بہن بی بی کا رشتہ مانگنے آئی تھی۔ چند دنوں کے بعد بی بی کی نسبت نمبردار کے بھانجے سے قرار پائی۔ یہ لڑکا ڈاک خانے کا چٹھی رساں ہے اور ان دنوں کہیں دُور ملازمت پر گیا ہوا تھا۔

نمبردار کی بہن ایک دفعہ پھر شادی کی تاریخ مقرر کرنے آئی۔ سب نے خوشی خوشی چاند کی پندرہویں تاریخ مقرر کر دی۔ اس دن سے بی بی مجھے بہت افسردہ خاطر معلوم ہوتی تھی اور دو ایک دفعہ میں نے اس کو روتے بھی دیکھا۔ شادی کی تو ہر ایک کو خوشی ہوتی ہے۔ خدا جانے وہ مغموم سی کیوں رہنے لگی۔ ایک دن اس نے مجھ سے نہایت اُداسی کے لہجے میں پوچھا " جُورے تمہارے بالوجی کو کب چھٹیاں ہوں گی ؟" میں نے کہا " وہ اس اتوار کو آئیں گے۔ ان کا خط کل آیا تھا"۔

اتوار کے دن میں گھوڑا لے کر اسٹیشن پر گیا۔ بالوجی آئے تو میں انہیں پہچان ہی نہ سکا۔ اُنہوں نے پتلون کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر انگریزی ٹوپی تھی۔ ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ اور ایک سوٹ کیس۔ ہم خوشی خوشی گھر کو روانہ ہوئے۔ وُہ بہت خوش نظر آتے تھے۔ جب ہم گلی میں پہنچے تو اُنہوں نے ڈھولک کی آواز سُن کر مجھ سے پوچھا " جُورے ایہاں کس کی شادی ہونے والی ہے ؟" میں نے انہیں بی بی کی نسبت اور شادی کی تیاریوں کی بابت بتایا۔ وہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ ہوں نہ ہاں۔ میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں بشاشت کے بجائے افسردگی سی چھا گئی تھی۔

گھر جا کر وہ معمولی طور پر باتیں کرتے رہے۔ ماموں نے کہا " بیٹا! کتابیں وغیرہ سمجھ میں آتی جاتی ہیں نا ؟"

" ہاں"

" کوئی مشکل تو نہیں ؛ تمہیں وہاں کوئی تکلیف تو نہیں ؛ خرچ ورچ تو نہیں ختم ہو گیا تھا ؛"

"نہیں"

"مگر تم اس طرح چُپ چاپ کیوں ہو؟"

"یونہی سفر وغیرہ کی تکان ہے اور سر میں ہلکا ہلکا درد سا ہو رہا ہے"۔

رات کو نمبردار نے بُلا بھیجا مگر بابوجی نہ گئے اور کہہ دیا کہ میں تھکا ہؤا ہوں۔ صبح کو نمبردار خود آیا" یار تم اچھے ٹھہرے کالج کے پڑھنے والے۔ اب تم "صاحب" بن گئے ہو اور ہمارے واقف ہی نہیں بنتے۔ دیکھو بھائی بی بی کی بارات آج کے دن آئے گی۔ تمہارے ذمّہ بھی بہت سے کام ہیں، آؤ نہ ذرا بیٹھیں"۔

بابوجی دس بجے تک نمبردار کے ہاں بیٹھے رہے۔ واپس آتے وقت بی بی سے بھی صحن میں تھوڑی دیر کے لئے باتیں کرتے رہے۔ گھر سے نکلتے وقت وہ رومال سے آنسو پونچھ رہے تھے اور ظاہر یوں کر رہے تھے جیسے چہرے پر سے گرد صاف کر رہے ہوں۔

یہ ہفتہ بیاہ کی تیاریوں میں گزرا۔ رات کو لڑکیوں کا ڈھولک بجانا مجھے بہت بھلا لگتا اور میں کتنی کتنی رات تک جاگتا رہتا اور لڑکیوں کے گیت سُنتا رہتا۔ پیر کے دن بارات آئی اور منگل کو چلی گئی۔ بابوجی ان دنوں بہت پژمردہ سے پھرتے تھے اور اپنے آپ کو لاکھ خوش ظاہر کرنے کی کوشش کرتے مگر اندرونی غم ظاہر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ کئی دفعہ اُنہوں نے سر کے درد کا بہانہ کیا اور لیٹ رہے اور کئی دفعہ دیر دیر تک چپ چاپ کسی جگہ الگ بیٹھے رہتے۔ برات کے دن اور اس سے پہلے، جیسا کہ شریف لڑکیوں کا دستور ہے، بی بی بہت روتی تھی اور رو رو کر اُس نے اپنی آنکھیں سُرخ کر لی تھیں۔ شادی کے دن اسے بخار ہو گیا، اور بخار ہی کی حالت میں وہ سُسرال پہنچائی گئی۔

بابوجی برات روانہ ہونے کے وقت گھر پر نہیں تھے، کہیں باہر گئے ہوئے تھے، اور گھری شام کے وقت گھر واپس آئے ماموں کے دریافت کرنے پر معلوم ہؤا کہ قصبے میں کسی دوست سے ملنے گئے ہوئے تھے۔

صبح میں یونہی ذرا باہر کھیتوں کی طرف گیا۔ واپس آتے وقت رستے میں مجھے نواب ملا۔ وہ بیلوں کے ساتھ اپنے کنوئیں کی طرف جا رہا تھا۔ کہنے لگا "منظور یار تمہارے بابوجی کیا کل گھر سے لڑ کر آئے تھے؟"

مَیں نے تعجّب سے پُوچھا "کیوں؟"

"وہ شرابیوں کی طرح ہمارے کنوئیں پر پھرتا رہا۔ پہلے تو بڑ کے نیچے لیٹا رہا۔ میں نے سمجھا ٹھنڈی ہوا کا لُطف اُٹھا رہا ہوگا۔ میں پاس گیا تو وہ رو رہا تھا۔ وجہ پوچھی تو بولا، کچھ نہیں، آنکھ میں کوئی چیز گر پڑی تھی۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر پانی کے قریب بیٹھا رہا اور دیر تک مینڈ کے اس قدر قریب بیٹھا رہا کہ ذرا پاؤں پھسلتا تو کنوئیں کے اندر ہوتا اور چلتے کنوئیں میں

ٹنڈوں" سے پانی پینا کتنا خطرناک ہے ۔ دو دفعہ اس نے ایسے پانی پیا اور توبہ! ایک دفعہ تو گاہدی" کے بیلوں کے نیچے ہی آنے لگا تھا ۔ عجیب آدمی ہے ۔ اپنی زندگی کی اسے پروا ہی نہیں ۔ اچھا شہر میں پڑھ رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

نواب نے میرے جواب کا انتظار نہ کیا اور دوڑ کر اپنے بیلوں سے جا ملا ۔

میں ذرا آگے گیا تو بالو جی آرہے تھے ۔ اُنہوں نے خود ہی پوچھا" یہ نواب تم سے کیا کہہ رہا تھا" جب میں نے نواب کی باتیں ایک دو فقروں میں بتائیں تو کہنے لگے گھر جا کر یہ باتیں نہ کرنا ۔

(۵)

میں اسی مہینے اپنے گاؤں چلا آیا ۔ والد صاحب بیمار تھے اور اُنہوں نے مجھے بُلا لیا تھا ۔ ہمارے گاؤں میں بھی اب سکول کھُل چکا تھا ، اس لئے میں یہیں داخل ہو گیا ۔ یہاں میں پھر اپنے قدیم دوستوں سے مِل جُل کر رہنے لگا ۔ ہمارا سکول چھ جماعتوں کا تھا ۔ جب میں نے چھٹی جماعت پاس کر لی تو میں قصبہ کے ہائی سکول میں سپیشل کلاس میں داخل ہو گیا ۔ پھر ساتویں اور آٹھویں جماعت پاس کی ۔ مجھے ہر روز تین ساڑھے تین میل کا سفر کرنا پڑتا تھا ۔ ماموں اب بہت مدت کے بعد آئے ۔ پھر میرا ذکر چھڑا اور ایک دفعہ پھر ماموں مجھے اپنے ساتھ لے گئے ۔ وہ کہتے تھے" ہمارا ہائی سکول تمہارے سکول سے اچھا ہے اور وہ گھر کے نزدیک بھی ہے ۔ سردار بھی اب لاہور رہتا ہے ۔ تمہارے جانے سے رونق ہو گی ۔ نمبردار تمہیں بہت یاد کیا کرتا ہے ۔"

اب میں پھر ماموں کے پاس رہتا ہوں اور ہر روز دو میل کا سفر سکول جانے آنے میں کرتا ہوں ۔ یہاں کی گلیاں ، گھر ، درخت ، کنوئیں سب مجھے آج سے چھ سال قبل کے واقعات یاد دلاتے ہیں ۔ بالو جی نے کالج اُسی سال چھوڑ دیا تھا جب میں یہاں سے گیا تھا ۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ بیکار پھرتے رہے ۔ کہتے ہیں ان دنوں وہ ہر وقت شعر پڑھتے رہتے تھے ۔ ماموں نے اپنی فوجی چٹھیوں اور سفارشوں کی مدد سے بتیری کوشش کی کہ بالو جی کو کہیں سرکاری ملازمت مِل جائے مگر بے سود ۔ حقیقت ہے کہ آج کل سرکاری ملازمت کا ملنا ناممکن سا امر ہے ۔ ایک آدھ سال نوکری کی تلاش میں گزر گیا ۔ پھر کسی نے نیک صلاح دی کہ لڑکے کو تجارت میں لگاؤ ۔ ماموں نے شہر لاہور میں اپنے کسی دوست کی مدد سے ایک دکان کرایہ پر لے دی اور پانصد روپے کی اشیائے خوردنی آٹا ، دال ، نمک وغیرہ دلوا دیں ۔ پہلے پہل تو کام نہیں چلتا تھا اور نقصان ہی ہوتا تھا ۔ بالو جی بھی پورے شوق سے کام نہیں کرتے تھے اور اگر ماموں کے دوست بطور حصہ دار کام کو جاری نہ رکھتے تو بالو جی کب کی دکان کی چیزیں بیچ کر گھر کو آ گئے ہوتے ۔ مگر اب سُنا ہے کہ ان کا کام ترقی کر رہا ہے ۔ اور اپنا خرچ ، دکان کا کرایہ نکال کر بیس پچیس روپے مہینہ کے بچ رہتے ہیں ۔ آج کل کے زمانہ میں غنیمت ہے ۔ آج کل بالو جی کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں اور رشتہ تلاش کیا جا رہا ہے مگر

بابوجی خوش نہیں۔

نمبر دار کی ڈاڑھی کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے ہیں۔ ان کا داماد چٹھی رساں اب لاہور کے کسی ڈاک خانہ میں ہے اور بابوجی جب پچھلی عید پر گھر آئے تھے تو بتاتے تھے کہ اس کا گھر ہمارے گھر کے پاس ہی ہے اور وہ مجھے ملا کرتا ہے۔

گلی کے سب بچے اب بھی نمبر دار کے وسیع صحن میں آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ عمری اور میں تمام بچوں کو کھلاتے ہیں، وہ میری طرف دیکھ کر ہمیشہ مسکرا دیا کرتی ہے اور میں بھی جانے کیوں اسی وقت مسکرا دیتا ہوں۔ اور پھر بڑوں کی نگاہوں سے بچ کر دیر تک اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ میں اِدھر اُدھر گزرتا ہوا نمبر دار کے گھر میں ضرور ایک نظر ڈال لیا کرتا ہوں۔ جانے کیوں مجھے ہر وقت عمری کا خیال لگا رہتا ہے۔

چند روز ہوئے میں دو تین دنوں تک اپنے کام کی وجہ سے بچوں کے کھیلوں کو دیکھ نہ سکا۔ عمری نے مجھے بلایا۔ جب میں گیا تو وہ مسکرا کر آہستہ سے کہنے لگی "آپ تو عید کا چاند ہو گئے!" چاندنی رات تھی اور بچے "دھوپ چھاؤں" کھیل رہے تھے۔

محمد صادق قریشی امداسی
(بی۔ اے)

اظہارِ اُلفت

نہ کیجئے کبھی اظہار اپنی اُلفت کا ہے بہترین محبت وہی جو ہو خاموش
نسیمِ صبح کے مانند چاہیئے اُلفت خرام جس کا نہیں آشنائے جوش و خروش
مگر تھی ضبطِ محبت کی تاب مجھ کو کہاں سُنا دیا اُسے افسانۂ دلِ پُر جوش
یہ سُن کے خوف سے چل دی وہ کانپتے ڈرتے کہ منتظر تھی مری جس کے واسطے آغوش
ابھی نہ گزری تھی اس بات کو بہت مدت کہ پاس اس کے اِک آیا مسافرِ خاموش
جو لے گیا اُسے چپ چاپ ایک آہ کے ساتھ
وہ عمر بھر کے لئے مجھ سے ہو گئی روپوش

(ماخوذ از ولیم بلیک)
ترجمہ بہ تصرف

امین الرحمن

انجام

لو میں بیان کرتا ہوں تفصیلِ آرزو

جب میں جوان تھا مری دُنیا جوان تھی
دل تھا پھنسا ہُوا کسی دامِ نگاہ میں
جب حُسن و عشق پر تھا مرا انحصارِ زیست
ارمان پل رہے تھے کسی جلوہ گاہ میں
ایمان و کفر سے مرا دِل بے نیاز تھا
اور تھا میں سربسجدہ محبّت کی راہ میں
خاکِ درِ حبیب میں تھی اس قدر کشش
ملتی نہ تھی یہ بات کسی بارگاہ میں
تھی مجھ کو آرزو کہ یہ دُنیا بنے بہشت
بس جائے حُسنِ ساقیِ مہوش نگاہ میں

ہونے نہ دی زمانے نے تکمیلِ آرزو

فطرس نقوی احسانی

غزل

بیٹھے تھے اُن کی یاد میں کل بیخبر سے ہم
وہ آئے اور کہا ، پلٹ آئے سفر سے ہم

کیسے چھپائیں دل کی لگی سارے گھر سے ہم
کب تک چرائیں آنکھ تمہاری نظر سے ہم

تذلیلِ شانِ ضبط سہی ، یہ محال ہے
گزریں نہ صبح و شام تری رہگذر سے ہم

کافر نگاہیوں کا سبب حُسنِ دلفریب
اس "مبتدا" کو کیوں نہ سمجھ لیں "خبر" سے ہم

کعبہ کا طوف فرض ، مگر اس کا کیا علاج
کچھ عہد کر چکے ہیں کسی سنگِ در سے ہم

انجامِ اعتمادِ وفا کچھ نہ پُوچھئے
کرتے ہیں مشورہ دلِ نامعتبر سے ہم

چھائی ہے حسرتوں کی گھٹا اُس مقام پر
پیتے تھے جامِ عشق جہاں اُس نظر سے ہم

یارائے ضبطِ دردِ جدائی نہیں رہا
اے حُسن ہوشیار ! نکلتے ہیں گھر سے ہم

اوراق سادہ ہوتے ہیں لمحاتِ عمر شاد
رنگتے ہیں ان کو سُرخیٔ خونِ جگر سے ہم

شاد عارفی

بدصُورتی

اسے میری بدذوقی سمجھئے یا عامیانہ روش سے بچ کر چلنے کی عادت ، بہرصورت یہ ایک حقیقت ہے کہ میں بدصورتی کو ہمیشہ خوبصورتی پر ترجیح دیتا ہوں ، خوبصورت چیزیں دیکھ کر میں ہمیشہ اپنے دل میں یہ سوچتا ہوں کہ خوبصورتی تو ایک عارضی شے ہے ، شفق کی طرح جلد مِٹ جانے والی ، توسِ قزح کی طرح گُم ہو جانے والی ، لیکن وہ چیز جو ہمیشہ قائم رہتی ہے ، وہ جس پر ہمارے حسیات بھروسا کر سکتے ہیں جس کے متعلق کوئی قطعی رائے قایم کی جا سکتی ہے ۔ وہ صرف ایک چیز ہے ، اور وہ ہے بدصُورتی اور اس دُنیا میں تو ہر شے چاہے اُس کی ابتدائی صورت کتنی ہی روشن اور دلپذیر کیوں نہ ہو اپنے انجام کو پہنچ کر بالضرور بدصُورت بن جاتی ہے ، پھُول مُرجھا جاتے ہیں ، عورتیں بوڑھی ہو جاتی ہیں شفق رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو جاتی ہے ـــــ لیکن بدصُورتی ہمیشہ قایم رہتی ہے ، شروع سے لے کر آخر تک ۔ تو پھر کیوں اُن چیزوں کی طرف توجہ دی جائے ، جو عارضی ہیں ، وقتی اور ناپائدار ، اور بشر اپنے دل کو اُن چیزوں کی طرف کیوں نہ مائل کرے جن کی حیثیت ابدی و دوامی ہے ، جو کبھی بدل نہیں سکتیں ، جن کی ہیئت میں کبھی انقلاب نہیں آسکتا ، جو قدرت کے قانون کی طرح اٹل ہیں ۔

بدصورتی کے متعلق میرے خیالات کسی صوفیانہ لغزش کا نتیجہ نہیں ، ان کی اساس خالصتہً فلسفیانہ ہے ، اسے مذہب ، آرٹ اور اس قسم کی دیگر باتوں سے کوئی تعلق نہیں ، خوبصورتی کے متعلق آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک اعتباری اصطلاح ہے جس کے متعلق کبھی کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی ، یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ فلاں چیز حسین ہے ، لیکن کسی بدصُورت چیز کے متعلق ہر وقت اور ہر لمحہ نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بدصورت ہے ۔ اور یہی بدصُورتی کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔ علاوہ ازیں بدصورتی زندگی اور کائنات کا جزوِ لاینفک ہے ، اس کے بغیر خوبصورتی ایک لمحہ نہیں جی سکتی ۔ حُسن کی بنیادیں بدصُورتی پر استوار ہوتی ہیں ، اور اس لحاظ سے بدصُورتی بھی ایک طرح کا حُسن ہی ہے ۔ آئین سٹائین کے اضافی نظریہ سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے ، اور شاید اسی نظریہ کے ماتحت ہمیشہ دُنیا میں سُکھ کے ساتھ دُکھ ، پھُول کے ساتھ کانٹے اور خوبصورت عورتوں کے ساتھ بدصُورت مرد بستے ہیں ۔

رُوحانی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ دُنیا میں اصلی حُسن صرف بدصُورتی میں ہے ۔ مثال کے طور پر آپ دُنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کی صُورتوں کی طرف توجہ کیجئے ، آپ دیکھیں گے کہ صرف بدصورت آدمی ہی دنیا کے "بڑے آدمی" بنتے ہیں ۔ بجائے خوبصورت آدمی تو عام طور پر فوج میں سپاہی بھرتی ہوتے ہیں اور بدصُورت آدمی اُن پر

حکومت کرتے ہیں، دُور کیوں جایئے ہندوستان کے گیارہ صوبوں کی اسمبلیوں کے ممبروں کی صورتیں ملاحظہ کیجئے، سوائے چند مستثنیات کے باقی سب وہ ہیں جنہیں دیکھ کر بے اختیار خدا کی قدرت یاد آتی ہے، میں یہ بات نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ بڑائی صرف بدصُورت آدمیوں کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے، چنانچہ اس بیسویں صدی میں جب مردوں اور عورتوں کو حسین بنانے کے لئے سینکڑوں طریقے برتے جا رہے ہیں، میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں کہ دُنیا کے بڑے بڑے رہنما بڑے بڑے امیر، فوج کے جرنیل، ادیب، فلسفی، سائنسدان بے حد بدصُورت واقع ہوئے ہیں۔

× × × × × × ×

دراصل مجھے بدصورتی سے ایک گونہ عشق سا ہو گیا ہے، لوگ تو خوبصورت عورتوں پر مرتے ہیں، میں بدصورت عورتوں کو دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں۔ اور جب کبھی میرے گھر میں میرے بیاہ کے متعلق کچھ بات چیت شروع ہوتی ہے تو میں کچھ گھبرا سا جاتا ہوں اور اکثر نوجوانوں کی طرح جو ان موقعوں پر "لڑکی کیسی ہے؟ خوبصورت ہے نا؟ رنگ کیسا ہے؟ قد و قامت" اور اس قسم کے سوالوں کا تانتا باندھ دیا کرتے ہیں، میں بھی "اول جلول" بکنے لگ جاتا ہوں، مثلاً

"لڑکی بدصُورت ہے نا؟"

"ہاں"

لیکن محض "ہاں" سے میری تسلی نہیں ہوتی، چنانچہ میں پھر سوال کرتا ہوں

"کیا اُس کی جلد بالکل سیاہ ہے، سیاہ جیسے اماوس کی رات"

"ہاں، ہاں، اطمینان رکھو"

"اور دانت؟"

"میلے اور سُرخ! شاید پان بہت کھاتی ہیں"

"بہت خوب..... اچھا!..... مگر یہ تو بتاؤ کہ اس کی آنکھیں کیسی ہیں؟"

"آنکھیں؟ آنکھیں تو ذرا بڑی بڑی سی ہیں، چہرے پر بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بال بھی تو گھنگر یالے ہیں..."

"چچ..... چ..... چ..." میں ہاتھ ملتے ہوئے کہتا ہوں، "یہ تو بہت بُری بات ہے۔"

اور اس طرح یہ ناطہ ٹوٹ جاتا ہے۔

اسی طرح کئی ناطے آئے، مگر ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص موجود تھا، کسی کا رنگ کھلتا ہوا تھا، تو کسی کی ناک ستواں، کسی کی کمر پتلی تھی، تو کوئی سرو قد، غنچۂ اُمید کھلا پر نہ کھلا۔ اور گو اب میری عمر تیس سے کچھ اُوپر ہے، مگر پھر بھی پُر اُمید

ہوں اور ایک ایسی عورت کی تلاش میں ہوں جو کامل بدصورت ہو . . . . . ایک بار ! . . . منٹو پارک لاہور کی نمائش میں ایک ایسی عورت دیکھی تھی جس کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ "وہ ہے میرے خوابوں کی محبوبہ۔" لیکن افسوس کہ وہ بھی کسی کی بیاہتا نکلی !

× × × × × × × × × ×

بدصورتی کے خلاف اگر کوئی دلیل دی جاسکتی ہے تو وہ ہے شاعروں کی شاعری، شاعر لوگ شعر کہتے ہیں تو صرف حسین چیزوں کی تعریف میں حسین عورتیں حسین پھول حسین وادیاں، بس یہی ان کے موضوع ہیں۔ کیا کبھی کسی شاعر نے مگرمچھ کی شان میں بھی طبع آزمائی کی ؟ کسی بدصورت عورت کو دیکھ کر کبھی کسی شاعر کے شاعرانہ جذبات کو تحریک ہوئی ؟ اگر نہیں تو بس پھر بدصورتی ایک بیکار شے ہے۔" کچھ اس قسم کے دلائل بدصورتی کے خلاف شاعر مزاج لوگوں کی طرف سے دیئے جاتے ہیں، لیکن ان دلایل پر زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ شاعر لوگوں سے تو یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی سطحی اور جذباتی حرکتوں سے بے نیاز ہو کر اس اہم سوال کے حسن و قبح پر غور کرسکیں، اس کے علاوہ وہ تو محض خوبصورتی کے گن گانے کے سبب کما کھاتے ہیں، اگر آج لوگ بدصورتی کی اہمیت کو سمجھ جائیں تو یہی شاعر لوگ جو آج بلبلوں اور گلاب کے پھولوں پر جان چھڑکتے ہیں، کل کوّے اور بھنگ کی کونپلوں پر طبع آزمائی کرنا شروع کردیں، ضرورت یہ ہے کہ پہلے آپ لوگوں کی ذہنیت میں تھوڑی سی تبدیلی واقع ہو لیکن میں اس پر بھی شاعروں کا اعتبار نہیں کروں گا۔ کیونکہ شعر کہنا بذاتِ خود ایک خوبصورتی ہے، اور خوبصورتی کا اعتبار کیا ؛ خود شاعروں نے اپنے لاکھوں شعروں میں حسن کی بیوفائی اور خوبصورتی کی بے ثباتی کا رونا رویا ہے، پھر یہ لوگ کس طرح بدصورتی کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت کرسکتے ہیں۔

× × × × × × ×

خوبصورتی فساد کی جڑ ہے، پتھر اور دھات کے زمانے سے لے کر آج تک خوبصورتی دنیا کے امن کو تباہ و برباد کرتی چلی آئی ہے خوبصورت چیزوں کے حصول کے لئے لوگوں نے اپنی جانیں گنوادیں، تہذیبیں مٹ گئیں، اور قومیں فنا ہو گئیں، لیکن ہم ہیں کہ اسی جنوں خیز وارفتگی سے پرانے راستے پر لڑھکے جارہے ہیں، خوبصورتی، خوبصورتی، خوبصورتی، خوبصورتی، اس دیوانگی کے جوش میں ہم نہیں سوچتے کہ امنِ عالم کیوں خطرہ میں ہے ؛ وہ کیا چیز ہے جو اقوامِ عالم میں اتحاد نہیں ہونے دیتی ؛ لوگ کیوں لڑتے ہیں ؛ . . . . اگر ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں بنائے نزاع محض خوبصورتی ہے، لوگ لڑتے ہیں خوبصورت چیزوں کے لئے، خوبصورت خیالوں کے لئے، خوبصورت عورتوں کے لئے، خوبصورت خطوں کے لئے، خوبصورت ملکوں کے لئے، اگر لوگ آج بدصورتی کی اہمیت کو سمجھ جائیں، تو امن قائم ہوسکتا ہے، گذشتہ دس بارہ ہزار سال کی انسانی زندگی میں خوبصورتی نے ہم پر جو قیامتیں ڈھائی ہیں تاریخ کے اوراق اس پر گواہ ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے، کہ ہم لوگ خوبصورتی کے مضر خواص سے واقف ہو جائیں، اور خوبصورت چیزوں کے لئے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیں۔ یہ فضول باتیں ہیں، آخر ہماری انسانی زندگی کی اساس خوبصورتی پر نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی بدصورت قسم کی باتوں ہی پر ہے۔

کرشن چندر

دسمبر کی ایک رات

وئی سوئی گھاس پر شبنم کا افسردہ لحاف
کھوئے کھوئے دشت پر محزوں دھندلکوں کا غلاف

یکے پھیکے آسماں پر بکھری بکھری بدلیاں
جیسے لاٹھی کے سہارے رینگتے ہیں ناتواں

ر جھکائے اونگھتے ہیں دُور برگد کے درخت
یا معلّق ہیں فضائے تیرہ میں دیووں کے تخت

ست قد پودوں میں ہلکی سرسراہٹ کی صدا
مانگتا ہے خواب میں جیسے کوئی مفلس دُعا

وڑھ کر کُہرے کی چادر سو رہے ہیں کوہسار
جیسے دن بھر کی کمائی کو گنیں سرمایہ دار

ند کا جادُو اندھیرے گاؤں پر چھایا ہُوا
ہر جگہ مغموم۔ ہر نظّارہ گھبرایا ہُوا

و رہے ہیں گرم ایوانوں میں شاہانِ جہاں
ڈھیلے ڈھالے جسم۔ انبارِ حریر و پرنیاں

نے حجروں میں ہیں واعظ پاؤں پھیلائے ہوئے
رٹ رہے ہیں خواب میں الفاظ دُہرائے ہوئے

رم فرغل کو لپیٹے سو گئے ہیں پہرہ دار
میکدوں کی چھاؤں میں لیٹے ہوئے ہیں میگسار

ست ہیں اپنے گھروں میں شاعرانِ ذی وقار
جن کے باطن سرد اور تاریک۔ ظاہر تابدار

پنے آسن پر ہی پنڈت جی کی گردن جھک گئی
بے تحاشا دَوڑتی مالا اچانک رُک گئی

ں مگر بستی میں اک بیوہ ابھی بیدار ہے
درد کی شدّت سے آنکھیں بھینچنا دشوار ہے

ذبح کرتا ہے اُسے دِن رات بے غیرت سماج
غور کر۔ اے وہ کہ تیرے سر پہ ہے مذہب کا تاج

احمد ندیم قاسمی (بی اے)

احسن الکلام

دُنیائے عیش و غم کا مساوی حساب ہے — تصویرِ خواب وہ ہے، یہ تعبیرِ خواب ہے

پوچھو نہ مجھ سے کیوں تری حالت خراب ہے — سوچو! تمہارے پاس ہی اس کا جواب ہے

لطفِ حیات و عیش ہے جب تک شباب ہے — پھر زندگی نہیں ہے وبال و عذاب ہے

برباد ہیں، تباہ ہیں، آشفتہ حال ہیں — تم پر مٹے ہوؤں کی یہ مٹی خراب ہے

دُنیا کے حق میں ایک تری گردشِ نگاہ — اے عشوہ گر محرّکِ صد انقلاب ہے

دل توڑیئے کہ عہدِ وفا کیجیے شکست — ہر کام آپ کے لئے کارِ ثواب ہے

کچھ غم نہیں مجھے تری چشمِ عتاب کا — تو سامنے ہے، ذوقِ نظر کامیاب ہے

مایوس کر رہے ہیں وہ بے عرضِ مدّعا — گویا وہاں سوال سے پہلے جواب ہے

دُنیا ہے اِک نمائشِ خواب آفریں مگر — جو دیکھتے ہیں جاگتے ہیں وہ یہ خواب ہے

تلوار ہو کھچی ہوئی جیسے، اسی طرح — وہ حسن بے پناہ ہے، جو بے حجاب ہے

اللہ رے حُسنِ سادہ کی رنگینیٔ مذاق — گلکاریوں سے تختۂ گلشن، نقاب ہے

غمّاز، رازِ عشق کا ان کے سوا ہے کون — یا چشمِ تر ہے یا دلِ پُر اضطراب ہے

احسن کے دل کو خوب چُنا اپنے واسطے
یہ حُسنِ انتخاب ترا لاجواب ہے

احسن مارہروی

نگارخانۂ چین

موسم گرما کا آغاز

بانس کے درختوں کا سایہ گھنا ہو رہا ہے
پرندوں نے سہ پہر کی فضا کو گیتوں سے بھر دیا ہے
بہار آلوچے کے درختوں سے بے وفائی کر رہی ہے
آدمی تھک چکا ہے، کیونکہ طویل دن ختم نہیں ہوتا

(چو۔شو۔چین) ۹۰۰ء

وہ کہاں ہے؟

مَیں، ندّی کے کنارے
پہاڑ پر چڑھ رہا ہوں —— بالکل تنہا
چاند کی شعاعیں لہروں پر رقصاں ہیں
پچھلے سال بھی میں یہی نظارہ دیکھ رہا تھا
لیکن اس وقت میرے ساتھ
وہ بھی تھی
ہر چیز اُسی طرح موجود ہے
لیکن دل کو جس کی تلاش ہے
وہ یہاں موجود نہیں

(چاؤ۔چیا) ۹۰۰ء

نگاہِ کرم

حسین لڑکیاں برآمدوں میں چہلیں کرتی پھرتی ہیں
ان کے گیتوں کی آوازیں چنگ ورباب کے نغموں سے کھیلتی ہوئی یہاں آرہی ہیں

ذرا ادھر تو آؤ اور بتاؤ کہ جس حسینہ پر آج کسی کی نگاہِ کرم پڑی ہے
اُس کی پلکیں کیا دوسری لڑکیوں سے زیادہ شوخ اور دراز ہیں ؟

(رہسیا ؤنگ) سنہ ۹۰۰ء

سبکدوشی کے بعد

اس مغرور اور صاف دل سابق وزیرِ اعظم کو
کسی سے دشمنی نہیں
اب وہ مغربی جھیل کے کنارے
بانس کے دروازوں والے مکان میں رہتا ہے
اسے اپنی پیشانی سرد کرنے کے لئے
کسی پنکھے کی ضرورت نہیں
کیونکہ جنوبی سرد ہوائیں
اسے چومتی رہتی ہیں
اور اس کی سرکاری ٹوپی
ساحل پر پڑی نہایت سستی سے
مرغابیوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے

(لی - چیا - یُو) سنہ ۹۰۰ - ۸۰۰ء

ایک قسم

اُنھوں نے قسم کھائی کہ ہُنوں[1] کو تباہ کر دینا چاہئے
اگر ضرورت پیش آئی تو ہم سب اپنی جانیں قربان کر دیں گے . . . . . .
اور اب پانچ ہزار سال ان کے لاشوں کو ہڑپ کر چکے ہیں
اُن کی ہڈیاں دریا کے کنارے اِدھر اُدھر
بکھری پڑی ہیں

---

[1] ایک تند خُو قوم

لیکن یہاں سے بہت دُور بسنے والے حسینوں کو
ان کی صُورتیں اب تک صاف دکھائی دیتی ہیں

(چین ۔ تاؤ) (سنہ ۱۰۰۰-۹۰۰ء)

موقع

جام تمہارے ہاتھ میں ہے
گریز پا وقت کو بھاگنے سے روک لو
آخر تم ہی بتاؤ کہ زندگی میں
کتنی مرتبہ چاند سر پر آتا ہے

(نامعلوم)

ایک حقیقت

چاند کی شعاع نے
دریا کے بستر کو منوّر کر رکھا ہے
پانی کی رَو خواہ کس قدر تیز ہو
شعاع کو اپنے ساتھ نہیں بہا لے جا سکتی
بادل ہمارے سر پر اُڑتے جا رہے ہیں
پہاڑ کی چوٹی ان سے کہیں زیادہ اُونچی ہے
لیکن اُنہیں آگے جانے سے نہیں روک سکتی

(الو ۔ چو ۔ چیہ) سنہ ۱۸۰۰ء

مہدی علی خاں

خونِ پاک

ہے نورِ ایزدی کی جھلک خونِ گرم و پاک
انساں کے دل کو رکھتا ہے جو پاک و تابناک
بنتی ہے اس سے غیرتِ خورشید مشتِ خاک
شیطاں کی فوج ہوتی ہے اس تیغ سے ہلاک

پیکارِ زندگی میں یہی تیغ تیز ہے
ہر ضرب جس کی شعلہ فشاں برق ریز ہے

ہے جوئے خونِ پاک کرن آفتاب کی
مستی ہیں اس کی لہریں ہیں موجیں شراب کی
اس میں تڑپ ہے نغمۂ تارِ رباب کی
رنگینیاں اسی سے ہیں بزمِ شباب کی

ظلماتِ غم میں خانۂ دل کا چراغ ہے
اس کی بہارِ حسن سے جی باغ باغ ہے

خوں سے دلوں میں چہرِ تمنا ہے لعل گوں
خوں سے فسوں ہے حسن کا اور عشق کا جنوں
امواجِ خوں سے بجتا ہے ہمت کا ارغنوں
افواجِ خوں کے سامنے افلاک ہیں زبوں

جس کی رگوں میں خوں ہے شرافت اسی کی ہے

دولت اُسی کی اور حکومت اُسی کی ہے

یہ سُرخ سُرخ چیز جسے کہتے ہیں لہُو
عشقِ غیور پاک کی ہے اِس سے آبرُو

سینوں میں اس سے اُٹھتا ہے طوفانِ آرزو
اِس آب سے حمیّت و غیرت ہیں باوضُو

پلتی ہے حُبِّ دین و وطن اس کی گود میں
کھلتا ہے زندگی کا چمن اس کی گود میں

قوموں کی آبرُو ہیں جوانانِ پاکباز
پُر نغمہ سوزِ حق سے ہیں جن کے دلوں کے ساز

جرأت میں جو ہیں جُرّہ و شاہین و شاہباز
جن کی نگہ سے ہوتا ہے آہن کا دل گداز

جو خونِ شعلہ ریز سے مثلِ بہار ہیں
پاکیزگی میں خنجرِ بُرّاں کی دھار ہیں

میری رگوں میں خونِ شجاعت ہے موجزن
میرے لہو میں عشقِ صداقت ہے موجزن

میرے بدن میں شوقِ شہادت ہے موجزن
میرے سخن میں نُورِ محبت ہے موجزن

روشن مرا سخن ہے مرے خونِ پاک سے
نکلا ہے آفتاب دلِ تابناک سے

محمد اکبر منیر

محبوب کی قبر پر

میں خاموش تھی مگر میرا دل، سیماب بر آتش، اپنی ہر تڑپ میں برقِ جہندہ کو دعوتِ مقابلہ دے رہا تھا۔ میں بے حس و حرکت تھی مگر آنکھیں ـــــ وہ آنکھیں جن میں متعدد طوفان سمٹ کر آ گئے تھے، متجسس اور متلاشی نظر آتی تھیں۔

میں کہاں تھی؟ ـــــ اُس مقام پر جہاں میرا خدا لئے جذبات، میرا سرتاج، میرا پیارا شوہر عمیق قبر میں محوِ خواب تھا۔

مَیں نے یاسمن کی بیل کو ہٹایا، اُن تیتریوں کو ہوشیار کیا جو میرے محبوب کی قبر کو بوسہ دے کر میرے جذبۂ رقابت میں تلاطم برپا کر رہی تھیں، مگر خدا جانے کیوں میں نے اُن کو انتہائے شوق میں چوم لیا۔

میں وہاں تنہا نہ تھی، میں اُن کے ساتھ تھی جن کو میں جان سے زیادہ عزیز تھی، جو دُنیا میں میرے وجود کا موجب تھے ـــــ مگر کیا وہ میرے رنج سے باخبر تھے؟ کیا وہ اُن جذبات و احساسات کا اندازہ کر سکتے تھے جن کے نرغے میں اُس وقت میں تھی؟ نہیں! ہرگز نہیں!!

اُس وقت اُن کی شفقتِ پدری میرے دل پر نیز و نشتر کا کام کر رہی تھی۔ اُن کی موجودگی میری مظاہرہ میں آنے والی بیتابیوں کے لئے ایک حجابِ مستقل بن گئی تھی۔ میرا دل اس تودۂ خاک کے نظارہ سے جس میں میرا پیارا ہمیشہ کی نیند سو رہا تھا درد و الم سے پھٹا جا رہا تھا۔

میں خوشی کے ایام اُس کے ساتھ گزار چکی تھی۔ میں اس کے ساتھ گرجا کو گئی، جہاں ہم سلسلۂ ازدواج میں جکڑ دیئے گئے۔

میں اس کے ساتھ دریا کے ساحل پر گلگشت سے لطف اندوز ہونے گئی اور محظوظ ہوئی لیکن ـــــ اب جبکہ وہ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا، ایک دائمی داغ مفارقت دے گیا، میری نظروں سے نہاں ہو گیا، اس کا جسدِ لطیف قبر کی خوراک ہو گیا ـــــ زمانہ یہ برداشت نہیں کرتا اور مجھے اجازت نہیں دیتا کہ اُس کی گور پر چند آنسو بہاؤں۔ اُس کو بوسہ دوں، قبر شق ہو میں سما جاؤں اور اس کی ابدی رفاقت حاصل کر لوں . . . .

"آؤ"

یہ لفظ والدِ ماجد کی زبان سے نکل کر ٹھیک اُس وقت سماعت سوز ہوا جب کہ میں عالمِ خیال میں کھو گئی تھی اور میرا پیارا شوہر اپنے ہاتھ میں ایک گلاب کا پھول لئے ہوئے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ دفعتًہ اُس نے مجھ کو مخاطب کر کے خدا جانے کیا کہا میں سُن نہ سکی، منتظر تھی کہ پھر سُنوں کہ یہ آواز کانوں میں آئی۔

"بس ختم کرو۔ آؤ"

یہ حکم اور پھر رنگین احساسات کے موقع پر ایک تیر بے پناہ تھا جو دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا، ایک بلائے جبر و استبداد تھی جو فضائے مبرم کی طرح مجھ پر نازل ہوئی۔

میں نے اپنے بہتے ہوئے آنسو پونچھے۔ تڑپتے ہوئے دل کو سنبھالا۔ دو گلاب کے پھول جو میرے پاس تھے بسُرعتِ تمام قبر پر چڑھائے۔ ہوا چلی۔ بادِ تُند کے ایک بیرحم جھونکے نے دونوں پھولوں کو میری موجودگی ہی میں برباد کر دیا ـــــ آہ!

(ترجمہ از انگریزی)

عروج بدایونی

محبّت کی نیرنگیاں

(ایک قافیے میں)

غمِ حرماں اُڑا لایا ہے مجھ کو اُس بلندی پر
جہاں سے حُسن کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!

(ذوقی)

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!

(اصغر گونڈوی)

نہ تُو بدلا نہ میں بدلا، مگر یہ کیا قیامت ہے،
کہ اب مجھ سے تری صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!

(حامد علی خاں)

محبّت نے اثر کو اس قدر بے حال کر ڈالا
کہ بیچارے کی اب تو شکل پہچانی نہیں جاتی!

(اثر صہبائی)

ترے جلوے بسے ہیں اسقدر میری نگاہوں میں
کہ اب صُورت کسی کی مجھ سے پہچانی نہیں جاتی!

(حفیظ ہوشیارپوری)

حفیظ ہوشیارپوری

کرشمہ

افرادِ ڈراما

الطاف حسین ــــــــ پرانی طرز کے ایک پنجاہ سالہ بزرگ
حمیدہ خاتون ــــــــ ان کی بیوی عمر ۴۵ سال
لطیف احمد ــــــــ ان کا لڑکا عمر ۲۵ سال
احمد حسین ــــــــ ایک پنشن یافتہ فوجی سپاہی، عمر ۶۰ سال
رفیق احمد ــــــــ لطیف کے کارخانہ کا ایک ملازم
ملازم ــــــــ

زمانۂ حال

پہلا منظر

(انگریزی طرز کے مطابق سجا ہؤا ایک کمرہ۔ حمیدہ خاتون الطاف حسین اور لطیف بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ الطاف حسین ململ کا ایک کرتہ، غرارہ دار پائجامہ پہنے ہوئے ہیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ عینک پیشانی پر لگی ہوئی ہے۔ لطیف ریشمی قمیص اور سفید پتلون پہنے ہوئے ہے۔)

الطاف حسین ۔ (پسینہ پونچھتے ہوئے) اُف کس بلا کی گرمی ہے (کچھ وقفہ کے بعد) احمد حسین اب تک نہیں آئے۔

لطیف ۔ آتے ہوں گے۔ راستہ میں کوئی مل گیا ہوگا، رُک گئے ہوں گے۔ (باہر دستک کی آواز) لیجیے آ گئے۔

(الطاف حسین جا کر دروازہ کھولتے ہیں۔ احمد حسین فوجی لباس پہنے داخل ہوتے ہیں۔ ان کا بایاں ہاتھ مونڈھے کے پاس سے کٹا ہؤا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اُن کے بیٹھنے کے بعد)

حمیدہ خاتون ۔ اتنی گرمی میں، اور یہ لباس۔ تمہیں گرمی نہیں لگتی۔

احمد حسین ۔ یہ بھی کوئی گرمی ہے، جو شخص افریقہ میں رہ چکا ہو، وہ اتنی معمولی گرمی کی پروا نہیں کرتا۔

حمیدہ خاتون ۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔

احمد حسین (لطیف سے) تمہارا کام کیسا چل رہا ہے۔ تم لوگ بھی جادوگروں سے کم نہیں ہو۔ جہاں تم نے کہا "روشنی ہو جائے" ساری دُنیا منوّر ہو گئی۔ بے جان مشین سے کہا "چل" اور وہ چلنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے بھی جادو کا تھوڑا سا تجربہ ہے۔

لطیف۔ وہی آپ کا بنگالی جادو۔ سب فریب۔ دھوکا۔

احمد حسین۔ تم اسے فریب کہتے ہو۔ صاحبزادے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔

لطیف۔ ٹوکری کا تماشا میں نے بھی دیکھا، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کیسے کیا جاتا ہے۔ کوئی زیادہ وقیع بات بیان کیجیے۔

احمد حسین۔ اس کے تماشے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

لطیف۔ (مسکراتا رہتا ہے اور کوئی جواب نہیں دیتا)

احمد حسین۔ تم کو میری باتوں کا یقین نہیں آ رہا ہے۔ ہاں میاں زمانہ ہی ایسا آ لگا ہے کہ لوگ خود اپنے وجود سے انکار کرنے لگے ہیں۔

الطاف حسین۔ احمد حسین اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے، تم آج کل کے نوجوانوں کی ذہنیت سے واقف ہوتے ہوئے بھی ایسی باتوں کا اثر لیتے ہو . . . . خوب یاد آیا۔ تم ایک روز کسی بُت کا ذکر کر رہے تھے، وہ بات تو ادھوری ہی رہ گئی۔

احمد حسین۔ اب اس قصہ کو جانے بھی دیجیے۔ (اپنے آپ سے) جب کبھی مجھے اس کا خیال آتا ہے میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔

الطاف حسین۔ تم نے کہا تھا کہ تم ہر وقت اسے ساتھ رکھتے ہو۔

احمد حسین (جو کچھ سوچ رہے ہیں۔ الطاف حسین کی طرف توجہ کیے بغیر بے خیالی سے) ہاں

حمیدہ خاتون۔ اس بُت میں ایسی کیا خاص بات ہے۔

لطیف۔ کیا وہ اس وقت بھی آپ کے پاس ہے۔

احمد حسین۔ ہاں ہے تو، مگر تم دیکھ کر کیا کرو گے۔ اوّل تو تمہیں یقین نہ آئے گا۔ دُوسرے وہ کوئی ایسی دیکھنے کی چیز بھی نہیں ہے۔ (جیب میں ٹٹولتے ہوئے) ایک معمولی قسم کے بچوں کے کھلونے جیسا بُت ہے۔ (جیب سے ایک بدوضع سیاہ رنگ کا چھوٹا سا بُت نکال کر بتاتے ہوئے) یہ دیکھو۔

الطاف حسین۔ اس میں کیا خاص بات ہے۔

احمد حسین۔ اس میں جادو کا اثر ہے۔

الطاف حسین۔ لاحول ولا قوۃ۔ (بت احمد حسین کو دے دیتا ہے)

احمد حسین۔ (بُت کو ہتیلی پر رکھ کر اسے گھورتے ہوئے اپنے آپ سے) ایک بڈھا فقیر، بڑا ہی مقدس آدمی برسوں ایک ہی حالت میں بیٹھا رہنے والا۔ خدا سے لَو لگائے ہوئے۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ لوگ قسمت کے غلام ہیں، تدبیر تقدیر کو بدل نہیں سکتی۔ اور اگر کوئی اس کی کوشش کرے تو تباہ ہو جائے۔ اس نے اس بُت کو بنا کر اس میں یہ اثر پیدا کیا کہ تین آدمی (تینوں کو باری باری دیکھتے ہوئے) تینوں میں سے ہر ایک تین چیزیں اس بُت سے مانگ سکتے ہیں۔

(سوائے حمیدہ خاتون کے باقی سب کھوکھلی ہنسی ہنستے ہیں)

حمیدہ خاتون۔ شش!

احمد حسین (اور زیادہ سنجیدگی سے) جو کچھ وہ مانگیں گے اُن

کو مل جائے گا مگر بعد میں انہیں اپنے سوال پر افسوس ہوگا۔

الطاف حسین۔ لیکن وہ چیزیں ان کو ملیں گی کیسے؟

احمد حسین۔ یہ اس نے نہیں بتایا۔

الطاف حسین۔ تم نے اس کو نہیں آزمایا؟

احمد حسین۔ (سنجیدگی سے) میں آزما چکا ہوں۔

لطیف۔ کیا تم نے جو کچھ مانگا وہ تم کو مل گیا۔

احمد حسین۔ ہاں۔

الطاف حسین۔ کیا کسی اور نے بھی اسے آزمایا ہے۔

احمد حسین۔ ہاں اس کے پہلے مالک نے بھی تین چیزیں مانگیں (کچھ کھویا سا جاتا ہے) اور آخری چیز جو اس نے مانگی وہ موت تھی۔ (سب کے جسم پر کپکپی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے) اس کے بعد یہ میرے ہاتھ لگا۔

لطیف۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسی تین چیزیں مانگی جائیں جو بغیر مانگے بھی ملیں گی۔

احمد حسین۔ (سر ہلاتے ہوئے) آہ، نادان بچہ۔

الطاف حسین۔ خانصاحب اب تو یہ بت تمہارے لئے بیکار ہے، پھر اسے اپنے پاس کیوں رکھ چھوڑا ہے؟

احمد حسین۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے فروخت کر دوں مگر اب میرا خیال بدل گیا ہے۔

حمیدہ خاتون۔ اگر تم اور تین چیزیں مانگ سکتے تو۔۔۔۔

احمد حسین۔ (بُت کو بدستور ہتھیلی پر رکھے ہوئے) نہ جانے کیا ہوتا، نہ جانے کیا ہوتا (یکایک غصہ سے بُت کو زمین پر پٹکتے ہوئے) نہیں، ہرگز نہیں، کبھی نہیں۔

الطاف حسین۔ (بُت کو زمین سے اٹھاتے ہوئے) یہ تم کیا کر رہے ہو؟

احمد حسین۔ (بُت الطاف حسین سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے) اسے توڑ دو، پھینک دو، جلا دو۔ اس بت کو تباہ کر دو۔

الطاف حسین۔ جلانے یا توڑنے پھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے میں اپنے پاس رکھوں گا۔

احمد حسین۔ ایسی غلطی نہ کرنا۔ تم اس کے اثرات سے واقف نہیں ہو۔ دیکھو میرا کہا مانو، ورنہ پھر اگر کوئی بات ہوئی تو۔۔۔۔۔۔

الطاف حسین۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں بھی دیکھونگا کہ کیا ہوتا ہے۔ کیوں لطیف تمہارا کیا خیال ہے؟

لطیف۔ (ہنستے ہوئے) اگر آپ کی یہی خوشی ہے تو رکھ لیجئے۔ یہ ایک لغو سی چیز ہے۔

الطاف حسین۔ (بُت کو دیکھتے ہوئے) لغو سی چیز، ہاں، حیرت ہے۔۔۔۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ۔۔۔۔

احمد حسین۔ (الطاف حسین کے آخری الفاظ کا غلط مفہوم سمجھتے ہوئے) ذرا سوچو تو کہ تم کیا کر رہے ہو۔۔۔۔ اس کا یہ طریقہ نہیں ہے۔

الطاف حسین۔ پھر کونسا طریقہ ہے؟

احمد حسین۔ دیکھو الطاف میں پھر ایک بار تمہیں متنبہ کرتا ہوں۔ یقین مانو کہ اس میں سراسر نقصان ہے۔ (الطاف حسین کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ سمجھتا

ہے کہ انہیں کوئی پروا نہیں ہے) اس بُت کو اپنے سیدھے
ہاتھ میں لو اور جو کچھ مانگنا ہو زور سے مانگو۔

حمیدہ خاتون ۔ یہ الف لیلہ کے مضمون سے کم نہیں ہے
..... اچھا میرے لئے چار ہاتھ مانگو۔

الطاف حسین ۔ میں چاہتا ہوں کہ ....

احمد حسین ۔ ٹھہرو ۔ اگر تم کو مانگنا ہی ہے تو کوئی ایسی چیز
مانگو جس سے تمہیں نفع بھی ہو ۔ ان بیہودگیوں سے
فائدہ ..... اچھا ۔ اجازت دو ۔ میں اب
رُخصت ہوتا ہوں ۔

(الطاف حسین بُت کو میز پر رکھ دیتے ہیں)

لطیف ۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں ۔ کارخانہ جانا ہے
ایک منٹ ٹھہر جائیے ۔

احمد حسین ۔ نہیں میں نہیں ٹھہر سکتا ۔ میرے حواس ٹھکانے
نہیں ہیں ۔ مجھے تازہ ہوا کی ضرورت ہے (جاتے ہوئے
مُڑ کر) میں پھر ایک بار کہتا ہوں کہ اسے توڑ دو، یا
کہیں دُور پھینک دو ۔

(خدا حافظ کہے بغیر چلے جاتے ہیں ۔ ان کے
جانے کے بعد الطاف حسین بُت کو اُٹھا کر اسے
گھورتے ہوئے)

الطاف حسین ۔ ہم اسے پھینک ہی نہ دیں ۔

لطیف ۔ (ہنستے ہوئے) کیوں؛ اس کے طفیل تو ہم دولتمند
اور خوشحال ہو جائیں گے ..... شہنشاہ ہونے
کی خواہش کیجئے ابا جان ۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے ۔

الطاف حسین ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مانگوں (بُت
کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے) ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مجھے
سب کچھ مل گیا ہے ۔

لطیف ۔ ابا جان، آپ اپنے قرض کے بارے میں ہمیشہ
فکرمند رہا کرتے ہیں ۔ اتنا روپیہ مانگئے کہ قرض ادا
ہو جائے ۔

الطاف حسین ۔ ہاں یہ ٹھیک ہے (بُت کو سیدھے ہاتھ
میں لے کر) میں دس ہزار روپیہ چاہتا ہوں ۔

(الفاظ ادا ہونے نہیں پاتے کہ ان کے مُنہ سے
ایک چیخ نکل جاتی ہے ۔ اور بت ہاتھ سے گر پڑتا ہے)

لطیف ۔
حمیدہ خاتون } کیا ہوا؟

الطاف حسین ۔ (پھٹی ہوئی آنکھوں سے بُت کو دیکھتے
ہوئے) بُت نے حرکت کی ۔ جونہی الفاظ میری زبان
سے نکلے مجھے ایسا معلوم ہوا گویا وہ نکل جانا چاہتا ہے ۔

لطیف ۔ (بُت کو اُٹھاتے ہوئے) یہ کیسے ممکن ہے ابا
جان (ہنستے ہوئے) یہ تو مٹی کی ایک بیجان مورت
ہے (اسے میز پر رکھ کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے)
روپیہ ابھی آیا نہیں، اور میں شرط باندھ سکتا ہوں کہ
کبھی نہ آئے گا ۔

الطاف حسین (مطمئن ہو کر) شکر ہے کہ کوئی نقصان نہیں پہنچا ۔

لطیف ۔ (ہنس کر) اچھا اب میں بھی جاتا ہوں ۔ ابھی
مجھے بہت کام کرنا ہے ۔

حمیدہ ۔ صبح ذرا جلدی آنا۔

لطیف ۔ آٹھ بجے تک آجاؤں گا۔ لیکن میرا انتظار نہ کیجئے گا

(الطاف حسین سے) ابا جان فکر نہ کیجئے۔ شاید منی آرڈر تک

روپیہ آجائے۔

الطاف حسین ۔ (لطیف کو گھورتے ہوئے) مگر لطیف اس میں

حرکت ضرور ہوئی۔

(لطیف ہنستا ہوا چلا جاتا ہے۔ الطاف حسین بُت کو گھورتے

رہتے ہیں۔ یکایک اُن کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے

ان کو کوئی خوفناک چیز دکھائی دیتی ہے۔ ان کے مُنہ سے

چیخ نکل جاتی ہے۔)

حمیدہ خاتون (ان کی طرف متوجہ ہو کر) کیا ہُوا؟

الطاف حسین (ڈر پر قابو پاکر) کچھ نہیں کچھ نہیں ... میں ...

میں .... میں .... مجھے کمرہ میں عجیب و غریب شکلیں

دکھائی دے رہی ہیں۔

حمیدہ خاتون ۔ آؤ اندر چلیں۔

(چلے جاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(وہی کمرہ جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ حمیدہ خاتون اور

الطاف حسین بیٹھے ہیں۔ الطاف حسین اخبار پڑھ رہے ہیں۔

حمیدہ خاتون کچھ سی رہی ہیں۔)

الطاف حسین ۔ کیا اچھی صبح ہے۔

حمیدہ خاتون ۔ ہاں بے حد سُہانی

الطاف حسین ۔ کیا بات ہے لطیف ابھی نہیں آیا۔

حمیدہ خاتون ۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) کوئی کام ہوگا۔ اس

لئے دیر ہوگئی ہوگی (بُت کو میز پر رکھ کر) رات احمد حسین

بھی کیا جھوٹ سچ اُڑا گئے۔

الطاف حسین ۔ اُنہوں نے آج تک کوئی بات سچ بھی کہی ہے

میں سمجھتا ہوں سب بڈھے سپاہی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

حمیدہ خاتون ۔ ایک بیجان مٹی کی مُورت کسی کا سوال کیسے

پُورا کر سکتی ہے۔

الطاف حسین ۔ میں خود بھی تمام رات یہی سوچتا رہا مگر کچھ

سمجھ میں نہ آیا۔

حمیدہ خاتون ۔ کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ ممکن ہے اُنہوں

نے سچ کہا ہو۔

الطاف حسین ۔ ہاں ہو سکتا ہے۔ دُنیا میں آئے دن ایسی

باتیں ہوتی رہتی ہیں جن کو باور نہیں کیا جا سکتا۔

(ملازم داخل ہوتا ہے۔ دونوں اُچھل پڑتے ہیں۔)

ملازم ۔ حضور ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

الطاف حسین ۔ بیگم تم ذرا اندر ہو جاؤ تو میں ان کو یہیں بُلا

لوں (حمیدہ خاتون اندر چلی جاتی ہیں) ان کو بھیج دے

(ملازم جاتا ہے ۔ رفیق احمد داخل ہوتا ہے۔)

رفیق احمد ۔ آداب عرض ہے۔

الطاف حسین تسلیم ۔ آیئے تشریف لایئے .... یہاں

تشریف رکھیئے۔

رفیق احمد۔ شکریہ (کچھ رُکتے ہوئے) میں ایک خاص کام سے حاضر ہوا ہوں۔

الطاف حسین۔ فرمایئے۔ فرمایئے۔

رفیق احمد۔ (رُک رُک کر) میں اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ . . . . کہ لطیف صاحب . . .

الطاف حسین۔ کیا آپ کو لطیف سے کچھ کام ہے۔ تشریف رکھیئے وہ آتا ہی ہوگا۔

رفیق احمد۔ جی نہیں . . . . میں در اصل . . . . مجھے ان سے کام نہیں ہے . . . . مجھے آپ سے . . . . میں انہی کے کارخانے سے آرہا ہوں۔

الطاف حسین۔ وہ خود کیوں نہیں آیا۔ کیا اس نے کوئی پیغام بھیجا ہے ؟

رفیق احمد۔ جی نہیں۔ بلکہ . . . . بلکہ . . . .

الطاف حسین۔ (یہ محسوس کرکے کہ کوئی خاص بات ضرور ہے) کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا ہے ؟

رفیق احمد۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں آپ سے مل کر . . . .

الطاف حسین۔ آپ کوئی بُری خبر تو نہیں لائے ہیں۔

رفیق احمد۔ مجھے افسوس ہے . . . . مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے۔

الطاف حسین۔ کیا لطیف کو کچھ ضرر پہنچا ہے ؟

رفیق احمد۔ بہت سخت

الطاف حسین۔ کیا اس کو کسی قسم کی تکلیف ہے ؟

رفیق احمد۔ جی بالکل نہیں۔

الطاف حسین۔ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ . . . .

رفیق احمد۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ایک واقعہ سُنا رہے تھے۔ جو شاید رات میں یہاں پیش آیا تھا۔ اُنہوں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ اور . . . .

الطاف حسین۔ کیا ہوا اس کے بعد کیا ہوا۔

رفیق احمد۔ وہ مشین پر گر پڑے۔ (اندر سے ایک چیخ کی آواز آتی ہے۔ الطاف حسین اپنا سر جھکا لیتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔) کمپنی نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ اس کی جانب سے اس عظیم ترین سانحہ پر آپ کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کروں۔

الطاف حسین۔ (جن کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے قطعاً عاری ہے، خلا میں دیکھتے ہوئے) عظیم ترین سانحہ، ہاں عظیم ترین سانحہ۔ میرا بچہ . . . . اکلوتا بچہ . . . . میری ضعیفی کا سہارا . . . . عظیم ترین سانحہ۔

رفیق احمد۔ (میز پر ایک لفافہ رکھتے ہوئے) مسٹر لطیف کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کمپنی نے آپ کی خدمت میں دس ہزار روپیہ کی حقیر رقم کا یہ چک پیش کیا ہے۔

(رفیق احمد چلا جاتا ہے۔ الطاف حسین کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ جاتے ہیں۔ پھر وہ ایک اندھے کی طرح ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر بیہوش ہو کر گر پڑتے ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

(وہی کمرہ جو پہلے منظر میں بتایا گیا ہے۔ الطاف حسین صوفے پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ کمرہ میں ہر طرف بے ترتیبی ہے۔ کرسیوں پر گرد جمی ہوئی ہے۔ حمیدہ خاتون کھڑکی کے پاس کھڑی باہر دیکھ رہی ہیں۔)

الطاف حسین۔ (چونک کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے) بیگم بیگم۔

حمیدہ خاتون۔ کیا ہے؟

الطاف حسین۔ تم کہاں ہو؟

حمیدہ خاتون۔ کھڑکی کے پاس۔

الطاف حسین۔ کیا کر رہی ہو؟

حمیدہ خاتون۔ اس سامنے والی سڑک سے آگے بڑھنے کے بعد وہ قبرستان ہے جہاں ہم نے اپنے لال کو سپرد خاک کیا۔

الطاف حسین۔ ہاں، مگر اب اس سے فائدہ بیگم۔ یہاں آجاؤ۔ اس ہوا سے تمہیں نقصان پہنچ جائے گا

حمیدہ خاتون۔ جس جگہ وہ آرام کر رہا ہے، وہاں اس سے زیادہ تند ہوا چل رہی ہے۔

الطاف حسین۔ وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ گیا۔

حمیدہ خاتون۔ ہماری ساری اُمیدیں اپنے ساتھ لیتا گیا۔

الطاف حسین۔ ہماری ساری آرزوؤں کا خون کر گیا۔

حمیدہ خاتون۔ اور ہماری ساری ...... (چیخ کر) ادھر دیکھو (وہ بھاگ کر اُن کے پاس آتی ہیں۔)

الطاف حسین۔ بیگم بیگم۔ کیا معاملہ ہے۔

حمیدہ خاتون۔ (انتہائی بے تابی سے) بُت۔ وہ بُت۔

الطاف حسین۔ (حیران ہو کر) کہاں۔ وہ کہاں ہے۔ اُسے کیا ہوا؟

حمیدہ خاتون۔ تم نے اسے پھینکا تو نہیں۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔

الطاف حسین۔ اُس روز کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔

حمیدہ خاتون۔ اسے تلاش کرو۔

الطاف حسین۔ (اُٹھ کر ادھر اُدھر تلاش کرتے ہیں۔ ایک صوفے کے نیچے سے) یہاں ہے، یہاں ہے۔ مگر تم اسے کیا کرو گی۔

(بُت انہیں دے دیتے ہیں)

حمیدہ خاتون۔ مجھے پہلے سے اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔

الطاف حسین۔ کس کا؟

حمیدہ خاتون۔ باقی دو چیزوں کا۔

الطاف حسین۔ (خوفزدہ ہو کر) کیا؟

حمیدہ خاتون۔ ہم نے اب تک صرف ایک چیز مانگی ہے۔

الطاف حسین۔ کیا وہ کافی نہیں ہے۔

حمیدہ خاتون۔ نہیں۔ ہم ایک چیز اور مانگیں گے (بت ان کی طرف بڑھاتے ہوئے) اسے لو اور کہو

الطاف حسین۔ (اس سے دُور ہٹتے ہوئے) کیا کہوں؟

حمیدہ خاتون۔ کہو کہ ہمارا بچہ زندہ ہو جائے۔

الطاف حسین۔ یا اللہ۔ بیگم تم دیوانی ہو گئی ہو۔

حمیدہ خاتون۔ کہو۔ کہو (انتہائی افسردگی سے) میرا بچہ۔ میرا لال۔
الطاف حسین۔ تمہیں اس کا بالکل احساس نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟
حمیدہ خاتون۔ ہماری پہلی خواہش پوری ہو گئی، دوسری کیوں نہ ہوگی۔
الطاف حسین۔ اسے مرے ہوئے دس دن ہو گئے بیگم، تم اسے کیسے دیکھ سکو گی؟
حمیدہ خاتون۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ جس حالت میں بھی ہو، وہ واپس آجائے۔ یہی کافی ہے۔
الطاف حسین۔ (بُت سے ڈر کر دور ہوتے ہوئے) میں اسے چھونا نہیں چاہتا۔
حمیدہ خاتون (بُت انہیں دیتے ہوئے) لو۔ اور کہو جو کچھ میں نے کہا ہے۔
الطاف حسین۔ (کانپتے ہوئے) بیگم!
حمیدہ خاتون۔ (غصہ سے) کہو!
الطاف حسین۔ (حمیدہ خاتون کے غصہ سے مجبور ہو کر مگر کانپتے ہوئے) میں چاہتا ہوں کہ میرا بچہ زندہ ہو جائے۔
(ایک چیخ کے ساتھ بُت کو گرا دیتے ہیں۔ حمیدہ خاتون کھڑکی کے پاس جاتی ہیں۔)
حمیدہ خاتون۔ (کچھ وقفہ کے بعد ناامیدی سے) کچھ بھی نہیں ہے۔
الطاف حسین۔ شکر ہے خدائے پاک تیرا شکر ہے۔
حمیدہ خاتون۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ ساری سڑک سنسان پڑی ہوئی ہے (کھڑکی کے پاس سے لوٹ آتی ہیں) اب ہماری زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم محض اس کی خاطر زندہ تھے ہمارے گھر کا چراغ گل ہو گیا (کرسی پر گر پڑتی ہیں) ہر لمحہ جو گزرتا ہے ہزاروں سال کا معلوم ہوتا ہے۔
الطاف حسین۔ یہ تو عمر بھر کا رونا ہے بیگم۔ آؤ اندر چلیں، کچھ دیر آرام کر لو۔
حمیدہ خاتون۔ میری قسمت میں اب آرام کہاں۔
(دروازہ پر کھٹ کی ایک ہلکی سی آواز ہوتی ہے)
حمیدہ خاتون۔ (اچھل کر) یہ کیا ہے؟
الطاف حسین۔ ہوا کی وجہ سے دروازہ ہل رہا ہے۔
(دروازہ پر پھر کھٹ کی آواز ہوتی ہے۔ مگر پہلے کی بہ نسبت ذرا زور سے۔ حمیدہ خاتون دروازہ کی طرف جانا چاہتی ہیں)
الطاف حسین (حمیدہ خاتون کو پکڑ کر) ٹھہرو۔ تم کیا کرنے والی ہو۔
حمیدہ خاتون۔ (چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) میرا بچہ، میرا لال، میرا لطیف آگیا۔ مجھے چھوڑ دو۔ جانے دو۔ میں بالکل بھول گئی تھی کہ قبرستان یہاں سے ایک میل پر ہے۔ مجھے چھوڑ دو تاکہ میں دروازہ کھول دوں۔
(کھٹ کھٹ کی آواز بدستور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے جاری رہتی ہے۔ جو ہر بار پہلے سے زیادہ زور سے ہوتی ہے۔)
الطاف حسین۔ (ان کو بدستور پکڑے ہوئے) خدا کے لئے
حمیدہ خاتون (چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) مجھے جانے دو۔

الطاف حسین۔ دروازہ نہ کھولو۔ (انہیں کھینچ کر دوسری طرف لے جاتے ہیں۔)

حمیدہ خاتون۔ مجھے جانے دو۔

الطاف حسین۔ ذرا سوچو کہ تمہیں وہاں کیا دکھائی دیگا۔

حمیدہ خاتون۔ (چھڑاتے ہوئے) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اپنے بچہ سے ڈر جاؤں گی (دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے) میں آرہی ہوں میرے لال میں آرہی ہوں۔

الطاف حسین۔ ایسا نہ کرو۔

(حمیدہ خاتون ان کی باتوں کی پروا نہ کرکے دروازہ کے قریب جاکر اسے کھولنے کی کوشش کرتی ہیں۔)

الطاف حسین۔ (یکایک) بُت۔ وہ بُت کہاں گیا (گھٹنوں کے بل جھک کر ڈھونڈتے ہیں)

حمیدہ خاتون۔ زنجیر بہت سخت ہے۔ میں اسے نہیں کھول سکتی۔ آؤ میری مدد کرو۔

(کھٹ کھٹ کی آواز بدستور آرہی ہے اور بہت زیادہ زور سے۔)

الطاف حسین۔ (ٹٹولتے ہوئے) بُت۔ بُت۔ ابھی ایک چیز اور باقی ہے۔

حمیدہ خاتون۔ کیا تم سنتے نہیں۔ تمہارا بچہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

الطاف حسین۔ لاحول ولا قوۃ۔ نہ جانے کدھر چلا گیا۔

حمیدہ خاتون۔ آؤ، آؤ۔ کیا تم اپنے بچے کو اپنے گھر میں نہ آنے دو گے؟

(آواز میں شدت پیدا ہوگئی ہے۔ ایسا معلوم ہورہا ہے جیسے کوئی اپنے جسم سے دروازہ دھکیل رہا ہے)

حمیدہ خاتون۔ میرے بچے۔ میرے لال ٹھیرو۔ میں دروازہ کھولنے کی کوشش کررہی ہوں۔ بس ایک منٹ اور۔

الطاف حسین۔ استغفراللہ۔ استغفراللہ (بُت مل جاتا ہے وہ ایک گہری سانس لیتے ہیں۔ اس کے بعد کھڑے ہوکر بُت کو سیدھے ہاتھ میں لئے ہوئے) میں چاہتا ہوں کہ وہ مر جائے۔ مر جائے اور جنت کی لذتوں سے لطف اندوز ہو۔

(آواز بند ہوجاتی ہے۔ دروازہ کھل جاتا ہے۔ چاندنی دروازہ میں سے اندر آتی ہے۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر سکوت۔ حمیدہ خاتون بیہوش ہوکر گر پڑتی ہیں الطاف حسین دونوں گھٹنوں پر جھک کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیتے ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

محمد یحییٰ صدیقی

کیلاش کنول

تراجم از پیامِ مشرق ـــــ حسبِ اجازت علامہ اقبال

(حقوق محفوظ)

(۳۱) ـــــ ترجمہ

ز مرغانِ چمن نا آشنایم	سنگ چمن والوں کے نہ جاؤں
بشاخِ آشیاں تنہا سرایم	کُنج[1] میں بیٹھ اکیلا گاؤں
اگر نازک دِلی از من کراں گیر	مَن ہے تراشکمار[2] تو ہٹ جا
کہ خونم می تراود از نوایم	اپنا لہُو بھی سُروں میں ملاؤں

(۳۲) ـــــ ترجمہ

جہاں یارب چہ خوش ہنگامہ دارد	خُوب یہ بکھڑ داتا[3] جگ میں
ہمہ را مستِ یک پیمانہ کردی	مست ہیں ایک ہی چُلّو سے سب
نگہ را با نگہ آمیز دادی	آنکھ تو آنکھ سے مل جاتی ہے
دل از دل جاں ز جاں بیگانہ کردی	جیان کو جان سے میل نہ مطلب

لہ ہندی میں کُنج درختوں یا اُن کی پتیوں کی کُپھا کو کہتے ہیں۔ فارسی میں کُنج کونے کو کہتے ہیں۔ ؎۲ سُکمار ۔۔۔ نازک۔ ؎۳ داتا معنی خدا

(۲۳) — (ترجمہ)

سکندر با خضرِ خوش نکتہ گفت	خضرؔ سے بولے بچنؔ یہ سکندر
شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو	آندھی بھنور سے جگت کے بھڑ و تم
تو این جنگ از کنار عرصہ بینی	دیکھتے کیا ہو الگ سے لڑائی
بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو	جان دو رن میں تو انتؔ جیو تم

لہ خضر یا خِضر یہاں دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔ بحر میں کافی لوچ ہے۔ خضر علیہ السلام ایک پیغمبر (یعنی اوتار) ہیں جو مخلوقِ خدا کی رہبری کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خدا نے اُن کو زندگانی جاوید بخشی ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ خضرؑ سکندر کو چشمۂ آبِ حیات تک لے گئے لیکن سکندر کو جب معلوم ہوا کہ اس آبِ حیات کی تاثیر سے آدمی زندہ تو رہتا ہے مگر کچھ کر نہیں سکتا۔ تو اُنھوں نے پینے سے انکار کر دیا۔ اس آبِ حیات یا امرت جل کی تمثیل کے لئے انگریزی زبان میں ٹینسن کی نظم [illegible] خوب ہے۔ مختصر یہ کہ خضر علیہ السلام دُنیا کے معاملات میں دُور ہی سے چھپ چھپ کے حصّہ لیتے ہیں، علائقِ دُنیا سے علی الاعلان کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ یہاں سکندر نے اسی بات کا شکوہ کیا ہے۔

ے بچن معنی بات۔ سے انت معنی ہمیشہ۔

(۲۲) — (ترجمہ)

مسلماناں مرا حرفے است در دل	دل میں مرے اک بات ہے مُسلم
کہ روشن تر ز جانِ جبرئیل است	جس پہ مٹے جبریل کا جیون
نہانش دارم از آذر نہاداں	مورتی گھڑنے کی لت ہے جن کو
کہ ایں سرّے ز اسرارِ خلیل است	اُن سے چھپاؤں وہ پریم کا درپنؔ

عہ درپن معنی آئینہ۔

مقبول احمد پوری

ایک عید کے دن

(۱)

ان دونوں مولویوں نے تمام شہر میں دین کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ جب امامی نعل بند اور شیخ میرن پنجابے تک کے ہاں وعظ ایک طرف اور میلاد شریف وختمِ خواجگان دوسری طرف ہونے لگیں تو بھلا کس منصف مزاج کو اپنے دل میں فیصلہ کرنے سے انکار ہو سکتا تھا کہ ہر دو مولوی صاحبان غضب کے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، اور ان کے پرتوفیض سے سارا شہر دیندار، متقی اور خدا پرست بن گیا ہے!

البتہ جس طرح دو ملاؤں میں مرغی مُردار ہو جاتی ہے، اسی طرح دو مولویوں کے درمیان شہر کی اسلامی آبادی کا مرار ہو جانا ازبس لازمی امر تھا۔ کیونکہ یہ کوئی ایسی بات تو نہ تھی کہ کسی کے روکے رُک جاتی۔ آخر بریلی اور امرتسر میں جو زبردست فاصلہ ہے، وہ کس طرح نہ برقرار رہتا؛ چاہے ایک شہر، ایک آبادی، ایک میونسپلٹی کے حدود ہی میں کیوں نہ بود و باش رکھی جائے، لیکن عقائدِ صحیحہ اور سنتِ مطہرہ کا اتباع تو اس فاصلے کو نہیں بدل سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی جو مولانا ابوالخیر امرتسری، اور جناب بلبلِ ہند عاشق حسین بریلوی دامت برکاتہم کے طور طریق تعلیم وتلقین، عقائد ومسلک میں امرتسر اور بریلی کا فاصلہ ہر حال میں بحال رہتا تھا۔

وہ جو مائی جی کی مسجد میں نماز پڑھنے والے تھے، انہیں اور مولانا ابوالبرکات کو بھی انہیں کے ساتھ، وہابی پارٹی کہلانے کا اعزاز حاصل ہوا تھا، اور سید نور والی مسجد کے نمازیوں کو مع مولانا عاشق حسن، مقلد پارٹی، اور اگر خدانخواستہ جوش زیادہ آجائے تو بدعتی پارٹی کہہ دیا جاتا تھا۔

اس سے تو کوئی سروکار نہیں کہ وعظ کے اختتام پر یا محفلِ میلاد کے بعد، کون زیادہ چائے اور شربت پلاتا تھا، بریانی کون زیادہ کھلاتا تھا، شیرینی تبرک کہاں زیادہ تقسیم ہوتی تھی، البتہ شرک، کفر، اور بدعت کے طلائی ونقرئی تمغے اپنے مخالفین کو عطا کرنے میں نہ بریلوی پیچھے رہتے تھے اور نہ امرتسری ہارتے تھے۔

شہر کے ہر اس گلی کوچے میں جہاں دس پانچ گھر ایسے ہوں جن کی چار دیواری بوسیدہ ٹیلوں سے تعبیر ہو، جہاں دروازے پر میلے، پھٹے اور پرانے ٹاٹ کا ایک پردہ لٹک رہا ہو، بدبودار کالا مٹیالا پانی صحن خانہ سے نکل کر بہ کر گلی میں اکٹھا ہو گیا ہو، اور سامنے دس پانچ مرغیاں، کوڑے کرکٹ کے ناقابلِ نظارہ انبار میں سے اپنا رزق کرید رہی ہوں، وہ مقام ضرور ان دونوں میں سے کسی ایک جماعت کا مورچہ ہوتا تھا، جہاں سے غنیم پر گولہ باری ہو سکتی تھی۔ اگر مورچہ بندی نہ کی جاتی تو حریف بازی نہ لے جاتا؛ یہی وجہ تھی جو گندہ نالہ ہو یا جولاہے محلہ، جسونت رائے کی ٹکری ہو، یا قصاب پورہ، ہر جگہ کسی کے وعظ اور کسی کی میلاد کے جلسے منعقد ہوا کرتے تھے۔ اور اگر کہیں

کسی وقت موقع نہ ملے تو پھر مائی جی اور سید نور کی مسجدیں تو موجود تھیں۔ مغرب کی نماز کے بعد دعا ختم بھی نہ ہونے پاتی کہ مولانا بریلوی کے کوئی لفٹننٹ بلند آواز سے اعلان کر دیتے تھے کہ بھائیو آج بعد نماز عشاء حضرت کا وعظ ہوگا، سب صاحبان تشریف لائیں، بعینہٖ اسی طرح مولانا امرتسری کے کوئی کرنیل اپنے مولانا کے وعظ کی منادی کر دیتے تھے۔ ان مواعظِ حسنہ کا اتنا اثر ہو گیا تھا کہ شہر کے جملہ مسلمان بلکہ ان کے اسکول جانے والے لڑکے بھی، یا تو کٹر وہابی ہو گئے تھے، یا مسلمہ حنفی۔

وہابی گروہ بلالحاظ اس کے کہ امام نے فاتحہ کتنی دھیمی قرأت میں ختم کی ہے، باہمہ گر اتنی بلند آواز سے آمین کہتا اور اس میں اصوات کی اتنی کھینچ تان کرتا کہ یہی معلوم ہوتا کہ گویا اسلام زندہ ہو گیا ہو اور جبکہ مقلد پارٹی سورۂ فاتحہ ختم کر لینے کے بعد گم سم ہو جاتی گویا اس پر آمین کہنا خواہ آہستہ ہی کیوں نہ ہو مطلق فرض نہیں ہے۔ اسی طرح وہابی مارے جوش کے اپنی نمازیں سینے سے بھی اوپر، شاید نرخرے کے نیچے ہاتھ باندھنے لگے تھے، اور مقلد حضرات ان کے برعکس شاید ضد میں آکر ناف سے بھی نیچے ہاتھ باندھنے لگ جاتے تھے! وہابی رکوع کے بعد ربنا لک الحمد پڑھنے کے لئے اتنی دیر تک قیام کرتے کہ کلکتہ کا اسٹنڈرڈ ٹایم بھی مات جبکہ مقلد رکوع کے بعد کھڑے بھی نہ ہونے پاتے اور منہ کے بل سجدے میں چلے جاتے تھے۔

اگر کہیں حسنِ اتفاق سے محفل میلاد میں دونوں جماعتوں کا ایسا اجتماع ہو گیا جیسے ہندوؤں کا بھرت ملاپ ہوتا ہے تو مقامِ ولادتِ باسعادت کے وقت جب میلاد خواں "یا نبی سلام علیک" ایک خاص لے سے پڑھ کر تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور مقلد حضرات بھی اُٹھ کھڑے ہوتے، اس وقت وہابی کھڑے بھی ہوتے تو بیٹھ جایا کرتے تھے!

رمضان کا مہینہ شروع ہوتے ہی یہ جہاد ترقی کر جاتا تھا، ایک صحیح بخاری سے تراویح کی صرف آٹھ رکعت ثابت کرتے رہتے دوسرے فقہ اور احادیث سے بیس رکعت کا جواز ثابت کرنے لگتے تھے، اس کے ساتھ یہ بھی ہوتا کہ اگر کہیں بیس رکعت ہو رہی ہوں تو امرتسری معتقد آٹھ رکعت پڑھ کر بیٹھ جاتا، بیکار بیٹھا رہتا، لیکن آٹھ رکعت کے بعد نویں ہرگز نہ پڑھتا تھا، جبکہ بریلوی کو تسلیم ہی نہ تھا کہ رسول اللہ نے کبھی آٹھ رکعت بھی ادا فرمائی ہوں گی،

نماز کے اوقات کی بھی یہی کیفیت تھی، ایک فرقہ نماز فجر اس وقت ادا کرتا جب ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا، تو دوسرا فرقہ اذانِ فجر اس وقت دیتا جب روشنی بخوبی پھیل جاتی۔

اختلافات کی انتہا یہ تھی کہ حکام کو ہر وقت یہ دہشت رہتی تھی کہ خدا نہ کرے کہیں فساد برپا ہو جائے، اس لئے بارہا دونوں مولویوں کے مچلکے اور ضمانتیں بھی لی جا چکی تھیں، لیکن اعلائے کلمۃ الحق سے وہ بھلا کس طرح باز آ سکتے تھے۔ چنانچہ فضلو ہوٹل والا ان لوگوں کو چائے تک نہ پلاتا جو امرتسری عقیدے کے ہوں، اور کرم علی نانبائی بریلویوں کا آٹا چھونا بھی گناہ سمجھتا تھا! اسی طرح شکور خلیفہ اور وفاتی ٹیلر ماسٹر علی الترتیب نہ ان لوگوں کی حجامت بناتے اور نہ کپڑے سیتے تھے جو ان کے حضرت مولانا کو اچھا نہ سمجھتے ہوں

دونوں جگہ دو اخبار بھی آتے تھے جو اعتقاد کی فرقہ وارانہ آگ کو بھڑکانے میں پنکھے کا کام دیتے تھے۔
اسی طرح سینکڑوں سینکڑوں راتیں گزرتی چلی جا رہی تھیں، اور جماعت بندی بھی انہیں کے ساتھ روزافزوں ہو رہی تھی۔

(۲)

احمد حسن صاحب سٹی مجسٹریٹ کو تبدیل ہو کر آئے ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ عید الفطر قریب آگئی۔ ماہِ صیام میں اکثر جگہ ہر دو مولوی صاحبان نے سٹی مجسٹریٹ کو اپنے شاہکار سنائے تھے اور پھر باری باری سے دلجوئی کے لئے نہیں بلکہ محض ملاقات کی غرض سے ان کے بنگلے پر بھی حاضری دی تھی اور پھر باوجود داخل جماعت کے استفسارات کے دونوں مولوی یہ نہ بتا سکے کہ "الحمدللہ صاحب بہادر ہمارے ہم عقیدہ ہیں یا نہیں ہیں"

ایک دن صبح ڈپٹی کمشنر کا لال پٹے والا چپراسی سائیکل پر سوار ہو کر آیا اور عرض کی کہ حضور کو صاحب بہادر نے ابھی بلایا ہے سٹی مجسٹریٹ تھوڑی دیر میں ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچے۔ دیکھا مسٹر دامودر راؤ ڈپٹی کمشنر اور مسٹر دوار کا ناتھ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور بینی مادھو صاحب سرکل انسپکٹر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی جا کر بیٹھ گئے۔

ڈپٹی کمشنر نے ان سے خطاب کیا "کیوں جناب، آپ کو علم ہے کہ یہاں جو دو مولوی ہیں ان کے سبب امنِ عامہ میں خلل پڑ رہا ہے، چنانچہ سخت اندیشہ ہے کہ عید کے دن آپس میں کشت و خون ہو جائے گا"

سٹی مجسٹریٹ نے پوچھا "کشت و خون کیوں ہوگا؟"

ڈپٹی کمشنر نے کہا "اس لئے کہ اب کی مرتبہ ایک ہی عید گاہ میں دونوں فریق نماز کو آنے والے ہیں اور وہ اپنے اپنے مولوی کو نماز پڑھانے کے لئے آگے کریں گے اور پھر نتیجہ جو کچھ ہوگا وہ اظہر من الشمس ہے!"

سٹی مجسٹریٹ نے کہا "پھر کیا آپ نماز روکنا چاہتے ہیں؟"

ڈپٹی کمشنر نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی صورت دیکھی اور خاموشی اختیار کی،

ڈی، ایس، پی نے کہا "احمد حسن صاحب، ہم لوگوں کا منشا وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں، بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ وقت بے وقت کیلئے مسلح پولیس کا ایک دستہ وہاں تعینات کر دیا جائے اور پھر آپ بحیثیت مجسٹریٹ وہاں موجود ہی ہوں گے......!

سٹی مجسٹریٹ نے کہا "جناب راؤ صاحب، اور جناب لالہ صاحب، آپ کی دُور اندیشی قابلِ داد ہے، لیکن باور فرمائیے کہ یہ محض افواہ ہے، وہاں کوئی ہنگامہ، کوئی فساد، کوئی کشت و خون ہرگز نہ ہوگا"

ڈپٹی کمشنر نے چیں بجبیں ہو کر کہا "خیر میں بحیثیتِ حاکمِ ضلع اس پر خود غور کر لوں گا۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں"

"بہتر ہے۔ آداب" کہہ کر احمد حسن صاحب واپس آگئے۔

وہ اثنائے راہ میں غور کرتے رہے کہ لالہ جی، اور راؤ صاحب کو، ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ ڈپٹی کمشنر ہونے کا بالکل پہلا موقع ملا ہے لہٰذا وہ حفظِ ماتقدم سے کام لینا چاہتے ہیں۔

(۳)

ہندؤوں تک میں یہی چرچا تھا کہ آج عیدگاہ میں جو نہ ہو جائے کم ہے۔ مولانا ابوالبرکات کی جماعت کہتی تھی کہ ہم ہمیشہ سے پڑھتے چلے آئے ہیں لہٰذا عیدگاہ میں پہلے نماز ہم ہی پڑھیں گے۔ مقلدین کی جماعت مصر تھی کہ جب تک ہمارے حضور شہر میں رونق افروز نہیں ہوئے ہم نے وہابی مولوی کے پیچھے خوب نمازیں پڑھیں، اب ہرگز نہیں پڑھ سکتے، نہ گزشتہ سال کی طرح الگ میدان میں نماز ادا کریں گے، بلکہ عیدگاہ ہی میں پڑھیں گے، کیونکہ عیدگاہ پر ہمارا بھی حق ہے۔ پس پہلے ہمارے حضور نماز پڑھا لیں، اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے کو جس کا جی نہ چاہے، وہ بعد میں نماز پڑھ لے۔

"فساد کا اندیشہ" اپنی اپنی درخواستوں میں بھی ڈپٹی کمشنر پر ظاہر کر دیا گیا تھا۔ کپڑے کے ہندو تاجروں نے بھی اپنے گاہکوں سے جو معلومات حاصل کئے تھے وہ سب بینی مادھو سرکل انسپکٹر نے حکام بالا کو اس لئے گوش گزار کر دیئے تھے کہ آیا بینی مادھو کو سارے شہر کا اندیشہ نہیں تھا؛ شاید بہت سے اللہ والے اپنی ماؤں سے دودھ، اور اپنی بیویوں سے تہہ بخشوا کر نماز کو گئے ہوں، شاید اکثر نے اپنی آستینوں میں چھریاں، جیبوں میں چاقو اور کمروں میں خنجر بھی پوشیدہ رکھ چھوڑے ہوں، کسی کو نہیں معلوم، البتہ بینی مادھو کو بخوبی معلوم تھا، اسی لئے بیراسن اور گوکل، اور دھنی رام اور اہر دادین لوہاروں کو سرکل انسپکٹر صاحب بار بار تھانے میں بلوا کر رپورٹ اُگلوایا کرتے تھے کہ ان کی سان پر کتنے مسلمانوں نے ہتھیار تیز کرائے ہیں۔

اکثر بیچارے محتاط اپنے بچوں کو عیدگاہ لے جانا قرینِ دانشمندی نہ سمجھ کر گھر ہی چھوڑ گئے تھے۔

تاکہ عیدگاہ کی پوری حد پر اپنا ہی قبضہ رہے اس لئے منشی جمال الدین حنفی چشتی، قادری جو سٹی مجسٹریٹ کی روبکاری میں مثل خواں تھے، اپنے عدالتی اور قانونی تجربے کام لے کر یہ فیصلہ صادر فرما چکے تھے کہ چار ہی بجے رات سے جانمازیں اور اگر وہ نہ ہوں تو فرش اتنی افراط سے بچھا دیا جائے کہ ایک چپہ بھی خالی نہ رہنے پائے۔ چنانچہ راتوں رات ایسا کر دیا گیا۔

جب ساڑھے سات بجے صبح غیر مقلد پارٹی تکبیریں کہتے ہوئے آئی تو یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اول ہی سے فرش بچھا کر قبضۂ مخالفانہ کر لیا گیا ہے۔ چند منٹ کی سرگوشیوں کے بعد اپنا لایا ہوا فرش ایک طرف رکھ کر پوری جماعت ایک سمت بیٹھ گئی۔

جماعتوں کی ترتیب کا وہ جنگی اصولِ مطلق فراموش نہیں کیا گیا تھا جسے میمنہ و میسرہ سے نامزد کیا جاتا ہے۔ دائیں جانب اول ہی سے جملہ حضراتِ احناف فروکش تھے۔ اس لئے بائیں طرف غیر مقلدین یا وہابی رونق افروز ہو گئے۔ ان دونوں جماعتوں کے بیچ میں تین فٹ کی اعتقادی حدِ فاصل حائل تھی، جو ایک خلا کی صورت میں منبر و محراب سے لے کر جوتے اُتارنے تک کی سیڑھیوں

کے نیچے تک چلی گئی تھی چنانچہ وہابی اور حنفی جوتے بھی ایک دوسرے سے تین فٹ الگ تھے!

دونوں مولویوں نے تو ایک دوسرے کو صرف ایک دو مرتبہ ہی کن انکھیوں سے دیکھا ہوگا مگر ان کے پیرو اپنے مخالفین کو اس بری طرح ٹکٹکی باندھ باندھ کر گھور رہے تھے کہ اگر آنکھوں میں پھاڑ کھانے کی قوت ہوتی تو پناہ نہ ملتی۔ قصداً دیکھ کر "اخ تھو" کہہ دینا اور "لاحول ولا قوۃ" کے آوازے کسنا تو روزمرہ میں داخل تھا۔ لہٰذا اس کا تذکرہ عبث ہوگا۔

اتنے میں احمد حسن صاحب سٹی مجسٹریٹ مع اپنے تینوں بچوں اور ایک بچی کے تشریف لائے، صحن میں پہنچتے ہی چاروں طرف ایک نگاہ غلط انداز پھینکی اور پھر "اے حضور ادھر تشریف لائیے"۔ "حضور یہ رہی جگہ آئیے نا" دونوں جانب سے سن کر کہنے لگے — "آپ لوگ تکلیف نہ کیجیے۔ مجھے جہاں جگہ ملے گی بیٹھ جاؤں گا" —— پھر پہلی صف میں پہنچ کر حریفوں کے درمیانی خلا کو برقرار نہ رہنے دیا اور بچوں سمیت بیٹھ گئے۔

نظریں انہیں کی طرف تھیں اور وہ تھے کہ آنکھیں بند، لب بند، دست بستہ دوزانو بیٹھے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

دفعتہً سب کی نگاہیں سڑک کی طرف اٹھ گئیں، کیونکہ تیس پولیس کے سپاہیوں کی گارد بندوقیں کاندھوں پر رکھے ہوئے لالہ گنگارام ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس، اور بینی مادھو سرکل انسپکٹر، اپنے پورے یونی فارم میں ملبس "لیفٹ رائٹ" "لیفٹ رائٹ" کرتے ہوئے عیدگاہ کے بالمقابل پہنچے، پچاس قدم کے فاصلے پر پہنچ کر لالہ گنگارام کے حکم سے بندوقیں لئے ہوئے لوٹ کر، ایک صف میں پرا باندھے کھڑے ہوگئے اور پھر زمین پر بندوقوں کے کندے ٹیک کر کھڑے ہوگئے۔

دیکھتے ہی احمد حسن صاحب سٹی مجسٹریٹ کی صورت سرخ ہوگئی۔ کنپٹیوں کی رگیں ابھر آئیں۔ پھر وہ کانپنے لگے۔ شاید انہیں بہت جوش آگیا تھا: وہ یکدم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کی مطلق پروا نہیں کی کہ میں اکیلے موزے پہنے ہوئے ہوں، اور صحن سے باہر آنے سے باریک کانٹے چبھیں گے۔ کمال عجلت سے عیدگاہ سے باہر آکر، ہاتھ کا اشارہ کرکے بڑے زور سے کہا —— ریڈی ——

چنانچہ مجسٹریٹ کا حکم سنتے ہی پولیس کے سپاہیوں نے اپنی بندوقیں اٹھا کر کاندھوں پر رکھ لیں۔

پھر سٹی مجسٹریٹ نے کہا —— رائٹ اباؤٹ ٹرن —— چنانچہ تمام سپاہی لوٹ کر ایک کے پیچھے ایک کھڑے ہوگئے۔

اس کے بعد جب احمد حسن صاحب نے بڑے جوش سے گرج کر کہا —— "کوئک مارچ"! تو تمام گارد لالہ گنگارام اور بینی مادھو کی زیر کمان اسی عجلت و سرگرمی سے اسی سمت روانہ ہوگئی جدھر سے آئی تھی۔ بہت دیر تک پولیس کی گارد کے بوٹوں کی ایک ساتھ نکلنے والی آواز سنائی دیتی رہی۔

جس وقت احمد حسن صاحب عیدگاہ میں واپس لوٹے ہیں تو دیکھا گیا کہ ان کے رخسار پر آنسوؤں کے چند قطرے آکر جم گئے تھے اور وہ اپنے آپ کہہ رہے تھے —— "مسلمانوں کا خون اتنا سستا سمجھ لیا ہے! ——" اس کے بعد وہ کھڑے ہوکر

بھرائی ہوئی آواز میں پکار اُٹھے "صفیں سیدھی کرو" پھر کہا "چلیے مولانا ابوالبرکات صاحب نماز پڑھایئے"

مولانا نے جوش کے ساتھ اُٹھ کر کہا "جی نہیں مولانا عاشق حسین صاحب پڑھائیں!"

یہ کہنے کی دیر تھی کہ مولانا عاشق حسن ایک چیخ مار کر رونے لگے۔ پھر آگے بڑھ کر ابوالبرکات صاحب کا ہاتھ تھام لیا، پھر رو کر، چلا کر، التجا کی کہ نہیں آپ ہی پڑھایئے، آپ بزرگ ہیں، میرے بزرگ ہیں" پھر سسکیاں بھرنے لگے۔

عجیب سماں تھا۔ دونوں مولوی ایک دوسرے سے لپٹ کر زار و قطار رو رہے تھے اور حاضرین بھی شدتِ غم سے بے تاب تھے، احمد حسن صاحب اپنے ریشمی رومال سے آنکھیں ڈھانکے ہوئے سسکیاں بھر رہے تھے۔

شاید آسمان کے فرشتے بھی اس نظارے کو دیکھ کر مسرت کے آنسو بہا رہے ہوں گے۔

ابوالبرکات صاحب نے نماز پڑھائی، عاشق حسین صاحب نے خطبہ سنایا، پھر تمام حاضرین نے خشوع و خضوع سے حالی کی وہ مشہور مناجات جس کا مطلع ہے "اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے" کی تکرار کی، اسلام اور مسلمانوں کی فتح و نصرت کی دُعائیں مانگیں، بغلگیر ہوئے، اور ایسے بغلگیر گویا مدت کے بچھڑے ہوئے عزیز مل گئے ہوں۔ پھر باہمد گر دعوتوں کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا جس کی نظیر شہر کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ملتی۔

حسن عزیز جاوید

ہم سے تو اس کے واسطے بھی بددعا نہ ہو
دشمن برا سہی مگر اس کا برا نہ ہو

دل کا نہ لگنا ہے سبب بیزاریاں اے صفی
حسرت نہ ہو، امید نہ ہو، مدعا نہ ہو

صفی اورنگ آبادی

قرار و سکوں

سکونِ قلب کی ہے تجھ کو جستجو اے دوست! قرارِ روح کی ہے تجھ کو آرزو اے دوست!
تُو ڈھونڈتا ہے اسے سازہائے عشرت میں تجھے تلاش ہے اسکی بتوں کی اُلفت میں
سکوں نواز سمجھتا ہے سیم و گوہر کو سرور بخش سمجھتا ہے دَورِ ساغر کو
ہوائے حشمت و زر دشمنِ قرار و سکوں ہے بزمِ عیش و طرب مدفنِ قرار و سکوں
یہ موجِ آب نہیں ہے فقط سراب ہے یہ نہیں یہ گوہرِ تاباں فقط حباب ہے یہ
بُجھا رہا ہے تُو شعلوں سے تشنگی اپنی سمجھ رہا ہے ہلاکت کو زندگی اپنی

تُو مضطرب ہے کہ تجھکو سکوں نہیں ملتا
مگر وہ گوہرِ نایاب یوں نہیں ملتا

مثالِ مہرِ درخشاں نگاہ پیدا کر پھر اس نگاہ سے سینے میں راہ پیدا کر
نقوشِ باطل و حق میں تمیز پیدا کر جو سومنات شکن ہو وہ چیز پیدا کر

صدف ہے اپنی حیات اور گہر ہے حسنِ عمل
مصافِ زیست میں تیغ و سپر ہے حسنِ عمل

یہی عمل ہے کلیدِ خزینۂ عرفاں
اسی عمل سے رواں ہے سفینۂ عرفاں

یہی ہے مردِ مجاہد کی منزلِ مقصود
یہی مقام ہے جس کو کہا گیا محمود

فضائے روح میں تیری ہو نورِ حق کا ظہور
ظہورِ حق سے ہوں باطل کی ظلمتیں کافور

صفائے قلب میں ہے راحت و سکون و قرار
اس آئینہ میں ہیں حسنِ ازل کے نقش و نگار

وہ حسن جس کا تماشا ہے جنتِ جاوید
وہ حسن جس کی تمنا ہے لذتِ جاوید

وہ حسن کیفیتِ جاوداں ہے جس کا وصال
وہ حسن میکدۂ روح و جاں ہے جس کا وصال

تلاشِ حق میں اگر عمر ہو بسر تیری
جمالِ حق کی ہو جویا اگر نظر تیری

اگر نہ دامنِ حق تیرے ہاتھ سے چھوٹے
اگر نہ یورشِ باطل سے دل ترا ٹوٹے

تو مل ہی جائے گا تجھ کو سکوں کبھی نہ کبھی
بدل ہی جائے گا حالِ زبوں کبھی نہ کبھی

آثر صہبائی

چنڈول

اے مرے چنڈول کیا ننھی سی تیری جان ہے
طائرانِ دہر سے تیری نرالی شان ہے

گرچہ مشتِ پر ہے لیکن محرمِ عرشِ بریں
تُو نے پایا ہے جہاں میں مسکنِ بالاتریں

تُو زمیں پر سے اُڑا بامِ فلک پر چڑھ گیا
دیکھتے ہی دیکھتے اس سے بھی آگے بڑھ گیا

ہیں تعجب خیز تیری معرکہ آرائیاں
عقل کو حیران کرتی ہیں فلک پیمائیاں

آسماں والوں کو بھی اُڑنے پہ تیرے ناز ہے
تیرے پنکھوں میں غضب کی طاقتِ پرواز ہے

ہوش اُڑتے ہیں فرشتوں کے تری پرواز سے
اور ہیں اہلِ جہاں حیراں ترے انداز سے

تُو اُڑا اور آسماں کا ایک تارا ہو گیا
دیکھنے والوں کی آنکھوں کا اشارا ہو گیا

چاند تارا بن گیا اور آسماں میں جا چھپا
اُڑتے اُڑتے جاتے جاتے کہکشاں میں جا چھپا

تُو جہاں کی محفلوں سے کس لئے اُکتا گیا
اہلِ دُنیا سے ترا دل کس لئے گھبرا گیا

اپنی شاخِ آشیاں تک کس لئے آتا نہیں
دُور رہ کر تو وطن سے آہ گھبراتا نہیں

ڈھونڈنے جاتا ہے کس کو عرشِ بالا پر بتا
گُم ہُوا ہے کون وہ جس کا لگاتا ہے پتا

کیا زمیں والوں میں کوئی قدرداں تیرا نہیں
کیا ترے رہنے کے قابل آشیاں تیرا نہیں

دیکھ اپنی ذات کو ناشاد کی ہستی کو دیکھ
آسمانوں کی بلندی سے مری پستی کو دیکھ

رئیس شیکو ناشاد

اقبال کی منظر نگاری

(ذیل کا مقالہ یومِ اقبال کی تقریب پر اُس جلسہ میں پڑھا گیا جو ۱۶ ر جنوری ۱۹۳۸ء کو ڈی۔اے۔وی کالج راولپنڈی کے ہال میں آنریبل شیخ سر عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل لندن کی صدارت میں منعقد ہوا۔)

جگن ناتھ آزاد۔ بی۔اے (سیکرٹری انجمن اُردو راولپنڈی)

ہمارے ملک کی تاریخِ ادب میں یہ پہلی مثال ہے کہ کسی شاعر کی یادگار اُس کی زندگی میں اس قدر اہتمام کے ساتھ ملک کے طول و عرض میں منائی گئی ہو۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو اُن کی سالگرہ پر آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اُدبا، شعرا اور اصحابِ ذوق ہدیۂ مبارک باد پیش کر رہے ہیں۔ اور یہ اس شکرگزاری کا اظہار ہے جو ہم سب پر اُن کی گراں قدر خدمت گزاری کے لئے لازم آتی ہے دَورِ حاضر میں اُن کے سحر انگیز کلام نے اہلِ وطن کے جذبۂ عمل کو بیدار کرنے میں جو حصّہ لیا ہے اُس کے لئے علامۂ اقبال کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

اقبال کا کلام صُوری اور معنوی خصوصیات کے لحاظ سے ایک بحرِ بے پایاں ہے جس کی وسعت اور عمق کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے۔ میں اس شاعرِ عالم کے کلامِ بلاغت نظام کی صرف ایک خصوصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا یعنی مجھے "اقبال کی منظر نگاری" کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اگرچہ اس ایک خصوصیت کا نامکمل بیان بھی میرے لئے چھوٹا مُنہ اور بڑی بات ہے لیکن کارفرمایانِ بزم کے ارشاد کی تعمیل میں وہ تاثرات جو مطالعۂ کلامِ اقبال کے دَوران میں میرے دِل نے قبول کئے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں

اُردو کی موجودہ اصلاح یافتہ شاعری جس کی داغ بیل حالی اور آزاد نے ڈالی تھی اقبال کے میدانِ عمل میں آنے سے پہلے مروّج اور مقبول ہو چکی تھی اس شاعری کا جزوِ اعظم منظر نگاری تھا۔ ان کے ہمعصروں اور مقلدوں نے منظر نگاری میں خوب رنگ آمیزیاں کیں بعض شعرا نے اسی صنفِ شاعری کو اپنا خاص مضمون بنا لیا۔ بعض نے مُلکی اور ملّی مضامین میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے منظر نگاری کو ذریعۂ امداد کے طور پر استعمال کیا۔ اقبال کا تعلق صریحی طور پر دوسرے طبقے سے ہے، چنانچہ کلامِ اقبال میں جا بجا منظر نگاری کو وارداتِ قلب، جذباتِ ملّت اور نکاتِ فلسفہ وغیرہ کو دلکش اور مؤثر بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ان کی اوّلیں نظموں میں "کوہِ ہمالیہ" کے دُوسرے ہی بند سے اس حقیقت کا ثبوت مِل جاتا ہے کہ وہ ہمالیہ پر ایک بیانیہ نظم نہیں لکھ رہے بلکہ اُن کا اصل موضوع اس عنوان کے پردہ میں "حبِ وطن" ہے۔

باوجودیکہ منظر نگاری اقبال کے کلام کا خاص موضوع نہیں ہے لیکن جہاں جہاں کلامِ اقبال میں منظر نگاری موجود ہے، وہاں

یہ ایک سحر انگیز منظر پیش کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی نظم میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا — دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر

خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

"ماہِ نو" پر چند اشعار لکھے ہیں۔ میں شروع کے تین اشعار پیش کرتا ہوں، انہی سے کلام کی اس خصوصیت کے کمال کا اندازہ لگا لیجئے منظر نگاری کے تمام لوازم مثلاً قدرتِ زبان، ندرتِ تشبیہ، علوِ تخیل ان چھ مصرعوں میں انتہائی دلکشی کے ساتھ موجود ہیں ؎

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل — ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب — نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی

نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

ایبٹ آباد کے پہاڑوں پر گھٹاؤں کے منظر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:۔

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا — سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا

نہاں ہوا جو رُخِ مہرِ زیرِ دامنِ ابر — ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر

گرج کا شور نہیں ہے۔ خموش ہے یہ گھٹا — عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

ہوا کے زور سے اُبھرا۔ بڑھا اُڑا بادل

اُٹھی وہ کالی گھٹا، لو برس پڑا بادل

برسات کے موسم کی کتنی سچی تصویر ہے۔ ایک ایک مصرع پر فصاحت اور بلاغت نثار ہو رہی ہے، لفظ لفظ نظارے کی تصویر کھینچ رہا ہے خاص کر ساکنانِ راولپنڈی جس قدر ان اشعار کی صداقت کا احساس کر سکتے ہیں اور اُن سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور مقام والوں کی قسمت نہیں۔

"ایک شام" جن جذبات کی مظہر ہے اُس کا احساس فقط حساس دِل ہی کر سکتے ہیں۔ دریا کے کنارے شام ہو رہی ہے، سکوت ہر طرف اپنا تسلط جما رہا ہے۔ غیر ممکن ہے کہ اقبال اس خاموش کُن اور غم انگیز منظر سے متاثر نہ ہو۔ کہتا ہے ؎

خاموش ہے چاندنی سحر کی — شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

وادی کے نوا فروش خاموش کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے نیکرؔ کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

لہ دریائے نیکر (ہائیڈل برگ)

"گورستانِ شاہی" میں تو اقبال نے منظر کشی کے جادو کو اعجاز کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ شاندار اسلامی حکومتوں کے ویران کھنڈر شاعر کے سامنے ہیں۔ آنکھیں تباہ شدہ مناظر کو دیکھ رہی ہیں۔ حساس دِل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ قطب شاہی اور عماد شاہی حکومتوں کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لیکن آج ان کے عظیم الشان شہنشاہ

سو رہے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دُور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور

عالیجناب شیخ صاحب نے جو ہماری خوش قسمتی سے آج کرسیِ صدارت پر جلوہ افروز ہیں، اس بلند پایہ نظم کی تمہید میں جون ۱۹۱۰ء میں چند سطور زیبِ اوراقِ مخزن کی تھیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک قصیدہ کا ذکر کرنے کے بعد شیخ صاحب لکھتے ہیں:۔

"دوسری نظم جو گورستانِ شاہی کے عنوان سے شائع کی جاتی ہے ایسی لاجواب نظم ہے جو فی الحقیقت اقبال کے دیرینہ سکوت کی تلافی کرتی ہے، اس کا ایک ایک مصرعہ ایسا درد بھرا اور معنی خیز ہے کہ دل سے داد نکلتی ہے . . . . سلاطینِ قطب شاہیہ کے مزار اُن کے قریب گولکنڈہ کا تاریخی حصار، شبِ ماہ مگر ایسی شبِ ماہ جس میں بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نور و ظلمت میں لڑائی ٹھن رہی تھی سچے شاعرانہ جذبات کے نشوونما کے لئے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان کیا ہوگا۔ ان جذبات کا عکس جس خوبی اور صفائی سے جنابِ اقبال نے اُتارا ہے۔ اُنہی کا حصہ ہے۔"

خود علامہ اقبال نے اسی نظم کی تمہید میں لکھا:۔

"حیدرآباد دکن میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی۔ اے معتمد محکمۂ فینانس مجھے ایک شب اُن شاندار مگر حسرتناک گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے جن میں سلاطینِ قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی،

ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُرحسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم انہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے "۔

شہنشاہوں کے قبرستان کا الناک منظر، شب ماہتاب کا ابر آلود نظارہ اور اقبال کا دلِ حساس، اس اتفاق کو اُردو شاعری کی خوش قسمتی سمجھنا چاہئے۔ نظم کا آغاز دیکھئے، کس درجہ بلند پایہ منظر نگاری ہے ؎

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے کچھ مکدر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں صبحِ صادق رو رہی ہے رات کے آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی
باطنِ ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

یکایک شاعر کی توجہ اس یاس انگیز منظر سے ہٹ کر سامنے گولکنڈہ کے قلعہ کی جانب مبذول ہوتی ہے اور کہتا ہے ؎

آہ! جولانگاہِ عالمگیر یعنی وہ حصار دوش پر اپنے اُٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سُکّانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ منظر نگاری اقبال کے کلام میں وارداتِ قلب، جذباتِ ملت، نکاتِ فلسفہ اور حبِ وطن وغیرہ مضامین کو دلکش اور مؤثر بنانے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اس نظم میں یہ خصوصیت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے، ان اشعار کو لیجئے ؎

ابر کے روزن سے وہ بالائے بامِ آسماں ناظرِ عالم ہے نجمِ سبز فامِ آسماں
خاکبازی وسعتِ دُنیا کا ہے منظر اسے داستاں ناکامیٔ انساں کی ہے ازبر اسے
ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا
گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لئے فاتحہ خوانی کو یہ ٹھیرا ہے دم بھر کے لئے

یا

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل جن کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال
رُعبِ فغفوری ہو دُنیا میں کہ شانِ قیصری ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

شورشِ بزمِ طرب کیا عود کی تقریر کیا　　درد مندانِ جہاں کا نالۂ شبگیر کیا

اور ؎

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے　　اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

یا

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے　　ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ آغاز سے شاعر کا مطلب فقط منظر نگاری نہ تھا بلکہ کچھ اور بھی۔ اگر حب ملی اور منظر نگاری کا کمال دیکھنا ہو تو "گورستانِ شاہی" اقبال کے اُردو کلام میں بے نظیر چیز ہے۔

"نمودِ صبح" کے زیرِ عنوان ایک نظم ہے، یہ دراصل ایک قصیدۂ مدحیہ کے ابتدائی اشعار ہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ منظر نگاری کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔

وقت کی تنگ دامانی کی وجہ سے بعض لاجواب نظموں مثلاً "رات اور شاعر" اور "بزمِ انجم" کو مجبوراً نظر انداز کیا جاتا ہے۔

چونکہ شاعر نے اُردو سے زیادہ فارسی میں طبع آزمائی کی ہے، یہ مضمون تشنہ رہ جائے گا، اگر فارسی منظومات میں سے اقتباسات آپ کے سامنے پیش نہ کئے جائیں۔ سر اقبال کی فارسی تصنیفات میں "پیامِ مشرق" ایک ایسا چمنِ بے خزاں ہے جس میں اقبال کی منظر نگاری کے اچھوتے اور مکمل نمونے بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔

بہار کا موسم اپنی پورے شکوہ سے جلوہ گر ہے۔ شاعر دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے کہتا ہے ؎

خیز کہ در کوہ و دشت　　خیمہ زد ابرِ بہار

مست ترنّم ہزار
طوطی و دراج و سار
بر طرفِ جوئبار
کشتِ گل و لالہ زار
چشم تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت　　　خیمہ زد ابرِ بہار

شاعر کی عمیق نظر فقط بہار تک ہی محدود نہیں رہ جاتی بلکہ بہار کے تاثرات کا بھی مشاہدہ کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خیز کہ در باغ و راغ　　　قافلۂ گل رسید

بادِ بہاراں وزید

مُرغ نوا آفرید

لالہ گریباں درید

حُسن گُلِ تازہ چید

عشق غمِ نو خرید

خیز کہ در باغ و راغ　　　قافلۂ گُل رسید

نسیمِ صبح کی زبان سے کتنے لطیف اشعار کہلائے ہیں :؎

ز روئے بحر و سرِ کوہسار می آیم　　　ولیک مے نہ شناسم کہ از کجا خیزم
بہ سبزہ غلطم و بر شاخِ لالہ می پیچم　　　کہ رنگ و بُو ز مساماتِ اُو بر انگیزم
خمیدہ تا نہ شود شاخ او ز گردشِ من　　　بہ برگِ لالہ و گل نرم نرمک آویزم

سار بانِ حجاز اپنے ناقہ پر سوار جا رہا تھا۔ صبح ہو رہی ہے۔ اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

مہ ز سفر پا کشید　　　در پسِ تل آرمید
صبح ز مشرق دمید　　　جامۂ شب بر درید

بادِ بیاباں وزید

تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست

شاعر نشاط باغ کشمیر میں بیٹھا ہے۔ بہار پُورے جوبن پر ہے، دل پر جو کیفیت طاری ہو رہی ہے، اس کا اندازہ ان اشعار سے کیجئے ؎

زمیں از بہاراں چو بالِ تدروے　　　ز فوارہ الماس بار آبشارے
چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے　　　کہ می آید از خلوتِ شاخسارے
نواہائے مرغِ بلند آشیانے　　　در آمیخت با نغمۂ جوئبارے

تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را
نہاد است در دامنِ کوہسارے

ایک اور نظم میں کشمیر جنت نظیر کی تصویر کھینچی ہے۔ فقط دو اشعار پیش کرتا ہوں ؎

بادِ بہار موج موج، مرغِ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سرِ نارون نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بہ آبجو تپید
خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر

اتنا وقت نہیں کہ علامہ اقبال کی تمام تصانیف سے اقتباسات آپ کے سامنے پیش کروں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا این جاست

جگن ناتھ آزاد

یادِ گرامی[1]

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی (بمقام جالندھر، در جلسۂ "خیر مقدمِ گرامی" اکتوبر ۱۹۰۹ء):—

ہے نواسنج آج کل سُن لو گرامی کو کہ پھر
نغمۂ بلبل سے خالی بوستاں ہو جائے گا

ڈاکٹر سر محمد اقبال (انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۲ء میں حضرتِ گرامی کا تعارف کراتے ہوئے):—

"گرامی کو دیکھ لو! تمہاری نسلیں اس بات پر فخر کریں گی کہ ہمارے بزرگوں نے اپنی آنکھوں سے گرامی کو دیکھا تھا اور اُس کی زبان سے اُس کا کلام سُنا تھا۔"

راحل ہوشیارپوری

[1] لسان العصر شیخ غلام قادر گرامی رح (۱۸۵۴ — ۱۹۲۷ء)

محفلِ ادب

پیامِ محبت

از:-

عالی جناب شاہزادۂ والاشان معظم جاہ بہادر

اے جذبۂ محبت   ان سے یہ حال کہنا
ان کو اگر خوشی ہو   میرا ملال کہنا
وہ دیں جواب اگر کچھ   دل کا سوال کہنا
اُن کا بیان سُن کر   اپنا خیال کہنا
پھر میرا نام لیکر   میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ زندگی میں   کوئی مزا نہیں ہے،
یعنی نظر تمہاری   درد آشنا نہیں ہے،
جب سے بچھڑ گئے ہو   وہ دل رہا نہیں ہے،
میری مصیبتوں کی   کچھ انتہا نہیں ہے؛
پھر میرا نام لے کر   میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ میری دنیا   برباد ہو رہی ہے
غمگیں خموشیوں میں   فریاد ہو رہی ہے
اک تازہ رسمِ اُلفت   ایجاد ہو رہی ہے
بیداد کر رہے ہو   بیداد ہو رہی ہے
پھر میرا نام لے کر   میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ اب کہاں ہے   وہ آپ کی عنایت
یا آپ وہ نہیں ہیں   یا آگئی قیامت
لب تک نہ آسکے گی   دل میں جو ہے شکایت
اک حرفِ آرزو ہے   یا درد کی حکایت
پھر میرا نام لیکر   میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ یاد کر لو   بھولی ہوئی کہانی
گزری تمہاری خاطر   کس طرح زندگانی
دل نقشِ آرزو ہے   یا درد کی نشانی
قسمت نے تم کو پایا   اور کھو گئی جوانی

پھر میرا نام لے کر   میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ تم نہیں ہو   پر یاد آ رہے ہو
یہ بھی ہے اِک عنایت   یوں ظلم ڈھا رہے ہو
میری نظر سے چھپ کر   دل میں سما رہے ہو
جس کو بنا چکے تھے   اُس کو مٹا رہے ہو
پھر میرا نام لے کر   میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ پھیر لی ہے   جب سے نگاہ تم نے
دل لے کے کر دیا ہے   دل کو تباہ تم نے
کیوں مجھ سے ترک کر دی   وہ رسم و راہ تم نے
مجھ کو نہیں بتایا   میرا گناہ تم نے
پھر میرا نام لے کر   میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ اِک بلا ہے   اب زندگی کسی کی
قایم رہے گی غم سے   کب تک خوشی کسی کی
تم بھی سمجھ رہے ہو   بے چارگی کسی کی
محسوس کر رہے ہو   شاید کمی کسی کی
پھر میرا نام لیکر   میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ ایک بے کس   فریاد کر رہا تھا
ناشادیوں سے خوش تھا   دل شاد کر رہا تھا
خود اپنی زندگی پر   بیداد کر رہا تھا
کچھ بھولنے کی دُھن تھی   کچھ یاد کر رہا تھا
پھر میرا نام لے کر   میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ جب مقدر   سویا ہوا نہیں تھا
میری نظر حسیں تھی   سارا جہاں حسیں تھا
انصاف سے بتاؤ   یہ رنگ بھی کہیں تھا
غم آج دل شکن ہے   کل تک تو دل نشیں تھا
پھر میرا نام لے کر   میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر
میرا پیام کہنا

کہنا کہ ہیں نظر میں   گزرے ہوئے زمانے
وہ شوق کی کہانی   وہ درد کے فسانے
میری شکایتوں پر   وہ عذر وہ بہانے
میں نے کہا بہت کچھ   افسوس تم نہ مانے
پھر میرا نام لے کر   میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر
میرا پیام کہنا

"نگار"

مصنف کے حالات اس کی تصانیف سے

(مزاحیہ)

مغربی طرزِ تنقید نے جسے آج کل تنقیدِ عالیہ کا نام دیا جاتا ہے ہمارے نقادوں کی ذہنیت میں ایک خطرناک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔اس انقلاب کا سب سے نمایاں پہلو کسی مصنف کے سوانح حیات اس کی تصانیف سے اخذ کرنے کا جنون ہے۔ہمارے نقادوں کی اس امر واقع پر نظر ہی نہیں کہ ہمارے مصنف بالخصوص شاعر آپ بیتی نہیں کہا کرتے بلکہ ایک علمی اور خیالی دُنیا پیدا کر کے اس میں رہنے والے کسی فرضی شخص کے حالات اور جذبات اپنے نام سے بیان کرتے ہیں اس لئے ان کے کلام سے ان کی زندگی کے حالات اخذ کرنا حنظل میں سے عطر نکالنے کی کوشش کے مترادف ہے لیکن مجھ ایسے کم مایہ شخص کیلئے ان بزرگوں کی روش کے خلاف بغاوت کرنا بھی ناممکن ہے اس سے مجبوراً اُن کی پیروی کر رہا ہوں۔جی چاہتا تھا کہ دو تین شاعروں کے حالات ان کے کلام سے اخذ کر کے اس طرزِ تنقید کی لغویت پر کچھ روشنی ڈالوں لیکن وقت بہت کم ہے۔اس لئے صرف مرزا غالب کے حالات بیان کئے دیتا ہوں اور وہ بھی نہایت اختصار سے۔

مرزا کا نام تمام تذکرہ نویسوں نے اسد اللہ خاں لکھا ہے لیکن نئے تذکرہ نگاروں نے اس معاملے کو بھی خاص تحقیقات کا مستحق سمجھا اور بڑی کاوش اور تلاش کے بعد ثابت کر دکھایا ہے کہ غالب کا نام احمد شاہ ابدالی یا ہمیوں بقال نہیں بلکہ اسد اللہ خاں تھا ان محققوں کے اس خیال کی تائید مرزا کے دو شعروں سے بھی ہوتی ہے۔یعنی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں ۔۔۔ وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

اسد اللہ خاں تمام ہوا ۔۔۔ اے دریغا وہ رندِ شاہدباز

مرزا کا تخلص کئی غزلوں میں اسدؔ ہے اور اکثر میں غالبؔ۔اس سے بعض لوگوں کو شک ہو چلا تھا کہ مرزا کا دیوان دو مختلف شاعروں کے زورِ طبع کا نتیجہ ہے لیکن ہمارے تذکرہ نویسوں نے ثابت کر دیا ہے کہ غالبؔ اور اسدؔ دراصل ایک شخص کے تخلص ہیں۔البتہ ان تذکرہ نویسوں کا یہ خیال درست نہیں کہ مرزا پہلے اسدؔ تھے۔پھر غالبؔ بن گئے حقیقت یہ ہے کہ مرزا نے آخر تک اسدؔ تخلص نہیں چھوڑا۔فرماتے ہیں ؎

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے ۔۔۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ظاہر ہے کہ یہ شعر مرزا نے آخر عمر میں بھی نہیں بلکہ اپنی موت کے بعد لکھا تھا۔پھر کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ آخر تک اسدؔ تخلص استعمال کرتے رہے۔

پیدائش:۔ نام اور تخلص کا مسئلہ یوں حل ہو گیا لیکن مرزا کی پیدائش اور عمر کے متعلق نئے اور پُرانے تمام تذکرہ نویسوں نے بُری طرح ٹھوکریں کھائی ہیں۔سب نے غالب کا سنہ پیدائش ۱۲۱۲ ہجری لکھا ہے اور عمر ۷۳ سال لیکن یہ صریحاً غلط ہے۔مرزا خود کہتے ہیں ؎

تھا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اس زمانے سے ۔۔۔ کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

اس سے ظاہر ہے کہ مرزا غالب نہ صرف قیسِ عامری کے زمانے میں زندہ تھے،بلکہ عمر میں بھی اس سے بڑے تھے۔

والدین ۔ غالب کے باپ کا نام تمام تذکروں میں عبداللہ بیگ خاں درج ہے، مرزا کے کلام سے اس معاملے پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ لیکن مرزا کے باپ کا کچھ نہ کچھ نام تھا ضرور ۔ کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اب سے کئی سو سال پہلے بھی ہندوستان میں باپوں کے نام ہُوا کرتے تھے، مثلاً جہانگیر کے باپ کا نام جلال الدین اکبر اور ہمایوں کے باپ کا نام ظہیر الدین بابر تھا۔ اس تاریخی انکشاف کے بعد اگر قافیہ کی رعایت سے اسداللہ کے باپ کا نام عبداللہ تسلیم کر لیا جائے تو میرے خیال میں کچھ حرج نہیں۔

مرزا کی والدہ ماجدہ کا نام کسی کو معلوم نہیں ہو سکا لیکن انہوں نے اپنے ایک خط میں اس امر کی شکایت کی ہے کہ ایک شخص نے ان کو بڑھاپے میں ماں کی گالی دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا کی کم از کم ایک ماں ضرور تھی۔

تعلیم ۔ معلوم نہیں مرزا نے تعلیم کہاں پائی۔ مجنوں کے زمانے میں کوئی باقاعدہ سکول تو تھا نہیں۔ صرف ایک دبستان تھا جس کی دیواروں پر مجنوں لام الف لکھا کرتا تھا۔ پس مرزا غالب گھر پر ہی پڑھے ہوں گے۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ وہ جاہل نہیں تھے۔ اگر ناخواندہ ہوتے تو شعر کیوں کر لکھ سکتے۔ اور اتنی تصانیف کہاں سے آ جاتیں، انہوں نے اُردو اور فارسی میں نظم و نثر لکھی ہے پس دو دونوں زبانیں جانتے تھے۔

پیشہ اور شغل :- مرزا کا سب سے بڑا پیشہ تو ظاہر ہے، دوسرا کام یہ تھا کہ شعر چُن چُن کر رُسوا ہوتے تھے، خود مانتے ہیں کہ

شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

اس کے علاوہ بعض اور اشغال بھی تھے، مثلاً اُنہوں نے مصوری بھی سیکھی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

کچھ مدت یہ شیوہ بھی رہا۔ کہ صبح سویرے کان پر قلم رکھ کر نکل پڑتے اور سارا دن لوگوں کے خط لکھتے پھرتے، اِسی لئے کہتے ہیں:-

مگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

مختصر حالات :- اب مرزا کے مختلف سوانح حیات سنئے، وقت کی تنگی کے باعث میں صرف چند ہی واقعات کے بیان پر اکتفا کروں گا۔

مرزا کی زندگی اگرچہ نسبتہً عُسرت میں گزرتی تھی لیکن اس کے لئے اللہ میاں ذمہ دار نہ تھے، خود مرزا کو اقرار ہے کہ خدا نے انہیں دونوں جہان دے رکھے تھے۔ سنئے

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ دونوں جہان گئے کہاں؟ جواب مرزا کے اس شعر میں موجود ہے ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے — یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پس دونوں جہان بھی گھر کے ساتھ ہی لٹا دیئے ہونگے مرزا غالب کا گھر نہ صرف ویران تھا، بلکہ اس میں ویرانی سی ویرانی تھی۔ چنانچہ

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

لیکن ان کا گھر وسیع نہ تھا۔ اور مرزا کو ورزش کے لئے یا شاید کرکٹ کھیلنے کے لئے بہت وسیع جگہ کی ضرورت تھی۔ اس لئے جنگل میں جا رہے تھے، فرماتے ہیں ؎ کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

عادات وخصائل:۔ مرزا بڑے سادہ لوح اور صاف دل انسان تھے اکثر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے تھے جن کا نتیجہ نقصان یا تکلیف ہوتا تھا چنانچہ ایک دن محبوب کی گلی میں بیٹھے بیٹھے ذرا سی غلطی کے باعث دربان سے چند یا گنجی کرالی کہتے ہیں :۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ایک دن خود محبوب سے بھی مار کھائی لیکن قصور اپنا تھا۔ اس لئے نہایت ایمانداری سے اس کا اعتراف بھی کرلیا ہے۔ یعنی ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اسی سادہ لوحی کی بدولت ایک دن محبوب کی حد سے زیادہ تعریف کرکے ایک غمخوار رازداں کو رقیب بنا لیا۔ ثبوت ملاحظہ ہو ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

لیکن دیوانہ بکارِ خویش ہشیار کبھی کبھی رقیب کو جل بھی دے جاتے ؎

دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا — تا کرے نہ غمازی کرلیا ہے دشمن کو

مرزا نجوم اور جوتش کے نہ صرف قائل تھے بلکہ محبت کے معاملے میں بھی جوتشیوں سے پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے، اسی لئے کہا ہے ؎

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض — اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

مرزا کا دل۔ غالب کا دل عام لوگوں کی طرح خون کا قطرہ یا گوشت کا لوتھڑا نہ تھا، بلکہ آفت کا ٹکڑا تھا اور مرزا اس کی آوارگی کے شاکی تھے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے — عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

لیکن اللہ میاں نے فضل کیا، اور مرزا کو جلد ہی اس سے رہائی مل گئی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے سوزِ نہاں کا دورہ ہوا۔ اور سارے کا سارا دل بے محابا جل گیا۔ مرزا نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے ؎

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا — آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

غالب کے ناخن بہت جلد جلد بڑھتے تھے۔ چنانچہ زخم ابھی بھرنے بھی نہ پاتا تھا کہ ناخنوں کے کھرپے پھر کھدائی کے لئے تیز ہوجاتے، فرماتے ہیں ؎

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

غالب کا زمانہ:۔ غالب کے زمانے میں دلی میں غمِ الفت کا قحط پڑ گیا تھا۔ اب خدا جانے کیا حال ہے، فرماتے ہیں :۔ ؎

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد — ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے کھائیں گے کیا

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی خوراک غمِ الفت تھی یا کم از کم غمِ الفت ان کی خوراک کا جزوِ اعظم تھا۔

لیکن اس قحط سالی میں ایک دو چیزوں کی ارزانی بھی تھی مثلاً دل اور جاں بازار میں بکا کرتے تھے۔ اور ہر شخص خرید سکتا تھا۔ مرزا کو اس کا اعتراف ہے ؎ تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے — لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

اس زمانہ میں پورے سات آسمان تھے، اور سب کے سب دن رات گردش میں رہتے تھے۔ مرزا لکھتے ہیں ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مرزا کے زمانے کی ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ اگر کسی کو محبوب کا مُنہ معلوم نہ ہو سکے تو اس کی ہیمدانی کھُل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مرزا کی ہیمدانی بھی کھُل گئی جس کا اعتراف اس شعر میں موجود ہے :۔

دہن اس کا جو نہ معلوم ہُوا   کھُل گئی ہیچمدانی میری

سب سے بڑی قباحت اس عہد کی یہ تھی کہ مجرموں کو سخت وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ چنانچہ مرزا غالب ایسے شخص کو بھی ایک مرتبہ کسی جُرم کی پاداش میں پنجرے میں بند کر دیا گیا لیکن زمانہ اس قدر خراب تھا کہ مرزا اس حالت کو بھی غنیمت سمجھتے تھے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں   گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

غالب کا محبوب۔ مرزا کا محبوب بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا اس کا نام سارے جہان کو معلوم تھا لیکن کسی ملک کسی شہر کسی گاؤں میں کوئی شخص بھی اس کا نام ستمگر کہے بغیر نہ لیتا تھا۔ مرزا کہتے ہیں ؎

کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں   لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

اس محبوب کے عادات و خصائل بھی عجیب تھے، مثلاً گالیاں بہت دیا کرتا تھا۔ مرزا پوچھتے ہیں ؎

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب   یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

اسی طرح اگر کبھی مرزا شکوہ شکایت کریں تو وہ فوراً اُٹھ بھاگتا اور سارے رقیبوں کو جمع کر لیتا۔ اسی لئے مرزا جھنجلاتے ہیں ؎

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو   اِک تماشا ہُوا گلا نہ ہُوا

جب وہ رقیب کی بغل میں سوتا تو مرزا کے خواب میں آ کر پنہاں تبسم کیا کرتا تھا۔ اسی لئے مرزا کہتے ہیں ؎

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ   سبب کیا خواب میں آ کر تبسّم ہائے پنہاں کا

معشوق تھا تو ستمگر لیکن آخر میں بے طلب بوسے دینے لگا تھا۔ مرزا کی بدگمانی ملاحظہ ہو ؎

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو   دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

اس کے مذہب کے متعلق صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم تھا۔ جبھی تو مرزا کو کہنا پڑا ؎

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ   غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

چند متفرق واقعات :۔ ایک دفعہ مرزا نے اُڑنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز تو تھے نہیں کسی اور طریق سے اُڑے ہوں گے، لیکن جال میں پھنس گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے   اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے کچھ مدت گھونسلے میں بھی گزاری۔

مرزا کا ایک دربان بھی تھا جب مرزا کا گھر ویران ہو گیا تو اس کے لئے کوئی کام نہ رہا۔ مگر تھا وفادار۔ مرزا کا ساتھ نہ چھوڑا اور گھر میں سے گھاس کھود کر گزر اوقات کرتا رہا۔ مرزا فرماتے ہیں ؎

[illegible]

مرزا نے کئی مرتبہ بہشت کی سیر بھی کی۔ ایک مرتبہ بہشت سے واپس آکر محبوب سے فرماتے ہیں ؎

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت   یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

خواجہ خضر سے بھی مرزا کی اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ نصرت الملک کے قصیدہ میں فرماتے ہیں ؎

تو سکندر ہے۔ مرا فخر ہے ملنا تیرا   گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

لیکن خضر کو رہنمائی کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے کہتے ہیں ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں   مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

مرزا بزدل بھی تھے، ایک مرتبہ اُن کو چوروں کا سامنا ہوا تو دیکھتے ہی بھاگ نکلے لیکن دوڑ دھوپ کے باوجود پکڑے گئے۔ ایک ستم ظریف چور نے ڈانٹ کر کہا۔ کم بخت ہمیں اس قدر دوڑایا ہے، لے اب میرے پاؤں داب۔ اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ   ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرزا اپنے رقیب کے دروازہ پر کم نہ زیادہ پورے ایک ہزار مرتبہ گئے۔ شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب بھی عمر بھر میں ہزار بار ہی رقیب کے گھر گیا ؎

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار   اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

مرزا نے مرنے کے بعد بھی بہت سے شعر کہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے شاگردوں تک پہنچا دیئے۔ اُنہوں نے دیوان میں شامل کر دیئے ان میں سے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں ؎

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ   ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد   مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

مرزا کا محبوب کہیں کعبہ کے گرد و نواح میں سکونت پذیر تھا۔ چنانچہ جب کبھی مرزا کو محبوب کے دروازے پر دھکے پڑتے تو وہ کعبہ کی جانب چل دیتے۔ فرماتے ہیں ؎

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں   اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

مجنوں عمر میں تو مرزا سے چھوٹا تھا ہی، اس کا انتقال بھی مرزا سے پہلے ہی ہوا۔ مرزا کہتے ہیں ؎

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ   مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

مرزا بچارے کی موت بھی غریب الوطنی میں ہوئی۔ فرماتے ہیں ؎

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور   رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

موت یوں ہوئی کہ آخر عمر میں وحشت کے دورے پڑنے لگے تھے، ایک دن اسی حالت میں سر پھوڑ کر مر گئے۔ مرتے مرتے کہا ؎

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے   بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

معشوق کو یہ حال معلوم ہوا تو مروت نے جوش مارا اور دوڑا آیا۔ لیکن مرزا غریب میں ایک نظر دیکھ لینے کی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ چنانچہ یہ شعر پڑھتے پڑھتے جاں بحق ہوئے ؎ مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے   خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

لیجئے صاحب، یہ ہے ہمارے خدائے سخن کی وہ صورت جو "تنقید عالیہ" کے آئینے میں نظر آتی ہے۔

مطبوعات

مکاتیبِ غالب۔ ملک کے ادبی حلقوں کو مولوی امتیاز علی صاحب عرشی ناظمِ کتب خانہ رامپور کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اُنہوں نے رامپور کے شاہی کتب خانے میں سے غالب کے وہ خط جمع کر کے شائع کر دیئے جو نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے نام لکھے گئے تھے۔ نواب یوسف علی خاں غالب کے شاگرد تھے اور چونکہ اُن کی شاعری غالب کی شاگردی کے ساتھ ہی
[illegible] ۱۳/ [illegible] ہے کہ اُن کا پہلا دیوان سر بسر غالب کا کلام ہے [illegible]
تعارف حضرت کیفی دہلوی نے کرایا ہے۔ پلاٹ میں مصنف نے اس تنقیح کو لیا ہے کہ اولاد اور بالخصوص لڑکیوں کی شادی قرار دینے کے وقت اصولاً کن امور کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

راز۔ یہ چند افسانوں کا مجلد مجموعہ ہے، جو محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدر آباد دکن نے شائع کیا ہے۔ اس قسم کے مجموعے یہ کارخانہ آئندہ بھی بلا تعیین وقت شائع کرتا رہے گا اور جو حضرات اپنے نام درج کرا دیں گے اُن کو ہمیشہ ۵ر میں پہنچاتا رہے گا قیمت ہمیشہ ۵ر رہے گی۔
[illegible] قیمت [illegible] یہ کتاب محمد اسمٰعیل صاحب علی گڑھی نے مسلمانوں کی معاشرتی اور
اہلِ دربار نے اعتراض کیا اور نواب صاحب نے بھی ناراضی ظاہر کی، اس پر مرزا صاحب نے جواب دیا " ان باتوں کو میں نے مانا لیکن فرہنگ لکھنے والوں کی رائے کے بموجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق "۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُفتادگی اور بے چارگی کی حالت میں بھی اقلیمِ ادب کے اس بادشاہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ کم از کم اس کی اپنی اقلیم میں کسی نا اہل کا سکہ چلے۔

مکاتیب کی زبان وہی فصیح و سلیس اُردوئے مُعلیٰ ہے جو غالب کا طُرۂ امتیاز ہے، کتاب نہایت نفیس کاغذ پر خوبصورت نسخ ٹائپ میں چھپی ہے۔ حجم ۱۳۵ صفحات ہے۔ نفیس اور مضبوط جلد پر کتاب کے نام کی ڈائی لگی ہے۔ تصویریں بھی ہیں۔ قیمت مجلد للعہ۔ سٹیٹ لائبریری رام پور سے طلب فرمایئے۔

مُسلم گرلز کالج میگزین:۔ یہ علی گڑھ کے مُسلم گرلز کالج کا رسالہ ہے جو مسز بسم اللہ نیاز احمد صاحبہ بی، اے، بی ٹی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ علی گڑھ کے مشہور زنانہ رسالے " خاتون " کا قائم مقام ہے لیکن چونکہ یہ مُسلم گرلز کالج سے وابستہ ہے اس لئے اس میں زیادہ تر اس کالج کی طالبات یا اولڈ گرلز کے مضامین ہی چھپتے ہیں۔ فی الحال یہ رسالہ سالانہ ہے لیکن اگر خواتین اس کی سرپرستی کریں جس کا یہ مستحق ہے تو ماہوار کر دیا جائے گا۔ کالج کی لڑکیوں کے مضامین قابلِ تعریف ہیں اور یہ رسالہ حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

طرحِ نو:۔ یہ ماہوار اُردو رسالہ اُردو بک سٹال لاہور نے جاری کیا ہے اور اس کی ادارت مشہور نوجوان شاعر سراج الدین صاحب ظفر کے سپرد ہے جن کی شاعری ناظرینِ ہمایوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس رسالہ میں سیاسی اور ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ روس کی طرحِ نو، عورت کی معاشی غلامی، آئندہ جنگ کی تیاریاں، ملکی اتحاد کی ضرورت مفید مضامین ہیں۔ چندہ سالانہ تین روپے۔

مجلۂ عثمانیہ:۔ یہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ ہے جو اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ مجلۂ عثمانیہ ہر اس شاندار جامعہ کا رسالہ کہلانے کا مستحق ہے۔ ہندوستان کے کسی اور کالج کے رسالے میں اس قدر مفید اور ٹھوس مضامین شائع نہیں ہوتے۔ طلبہ کے فاضلانہ مضامین یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم کی کامیابی کی روشن دلیل ہیں۔

ڈانٹ کر کہا۔ تم بخت ہمیں اس قدر دوڑایا ہے، لے اب میرے پاؤں داب۔ اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے ؎

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرزا اپنے رقیب کے دروازہ پر کم نہ زیادہ پورے ایک ہزار مرتبہ گئے۔ شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب بھی عمر بھر میں ہزار بار ہی رقیب کے گھر گیا ؎

اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار

مرزا نے مرنے کے بعد بھی بہت سے شعر کہے اور کسی نہ کسی طرح اپنے شاگردوں تک پہنچا دیئے۔ اُنہوں نے دیوان میں شامل کر دیئے۔ ان میں سے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں ؎

(۱) **اسلامی حکایات منظوم** (قیمت درج نہیں)۔ (۲) سیرت حضرت جعفر طیار ۴؍ (۳) اسلامی روایات ۶؍ (۴) اسلام اور غلامی (۵) اسلام اور غیر مسلم۔ یہ سب کتابیں محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواری نے مرتب کی ہیں اور مسلم اکیڈیمی پھلواری شریف سے مل سکتی ہیں۔ ۱؍ حکایات میں مشہور شعراء کی نظمیں درج ہیں، اسلامی روایات میں اسلامی تاریخ کے سبق آموز واقعات ہیں، دوسری کتابوں کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے۔ اسلامی معلومات کے لحاظ سے یہ کتابیں بچوں کے لئے مفید ہیں۔

یادگارِ اظہر:۔ مولوی سید دلدار حسین اظہر کی طویل حمد حسنِ اہتمام کے ساتھ مجلد شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے خاص طرز کو ملحوظ رکھا ہے۔ قیمت درج نہیں۔ مصنف سے مدرسہ فوقانیہ دار الشفا حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے۔

اسلامک برادرہُڈ۔ مولوی محمد حفیظ اللہ کی "اسلامی مساوات" کا انگریزی ترجمہ از مولوی عبدالغنی۔ مقدمہ از سر محمد فخر الدین وزیر تعلیم اڑلیسہ۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ: مسلم بک ڈپو پھلواری شریف، پٹنہ

نغمۂ سروش: فضل الدین صاحب فدا کی رباعیات کا مجموعہ مرتبہ سید کاظم ایڈیٹر رسالہ کہکشاں دہلی جناب مرتب سے منگا

عروجِ زندگی۔ (افسانہ) مصنفہ ن۔ حسن صاحب ایم۔ اے بی ٹی ایل ایل بی سکریٹری کتب خانہ انجمن ترقی اردو کلکتہ۔ قیمت حضرتِ مصنف حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ بنگال میں اُردو زبان کے لئے کام کرنا ہر طرح قابلِ قدر ہے۔ کتاب جناب مصنف سے مل سکتی ہے۔

تبصرۃ الحکما معروف کلیاتِ طبِ جدیدہ: مصنفہ حکیم احمد الدین صاحب موجد طبِ جدید ایڈیٹر تبصرۃ الاطباء شاہدرہ لا

متعلق اس کتاب میں مفید معلومات درج ہیں۔ مختلف طریقہ ہائے علاج پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ طب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ بہت مفید معلوم ہوتی ہے۔ قیمت مجلد ہے۔ کتاب ضخیم ہے۔ پتہ: دار الکتب انجمن خادم الحکمت شاہدرہ لاہور۔

رومی اور اسلامی ادارۂ غلامی:۔ تفصیلی موازنہ اور تقابلی مطالعہ مرتبہ محمد حفیظ اللہ صاحب ایم اے عثمانیہ۔ قیمت ۴ر۔ پتہ: بزم قانون عثمانیہ کالج حیدرآباد دکن۔

کشف الظلام ترجمہ شفاء السقام:۔ علامہ تقی الدین سبکی کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ زیارتِ قبور، استمداد، توسّل، تشفع، حیاتِ انبیاء و شہداء، مقام محمود وغیرہ کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۱۲ر۔ پتہ: برقی پریس، سبزی باغ، بانکی پور۔

عیش دوست:۔ ایک عبرت آموز ناٹک مصنفہ پروفیسر خادم محی الدین صاحب۔ پتہ: قومی کتب خانہ لاہور۔ قیمت ۱۰ر۔ تعارف حضرت کیفی دہلوی نے کرایا ہے۔ پلاٹ میں مصنف نے اس تنقیح کو لیا ہے کہ اولاد اور بالخصوص لڑکیوں کی شادی قرار دینے کے وقت اصولاً کن امور کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

راز:۔ یہ چند افسانوں کا مجلد مجموعہ ہے، جو محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدرآباد دکن نے شائع کیا ہے۔ اس قسم کے مجموعے یہ کارخانہ آئندہ بھی بلا تعین وقت شائع کرتا رہے گا اور جو حضرات اپنے نام درج کرا دیں گے اُن کو ہمیشہ ۵ر میں پہنچاتا رہے گا۔ قیمت ہمیشہ ۵ر رہے گی۔

پیامِ عمل:۔ شائع کردہ صدیق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ۔ قیمت ۸ر۔ یہ کتاب محمد اسرائیل صاحب علی گڑھی نے مسلمانوں کی معاشرتی اور تمدنی اصلاح کی غرض سے لکھی ہے۔ اصلاح مفاسد کے خیال سے یہ کتاب مفید معلوم ہوتی ہے۔ عام مسلمانوں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

تذکرۂ سیفی:۔ طاہر سیف الدین صاحب کے دہلی و شملہ کے حالاتِ سفر۔ قیمت ۹ر۔ پتہ: مطبع نادری جبل پور۔

زوالِ غازی:۔ غازی امان اللہ خاں کے زوال کے اسباب پر اس مفصل کتاب میں عزیز ہندی صاحب نے بحث کی ہے۔ قیمت ہے۔ پتہ: ثنائی برقی پریس امرتسر۔

علامہ سیتاپوری:۔ از ڈاکٹر سید ناظم صاحب۔ ناشر: جامعہ ملیہ دہلی۔ قیمت ۴ر۔ اس کتاب میں فورٹ ولیم کالج کے رکنِ اعظم مولوی اکرام علی مترجم اخوان الصفاء کے حالات درج ہیں۔

انبساطِ روح: مصنفہ حاجی محمد عبد الغفور صاحب شتاق دشوق۔ یہ مذہبی اور صوفیانہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ کلام معمولی ہے۔ قیمت ۸ر۔ پتہ: مولوی محمد منظور فاضل صاحب اٹالہ۔ الہ آباد۔

ذکرِ نبی: سوانح رسول مقبول از نصیر الدین ہاشمی، ہاشمی صاحب مشہور مصنف اور محقق ہیں۔ یہ کتاب جس کا حجم ۱۱۶ صفحات ہے قابلِ قدر ہے۔ قیمت ۱۲ر۔ پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ مصطفےٰ بازار حیدرآباد دکن۔

ہاتھ کی عکسی تصویریں:۔ اس کتاب میں دیواروں پر ہاتھ کا سایہ ڈال کر مختلف جانوروں اور چوپایوں کی شکلیں بنانے کے

طریقے درج ہیں۔ بچوں کے لئے دلچسپ تفریحی مشغلہ ہے، کتاب میں تصویریں دی گئی ہیں۔ قیمت ۵ر۔ پتہ: ایڈیٹر صاحب انڈین ایجوکیشن لوہا شہر

دُنیا کے بچے: مختلف ممالک کے بچوں کی تصویریں اور حالات۔ بچوں کے لئے بہت دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ہے۔ پتہ: مکتبہ جامعہ مِلّیہ دہلی ۔

فہرس کتب خانہ سٹی کالج:۔ مرتبہ غلام رسُول صاحب مددگار گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد دکن۔ قیمت مجلد عاؔ۔ یہ فہرست جس سلیقہ اور حُسنِ اہتمام سے مرتّب کی گئی ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔ فہرست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سٹی کالج کا کتب خانہ بہت اچھا ہے اور لائبریرین صاحب کو کتابوں کے جمع کرنے کا خاص خیال ہے۔ فہرست کی ترتیب میں جس جدّت اور اجتہاد سے کام لیا گیا ہے وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔

حمید کے سَو شعر: ۴ر۔ از حمید صاحب لکھنوی۔ کلام اچھا ہے۔ پتہ: مینیجر نامی پریس لکھنؤ

باز کے سَو شعر: ۴ر۔ مرتبہ محمد واجد علی خاں صاحب باز۔ کلام اچھا ہے۔ کاشانۂ باز، بازار گھانسی، حیدرآباد دکن ۔

خوشۂ پروین: ۴ر۔ فضل الدین صاحب فدا دینانگری کے سَو شعر۔ بعض شعر خوب ہیں۔ پتہ بابو فضل الدین فدا، مال بابو دینانگر، گورداسپور۔

ہوش کے ناخن: دلچسپ ڈراما از مخدوم محی الدین صاحب بی اے عثمانیہ۔ حیدرآباد کی سماجی زندگی کا مرقع۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ احمدیہ پریس چارمینار حیدرآباد دکن۔

شب چراغ:۔ محمد صادق صاحب ضیاء کے نو افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت ۸ر۔ پتہ:۔ قصر الادب، دفتر شاعر آگرہ ۔

صہبائے راز: حضرت گویا جہان آبادی کی قابلِ مطالعہ نظم۔ قیمت لـر۔ پتہ: العرش پریس۔ بریلی ۔

اصلِ حیات: از حضرت گویا جہان آبادی۔ منکرینِ حیات بعد الموت کو مدلّل جواب۔ قیمت ۴ر۔ پتہ: رفارم سوسائٹی بریلی ۔

رُباعیاتِ جذب: از راگھوندر راؤ صاحب جذب۔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔ حجم ۱۰۰ صفحات۔ کلام پاکیزہ اور عارفانہ ہے۔ قیمت ۸ر

متاعِ سخن۔ انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر از ڈاکٹر محی الدین زور قادری۔ قیمت ۱۲ر۔ اُستادانہ کلام ہے۔ پتہ: کتابستان، الہ آباد (یو۔پی)

مصطفےٰ کمال پاشا۔ از سید اشفاق حسین صاحب ایم اے ہیڈ ماسٹر گوڑیانی ضلع روہتک۔ قیمت مجلد علہ ۔

زندگی: یہ مشہور جرنلسٹ مُلا رموزی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ حجم ۲۱۲ صفحات۔ قیمت عاؔ۔ پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ محمود حیدرآباد دکن

قنوج کی راجکماری۔ سنجوگتا اور پرتھی راج کا منظوم قصہ۔ قیمت ۶ر۔ پتہ: محمد اسلم خاں، صدر بازار، کرنال ۔

رموزِ کلامِ غالب:۔ از محمد اسحاق صاحب امرتسری۔ قیمت ۸ر۔ پتہ: دفتر رسالہ "ماہِ تمام" کلکتہ ۔

سید عبدالطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

R. L. No. 1363.

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ- لاہور

The Title and Picture Printed at the Half-tone Press,
Ram Nagar Langley Road, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

ہمایوں بابت ماہ جون ۱۹۳۸ء

تصویر:- جنگ کے دنوں میں

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

اُس ادیب یا ادب پسند کے لئے جسے سوائے ادب کے دنیا کی کسی اَور چیز سے واسطہ نہ ہو، ادب ایک دل خوش کُن حقیقت ہے۔ کم ازکم ایک پُرامن جائے پناہ ہے لیکن اُس کے لئے جو زندگی کے کسی اور شعبے سے بھی تعلق رکھتا ہو یا رکھنے پر مجبور ہو زندگی چین اور بے چینی کے کھلاڑیوں کے درمیان ایک جنگ یا مقابلہ ہے بلکہ اس بیان میں بھی ایک غلطی ہے۔ پورا امن شاید صرف اُس ادیب کو نصیب ہے جس کے لئے ادب دماغی عیش و عشرت ہو ورنہ کہاں زندگی کا کوئی کام اور کہاں پُورا امن ؟

اُردو کے اہل ادب اپنی غفلت یا نیکیوں میں مست تھے کہ زندگی کا ایک نیا فلسفہ اور سیاست کا ایک تازہ طوفان اُن پر ٹوٹ پڑا ورنہ وہ خوب اپنے مزے میں پڑے اپنے طرح مصرعوں پر غزلیں لکھتے اور ایک دُوسرے کے بامعنی و بے معنی کلام پر سر دُھنتے تھے نئے فلسفے نے انہیں جھنجھوڑا اور نئی سیاست نے اُن کی زبان اور رسم الخط کو جڑ سے اُکھیڑ پھینکنا چاہا۔ اُن میں سے بعض پوچھتے ہیں کہ کیا ایسی خوبصورت اور نفیس چیزوں کا یوں قلع قمع کیا جا سکتا ہے ؛ نامناسب ناممکن ! انہیں کیا معلوم کہ ان سے پہلے کتنے مغلوں اور ہلاکوؤں اور چنگیز خانوں نے کتنی نفیس و خوبصورت چیزوں کو تہِ تیغ کر ڈالا، پھر عجب کیا ہے کہ ان کی تمدنی پیداوار بھی کسی نئے قومی انقلاب کے پاؤں تلے روندی جانے والی ہو!

ڈاکٹر اقبال رح سے ان ہی مشکلوں کا چند ہی ماہ ہوئے میں ذکر کر رہا تھا اور مایوسانہ لہجے میں اُن سے اس کے متعلق رائے طلب کر رہا تھا کہ میری ساری دلایل کے مقابل میں اُنہوں نے ایک مسکراہٹ سے پنجابی میں بے تکلفی سے جواب دیا تو یہ دیا کہ ایسے ہی نہ ڈریئے آپ کی اُردو برابر قائم رہے گی!

کیا ہوگا یہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے۔ آج کل ہر لڑائی بہت سے محاذوں پر لڑی جاتی ہے اُردو کی لڑائی کے بھی بہت سے محاذ ہیں۔ ایک وہ محاذ جہاں متین ادیب اور غافل شاعر علم و ادب کے موتی بکھیرتے ہیں، جہاں بڑے بڑے عالم فاضل ہزاروں محنت کی اور اُدھ کتابیں کھولے اُردو کی نئی قاموسیں تیار کر رہے ہیں۔ ایک اَور محاذ ہے جہاں روزانہ اخبار اپنی بمباری تیار کرتے ہیں اور اپنی بندوقیں سر کرتے ہیں علمی و ادبی رسالے ان دونوں محاذوں کے درمیان میں کشمکش و پنج میں ہیں انہیں پتہ نہیں چلتا کہ امن سے ادبی کام کریں یا اپنی زبان کے لئے غُل مچائیں۔ ایک اور محاذ پر سیاست کی ہولی کھیلی جا رہی ہے ریزولیوشن ترائے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے نقص بیان کئے جاتے ہیں، کبھی تُو تُو مَیں مَیں ہے اور کبھی صلح کی گفتگوئیں ہیں، اس میں بڑے بڑے سیاست دان اور بڑے بڑے رُوحانی رہنما شامل ہیں۔ اسی طرح چند چھوٹے چھوٹے محاذ اور بھی ہیں۔

سوال تو صرف یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لئے کونسا محاذ انتخاب کرتا ہے؛ محاذ کا انتخاب لازمی ہے گو بارہا خود حالات ہی اس انتخاب کو عمل میں لے آتے ہیں اور انتخاب کنندہ مُنہ تکتا رہ جاتا ہے۔ پھر بھی سرکاری طور پر انتخاب ہوتا ہی رہتا ہے اور ہم اس سے رُوگردانی نہیں کر سکتے۔

خوش قسمت ہیں وہ جنہیں صرف ایک ہی محاذ پر کام کرنا پڑتا ہے، وہ دوسروں کی حالت سے ناآگاہ سہی لیکن انہیں ایک گونہ امن تو نصیب ہے، یکسوئی تو ہے، اپنا کام کرتے ہیں بُرا ہو یا بھلا، ایک خبط ہی سہی، ایک اعتقاد ہی سہی، اپنے دائرے میں بند ہی ہوں، غنیمت ہے کہ کچھ کر رہے ہیں اور تھوڑا بہت اطمینان رکھتے ہیں:

جو کرنا ہے تجھکو کر جو ہونا ہے ہونے دے

حضرت راحل ہوشیارپوری اپنے گرامی نامہ مؤرخہ ۲۰ مئی میں لکھتے ہیں۔

"ہمایوں بابت مئی ۱۹۳۰ء کی ترتیب خاص طور پر قابلِ تعریف ہے۔ رسالے کی ابتدا اقبال مرحوم کے ذکر سے ہوتی ہے۔ آخری مضمون بھی اقبال پر ہے۔ اس مضمون کے نیچے گرامی مرحوم کے متعلق اقتباسات۔ اس سے آگے گرامی کے آقا ذی جاہ "منظم جاہ" کا کلام۔ غالب کی سوانحعمری، غالب کے کلام سے (منقول از "شیرازہ") کے بعد مکاتیبِ غالب پر ریویو!

"بابوجی" کے بعد منظومات "اظہارِ اُلفت" اور "محبوب کی قبر پر" کے بعد "محبت کی نیرنگیاں"، "نیرنگیاں" کے بعد "کرشمہ" کیا عمدہ ترتیب ہے۔ اقبال کے متعلق اڈیٹر کی نثر اور جائنٹ ایڈیٹر کی نظم۔ پھر حامد اور حمید۔ اور راحل و حفیظ دو بھائیوں کی جوڑیاں بزمِ ہمایوں میں نظر آتی ہیں۔ "یادِ گرامی" میں گرامی کی رائے اقبال کے متعلق اور اقبال کی تصویر کے نیچے گرامی کا شعر سبحان اللہ! گرامی صاحب کے شعر اور حفیظ کی تاریخ "پیغمبرِ خودی" میں جو مناسبت ہے ظاہر ہے۔ میں اس ترتیب سے محظوظ ہؤا۔"

بشیر احمد

محمد اقبال

فنا پر خندہ زن اقبال عالی گوہری تیری
کہ ہے صورت نما اللہ کی صورت گری تیری

لرز جاتا ہے جذبِ عشقِ حق سے عرش کا پایہ
ہٹاتی ہے پرے جبریل کو بھی بے پری تیری

پھر اب کرّوبیانِ عرش کو اک سجدہ لازم ہے
عروجِ آدمِ خاکی کا زینہ رہبری تیری

انا الحق گو ہے عشقِ حق میں بندوں کی خود آگاہی
بناتی ہے خدا، انساں کو صنعت گری تیری

سکھائے چیونٹی کو تُو نے آدابِ سلیمانی
گدا ہو خسروی جس کی، وہ دولت بے زری تیری

رسول اللہ کے پیغام کی تفسیر کی تُو نے
چلی ختم الرسل کے بعد بھی پیغمبری تیری

یہ فوق الخلق تخلیق اور یہ صد جلوہ پیدائی
مسلّم ہے جہانِ شاعری میں داوری تیری

۱۸ مئی ۱۹۳۸ء

حامد علی خاں

(۱)

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبال

(۲)

ہماری نے نواز آئے نہ آئے
دلوں میں پھر گداز آئے نہ آئے
سکندر تو ابھی آئیں گے لاکھوں
کوئی آئینہ ساز آئے نہ آئے

حامد علی خاں

(۳)

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس نہ دانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

اقبال

(۴)

خودی کا اور جہاں کا رازداں تو
زبانِ سلسلہ کا ترجماں تو
پیامبر اب تیری بیداریات
چراغِ فکر فروزِ دیں زماں تو
نقیبِ مہدیِ آخر زماں تو

حامد علی خاں

جہاں نما

اتحادِ ہندو مسلم اور آزادئ ہندوستان

غلام قوموں کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہوتی ہے کہ اپنے دورِ زوال میں اُن کا ہر عمل شعوری یا غیر شعوری طور پر غیر ملکی آقاؤں کے مصالح کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس سے زیادہ تکلیف دہ یہ بات ہوتی ہے کہ جو لوگ آزادی حاصل کرنے کے لئے بیقرار نظر آتے ہیں وہ خود بھی حکمرانوں کے پیدا کیے ہوئے فریبوں کا اس طرح شکار ہوجاتے ہیں کہ خود اُن کے اعمال ہی اپنی غلامی کی بنیادوں کو اور زیادہ استوار کرنے لگتے ہیں۔ حاکم قوم دستورِ حکومت میں بعض ایسی خصوصیات رکھ دیتی ہے جن سے اہلِ ملک میں چھوٹے چھوٹے معاملات کے متعلق اندرونی جھگڑے پیدا ہوجاتے ہیں۔ فریب خوردہ عوام اور اُن سے بڑھ کر اُن کے رہنما موہوم اور بے حقیقت مقاصد کے اس دامِ فریب میں یوں گرفتار ہوجاتے ہیں کہ آزادی کا اہم ترمقصد نظر انداز ہوجاتا ہے۔ جب کبھی غلاموں میں آزادی کا ولولہ پیدا ہوتا ہے حکمران قوم ہمیشہ ایک نیا دام پھیلا دیتی ہے اور قیامت یہ ہے کہ غلام اس دام کی حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود بھی اس میں گرفتار ہونے کے لئے کھنچے چلے آتے ہیں ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

۱۹۱۹ء کے فسادات کے بعد جو بیداری اس ملک میں پیدا ہوئی تھی اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ یہ ایک خدا ساز بات تھی کہ ہندو اور مسلمان کچھ دیر کے لئے آپس میں مل بیٹھے تھے لیکن مغربی سیاست نے جلد ہی اپنی زنبیل سے مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات کی ہڈی نکال کر ان کے سامنے ڈال دی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں مُردار کی اس بے مغز خشک ہڈی کو چچوڑنے کے لئے بیقرار ہوکر ناخن و چنگال سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوگئے اور دونوں طرف کے بڑے بڑے لیڈر بھی اس ہنگ میں شامل نظر آئے۔ دیکھتے دیکھتے وہ اتحاد خواب و خیال ہو گیا جس کی برکت سے ملک نے اس قدر طاقت پیدا کر لی تھی کہ زاعنہ وقت بھی "ننگے فقیروں" کے سامنے جھکنے لگے تھے اور آزادی کی منزل آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔

اس کے بعد جب غلامی کی پرانی شراب آئینِ جدید کی نئی بوتل میں ڈال دی گئی تو ملک اور زیادہ بدمست ہوگیا۔ یہ حقیقت سب نے فراموش کردی کہ طاقت پیدا کئے بغیر کبھی کوئی "داتا" آزادی نہیں دیا کرتا اور طاقت اتحاد اور ایک متحدہ محاذ کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی ملک کی فعال ترین جماعت کا یہ زوال بہت عبرت ناک ہے کہ وہ اپنے بلند مقاصد کو بھول کر جھوٹی آزادی کے کھلونے سے بچوں کی طرح کھیلنے لگی ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ملک اگر آج پوری طرح متحد ہو جائے تو ہمارے مطالبات کے تسلیم کر لئے جانے میں بہت زیادہ تعویق نہ ہوگی۔ لیکن مغربی سیاست کے نت نئے ہتھکنڈے ملک کے ہر فرقے کو اتحاد کی نعمت سے دور ہی دور لے جا رہے ہیں ۔

اس سلسلے میں ہندو قوم کی حالت سب سے زیادہ افسوسناک ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ سب سے زیادہ غافل ہے بلکہ اس لئے کہ وہ سب سے زیادہ بیدار ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُس عالی حوصلگی سے کام نہیں لیتی جس کی وہ اہل ہے۔ ہندوؤں کو اس ملک میں محض عظیم ترین اکثریت ہی حاصل نہیں بلکہ وہ ہر لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں، علم، تجارت، دولت، سیاسی تدبر، سیاسی اقتدار، ہر میدان میں وہ آگے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اقلیتوں سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ اگر اقلیتوں کے مطالبات اپنے حدود سے متجاوز بھی ہوں اور ہندو قوم اتحاد و یگانگی کے اہم مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ایک بڑے بھائی کی طرح عالی حوصلگی سے کام لے کر انہیں تسلیم بھی کر لے تو اس کی ہستی کسی طرح خطرہ میں نہیں پڑ سکتی۔ ہندوؤں کو ملک میں اتنی عظیم اکثریت حاصل ہے کہ اگر وہ بلا وجہ بزدل نہ بنیں تو کوئی اقلیت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی خواہ وہ اپنے تناسب آبادی سے کچھ زیادہ حقوق ہی کیوں نہ حاصل کر لے ۔

اقلیتوں کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں جس ملک کی قوی ترین اور روشن خیال ترین اکثریت اتنی بزدل اور تنگ حوصلہ ہو اس کی پسماندہ اقلیتوں کا جو حال ہو سکتا ہے ظاہر ہے ؏

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

ملکی جمعیت کا موجودہ انتشار ہماری غلامی کی زنجیروں کو روز بروز زیادہ مضبوط کر رہا ہے اور اس انتشار کی سب سے بڑی ذمہ دار ملک کی بیدار ترین فعال جماعت ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ یہ جماعت عملاً نااتفاقی کی تلقین کرتی ہے بلکہ افسوس یہ ہے کہ اس جماعت نے اتحاد کے مقصد عظیم کو ایک عرصے کے لئے پس پشت ڈال دیا اور اس سے قطعاً غافل ہو گئی۔ حالانکہ اس کا سیاسی تدبر اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ایثار اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کر کے ملک کی تمام جماعتوں کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیتی اور ایک متحدہ ہندوستان آزادی کی منزل کی طرف برابر جادہ پیما رہتا۔

ہندوستان کا مستقبل

گذشتہ دنوں ہندوستان کے موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو نے یہ حقیقت بیان کی کہ "ہماری صوبجاتی حکومتوں کو جو قوت حاصل ہے اس کا ماخذ نظامِ حکومت نہیں بلکہ خود کانگرس کی تنظیمی قوت ہے، جنگ اور انقلابات کے اس دور میں کوئی بات بعید از امکان نہیں۔ اس زمانے میں ہمارے بچاؤ کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم پُرامن رہ کر اپنی اندرونی طاقت بڑھاتے رہیں۔ لیکن کوئی راستہ خطرات سے خالی نہیں ہوتا اس لئے ہمیں گوناگوں دشواریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت مستعد رہنا چاہیئے ہمارے راستے میں کچھ کم رکاوٹیں نہیں ہیں۔ غیروں کی مخالفت سے زیادہ ہمیں اپنی اندرونی کمزوریوں کے خلاف جدوجہد کرنی ہے۔ کسی دشمن کے

خلاف لڑنے کے مقابلہ میں اپنی کوتاہیوں کے خلاف جہاد کرنا زیادہ دشوار ہوتا ہے ہمیں دونوں طرح کا مقابلہ درپیش ہے۔ ہمارے اندر بہت سی سماجی خرابیاں ہیں جنہیں قدیم رسم و رواج اور عقاید نے غیر معمولی تقویت بہم پہنچا رکھی ہے۔ بہ حالات موجودہ یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ ہم میں اب ایک نئی بیداری ضرور پیدا ہو رہی ہے۔ فضا میں انقلاب کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں۔ غربا اپنی فاقہ کشی اور مصیبت کا خاتمہ کر دینے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دنیا بھر پر جنگ کے مصائب اور جنگ کے خطرات کے بادل چھا رہے ہیں۔ ہندوستانی اب پہلے کی طرح دوسروں کے ہاتھ میں آلۂ کار راری بنے رہنے پر تیار نہیں۔ یہ ملک اب خود اپنی قسمت کا مالک بننا چاہتا ہے، ہندوستان اگرچہ مشینوں اور کارخانوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا مگر وہ انہیں اس زمانے میں ترقی کا ایک ناگزیر ذریعہ ضرور سمجھتا ہے اور وہ ان کے وجود کو کسی نہ کسی طرح اپنے معتقدات سے ہم آہنگ کرنے کا خواہشمند ضرور ہے۔ ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ زراعتی مسئلہ ہے بڑے بڑے زمینداروں کا اجارہ غریب کاشتکاروں کی ترقی کے راستے میں بری طرح حائل ہے ایک زبردست زراعتی انقلاب کے بغیر اس مصیبت کا علاج ممکن نہیں لیکن زراعتی انقلاب کے باوجود بھی شہری اور قصباتی بے روزگاروں کی ایک کثیر تعداد موجود رہے گی جن کے لئے کام کرنے کے لئے صنعتی کارخانوں کی تنظیم کی ضرورت ہوگی ۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر

سنہ ۱۹۰۶ء —— نواب وقارالملک —— ڈھاکہ
سنہ ۱۹۰۷ء —— آدم جی پیر بھائی —— کراچی
سنہ ۱۹۰۸ء —— سر سید علی امام —— امرتسر
سنہ ۱۹۰۹ء —— ہز ہائی نس آغا خاں —— دہلی
سنہ ۱۹۱۰ء —— سید نبی اللہ —— ناگپور
سنہ ۱۹۱۱ء —— نواب سلیم اللہ —— کلکتہ
سنہ ۱۹۱۲ء —— میاں سر محمد شفیع —— لکھنؤ
سنہ ۱۹۱۳ء —— سر ابراہیم رحمت اللہ —— آگرہ
سنہ ۱۹۱۵ء —— مسٹر مظہر الحق —— بمبئی
سنہ ۱۹۱۶ء —— مسٹر محمد علی جناح —— لکھنؤ
سنہ ۱۹۱۷ء —— مولانا محمد علی (نظر بند ہو گئے) —— کلکتہ
—— راجہ محمد علی محمد خاں ——
سنہ ۱۹۱۸ء —— مسٹر اے کے فضل الحق —— دہلی
سنہ ۱۹۱۹ء —— حکیم اجمل خاں —— امرتسر
سنہ ۱۹۲۰ء —— ڈاکٹر مختار احمد انصاری —— ناگپور
سنہ ۱۹۲۱ء —— مولانا حسرت موہانی —— احمد آباد
سنہ ۱۹۲۳ء —— مسٹر غلام محمد بھرگری —— لکھنؤ
سنہ ۱۹۲۴ء —— سر سید رضا علی —— بمبئی
سنہ ۱۹۲۵ء —— سر عبدالرحیم —— علی گڑھ
سنہ ۱۹۲۶ء —— شیخ سر عبدالقادر —— دہلی
سنہ ۱۹۲۷ء —— مولوی سر محمد یعقوب —— کلکتہ
سنہ ۱۹۲۸ء —— سر محمد علی محمد خاں —— کلکتہ
سنہ ۱۹۲۹ء —— ڈاکٹر سر محمد اقبال —— الہ آباد
سنہ ۱۹۳۱ء —— چودھری سر ظفر اللہ خاں —— دہلی
سنہ ۱۹۳۳ء —— میاں عبدالعزیز —— کلکتہ
سنہ ۱۹۳۴ء —— خان بہادر حافظ ہدایت حسین —— دہلی
سنہ ۱۹۳۶ء —— سر سید وزیر حسین —— بمبئی
سنہ ۱۹۳۷ء —— مسٹر محمد علی جناح —— لکھنؤ
سنہ ۱۹۳۸ء —— مسٹر محمد علی جناح —— کلکتہ (اجلاس خاص)

مرحوم اقبال کی یاد میں

(ایک نوعمر طالب علم کے جذبات)

عجب دُر دلیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد ۔ وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

آہ! اقبال ملتِ اسلامیہ کی تمناؤں کے مرکز، قوم کی کشتی کے ناخدا۔ مردہ روحوں میں زندگی کا لہو دوڑانے والے، خودی کے پیام بر، فخرِ ایشیا۔ تو ہمیں داغ مفارقت دے گیا۔ ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء تاریخ عالم میں ایک غم افزا دن شمار ہوگا۔ آئندہ نسلیں اِس دن کو یاد کر کے خون کے آنسو بہائیں گی۔ یہ منحوس دن، غم سے بھرپور دن ہمارے غموں میں اور اضافہ کر گیا۔

افسوس! ہمیں خودداری کا سبق دینے والا اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونے کی تلقین کرنے والا خود اُس دُنیا میں جا بسا ہے جہاں جو جاتا ہے پھر واپس نہیں آتا۔

اقبال کی شاعری کا ایک ایک لفظ جیتے جاگتے معلم کی طرح خودداری کا سبق دیتا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

نیز ؎ خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض ۔ نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

بالِ جبریل کی آخری نظم "چیونٹی اور عقاب" ہماری آنکھیں کھول دیتی ہے، گویا تمام تاریخِ اسلام ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور وہی پرانا سبق نئے رنگ میں دُہرایا جاتا ہے۔

چیونٹی

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب

تُو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

ترجمانِ حقیقت نے صرف خودداری کا سبق ہی نہیں دیا بلکہ زندگی کے ساتھ زندہ دلی کی تلقین بھی کی ہے ؎

دلِ مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ ۔ کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

مرحوم اقبال سچا محبِ وطن تھا۔ وہ غلامی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اس کے رگ و ریشہ میں آزادی کی محبت سرایت کر چکی تھی۔ اس نے شہنشاہی کا طلسم توڑ کر رکھ دیا ہے

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیہ اِنَّ الْمُلُوْک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری

وہ مسلمان کے افلاس سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ اُس کی جہالت، پیر پرستی کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ خوابیدہ مریدوں کی بیداری کا نقشہ کس جوش سے دکھایا ہے

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دِیا بھی　　　گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

آہ! او دُنیائے حاضر کے سب سے بڑے انسان، اب ہم ہمیشہ کے لئے تیرے کلام سے محروم کر دیئے گئے۔ او محسنِ اعظم تُو قوم کا حقیقی معنوں میں لیڈر تھا۔

تیری زندگی قوم پر قربان ہوئی۔ تُو نے سوتی ہوئی قوم کو جگایا۔ مُردہ روحوں میں زندگی کی لہر دَوڑا دی۔

اقبال! تُو صبر و استقلال کا دیوتا تھا، تُو نے آخری دم تک ملک و قوم کی خدمت سے جی نہ چرایا۔ تجھ کو یقین تھا کہ اب میں کوئی دم کا مہمان ہوں لیکن پھر بھی تُو نے اپنا کام جاری رکھا اور ملت پر جان نثار کی۔

اقبال! موت سے پہلے جو الفاظ تیری زبان سے نکلے وہ ہمارے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہیں گے "مَیں مسلمان ہوں مَیں موت سے نہیں ڈرتا۔ جب موت آئے گی مَیں متبسم چہرے کے ساتھ اس کا خیر مقدم کروں گا"

مرنا سب کو ہے۔ دُنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ غیر فانی صرف خدائے واحد کی ذات ہے۔ لیکن تیرے جانے سے جو نقصانِ عظیم قوم کو پہنچا ہے اُس کی تلافی ناممکن نظر آتی ہے۔

او دلیر حوصلہ رکھنے والے رہنما! قوم کے حقیقی بہی خواہ! الوداع! ہمیشہ کے لئے اور آخری الوداع!

محمد افتخار الحق
از خوشاب

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر　　　یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا (اقبال)

زندۂ جاوید اقبال

قطعہ

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا
احساس میں سما گیا، دِل میں اُتر گیا!
کُنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر
قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا!
کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا
ویرانۂ فنا سے سلامت گزر گیا!
باغِ جہاں میں صورتِ گلہائے تر رہا
باغِ جناں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا!
خاکِ چمن میں گوہرِ شبنم نہاں نہیں
خورشید جلوہ بار سے پوچھو کدھر گیا؛
"ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق"
روشن تر اِس حقیقت روشن کو کر گیا!
محروم! کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو
یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا!

تلوک چند محروم

ہندوستان کی مشترکہ زبان

خدا معلوم کیونکر آگئی اردو زباں مجھکو   میں کسرائی، وطن طہران، مسکن گونڈوانے میں

(نرگس خانم پروین بنت مرزا عاشق حسین بزم مرحوم)

حقیقت یہ ہے کہ صرف اُردو ہی ہندوستان کی مشترک زبان (لنگوا فرینکا) بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور صلاحیت کا کیا ذکر ایک بڑی حد تک وہ لنگوا فرینکا بن چکی ہے۔

مسٹر گولڈسٹریم آئی سی ایس (ریٹائرڈ)

(ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ میں اب سے تقریباً سولہ برس پیشتر)

زبان کا مرتبہ

تمام دُنیا کے کاموں میں اپنی زبان کا مرتبہ سب سے بڑا ہے۔ اور زبان کا مدار نازک بیانی و پاکیزہ خیالی پر ہے۔ میں اپنی زبان پر اپنا وقت اور روپیہ خرچ کرنا تمام ملکی و قومی نیکیوں سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں اور کتنی ہی زیر باری اور دردِ سر ہو اس مشغلہ کو اعلیٰ درجہ پر پہنچائے بغیر نہ رہوں گا۔

اُردو کا قصور صرف یہی ہے کہ آپ کی زبان ہے۔ اور کسی کی ہوتی تو خدا جانے کس مرتبہ کو پہنچ جاتی۔

خان بہادر میر ناصر علی مرحوم

صدائے بازگشت

"جس طرح اُردو زبان ہندو مسلمان دونوں قوموں کی زبانوں سے مرکب ہے، اسی طرح انجمن ترقی اُردو دونوں قوموں سے یکساں تعلق رکھتی ہے اور دونوں قوموں کا فرض ہے کہ زبان اُردو کو وسیع معنوں میں قومی زبان یا ملکی زبان تصور کر کے اس کو ترقی دینے کی کوشش کریں اور یہ زبان جس اتحادِ اقوام کی یادگار ہے اُس کو دونوں قومیں مل کر زندہ اور تازہ رکھنے میں ذرا کوتاہی نہ کریں۔ لیکن فرض کرو کہ دوسری قوم جس کے ساتھ ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے اور جو اُردو زبان پر وہی حق رکھتی ہے جو ہمارا حق ہے، اس حبِ وطن کی منزل میں کسی خاص وجہ سے ہمارا ساتھ نہ دے، جس کو میں بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا، تو پھر اے فرزندانِ اسلام! تم اپنے فرض سے کیوں غفلت کرو۔ تم اس محبوب زبان کو ترقی دینے اور اس کو بلند ترین درجہ تک پہنچانے میں کیوں کوتاہی کرو۔ یاد رکھو کہ اگر تم اپنا فرض ادا کرو گے اور اپنی جدّ و جہد سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹو گے اور اپنے اس قومی یا ملکی منصوبہ کو پیشِ نظر رکھ کر برابر آگے بڑھتے اور منزلِ مقصود کے قریب پہنچتے جاؤ گے تو وہ جو کسی غلطی سے اصلی شاہراہ کو چھوڑ کر کسی اور پگڈنڈی پر چل پڑے ہیں اور وہ جو کوتاہ بینی یا غفلت سے بھائیوں کا ساتھ چھوڑ کر منزل سے دُور جا رہے

لہ ان کا سلسلۂ نسب کسریٰ شہنشاہِ ایران سے ملتا ہے اور ان کی والدہ یوروپین تھیں۔

ہیں تمہارے نقشِ قدم کو پھر تلاش کریں گے، تمہارے قافلہ کے جرس کی صدا پر پھر کان لگائیں گے، تمہاری گردِ راہ کی پرواز کو آنکھیں کھول کر اور دُور بین لگا کر دیکھیں گے۔ اپنی پگ ڈنڈی کے انجام پر منزلِ مقصود کو نہ پا کر پھر اس اصلی شاہراہ پر آ ہوں گے۔ اُس وقت سمجھیں گے کہ نجات کا آبِ حیات جس کی تلاش میں وہ نکلے تھے تعصب و نفاق کے رستے پر چل کر اس کے کنارے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس وقت وہ دَوڑ دُھوپ کریں گے تاکہ خضرِ اتحاد کا سُراغ لگائیں اور اس کی دستگیری سے آبِ حیات کے چشمے تک پہنچیں۔

پس اے فرزندانِ اسلام! تمہارا فرض ہے کہ اُس وقت کے آنے تک اپنے فرض کے انجام دینے میں سرگرم رہو اور پیچھے پھر پھر کر اپنے بھائیوں کو دیکھتے جاؤ اور یہ خیال دل میں رکھو کہ آخر وہ بھائی ہیں، برادرانہ محبت کا جوش کب تک ان کے دلوں کو بے چین نہ کرے گا، غلط فہمیوں کا غبار کب تک ان کی آنکھوں کو دُھندلا کرتا رہے گا، کب تک وہ یہ نہ جانیں گے کہ جس منزل پر تم چل رہے ہو اُس پر تمہارے اور اُن کے آبا و اجداد پہلے عرصۂ دراز تک چلتے رہے ہیں کب تک وہ یہ نہ سمجھیں گے کہ تمہارے اور اُن کے اسلاف دونوں نے مِل کر اس رستے کو خس و خاشاک سے پاک کیا تھا۔ اس کے نشیب و فراز کو ہموار کیا تھا۔ اس کے کناروں پر جا بجا سنگِ نشان قائم کئے تھے، پھر دونوں طرف کوسوں تک پھولوں اور میووں کے درخت قطار در قطار لگائے تھے۔ اب یہ وہی منزل ہے جس میں تم آگے بڑھنا چاہتے ہو اور تمہارے بھائی اس منزل کے سرے سے دوسرا رستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اپنی نئی پگ ڈنڈی کی داغ بیل ڈال کر اس کو اس منزل کی طرح آراستہ و پیراستہ کرنا چاہتے ہیں۔ آخر کب تک یہ تنگ مزاجی اور تنگ چشمی باقی رہے گی کب تک سرد مہری اور بے پروائی سے کام لیا جائے گا۔ بڑھو! آگے بڑھو!! نہ اپنے فرض کو بھولو اور نہ اپنے بھائیوں کو بھولو۔ وہ وقت آج نہیں تو کل ضرور آئے گا جبکہ ہمارے بھائی اسی منزل کو پھر محبت کی نگاہ سے دیکھیں گے جس پر ہم اور اُن کے آبائے کرام مدت تک گامزن رہے ہیں۔"

مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم

(از خطبۂ صدارت انجمن ترقیٔ اُردو، سالانہ اجلاس بمقام سُورت ۱۹۲۱ء)

راحل ہوشیارپوری

اقبال کے آخری لمحات

دل بجھ رہا ہے آنسو آنکھوں سے بہ رہے ہیں
اقبال سب سے رخصت ہو کر یہ کہہ رہے ہیں

پھر نیند میں خودی کو اپنی سُلا نہ دینا
میرا پیام دل سے اپنے بھُلا نہ دینا

بجھتا ہے دل تو کیا غم، آنسو بہیں تو بہہ لیں
اک بات وقتِ آخر ہم تم سے اور کہہ لیں

میری نوائے دل پر تم دِل سے غور کرنا
خود دار بن کے جینا خود دار بن کے مرنا

دِل بجھ چکا ہے آنکھیں بھی خوب رو چکی ہیں
سیلِ سرشکِ غم سے دامن بھگو چکی ہیں

اِک دِلرُبا اندھیری ہر سمت چھا رہی ہے

خوابِ فنا کی پیاری سی نیند آ رہی ہے

ہم طوفِ شمعِ وحدت کا قصد کر رہے ہیں

اپنی خودی سے بھی اب آگے گزر رہے ہیں

خوش ہیں کہ سونے والو تم کو جگا کے چھوڑا

تُم کو خودی سے اپنی آگہ بنا کے چھوڑا

کیا خوفِ مرگ ہم کو زندہ ہیں سب کے دِل میں

رہتے ہیں عزم بن کر ہر قلبِ مضمحِل میں

دُنیا میں تھے وطن تھا سارا جہاں ہمارا

عقبیٰ میں ہیں وطن ہے کون و مکاں ہمارا

صد شُکر پیشِ حق بھی ہم نیک نام پُہنچے

لمحاتِ آخری کا سب کو سلام پُہنچے

مقبول

ندوستان کے آئینِ نو میں گورنر کے اختیارات

آئین جدید دو خصوصیتوں کا حامل ہے - اوّل فیڈریشن، دوم صوبجاتی خودمختاری - اوّل الذکر یعنی برطانوی اور ریاستی
فاق ابھی تک عمل میں نہیں آیا، مگر صوبجاتی خودمختاری کا یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو سرکاری طور پر نفاذ کیا گیا - سطورِ ذیل میں صوبجاتی
کے سب سے اہم جزو یعنی گورنر کے اختیارات اور اُس کی آئینی حیثیت پر بحث کی گئی ہے - یہ سوال اس لئے اور بھی
یا کہ پچھلے دنوں کانگرس نے بھی (جو ہندوستان کی سب سے بڑی منظم سیاسی جماعت ہے) کچھ پس و پیش کے بعد نئے
کے ماتحت وزارتیں قبول کر لی ہیں - کانگرس کا سب سے بڑا اعتراض گورنر کے اختیارات کے متعلق تھا، وہ چاہتی تھی
وزراء کی آئینی کارروائیوں میں مداخلت نہ کرے - گورنر کے اختیارات کی کیا نوعیت ہے؛ اور کیا واقعی گورنر کی مداخلت
نان کے قومی و ملکی مفاد کے لئے ضرر رساں ہے؛ ان دو سوالوں پر ہمیں بحث کرنا ہے:-

ظاہر ہے کہ یہ سوال آئینی پیچیدگیوں سے خالی نہیں اور ان پر کوئی قطعی حکم لگانا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ ان سوالوں کا
بن کے عملی پہلو سے ہے نہ کہ نظری سے - جب تک ہمیں نئے آئین کا عملی تجربہ نہ ہو ہم قطعی طور سے اس کے اثرات کو
جانچ سکتے تاہم اُن آئینی دفعات سے جو گورنر کے اختیارات اور ذمہ داریوں کی تشریح کرتے ہیں کچھ نہ کچھ نتائج مرتب
سکتے ہیں جو ظاہر کریں گے کہ کہاں تک گورنر کی مداخلت ہمارے سیاسی ارتقاء اور قومی مصالح کے مفید یا مُضر ثابت ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ صوبجاتی خودمختاری سے کیا مراد ہے؛ برطانوی پارلیمنٹ کی ہمیشہ یہ حجت رہی ہے
روبارِ سلطنت میں ہندوستانیوں کو تعلیم دے گی تاآنکہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ اُن کے ملک کی حکومت اُن کو سونپ دی
- اس سیاسی تعلیم کی پہلی قسط ۱۹۱۹ء کا آئین تھا جس کے ماتحت صوبوں میں "دوعلی" حکومت کا نفاذ کیا گیا - مسٹر مانٹیگو
ڈ چیمسفورڈ کا خیال تھا کہ صوبوں میں اس قسم کی تعلیم بہتر اور زیادہ خوشگوار نتائج پیدا کرے گی، لہٰذا مرکزی حکومت کو چھوڑ
یمنٹ نے ہندوستانیوں کو صوبوں میں محدود سیاسی قوت دی - سائمن کمیشن نے بھی صوبجاتی تجربہ کی سفارش کی اور جب
ن کی ترتیب و تدوین کا کام شروع ہوا تو سلیکٹ کمیٹی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ مرکز کو چھوڑ کر صوبوں میں ہندوستانی
وسونپ کی حکومت دینی چاہیے - اس پالیسی کے زیرِ اثر موجودہ آئین پرانی دوعملی کو رد کر کے تمام سیاسی قوت ہندوستانی
کے سپرد کرتا ہے - یہ ہندوستانی وزراء ان محکموں کی نگرانی اور انتظام کے لئے جو نئے آئین کے ماتحت انہیں سپرد

کیے گئے ہیں ایک ایسی مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہیں جو عوام کی نمائندہ تصور کی جاتی ہے۔

یہ حکومت خود اختیاری کی ابتدا ہے۔ رفتہ رفتہ جب ہندوستانیوں میں حکمرانی کی استعداد، برطانوی تدبر و سیاست کے معیار کے مطابق پیدا ہو جائے گی تو حکومت اُن کو سپرد کر دی جائے گی ــــ اور وہ پابندیاں جو کسی نہ کسی مصلحت کے زیر اثر آج کل ہندوستانی وزراء پر عائد کی گئی ہیں، ہٹالی جائیں گی۔ یہ منتہا ہوگا ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کا ــــ آئین جدید صوبے کے نظم و نسق کا افسر اعلیٰ گورنر کو تصور کرتا ہے۔ گورنر شہنشاہِ ہند کا نمائندہ ہے، گورنر کو مشورہ دینے کے لئے وزراء کا ایک کابینہ ہوگا جو ہر معاملہ میں گورنر کی راہنمائی کرے گا ماسوا اُن مخصوص حالات کے جن میں پارلیمنٹ کی طرف سے گورنر پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اپنے ذاتی فہم و منشا کے مطابق عمل کرے۔ بظاہر صوبے میں پولیس، عدالت، مالیات، تعلیم وغیرہ سب کا انتظام ایسے وزیروں کو سپرد کیا گیا ہے جو عوام کی رائے کے مطابق چُنے گئے ہیں اور جو عوام کی نمائندہ مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہیں یہاں تک کہ اگر عوام کی نمایندہ یہ جماعت وزراء کے کام سے مطمئن نہ ہو تو وہ ان کے اختیارات سلب کر سکتی ہے اور اُن کے بجائے ایک زیادہ معتبر جماعت کو حکومت دے سکتی ہے۔

آئین کی دفعات کے سرسری مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا گورنر کے اختیارات ایک نگراں کی حیثیت سے زیادہ نہیں مگر ایک عمیق نظر بتا سکتی ہے کہ حقیقت کچھ اَور ہے اور باوجود اس کے کہ تمام قوت ہندوستانی وزراء کو تفویض کر دی گئی ہے گورنر کے اختیارات اس قدر وسیع ہیں کہ وہ صوبے کے ہر انتظامی شعبہ میں مداخلت کر سکتا ہے۔ . . . . .

گورنر کی قوت تین حصّوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے: ۱۔ گورنر کی مخصوص ذمہ داریاں، ۲۔ خصوصی اختیارات، ۳۔ گورنر کی آئین سازی کی قوت۔

ذیل کے تبصرہ میں بجائے اس کے کہ ہر قوت پر جُداگانہ بحث کی جائے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان سب قوتوں کا ایک ہی جگہ ذکر کر دیا جائے جن کی بدولت گورنر کسی معاملہ میں مداخلت کر سکتا ہے۔

گورنر کی سب سے پہلی ذمہ داری صوبہ میں ہر امن سوز تحریک یا قوت کا انسداد کرنا ہے، ظاہر ہے کہ امن کا تعلق صوبے کے انتظام سے ہے لہٰذا یہ ذمہ داری اُس وزیر پر عاید ہونی چاہئے جو صوبہ کی پولیس، عدالت اور اُس کے ضمنی اداروں کے انتظام کے لئے مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہے مگر ایسا نہیں کیا گیا، لہٰذا باوجود اس کے کہ ایک ہندوستانی وزیر صوبہ کا منتظم ہوگا، پھر بھی وہ اپنی ذمہ داری پوری طرح محسوس نہ کرے گا کیونکہ آخری ذمہ داری گورنر پر عاید ہوتی ہے اور گورنر حکومت کے ہر شعبہ میں اس ذمہ داری کی بدولت مداخلت کر سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں وزیر کا کوئی حکم صوبہ کے امن کے لئے خطرناک ہوگا اور واضح رہے کہ اس بات کا فیصلہ کہ کوئی چیز گورنر کی مخصوص ذمہ داریوں کے تحت میں آتی ہے صرف گورنر پر منحصر ہے

اور اُس کا فیصلہ کسی عدالت میں نہیں جانچا جا سکتا۔) مزید برآں گو پولیس وزیر کے دستِ اختیار میں ہے تاہم اُس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ پولیس کے انتظام یا بھرتی کے لئے کوئی قانون بنائے۔ یہ اختیار صرف گورنر کو ہے۔

فرض کیجئے کہ کسی صوبہ میں انارکسٹ صوبہ کے امن میں خلل اندازی کرتے ہیں، قدرتاً وزیرِ انتظامیہ کا فرض ہے کہ وہ ایسی خلافِ قانون کارروائیوں کا انسداد کرے۔ مگر ایسا نہیں۔ نیا آئین گورنر کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر اپنی مخصوص قوتوں سے کام لے اور اپنے کابینہ کے مشورہ کے بغیر جو مناسب سمجھے کرے، وزیرِ انتظامیہ کو اتنا بھی حق نہیں کہ وہ گورنر کو رائے دے ایسی نہیں بلکہ آئین اجازت دیتا ہے کہ ایسے حالات میں گورنر ایک خاص افسر انارکسٹ فتنہ کے انسداد کے لئے مقرر کر سکتا ہے یہ افسر مجلسِ قانون ساز کا ممبر ہوگا، وہاں ہر بحث میں اور اجلاس کی عام کارروائی میں حصہ لے سکتا ہے اُس کے اختیارات ایسے ہی ہیں جیسے کہ ایک منتخب شدہ ممبر کے ..... (مگر یہ افسر کسی معاملہ میں رائے نہیں دے سکتا) آئین کی یہ دفعہ صاف ظاہر کرتی ہے کہ ابھی تک ہندوستانی وزرار اس قابل نہیں کہ اُن پر اعتماد کیا جا سکے۔ بجائے اس کے کہ ہر معمولی انتظام کی طرح انارکسٹ جیسے فتنوں کا انتظام بھی وزیر کے سپرد کیا جائے آئین ایک نئی مشین بہم پہنچاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجلس قانون ساز کا منتخب کردہ نمائندہ (وزیرِ انتظامیہ) مجلس کی بحث و تنقید سے بچ جاتا ہے۔ اس کے بجائے ایک خاص افسر گورنر کی کارروائیوں کی وضاحت کرے گا۔ ایسا افسر کہاں تک اپنی ذمہ داری محسوس کرے گا، اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

اس خیال کی تائید کہ نیا آئین ہندوستانی وزرار پر زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہتا اس سے ہوتی ہے کہ خفیہ پولیس کی تمام کارروائیاں سینۂ راز میں رکھی جائیں گی اور کوئی شخص اُن تک راہ نہیں پا سکتا حتےٰ کہ وزیرِ انتظامیہ خود ــــ البتہ صرف وہ پولیس افسر جنہیں انسپکٹر جنرل اجازت دے یا وہ اشخاص جن پر گورنر کی نظرِ کرم ہو خفیہ پولیس کی کارروائیوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

ہندوستانی وزیر کے ہاتھ سے انتظامی ادارہ کی اصلی قوت چھین لینے کے لئے یہی کافی تھا کہ صوبہ کا انتظام اور امن گورنر کی مخصوص ذمہ داری بنا دیا جائے، اُس پر خصوصی اختیارات دینا اور وزیر کو خفیہ پولیس کی کارروائیوں سے دُور رکھنا، نئے آئین کو نہایت غیر مرغوب رنگ میں ظاہر کرتا ہے۔

گورنر کی دوسری ذمہ داری اقلیتوں کی جائز خواہشات کا تحفظ ہے ــــ اس ضمن میں یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ اقلیت سے کیا مُراد ہے۔ اقلیت معاشی، مذہبی، لسانی ..... کئی حیثیت سے تصور کی جا سکتی ہے۔ غالباً ہندوستان میں اقلیت سے مُراد ایک مذہبی گروہ سے ہے۔ یہ اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ کب اور کس طرح ہندوستانی سیاست کا "لاینحل" مسئلہ بنا، یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہیں۔ غالباً ۱۹۰۶ء سے پہلے یعنی سر علی امام اور سر آغا خاں کے شملہ ڈیپوٹیشن سے پہلے ہندوستانی لفظ اقلیت سے بھی شناسا نہ تھے۔ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے سامنے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کا خیال ہوا اور اُنہوں نے لارڈ منٹو سے درخواست

کی کہ وہ ان کے مفاد کا تحفظ آئینی شکل میں کریں۔ لارڈ منٹو نے اُن کے اس مطالبہ کو منظور کیا اور آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان جداگانہ نیابت اور انتخاب کے حقدار ہیں ـــــ قومی سیاست کو اس قسم کے تحفظات سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اُس پر بحث کرنا موجودہ موضوع سے خارج ہے۔ مگر اس کا قدرتی نتیجہ جو جلد یا بدیر ظاہر ہونے والا تھا وہ یہ ہوا کہ اب دوسرے مذہبی گروہ بھی اپنے مخصوص مفاد کو آئینی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان مطالبات کا نتیجہ "کمیونل اوارڈ" ہے۔ یہی نہیں بلکہ نیا آئین نسلی اقلیت کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اینگلو انڈین جماعت کو ریلوے ملازمتوں پر خاص حقوق عطا کیے گئے ہیں۔

یہ قیاس کرنا کہ اقلیتوں کے مفاد کو اکثریت کے تدبر و سیاست پر چھوڑ دینا چاہئے ایک سخت غلطی ہے، کوئی نظامِ حکومت مطمئن اقلیت کے بغیر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ ہر وہ ملک جہاں اقلیت غیر مطمئن ہے، جہاں کی اقلیت کو اکثریت پر بھروسہ نہیں، جہاں اقلیت اپنی زندگی کو دوسروں کے رحم و کرم پر مبنی تصور کرتی ہے ہمیشہ بدنظمی اور سیاسی پیچیدگیوں میں مبتلا رہیگا یہ سب سچ ہے مگر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اقلیتوں کے تحفظ کا کیا طریقہ ہے۔ کیا اُن کے "جائز" مطالبات کو آئین میں منضبط کر دینا چاہیے یا جائز مطالبات کا فیصلہ کسی شخصِ واحد کی رائے پر منحصر ہونا چاہیئے۔ نیا آئین آخری صورت کو قبول کرتا ہے لہٰذا گورنر اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ کسی اقلیت کے کیا حقوق کس وقت، کہاں اور کیسے غصب کیے گئے ہیں۔ گورنر کو ایسا شخص خیال کیا گیا ہے جو کبھی غلطی نہ کرے، وہ ایسی مشین ہے جو خارجی اثرات سے محفوظ ہے، اس کا فیصلہ ہر قسم کی نکتہ چینی اور نظرِ ثانی سے بالا تسلیم کیا گیا ہے مگر کیا یہ سب کچھ ہندوستان کی مکدر سیاسی فضا اور پارٹی گورنمنٹ میں ممکن ہے؟ اس کا جواب مستقبل دے گا۔

گورنر کی ذمہ داری اقلیتوں کے "جائز" مفاد کا تحفظ ہے۔ آئینِ نو میں لفظ "جائز" کی کہیں تشریح نہیں کی گئی۔ قدرۃً لفظ "جائز" کا اطلاق ہر اُس چیز پر ہو سکتا ہے جسے گورنر کا دماغ قبول یا ایجاد کرے۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بلاشبہ اقلیت کو اکثریت پر بھروسا اور یقین ہونا چاہئے مگر بھروسے اور یقین کی جگہ دل ہے نہ کسی کی چوکھٹ!

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقلیتوں کے حقوق کا تصفیہ بجائے مجلس قانون ساز کے گورنر کے ڈرائینگ روم میں ہوا کرے گا[1]۔ ہر وہ ہندوستانی جو پچھلے بیس پچیس برس کی سیاسی تاریخ سے واقف ہے اس قسم کے آئینی تحفظات کے عملی نتائج کا بخوبی اندازہ[2] کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں اقلیتوں کی خواہشات کا تحفظ اس طرح بھی کیا گیا ہے۔ کہ اُنہیں جداگانہ نیابت اور انتخاب عطا کیا گیا ہے

---

[1] لارڈ مارلے وزیرِ ہند نے ان مطالبات کو آئینی شکل دینے سے انکار کر دیا تھا۔
[2] راماسوامی۔ نئے آئین پر ایک نظر۔

اُن کے نمائندے مجلسِ قانون ساز میں اپنے مطالبات پیش کر سکتے ہیں اور اُن مطالبات کا منوانا اقلیت کی معنوی قوت پر جو اُس کی تنظیم اور سیاسی ارتقا سے وابستہ ہوگی منحصر ہوگا۔

یہ سمجھنا کہ گورنر ہر دفعہ اقلیت کا تحفظ کر سکتا ہے پارٹی گورنمنٹ کی عملی سیاست سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔ اگر کوئی اکثریت کسی اقلیت کے حقوق غصب کرنے کا تہیہ کرلے تو گورنر کے سامنے صرف دو راستے کھلے ہیں، یا تو وہ اقلیت کے حقوق کا تحفظ نہ کرے یا اکثریت کو دبانے کی غرض سے تمام نظامِ حکومت کو پلٹ دے۔ نئے انتخابات ہوں، نئی وزارت بنے اور مجلسِ قانون ساز میں اقلیت کی سیاسی حیثیت بھی بدل جائے۔ کیا کوئی گورنر ہمیشہ موخر الذکر طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔

اقلیتوں کو اور تقویت دینے کے لئے "پرچہ ہدایات" (*Instrument of Instructions*) گورنر کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ حتی الامکان اُن کے نمایندہ کو کابینہ میں جگہ دے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ یہ اقدام کابینہ کی مجموعی ذمہ داری کو گزند نہ پہنچائے۔ گورنر کہاں تک اس ہدایت پر عمل کر سکتا ہے وہ پچھلے چند دنوں کی صوبجاتی سیاست نے واضح کر دیا ہے۔ اُڑلیسہ کیبنٹ میں کسی مسلمان وزیر کو جگہ نہیں دی گئی۔ مسلمانوں نے گورنر سے استدعا کی کہ وہ اپنی مخصوص ذمہ داری اور "پرچہ ہدایات" کی بدولت مداخلت کرے اور اقلیت کے مفاد کا خیال کرتے ہوئے ایک مسلمان وزیر کو کابینہ میں جگہ دے ۔۔۔ گورنر نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کی رائے میں اقلیتوں کے حقوق ہر طرح سے محفوظ ہیں۔

ظاہر ہے بحالاتِ موجودہ اقلیتوں کے جائز مفاد کا گورنر کے ہاتھ میں ہونا قومی اور ملکی مصالح کے بھی خلاف ہے اور اقلیتوں کو بھی اُن کے حسب منشا فائدہ پہنچانے سے قاصر ہے۔ ان حالات میں دوسری صورت یہی ہوسکتی ہے کہ وہ بنیادی حقوق جو کسی قوم کی مذہبی، ثقافتی، لسانی اور سیاسی زندگی کے حفظ و بقا کے لئے ضروری ہیں آئین میں منضبط کر دیئے جائیں اور جب بھی مجلسِ قانون ساز میں ایسا قانون پیش کرنے کی کوشش کی جائے جو کسی اقلیت کے حقوق پر ناروا حملہ ہو تو قانون کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ فیڈرل کورٹ جیسے ادارہ کے سپرد کر دیا جائے، جس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ آئین کی تشریح کرے۔ فیڈرل کورٹ کا یہ اہم ترین فرض ہے کہ وہ آئین کے متعلق تمام مسائل کا فیصلہ کرے اس لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں اقلیتوں کا مسئلہ بھی اسی غیر جانبدار ادارہ کے سپرد نہ کر دیا جائے۔ گورنر کا فیصلہ چاہے کتنا ہی حق بجانب ہو مگر اس پر ہمیشہ شک کی نظریں پڑیں گی، ایسے فیصلہ میں روایتی تعصب، نسلی امتیاز اور حاکمانہ مصلحت اندیشی کی جھلک نظر آئے گی۔ مگر عدالت کا فیصلہ ہاتھ دماغ کے علاوہ نفسی رجحانات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، لہٰذا ایسا فیصلہ زیادہ قابلِ قبول ہوتا ہے اور آئین پسند دماغوں پر جو سیاسی جدوجہد کے علمبردار ہوتے ہیں، عدالت کی انصاف پسندی نقش ہو جاتی ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مابہ النزاع مسائل امن و آشتی سے طے پا جاتے ہیں۔ ورنہ دوسری صورت میں ہمیشہ گورنر کا فیصلہ خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے، جس کا حل

خطرناک نتائج کا حامل ہوتا ہے، آزادی طلب قوم، بدیسی حکمرانوں کے عمل کو شک کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اقلیتوں کے رہنما ہر اُس فیصلہ کو جو کسی دوسری اقلیت کو تھوڑا سا فائدہ پہنچائے، اپنے لئے "مضر اور آئندہ جنگ" کے لئے ایک بہانہ بنا لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے نیا آئین ان نتائج کا کوئی تسلی بخش حل پیش نہیں کرتا۔ گورنر کو اتنی قوت دے دی گئی ہے کہ وہ اُسے کسی پارٹی، کسی گروہ، کسی قلیت کو "سیاسی انعام" دینے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

گورنر کی تیسری ذمہ داری ملازمتوں کے متعلق ہے۔ آئین چاہتا ہے کہ گورنر ملازموں اور اُن کے متعلقین کے اُن حقوق کی نگرانی کرے جو قانوناً اُن کو بخش دیئے گئے ہیں۔ اس دفعہ کی پہلی شق یہ ہے کہ گورنر ملازمتوں کے جائز حقوق کا تحفظ کرے۔ دوسری شق کا اثر ہماری قومی سیاست کے لئے مضر نہیں ہو سکتا کیونکہ اُن کا تعلق زیادہ تر پنشن یا ملازمتوں پر حقوق وغیرہ سے ہے۔ مگر پہلی شق زیادہ واضح الفاظ میں بیان نہیں کی گئی، یہاں بھی لفظ "جائز" استعمال کیا گیا ہے اور اس "جائز" کا فیصلہ کرنے والا صرف گورنر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کا انتظام بغیر ایک ایسی منتظم جماعت کے جو اپنے آپ کو مشاہرہ اور مدتِ ملازمت کے متعلق محفوظ خیال کرے، محال ہے۔ کیونکہ نمائندہ حکومت (Representative Government) ایک ایسی جماعت کے سپرد ہوتی ہے جس کا قیام مجلسِ قانون ساز پر منحصر ہوتا ہے۔ کابینہ کی مدتِ حیات غیر مستقل ہوتی ہے، لہٰذا حکومت کی پالیسی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، مگر یہ پالیسی جاری کرنے والا محکمہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محکمہ جانتا ہے کہ انتظامی مشکلات کیا ہوتی ہیں۔ نئی پالیسی کس طرح جاری کرنی چاہئے۔ قانون کیسے نافذ کئے جاتے ہیں وغیرہ۔ الغرض اس محکمہ کا تجربہ ہر حکومت کے لئے ضروری اور لازم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تجربہ حاصل کرنے کے لئے ملازموں کی ایک مطمئن جماعت موجود ہونی چاہئے۔ ایسی جماعت تیار کرنے کے لئے آئین اُن کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے، مگر ان حقوق کا محافظ گورنر کو بنانا قوم پرستوں کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ انڈین سول سروس، انڈین میڈیکل سروس وغیرہ ملازمتوں کے قانون وزیرِ ہند کے منشاء کے مطابق بنتے ہیں، "ان کا تقرر و تنزل اس کے ہاتھ میں ہے، وہ اس کے مطیع ہیں اور اسی کے سامنے ذمہ دار ہیں . . . . مگر حکومت کی مشین میں وہ انتظامی اداروں کے افسر ہونے کی حیثیت سے ایسے وزیروں کے ماتحت ہیں جو مجلسِ قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہیں۔ وزیر اگر چاہے کہ اس کا ماتحت افسر (کوئی آئی سی ایس) ایسے قوانین پر عمل کرے جو خود وزیر نے اپنے محکمہ میں زیادہ تسلی بخش انتظام کے لئے وضع کئے ہوں اور اُس کا ماتحت افسر ایسے قوانین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے یا اُن کی خلاف ورزی کرے تو کیا وزیر اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر سکتا ہے یا اس کو ایسی سزا دے سکتا ہے جو اس نے اُن قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے کے لئے تجویز کی ہو: جہاں تک آئین کا تعلق ہے، آئین وزیر کو اس قسم کا کوئی اختیار نہیں دیتا۔ وزیر اپنے ایک ماتحت افسر کے خلاف، چاہے وہ افسر وزیر کی کسی پالیسی، تجویز یا کسی حکم کے خلاف عمل کرے، خود کوئی سزا پاس نہیں کر سکتا۔ ایسے عمل کا حکومت اور ملک پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

کابینہ میں تقسیمِ کار اور طریقۂ عمل کا فیصلہ گورنر اپنی مرضی کے مطابق کرے گا۔ آئین کی یہ دفعہ بہت اہم ہے۔ گورنر کے اس اختیار کے اثرات سے وہی لوگ زیادہ واقف ہیں جو حکومت کی مشین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس اختیار کی بدولت گورنر اگر چاہے تو کسی محکمہ کی اصلی قوت اپنے ہی ہاتھ میں رکھ سکتا ہے۔ طریقۂ عمل کے ضمن میں گورنر کو قانوناً ایسا انتظام کرنا پڑیگا جس کی بدولت وزیر اور اُن کے سکرٹری مجبور رہوں گے کہ وہ خاص اُمور کے متعلق تمام اطلاعیں گورنر کو پہنچاتے رہیں۔ گورنر اگر چاہے تو وہ تمام خبریں اس طرح سے حاصل کرسکتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر ایک وزیر اور سکرٹری کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسی چیز جو گورنر کی "مخصوص ذمہ داری" سے متعلق ہو، فوراً گورنر کو پہنچا دے۔ اس دفعہ کی آئینی پیچیدگی یہ ہے کہ سکرٹری کو وزیر کا سا درجۂ امتیاز دیا گیا ہے۔ سکرٹری جو اکثر آئی۔سی۔ایس افسر ہوتا ہے اس کا مجاز ہوگا کہ وہ گورنر سے براہِ راست، وزیر کی مداخلت بلکہ علم و مرضی کے بغیر، کسی خاص محکمہ کے متعلق گفتگو کرسکے، وہ گورنر کو تمام ایسے حالات بتا سکتا ہے، جن کا بتانا شاید وزیر مناسب نہ سمجھے، کیا گورنر ایسے موقعوں پر سکرٹری کو وزیر پر ترجیح دے گا؟ یا وزیر خود اپنے سکرٹری پر اعتماد کرے گا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو "رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند" کے تحت آتے ہیں — گورنر کے اسی اختیار کے متعلق پارلیمنٹ میں ایک مخالف ممبر نے کہا تھا" کہ سکرٹری کو وزیر پر ایک محافظ کتے کی طرح مسلط کر دیا گیا ہے"۔

یہ ایسے ہی ملازموں کے لئے ہے کہ اُن کے جائز حقوق کی نگہداشت گورنر کی مخصوص ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ مضبوط اور انصاف پسند حکومت کے لئے مطمئن ملازم ضروری ہیں تو یہ اور بھی زیادہ صحیح اور اہم ہے کہ ملازموں اور وزراء کے تعلقات خوشگوار ہونے چاہئیں، اُن میں آپس میں اعتماد، تعاون اور پبلک مفاد کے سامنے ذاتی اغراض کو بھول جانے کی ہمت ہونی چاہئے۔ بے شک آئین ایسا سازگار ماحول پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں ادارہ پبلک سروس کمیشن ہے۔ مگر کیا آئین ہر اس کوشش کو دبانے کا انتظام کرتا ہے جس کا مقصد ملازمت اور وزارت میں کشمکش پیدا کرنا ہو؟ کیا "جائز حقوق" میں سزا پانے کا "حق" بھی شامل ہے؟ کیا گورنر کو اختیار ہے کہ وہ آئی۔سی۔ایس افسروں کو سزا دے سکے؟ نئے آئین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سزا دینے اور موقوف کرنے کا اختیار بھی صرف سکرٹری آف سٹیٹ (وزیرِ ہند) کو ہے۔ ظاہر ہے گورنر صرف اُن حالات میں مداخلت کرے گا جب کوئی وزیر کسی "ملازم" کے خلاف کوئی اقدام کرے اُس وقت وسیع المعنی لفظ "جائز" (جس کی آئین میں کچھ تشریح نہیں کی گئی) لامحدود قوت عطا کرسکتا ہے۔ یہاں بھی ضروری تھا کہ ملازمت کے حقوق کی حفاظت ایک ایسے ادارہ کے سپرد کی جاتی جو پبلک میں اعتماد پیدا کرسکے۔ جس کا فیصلہ پارٹی گورنمنٹ کی ریشہ دوانیوں اور سیاسی جوڑ توڑ سے بالاتر ہو، ایسا ادارہ پبلک سروس کمیشن ہوسکتا ہے۔ یہی ادارہ اُمیدواروں کی جانچ کرتا ہے، اسی کی سفارش اور جانچ پر سکرٹری آف سٹیٹ مختلف آسامیاں پُر کرتا ہے۔ اگر ایسے ہی غیر جانبدار ادارہ کے ہاتھ میں تمام جھگڑے

لہ Sec 59, cl. (c)

جھکانے کی قوت بھی دے دی جائے تو زیادہ خوشگوار نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ایسے حالات میں یہ یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ ایک محکوم ملک جہاں ایسی قوم پرست قوتیں برسرِ عمل ہوں جو بدیسی حاکموں کے اثر و اقتدار کو ملک کی آزادی میں رکاوٹ سمجھتی ہوں (ان کے پیشِ نظر یہ بات نہیں ہوتی کہ یہ اثر و قوت قوم و ملک کی بھلائی کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ وہ صرف یہی دیکھتی ہیں اور غالباً دیکھنا چاہتی ہیں کہ موجودہ حالات اُن کی قومی فلاح کے منافی ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس قوت پبلک میں اعتماد پیدا کیا جائے، اس کی اعانت حاصل کرنے کے لئے دیانت دارانہ کوششیں کی جائیں اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک سیاسی قوت بجائے عوام کے کسی ایک شخص کے فہم و منشا پر منحصر ہے۔

گورنر کی چوتھی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسے قانون پاس نہ ہونے دے جو ایسے مقاصد کے منافی ہوں جن کے حاصل کرنے کے لئے امتیازی سلوک والی آئینی دفعات وضع کی گئی ہیں۔

اس پیچیدہ دفعہ کے سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کو مالی خود مختاری[1] عطا کی گئی تھی مرکزی مجلس قانون ساز کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ تجارتی معاہدوں پر بحث کر سکے اور اپنے حسبِ منشاء اُن کو طے کرے اور اگر چاہے تو کسی ملک سے ترجیحی سلوک روا رکھے۔ اسمبلی کا ان معاملات پر کہاں تک اختیار تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے برطانیہ کے ساتھ ترجیحی معاہدہ (اوٹاوہ پیکٹ) ختم کرنے کا ووٹ دیا اور حکومتِ ہند نے اس فیصلہ پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسمبلی کو تمام مالی اُمور پر اختیار تھا، بلکہ یہ ایک محدود قوت تھی جو ہندوستانیوں کو تجارتی معاہدے طے کرنے اور کچھ محصول لگانے کے لئے دی گئی تھی۔ تاہم اس کا اتنا اثر ضرور تھا کہ تجارتِ درآمد پر محصول لگانے سے ملکی صنعت کو فروغ ہوا۔ ظاہر ہے اسمبلی برطانوی سامانِ تجارت پر بھی محصول لگا سکتی تھی ——— مگر اب یعنی فیڈریشن کے قیام کے بعد یہ گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ہر اُس امتیازی قانون کو پاس نہ ہونے دے جس کا اثر برطانوی مال یا باشندوں پر پڑے، چونکہ ہندوستان یا بالفاظِ دیگر فیڈریشن کی مالی پالیسی بھی گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری ہے اور صوبوں کو "مالیات" پر کوئی اختیار نہیں لہٰذا یہ گورنر جنرل ہی کا اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے ہندوستان کی مالیات کا انتظام کرے اور اس لئے کہ صوبوں میں کوئی ایسا قانون نہ پاس کیا جائے جو اس مصلحت کے خلاف ہو، یہ گورنر کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ایسی کوششوں کی روک تھام کرے، اور فیڈریل اسمبلی یا وائسرائے کے پاس کردہ قوانین کو اپنے صوبے میں نافذ کرے ——— فیڈریشن کی مالی پالیسی کو گورنر جنرل کی ذمہ داری قرار دینا، ۱۹۲۱ء میں عطا شدہ "مالی خود مختاری" پر ایک ایسی بندش ہے جو قوم پرستوں کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتی رہے گی۔

علاوہ ازیں یہ دفعہ ملکی تجارت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، ہر اُس ملک میں جو صنعت کے میدان میں نیا نیا اُترا ہے، اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ بیرونی ممالک سے مقابلہ کر کے اپنی ملکی منڈیوں کو اپنے تجارتی سامان کی کھپت کے لئے محفوظ کرے۔ حکومت ایسے

[1] Fiscal Autonomy

موقع پر قومی مفاد کے پیش نظر ملکی صنعت کو محصولِ درآمد اور دیگر ذرائع سے مدد پہنچاتی ہے تا آنکہ ملکی صنعت بھی اس قابل ہو جائے کہ بغیر مدد کے بیرونی مسابقت کا مقابلہ کر سکے۔ ہندوستان ایک نیا صنعتی ملک ہے۔ ضرورت ہے کہ حکومت اس کی نوخیز صنعت کی اعانت کرے تاکہ وہ سامان جو یہاں بکفایت تیار ہو سکتا ہے، ملکی منڈیوں میں مہیا کیا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ تامینی پالیسی[1] کا اختیار کرنا خطرات سے خالی نہیں تاہم قومی مفاد کے لئے اشیاء کی قیمت میں گرانی اور عوام کی قوتِ خرید میں کمی تھوڑے عرصے کے لئے برداشت کی جا سکتی ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مالی خود مختاری کی بدولت اسمبلی اس تامینی پالیسی پر کاربند تھی اور اسی کی برکت تھی کہ ہندوستان لوہے، شکر، دیا سلائی وغیرہ اشیاء کے لئے بیرونی ممالک سے بے نیاز ہوتا جا رہا تھا . . . . مگر کیا آئندہ بھی اسی پالیسی پر جس کا مقصد ملکی صنعت کا فروغ ہے عمل کیا جا سکے گا؟ اس کا جواب اُمید افزا نہیں۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ شاید یہ پالیسی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دی جائے گی۔

محصولِ درآمد کے علاوہ حکومت کبھی کبھی بعض صنعتوں کی پیداوار پر مقدار کے لحاظ سے نقد روپیہ[2] بھی دیا کرتی ہے، اس کا مقصد بھی ملکی صنعت کو "مصنوعی مدد" سے ترقی دینا ہوتا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ حکومت فیصلہ کرتی ہے کہ اُونی مصنوعات کو ایسی مدد کی ضرورت ہے لہٰذا ہندوستانی خزانہ سے اس صنعت کو نقد روپیہ دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اُونی مصنوعات تیار کرنے کے کارخانے ہندوستانی اور برطانوی ہر قسم کے سرمایہ سے تیار کئے گئے ہیں ـــ کیا اسمبلی اعتراض کر سکتی ہے کہ ہندوستان کا روپیہ کسی انگریزی کارخانہ کو نہ دیا جائے؟ امتیازی سلوک والا آئین ایسے اعتراض کو جائز قرار نہیں دے سکتا، کیونکہ ایسے قانون کا اثر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی (انگریزی) کارخانوں میں امتیاز پیدا کرنا ہوگا۔ اس طرح سے یہ قانون غیر ہندوستانی سرمایہ اور کمپنیوں کا تحفظ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا جا سکتا جو برطانوی باشندوں پر اس قسم کی پابندیاں عاید کر سکے جیسی آج کل جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر عائد کی جا رہی ہیں، برطانیہ کا ہر باشندہ تجارت اور کاروبار وغیرہ میں اُن تمام مراعات کا مستحق ہوگا، جو کسی ہندوستانی کو حاصل ہونگی، اس کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کو یہی حقوق انگلستان میں حاصل ہوں گے۔

یہ قانون ہندوستان کی معاشی زندگی اور صنعتی ترقی پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے، گورنر جنرل کی اس ذمہ داری پر ہندوستان کی آئندہ خوشحالی منحصر ہے۔ مالی پالیسی پہلے ہی اسمبلی کی نگرانی اور خوردہ گیری سے محفوظ تھی، اب فیڈریشن کے بعد تجارتی معاہدے بھی اس طرح طے کئے جائیں گے کہ ایک نوخیز صنعتی ملک کے مفاد کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے، بلکہ دُنیا کے معاشی حالات سے قطعِ نظر ایک محدود جغرافی اور سیاسی سلطنت کے قیام کو مقصدِ اولین سمجھا جائے۔ یہ ایسے شبہات ہیں جو ہر قوم پرست کے دِل میں پیدا ہو سکتے ہیں، تاہم یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان باقی دُنیا کی طرح تاریخی قوتوں کے زیرِ اثر ہے۔ ممکن ہے قوم پرستوں کے شُبہات کبھی عملی صُورت اختیار نہ کریں۔

[1] Protectionist Policy [2] Bounty

گورنر کی پانچویں ذمہ داری، ایسے علاقوں کی خوش انتظامی سے متعلق ہے جن کا انتظام باقی صوبے کے مانند کسی ترقی یافتہ نظامِ حکومت کا اہل نہیں۔ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے ماتحت یہ علاقے گورنر اور اس کی کونسل (جماعتِ وزراء کے زیرِ نگرانی تھے۔ ان کی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ نہ تو ان کے نمایندے مجلسِ قانون ساز کے ممبر ہو سکتے تھے اور نہ مجلسِ قانون ساز کو کسی قسم کی مداخلت کا اختیار تھا۔ دراصل یہ ایسے سرحدی یا جنگلی علاقے ہیں جو تمدنی اور سیاسی اعتبار سے اس قابل نہیں کہ وہاں ترقی یافتہ سیاسی نظام، عوام یعنی وہاں کی آبادی کے لئے مفید ثابت ہو سکے، کوشش یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ان کو باقی صوبے کی سیاسی سطح پر لایا جائے ——— نئے آئین کے مطابق ان علاقوں کی حکومت صرف گورنر کو تفویض کی گئی، کسی وزیر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ گورنر کو ان معاملات پر کوئی رائے دے، مجلسِ قانون ساز کو پہلے کی طرح وہاں کے حالات پر کوئی اختیار نہیں۔ وہاں سے کوئی نمایندہ نہیں بلایا جائے گا، گورنر صوبے کے خزانہ سے روپیہ لےکر جس کی منظوری مجلسِ قانون ساز کے ہاتھ میں نہیں ایسے علاقوں کی حکومت اپنے فہم و مرضی کے مطابق کرے گا۔ قوم پرستوں کا خیال ہے کہ مجلسِ قانون ساز کو کم از کم نکتہ چینی کا پورا اختیار ہونا چاہیے۔ دوسرے وہ چاہتے ہیں کہ ایسی حکومت کی میعاد کم از کم مدت تک محدود ہونی چاہیے تاکہ برطانوی ہندوستان اور ریاستی ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا نیا ہندوستان نہ بس جائے ———

گورنر کی باقی دو ذمہ داریاں فیڈریشن سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں، لہٰذا ان پر تبصرہ کرنا موجودہ بحث سے خارج ہے۔ تاکہ گورنر ان ذمہ داریوں کو بوجہ احسن سرانجام دے سکے، پارلیمنٹ نے اس کو آرڈیننس جاری کرنے کی قوت بھی دی ہے، گورنر کے آرڈیننس دو قسم کے ہوں گے (۱) وزیر کا آرڈیننس، (۲) گورنر کا آرڈیننس۔

وزیر کا آرڈیننس، وزیر کے مشورے پر جاری کیا جائے گا مگر صرف اس وقت جب کہ مجلسِ قانون ساز کا سیشن (مدتِ اجلاس) ختم ہو چکا ہو، ایسے آرڈیننس کے لئے ضروری ہے کہ گورنر کو یقین ہو جائے کہ حالات فوری احکام کے مقتضی ہیں، یہ آرڈیننس مجلسِ قانون ساز کے اجلاس میں پیش کیا جائے گا اور اگر مجلس اس کی نامنظوری کا رزولیوشن پاس کر دے تو آرڈیننس ختم ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں مجلس کے اجلاس کے چھ ہفتہ بعد آرڈیننس از خود بغیر کسی رزولیوشن کے ختم ہو جائے گا، گورنر اور شاہنشاہِ معظم بھی آرڈیننس کو واپس لے سکتے ہیں۔

گورنر کا آرڈیننس اس وقت جاری ہوگا جب حالات ایسے ہوں جن میں اسے اپنے فہم و مرضی کے مطابق عمل کرنا ہے، یہ آرڈیننس چھ ماہ تک جاری رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر چھ ماہ سے زیادہ توسیع کرنے کی ضرورت ہو تو یہ آرڈیننس وزیرِ ہند کے توسل سے پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔ ایسا آرڈیننس گورنر یا شاہنشاہِ معظم واپس لے سکتے ہیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ آرڈیننس کس قوت کے زیرِ اثر ہیں، وزیر کا آرڈیننس مجلسِ قانون ساز کے ماتحت ہے، بصورتِ دیگر کونسل کے اجلاس کے

چھ ہفتے کے بعد خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ مگر گورنر کا آرڈیننس کبھی مجلس کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا اور اُس صورت میں جبکہ اِسے چھ ماہ سے زیادہ نافذ کرنے کی ضرورت ہو اُس وقت بھی پارلیمنٹ اُسے رد نہیں کر سکتی۔ ایسا کرنا صرف ایک آئینی رسم کا پورا کرنا ہے۔ اس کا جاری کرنے اور واپس لینے والا صرف گورنر ہے ——— یہی نہیں اس کے علاوہ گورنر اگر چاہے تو قانون بھی بنا سکتا ہے۔ ایسا قانون "گورنر کا ایکٹ" کہلائے گا۔ ایسے حالات جن میں گورنر اپنے فہم یا مرضی کے مطابق عمل کر سکتا ہے اُسے یہ حق دیتے ہیں کہ وہ فوراً "گورنر کا ایکٹ" پاس کر دے یا مجلس قانون ساز میں ایک پیغام مجوزہ بل کے ساتھ بھیج دے۔ اگر مجلس قانون پاس نہ کرے تو ایک ماہ کے بعد یہ بل از خود قانون بن جائے گا ——— ایسے موقع پر گورنر مجلس اور کونسل کی ترمیمیں قبول کرنے پر مجبور نہیں گو وہ ان پر غور کر سکتا ہے۔

یہ آمرانہ قوتیں، صوبے کی عام سیاسی زندگی کو شل کر سکتی ہیں، ذمہ داریوں کے علاوہ گورنر کو اتنی قوت دینا، وزرا کے معمولی اختیارات کی حقیقت ظاہر کر دیتا ہے، مالیات کو مرکزی حکومت یعنی فیڈریشن کے سپرد کر دینا اور فیڈریشن کی مالی پالیسی کو گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری قرار دینا، صوبوں کو مفلوج کر دینا ہے، حکومت کے کاروبار سے وزرا، اتنا روپیہ نہیں بچا سکتے کہ وہ تعلیم، حفظانِ صحت، بے روزگاری کے انسداد، وغیرہ قومی کاموں پر صرف کریں . . . . . . ان تمام تحفظات کے باوجود یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ حکومت نظری فلسفہ نہیں بلکہ اس کا تعلق عملی سیاست سے ہے، بے شک نیا آئین قوم پرستوں کی آرزوؤں کی تکمیل نہیں۔ تاہم یہ اتنا بے جان بھی نہیں کہ ہندوستان کے اُن نگروں اور بھوکوں میں جو دُور افتادہ علاقوں میں بستے ہیں سیاسی بیداری پیدا نہ کرے، نئے انتخابات اس بات کی کافی شہادت ہیں کہ لوگ آئینی مشین سے ڈرتے نہیں بلکہ اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک سیاسی پارٹی کا احتجاج، ملک میں ہیجان پیدا کر سکتا ہے، مگر عوام کو ملکی مسائل سے آشنا کر کے سیاسی قوت اُنہیں دے دینا زیادہ مشکل اور اہم ہے۔ اور یہی ہمارا مطمح نظر ہونا چاہئے۔ ذرائع حصول میں اختلاف ہو سکتا ہے، کوئی چاہتا ہے کہ خونی انقلاب کی ایک ہی کروٹ یہ سب کچھ عطا کر دے اور کوئی سمجھتا ہے کہ بتدریج ارتقائی منازل طے کرنا ہمارے لئے زیادہ قرینِ دانش ہے مگر کیا اس پُرشورش، بدلتی دُنیا میں عوام کی قوت سے کوئی انکار کر سکتا ہے؟

محمد صدیق تاؤنی

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

۱۹۳۸ء

پیغمبرِ دینِ خودی

منتظر اُس مردِ حق کا ہے جہانِ بے ثبات
جس کا اک جلوہ ہو بُنیادِ فروغِ شش جہات

مدّتوں گردش میں رہتا ہے چراغِ مہر جب
صُبح ہوتی ہے شبِ تاریکِ بزمِ کائنات

گھومتا ہے جب تلاشِ نُوح میں سو سو فلک
کشتیِ انساں کو طوفانوں سے ملتی ہے نجات

صاحبِ ضربِ کلیم آتا ہے اک صدیوں کے بعد
گرچہ اس دُنیا میں بنتے ہیں سدا لات و منات

اک حسینِؓ تشنہ ہوتا ہے حرم سے جلوہ گر
جستجو میں مدّتوں روتی ہے جب رودِ فرات

دُودمانِ عشق سے محمود روز اُٹھتے نہیں
نت نئے تیار ہوتے ہیں خرد کے سومنات

تلخیِ دوراں رُلاتی ہے ہزاروں سال جب
پھوٹتی ہے زندگی کے نخل سے شاخِ نبات

اب ہمیشہ روئیں گے اقبال کو دیر و حرم
"عُمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات"

"تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں"
(زبورِ عجم)

حفیظ ہوشیارپوری

(۱)

پلیگ اور کوارنٹین!

ہمالہ کے پاؤں میں لیٹے ہوئے میدانوں پر پھیل کر ہر ایک چیز کو دُھندلا بنا دینے والی کُہر کے مانند پلیگ کے خوف نے چاروں طرف اپنا تسلّط جما لیا تھا۔ شہر کا بچہ بچہ اُس کا نام سُن کر کانپ جاتا تھا۔

پلیگ تو خوفناک تھی ہی، مگر کوارنٹین اُس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ لوگ پلیگ سے اتنے ہراساں نہیں تھے جتنے کوارنٹین سے، اور یہی وجہ تھی کہ افسرانِ محکمۂ حفظانِ صحت نے شہریوں کو چوہوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے لئے جو قدِ آدم اشتہار چھپوا کر دروازوں، گزرگاہوں اور شاہراہوں پر لگایا تھا اُس پر "نہ چوہا نہ پلیگ" کے عنوان میں اضافہ کرتے ہوئے "نہ چوہا - نہ پلیگ - نہ کوارنٹین" لکھا تھا۔

کوارنٹین کے متعلق لوگوں کا خوف بجا تھا۔ بحیثیت ایک ڈاکٹر کے میری رائے نہایت مستند ہے اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنی اموات شہر میں کوارنٹین سے ہوئیں اتنی پلیگ سے نہ ہوئیں، حالانکہ کوارنٹین کوئی بیماری نہیں۔ بلکہ وہ اُس وسیع رقبہ کا نام ہے جس میں متعدّی وبا کے ایّام میں بیمار لوگوں کو تندرست انسانوں سے ازروئے قانون علیحدہ کر کے لا ڈالتے ہیں۔ تاکہ بیماری بڑھنے نہ پائے۔ اگرچہ کوارنٹین میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا بندوبست تھا، مگر مریضوں کے کثرت سے وہاں آ جانے پر اُن کی طرف فرداً فرداً توجہ نہ دی جا سکتی تھی۔ خویش و اقارب کے قریب نہ ہونے سے میں نے بہت سے مریضوں کو بے حوصلہ ہوتے دیکھا۔ کئی تو اپنے نواح میں لوگوں کو پے بہ پے مرتے دیکھ کر مرنے سے پہلے ہی مر گئے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ کوئی معمولی طور پر بیمار آدمی وہاں کی وبائی فضا ہی کے جراثیم سے ہلاک ہو گیا۔ اور پھر کثرتِ اموات کی وجہ سے آخری رسوم بھی کوارنٹین کے مخصوص طریقہ پر ادا ہوتیں یعنی سینکڑوں لاشوں کو مردہ کتوں کی نعشوں کی طرح گھسیٹ کر ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں جمع کیا جاتا۔ اور بغیر کسی کی مذہبی رسوم کا احترام کئے پٹرول ڈال کر سب کو نذرِ آتش کر دیا جاتا۔ اور شام کے وقت جب ڈوبتے ہوئے سورج کی آتشیں شفق کے ساتھ بڑے بڑے شعلے یک رنگ و ہم آہنگ ہوتے، تو دوسرے مریض یہی سمجھتے کہ تمام دُنیا کو آگ لگ رہی ہے۔

کوارنٹین اس لئے بھی زیادہ اموات کا باعث ہوئی کہ بیماری کے آثار نمودار ہوتے تو بیمار کے متعلقین اُسے چھپانے لگتے تاکہ کہیں مریض کو جبراً کوارنٹین میں نہ لے جائیں ۔ چونکہ ہر ایک ڈاکٹر کو تنبیہ کی گئی تھی کہ مریض کی خبر پاتے ہی فوراً مطلع کرے۔ اس لئے لوگ ڈاکٹروں سے علاج بھی نہ کراتے۔ اور کسی گھر کے وبائی ہونے کا صرف اُسی وقت پتہ چلتا جب کہ جگر دوز آہ و بکا کے درمیان ایک لاش اُس گھر سے نکلتی ۔

اُن دنوں میں کوارنٹین میں بطور ایک ڈاکٹر کے کام کر رہا تھا ۔ پلیگ کا خوف میرے دل و دماغ پر بھی مسلط تھا۔ شام کو گھر آنے پر میں ایک عرصہ تک کار بالک صابن سے ہاتھ دھوتا رہتا اور جراثیم کش مرکب سے غرارے کرتا ۔ یا پیٹ کو جلا دینے والی گرم کافی یا برانڈی پی لیتا ۔ اگرچہ اُس سے مجھے بے خوابی اور آنکھوں کے چندھے پن کی شکایت پیدا ہو گئی ۔ کئی دفعہ بیماری کے خوف سے میں نے قے آور دوائیں کھا کر اپنی طبیعت کو صاف کیا ۔ جب نہایت گرم کافی یا برانڈی پینے سے پیٹ میں تخمیر ہوتی اور بخارات اُٹھ اُٹھ کر دماغ کی طرف جاتے، تو میں اکثر ایک حواس باختہ شخص کے مانند طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا۔ گلے میں ذرا بھی خراش محسوس ہوتی تو میں سمجھتا کہ پلیگ کے نشانات نمودار ہونے والے ہیں —— اُف ! میں بھی اُس موذی بیماری کا شکار ہوں گا ..... پلیگ ! اور پھر —— کوارنٹین !

اُنہیں دنوں میں " نو عیسائی " ولیم بھاگو خاکروب ، جو میری گلی میں صفائی کیا کرتا تھا میرے پاس آیا اور بولا " بابوجی — غضب ہو گیا ۔ آج ایمبو اسی محلہ کے قریب سے بیس اور ایک بیمار لے گئی ہے ۔"

" اکیس ؟ ایمبولینس میں ...... ؟ " میں نے متعجب ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے ۔

" جی ہاں .... پورے بیس اور ایک —— اُنہیں بھی کونٹن (کوارنٹین) لے جائیں گے —— آہ ! وہ بیچارے کبھی واپس نہ آئیں گے کیا ؟ "

دریافت کرنے پر مجھے علم ہوا کہ بھاگو رات کے تین بجے اُٹھتا ہے ، آدھ پاؤ شراب چڑھا لیتا ہے ۔ اور پھر حسب ہدایت کمیٹی کی گلیوں میں اور نالیوں پر چونا بکھیرنا شروع کر دیتا ہے تاکہ جراثیم پھیلنے نہ پائیں ۔ بھاگو نے مجھے مطلع کیا کہ اُس کے تین بجے اُٹھنے کا یہ بھی مطلب ہے کہ بازار میں پڑی ہوئی لاشوں کو اکٹھا کرے اور اُس محلہ میں جہاں وہ کام کرتا ہے اُن لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کاج کرے جو بیماری کے خوف سے باہر نہیں نکلتے ۔ بھاگو تو بیماری سے ذرا بھی نہیں ڈرتا تھا اُس کا خیال تھا کہ جو مرنا ہوگا تو خواہ وہ کہیں چلا جائے ۔ بچ نہیں سکتا۔

اُن دنوں جب کوئی کسی کے پاس نہیں پھٹکتا تھا بھاگو سر اور مُنہ پر منڈاسا باندھے نہایت مستعد ہو کر بنی نوع انسان کی خدمت گزاری کر رہا تھا ۔ اگرچہ اُس کا علم نہایت محدود تھا تاہم اپنے تجربہ کی بنا پر وہ ایک مقرر کی طرح لوگوں کو بیماری سے

سمجھنے کی تراکیب بتاتا - عام صفائی، چونا بکھیرنے اور گھر سے باہر نہ نکلنے کی تلقین کرتا - ایک دن میں نے اُسے لوگوں کو شراب کثرت سے پینے کی تلقین کرتے ہوئے بھی دیکھا - اُس دن جب وہ میرے پاس آیا - تو میں نے پوچھا "بھاگو! تمہیں پلیگ سے ڈر بھی نہیں لگتا؟"

"نہیں بابوجی ـــــ بن آئی بال بھی بینکا نہیں ہوگا - آپ اتنے بڑے حکیم ٹھہرے - ہزاروں نے آپ کے ہاتھ سے شفا پائی - مگر جب میری آئی ہوگی تو آپ کا دارو درمن بھی کچھ اثر نہ کرے گا . . . . . ہاں بابوجی ـــــ آپ بُرا نہ مانیں میں ٹھیک اور صاف صاف کہہ رہا ہوں" اور پھر گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے بولا "کچھ کوئنٹن کی کہئیے بابوجی ـــــ کوئنٹین کی"

"وہاں کوارنٹین میں ہزاروں مریض آ گئے ہیں - ہم حتے الوسع اُن کا علاج کرتے ہیں - مگر کہاں تک - نیز میرے ساتھ کام کرنے والے خود بھی زیادہ دیر اُن کے درمیان رہنے سے گھبراتے ہیں - خوف سے اُن کے گلے اور لب سُوکھے رہتے ہیں - پھر تمہاری طرح کوئی مریض کے مُنہ کے ساتھ منہ نہیں جا لگاتا - نہ کوئی تمہاری طرح اتنی جان مارتا ہے ..... بھاگو! خدا تمہارا بھلا کرے جو تم بنی نوع انسان کی اس قدر خدمت کرتے ہو ـــــ !"

بھاگو نے گردن جھکا دی اور منڈاسے کے ایک پلو کو مُنہ پر سے ہٹا کر، شراب کے اثر سے سُرخ ہو چکے ہوئے چہرے کو دکھاتے ہوئے بولا "بابوجی، میں کس لائق ہوں - مجھ سے کسی کا بھلا ہو جائے - میرا یہ نکما تن کسی کے کام آ جائے - اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے - بابوجی! بڑے پادری لابے (ریورینڈ مونٹ ل آبے) جو ہمارے محلوں میں اکثر پرچار کے لئے آیا کرتے ہیں - کہتے تھے - خداوند یسوع مسیح یہی سکھاتا ہے کہ بیمار کی مدد میں اپنی جان تک لڑا دو ـــ میں سمجھتا ہوں . . . . ."

مَیں نے بھاگو کی ہمت کو سراہنا چاہا - مگر کثرتِ جذبات سے میں رُک گیا - اُس کی خوش اعتقادی اور عملی زندگی کو دیکھ کر میرے دل میں ایک جذبۂ رشک پیدا ہوا - میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ آج کوارنٹین میں پوری تن دہی سے کام کر کے بہت سے مریضوں کو بقیۂ حیات رکھنے کی کوشش کروں گا - اُن کو آرام پہنچانے میں اپنی جان تک لڑا دوں گا - مگر کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے - کوارنٹین میں پہنچ کر جب میں نے مریضوں کی خوفناک حالت دیکھی اور اُن کے مُنہ سے پیدا شدہ تعفن میرے نتھنوں میں پہنچا تو میری رُوح لرز گئی اور بھاگو کی تقلید کرنے کی ہمت نہ پڑی -

تاہم اُس دن بھاگو کو ساتھ لے کر میں نے کوارنٹین میں بہت کام کیا - جو کام مریض کے زیادہ قریب رہ کر ہو سکتا تھا، وہ مَیں نے بھاگو سے کرایا - اور اُس نے بلا تامل کیا . . . . . . خود مَیں مریضوں سے دُور دُور ہی رہتا - اس لئے کہ مَیں مَوت سے بہت خائف تھا اور کوارنٹین سے اُس سے زیادہ خائف!

مگر کیا بھاگو موت اور کوارنٹین دونوں سے بالاتر تھا؟

اُس دن کوارنٹین میں چار سَو کے قریب مریض داخل ہوئے اور اڑھائی سَو کے لگ بھگ لقمۂ اجل ہو گئے!

(۲)

یہ بھاگو کی جانبازی کا صدقہ ہی تھا کہ میں نے بہت سے مریضوں کو شفایاب کیا۔ وہ نقشہ جو مریضوں کی رفتار صحت کے متعلق چیف میڈیکل آفیسر کے کمرے میں آویزاں تھا۔ اُس میں میرے تحت میں رکھے ہوئے مریضوں کے اوسط صحت کی لکیر سب سے اُونچی چڑھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میں ہر روز کسی نہ کسی بہانہ سے اُس کمرہ میں چلا جاتا اور اُس لکیر کو سَو فیصدی کی طرف اُدھر ہی اُوپر بڑھتے دیکھ کر دل میں بہت خوش ہوتا۔

ایک دن میں نے برانڈی ضرورت سے زیادہ پی لی۔ میرا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ نبض گھوڑے کی طرح دوڑنے لگی۔ اور میں ایک جنونی کی مانند اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ مجھے خود شک ہونے لگا کہ پلیگ کے جراثیم نے مجھ پر آخر کار اپنا اثر کر ہی دیا ہے۔ اور عنقریب ہی گلٹیاں میرے گلے یا رانوں میں نمودار ہوں گی۔ میں بہت ہی سراسیمہ ہوگیا۔ اُس دن میں نے کوارنٹین سے بھاگ جانا چاہا۔ جتنا عرصہ بھی میں وہاں ٹھہرا، خوف سے کانپتا رہا۔ اُس دن مجھے بھاگو کو دیکھنے کا صرف دو دفعہ اتفاق ہوا۔

دوپہر کے قریب میں نے اُسے ایک مریض سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ وہ نہایت پیار سے اُس کے ہاتھوں کو تھپک رہا تھا۔ مریض میں جتنی بھی سکت تھی اُسے مجتمع کرتے ہوئے اُس نے کہا "بھئی اللہ ہی مالک ہے، اِس جگہ تو خدا دشمن کو نہ لائے۔ میری دو لڑکیاں . . . . . ."

بھاگو نے اُس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "خداوند یسوع مسیح کا شکر کرو بھائی ــــ تم تو اچھے دکھائی دیتے ہو۔"

"ہاں بھائی شکر ہے خدا کا ــــ پہلے سے کچھ اچھا ہی ہوں ــــ اگر میں کوارنٹین . . . . . ."

ابھی یہ الفاظ اُس کے مُنہ میں ہی تھے کہ اُس کی نسیں کھنچ گئیں۔ اُس کے مُنہ سے کف جاری ہوگیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ کئی جھٹکے آئے اور وہ مریض جو ایک لمحہ پہلے سب کو اور خصوصاً اپنے آپ کو اچھا دکھائی دے رہا تھا، ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ بھاگو اُس کی موت پر دکھائی نہ دینے والے خُون کے آنسو بہانے لگا۔ اور کون اُس کی موت پر آنسو بہاتا۔ کوئی اُس کا وہاں ہوتا تو اپنے جگردوز نالوں سے ارض و سما کو شق کر دیتا۔ ایک بھاگو ہی تھا جو سب کا رشتہ دار تھا۔ سب کے لئے اُس کے دل میں درد تھا۔ وہ سب کی خاطر روتا اور کُڑھتا تھا ــــ ایک دن اُس نے خداوند یسوع مسیح کے حضور میں نہایت عجز و انکسار سے اپنے آپ کو بنی نوعِ انسان کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر بھی پیش کیا۔

اسی دن شام کے قریب بھاگو میرے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھُولی ہوئی تھی اور وہ ایک دردناک آواز سے کراہ رہا تھا بولا۔ "بابوجی ــــ یہ کوارنٹین تو دوزخ ہے دوزخ۔ پادری لابے اسی قسم کی دوزخ کا نقشہ کھینچا کرتا تھا . . . . . ."

میں نے کہا "ہاں بھائی۔ یہ دوزخ سے بھی بڑھ کر ہے ــــ میں تو یہاں سے بھاگ نکلنے کی ترکیب سوچ رہا ہوں . . . ."

میری طبیعت آج بہت خراب ہے۔"

"بالوجی اس سے زیادہ اور کیا بات ہو سکتی ہے ..... آج ایک مریض جو بیماری کے خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا، اُسے مُردہ سمجھ کر کسی نے لاشوں کے ڈھیر میں جا ڈالا۔ جب پٹرول چھڑکا گیا۔ اور آگ نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تو میں نے اُسے شعلوں کے درمیان ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا۔ میں نے کُود کر اُسے اُٹھالیا۔ بالوجی! وہ بہت بُری طرح جُھلسا گیا تھا۔ اُسے بچاتے ہوئے میرا دایاں بازو بالکل جل گیا ہے ——"

میں نے بھاگو کا بازو دیکھا۔ اُس پر زرد زرد چربی نظر آرہی تھی۔ میں اُسے دیکھتے ہوئے لرز اُٹھا۔ میں نے پوچھا "کیا وہ آدمی بچ گیا ہے پھر —— ؟"

"بالوجی —— وہ کوئی بہت شریف آدمی تھا۔ جس کی نیکی اور شریفی (شرافت) سے دُنیا کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکی۔ اتنے درد و کرب کی حالت میں بھی اُس نے اپنا جُھلسا ہؤا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور اپنی مریل سی نگاہ میری نگاہوں میں ڈالتے ہوئے اُس نے میرا شکریہ ادا کیا۔"

"—— اور بالوجی" بھاگو نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اِس کے کچھ عرصہ بعد وُہ اتنا تڑپا۔ اتنا تڑپا کہ آج تک میں نے کسی مریض کو اس طرح جاں توڑتے نہیں دیکھا ہوگا —— اس کے بعد وہ مر گیا۔ کتنا اچھا ہوتا۔ جو میں اُسے اسی وقت جل جانے دیتا۔ اُسے بچا کر میں نے اُسے مزید دُکھ سہنے کے لئے زندہ رکھا۔ اور پھر وہ بچا بھی نہیں۔ اب انہی جلے ہوئے بازوؤں سے مَیں پھر اُسے اُسی ڈھیر میں پھینک آیا ہوں ——"

اِس کے بعد بھاگو کچھ نہ بول سکا۔ درد کی ٹیسوں کے درمیان اُس نے رُکتے رُکتے کہا "آپ جانتے ہیں ..... وُہ کس بیماری ..... سے مرا۔ پلیگ سے نہیں —— کونٹین سے —— کونٹین سے!"

(۳)

اگرچہ ہمہ یاراں دوزخ، کا خیال اُس لامتناہی سلسلۂ قہر و غضب میں لوگوں کو کسی حد تک تسلی کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔ تاہم مقہور بنی آدم کی فلک شگاف صدائیں تمام شب کانوں میں آتی رہتیں۔ ماؤں کی آہ و بکا، بہنوں کے نالے، بیویوں کے نوحے، بچوں کی چیخ پکار شہر کی اُس فضا میں جس میں کہ نصف شب کے قریب اُلّو بھی بولنے سے ہچکچاتے تھے ایک نہایت المناک منظر پیدا کرتی تھی۔ جب صحیح وسلامت لوگوں کے سینوں پر منوں بوجھ رہتا تھا تو اُن لوگوں کی حالت کیا ہوگی جو گھروں میں بیمار پڑے تھے اور جنہیں کسی یرقان زدہ کے مانند در و دیوار سے مایوسی کی زردی ٹپکتی دکھائی دیتی تھی۔ اور پھر کوارنٹین کے مریض جنہیں مایوسی کی حد سے گزر کر ملک الموت مجسم دکھائی دے رہا تھا، وہ زندگی سے یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے کسی طوفان میں کوئی کسی درخت کی چوٹی سے چمٹا ہؤا ہو۔ اور پانی کی تیز و تند لہریں ہر لحظہ بڑھ کر اُس چوٹی کو بھی ڈبو دینے کی آرزومند ہوں۔

میں اُس روز توہم کی وجہ سے کوارنٹین بھی نہ گیا۔ کسی ضروری کام کا بہانہ کر دیا۔ اگرچہ مجھے سخت ذہنی کوفت ہوتی رہی تھی کیونکہ بہت ممکن تھا کہ میری مدد سے کسی مریض کو فائدہ پہنچ جاتا۔ مگر اُس خوف نے جو میرے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ مجھے پابہ زنجیر رکھا۔ شام کو سوتے وقت مجھے اطلاع ملی کہ آج شام کو کوارنٹین میں پانسو کے قریب مزید مریض پہنچے ہیں۔

میں ابھی ابھی معدے کو جلا دینے والی گرم کافی پی کر سونے ہی والا تھا کہ دروازے پر بھاگو کی آواز آئی۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو بھاگو ہانپتا ہوا اندر آیا۔ بولا "بابوجی ـــــ میری بیوی بھی بیمار ہو گئی . . . . اس کے گلے میں گلٹیاں نکل آئی ہیں . . . خدا کے واسطے اُسے بچاؤ . . . . . اُس کی چھاتی پر ڈیڑھ سالہ بچہ دُودھ پیتا ہے، وہ بھی ہلاک ہو جائے گا۔"

بجائے گہری ہمدردی کا اظہار کرنے کے میں نے خشمگیں لہجہ میں کہا۔ "اس سے پہلے کیوں نہ آ سکے ـــــ کیا بیماری ابھی ابھی شروع ہوئی ہے؟"

"صبح معمولی بخار تھا ـــــ جب میں کوارنٹین گیا . . . ."

"اچھا ـــــ وہ گھر میں بیمار تھی۔ اور پھر بھی تم کوارنٹین گئے؟"

"جی بابوجی ـــــ" بھاگو نے کانپتے ہوئے کہا۔ "وہ بالکل معمولی طور پر بیمار تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید دُودھ چڑھ گیا ہے ـــــ اس کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں ـــــ اور پھر میرے دونوں بھائی گھر پر ہی تھے . . . . . . اور سینکڑوں مریض کوارنٹین میں بے بس . . . . ."

"تو تم اپنی حد سے زیادہ مہربانی اور قربانی سے جراثیم کو گھر لے ہی آئے نا۔ میں نہ تم سے کہتا تھا کہ مریضوں کے اتنا قریب مت رہا کرو ـــــ دیکھو میں آج اسی وجہ سے وہاں نہیں گیا۔ اس میں سب تمہارا قصور ہے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم سے جانباز کو اپنی جانبازی کا مزا بھگتنا ہی چاہئے۔ جہاں شہر میں سینکڑوں مریض پڑے ہیں . . . ."

بھاگو نے ملتجیانہ انداز سے کہا "مگر خداوند یسوع مسیح . . . . ."

"چلو ہٹو ـــــ بڑے آئے کہیں کے ـــــ تم نے جان بُوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالا۔ اب اس کی سزا میں بھگتوں؟ قربانی ایسے تھوڑی ہوتی ہے۔ میں اتنی رات کے وقت تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتا ـــــ"

"مگر پادری لابے . . . . . ."

"چلو ـــــ جاؤ ـــــ پادری لابے کے کچھ ہوتے . . . . . ."

بھاگو سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ اُس کے جانے کے آدھ گھنٹہ بعد جب میرا غصہ فرو ہوا تو میں اپنی حرکت پر نادم ہونے لگا میں عاقل کہاں کا تھا جو بعد میں ہدفِ ملامت و پشیمانی ہو رہا تھا۔ میرے لئے یہی یقیناً سب سے بڑی سزا تھی کہ اپنی تمام خودداری کو

پامال کرتے ہوئے بھاگو کے سامنے اپنے گذشتہ رویہ پر اظہارِ معذرت کرتے ہوئے اُس کی بیوی کا پوری جانفشانی سے علاج کر
میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور دوڑا دوڑا بھاگو کے گھر پہنچا . . . . . وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ بھاگو کے دونو
بھائی اپنی بھابج کو چارپائی پر لٹائے ہوئے باہر نکال رہے تھے ـــــ

میں نے بھاگو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا " اسے کہاں لے چلے ہو ؟"

بھاگو نے آہستہ سے جواب دیا " کونٹین میں . . . . . "

" تو کیا اب تمہاری دانست میں کوارنٹین دوزخ نہیں رہا ـــــ بھاگو ؟ . . . . . "

" آپ نے جانے سے انکار کر دیا۔ بابوجی ـــــ اور چارہ ہی کیا تھا۔ میرا خیال تھا۔ وہاں حکیم کی مدد مل جائے گی او
مریضوں کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھوں گا۔"

" یہاں رکھ دو چارپائی . . . . . اب بھی تمہارے دماغ سے دوسرے مریضوں کا خیال نہیں گیا . . . . . احمق . . . "

چارپائی اندر رکھ دی گئی اور میرے پاس جو تیر بہدف دوا تھی میں نے بھاگو کی بیوی کو پلائی اور پھر اپنے غیر مرئی حریف
موت سے مقابلہ کرنے لگا۔ بھاگو کی بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔

بھاگو نے ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہا " آپ کا احسان ساری عمر نہ بھولوں گا ـــــ بابوجی "

میں نے کہا " مجھے اپنے گذشتہ رویہ پر سخت افسوس ہے بھاگو ـــــ ایشور تمہیں تمہاری خدمات کا صلہ تمہاری بیو
کی صورت میں دے ـــــ "

اُسی وقت میں نے اپنے غیر مرئی حریف کو اپنا آخری حربہ استعمال کرتے دیکھا۔ بھاگو کی بیوی کے لب پھڑکنے لگے۔ نبض
میرے ہاتھ میں تھی مدھم ہو کر شانہ کی طرف سرکنے لگی۔ میرے غیر مرئی حریف نے جس کی عموماً فتح ہوتی تھی حسب معمول پھر مجھے چا
چت گرایا۔ میں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا " بھاگو! بدنصیب بھاگو! تمہیں اپنی قربانی کا یہ عجیب صلہ ملا ہے ـــــ "

بھاگو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

آہ! وہ نظارہ کتنا دلدوز تھا جبکہ بھاگو نے اپنے بلبلاتے ہوئے بچے کو اسکی ماں سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا او
نہایت عجز و انکسار سے واپس لوٹا دیا۔

میرا خیال تھا کہ اب بھاگو اپنی دُنیا کو تاریک پا کر کسی کا خیال نہ کرے گا . . . . . مگر اُس سے اگلے روز میں نے
بیش از پیش مریضوں کی امداد کرتے دیکھا۔ اُس نے سینکڑوں گھروں کو بے چراغ ہونے سے بچا لیا ـــــ اور اپنی زندگ
ہیچ سمجھا۔ میں نے بھی بھاگو کی تقلید میں نہایت مستعدی سے کام کیا۔ کوارنٹین اور ہسپتالوں سے فارغ ہو کر اپنے فالتو وقت

نے شہر کے غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر جو کہ بدرروؤں کے کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے باغلاظت کے سبب بیماری کا مسکن تھے، رجوع کیا۔

(۴)

اب فضا بیماری کے جراثیم سے بالکل پاک ہو چکی تھی۔ شہر کو بالکل دھوڈالا گیا تھا۔ چوہوں کا کہیں نام و نشان دکھائی نہ دیتا تھا سارے شہر میں صرف ایک آدھ کیس ہوتا جس کی طرف فوری توجہ دیئے جانے پر بیماری کے بڑھنے کا احتمال باقی نہ رہا۔

کاروبارِ شہر نے اپنی طبعی حالت اختیار کر لی، سکول، کالج اور دفاتر کھلنے لگے۔

ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی وہ یہ تھی کہ بازار میں گزرتے وقت چاروں طرف سے انگلیاں مجھی پر اٹھتیں۔ لوگ احسانمندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے۔ اخبارات اور مجالس متفقہ طور پر میری تعریف میں رطب اللسان تھے۔ اخباروں میں تعریفی کلمات کے ساتھ میری تصاویر چھپیں۔ اس چاروں طرف سے تحسین و آفرین کی بوچھاڑ نے میرے دل میں کچھ غرور سا پیدا کر دیا۔

آخر ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں شہر کے بڑے بڑے رئیسوں اور ڈاکٹر مدعو کیے گئے۔ گورنر صاحب بہادر نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ میں صاحب صدر کے پہلو میں بٹھایا گیا کیونکہ وہ دعوت دراصل میرے ہی اعزاز میں دی گئی تھی۔ ہاروں کے بوجھ سے میری گردن جھکی جاتی تھی اور میری شخصیت بہت نمایاں معلوم ہوتی تھی۔ پُرغرور نگاہ سے میں کبھی ادھر دیکھتا کبھی اُدھر...... 'بنی آدم کی انتہائی خدمتگزاری کے صلہ میں کمیٹی شکرگزاری کے جذبہ میں معمور ایک ہزار ایک روپے کی تھیلی بطور ایک حقیر رقم کے مجھے نذر کر رہی تھی'۔

جتنے بھی لوگ موجود تھے، سب نے میری خصوصاً اور میرے رفقائے کار کی عموماً تعریف کی، اور کہا کہ گذشتہ آفت میں جتنی جانیں میری جانفشانی اور تن دہی سے بچی ہیں ان کا شمار نہیں۔ میں نے نہ دن کو دن دیکھا نہ رات کو رات۔ اپنی حیات کو حیاتِ قوم اور اپنے سرمایہ کو سرمایۂ ملت سمجھا اور بیماری کے مسکنوں میں پہنچ کر مرتے ہوئے مریضوں کو جامِ شفا پلایا!

گورنر صاحب نے میز کے بائیں پہلو میں کھڑے ہو کر ایک پتلی سی چھڑی ہاتھ میں لی اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے اُن کی توجہ اُس سیاہ لکیر کی طرف دلائی جو دیوار پر آویزاں نقشے میں بیماری کے دنوں میں صحت کے درجہ کی طرف ہر لحظہ اُفتاں و خیزاں بڑھی جا رہی تھی۔ آخر میں گورنر صاحب نے نقشہ میں وہ دن بھی دکھایا جب میرے زیرِ نگرانی چوّن مریض رکھے گئے اور وہ تمام کے تمام صحت یاب ہو گئے یعنی نتیجہ سو فیصدی کامیابی رہا اور وہ سیاہ لکیر اپنی معراج کو پہنچ گئی۔

ہال تالیوں اور تحسین و آفرین کی آوازوں سے گونج اُٹھا۔

اس کے بعد گورنر صاحب نے اپنی تقریر میں میری ہمت کو بہت کچھ سراہا اور کہا کہ لوگ یہ جان کر بہت خوش ہوں گے کہ بخشی جی اپنی خدمات کے صلہ میں لفٹیننٹ کرنل بنائے جا رہے ہیں۔

ہال ایک دفعہ پھر نہایت پُرشور تالیوں سے گونج اُٹھا۔

اُنہی تالیوں کے شور کے درمیان میں نے اپنی پُرغرور گردن اُٹھائی اور گورنر اور معزز حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس میں علاوہ اور باتوں کے میں نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی توجہ کے قابل ہسپتال اور کوارنٹین ہی نہیں تھے بلکہ اُن کی توجہ کے قابل غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر تھے۔ وہ لوگ اپنی مدد کے بالکل ناقابل تھے اور وہی زیادہ اُس موذی بیماری کا شکار ہوئے۔ میں نے اور میرے رُفقا نے بیماری کے صحیح مقام کو تلاش کیا اور اپنی پوری توجہ بیماری کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے میں صرف کر دی۔ کوارنٹین اور ہسپتال سے فارغ ہو کر ہم نے راتیں انھیں خوفناک مسکنوں میں گزاریں۔

آخر میں مَیں نے خدا سے دُعا مانگی کہ وہ انسان کو ایسے عذابوں سے بچائے اور کہا کہ کاش مجھ کو اور میرے بھائیوں کو ہمت ہو کہ وہ اپنی زندگی پر کھیل کر بنی آدم کی امداد کیا کریں۔

گورنر صاحب کی اور میری تقاریر پریس میں بڑی بڑی سُرخیوں سے چھپیں اور میں چند ہی دنوں میں صوبوی شہرت کا مالک ہو گیا۔

اسی دن جلسہ کے بعد جب میں بطور ایک لفٹیننٹ کرنل کے اپنی پُرغرور گردن کو اُٹھائے، ہاروں سے لدا پھندا، لوگوں کا "ناچیز ہدیہ" ایک ہزار ایک روپے کی صُورت میں جیب میں ڈالے ہوئے گھر پہنچا تو مجھے ایک طرف سے آواز آئی "بابوجی — بہت بہت مبارک ہو" —

اور بھاگو نے مبارک باد دیتے وقت اپنی پُرانی جھاڑو ایک طرف رکھ دی۔ میں بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔ یکایک میرے دماغ میں گذشتہ واقعات نے چکر لگایا اور میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی پُرغرور گردن کو اُٹھائے ہاروں سے لدا پھندا آسمان سے سر کو لگائے کتنا چھوٹا تھا، اخبارات اور جلسوں نے میری کتنی عزت و توقیر بڑھائی مگر اس بچارے کو کسی نے نہ پوچھا اور اسے ذرا بھی افسوس نہیں۔ حالانکہ اُس کی خدمات کے مقابلہ میں میری خدمات کتنی ہیچ ہیں۔ یہ ہے دُنیا کی بے انصافی! — اس کے سامنے ایسی وضع قطع بنا کر کھڑا ہونا میرے لئے کتنا باعثِ ننگ ہے۔ ہاں اس کے سامنے جس نے اپنی بیوی اور بعد میں اپنے بچے کو بھی اپنے فرض پر قربان کر دیا ہے — آہ!

میں کچھ دیر بالکل مبہوت کھڑا رہا۔

پھر میں نے نہایت آہستہ اور ملائم آواز میں کہا "بھاگو — بھائی — نزدیک تو آؤ۔"

بھاگو نزدیک آیا تو میں اُس کے گلے سے لپٹ گیا، اپنے ہار اُتار کر اُس کے پاؤں پر رکھ دیئے۔ ایک ہزار ایک روپے کا بٹوہ اُس کی مٹھی میں دے دیا۔ . . بھاگو حیران و ششدر کھڑا رہ گیا۔ میں نے اُسے زبردستی خاموش رہنے کو کہا۔

"اگر دنیا نہیں جانتی بھاگو، تو نہ جانے، میں تو جانتا ہوں۔ تمہارا یسوع تو جانتا ہے — پادری ل آبے کے بے مثال چیلے تجھ پر خدا کی رحمت ہو — !"

پھر اتنے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود میں بے توقیر ہو کر اس قدر ناشناس دُنیا کے ماتم میں رونے لگا۔

راجندر سنگھ بیدی

علامہ اقبال مرحوم

موت کی تاریکیوں میں رو رہی تھی زندگی
خلوتِ خاموشِ شب میں سو رہی تھی زندگی

انتظارِ نغمہ زن میں زندگی کا ساز تھا
بربطِ خاموشِ ہستی گوش بر آواز تھا

یک بیک اِک طائرِ آتش نوا پیدا ہُوا
آسماں کی سرزمیں پر حشر سا برپا ہُوا

جانبِ پستی اُڑا وہ خوش نوا گاتا ہُوا
آتشیں نغموں سے اپنے آگ برساتا ہُوا

زہرہ و ناہید کی محفل کو گرماتا ہُوا
خونِ تازہ زندگی کی رگ میں دوڑاتا ہُوا

صبح کی قندیل روشن کی سوادِ شام میں
جان سی پھر ڈال دی خاکسترِ ایّام میں

نغمۂ اقبال تھا یا صُورِ اسرافیل تھا
دم بخود، ہیبت زدہ، سہما ہُوا جبریل تھا

مرتبہ اقبال کا دُنیا نے پہچانا نہیں
یہ مجاہد کون تھا خلقت نے پہچانا نہیں

آہ محفل میں نہیں وہ ساقیِ محشر بدوش
جس کے ہنگاموں سے برپا تھا قیامت کا خروش

"جس کے آوازے سے لذّت گیر اب تک گوش ہے"
"وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے"

مظفر حسین شمیم

تربیتِ جنسی اور سماج

حبب شباب کا آغاز ہو اور رگوں میں جوانی کا خون جوش مارتا ہو تو ہر نوجوان دِل کی دھڑکنوں کے ساتھ رنگین اُمیدیں پرورش
ہیں۔ جذبات کی دُنیا لہراتی ہے، زندگی یکسر رومان اور فضا نغمہ و تبسّم سے لبریز نظر آتی ہے۔ سنہری تخیلات کی موجیں موتول
ٹ بن کر تھرتھراتی ہیں، ہر سانس ساغر چھلکاتی اور ہر نفس صبائے کیف لنڈھاتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان ہواؤں
در لہروں پر سوار ہا ہے۔ عمر کا یہی وہ حصّہ ہے جب بے اختیار گنگنانے، بے وجہ مُسکرانے اور کسی کی بارگاہِ ناز میں سجدہ ہائے
رنے کو جی چاہتا ہے۔

س "جوشِ نمو" اور "سکر و کیف" کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ اس تمام "ذوقِ عبودیت" کی تہ میں شدید ترین
ے جنسی" کی تڑپ ملتی ہے اور عشق و محبت اور حُسن و شباب کی تمام کار فرمائیاں اسی عنوان سے شروع ہوتی ہیں۔ محبت
رسے بلند اور پست سے پست تصوّر آپ کر لیجیے، اس کی بُنیاد آپ اسی جنسی تڑپ پر پائیں گے جو نیک و بد سیرتوں کے
ں مختلف جلوؤں کی مظہر بنتی ہے، کیونکہ "تقاضائے جنسی" یا دوسرے الفاظ میں "محبت" کا مقصدِ اصلی "حظِ نفس" ہے، اور
افتہ اور غیر تربیت یافتہ نفس کی تسکین کے پہلو مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ کسی نفس کا منتہائے نظر صرف "اتصالِ جنسی" ہوتا
کا اتصالِ بدن، اور کسی کا اتصالِ روح و نظر۔ محور ان سب کا ایک ہی ہے اگرچہ گردشیں مختلف ہیں۔ اس کا ایک آسان ثبوت
عورت کا حُسن، سبزہ کی لہک، پھولوں کی مہک، آبشار کے ترنم، شفق کی رنگینی، ہوا کی سنسناہٹ اور کلیوں کی چٹک وغیرہ سے
ر بوڑھوں کے دلوں میں والہانہ کیف اور "گم شدگی" کی وہ کیفیت نظر نہیں آتی جو نوجوانوں میں پائی جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ
دِ طفولیت اور سِنِ کہولت میں "جذبۂ نفس" و "تقاضائے جنسی" بہت کمزور اور پژمردہ ہوتا ہے اور جوانی میں پورے زور
پر۔

لغرض تقاضائے جنسی ایک فطری جذبہ ہے اور اس کی طاقت عظیم الشان طاقت ہے۔ اس کی اگر نفسیاتی اصُولوں پر صحیح
کی جائے تو انتہائی وحشت و بربریت پر منتج ہوتا ہے جس سے نفس کی گندگی بہت گھناؤنے طریقہ پر اُبل پڑتی ہے، اور
ل سے تمام اخلاقی برائیوں کے مچھّر اُڑنے لگتے ہیں۔ لیکن تربیت پا جانے کے بعد یہی وہ طاقت ہے جو اخلاق کی پاکیزگی
ت کے مجد و شرف کا معیاری نمونہ پیش کرتی ہے اور دِل کا یہی گداز خلوص و ایثار کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ایک بھڑکتا

ہؤا شعلہ ہے جو قابُو میں آجانے کے بعد تعمیرِ تمدن میں بہت مفید مسالے کا کام دیتا ہے، اور قابُو سے باہر ہوکر پوری عمارت کو
کردیتا ہے۔ کیونکہ اس کا اشارہ پاکر مردہ و بے حس روحوں میں زندگی کی وہ تڑپ پیدا ہوجاتی ہے جو عناصر کو مسخر کرسکتی اور دہر
حکم چلاسکتی ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ ہماری سماج کے نزدیک کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ دو انسانی ہستیوں کے در
میلانِ جنسی کی بُنیادوں پر کوئی رابطہ پیدا ہوجائے، کس قدر حیرت کی بات ہے کہ فطرت کا ایک شدید ترین تقاضا جس کو کسی
سے فنا نہیں کیا جاسکتا اور اگر ایک طرف سے اُس پر دباؤ پڑے تو دُوسری جانب زیادہ شدت کے ساتھ اُبھر آتا ہے ہما
قانون میں سب سے بڑا جرم قرار پاتا ہے اور اس کے سنوارنے پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ بلکہ اس کا تذکرہ بھی بہت معیو
انتہائی بے شرمی و بداخلاقی سمجھا جاتا ہے۔

افسانے اور شاعری کی دُنیا میں تو رکیک سے رکیک جذبات کا تذکرہ نہ صرف ناگزیر بلکہ مستحسن ہے، لیکن علمی حیثیت سے
نے اِس وقت تک، جیسا کہ چاہئے، اس طرف توجہ نہیں کی۔ دو ایک کتابیں اُردو میں اس موضوع پر ضرور لکھی گئیں یا تر
گئیں، لیکن وہ یا تو اتنی ادق ہیں کہ ہر شخص اُن سے استفادہ نہیں کرسکتا یا پھر بعض میں سرسری طور پر ضمناً اس کا تذکرہ کردیا گ
اور افادی پہلو کو نظر انداز کردیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہماری تربیت گاہوں میں اس کی اصلاح و تربیت پر کوئی مستقل درس نہیں
جاتا۔ درانحالیکہ جذبۂ جنسی اخلاق کی تعمیر کا وہ بنیادی پتھر ہے جس سے قطع نظر کرلینے کے بعد اخلاق کی عمارت حوادث
تھپیڑوں اور سیلاب کے مقابلہ کے لئے زیادہ استقلال و پائیداری اپنے اندر نہیں رکھتی۔

اس مضمون کے ناظرین میں بعض بزرگ مجھ کو بے حیائی و بے شرمی کا نقیب ضرور قرار دے رہے ہوں گے، لیکن
ادب سے عرض کروں گا کہ علمِ حقائق کا پردہ پوش نہیں بلکہ حقیقت کے چہرے کا نقاب کُشا ہوتا ہے، یہ بے حیائی کی دعوت نہیں
حقیقت کی جستجو ہے، کیا ہم اپنے بچوں کو کھانے پینے کے طریقے نہیں سِکھاتے، اُن کو گفت گو کے آداب سے واقف نہیں کر
کیا سونے جاگنے چلنے پھرنے کے متعلق گفتگو کرنا عیب ہے؛ یہ سب فطری احتیاجیں ہیں، اگر تمدن نے ان کے متعلق کچھ آداب
بتائے ہیں تو جنسی احتیاج کے متعلق بھی بنائے ہوں گے جن سے واقفیت حاصل کرنا اور نوجوانوں کو اس کی تعلیم دینا ہمارا ف
آپ خود غور کیجئے کہ ہماری یہ غفلت ہماری جوان نسلوں میں کن مفاسد کا بیج بو رہی ہے؛ اور اس جذبہ کی تربیت سے زندگی کے
میں کام نہیں لیا جاسکتا؛ اب آیئے اُن اسباب کو تلاش کریں جو اس بے توجہی پر زندگی کے تمام شعبوں میں خرابیوں کی ب
کررہے ہیں!

اوّل اوّل جب آغازِ شباب میں دل میں لطیف خلش پیدا ہوتی اور جذبات میں ہلچل مچتی ہے تو لڑکا کا نہ تو خود ان احسا
کو سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی سمجھ والا ہی اس کو سمجھاتا ہے۔ وہ خود بھی ہدفِ ملامت بننے کے لئے اپنے ان نئے محسوسات کو کسی

سامنے ظاہر نہیں کرتا۔ اس طرح اُس میں بے حسی جڑ پکڑ لیتی ہے اور اپنے اور دوسروں کی حسیات کا تجزیہ کرنے اور اُن کو سمجھنے کی صلاحیت فنا ہوتی جاتی ہے۔

پھر جن کے سامنے یہ باتیں ظاہر کی جاتی ہیں وہ اس کے ہم سِن اور اسی کی طرح نابلد ہوتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ حسین صُورت کا نظارہ کیوں ان کے دل کی دھڑکن تیز کر دیتا ہے؛ دلکش راگ کیوں ان کی طبیعت کو لبھاتا ہے؛ اتفاقاً کسی جوان جسم کا لمس کیوں ان کے بدن میں بجلی کا سا ارتعاش پیدا کر دیتا ہے؛ اُن کے دِل میں میٹھا میٹھا درد کیوں ہوتا ہے؛ کیا چیز ان کو گنگنانے اور آپ ہی آپ مسکرانے پر اُکساتی ہے؛ اور کبھی کبھی ان کو بلا وجہ تنہائی کس لئے مرغوب ہوتی ہے؟

علاوہ ازیں وہ نہیں جانتے کہ اُنھوں نے زندگی کی کس منزل میں قدم رکھا ہے اور اس راستہ پر ان کو کس طرح چلنا ہے؛ لہٰذا ہوا کے موافق یا مخالف جھونکے جدھر چاہتے ہیں اُن کو موڑ دیتے ہیں اور اس طرح طبیعت میں جو ہچکچاہٹ اور گھٹاؤ یا بہیمانہ آزادی اور غیر ذمہ داری جڑ پکڑ لیتی ہے وہ آخر عمر تک نہیں جاتی۔

اس وقت اُن کے معلمین کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور اُن کے حرکات وسکنات سے اُن کے جذبات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر کے، نفسیاتِ شباب کے اصُولوں کے ماتحت اُن کو صحیح تربیت دیں اور بتلائیں کہ وہ اب زندگی کی کس راہ پر گامزن ہیں اور یہاں اُن کو کس طرح قدم اُٹھانا چاہئے۔

چونکہ سماج کے نزدیک محبت جرم ہے لہٰذا جب دو انسانی ہستیوں میں اس قسم کی یگانگت پیدا ہوتی ہے تو وہ ہیئتِ اجتماعی کے زیر اثر یہ سمجھ کر کہ ہم کسی بہت ہی خطرناک اور ناپاک جرم کے مُرتکب ہو رہے ہیں اپنے خیالات وجذبات کو ناجائز حد تک چھپا کر مجرمانہ ذہنیت کے مہلک اور سریع التاثیر جراثیم غیر شعوری طور پر اپنے اندر پالتے رہتے ہیں۔ افشائے راز کا خوف ہر وقت ان پر مسلط رہتا ہے، وہ چھپ چھپ کر ملاقات وگفتگو کے مواقع نکالتے ہیں۔ اور نتیجہ ان سب کا یہ ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی ساخت مستقل طور پر سازشی اور بزدلانہ نوعیت اختیار کر لیتی ہے، صداقت وحقیقت کی طرف سے ان کے دِل میں ہمیشہ کے لئے ڈر بیٹھ جاتا ہے، مکر و دروغ ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے، ان کے ذہن میں پستی، کردار وعزائم میں کمزوری، مزاج میں تلوّن، لہجہ میں نا دگی، طبیعت میں بُزدلانہ شرم اور اخلاق میں ریاکاری آجاتی ہے۔ وہ بے باک فطرت، نڈر دل، بلندیٔ نظر، صفائی قلب اور اخلاقی جرأت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جنسی جذبات پر سماج بجز ملامت وسرزنش کے اور کسی حیثیت سے توجہ نہیں کرتی اس لئے محبت کی تباہ کاریاں ہی زیادہ دکھلائی دیتی ہیں۔ اگر کسی کا دماغ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے تو وہ از خود اپنے جذبۂ جنسی کی تربیت کر کے اپنی انسانیت کو جلا کر لیتا ہے، ورنہ عام طور پر اس کا تاریک پہلو ہی منظرِ عام پر آتا رہتا ہے جس کے باعث اس کو اور زیادہ قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔

اگر آپ تحقیق کریں تو بہت تھوڑی جستجو کے ساتھ آپ کو ایسی متعدد مثالیں ملیں گی کہ ایک نکمی نفرت کا لڑکا جو بلید الطبع بھی ہے اور فکر و نظر اور کردار و عزائم کے اعتبار سے بھی پست ہے جو اپنی زندگی کا مصرف نہیں جانتا اور اس کو ناقابل برداشت بوجھ تصوّر کرتا ہے، محبت کا سہارا پا کر اُٹھتا ہے، حیرت انگیز طریقہ پر اپنا چولا بدل کر کشاکش حیات میں مردانہ وار حصّہ لیتا اور زندگی کا اعلیٰ نصب العین حاصل کر لینے میں محیر العقول کارنامے دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، گویا اس کے ساز زندگی کے بہترین نغمے سوئے ہوئے تھے، جو مناسب مضراب پڑتے ہی تار تار سے نکلنے لگے، یا یہ کہ ایک اچھا خاصا ترقی کرنے والا نوجوان محبت میں ناکام ہو جانے اور سماج کے زیرِ عتاب ہو جانے کے بعد یکایک بلندی و رفعت کے منارے سے پستی و جہالت کے گہرے اور تاریک غار میں اوندھے مُنہ جا گرتا ہے، گویا وہ شبنم کا ایک قطرہ تھا جو تمازتِ آفتاب کی تاب نہ لا کر فنا ہو گیا۔ اور اُن خوش قسمتوں کی تعداد تو بہت ہی کم ہے جو حُسنِ اتفاق سے اپنی فطرت کے مطابق شریکِ زندگی حاصل کر کے شادی ہو جانے کے بعد محبت کی لذتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔

علم و بصیرت کے اس دَور میں محبت صرف رُومانی گیتوں کے لئے ہی مخصوص نہیں رہی ہے، بلکہ وہ اس وقت علم النفس کی ایک جُداگانہ شاخ اور فلسفہ کا ایک اہم موضوعِ بحث ہے، جس کے ماتحت مہذّب قومیں اپنے نوجوانوں کے جذبۂ جنسی کی صحیح اُصولوں پر تربیت کر کے ان کو قوم و وطن کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد بناتی ہیں۔

اگرچہ میں نے اس مضمون میں صرف مردوں کے جذبات سے بحث کی ہے اور وہ بھی بہت ہی تشنہ و نامکمل ہے لیکن تربیتِ جنسی صنفِ نازک کے لئے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ صنفِ قوی کے لئے بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ، کیونکہ مرد کے مقابلہ میں عورت زیادہ ذہین اور ذکی الحس ہوتی ہے، وہ اضطرابِ درونی و خلشِ باطنی کو مرد سے پہلے محسوس کرتی ہے۔

بہرحال ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سماجی حیثیت سے ان تمام اُمور کے پیشِ نظر تقاضائے جنسی و جذبۂ نفسانی کے متعلق اپنے روایتی فیصلۂ نفرت و ملامت پر نظرِ ثانی کر کے اپنے قانونِ تربیت میں چند دفعات کا اضافہ کریں اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ تربیتِ جنسی کے لئے بھی اپنے معاشرتی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ اصُول وضع کریں۔ کیونکہ ذہنی و اخلاقی تربیت کا تمام تر دار و مدار اسی تربیتِ جنسی پر ہے۔ مجھ کو اُمید ہے کہ ہمارے ملک کے اربابِ فکر و بصیرت اس پر اپنی آراء کا اظہار کرتے ہوئے کوئی صحیح راہِ عمل متعین کریں گے۔

نعمان شاغل بھوپالی

محبت روحِ جسمِ عارضی ہے — محبت زندگی کی زندگی ہے
محبت غایت الغایاتِ ہستی — محبت حق نما ہے حق رسی ہے

اللہ والا فلسفی

کیوں گزشتہ ساعتیں پھر مجھ کو تڑپانے لگیں
زندگی کی حسرتیں پھر دل میں گھبرانے لگیں

بن گیا پھر کیوں پریشاں کُن یہ فانوسِ خیال
وحشتیں پھر کیوں مری تخئیل پر چھانے لگیں

انبساطِ زندگی کی خوش نُما تنویر میں
موت کی سی صورتیں کیوں کر نظر آنے لگیں

اُٹھ گیا دُنیا سے کوئی زندۂ جاوید کیا
کیوں فنا کی بدلیاں دُنیا پہ منڈلانے لگیں

رو رہا ہے کون یہ لے لے کے نام اقبال کا
کچھ لحاظ اس کو نہیں مجھ سے پریشاں حال کا

کیوں نہ مضطر ہوں، نہیں ہے دستِ بیجا اضطراب
اور بڑھنا چاہیے اس وقت میرا اضطراب

مجھ پر اپنا کر قیاس اے ہمنوا تُو ہی بتا
آہ اطمینان حاصل ہے تجھے یا اضطراب

جانتے تھے اپنا رہبر ہم سبھی اقبال کو
کیوں نہ ہوں پھر اس کی فرقت میں سراپا اضطراب

کیا خبر تھی یہ خبر اس درجہ ہوگی جانگسل
ہوگیا محتاجِ تدبیر آہ دل کا اضطراب

اطلاعِ رحلتِ اقبال میں کیونکر سنوں؟
یہ خبر اُچُپ ہے نقیبِ جاہِ پیغمبر سنوں؟

مُلک و ملّت کا حقیقی رہنما جاتا رہا
آدمیت کا دلِ درد آشنا جاتا رہا

قوم کی بیداریوں کو ناز تھا جس فرد پر
آہ وہ فردِ یگانہ کیا ہوا؛ جاتا رہا

کیوں نظر آتا نہیں وہ رہبروں کا راہبر
مُدعی جو رہنمائی کا نہ تھا، جاتا رہا

حاسّہ بیدار اس نے کر دیا کُل قوم کا
جاذبِ مخلص دلِ حسّاس کا جاتا رہا

جوشش اس کی قیادت میں تھی اوروں میں کہاں

آہ وہ حسنِ تخاطب، اُف وہ تاثیرِ بیاں

اس کی تعلیمات سے روشن ہوئے صدہا چراغ — تھا دل افروزکب رقوم وہ روشن دماغ
ہند میں رہ کر حجازی منزلیں کرتے ہیں طے — ہم نے کیسے کیسے اس رہبر سے پائے ہیں سُراغ
فرق پر اس کے جنابِ قاسمِ کوثر کا ہاتھ — ہاتھ میں اس کے مئے عرفاں کا نورانی ایاغ
غم رُبا اقبال کا ہر شعر عشرت ریز ہے — ہر پیام اس کا ہمارے واسطے گلریز باغ

بھر دیا مقصود کے پھولوں سے دامن قوم کا
عطر افشاں ہے انہیں پھولوں سے مسکن قوم کا

ہوگیا شل اس کی زد سے مفسدوں کا دستِ کید — حبۃً للہ مٹایا اختلافِ عمرو و زید
مستفید اس سے ہوا ہر فرد، دیکھو تو سہی — کون ہے صیاد خوشدل، کون ہے غمناک صید؟
قوم کو سمجھا دیئے اس نے نکاتِ اتحاد — اس کی آزادانہ روش نے توڑ دی فرقوں کی قید
اب ہے جس منزل میں وہ اللہ والا فلسفی — اس سے لے منظور واقف ہیں سنائی و جنید

دے رہے ہیں گرچہ ظاہر میں صدائے الوداع
اس حیات آثار سے تُو کہہ بجائے الوداع :-

السّلام اے رہنمائے ملک و ملّت السلام! — السّلام اے پیروِ "ختمِ رسالت" السلام!
در ضیائے ملّتِ بیضا لوائش یافتی — السلام اے طلعت افروزِ قیادت السلام!
آیتے بودی تو از آیاتِ ایمان و یقیں — السلام اے صاحبِ فضل و کرامت السلام!
جلوۂ تنظیمِ ملّت می دہد ہر نظم تو — السلام اے شاعرِ خورشید سیرت السلام

بر سپہرِ مجد نامِ روشنت تابندہ باد!
با ہزاراں جاہ و نعمت قومِ تو پائندہ باد!

علی منظور حیدرآبادی

اُمیدوں کی دُنیا

یہ افسانہ میں نے ۸ ارفروری ۱۹۳۸ء کی شام کو آل انڈیا ریڈیو کے لاہور اسٹیشن سے براڈ کاسٹ کیا۔ (ح۔ ا)

حمید ایک ایسے خاندان کا چشم وچراغ تھا جس کے افراد پُشتوں سے غریبی اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے آئے تھے۔ ابھی اُس نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ماں نے اکلوتے بیٹے کی نگہداشت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ محنت مشقت کرکے اور اکثر اپنی بساط سے بڑھ کر اُس کی پرورش کا خیال رکھتی اور اسے دیکھ دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی کیونکہ اس تیرہ وتاریک دُنیا میں وہی اُس کی اُمیدوں کا آخری سہارا تھا۔ ذرا سیانا ہوا تو اس میں غیر معمولی ذہانت کے آثار نظر آنے لگے۔ ماں نے کچھ اپنی مزدوری کے بل بُوتے پر اور کچھ محلے والوں کی امداد کے بھروسے پر اُسے سکول میں داخل کرا دیا۔ یہ اُس کے لئے اجتماعی زندگی کی ابتدا تھی کیونکہ اس سے پہلے ماں نے اُسے کبھی گھر سے باہر نہیں جانے دیا تھا۔ وہ اُسے لمحہ بھر کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی، اس خیال سے کہ اُسے کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔ لیکن غالباً اس کی سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ محلے کے امیر اور آسودہ حال بچوں کو دیکھ کر اُسے اپنی خراب حالت اور غربت کا احساس نہ ہو اور یہ احساس بڑھتے بڑھتے اُسے پست ہمت نہ کردے، اور وہ اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھنے لگے۔

گھر سے باہر اُس کی دُنیا سکول کی چار دیواری تک محدود تھی۔ یہاں اُس نے طرح طرح کے لڑکوں کو دیکھا ان میں سے بعض امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے، بعض مالی حیثیت سے درمیانے درجے کے والدین کی اولاد تھے اور بعض اُس کی طرح خستہ حال، وہ ان سب کی شکل وصورت اور لباس کو غور سے دیکھتا۔ اس فرق پر حیران ضرور ہوتا لیکن ان سب سے الگ تھلگ رہتا۔

حمید اپنے ہم جماعتوں میں بہت کم گو اور خاموش مشہور تھا لیکن اس کم گوئی اور خاموشی کا راز اُس کی ماں کے سوا اور کسی کو معلوم نہ تھا۔ سکول سے واپس آتا تو وہ گہری نظر سے اُس کے چہرے کا مطالعہ کرتی اور سکول کی زندگی کے متعلق اُس کے احساسات معلوم کرنے کے بہانے سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی۔ اگر وہ اس کے جواب میں کوئی ایسی بات کہتا جس سے اُس کی خود داری کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہوتا تو اسے تسلی دینے کے لئے فرضی قصے کہانیاں سُناتی،

ماں کی بروقت تربیت کا یہ اثر ہوا کہ غریب ہونے کے باوجود وہ تعلیم میں تمام ہم جماعتوں سے بڑھ گیا جب اُستاد بھی حوصلہ افزائی کرنے لگے تو اُس کے پاس اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کی کوئی وجہ نہ رہی۔ وہ فخر آمیز مسکراہٹ سے اپنے اُن حریفوں کی طرف

دیکھتا جوغرور کی وجہ سے اُس کی حالت پر ہنسا کرتے تھے۔ ماں جب یہ دیکھتی کہ میری محنت کارگر ثابت ہوئی تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ وہ سکول سے فارغ ہو کر سیدھا گھر پہنچتا تو اُس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ حمید کو اب یقین ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ اُسی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ جن قصے کہانیوں کو وہ محض فرضی سمجھتا تھا اب اُن میں حقیقت کی جھلک نظر آنے لگی اور اُس کے دل میں اپنے آپ پر اعتماد کا جذبہ روز بروز ترقی کرتا گیا۔

تعلیم میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے سبب ہر درجے میں انعام اور وظیفے حاصل کرتا جس سے مالی مشکلات بھی ذرا کم ہو گئیں۔ نادار طلبہ کے لئے عموماً سکول کی تعلیم کے بعد اعلےٰ تعلیم کا جاری رکھنا مشکل ہو جایا کرتا ہے۔ اکثر ایسے ہونہار اور قابل طالب علم جن کے متعلق یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر انہیں موقع دیا جائے اور تمام سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تو شہرت کے آسمان پر سورج کی طرح چمکیں گے محض مفلسی کی وجہ سے زندگی کی کٹھن منزل میں گردِ راہ بن کر رہ جاتے ہیں بہت سے بے بہا گوہر اسی طرح بے قدری اور مایوسی کی خاک میں مِل جایا کرتے ہیں۔

لیکن حمید اس معاملے میں ذرا خوش قسمت واقع ہوا تھا۔ کیونکہ جب اُس نے انٹرنس میں اعلےٰ درجے کی کامیابی حاصل کی اور اُسے وظیفہ مِل گیا تو اُس کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کو دیکھ کر اُستادوں نے اُسے تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا، اور ہر ممکن طریقے سے اُس کی امداد کا وعدہ کیا۔ اگر اُس کے اپنے شہر میں کالج نہ ہوتا تو شاید وہ اس مشورے پر عمل نہ کر سکتا کیونکہ اُس صورت میں خرچ زیادہ ہو جانے کے علاوہ ماں اُس کی جُدائی گوارا نہ کر سکتی۔ خیر حالات نے اُس سے موافقت کی اور وہ جُوں تُوں کر کے کالج میں داخل ہو گیا۔

یہاں کی فضا سکول سے بالکل مختلف تھی۔ سکول میں تو اُسے اپنے جیسے بہت سے طُلبہ کو دیکھ کر کچھ تسلّی بھی ہو جاتی تھی مگر یہاں اُس قسم کے طالب علموں کی تعداد زیادہ تھی جن کی تلخ یاد سکول کی زندگی نے ہمیشہ کے لئے اُس کے دل سے وابستہ کر دی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ وہ اس نئے ماحول میں جی ہار بیٹھتا لیکن ماں کی محبت آمیز نصیحتیں اور ثابت قدمی کی تلقین یہاں بھی بار آور ثابت ہوئی اور حمید کا نام اُن طلبہ میں شمار ہونے لگا جو کالج کے لئے فخر کا باعث سمجھے جاتے تھے، وہ ہر امتحان اور ہر مضمون میں اوّل رہنے لگا۔

دو سال کی مختصر مدت خواب کی طرح گزر گئی اور حمید نے ایف۔ اے کے امتحان میں بھی گذشتہ روایات کو قائم رکھا۔ اس کا نام کالج کے "اعزازی بورڈ" کی زینت بن گیا جسے بعض حسد اور بعض رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

اب وہ بی۔ اے میں تعلیم پا رہا ہے۔ وظیفے اور ٹیوشنوں کی قلیل آمدنی سے تعلیم کا خرچ بھی پُورا کرتا ہے اور بمشکل اپنا اور ماں کا پیٹ بھی بھرتا ہے۔ ماں اُس کی روز افزوں ترقی کو دیکھ کر جی رہی ہے اور خُدا کی درگاہ سے ایک شاندار مستقبل کی

آس لگائے بیٹھی ہے

(۲)

رات کافی گزر چکی ہے، سڑک پر آمد و رفت بھی کم ہو گئی ہے۔ حمید ایک بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑا روشنی میں کتاب پڑھ رہا ہے، تھک جاتا ہے تو کتاب بغل میں داب کر سڑک کے آر پار ٹہلنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر اس خیال سے کہ صبح امتحان ہے اور آخری پرچہ ہے، کتاب کھول لیتا ہے۔ کبھی مطالعہ کے دَوران میں ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک چلا جاتا ہے کبھی ایک ہی کھمبے کے نیچے کھڑا ہو جاتا ہے، کبھی نیند کے غلبے سے کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر اس طرح گر جاتی ہے، جیسے سوتے ہوئے بچے کے ہاتھ سے کھلونا۔ آخر قوتِ ارادی کے سہارے دوبارہ مطالعے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ غرض اس طرح وہ امتحان کے آخری پرچے کی تیاری کر رہا ہے۔

"پوں ۔ پوں ۔ پوں" ۔۔۔ دفعتہً موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"بے وقوف! آنکھیں خراب کرے گا!" ان الفاظ کے سنتے ہی موٹر کے اندر سے ایک زبردست قہقہے کی آواز بلند ہوتی ہے اور وہ فرّاٹے بھرتی ہوئی پاس سے گزر جاتی ہے لیکن حمید ٹس سے مس نہیں ہوتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دو آدمی اُسی راستے سے گزرتے ہیں اور اس حالت میں اُسے مصروفِ مطالعہ پا کر جی کھول کر ہنستے ہیں۔

"عجیب احمق ہے! یہ امتحان میں ضرور کامیاب ہوگا!"

اس قسم کے بہت سے آوازے کان میں پڑتے ہیں۔ یک لخت کتاب ہاتھ سے گر پڑتی ہے اور وہ اپنے خیالات میں کھو جاتا ہے۔

"بے وقوف! احمق!!" لیکن کیا یہی دُنیا بھر کی عقل کے اجارہ دار ہیں؟ اگر یہ غلط ہے تو اس تمسخر کا مطلب؟ وہ تنگ و تاریک کوٹھڑی جس میں مٹی کا دیا تک نہیں ...... مگر نہیں! مجھے ان لوگوں کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ یہ عقلمند ہیں، میں بے وقوف! یہ سب کچھ درست، مگر صبح امتحان ہے، اور میرے مستقبل کا فیصلہ آج کی رات پر منحصر ہے، پہلے پرچے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ اگر صبح کے پرچے میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو خُدا جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ پچھلے سال منیر نے تمام پرچوں میں اول درجہ کے نمبر حاصل کئے تھے، لیکن صرف ایک پرچے میں فیل ہو جانے سے وہ امتحان میں ناکام رہا۔ اگر میں اس سال فیل ہو گیا تو اگلے سال مقابلے کے کسی امتحان میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔"

زمین سے کتاب اُٹھا کر پڑھنا چاہتا ہے لیکن ایک اور موٹر کے ہارن کی آواز خیالات کے اس سلسلے کو منقطع کر دیتی ہے اور وُہی الفاظ پھر کانوں میں گونجنے لگتے ہیں

"بے وقوف! آنکھیں خراب کرے گا" اس کے ساتھ ہی یہ الفاظ بھی یاد آ جاتے ہیں،

"عجیب احمق ہے۔ یہ امتحان میں ضرور کامیاب ہوگا!"

آنکھیں مجبوراً کتاب کے صفحے پر جمی ہوئی ہیں۔ لیکن دل میں خیالات کا ایک طوفان برپا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دُنیا میں اس طرح محسوس کرنے لگتا ہے جیسے کوئی پاگل کسی اجنبی شہر میں جا نکلے جہاں اُسے جاننے اور پہچاننے والا کوئی نہ ہو۔ طرح طرح کے خیال دل میں گزرتے ہیں۔

"چند گھنٹے اور باقی ہیں کل دوپہر تک امتحان ختم ہوجائے گا۔ شب و روز کی لگاتار محنت! اور اس سے بڑھ کر ماں کی دُعائیں! مَیں ضرور کامیاب ہوں گا۔ ممکن ہے اوّل درجے میں پاس ہوں۔ عجب نہیں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہوں۔ مقابلے کا امتحان معمولی بات ہے، اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو ممکن ہے کسی بڑے عہدے پر پہنچ جاؤں پھر میں بھی دُنیا میں عقلمند کہلاؤں گا۔ بے زری اور مفلسی کا داغ میری جبین سے دُھل جائے گا! اور وہی لوگ جو آج میری خستہ حالی کا مذاق اُڑا رہے ہیں مجھے احترام کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ قرض خواہوں کے آنے اور ان کے تقاضے بھی ختم ہوجائیں گے۔"

"ٹن ٹن ٹن ٹن . . . ." بارہ بج گئے! آج وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے، ماں میری راہ تک رہی ہوگی اور میرے لئے دُعائیں مانگ رہی ہوگی۔ ممکن ہے کہ مستقبل کی وہ روشن تصویر جو میری چشمِ تصور کے سامنے پھر رہی ہے اُس کی نظروں کے سامنے بھی ہو اور یہی اُسے میرے لئے شب بیداری پر مجبور کر رہی ہو۔ مجھے اُس نے کس محنت اور مشقت سے پالا، اگر کل کا پرچہ خراب ہوگیا تو اُس کی آرزوؤں کا کیا حشر ہوگا۔ لیکن اُسے اُن طعنوں اور پھبتیوں کی کیا خبر جو میں روز سُنتا ہوں، خیر! یہ آخری رات ہے! سڑک پر بجلی کی روشنی میں امتحان کی تیاری کی آخری رات! کل اطمینان کی سانس لُوں گا۔"

رات کی پُرسکون اور خاموش فضا میں حمید بظاہر تنہا تھا لیکن دل میں اُمیدوں اور آرزوؤں کی ایک دُنیا بسائے کھڑا تھا۔ اس تنہائی میں اُمید و یاس کی اُس پیہم کشمکش کا کوئی راز دار نہیں تھا جو اُس کے سینے میں جاری تھی۔ ہاں بوڑھی ماں کا خیال جس نے تمام راحتیں اپنے اکلوتے بیٹے پر قربان کر دی تھیں بار بار آتا اور یہی خیال اُس کی زندگی کا سہارا تھا۔ اور ہمیشہ مایوسیوں کے اندھیرے میں اُمید کی کرن بن کر اُس کی رہنمائی کیا کرتا تھا۔ پے در پے مصیبتوں کے دَوران میں انسان کو اکثر ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ اگر اس کی زندگی کی جدوجہد کا کوئی مرکز نہ ہو تو اُس کے لئے جینا دوبھر ہوجائے۔ وُہ جانتا تھا کہ یہ ساری تگ و دَو کیوں ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ یہی وجہ تھی کہ جہاں کہیں یاس دامنگیر ہوئی فوراً اُس کا خیال ماں کی طرف جاتا تھا۔ چنانچہ اس خیال نے اُسے دوبارہ کتاب اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ آنے والے امتحان کے لئے پہلے سے زیادہ توجہ کے ساتھ مطالعہ میں مصروف ہوگیا

اب اُس نے تہیّہ کر لیا تھا کہ کسی اور طرف توجہ ہٹنے نہیں دوں گا۔ خیالات کی پریشانی پر بھی قابو پا لیا تھا۔ نیند کے غلبے کو شکست دینے کے لئے مطالعہ کے دوران میں ٹہلنا شروع کر دیتا۔ اب اُسے یقین تھا کہ کوئی چیز کتاب کے پڑھنے میں مُخل نہیں ہوگی۔ کبھی کبھی دُور سے کتّوں کے بھونکنے کی آواز یا کسی سنتری کی للکار سنائی دیتی تھی۔ لیکن وہ ان دونوں کا عادی ہو چکا تھا۔ اب اُس کی توجہ کا یہ عالم تھا کہ کوئی راہ گیر بھی اُس طرف سے گزرتا تو اُسے معلوم نہ ہوتا۔ کتاب کو بند کر کے کبھی ایک کھمبے سے دُوسرے کھمبے تک جاتا اور جو کچھ پڑھا ہوتا اُس پر غور کر کے اُسے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا۔ اسی حالت میں کبھی سڑک کے آر پار جاتا، کبھی دماغی اور جسمانی تکان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ایک آدھ منٹ کے لئے بیٹھ جاتا۔ اب اُسے ذہنی کشمکش سے کسی قدر نجات مِل چُکی تھی، اور اُس کے خیالات کا تنہا مرکز کتاب تھی۔ مختصر یہ کہ اب نہ اُس کے دِل میں سوسائٹی کی بے انصافی اور لوگوں کے ہنسی مذاق کی یاد تازہ ہوتی تھی اور نہ وہ ذہنی طور پر ان کا بدلہ لینے کے لئے ہوا میں موہوم اُمیدوں اور آرزوؤں کے محل کھڑے کرتا تھا۔ شعوری طور پر اُس کی نگاہیں کتاب کے صفحات پر مرکوز تھیں، لیکن اُس کی توجہ کا غیر شعوری مرکز ستم رسیدہ ماں کا خیال تھا۔

مطالعہ کا یہ غیر معمولی اور صبر آزما طریقہ جاری تھا کہ دُور سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ لیکن اِس دفعہ وہ اُس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہ کر سکی۔ اُس نے آواز تو سُنی لیکن بدستور کتاب میں محو رہا۔ اس وقت وہ سڑک کے آر پار ٹہل رہا تھا، کبھی اِدھر جاتا کبھی اُدھر اور یہ کوئی خلافِ معمول بات نہیں تھی۔

ہارن کی دوسری آواز عین اُس وقت آئی جب وہ سڑک کے درمیان موٹر کی زد میں آ کر گزر چکا تھا۔

"صبح امتحان ہے" ان الفاظ کے ساتھ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو) حفیظ ہوشیارپوری

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
اقبال

اقبالؒ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حصولِ قطرۂ نیساں کی خاطر جان کھوتی ہے
تو ہوتا ہے صدف کے صاف سینے سے گہر پیدا

لطافت قوتِ نشو و نما میں جذب ہوتی ہے
ہزاروں کوششوں کے بعد ہوتا ہے ثمر پیدا

خلش دردِ وطن کی روح میں نشتر چبھوتی ہے
یونہی ہوتا نہیں پیغامِ شاعر میں اثر پیدا

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"
(اقبالؒ)

بہ ایں معنٰے ہمیں اُمید رکھنی چاہیئے لیکن
نہیں ممکن کہ ہو اقبال اب بارِ دگر پیدا

شاد عارفی

دعوت

افسانہ نگاری میں فیاض محمود کی غیر معمولی فنی مہارت نے ایک قلیل مدت میں قابل رشک شہرت حاصل کر لی ہے۔ یہ مقبولیت انہیں کو حاصل ہے کہ اگر کچھ دیر مضمون نگاروں کی فہرست میں اُن کا نام نظر نہ آئے تو ہمیں قارئین کی طرف سے تقاضے کے خطوط موصول ہونے لگتے ہیں۔ معاصر ادبا میں فیاض محمود کی کردار آفرینی کا جواب پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ اُن کا افسانہ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے آفریدہ کردار جسداً ہمارے سامنے آموجود ہوئے ہیں اور ہم اُن کی حرکات و سکنات ہی کا نہیں بلکہ اُن کے بشرے کی شکنوں اور اُن کے مافی القلب جذبات تک کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ فیاض محمود حقیقت نگار ہیں اور اُن کی خردبینی جزئیات نمائی اُن کی حقیقت نگاری کو سہ آتشہ کر دیتی ہے لیکن اس پر مستزاد اُن کے قلم کی ساحرانہ جنبشیں ایک فوق العادت صناعانہ کمال کے ساتھ حقیقت میں رومان کو یوں سمو دیتی ہیں کہ افسانہ خواں کا تصور ایک صوت پے رسانے کی سی لاویز جھلملاہٹ میں کسی دیکھی اور پھر ان دیکھی خیالی جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ **حامد علی خاں**

آپ لوگ غالباً صوبیدار میجر شاہد علی خان صاحب کے نام سے واقف ہوں گے۔ میں اُن کا بھانجا ہوں، اگرچہ اس میں میرا کوئی ذاتی کمال نہیں۔ صوبیدار صاحب کے متعلق کچھ عرصہ پہلے بھی میں نے دوستوں کے کہنے پر ایک حکایت لکھی تھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ کام خطرہ سے خالی نہیں، مگر چونکہ میں نے اپنا اور اُن کا نام بدل دیا ہے اور انہیں اخبارات اور رسائل سے قطعی نفرت ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ ایک عرصے سے سفر میں ہیں مجھے اُمید ہے کہ ان کے سوانح کی یہ دوسری قسط بھی ان کے علم میں نہ آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اطمینان سے ان کی معمول سے زیادہ مصروف زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

صوبیدار صاحب کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ اس لئے انہوں نے مجھ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یوں بھی نوکروں کو سخت سُست کہنے کے علاوہ انہیں شاید اس امر کی خواہش بھی ہو کہ کوئی خاص الخاص مقرب بھی چاہئے جسے دعوے کے ساتھ جو جی میں آئے کہا جا سکے اور جو ہر حالت میں، ہر موقع پر دل کی بھڑاس نکالنے میں خاموش سامع کا کام دے سکے اور اک وجہ یہ بھی ہو گی، اگرچہ یہ وجہ فقط مجھی کو معلوم ہے، کہ چونکہ زنان خانہ میں صوبیدار صاحب کے اکثر عادات پر بے لاگ نکتہ چینی ممانی جان کی طبیعت میں داخل ہو گیا ہے اس لئے صوبیدار صاحب کو اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ انہیں کوئی ایسا ہم نشیں مل جائے جس کے سامنے وہ طبقہ نسوانی کے متعلق نہایت واضح الفاظ میں، بغیر کسی رعایت کے، اپنے چیدہ چیدہ خیالات کا اظہار کر سکیں۔ چنانچہ اس منصب کے لئے میرے اعمال کی یاداشت میں اور قضا و قدر کے کسی پُراسرار فیصلے کے مطابق ماموں جان نے مجھے منتخب کیا۔ شاید اس لئے بھی کہ والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور والدہ صاحبہ کو یہ اشارہ کافی تھا کہ صوبیدار صاحب کی جو جائداد ہے وہ کہاں جائے گی، نہ ان کا کوئی بھائی ہے نہ بھتیجا۔ بہرحال میں کچھ عرصہ سے صوبیدار صاحب کی کوٹھی "کہکشاں" میں مقیم ہوں اور ان کے لاتعداد ارادوں، اور منصوبوں کی ترتیب، انتظام اور رائج میرے ہی سپرد ہے۔

جس دعوت کے متعلق یہ واقعہ آپ کو سُنا رہا ہوں، اس کی تھوڑی بہت "شانِ نزول" بھی ضرور بیان کرنی چاہیئے۔ غالباً یوں ہوا۔ ایک دن صبح نو بجے کے قریب، جنوری کے دنوں میں، چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم دونوں گفتگو کا کوئی موضوع تلاش کر رہے تھے کہ یکایک ماموں جان نے پوچھا "تم خان بہادر چودھری علی نواز خان ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر کو جانتے ہو؟" میں نے کہا "نہیں" اس پر انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے مگر نہایت منصفانہ لہجے میں کہا "تم بالکل چغد ہو، کسی کام کے آدمی کو نہیں جانتے، معلوم نہیں تمہاری پرورش کہاں ہوئی ہے۔ ماں بیچاری تو تمہاری اچھی سمجھدار ہے، معلوم نہیں تم نے ایسا کُند دماغ کہاں سے پایا ہے کہ ذہن میں فقط دو چیزیں موجود ہیں، جن کی کوئی ضرورت نہیں، یا شعر یا فلسفہ۔ اخبار اور کتابیں تو ہر وقت پڑھتے رہتے ہو مگر نام سے کسی مشہور آدمی کے تم واقف نہیں"۔ اس لمبی تقریر کو میں خاموشی سے سُنتا رہا۔ جب اُنہوں نے ذرا دم لیا تو میں نے پوچھا "آپ کن مشہور آدمیوں کا ذکر کر رہے ہیں؟" کہنے لگے "ارے اُلّو آدمی (یہ لقب مجھے آپ کی طرف سے عنایت ہو چکا ہے) انہیں خان بہادر چودھری علی نواز خان کو لو جو میرے سب سے عزیز دوست ہیں، ہر سمجھدار شخص نے جو بالکل جاہلِ مطلق نہیں، ان کا نام سُنا ہوگا"۔

میں نے نہایت ادب سے پوچھا "مگر وہ کہاں ڈپٹی کمشنر تھے؟"

میری طرف غور سے دیکھ کر فرمانے لگے "ارے تم واقعی اتنے احمق ہو یا یونہی جاہل بننے میں تمہیں لُطف آتا ہے، ان چودھری صاحب کو تو میں نے کہتے سُنا ہے کہ پنجاب میں کوئی شخص نہ ہوگا جو انہیں نہ جانتا ہو اور تم پڑھ لکھ کر کہتے ہو کہ تم انہیں نہیں جانتے"۔

میں نے کہا "حضرت پنجاب میں بیسیوں ضلعے ہیں۔ میں کس کس ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو جانتا پھروں؟"

اس پر اُنہوں نے بڑے وثوق اور "قطعی پن" سے کہا "میرا خیال ہے تم دُنیا کے معاملات میں بالکل کورے ہو۔ ارے یہ چودھری صاحب برسوں کانگڑے اور کُلّو کی طرف رہے ہیں اور میں نے تو انہیں کہتے سُنا ہے کہ لاہور میں بھی کچھ عرصہ رہے ہیں، معلوم نہیں کس عُہدے پر مگر کسی بڑے عہدے پر ہی رہے ہوں گے۔ سرکار کے ہاں ان کا بڑا رسُوخ ہے۔ سُنا ہے سینکڑوں کو نوکر کرایا ہے۔ صاحب اُٹھ اُٹھ کے سلام کرتے ہیں"۔

میں نے بمشکل اپنے آپ کو لاحول ولا کہتے کہتے روکا، مگر یہ کہنے سے باز نہ رہ سکا "کونسے صاحب کالے یا گورے؟"

میرے لہجے میں طنز تو تھی مگر اس کا ڈر نہ تھا۔ ماموں جان طنزوں کی پروا نہیں کرتے بلکہ اکثر انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی طنز کر رہا ہے۔ میں نے سُنا ہے بڑے آدمیوں کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے۔ کم از کم اس لحاظ سے تو ماموں جان بہت عظیم الشان شخصیت کے مالک ہیں۔ پھر کسی کی رائے پر عمل کرنا وہ اپنی ہتک خیال کرتے ہیں اور اپنی غلطیوں کا ذمہ دار

دوسروں کو ٹھہرانا ان کا دستور ہے۔ یہ سب باتیں ان کی بڑائی کا ثبوت دیتی ہیں۔ مگر میں نے جو کہا "کالے یا گورے؟" تو شاید ناراض ہوئے اور ماتھے پر بل بھی آگیا، مگر میری خوش قسمتی کہ میں اخبار لئے بیٹھے تھا۔ جونہی یہ لفظ میرے مُنہ سے نکلے میں اخبار پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ بچاؤ اس لئے بھی ہوگیا کہ ان کی ایک عادت سے میں واقف تھا اور وہ یہ کہ وہ کتنے طیش میں کیوں نہ ہوں، سوائے نوکروں کے وہ کسی سے رو در رو ہو کر کچھ کہنا پسند نہیں کرتے۔ ممانی جان سے دو بدو تو شاید کتنی کتنی مُدت نہیں ہوتے۔ اندر آتے جاتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، سب طرح کے تعلقات قائم ہیں مگر کسی معاملہ میں اگر دونوں کا اختلاف ہو اور اختلاف ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں تو ماموں جان اپنے اردگرد ہر چیز کی طرف نظریں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گے، ایک نہ دیکھیں گے تو ممانی جان کی طرف اور یہ انہیں بھی معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ممانی جان کو بحث میں ان پر ہمیشہ فتح رہتی ہے اور یہ بات مجھے بھی معلوم تھی۔ میں نے احتیاطاً انہیں ترچھی نظر سے دیکھا۔ ان کے چہرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرا سوال انہیں ناگوار معلوم ہوا ہے۔ مگر نہ دو منٹ انہوں نے مجھے بُلایا اور میں نے اخبار سے نظر اُٹھائی۔ البتہ میں نے دو تین دفعہ اخبار کو ضرورت سے زیادہ کھڑکھڑاہٹ پیدا کر کے کھولا، تاکہ انہیں میرے انہماک کا علم ہو جائے۔ غالباً دو ایک منٹ سوچنے کے بعد اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ میرا مطلب اس سوال سے گستاخی نہ تھا۔ چنانچہ سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا "مجھے کیا معلوم؛ میں نے تو سُنا ہے۔" مطلع صاف ہوگیا۔ میں نے شکر کیا اور اخبار کو تہ کر دیا۔

اس طرح چودھری علی نواز خان کا ذکر شروع ہوا۔ انجام اس کا ضروری تھا کہ مجھ سے تعلق رکھتا ہو۔ معلوم ہوا کہ خان بہادر صاحب لاہور جا رہے ہیں، اگر انہیں خط لکھ دیا جائے تو وہ امرتسر سے اُتر کر ہمارے پاس دو ایک دِن کے لئے ہوتے جائیں۔ ماموں جان کا ارادہ تھا کہ خان بہادر کو لینے کے لئے وہ موٹر امرتسر ہی بھیج دیں۔ یوں خان بہادر صاحب گاڑی سے بھی آ سکتے تھے۔ کیونکہ امرتسر سے ہمارے شہر کی طرف چار پانچ گاڑیاں چلتی ہیں۔ مگر موٹر نئی تھی ماموں جان نے جو عام طور پر موٹر کا بہت خیال رکھتے ہیں، کہا کہ بیس میل کا فاصلہ موٹر کے لئے کچھ نہیں۔ بارے میں نے سمجھایا کہ کہیں چودھری صاحب یہ نہ سمجھیں کہ ہمیں موٹر کی نمائش مقصود ہے، اس پر ماموں جان نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا کہ ہاں لوگ بہت کمینے ہوتے ہیں۔ اچھا تو جانے دو، چودھری صاحب کو گاڑیوں کے اوقات لکھ دو اور اسٹیشن پر موٹر بھیج دینا۔ آخر ٹانگے میں انہیں آنے کی تکلیف کیوں دی جائے۔ اگرچہ ہماری تو فٹن بھی ہے۔" میں نے کہا "تو فٹن بھیج دیجئے، ہماری تو فٹن بھی بہت خوبصورت ہے۔" کہنے لگے "نہیں سردیوں کا موسم ہے، موٹر میں ہوا نہ لگے گی، ان کے سامان اور نوکر کے لئے البتہ ٹانگہ بھیج دینا۔"

مگر یہ آغاز تھا۔ خط تو اسی وقت لکھ دیا گیا مگر انہیں تشویش ہی رہی، کہنے لگے اگر خط انہیں نہ مِلا تو؟" میں نے عرض کیا "آخر کیوں؛ اور خط تو پہنچ جاتے ہیں، اس کے لئے پہنچنا کیا مشکل ہوگا، مگر ان کی تسلّی نہ ہوئی۔ فرمایا "ایک اور

خط لکھو اور اسے رجسٹری کرا کے آؤ۔" میں نے کہا "حضرت دو خط اور ایک ہی مضمون کے اور ایک ہی ڈاک میں؟ آپ کے دوست کیا کہیں گے؟" کہا "تم فضول اعتراض کرتے ہو۔ ڈپٹی کمشنر وہ رہے ہیں، کیا انہوں نے کبھی رجسٹری شدہ خط نہیں وصول کیا؛ بس اپنے یقین کے لئے لکھتے ہیں۔ انہیں کیا؛ انہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ ایسا ویسا بُلاوا نہیں اور ہاں رجسٹری جلدی سے خود ہی کرا آؤ۔ بائیسکل لے جاؤ؛ ایسے کاموں میں نوکروں پر اعتبار کرنا عقلمندی نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا "مگر نوکر بھی تو رسید لے آئے گا۔" مگر اُنہوں نے عمداً میرے الفاظ کو نہ سُنا۔

بہر حال اپنے احکام کو قطعی بنانے کی غرض سے وہ میرے پاس سے اُٹھ کر اپنے خاص کمرے میں چلے گئے۔ اس کمرہ کا ذکر شاید میں نے آپ سے نہیں کیا۔ یہ کمرہ دیکھنے کے قابل ہے۔ اسے وہ اسلحہ خانہ کہتے ہیں۔ ان کی بندوقیں، پستول، کارتوس بنانے کی مشین، پیش قبضیں، چاقو اور تلوار، دو ایک چیتوں کی کھالیں، ایک آدھ ریچھ کی، ایک دو بارہ سنگے کے منڈھے ہوئے سر سینگوں سمیت اور ایسی ہی چیزیں اس کمرے کی دیواروں پر یا ادھر اُدھر لٹکی یا پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ کمرہ صوبیدار صاحب کی جائے پناہ ہے۔ جب بھی ممانی جان کی زبان زیادہ تیزی سے چلنے لگے اور ماموں جان کو خانہ جنگی میں شکست ہو تو اس کمرے میں قلعہ بند ہو جایا کرتے ہیں اور عموماً میں نے انہیں ایسے موقعوں پر بندوق کی نال صاف کرتے دیکھا ہے۔ اس کام میں وہ اس توجہ اور سرگرمی سے مشغول ہو جایا کرتے ہیں کہ کچھ عرصے کے لئے دُنیا کی کوئی چیز انہیں پریشان نہیں کر سکتی۔

ان کے اس شغل کے متعلق مجھے کئی لطیفے یاد ہیں مگر پھر کبھی سناؤں گا۔ اس وقت تو اس دعوت کا حال سنیئے۔ رجسٹری کرا کے جو میں واپس آیا تو دیکھا کہ ایک ہنگامہ سا برپا ہے۔ نوکر ادھر اُدھر بھاگ رہے ہیں، کوئی گاما کو آوازیں دے رہا ہے، تو کوئی کلو کو۔ کوئی خانساماں خانساماں پکارے جا رہا ہے اور کوئی مُرغیاں گن رہا ہے۔ میں جو نوکروں کو نظر پڑا، دو ایک میری طرف لپکے۔ میں نے پوچھا "خیر تو ہے" کہنے لگے "چھوٹے میاں"۔ یہ کم بخت اصل میں مجھے بچپن سے ہی چھوٹے میاں کہتے آئے ہیں اور مجھے اس نام سے اُلجھن ہوتی ہے اور اگرچہ میں نے کئی دفعہ انہیں ٹوکا ہے مگر یہ باز نہیں آتے۔ خیر تو کہنے لگے "چھوٹے میاں! بڑے صاحب نے تو ہم سب کو گھبرا دیا ہے۔ کیا بات ہے؛ کسی پلٹن کی دعوت ہے؛" میں نے پوچھا "کیوں؛" کہا "خانصاحب تو بکرے اور مرغیاں اور بٹیر اور مٹھائی اور جانے کیا کیا کچھ گنوا رہے ہیں۔" میں نے کہا "اچھا صبر کرو۔ ابھی پوچھتا ہوں۔ تم جاؤ۔"

آگے بڑھا تو دیکھا کہ صوبیدار صاحب اوور کوٹ کے جیب میں ہاتھ ڈالے برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور اردگرد خانساماں، شوفر، مالی اور منشی جی کھڑے ہیں، اور ماموں جان ہیں کہ حکم پر حکم صادر کر رہے ہیں۔ شوفر سے کہہ رہے ہیں کہ موٹر ٹھیک ٹھیک کر رکھے۔ نیچے اُوپر سے خوب دھو کر اسے بالکل نئی بنا دے۔ منشی جی کو حکم تھا کہ مضافات میں جا کر مرغیاں اور انڈے

اور مل سکیں تو بٹیریں اور تیتر درجنوں کی تعداد میں خرید لائے۔ خانساماں سے یہ گلہ تھا کہ اسے کچھ پکانا نہیں آتا۔ دعوت کسی کی کوئی خاک کرے! پڈنگ اسے اچھی نہیں بنانی آتی، شامی کبابوں میں وہ انار دانہ کافی نہیں ڈالتا وغیرہ وغیرہ۔ مجھ پر جو نظر پڑی تو پوچھا "رجسٹری کرا آئے ہو؟" میں نے کہا "جی ہاں"۔ پوچھا "تمہارے سامنے ہی کردی تھی یا یونہی فرصت ہیں کرینگے"۔ میں نے کہا "جی سامنے۔ میں وہاں سے یوں ٹلنے والا تھا۔ رسید ساتھ لے کے آیا ہوں"۔ اس پر کہا "اب اسے مل جائے تو اچھا ہے، کوئی اور نہ دستخط کرکے لے لے"۔ میں نے کہا "حضرت اسی احتیاط سے واپسی رسید والی رجسٹری کرا کے لایا ہوں"۔ یہ سُن کے قدرے تسلی ہوئی مگر پھر بھی سر ہلاتے ہی رہے۔

جب دو تین منٹ بعد شک رفع ہؤا تو مجھ سے پوچھا "کیا کر رہے ہو؟" میں نے کہا "کچھ نہیں"۔ کہنے لگے "یہی تو میں اکثر کہتا ہوں، تمہیں ذمہ داری کا احساس مطلقاً نہیں! خان بہادر آئے کھڑے ہیں، آج ہے منگل اور جمعہ کی شام کو وہ آجائینگے اور تم یوں کھڑے ہو جیسے کوئی کام ہی نہیں"۔ میں نے کہا "فرمایئے تو کیا کام ہے؟" ارشاد ہؤا "کیا تمہارے خیال میں دعوت ایک آدمی کی ہی ہوگی؟ یہ خان بہادر بہت بڑے آدمی ہیں، ان کی دعوت پر کم از کم شہر کے چند رؤسا اور حکام تو بلانے چاہئیں۔ ان کو اطلاع دینی ہے۔ دعوت کا انتظام کرنا ہے اور تم یہاں سارس کی طرح کھڑے ہو کبھی ایک ٹانگ پر اور کبھی دوسری پر"۔ کھڑا تو میں دونوں ٹانگوں پر ہی تھا مگر کیا جواب دیتا۔ ماموں جان ذاتیات پر تو فوراً اُتر آتے ہیں۔ خیر میں نے کہا "تو انہیں دعوت نامے بھیج دیتے ہیں"۔ اس پر کچھ سوچنے لگے۔ برآمدے کے دو ایک چکر کاٹنے کے بعد پوچھا "دعوت نامے تو چھپے ہوئے بہتر ہوتے ہیں"۔ میں نے کہا "چھپے ہوئے تو کوئی ہمارے پاس ہیں نہیں اور پھر یہ تو خاص تقریب ہے۔ آپ لوگوں کو خان بہادر سے ملنے کے لئے مدعو کریں گے، یہ عام دعوت ناموں پر تو نہیں لکھا ہوتا"۔ کہنے لگے "تو پھر"۔ میں نے عرض کیا "تو میں ٹائپ کر بھیج دیتا ہوں، آخر ٹائپ کی مشین گھر میں ہے، آپ نے خاص طور پر خرید رکھی ہے"۔ یہ سُن کے کچھ چیں بجبیں ہوئے۔ اصل میں مجھے یہ کہنا نہیں چاہیئے تھا۔ کیونکہ مجھ سے پوچھو تو ٹائپ رائیٹر کی ہمارے ہاں کوئی خاص ضرورت نہ تھی مگر ماموں جان ماشاءاللہ رئیس آدمی ہیں۔ جائداد کافی ہے، اراضی ہیں اور مکانات دُکانیں اور منڈی ہے، ان کے انتظام میں جو لکھنا پڑھنا پڑتا ہے وہ منشی جی کر ہی لیا کرتے تھے، مگر جب میں نے بی۔ اے پاس کیا تو کہنے لگے "میاں تمہیں نوکری کی ضرورت تو ہے نہیں مگر تم ٹائپ کرنا سیکھ لو"۔ چنانچہ مجھے ٹائپ کرنا سیکھنا پڑا۔ جب میں نے سیکھ لیا تو فرمانے لگے "ہمیں بھی تو ٹائپ مشین کی ضرورت ہے"۔ میں نے کہا "کیسے؟" کہا "تھوڑی خط و کتابت ہوتی ہے، افسروں سے سرکار سے ہر ایک سے واسطہ پڑتا ہے۔ اب تمہیں ٹائپ کرنا تو آتا ہی ہے، ٹائپ کر کے خطوں کا جواب دیا کریں گے"۔ ماموں جان تھوڑی بہت انگریزی تو جانتے ہی ہیں۔ یہ نیا شوق جو چرایا تو میں کیسے انہیں باز رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے ٹائپ کی مشین خرید لی۔ مگر اس کے استعمال

کرنے کی کم ہی نوبت آتی تھی۔ اور میں نے جو ٹاپ کی طرف اشارہ کیا تو کچھ ناراض ہوئے، بلکہ میرے کہنے کا اُلٹا ہی اثر ہوا۔ اور اگر میں نے سوچا ہوتا تو میں ٹاپ کا ذکر ہی نہ کرتا، کیونکہ ایسے حالات میں دوسروں کے مشورہ کے برعکس کام کرنا ماموں جان کی سرشت میں داخل ہے۔ کہنے لگے "میاں تمہیں نہ عزت کا خیال ہے نہ حیثیت کا۔ اگر تمہارے مشوروں پر چلا کروں تو معلوم نہیں کیا سے کیا ہو جائے۔ خان بہادر جیسے معزز شخص کی دعوت اور دعوتی رقعے ٹاپ کئے ہوئے کاغذوں پر! حیف ہے تم پر! خدا تمہیں عقل دے، یہ تم نے جو بی۔ اے پاس کیا ہے کس کام کے لئے کیا ہے؟"

پھر خود ہی سوچ کے فرمانے لگے "تم امرتسر جاؤ۔" میں نے چونک کر کہا "کیوں؟" کہا "کارڈ چھپوا کے لاؤ۔" میں نے حیرانی سے پوچھا "آج؟" کہنے لگے "کیوں نہیں؟ آج کیا چھپ نہیں سکتے؟ اور دیکھو سنہری حروف ہوں اور سنہری کنارے اور ہاں کارڈ بڑھیا قسم کے ہوں، لو اب جلدی کرو، مضمون بناؤ۔ جلدی کرو۔ جلدی۔" اس جگہ اعتراض تو الگ کسی چون وچرا کی گنجائش نہ تھی۔ لہٰذا مضمون بنا کے لے آیا۔ سنایا۔ اس پر بحث ہوئی، بالآخر مضمون پاس ہو گیا اور اسی وقت مجھے امرتسر روانہ کر دیا، اور ساتھ ہی حکم دے دیا کہ شام سے پہلے واپس آ جانا۔ ورنہ کوئی انتظام نہیں ہو سکے گا" اس وقت ایک بجا تھا۔

شام کے آٹھ بجے کے قریب تھکا مارا میں امرتسر سے کارڈ چھپوا کے واپس آیا۔ راستہ میں دعائیں مانگتا آیا کہ جناب والا کو پسند آ جائیں۔ خیر ستارہ نیک تھا، یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ کارڈ پسند آ گئے، مگر حکم ہوا کہ کھانا کھا کے ابھی ابھی نام بھر دو۔ ناموں کی فہرست تیار ہی تھی۔ میں نے کھانا کھانے سے پہلے ہی نام ان میں بھر دیئے۔ میرا تو خیال تھا کہ اسی وقت نوکر کو بھیجیں گے مگر معلوم نہیں کیوں؟ خیال آ گیا کہ اس وقت نہیں، کچھ دیر ہی ہو گئی ہے۔ صبح کو سہی۔ مگر اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ مجھے چھٹی مل گئی۔ توبہ! توبہ!! جب ان کے سر میں کوئی سودا سمایا ہوتا ہے تو وہ نیند یا آرام کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے۔ آرام ان کے نزدیک محض سستی اور بیکاری کا دوسرا نام ہے۔ میں نے مؤدبانہ گزارش کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں سو رہوں، سارا دن امرتسر مارا مارا پھرتا رہوں۔ پوچھا "تم جوان ہو کے اتنے سست کیوں ہو؟ اگر ایک دن ہاتھ پاؤں ہلا لیئے تو کیا آفت آ گئی۔ تمہیں شکار پر جانا پڑے تو معلوم ہو جائے۔" میں نے کہا "میں شکار پر جاؤں ہی کیوں؟" مگر یہ کہنے کی جرأت بھی مجھے اسی لئے ہوئی کہ تھکنے کی وجہ سے کچھ طبیعت چڑچڑی سی ہو رہی تھی اور کھانا کھانے کے بعد کچھ غنودگی سی طاری ہوتی جا رہی تھی، مگر شکر ہے وہ میری کاہلی کے مسئلہ میں ایسے معروف تھے کہ میرے الفاظ کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ورنہ شکار پر تو بیدار صاحب جان دیتے ہیں۔ شکار کا ایک قصہ مجھے یاد آتا ہے، مگر . . . . خیر . . . . پھر سہی . . . . .

صبح چا سے ابھی فارغ نہ ہوئے تھے کہ دعوت نامے بھیج دیئے گئے اور جب نوکر چلا گیا تو آپ کو خیال آیا کہ یونہی دعوت نامے بھیج دینے سے کیا فائدہ ہے۔ فوراً اس کے پیچھے آدمی دوڑایا اور مجھے ارشاد ہوا کہ ناموں کی فہرست تیار کر دو۔

نے پوچھا "ان کو کیا بھیجئے گا؟" فرمایا "تمہیں بات بات پر ٹوکنے کی عادت کہاں سے پڑی ہے، بات بات پر حجت! یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے عرض کیا "ماموں جان!" اور یاد رہے کہ اثنائے گفتگو میں میں اپنا رشتہ کم ہی جتایا کرتا ہوں، اس لئے کہ اس خطاب کا اثر قائم رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ آپ جانتے ہیں، ان کے ساتھ رہ کے ہر اونچ نیچ کا خیال رکھنا پڑتا ہے خیر تو میں نے کہا "ماموں جان! میں نے تو فقط پوچھا ہے، اس میں حجت کی کیا بات ہے"۔ فرمایا "اچھا! تو خیر فہرست بنا دو اور دعوتی رقعوں کے ساتھ بھیج دو اور دیکھو تاکید کردو کہ ہر شخص کے دستخط کرا کے لائیں، خود دیکھ لینا۔ اور ہاں! یہ بھی سوچا ہے دعوت کہاں ہوگی؟ کھانے کا کمرہ چھوٹا ہے۔ ہال میں انتظام کرانا ہے۔"

آپ سے شاید میں نے ہال کا ذکر ابھی تک نہیں کیا۔ یہ کمرہ ماموں جان کی آنکھ کا تارا ہے۔ یعنی اگر اتنے لمبے چوڑے کمرے کو آپ تارا تصور کر سکتے ہیں۔ اور یہ کمرہ ہماری کوٹھی کے عین وسط میں واقع ہے۔ سنگِ مرمر اور سنگِ سیاہ کا فرش ہے اور چاروں طرف ڈیڑھ ڈیڑھ گز تک دیواروں میں جڑی ہوئی نیلی پیلی اور سفید ٹائیلیں آنکھوں کو چکاچوند کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ میں نے ایک دفعہ کہیں دبی زبان سے کہہ دیا تھا کہ ان ٹائیلوں کی جگہ اگر ساگوان کی تختیاں لگ جاتیں تو اچھا ہوتا۔ بس صوبیدار صاحب اتنا گرجے کہ میں جل تو جلال تو پڑھتا سارا دن ممانی جان کے پاس بیٹھا رہا۔ ہاں تو ماموں جان کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ ہال میں کسی بڑی دعوت کا سامان ہو۔ اگرچہ ایک دو دفعہ آپ کو موقع مل بھی چکا تھا مگر ابھی ان کی تسلّی نہ ہوئی تھی۔ اب جو خان بہادر صاحب کا آنا ہوا تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ تمام ہال کو سجائیں گے اور ان کے خیالات اور فیصلوں کو عملی جامہ پہنانا چونکہ میرا کام ہوتا ہے، اس لئے انہیں فیصلہ کرنے میں دقت پیش نہیں آتی، چنانچہ حکم ہو گیا کہ جھنڈیاں اور جھاڑیں اور زنجیرے اور جانے کیا کیا کچھ تیار ہو جائے۔ میں نے بہت لجاجت سے سمجھایا کہ حضرت یہ کوئی خاص تقریب نہیں، جھنڈیاں اور جھاڑ کسی اور موقع پر اٹھا رکھیئے۔ معلوم نہیں لوگ کیا کہیں۔ تو کہنے لگے "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو، لوگ ایسے بدطینت ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ! اچھا تو ہال کو صاف کراؤ۔ ابھی سے سب کام شروع ہو جائے۔"

باقی دو دن میں ہی جانتا ہوں ہم سب نے کس طرح کاٹے ہیں۔ صوبیدار صاحب کو ہر جگہ اور ہر ایک کے ساتھ اور ہر کام میں اُلجھنے کا جو کمال حاصل ہے اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے، کبھی مالی سے جھگڑ رہے ہیں کہ جنوری میں گلدانوں کے لئے اچھے اچھے پھول کیوں نہیں ملیں گے اور کبھی خانساماں سے بحث ہے کہ آج کل کے بکروں کا گوشت بہت پھیکا اور بدذائقہ ہوتا ہے، اور کبھی منشی جی کو پریشان کرتے ہیں کہ جنوری میں بٹیریں کیوں نہیں مل سکتیں اور نہیں تو کہیں سے مرغابیاں منگواؤ اور دیکھو تازہ ہوں اور چربدار۔ اور کبھی مجھ سے تکرار کہ کھانے کی کرسیاں ہمارے پاس اگر کم تھیں تو تم نے اور کیوں نہیں بنوائیں تمہیں کسی بات کا دھیان بھی ہے، اگر میں ان چیزوں کا خیال نہ رکھوں تو کوئی کام پورا نہ ہو سکے۔ غرض یہ کہ جہاں کہیں کوا

کام کر رہا ہو، وہیں ماموں جان جاد ھمکتے اور اب جو سوچتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے سب سامان تیار کیسے ہو گیا۔

آخر کار جمعہ کا دن آ گیا، اور خان بہادر صاحب کا جواب بھی کہ ہم ضرور آئیں گے۔ صبح ناشتہ کرتے ہی آپ دورہ لگانے لگے۔ موٹر کا معائنہ ہوا، فٹن دیکھی گئی، تانگہ پر بھی تبصرہ کیا گیا۔ پھر اپنی سواری کے گھوڑے کے متعلق سائیس سے بحث کی۔ اس کے بعد ہال کمرے میں پہنچے، میزیں کرسیاں ابھی ایک طرف بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ بس تو ہنر سے طوفان آ گیا، نوکر چاکر سب اکٹھے کر لئے اور نہایت فراخدلی کے ساتھ گالیوں سے اُن کی تواضع کی۔ میزیں اسی وقت لگوائی گئیں، میز پوش نکلوائے گئے کرسیاں دوبارہ صاف کرائیں، گلدان اپنی اپنی جگہ رکھ دیئے گئے، غرضیکہ بارہ بجے سے پہلے پہلے سب چیزیں قرینے سے رکھوا دیں۔ کھانا کھانے کے بعد میرے اصرار پر کچھ دیر اندر زنان خانہ میں گئے تو ہم نے سانس لیا۔ مگر مجھے تنبیہ کر گئے کہ اب تم باورچی خانہ سے باہر قدم نہ رکھنا۔ سب چیزیں اپنی نگرانی میں پکواؤ اور ذرا دیکھو کہ کھانا میری ہدایات کے مطابق نہیں تیار ہو رہا تو فوراً خانساماں کو ڈانٹ دو، خیر وہ تو بیچارا خانساماں ہی بہت پرانا ملازم ہے اور کھانا اچھا پکاتا ہے، ورنہ معلوم نہیں ان کی ہدایات کا کیا کچھ نتیجہ نکلتا۔

چار بجے سے ہی آپ نے شوفر کو آوازیں دینی شروع کیں۔ میں نے کہا بھی کہ ابھی بہت وقت ہے، کہا "اگر تم پر چھوڑ دوں تو خان بہادر کو پیدل آنا پڑے"۔ اگرچہ اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ پیدل کیسے؟ کیونکہ کرایہ کے تانگے تو بیشمار اسٹیشن پر موجود رہتے ہیں۔ مگر خیر شوفر اُن کے مزاج کو خوب سمجھتا ہے۔ اس نے کہا "حضور موٹر نکال لی ہے، اسے حاجی دفعہ نرم کپڑے سے چمکارا" دے رہا ہوں۔ جب وہاں پہنچے گی تو بالکل نئی معلوم ہو گی۔ اس پر آپ بہت خوش ہوئے اور کہا "ہاں اچھی طرح چمکاؤ، خان بہادر کیا کہے گا"۔ پھر خانساماں کی طلبی ہوئی۔ مالی کو ڈانٹ ڈپٹ کی کہ ابھی گلدانوں میں پھول نہیں رکھے گئے اور نہیں تو نرگس کے پھول تو مل ہی سکیں گے، فوراً پیدا کرو، اسی وقت پھول سجا کے لے آؤ۔ خانساماں آیا تو اس سے کھانے کی بابت استفسار ہوا، اس نے ہر طرح تسلی دینے کی کوشش کی، ایمان کو بالائے طاق رکھ کر انہیں یقین دلایا کہ سب کچھ ان کے حکم کے مطابق پکایا گیا ہے۔

گاڑی ساڑھے پانچ بجے پہنچتی تھی مگر آپ نے موٹر کو ساڑھے چار ہی گھر سے روانہ کر دیا ہوتا اگر میں نہ کہتا کہ وہاں گھنٹہ بھر جو کھڑی رہے گی تو گرد سے اٹ جائے گی اور دس برس کی پرانی گاڑی معلوم ہو گی۔ وقت پر بھیجے تو یوں معلوم ہو گی جیسے کل خریدی گئی ہے"۔ کہا "اچھا!" میں نے کہا "جی"۔ کہنے لگے "تو پانچ بجے تو ضرور ہی روانہ ہو جائے"۔ میں نے شوفر کو جا کے سمجھا دیا۔ جب ساڑھے پانچ بج گئے تو کہنے لگے "کیوں بھئی ساڑھے پانچ تو ہو گئے ابھی تک کوئی آیا نہیں؟" میں نے کہا "مہمانوں کو سات بجے کا وقت دے رکھا ہے اور گاڑی ابھی سٹیشن پر پہنچی ہو گی، یہاں کون اس وقت آ جائے؟" مگر

ایسے جواب سے ان کی طبیعت خوش نہیں ہؤا کرتی۔ اگر میں کہہ دیتا کہ واقعی کسی نہ کسی کو تو آجانا چاہئے تھا تو شاید انہیں تسلی ہو جاتی۔ مگر آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ کچھ ایسا ہی آسان کام ہے کیونکہ اگر میں کہہ بھی دیتا کہ ہاں ساڑھے پانچ تو بج گئے اور ابھی تک کسی کا نشان تک نہیں، تو مجھے یقین ہے فوراً اُلٹ جاتے اور کہتے" وقت سے پہلے کون بیوقوف کہیں جاتا ہے، تمہارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے"!

انہیں باتوں میں پونے چھ بج گئے۔ بس اب تو ان کے لئے صبر ناممکن تھا۔ شوفر کو لگے گالیاں سنانے کہ موٹر ضرور فیل ہوگئی ہوگی۔ میں اسے سارا دن کہتا رہا کہ موٹر ٹھیک کر، اسی لئے کہتا تھا نا کہ چار بجے ہی یہاں سے چلا جائے"۔ اگرچہ یہ نہیں انہوں نے بتایا کہ چار بجے جانے سے وہ کیسے نہ بگڑتی۔ مگر ابھی وہ شروع ہی ہوئے تھے کہ ہمارے شہر کے تحصیلدار صاحب جو ان کے بہت گہرے دوست ہیں تشریف لے آئے۔ انہیں ذرا پہلے بُلا رکھا تھا۔ آپ نے بڑھ کے ان کا خیر مقدم کیا، اور پھر ان کی مزاج پرسی کے بعد ان سے ڈرائیور کی شکایت لے بیٹھے اور کہا کہ دیکھو چھ بج رہے ہیں، نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں"۔ اور پھر میری طرف دیکھ کے" دیکھو میاں تم فٹن تیار کرا کے لے جاؤ، ٹانگہ تو ان کے سامان کے لئے بھیج ہی دیا تھا ۔۔۔ ابھی جاؤ، لو اب دیر نہ کرو۔ اُٹھو"! اگر تحصیلدار صاحب وہاں نہ ہوتے تو شاید مجھے جانا ہی پڑتا۔ مگر وہ سمجھدار آدمی ہیں۔ کہنے لگے، "خانصاحب بگھی تیار کرنے میں بھی تو کافی وقت لگے گا اور اگر موٹر فیل بھی ہو جاتی تو وہاں ٹانگے تھوڑے ہیں، اور پھر ابھی وقت بھی کوئی ایسا نہیں ہؤا، سٹیشن بھی تو یہاں سے دو میل ہوگا"۔ اس پر میں نے بھی کہا "شاید گاڑی ہی دیر میں آئی ہو"۔ مگر ماموں جان کا اضطراب بڑھتا ہی گیا۔

جب چھ بج کے بھی پانچ منٹ ہوگئے اور کوئی نہ آیا، نہ موٹر نہ خان بہادر تو میری طرف اس غصے میں دیکھا ہے کہ توبہ ہے میری! گویا خان بہادر چودھری علی نواز خان کے نہ آنے کا سبب میں ہی ہوں۔ ابھی تحصیلدار صاحب انہیں تسلی ہی دے رہے تھے کہ موٹر واپس آگئی اور ڈرائیور نے اطلاع دی کہ خان بہادر صاحب تشریف نہیں لائے۔ اس پر ماموں جان کا غصہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اس بات پر اَور بھی کہ شہر کے مجسٹریٹ جن کی صوبیدار صاحب بہت عزت کرتے ہیں اور کئی ایک معززاشخاص کو مدعو کر رکھا تھا۔ تحصیلدار صاحب نے کہا کہ "بھئی ٹرین نہ مل سکی ہوگی"۔ بلکہ میں نے تو یہ بھی کہا کہ بیمار ہو گئے ہوں گے۔ مگر وہ دم بدم غصہ سے لال پیلے ہو رہے تھے، جب ہم کہتے کہ کوئی خاص وجہ ہوگی جو نہ آسکے ہوں گے تو اَور چڑتے۔ ابھی ہم اُن کا غصہ فرو کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے کہ تار والا تار لے کے آیا۔ میں نے کہا "لیجئے تار آگیا"! تحصیلدار صاحب نے کہا "واقعی اتنے بڑے آدمی ہیں کوئی معقول وجہ ہی ہوگی جو نہ آسکے ہوں گے"۔ تار کو کھولا یہ مضمون تھا " افسوس ہے ضروری کام پڑ گیا پھر کبھی سہی"۔ تار پڑھتے ہی آگے بگولا ہو گئے، کہنے لگے" اس خبیث نے سمجھا ہی کیا ہے! نواب زادہ کہیں کا! کام پڑ گیا ہے!

رائی کین کے سالے کو! پھر کبھی سہی! کمینہ! چودھری بنا پھرتا ہے! میں جانتا ہوں اس کی حقیقت کو! خان بہادر! ہونہہ! ساری عمر سرکار کے سامنے ناک رگڑتا رہا ہے، خان بہادر ہو گیا تو کہاں سے خدا ہو گیا ہے! اب اسے کام پڑ جاتے ہیں!" جب میں نے اور تحصیلدار صاحب نے انہیں تحمل کرنے کو کہا تو اور چراغ پا ہوئے۔ کہنے لگے "تمہارے لئے تو آسان ہے کہنا، ناک تو لوگوں کے سامنے میری کٹ جائے گی، لوگ کیا کہیں گے؟" ہم نے سمجھایا کہ تار تو آ ہی چکا ہے، لوگ خود سمجھ جائیں گے کہ کوئی ایسا ہی کام ہوگا، ورنہ خط جو لکھ دیا تھا کہ ضرور آئیں گے۔ خط کا یاد دلانا گویا آگ پر تیل ڈال دینا تھا، وہ بھرے کہ الاماں! فرمایا "حرامزادہ! اگر آنا نہیں تھا تو خط کیوں لکھا تھا۔ معلوم نہیں سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو، کبھی لکھتا ہے آؤں گا، اور کبھی نہیں! جیسے مجھے اس کے بلانے میں کوئی انعام ملنا تھا۔ بدذات! ڈپٹی کمشنر بنتا ہے! چھ مہینے پنشن ملنے سے پہلے کہیں ڈپٹی کمشنر لگ گیا، اپنے آپ کو لاٹ ہی سمجھنے لگا ہے، کوئی یہ پوچھے تم ہو کون؟ تمہارا باپ کون تھا؟ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ اکڑتا تو ایسے ہے جیسے میں نے اس کی لڑکی کا رشتہ مانگا تھا۔ کمینہ! بدمعاش! کتا!"

اوہ! اتنا بگڑے کہ کیا بتاؤں! جیسے ہی میں اور تحصیلدار صاحب کچھ کہتے وہ ایسے چنگھاڑتے کہ ہم خاموش ہو جاتے۔ اب اس کے آدھ گھنٹہ بعد جو دعوت کا لطف آ سکتا ہے اس کا آپ ہی اندازہ لگائیں!

مہمانوں کے رخصت ہونے پر خان بہادر کی اور اُن کے خاندان کی اور اُن کے ہر ملنے والے کی زندگی پر جن اُبلتے ہوئے الفاظ میں اُنہوں نے روشنی ڈالی ہے، وہ میں کوشش بھی کروں تو ادا نہیں کر سکتا۔

یہ تھی وہ مشہور دعوت جس کا نام ماموں جان کی موجودگی میں بھولے سے بھی کوئی نہیں لیتا!

سیّد فیاض محمود

تاریخ وفاتِ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم

وَالْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ

۱۳۵۷ھ

مرثیہ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم

کچھ نہیں دہر جز فریبِ نظر — اک طلسمِ فنا ہے سر تا سر
اس جہاں میں وجودِ انسانی — ہے سرِ راہِ بادِ شمعِ سحر
فرصتِ عمرِ دہرِ فانی میں — طپشِ برق ہے کہ تابِ شرر
نفس چند ہے قیام اس میں — ہے یہ دُنیا سرائے راہگذر
تار و پودِ حیاتِ انسانی — رگِ گل سے سوا ہے نازک تر

اُستواری نہیں ثبات نہیں
خاک دُنیا کی کائنات نہیں

جی لگے خاک تیرہ زنداں میں — کہ نہیں شمع بزمِ دوراں میں
کوسِ رحلت ہے بانگِ خندۂ گل — سب مسافر ہیں اس گلستاں میں
روئیں اب عمرِ جاوداں کو خضر — مل گیا زہر آبِ حیواں میں
کیوں عناصر میں اختلال ہے آج — کیوں تغیر ہے چار ارکاں میں
حرکت ہے زمین[*] میں پیدا — ہے سکوں دورِ چرخِ گرداں میں

کیا زمانہ میں انقلاب ہے آج

[*] بہ خیالِ قدیم زمین ساکن ہے۔

آب آتش ہے آتش آب ہے آج

چشمِ عبرت سے اے تماشائی — دیکھ نیرنگِ چرخِ مینائی
صبح ہوتے ہی ہو گئی نابود — شب کے تاروں کی جلوہ آرائی
تھی جو گلشن میں صبحِ فصلِ بہار — وہ کہاں ہے خزاں میں رعنائی
اب کہاں ہے وہ بزمِ جمشیدی — اب کہاں ہے وہ بادہ پیمائی
ہو گئی خاک میں مل کر — شانِ اسکندری و دارائی

آج "اقبال" کا بھی ماتم ہے
یہ نیا حادثہ نیا غم ہے

شاعرِ سحر کار تھا اقبال — آہ معجز نگار تھا اقبال
اس کے زیرِ نگیں تھا مُلکِ سخن — خُسروِ تاجدار تھا اقبال
چمنستانِ حُسنِ معنی میں — اِک گُلِ نَو بہار تھا اقبال
دَورِ حاضر میں ملک و ملت کا — سببِ افتخار تھا اقبال
سلطنت کیلئے بھی اِک حد تک — مایۂ اعتبار تھا اقبال

وا دریغا کہ آں سخندان مُرد
فخرِ حسّان و رشکِ سحبان مُرد

کوئی بھی ایسا نکتہ داں نہ ہُوا — نغز گفتار و خوش بیاں نہ ہُوا
ایک عالم میں اس کی شہرت تھی — اُس کا شہرہ کہاں کہاں نہ ہُوا
کچھ خدا داد تھا قبولِ سخن — کونسا شعر حرزِ جاں نہ ہُوا

تھی جُدا سب سے اس کی طرزِ بیاں — کوئی بھی اُس کا ہم زباں نہ ہوا
تھا وہ نازک خیال کچھ ایسا — دِل پر اُس کا سخن گراں نہ ہوا

خاص حصّہ تھا اُس کا رنگینی
شاعری اُس کی تھی کہ گُل چینی

تھا وہ اِک نقشِ بے مثال و نظیر — مایۂ نازِ خامۂ تقدیر
صدر آرائے بزمِ حالی و داغ — شہرت افزائے نامِ ذوق و نصیر
کلۂ افتخارِ ملّت و ملک — طُرّۂ اعتبارِ تاج و سریر
فلسفہ اور پھر زبانِ غزل — اور پھر یہ جزالتِ تحریر
شہد سے بھی زیادہ شیریں تھی — اُس کی ہر بات اُس کی ہر تقریر

شاعرِ دَورِ انقلاب تھا وُہ
نقطۂ فردِ انتخاب تھا وُہ

جائے اُو دَر جوارِ رحمت باد — مرقدش روضۂ زجنّت باد
روزِیش مغفرت بود زخُدا — بہرہ اش ازنبی شفاعت باد
سایۂ رحمتِ خدائے کریم — برسرش تادمِ قیامت باد
حرزِ جانہا کلامِ اُو بادا — صیتِ نظمش بہر ولایت باد
ازپیاسش فروغِ دین بادا — شمعِ ایماں چراغِ تربت باد

اطہر این نوحہ و دُعا گفتم
آنچہ گفتم بصد بُکا گفتم

اطہر ہاپوڑی

بُرقع

افرادِ ڈراما

احسان	ایک نوجوان طالب علم
مجید	احسان کا دوست اور ہم جماعت
محسن	احسان کا بڑا بھائی عمر ۳۵ سال
ناصر علی	احسان اور محسن کا باپ
مریم	محسن کی بیوی
رحمت	ملازم لڑکا

منظر:۔ ایک آراستہ کمرہ۔ احسان ایک صوفے پر بڑے آرام سے لیٹا ہے۔ ٹانگیں آگے کو پھیلا رکھی ہیں۔ ہاتھ میں کوئی اُردو رسالہ پکڑے بڑی لَے سے اشعار پڑھ رہا ہے۔ کسی کے آنے کی آہٹ پا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ دائیں دروازے سے اُس کا بڑا بھائی محسن داخل ہوتا ہے۔ احسان اپنی ٹانگیں سمیٹ کر صوفے پر سیدھا ہو بیٹھتا ہے۔)

محسن۔ احسان ایک کام تو کرو؛

احسان۔ فرمایئے!

محسن۔ مریم کو اُس کی چچی کے مکان پر پہنچا آؤ۔

احسان (رسالہ تپائی پر رکھتے ہوئے) ابھی؟

محسن۔ ہاں

احسان۔ بھابی تیار ہیں؟

محسن۔ بالکل۔ (واپس جاتا ہے۔ احسان اُٹھتا ہے اور تپائی پر سے رسالہ اُٹھا کر کھولتا ہے۔ ایک دو لمحے پڑھتا رہتا ہے۔ پھر "تیرے خیال کی بیتابیاں معاذ اللہ۔ کہ ایک بار بھلاؤں تو لاکھ بار آئے" گاتا ہوا سنگار میز کی طرف جاتا ہے۔ وہاں سے کنگھی اُٹھا کر اپنے گھنے بالوں کو درست کر رہا ہے کہ اتنے میں مریم اپنے بازو پر ریشم کا رنگین برقع ڈالے داخل ہوتی ہے۔)

مریم۔ چلو احسان ― ابھی تیار نہیں ہوئے تم؟

احسان (کھونٹی پر سے کوٹ اُتارتا ہے) میرے تیار ہونے میں کیا دیر ہے۔ (کوٹ پہنتا ہے۔ مریم پہلے برقع کا نچلا حصہ پہنتی ہے پھر اُوپر کا نقاب والا حصہ۔ ریشم کا نرم و رنگین برقع کسی قدر تنگ تراشا جانے سے مریم کے فربہ بدن سے چمٹ جاتا ہے، مزید برآں اُس کا میانہ قد اُس کی ہیئت کذائی کو عجیب سا بنا دیتا ہے۔)

احسان۔ بھابی میں نے کئی بار کہا ہے میرے ساتھ چلتے وقت یہ برقع نہ پہنا کرو۔

مریم۔ (اپنے آپ پر ایک چلتی نظر ڈالتے ہوئے) کیا ہے اس برقع میں؟

احسان۔ میں کیا بتاؤں اس برقع میں کیا ہے! ایک ریشم کا دوسرے رنگدار اور پھر چست سِلا ہوا۔ اس کی تراش تو دیکھو۔

مریم۔ ساری دُنیا ایسے برقع پہنتی ہے۔

احسان۔ اگر ساری دُنیا پہنتی ہے تو موٹر میں بیٹھتی ہے۔

تانگے میں پھرتی ہے، بازاروں میں یوں پیدل تو خاک
چھانتی نہیں پھرتی۔ اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو مہربانی
کرکے دوسرا برقع پہن آؤ۔ اس برقع میں ساتھ لے جانے
کے لئے میں ہرگز تیار نہیں۔

مریم۔ تمہارے بھائی جان کو تو اس برقع میں ساتھ لے جاتے
ہوئے آج تک عار نہیں آئی۔ تم آئے ہو بڑے کہیں کے۔۔۔۔

احسان۔ بھائی جان کی سمجھ پر تو مدت سے پردے پڑ چکے
ہیں، اُن کا تو ذکر ہی چھوڑو۔ انہیں عار آئے یا نہ آئے
مجھے اس سے غرض نہیں۔ (مریم کمرے سے باہر جاتی ہے
احسان صوفے پر بیٹھ کر رسالہ پڑھتا ہے۔ ایک دو لمحے اسٹیج
پر خاموشی رہتی ہے۔ مریم اور محسن داخل ہوتے ہیں)

محسن۔ احسان تم جاتے کیوں نہیں اِن کے ساتھ؟

احسان۔ بھائی جان کم از کم اس برقع کے ساتھ میں نہیں
جا سکتا۔ آپ خود ہی دیکھئے تو۔ مجھے بھابی کے ساتھ
جب اُنہوں نے یہ نیلا برقع پہن رکھا ہو بازار سے گزرتے
شرم آتی ہے۔ میں ہر دکاندار اور ہر راہ گیر کی نگاہ کا مرکز
نہیں بن سکتا۔ کوئی دوست کوئی واقف کار مل جاتا ہے
اور کچھ نہیں تو تانگہ لے دیجئے۔ کوئی سادہ سا برقع ہو تو بات
بھی ہے۔ ایسا برقع پہن کر بازار میں گزرنا سراسر۔۔۔۔

محسن۔ کیا ہے اس برقع میں۔ ساری دُنیا پہنتی ہے۔

احسان۔ جی ہاں ساری دُنیا تو پہنتی ہے بھابی نے جو کہدیا
کیا آپ نے کوئی ایسا شریف آدمی دیکھا ہے جو بیوی کو
اس قسم کا جاذبِ نظر ریشم کا برقع پہنا کر سرِ عام پیدل
لئے پھرتا ہو؟

محسن۔ کیا بڑا احسان۔ آدمیوں کی آنکھیں تو نکلوائی نہیں جا
سکتیں۔ وہ کمبخت تو ہر صورت دیکھیں گے۔ جاؤ لے
جاؤ، تکرار نہیں کیا کرتے۔

احسان۔ نہیں بھائی جان میں اس برقع کے ساتھ نہیں لے
جا سکتا۔ دوسرا سفید برقع پہن لیں۔

مریم۔ وہ تو دھوبی کو دے رکھا ہے۔

محسن۔ یہاں قریب ہی تو جانا ہے۔

احسان۔ چاہے قریب ہی جانا ہے، آخر بازار میں سے ہو
کر جانا ہے۔ رحمت کو بھیج دیجئے۔ آپ چلے جائیے۔

محسن۔ احسان تمہیں ابھی تک بات کرنے کا سلیقہ نہیں آیا
(مریم سے) جاؤ رحمت کو لے جاؤ۔

مریم۔ (آہستہ سے) وہ ننھی کو باہر لے کر گیا ہے۔

محسن۔ (کمرے سے باہر نکلتے ہوئے غصہ سے) یہ ڈھیٹ تو بحث
کرنا جانتا ہے۔ کام نہ کاج کہیں کا بڑا عزت دار (مریم
بھی اس کے پیچھے چلی جاتی ہے)

احسان۔ (بڑبڑاتا ہے) بات کرنے کا سلیقہ ـــ!!! اوفّوہ
ریشم کے رنگین برقع کے ساتھ ساتھ بازار میں سے
سینکڑوں کی نگاہوں کا مرکز بن کر گزروں۔ ہر قدم کی جنبش
سے ریشمی برقع پر لہریں اُٹھیں لوگ میری طرف گھوریں
کوئی منہ پھٹ بکنے لگے، میں آنکھوں سے اندھا کانوں
سے بہرہ بے غیرت بے حیا چلتا جاؤں۔ کوئی دوست
ملے میں آنکھ بچا لوں۔ کوئی بے تکلف پوچھے میں کہوں

میری بھابی ہے - بھائی جان کی بیگم صاحبہ! — مجھے بات کرنے کا سلیقہ نہیں؛ اُونہہ — ! نیچے سے آواز آتی ہے — احسان")

احسان - (کھڑکی میں سے نیچے دیکھ کر) کون ہے؟ امجد!!! آجاؤ اوپر (ایک کرسی کو راستہ میں سے ہٹاتا ہے)

(امجد بائیں دروازے سے مسکراتا ہوا داخل ہوتا ہے -)

امجد - (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) خوب ہوا آج - خلیل کے دوست بھی عجیب ہیں؟

احسان - کیا ہوا؟

امجد - پہلے یہ بتاؤ وہ رنگیلی لڑکیاں ابھی تک یہیں ہیں نا؟

احسان - کونسی؟

امجد - وہی جو اُس رات سینما گئی ہوئی تھیں، ریشم کے نیلے اور سیاہ بُرقع یاد نہیں - تم نے بتایا تھا نا کہ تمہارے پڑوس میں رہتی ہیں - بڑی رنگین مزاج ہیں -

احسان - ہاں ہاں، شاید ابھی تک تو مکان نہیں بدلا، کیوں؟

امجد - میں اور خلیل تمہارے ہاں آ رہے تھے - یہاں تمہاری گلی کے سرے پر خلیل کو کوئی دوست مل گیا بہت بے تکلف معلوم ہوتا تھا - ہر چند کہا کہ تمہارے ہاں جانا ہے مگر اُس نے ایک نہ سُنی اور خلیل کو کھینچ کر اپنے ساتھ لے گیا - اِس سلسلہ میں ابھی تکرار ہو رہی تھی کہ ایک دوہرے بدن کی میانے سے قد کی عورت نیلے رنگ کا ریشمی بُرقع پہنے گلی سے باہر آتی دکھائی دی -

خلیل نے اُسے دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ انہیں رنگیلی عورتوں میں سے ہے جو احسان کے ساتھ والے مکان میں رہتی ہیں - میں نے بھی اُس کی چال ڈھال اور تیز رنگ کے بُرقع سے یہی اندازہ لگایا - اتنے میں وہ عورت ہمارے قریب آگئی - جُونہی ہمارے پاس سے گزری خلیل کے دوست نے بے دھڑک کہا "اتنا حسین بُرقع اور پیدل - کہو تو موٹر پر لے چلوں" - ہم اُس کی اس دلبری پر بہت گھبرائے -

احسان (اپنے چہرے پر سے گھبراہٹ کے آثار چھپاتے ہوئے) یہ سُن کر وہ عورت کچھ نہ بولی!

امجد - نہیں - اُس نے ایک نظر خلیل کے دوست کی طرف دیکھا اور بغیر بولے آگے چلی گئی - ہم نے اُس شخص سے کہا کہ اُسے یوں نہ کہنا چاہیئے تھا - کیا پتہ کسی شریف گھرانے کی ہوتی، مگر وہ بات پر اڑا رہا کہ شریف گھرانے کی عورتیں ایسے جاذبِ نظر بُرقع پہن کر برسرِ عام تھوڑی پھرا کرتی ہیں - ان عورتوں کا تو مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ شوقین مزاج لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے، خلیل نے بھی کسی قدر میرا ساتھ دیا مگر وہ شخص چڑ گیا اور یہ کہہ کر کہ اچھا آپ کو آزمائش کر کے دکھاتا ہوں، اُسے کھینچ کر اُسی عورت کے تعاقب میں چلا گیا

احسان - (کھویا سا جاتا ہے) "چلا گیا؟؟؟ پھر —"

امجد - پھر کیا — میں تو یہاں آگیا ہوں مجھے کیا پتہ -

احسان (گھبرا کر) بڑا بیہودہ تھا وہ -

امجد۔ (مسکرا کر) یوں کہو بڑا بیہودہ تھا وہ بُرقع جس نے اُس شخص کو یہ کہنے کی جرأت دلائی ورنہ کسی کی مجال ہے کہ بُرقع پوش عورت کو کچھ کہہ سکے۔

احسان۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں یہ بھی ٹھیک ہے سارا قصور برقع کا تھا مگر ۔۔۔

امجد۔ تم گھبرا کیوں گئے ہو۔ تمہاری بلا سے۔ اپنی بلا سے (؟) اتنی ہمدردی کا آخر مطلب کیا؟ (خفیف سا قہقہہ) خدا جانے لاہور میں ہر روز ایسے کتنے واقعات ہوتے ہیں ۔ ہیں کیا؟

احسان۔ یہ تو ٹھیک ہے، مگر پردہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

امجد۔ پردہ بجائے خود اچھی چیز ہے مگر یہ پردہ چھپ چھپ کر دیکھنا اور دیکھ دیکھ کر چھپنا جس سے ہم آئے دن دوچار ہوتے ہیں، فوراً ترک کر دینے کے قابل ہے۔

احسان۔ میرے خیال میں بُرقع بجائے خود ایک مذاق ہے اور اب وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے جب لوگوں کی نگاہ میں برقع کی قدر تھی اور وہ ایک برقع پوش عورت کی طرف نگاہ اُٹھانا معیوب سمجھتے تھے۔

امجد۔ اِس میں کیا شک ہے۔ تم یہ سُن کر حیران ہو گے کہ ہمارے قرابت داروں میں چند عورتوں نے مختلف رنگوں کے چار پانچ بُرقع سلوا رکھے ہیں اور وہ شادی بیاہ کے موقعوں پر اُنہیں اُسی طرح بدل بدل کر پہنتی ہیں، جس طرح عام پہننے والے کپڑوں کے مختلف جوڑے پہنے جاتے ہیں۔

احسان۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ برقع کا پردہ بھی فیشن سے محفوظ نہیں رہا اور یہی وجہ ہے کہ اُس کا صحیح مقصد فوت ہو رہا ہے۔

امجد۔ وہ زمانہ اب ختم ہو چکا ہے جب برقع صحیح معنوں میں برقع تھا۔ اب اگر کوئی عورت صاف سُتھرا بُرقع اور اور کوئی اچھا سا جُوتا پہن کر بازار میں نکلے تو بیسیوں کیا سینکڑوں لوگ پہلے پاؤں سے سر تک پھر سر سے پاؤں تک جا پہنچتے ہیں اور اگر تنہا ہو تو خدا ہی حافظ۔

احسان۔ اور اگر برقع ہو رنگین یا ریشم کا تو لوگ بجلیاں دیکھتے ہیں کہ کھا جائیں گے۔ ہمارے بڑے نہیں سمجھتے کہ اب زمانے کی روش اور ذہنیت ایک خطرناک صُورت اختیار کر چکی ہے ۔۔۔

امجد۔ بالکل ۔۔۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ موجودہ لوگ وہی لوگ ہیں جو آج سے بیس برس پہلے تھے۔

(دائیں دروازہ سے رحمت داخل ہوتا ہے)

رحمت۔ بڑے میاں جی آ گئے۔

احسان۔ ابا جان؟

رحمت۔ جی ہاں۔

احسان۔ انہیں تو آج شام کو آنا تھا۔ اچھا جاؤ۔

(رحمت جاتا ہے)

امجد۔ بھئی میں بھی چلتا ہوں

احسان۔ وہ کیوں؟

امجد۔ تمہیں والد صاحب سے ملنا ہوگا (اُٹھتے ہوئے) پھر
ملیں گے۔ آج شام لارنس گارڈن آؤ گے ؛
احسان۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

(دونوں بائیں دروازہ سے نیچے اُتر جاتے ہیں۔ اسٹیج
پر ایک لمحہ خاموشی۔ محسن اور ایک اُدھیڑ عمر کا شخص دائیں
دروازہ سے داخل ہوتے ہیں۔ پیچھے پیچھے رحمت آتا ہے)

ناصر علی۔ یہاں تو نہیں ؛
محسن۔ یہیں تھا
رحمت۔ اُن کا کوئی دوست آیا تھا، اُن کے ساتھ چلے
گئے ہیں شاید۔
محسن۔ (ایک کرسی پر سے کتاب اُٹھا کر) آپ بیٹھئے
آ جاتا ہے ابھی۔
ناصر علی۔ کچھ پڑھتا پڑھاتا بھی ہے یا دوستوں کے ساتھ
ہی پھرتا رہتا ہے ؛
محسن۔ پڑھتا ہے۔ آرام طلب بہت ہے، گستاخ ہے جو
مُنہ میں آتا ہے کہہ دیتا ہے۔
ناصر علی۔ بہت لڑکے ہوسٹلوں میں رہنے سے آرام طلب
ہو جاتے ہیں۔ (احسان بائیں دروازہ سے داخل ہوتا ہے
اپنے باپ کو مؤدبانہ سلام کر کے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
بھئی کہاں تھے تم ؛
احسان۔ ایک دوست کے ساتھ نیچے تک گیا تھا۔
ناصر علی۔ ہم جماعت تھا کوئی ؛
احسان۔ جی ہاں !

ناصر علی۔ (محسن کی طرف دیکھ کر) مریم کہاں ہے ؛
محسن۔ اپنی چچی کے ہاں گئی ہے (رحمت سے) جاؤ بُلا
لاؤ۔ جلدی آنا۔ (رحمت جاتا ہے)
احسان۔ (والد سے) آپ کو تو آج شام آنا تھا۔
ناصر علی۔ ہاں۔ رحمان اپنی کار میں آ رہا تھا۔ میں بھی اُس
کے ساتھ ہی آ گیا۔
احسان۔ اُس کے کاروبار کا اب کیا حال ہے ؛
ناصر علی۔ اچھا ہے۔ اب تو خوب کما رہا ہے۔ (دائیں
دروازہ سے مریم داخل ہوتی ہے۔ ناصر علی کو سلام
کرتی ہے)
محسن۔ تمہیں تو ابھی رحمت لینے گیا تھا۔
مریم۔ مجھے ابھی زینہ میں ملا ہے۔ میں نے میاں جی کو دیکھ
لیا تھا۔ ہم اوپر بیٹھک میں تھے جب ان کی کار کو چوک
میں رُکنا پڑا۔ میری نظر اتفاق سے ہی پڑ گئی۔
ناصر علی۔ ہاں بہت بھیڑ تھی وہاں۔ تم اکیلی آئی ہو کیا ؛
مریم۔ جی نہیں۔ رمضانی پہنچا کر گیا ہے (احسان سے)
تم نہ گئے تو میں کیا پہنچ نہ سکی ؛
احسان۔ (اس ناگہانی غیر متوقع حملہ سے گھبرا سا جاتا ہے،
اُس کے چہرہ پر غصہ کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور الفاظ
اُس کے مُنہ سے غیر ارادی طور پر نکلتے ہیں) اچھا ہوا
پہنچ گئیں تو۔ پھر کسی کو ساتھ لے جانے کی ضرورت ہی
کیا ہے۔ بس بُرقع اُٹھایا اور چل دیں۔
ناصر علی۔ ہیں بات کیا ہے ؛

محسن - کچھ بھی نہیں - یونہی جھگڑتے ہیں - مریم احسان سے کہتی تھی مجھے چچی کے مکان تک پہنچا آؤ - یہ نہ گیا۔ وہ اکیلی چلی گئی۔

ناصر علی - یہ بُری بات ہے احسان - گھر کی عورتوں کو بازار میں اکیلے نہیں جانا چاہیئے (تم کیوں نہ گئے؟

احسان - (پیچ و تاب کھاتا ہے - ماتھے پر تیوری ہے) میں کیا بتاؤں ابا جان، بھائی جان یا بھابی سے پوچھیئے میرے نہ جانے کی وجہ کیا تھی - وہ کیوں نہیں بتاتے؟

ناصر علی - یہ بُری بات ہے احسان - تمہاری آرام طلبی اور گستاخی کی شکایت ہوتی ہے - تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے -

(رحمت داخل ہوتا ہے)

رحمت - چائے تیار ہے جناب -

محسن - اچھا چلو (سب اُٹھتے ہیں (احسان بیٹھا رہتا ہے)

ناصر علی - (دروازہ کے قریب جا کر) آؤ احسان

احسان - (اُٹھتے ہوئے) آپ چلئے میں ابھی آیا (سب چلے جاتے ہیں - احسان مُنہ بسورے کرسی پر بیٹھا رہتا ہے - اور آہستہ آہستہ کہتا ہے) میری آرام طلبی اور گستاخی کی شکایت ہوتی ہے - میں آرام طلب ہوں میں گستاخ ہوں - اُونہہ - !!! کیوں کہا کہ میں نہیں جاتا - برقع کا فساد - تم نہ گئے تو میں کیا پہنچ نہ سکی - (نچلے لب کو دانتوں تلے دبا لیتا ہے، کچھ سوچتا ہے) اونہہ ــــ عورت ــــ سگ باش برادر خُرد . . .

(رحمت داخل ہوتا ہے)

رحمت - میاں جی بلاتے ہیں، چائے پی لیجیے -

احسان - (غصہ میں) چلا جا یہاں سے - چائے چاٹے کی بکواس - میں نہیں پیونگا (مُنہ ایک طرف کر کے آہستہ سے) چائے کا بچہ - خبیث (رحمت چلا جاتا ہے -) اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے - چائے پی لو - زہر ہی لو -

(باہر دُور سے ناصر علی کی آواز آتی ہے) "احسان!"

احسان (آہستہ سے) میں نہیں پیوں گا چائے . . . .

(ناصر علی کی پھر آواز آتی ہے) "احسان"

احسان (آواز دیتا ہے) آیا جی -

(چہرے پر غصہ ہے - جاتا ہے - دروازہ کا کواڑ زور سے بند کرتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

آغا بابر بٹالوی
بی - اے (آنرز)

محفلِ ادب

اقبال کی تعلیم

(از جناب ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب ایم۔ اے ڈی فل (آکسن) صدر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے فرمایا کہ یہ کوئی مقالہ نہیں خراجِ عقیدت ہے جو میں اقبال کی جناب میں اس موقع پر پیش کرتا ہوں)

ستر اسی برس ہوئے ہندوستان کی اسلامی فضا میں ایک آواز گونجی جس سے زمین اور آسمان بھر گئے۔ اس آواز کا منبع علی گڑھ تھا۔ سرسید نے اس زور شور کے ساتھ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا کہ در و دیوار گونج اُٹھے اور عالمِ اسلام میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔

مسلمانوں کے ماضی و حال کو دیکھ دیکھ کر سرسید کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہتے تھے اور اُن کے استقبال پر نظر کر کے سرسید کے زبان اور قلم تنبہ اور تنبیہ، تدبر اور تدبیر کا تلاطم پیدا کر رہے تھے۔

پہلا شخص جس نے سرسید کا پیغام شعر کے سانچہ میں ڈھالا وہ حالی تھا۔ حالی نے مسلمانوں کے ماضی و حال کا ایسا نقشہ کھینچا اور ایسے دردِ دل کے ساتھ اس داستان کو بیان کیا کہ شعر کی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے۔ دوست دشمن سب نے گردن ڈال دی اور حالی اسلام کا سب سے بڑا قومی شاعر مان لیا گیا۔

لیکن سرسید کا پیغام ابھی اجمالی تھا۔ اُنہوں نے قوم کو اس قابل بنایا کہ اپنی حالت کو سمجھے اور حالات کو سمجھے اور پھر یہ بھی سمجھے کہ اس کا مستقبل کیا ہونا چاہیے۔ اس مستقبل کی تفصیل ابھی باقی تھی۔

وہ شخص جس نے اس اجمال کی تفصیل کی جس نے ماضی سے استقبال کی طرف نگاہ کو پھیرا، وہ اقبال ہے۔ اقبال نے اس جوش و خروش اور اس ولولہ اور اُمنگ کے ساتھ زبانِ شعر و ادب میں اس مضمون کو ادا کیا کہ یہ اُس کا حصہ ہو گیا۔ حالی ہمارے حال کا شاعر تھا اقبال ہمارے استقبال کا شاعر ہے۔

ہندوؤں، بدھوں اور عیسائیوں کی تعلیم یعنی نفی خودی مسلمانوں میں پھیل گئی تھی۔ تصوف وانزوا نے اُن کے ہاتھ پیر شل کر دیئے تھے۔ نفی خودی کی بدولت وہ انفرادی خودی میں سکڑ کر رہ گئے تھے۔ اقبال نے بتایا کہ سرِ حیات نفی خودی میں

نہیں بلکہ خودی میں مضمر ہے۔ یہ کائنات خودی کا مظہر ہے۔ خودی پیدا کر۔ یہی خودی ہے جو تجھے ایک اعلیٰ تر خودی یعنی بے خودی میں لے جائے گی اور تو انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت میں آجائے گا۔

یہ تمام مقامات اقبال نے خود طے کئے۔ وہ آغاز شعر میں نفی خودی اور وحدت وجود میں مبتلا تھا۔ پھر اس پر خودی اور وحدت وجود کا بھید کھلتا ہے۔ اور آخر میں وہ بے خودی پر منتہی ہو جاتا ہے۔

اقبال کی عظمت کا یہ ثبوت ہے کہ وہ جس جس مقام سے گزرتا ہے ایک عالم کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ جب وہ نفی خودی کا راگ گا رہا تھا لوگ اُسے الاپ رہے تھے، جب اُس نے خودی کا ڈنکا بجایا ہر ساز سے یہی آواز آنے لگی۔ اب جب کہ اُس نے بے خودی یعنی للّٰہیت اور قوم پرستی کا آوازہ بلند کیا سب اُسی میں آواز ملا رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کا تمدن اور اُن کی سیاسیات بدرجۂ غایت اقبال کے شرمندۂ احسان ہیں۔

مسلمان ایک گم کردہ راہ قافلہ کی طرح سیاسیات کے لق و دق بیابان میں بھٹکتے پھر رہے تھے مگر اس فلسفۂ حیات اور اسلامیات کے مبصر نے اُن کے لئے ایک مطمح پیدا کر دیا جس کے صائب ہونے کو لوگ نہایت سُرعت کے ساتھ ملتے جا رہے ہیں۔ وقت آ رہا ہے اس کا جھنڈا عنقریب بلند ہو جائے گا۔

اقبال کہتا ہے کہ ع من نوائے شاعر فرداستم۔ لیکن یہ ایک صدائے بازگشت ہے۔ اے اقبال! تیری صدا سے عالم اسلام کے دل و دماغ بھر گئے ہیں۔ وہ تیری ہی تعلیم کی طرف جا رہے ہیں۔ تو شاعرِ فردا ہی نہیں، تو شاعرِ امروز بھی ہے۔ اور تیرا اثر اتنا بڑا ہے کہ شاید ہی کسی اور شاعر کا کبھی ہوا ہو۔ تو قومی شاعر ہی نہیں تو شاعرِ عہد ہے۔ یہ عہد تیرا عہد ہے۔ عہدِ اقبال ہے۔ کون شاعر تجھ سے پہلے یا تیرے زمانہ میں ہندوستان یا ایران و خراسان بلکہ امریکہ و فرنگستان میں ایسا ہوا ہے جس کا تتبع اس درجہ کیا گیا ہو، جس کی آواز میں اس طرح آواز ملائی گئی ہو۔ آج جو شخص بھی شعر کہتا ہے، وہ اقبال کے رنگ میں کہتا ہے، جو مضامین بھی وہ بیان کرتا ہے اقبال کے مضامین ہوتے ہیں۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بحریں بھی اقبال ہی کی ہوتی ہیں اور شعر سُنانے کا طریقہ بھی اقبال ہی کا طریقۂ ترنم ہوتا ہے۔ ہاں یہ باوجود اس کے کہ ترنم کی کم نوائی شوکتِ مضمون کی متحمل نہیں!

زمانہ پر فرنگ چھا گیا تھا، اُس کا سیلِ بے پایاں ایسا چڑھا تھا کہ عالم اسلام بھی اُس میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔ اے اقبال! تو نے اپنی معنی خیز اور سوز انگیز آواز سے ایک سدِ سکندری کھڑی کی اور اسے بتا دیا کہ ؎

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اُٹھا، یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اسلام اور ادبِ اسلامی ہمیشہ تیرا مرہونِ منت رہے گا ۔ اسلام کو حق ہے کہ تجھ پر فخر کرے اور ہندوستان کا فرض ہے کہ تجھ
فرزند پر نازاں ہو + ہم دُعا کرتے ہیں کہ تیرا کلام ہمیشہ قوم کے دِل کو گرماتا رہے ۔ اور اُسے عُروج و اقبال کے آسمان تک
ئے تاکہ تیری دلی تمنا پوری ہو اور تو قوم کا اقبال بن کر دیر تک باقی اور صحت و سلامتی کے ساتھ اس کا رہنما رہے !

اقبال نمبر
علی گڑھ میگزین اپریل ۱۹۳۸ء

اقبال کا نظریۂ فنون

آرٹ کے متعلق جس میں شاعری شامل ہے علامۂ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی انسانی عمل کا منتہائے مقصود ہے اور
و شاندار اور باوقار بنانے کے لئے انسان ہر وقت کوشاں رہتا ہے ۔ اس لئے لازم ہے کہ تمام آرٹ کو اس مقصد کے زیرِ
تابع فرماں رکھا جائے ۔ افضل و اعلےٰ آرٹ وہ ہے جو ہماری خفتہ طاقتوں کو بیدار کر کے ہمیں زندگی کی مشکلات کا مردانہ وار
کرنے کے قابل بناتا ہے ۔ وہ علوم و فنون جو ہمیں تعلیم عمل دینے اور ہماری قوتوں کو بیدار کرنے کے بجائے ہم پر غفلت
شی طاری کردیں ہمارے لئے موت کا حکم رکھتے ہیں ۔ "آرٹ کا فرض یہ ہے کہ ہمارے اندر بیداری کی رُوح پھونکے ۔ نہ کہ
حالتِ سُکر طاری کرے " فنونِ لطیفہ کی تعریف اُنہوں نے خود یوں کی ہے :-

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصودِ ہُنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا!

اقبال کی شاعری کو معجزے کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے ۔

اقبال نمبر
علی گڑھ میگزین اپریل ۱۹۳۸ء

مطبوعات

علم خانہ داری محترمہ مختار رشا ہنواز کا نام ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انگریزی شاعری اور انشا پردازی میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ موصوفہ نے اپنی زبان کی خدمت کی طرف بھی توجہ کی ہے آپ کی سب سے پہلی اُردو کتاب "علم خانہ داری" کے نام سے رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور نے درسی کتابوں کے لیے تین سو صفحات پر مجلد اور مصور صورت میں شائع کی ہے۔ محترمہ لیڈی عبدالقادر کا "تعارف" بھی شامل ہے۔

نچلے اور درمیانی طبقے کے ہندوستانی گھروں میں بہت سی بیماریاں اور اتفاقی حادثات صرف "امور خانہ داری" سے ناواقفیت کی وجہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ ہمارے اہل تعلیم "نسواں" کی طرف توجہ نہیں کی جاتی اور چونکہ "علم خانہ داری" تعلیم نسواں کا ایک نہایت اہم جزو ہے اس لئے ہم بہنوں اور بیٹیوں کو صحیح قسم کی تربیت سے محروم رکھتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نہایت ناکام بیویاں اور مائیں ثابت ہوتی ہیں۔

اس کتاب میں اُن تمام ضروری باتوں پر بحث کی گئی ہے جن سے معمولی سے معمولی گھر بھی جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ گھر کی صفائی، صحت جسمانی کے اصول، مختلف قسم کے کھانے پکانے کے طریقے، بچوں کی پرورش، اتفاقی حادثات میں فوری امداد کی بہم رسانی غرضیکہ کوئی ضروری بات نہیں جس پر قابل مصنفہ کی دور رس نگاہیں نہ پڑی ہوں۔ بعض اُمور کی تشریح کے لئے جا بجا تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ سوتی، ریشمی اور گرم کپڑے رنگنے، صاف کرنے، استری کرنے اور ان پر سے داغ دھبے مٹانے کے بہت مفید طریقے درج ہیں جن کا مقصد کفایت شعاری کی تلقین ہے۔ متعدد بیماریوں کا نقشہ جس میں بیماریوں کی ابتدا، علامات، علاج اور تیمارداری کے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں بہت کارآمد ہے۔ مختلف قسم کے وٹامنوں کا تناسب بتانے کیلئے غذاؤں کا بھی ایک نقشہ دیا گیا ہے اور ان کے حیوانی، نباتاتی اور معدنی اجزا کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حشرات مثلاً کیڑے مکوڑوں، مکھیوں، مچھروں، پسوؤں اور کھٹملوں سے نجات حاصل کرنے کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ کتاب کی زبان نہایت شستہ اور طرز بیان بہت سادہ و دلنشین ہے معمولی پڑھے لکھے بچے اور بچیاں بھی سمجھ سکتی ہیں۔ ہندوستانی گھروں میں اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ ہمارے خیال میں اس موضوع پر اُردو میں اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب اور دیگر صوبہ جات کے تعلیمی ادارے اس کتاب کو لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں شامل کر کے اور سکولوں کی لائبریریوں کے لئے منظور کر کے اپنی قدر شناسی اور قدردانی کا ثبوت دیں گے۔

کتاب ایک روپیہ میں رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور سے طلب کی جا سکتی ہے۔

کمزور بچوں کی طاقت کیلئے
بچوں کو
ڈونگرے کا بال امرت
دینا چاہیئے
ملنے کا پتہ:۔ ہر بڑے دوا فروش کے ہاں بکتا ہے

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کیے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

منیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

The Title Page and Picture Printed at Half-Tone Press,
Dev Samaj Road, Lahore.

بیادگار علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

ہمایوں بابت ماہِ جون ۱۹۳۸ء

تصویر:- جنگ کے دنوں میں

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

اُس ادیب یا ادب پسند کے لئے جسے سوائے ادب کے دنیا کی کسی اَور چیز سے واسطہ نہ ہو، ادب ایک دل خوش کُن حقیقت ہے، کم از کم ایک پُر امن جائے پناہ ہے لیکن اُس کے لئے جو زندگی کے کسی اور شعبے سے بھی تعلق رکھتا ہو یا رکھنے پر مجبور ہو زندگی چین اور بے چینی کے کھلاڑیوں کے درمیان ایک جنگ یا مقابلہ ہے بلکہ اس بیان میں بھی ایک غلطی ہے۔ پورا امن شاید صرف اُس ادیب کو نصیب ہے جس کے لئے ادب دماغی عیش و عشرت ہو ورنہ کہاں زندگی کا کوئی کام اور کہاں پُورا امن؟

اُردو کے اہلِ ادب اپنی غفلت یا نیکیوں میں مست تھے کہ زندگی کا ایک نیا فلسفہ اور سیاست کا ایک تازہ طُوفان اُن پر ٹُوٹ پڑا ورنہ وہ خُوب اپنے مزے میں پڑے اپنے طرح مصرعوں پر غزلیں لکھتے اور ایک دُوسرے کے بامعنی و بے معنی کلام پر سر دُھنتے تھے نئے فلسفے نے انہیں جھنجھوڑا اور نئی سیاست نے اُن کی زبان اور رسم الخط کو جڑ سے اُکھیڑ پھینکنا چاہا۔ اُن میں سے بعض پوچھتے ہیں کہ کیا ایسی خوبصورت اور نفیس چیزوں کا یوں قلع قمع کیا جا سکتا ہے؟ نامناسب ناممکن! انہیں کیا معلوم کہ ان سے پہلے کتنے مہرگلوں اور ہلاکوؤں اور چنگیز خانوں نے کتنی نفیس و خوبصورت چیزوں کو تہ تیغ کر ڈالا، پھر عجب کیا ہے کہ ان کی تمدنی پیداوار بھی کسی نئے قومی انقلاب کے پاؤں تلے روندی جانے والی ہو!

ڈاکٹر اقبال رح سے اِن ہی مشکلوں کا چند ہی ماہ ہوئے میں ذکر کر رہا تھا اور مایوسانہ لہجے میں اُن سے اس کے متعلق رائے طلب کر رہا تھا کہ میری ساری دلائل کے مقابل میں انہوں نے ایک مُسکراہٹ سے پنجابی میں بے تکلفی سے جواب دیا تو یہ دیا کہ ایسے ہی نہ ڈریئے آپ کی اُردو برابر قائم رہے گی!

کیا ہوگا یہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے۔ آج کل ہر لڑائی بہت سے محاذوں پر لڑی جاتی ہے اُردو کی لڑائی کے بھی بہت سے محاذ ہیں۔ ایک وہ محاذ جہاں متین ادیب اور غافل شاعر علم و ادب کے موتی بکھیرتے ہیں جہاں بڑے بڑے عالم فاضل ہزاروں لُغت کی اور اُردو کتابیں کھولے اُردو کی نئی قاموسیں تیار کر رہے ہیں۔ ایک اَور محاذ ہے جہاں روزانہ اخبار اپنی بارود تیار کرتے ہیں اور اپنی بندوقیں سر کرتے ہیں علمی و ادبی رسالے ان دونوں محاذوں کے درمیان ہیں شش و پنج میں ہیں اُنہیں پتہ نہیں چلتا کہ امن سے ادبی کام کریں یا اپنی زبان کے لئے غُل مچائیں۔ ایک اور محاذ پر سیاست کی ہولی کھیلی جا رہی ہے ریزولیوشن تراشے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے نقص بیان کئے جاتے ہیں، کبھی تُو تُو مَیں مَیں ہے اور کبھی صلح کی گفتگوئیں ہیں، اِس میں بڑے بڑے سیاست دان اور بڑے بڑے رُوحانی رہنما شامل ہیں۔ اسی طرح چند چھوٹے چھوٹے محاذ اور بھی ہیں۔

سوال تو صرف یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لئے کونسا محاذ انتخاب کرتا ہے؛ محاذ کا انتخاب لازم ہے گو بارہا خود حالات ہی اس انتخاب کو عمل میں لے آتے ہیں اور انتخاب کنندہ مُنہ تکتا رہ جاتا ہے۔ پھر بھی سرکاری طور پر انتخاب ہمارے ہاتھوں میں ہے اور ہم اس سے رُوگردانی نہیں کر سکتے۔

خوش قسمت ہیں وہ جنہیں صرف ایک ہی محاذ پر کام کرنا پڑتا ہے، وہ دوسروں کی حالت سے ناآگاہ سہی لیکن اُنہیں ایک گونہ امن تو نصیب ہے، یکسوئی تو ہے، اپنا کام کر رہے ہیں بُرا ہو یا بھلا، ایک خبط ہی سہی، ایک اعتقاد ہی سہی، اپنے دائرے میں بند ہی ہوں، غنیمت ہے کہ کچھ کر رہے ہیں اور تھوڑا بہت اطمینان رکھتے ہیں: ؎

جو کرنا ہے تجھکو کر　　　جو ہونا ہے ہونے دے

حضرت راحل ہوشیارپوری اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۰ مئی میں لکھتے ہیں:۔

"ہمایوں" بابت مئی ۱۹۳۸ء کی ترتیب خاص طور پر قابلِ تعریف ہے۔ رسالے کی ابتدا اقبال مرحوم کے ذکر سے ہوتی ہے آخری مضمون بھی اقبال پر ہے۔ اس مضمون کے نیچے گرامی مرحوم کے متعلق اقتباسات۔ اس سے آگے گرامی کے آقازادہ نواب معظم جاہ کا کلام۔ غالب کی سوانح عمری، غالب کے کلام سے (منقول از "شیرازہ") کے بعد مکاتیب غالب پر ریویو!

"بابوجی" کے بعد منظومات "اظہارِ اُلفت" اور "محبوب کی قبر پر" کے بعد "محبت کی نیرنگیاں"، "نیرنگیوں" کے بعد "کرشمہ" کیا عمدہ ترتیب ہے۔ اقبال کے متعلق اڈیٹر کی نثر اور جائنٹ ایڈیٹر کی نظم۔ پھر حامد اور حمید اور راحل و حفیظ دو بھائیوں کی دو جوڑیاں بزمِ ہمایوں میں نظر آتی ہیں۔ "یادِ گرامی" میں گرامی کی رائے اقبال کے متعلق اور اقبال کی تصویر کے نیچے گرامی کا شعر، واہ سبحان اللہ! گرامی صاحب کے شعر اور حفیظ کی تاریخ "پیغمبرِ دینِ خودی" میں جو مناسبت ہے ظاہر ہے۔ میں اس ترتیب سے بے محظوظ ہوا۔"

بشیر احمد

محمد اقبال

فنا پر خندہ زن اقبال عالی گوہری تیری
کہ ہے صورت نما اللہ کی صورت گری تیری

لرز جاتا ہے جذبِ عشقِ حق سے عرش کا پایہ
ہٹاتی ہے پرے جبریل کو بھی بے پری تیری

پھر اب کروبیانِ عرش کو اک سجدہ لازم ہے
عروجِ آدمِ خاکی کا زینہ رہبری تیری

انا الحق گو ہے عشقِ حق میں بندوں کی خود آگاہی
بناتی ہے خدا، انسان کو صنعت گری تیری

سکھائے چیونٹی کو تو نے آدابِ سلیمانی
گدا ہو خسروی جس کی، وہ دولت بے زری تیری

رسول اللہ کے پیغام کی تفسیر کی تو نے
چلی ختم الرسل کے بعد بھی پیغمبری تیری

یہ فوق الخلق تخلیق اور یہ صد جلوہ پیدائی
مسلّم ہے جہانِ شاعری میں داوری تیری

حامد علی خاں

۱۸ رمئی ۱۹۳۸ء

(۱)

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمی از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ این فقیری
دگر دانای راز آید کہ ناید

اقبال

(۲)

حجازی نے نواز آئے نہ آئے
دلوں میں پھر گداز آئے نہ آئے
سکندر تو ابھی آتے رہیں گے
کوئی آئینہ ساز آئے نہ آئے

حامد علی خاں

(۳)

چو رختِ خویش بربستم ازین خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست این مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

اقبال

(۴)

خودی کا اوج جس کا لازوال ہو
زبر سایہ کا زحبال ہو
پیامبر ہیں تیری ہدایات
چراغِ راہ فردوسِ بریں ہو
نقیبِ شانِ مہدیِ آخر زماں ہو

حامد علی خاں

۲۱ مئی ۱۹۳۸ء

جہاں نما

اتحادِ ہندو مسلم اور آزادئ ہندستان

غلام قوموں کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہوتی ہے کہ اپنے دَورِ زوال میں اُن کا ہر عمل شعوری یا غیر شعوری طور پر غیر ملکی آقاؤں کے مصالح کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے، اس سے زیادہ تکلیف دہ یہ بات ہوتی ہے کہ جو لوگ آزادی حاصل کرنے کے لئے بیقرار نظر آتے ہیں وہ خود بھی حکمرانوں کے پیدا کئے ہوئے فریبوں کا اس طرح شکار ہو جاتے ہیں کہ خود اُن کے اعمال ہی اپنی غلامی کی بنیادوں کو اور زیادہ استوار کرنے لگتے ہیں۔ حاکم قوم دستورِ حکومت میں بعض ایسی خصوصیات رکھ دیتی ہے جن سے اہلِ ملک میں چھوٹے چھوٹے معاملات کے متعلق اندرونی جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ فریب خوردہ عوام اور اُن سے بڑھ کر اُن کے رہنما موہوم اور بے حقیقت مقاصد کے اس دامِ فریب میں یوں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ آزادی کا اہم تر مقصد نظر انداز ہو جاتا ہے۔ جب کبھی غلاموں میں آزادی کا ولولہ پیدا ہوتا ہے حکمران قوم ہمیشہ ایک نیا دام پھیلا دیتی ہے اور قیامت یہ ہے کہ غلام اس دام کی حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود بھی اس میں گرفتار ہونے کے لئے کھنچے چلے آتے ہیں ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر   پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

۱۹۱۹ء کے فسادات کے بعد جو بیداری اس ملک میں پیدا ہوئی تھی اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ یہ ایک خدا ساز بات تھی کہ ہندو اور مسلمان کچھ دیر کے لئے آپس میں مل بیٹھے تھے لیکن مغربی سیاست نے جلد ہی اپنی زنبیل سے مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات کی ہڈی نکال کر ان کے سامنے ڈال دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں مُردار کی اس بے مغز خشک ہڈی کو جھپٹنے کے لئے بیقرار ہو کر ناخن وچنگال سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئے اور دونوں طرف کے بڑے بڑے لیڈر بھی اس جنگ میں شامل نظر آئے۔ دیکھتے دیکھتے وہ اتحاد خواب و خیال ہو گیا جس کی برکت سے ملک نے اس قدر طاقت پیدا کر لی تھی کہ فراعنۂ وقت بھی "ننگے فقیروں" کے سامنے جھکنے لگے تھے اور آزادی کی منزل آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔

اس کے بعد جب غلامی کی پُرانی شراب آئینِ جدید کی نئی بوتل میں ڈال دی گئی تو ملک اور زیادہ بدمست ہو گیا۔ یہ حقیقت سب نے فراموش کر دی کہ طاقت پیدا کئے بغیر کبھی کوئی "داتا" آزادی نہیں دیا کرتا اور طاقت اتحاد اور ایک متحدہ محاذ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی ملک کی فعال ترین جماعت کا یہ زوال بہت عبرت ناک ہے کہ وہ اپنے بلند مقاصد کو بھول کر جھوٹی آزادی کے کھلونے سے بچوں کی طرح کھیلنے لگی ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ملک اگر آج پوری طرح متحد ہو جائے تو ہمارے مطالبات کے تسلیم کرلئے جانے میں بہت زیادہ ڈھیل نہ ہوگی۔ لیکن مغربی سیاست کے نت نئے ہتھکنڈے ملک کے ہر فرقے کو اتحاد کی نعمت سے دور ہی دور لے جا رہے ہیں ؀

اس سلسلے میں ہندو قوم کی حالت سب سے زیادہ افسوسناک ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ سب سے زیادہ غافل ہے بلکہ اس لئے کہ وہ سب سے زیادہ بیدار ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُس عالی حوصلگی سے کام نہیں لیتی جس کی وہ اہل ہے ہندوؤں کو اس ملک میں محض عظیم ترین اکثریت ہی حاصل نہیں بلکہ وہ ہر لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ علم، تجارت، دولت، سیاسی تدبّر، سیاسی اقتدار، ہر میدان میں وہ آگے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اقلیتوں سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ اگر اقلیتوں کے مطالبات اپنے حدود سے متجاوز بھی ہوں اور ہندو قوم اتحاد و یگانگی کے اہم مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ایک بڑے بھائی کی طرح عالی حوصلگی سے کام لے کر انہیں تسلیم بھی کرلے تو اس کی ہستی کسی طرح خطرہ میں نہیں پڑ سکتی۔ ہندوؤں کو ملک میں اتنی عظیم اکثریت حاصل ہے کہ اگر وہ بلا وجہ بزدل نہ بنیں تو کوئی اقلیت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی خواہ وہ اپنے تناسب آبادی سے کچھ زیادہ حقوق ہی کیوں نہ حاصل کرلے ؀

اقلیتوں کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں جس ملک کی قوی ترین اور روشن خیال ترین اکثریت اتنی بزدل اور تنگ حوصلہ ہو اس کی پسماندہ اقلیتوں کا جو حال ہو سکتا ہے ظاہر ہے ؏

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

ملکی جمعیت کا موجودہ انتشار ہماری غلامی کی زنجیروں کو روز بروز زیادہ مضبوط کر رہا ہے اور اس انتشار کی سب سے بڑی ذمہ دار ملک کی بیدار ترین فعال جماعت ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ یہ جماعت عملاً نااتفاقی کی تلقین کرتی ہے بلکہ افسوس یہ ہے کہ اس جماعت نے اتحاد کے مقصد عظیم کو ایک عرصے کے لئے پس پشت ڈال دیا اور اس سے قطعاً غافل ہو گئی۔ حالانکہ اس کا سیاسی تدبر اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ایثار اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کر کے ملک کی تمام جماعتوں کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیتی اور ایک متحدہ ہندوستان آزادی کی منزل کی طرف برابر جادہ پیما رہتا ؀

ہندوستان کا مستقبل

گذشتہ دنوں ہندوستان کے موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو نے یہ حقیقت بیان کی کہ "ہماری صوبجاتی حکومتوں کو جو قوت حاصل ہے اس کا ماخذ نظام حکومت نہیں بلکہ خود کانگرس کی تنظیمی قوت ہے، جنگ اور انقلابات کے اس دور میں کوئی بات بعید از امکان نہیں۔ اس زمانے میں ہمارے بچاؤ کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم پُرامن رہ کر اپنی اندرونی طاقت بڑھاتے رہیں۔ لیکن کوئی رستہ خطرات سے خالی نہیں ہوتا اس لئے ہمیں گوناگوں دشواریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت مستعد رہنا چاہیئے ہمارے راستے میں کچھ کم رکاوٹیں نہیں ہیں۔ غیروں کی مخالفت سے زیادہ ہمیں اپنی اندرونی کمزوریوں کے خلاف جدوجہد کرنی ہے۔ کسی دشمن کے

خلاف لڑنے کے مقابلہ میں اپنی کوتاہیوں کے خلاف جہاد کرنا زیادہ دشوار ہوتا ہے ہمیں دونوں طرح کا مقابلہ درپیش ہے۔ ہمارے اندر بہت سی سماجی خرابیاں ہیں جنہیں قدیم رسم و رواج اور عقاید نے غیر معمولی تقویت بہم پہنچا رکھی ہے۔ بہ حالات موجودہ یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ ہم میں اب ایک نئی بیداری ضرور پیدا ہو رہی ہے۔ فضا میں انقلاب کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں۔ غربا اپنی فاقہ کشی اور مصیبت کا خاتمہ کر دینے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دنیا بھر پر جنگ کے مصائب اور جنگ کے خطرات کے بادل چھا رہے ہیں۔ ہندوستانی اب پہلے کی طرح دوسروں کے ہاتھ میں آلۂ کار راری بنے رہنے پر تیار نہیں۔ یہ ملک اب خود اپنی قسمت کا مالک بننا چاہتا ہے، ہندوستان اگرچہ مشینوں اور کارخانوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا مگر وہ انہیں اس زمانے میں ترقی کا ایک ناگزیر ذریعہ ضرور سمجھتا ہے اور وہ ان کے وجود کو کسی نہ کسی طرح اپنے معتقدات سے ہم آہنگ کرنے کا خواہشمند ضرور ہے۔ ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ زراعتی مسئلہ ہے بڑے بڑے زمینداروں کا اجارہ غریب کاشتکاروں کی ترقی کے راستے میں بری طرح حائل ہے ایک زبردست زراعتی انقلاب کے بغیر اس مصیبت کا علاج ممکن نہیں لیکن زراعتی انقلاب کے باوجود بھی شہری اور قصباتی بے روزگاروں کی ایک کثیر تعداد موجود رہے گی جن کے لئے کام کرنے کے لئے صنعتی کارخانوں کی تنظیم کی ضرورت ہوگی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر

سنہ	صدر	مقام
۱۹۰۶ء	نواب وقار الملک	ڈھاکہ
۱۹۰۷ء	آدم جی پیر بھائی	کراچی
۱۹۰۸ء	سر سید علی امام	امرتسر
۱۹۰۹ء	ہز ہائی نس آغا خاں	دہلی
۱۹۱۰ء	سید نبی اللہ	ناگپور
۱۹۱۱ء	نواب سلیم اللہ	کلکتہ
۱۹۱۲ء	میاں سر محمد شفیع	لکھنؤ
۱۹۱۳ء	سر ابراہیم رحمت اللہ	آگرہ
۱۹۱۵ء	مسٹر مظہر الحق	بمبئی
۱۹۱۶ء	مسٹر محمد علی جناح	لکھنؤ
۱۹۱۷ء	مولانا محمد علی (نظر بند ہو گئے)	کلکتہ
	راجہ محمد علی محمد خاں	
۱۹۱۸ء	مسٹر اے کے فضل الحق	دہلی
۱۹۱۹ء	حکیم اجمل خاں	امرتسر
۱۹۲۰ء	ڈاکٹر مختار احمد انصاری	ناگپور
۱۹۲۱ء	مولانا حسرت موہانی	احمد آباد
۱۹۲۳ء	مسٹر غلام محمد بھرگری	لکھنؤ
۱۹۲۴ء	سر سید رضا علی	بمبئی
۱۹۲۵ء	سر عبد الرحیم	علی گڑھ
۱۹۲۶ء	شیخ سر عبد القادر	دہلی
۱۹۲۷ء	مولوی سر محمد یعقوب	کلکتہ
۱۹۲۸ء	سر محمد علی محمد خاں	کلکتہ
۱۹۲۹ء	ڈاکٹر سر محمد اقبال	الہ آباد
۱۹۳۱ء	چودھری سر ظفر اللہ خاں	دہلی
۱۹۳۳ء	میاں عبد العزیز	کلکتہ
۱۹۳۴ء	خان بہادر حافظ ہدایت حسین	دہلی
۱۹۳۶ء	سر سید وزیر حسین	بمبئی
۱۹۳۷ء	مسٹر محمد علی جناح	لکھنؤ
۱۹۳۸ء	مسٹر محمد علی جناح	کلکتہ (اجلاس خاص)

مرحوم اقبال کی یاد میں

(ایک نوعمر طالب علم کے جذبات)

عجب دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد ۔۔۔ وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

آہ! اقبال ملتِ اسلامیہ کی تمناؤں کے مرکز، قوم کی کشتی کے ناخدا۔ مردہ روحوں میں زندگی کا لہو دوڑانے والے، خودی کے پیام بر، فخرِ ایشیا۔ تو ہمیں داغ مفارقت دے گیا۔ ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء تاریخ عالم میں ایک غم افزا دن شمار ہوگا۔ آئندہ نسلیں اس دن کو یاد کر کے خون کے آنسو بہائیں گی۔ یہ منحوس دن، غم سے بھرپور دن ہمارے غموں میں اور اضافہ کر گیا۔

افسوس! ہمیں خودداری کا سبق دینے والا اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونے کی تلقین کرنے والا خود اُس دُنیا میں جا بسا ہے جہاں جو جاتا ہے پھر واپس نہیں آتا۔

اقبال کی شاعری کا ایک ایک لفظ جیتے جاگتے معلم کی طرح خودداری کا سبق دیتا ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔۔۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

نیز ؎

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض ۔۔۔ نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

بالِ جبریل کی آخری نظم "چیونٹی اور عقاب" ہماری آنکھیں کھول دیتی ہے، گویا تمام تاریخ اسلام ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور وہی پُرانا سبق نئے رنگ میں دُہرایا جاتا ہے۔

چیونٹی

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند

تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب

تُو رِزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں

مَیں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

ترجمانِ حقیقت نے صرف خودداری کا سبق ہی نہیں دیا بلکہ زندگی کے ساتھ زندہ دلی کی تلقین بھی کی ہے ؎

دلِ مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ ۔۔۔ کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

مرحوم اقبال سچا محبِ وطن تھا۔ وہ غلامی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اُس کے رگ و ریشہ میں آزادی کی محبت سرایت کر چکی تھی۔ اس نے شہنشاہی کا طلسم توڑ کر رکھ دیا ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک

سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر

پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری

وہ مسلمان کے افلاس سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ اُس کی جہالت، پیر پرستی کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ خوابیدہ مریدوں کی بیداری کا نقشہ کس جوش سے دکھایا ہے ؎

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دِیا بھی ۔۔۔ گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

آہ! او دُنیائے حاضر کے سب سے بڑے انسان، اب ہم ہمیشہ کے لئے تیرے کلام سے محروم کر دیئے گئے۔ او محسنِ اعظم تُو قوم کا حقیقی معنوں میں لیڈر تھا۔

تیری زندگی قوم پر قربان ہوئی۔ تُو نے سوتی ہوئی قوم کو جگایا۔ مُردہ روحوں میں زندگی کی لہر دَوڑا دی۔

اقبال! تُو صبر و استقلال کا دیوتا تھا، تُو نے آخری دم تک ملک و قوم کی خدمت سے جی نہ چرایا۔ تجھ کو یقین تھا کہ اب میں کوئی دم کا مہمان ہوں لیکن پھر بھی تُو نے اپنا کام جاری رکھا اور ملت پر جان نثار کی۔

اقبال! موت سے پہلے جو الفاظ تیری زبان سے نکلے وہ ہمارے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہیں گے "میں مسلمان ہوں میں موت سے نہیں ڈرتا۔ جب موت آئے گی میں متبسم چہرے کے ساتھ اس کا خیر مقدم کروں گا"

مرنا سب کو ہے۔ دُنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ غیر فانی صرف خدائے واحد کی ذات ہے۔ لیکن تیرے جانے سے جو نقصانِ عظیم قوم کو پہنچا ہے اُس کی تلافی ناممکن نظر آتی ہے۔

او دلیر حوصلہ رکھنے والے رہنما! قوم کے حقیقی بہی خواہ! الوداع! ہمیشہ کے لئے اور آخری الوداع!

محمد افتخار الحق

از خوشاب

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر ۔۔۔ یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا (اقبال)

زِندۂ جاوید اقبال

قِطعہ

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا
احساس میں سما گیا، دِل میں اُتر گیا!

کُنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر
قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا!

کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا
ویرانۂ فنا سے سلامت گزر گیا!

باغِ جہاں میں صُورتِ گلہائے تر رہا
باغِ جناں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا!

خاکِ چمن میں گوہرِ شبنم نہاں نہیں
خورشید جلوہ بار سے پوچھو کدھر گیا!

"ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شُد بعشق"
روشن تر اِس حقیقتِ روشن کو کر گیا!

محرومؔ! کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو
یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا!

تلوک چند محرومؔ

ہندوستان کی مشترکہ زبان

میں کسرائی، وطن طہران، مسکن گونڈوانے میں ۔ خدا معلوم کیونکر آگئی اردو زباں مجھ کو

ذرۂ طلیعن بانو پروین بنت مرزا عاشق حسین بزم مرحوم[1]

حقیقت یہ ہے کہ صرف اُردو ہی ہندوستان کی مشترک زبان (لنگوا فرینکا) بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور صلاحیت کا کیا ذکر ایک بڑی حد تک وہ لنگوا فرینکا بن چکی ہے۔

مسٹر گولڈسٹریم آئی، سی ایس (ریٹائرڈ)

(ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ میں اب سے تقریباً سولہ برس پیشتر)

زبان کا مرتبہ

تمام دُنیا کے کاموں میں اپنی زبان کا مرتبہ سب سے بڑا ہے۔ اور زبان کا مدار نازک بیانی و پاکیزہ خیالی پر ہے۔ میں اپنی زبان پر اپنا وقت اور روپیہ خرچ کرنا تمام مُلکی و قومی نیکیوں سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں اور کتنی ہی زیر باری اور دردِ سر ہو اس مشغلہ کو اعلےٰ درجہ پر پہنچائے بغیر نہ رہوں گا۔

اُردو کا قصور صرف یہی ہے کہ آپ کی زبان ہے۔ اور کسی کی ہوتی تو خدا جانے کس مرتبہ کو پہنچ جاتی۔

خان بہادر میر ناصر علی مرحوم

صدائے بازگشت

جس طرح اُردو زبان ہندو مسلمان دونوں قوموں کی زبانوں سے مرکب ہے، اسی طرح انجمن ترقی اُردو دونوں قوموں سے یکساں تعلق رکھتی ہے اور دونوں قوموں کا فرض ہے کہ زبان اُردو کو وسیع معنوں میں قومی زبان یا ملکی زبان تصور کرکے اس کو ترقی دینے کی کوشش کریں اور یہ زبان جس اتحادِ اقوام کی یادگار ہے اُس کو دونوں قومیں مل کر زندہ اور تازہ رکھنے میں ذرا کوتاہی نہ کریں۔ لیکن فرض کرو کہ دوسری قوم جس کے ساتھ ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے اور جو اُردو زبان پر وہی حق رکھتی ہے جو ہمارا حق ہے، اس حُبِ وطن کی منزل میں کسی خاص وجہ سے ہمارا ساتھ نہ دے، جس کو میں بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا، تو پھر اے فرزندانِ اسلام! تم اپنے فرض سے کیوں غفلت کرو۔ تم اس محبوب زبان کو ترقی دینے اور اس کو بلند ترین درجہ تک پہنچانے میں کیوں کوتاہی کرو۔ یاد رکھو کہ اگر تم اپنا فرض ادا کرو گے اور اپنی جدّ و جہد سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹو گے اور اپنے اس قومی یا ملکی منصوبہ کو پیشِ نظر رکھ کر برابر آگے بڑھتے اور منزلِ مقصود کے قریب پہنچتے جاؤ گے، تو وہ جو کسی غلطی سے اصلی شاہراہ کو چھوڑ کر کسی اور پگڈنڈی پر چل پڑے ہیں اور وہ جو کوتاہ بینی یا غفلت سے بھائیوں کا ساتھ چھوڑ کر منزل سے دُور جا رہے ہے

[1] ان کا سلسلۂ نسب کسریٰ شہنشاہِ ایران سے ملتا ہے اور ان کی والدہ یورپین تھیں۔

، تمہارے نقشِ قدم کو پھر تلاش کریں گے، تمہارے قافلہ کے جرس کی صدا پر پھر کان لگائیں گے، تمہاری گردِ راہ کی پرواز کو پھر
میں کھول کر اور دوربین لگا کر دیکھیں گے۔ اپنی پگ ڈنڈی کے انجام پر منزلِ مقصود کو نہ پا کر پھر اس اصلی شاہراہ پر قدم فرسا
ں گے۔ اُس وقت سمجھیں گے کہ نجات کا آبِ حیات جس کی تلاش میں وہ نکلے تھے، تعصب و نفاق کے رستے پر چلنے
، اس کے کنارے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس وقت وہ دوڑ دھوپ کریں گے تا کہ خضرِ اتحاد کا سُراغ لگائیں اور اس کی
ستگیری سے آبِ حیات کے چشمے تک پہنچیں۔

پس اے فرزندانِ اسلام! تمہارا فرض ہے کہ اُس وقت کے آنے تک اپنے فرض کے انجام دینے میں سرگرم
، اور پیچھے پھر پھر کر اپنے بھائیوں کو دیکھتے جاؤ اور یہ خیال دل میں رکھو کہ آخر وہ بھائی ہیں، برادرانہ محبت کا جوش
تک ان کے دلوں کو بے چین نہ کرے گا، غلط فہمیوں کا غبار کب تک ان کی آنکھوں کو دُھندلا کرتا رہے گا، کب تک
یہ نہ جانیں گے کہ جس منزل پر تم چل رہے ہو اُس پر تمہارے اور اُن کے آبا و اجداد پہلے عرصۂ دراز تک چلتے رہے
کب تک وہ یہ نہ سمجھیں گے کہ تمہارے اور اُن کے اسلاف دونوں نے مل کر اس رستے کو خس و خاشاک سے پاک
تھا۔ اس کے نشیب و فراز کو ہموار کیا تھا۔ اس کے کناروں پر جا بجا سنگِ نشان قائم کئے تھے، پھر دونوں طرف
سوں تک پھولوں اور میووں کے درخت قطار در قطار لگائے تھے۔ اب یہ وہی منزل ہے جس میں تم آگے بڑھنا
ہتے ہو اور تمہارے بھائی اس منزل کے سرے سے دوسرا رستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اپنی نئی پگ ڈنڈی کی داغ بیل
ل کر اس کو اس منزل کی طرح آراستہ و پیراستہ کرنا چاہتے ہیں۔ آخر کب تک یہ تنگ مزاجی اور تنگ چشمی باقی رہے گی
ب تک سرد مہری اور بے پروائی سے کام لیا جائے گا۔ بڑھو! آگے بڑھو!! نہ اپنے فرض کو بھولو اور نہ اپنے بھائیوں کو
دلو۔ وہ وقت آج نہیں تو کل ضرور آئے گا جبکہ ہمارے بھائی اسی منزل کو پھر محبت کی نگاہ سے دیکھیں گے جس پر ہمارے
ر اُن کے آبائے کرام مدت تک گامزن رہے ہیں۔"

مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم
(از خطبۂ صدارت انجمن ترقیٔ اردو، سالانہ اجلاس بمقام سورت۔ دسمبر ۱۹۱۸ء)

راحل ہوشیارپوری

اقبال کے آخری لمحات

دِل بُجھ رہا ہے آنسو آنکھوں سے بہ رہے ہیں
اقبال سب سے رُخصت ہو کر یہ کہہ رہے ہیں

پھر نیند میں خودی کو اپنی سُلا نہ دینا
میرا پیام دِل سے اپنے بھُلا نہ دینا

بُجھتا ہے دل تو کیا غم، آنسو بہیں تو بہہ لیں
اِک بات وقتِ آخر ہم تُم سے اور کہہ لیں

میری نوائے دل پر تُم دِل سے غور کرنا
خود دار بن کے جینا خود دار بن کے مرنا

دِل بُجھ چکا ہے آنکھیں بھی خُوب رو چُکی ہیں
سیلِ سرشکِ غم سے دامن بھگو چُکی ہیں

اِک دلرُبا اندھیری ہر سمت چھا رہی ہے

خوابِ فنا کی پیاری سی نیند آ رہی ہے

ہم طوفِ شمعِ وحدت کا قصد کر رہے ہیں

اپنی خودی سے بھی اب آگے گزر رہے ہیں

خوش ہیں کہ سونے والو تم کو جگا کے چھوڑا

تم کو خودی سے اپنی آگہ بنا کے چھوڑا

کیا خوفِ مرگ ہم کو زندہ ہیں سب کے دِل میں

رہتے ہیں عزم بن کر ہر قلبِ مضمحل میں

دُنیا میں تھے وطن تھا سارا جہاں ہمارا

عقبیٰ میں ہیں وطن ہے کون و مکاں ہمارا

صد شُکر پیشِ حق بھی ہم نیک نام پہنچے

لمحاتِ آخری کا سب کو سلام پہنچے

مقبُول

ہندوستان کے آئینِ نو میں گورنر کے اختیارات

آئین جدید دو خصوصیتوں کا حامل ہے - اوّل فیڈریشن ، دوم صُوبجاتی خودمختاری - اوّل الذکر یعنی برطانوی اور ریاستی ہند کا وِفاق ابھی تک عمل میں نہیں آیا ، مگر صُوبجاتی خودمختاری کا سکیم اپریل ۱۹۳۷ء کو سرکاری طور پر نفاذ کیا گیا - سطورِ ذیل میں صوبجاتی حکومت کے سب سے اہم جزو یعنی گورنر کے اختیارات اور اُس کی آئینی حیثیت پر بحث کی گئی ہے - یہ سوال اس لئے اور بھی اہم ہو گیا کہ پچھلے دنوں کانگرس نے بھی (جو ہندوستان کی سب سے بڑی منظم سیاسی جماعت ہے) کچھ پس و پیش کے بعد نئے آئین کے ماتحت وزارتیں قبول کر لی ہیں - کانگرس کا سب سے بڑا اعتراض گورنر کے اختیارات کے متعلق تھا ، وہ چاہتی تھی کہ گورنر اور وزراء کی آئینی کارروائیوں میں مداخلت نہ کرے - گورنر کے اختیارات کی کیا نوعیت ہے ؛ اور کیا واقعی گورنر کی مداخلت ہندوستان کے قومی و ملکی مفاد کے لئے ضرر رساں ہے ؛ ان دو سوالوں پر ہمیں بحث کرنا ہے :-

ظاہر ہے کہ یہ سوال آئینی پیچیدگیوں سے خالی نہیں اور ان پر کوئی قطعی حکم لگانا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ ان سوالوں کا تعلق آئین کے عملی پہلو سے ہے نہ کہ نظری سے ، جب تک ہمیں نئے آئین کا عملی تجربہ نہ ہو ہم قطعی طور سے اس کے اثرات کو نہیں جانچ سکتے ، تاہم اُن آئینی دفعات سے جو گورنر کے اختیارات اور ذمہ داریوں کی تشریح کرتے ہیں کچھ نہ کچھ نتائج مرتب کئے جا سکتے ہیں جو ظاہر کریں گے کہ کہاں تک گورنر کی مداخلت ہمارے سیاسی ارتقاء اور قومی مصالح کے مفید یا مُضر ثابت ہو سکتی ہے -

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ صوبجاتی خودمختاری سے کیا مراد ہے ؛ برطانوی پارلیمنٹ کی ہمیشہ یہ حُجّت رہی ہے کہ وہ کاروبارِ سلطنت میں ہندوستانیوں کو تعلیم دے گی تا آنکہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ اُن کے مُلک کی حکومت اُن کو سونپ دی جائے - اس سیاسی تعلیم کی پہلی قسط ۱۹۱۹ء کا آئین تھا جس کے ماتحت صُوبوں میں "دوعملی" حکومت کا نفاذ کیا گیا - مسٹر مانٹیگو اور مسٹر چیمسفورڈ کا خیال تھا کہ صُوبوں میں اس قسم کی تعلیم بہتر اور زیادہ خوشگوار نتائج پیدا کرے گی ، لہٰذا مرکزی حکومت کو چھوڑ کر پارلیمنٹ نے ہندوستانیوں کو صوبوں میں محدود سیاسی قوت دی - سائمن کمیشن نے بھی صوبجاتی تجربہ کی سفارش کی اور جب نئے آئین کی ترتیب و تدوین کا کام شروع ہوا تو سلیکٹ کمیٹی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ مرکز کو چھوڑ کر صوبوں میں ہندوستانی وزراء کو صوبے کی حکومت دینی چاہئے - اس پالیسی کے زیرِ اثر موجودہ آئین پُرانی دوعملی کو رد کر کے تمام سیاسی قوت ہندوستانی وزراء کے سپرد کرتا ہے ، یہ ہندوستانی وزراء اُن محکموں کی نگرانی اور انتظام کے لئے جو نئے آئین کے ماتحت اُنہیں سپرد

کیئے گئے ہیں ایک ایسی مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہیں جو عوام کی نمائندہ تصوّر کی جاتی ہے۔

یہ حکومتِ خود اختیاری کی ابتدا ہے۔ رفتہ رفتہ جب ہندوستانیوں میں حکمرانی کی استعداد برطانوی تدبر و سیاست کے معیار کے مطابق پیدا ہو جائے گی تو حکومت اُن کو سپرد کر دی جائے گی ـــــ اور وہ پابندیاں جو کسی نہ کسی مصلحت کے زیر اثر آج کل ہندوستانی وزراء پر عائد کی گئی ہیں، ہٹالی جائیں گی۔ یہ منتہا ہوگا ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کا ـــــ آئین جدید صوبے کے نظم و نسق کا افسرِ اعلےٰ گورنر کو تصوّر کرتا ہے۔ گورنر شہنشاہِ ہند کا نمائندہ ہے، گورنر کو مشورہ دینے کے لئے وزراء کا ایک کابینہ ہوگا جو ہر معاملہ میں گورنر کی راہنمائی کرے گا ماسوا اُن مخصوص حالات کے جن میں پارلیمنٹ کی طرف سے گورنر پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اپنے ذاتی فہم و منشا کے مطابق عمل کرے۔ بظاہر صُوبے میں پولیس، عدالت، مالیات، تعلیم وغیرہ سب کا انتظام ایسے وزیروں کو سپرد کیا گیا ہے جو عوام کی رائے کے مطابق چُنے گئے ہیں اور جو عوام کی نمائندہ مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہیں یہاں تک کہ اگر عوام کی نمائندہ یہ جماعت وزراء کے کام سے مطمئن نہ ہو تو وہ ان کے اختیارات سلب کر سکتی ہے اور اُن کے بجائے ایک زیادہ معتبر جماعت کو حکومت دے سکتی ہے۔

آئین کی دفعات کے سرسری مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا گورنر کے اختیارات ایک نگراں کی حیثیت سے زیادہ نہیں مگر ایک عمیق نظر بتا سکتی ہے کہ حقیقت کچھ اور ہے اور باوجود اس کے کہ تمام قوت ہندوستانی وزراء کو تفویض کر دی گئی ہے گورنر کے اختیارات اس قدر وسیع ہیں کہ وہ صوبے کے ہر انتظامی شعبہ میں مداخلت کر سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

گورنر کی قوت تین حصّوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے: ۱۔ گورنر کی مخصوص ذمہ داریاں، ۲۔ خصوصی اختیارات، ۳۔ گورنر کی آئین سازی کی قوت۔

ذیل کے تبصرہ میں بجائے اس کے کہ ہر قوت پر جُداگانہ بحث کی جائے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان سب قوتوں کا ایک ہی جگہ ذکر کر دیا جائے جن کی بدولت گورنر کسی معاملہ میں مداخلت کر سکتا ہے۔

گورنر کی سب سے پہلی ذمہ داری صوبہ میں ہر امن سوز تحریک یا قوت کا انسداد کرنا ہے، ظاہر ہے کہ امن کا تعلق صوبے کے انتظام سے ہے لہٰذا یہ ذمہ داری اُس وزیر پر عاید ہونی چاہیئے جو صوبہ کی پولیس، عدالت اور اُس کے ضمنی اداروں کے انتظام کے لئے مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہے مگر ایسا نہیں کیا گیا، لہٰذا باوجود اس کے کہ ایک ہندوستانی وزیر صوبہ کا منتظم ہوگا، پھر بھی وہ اپنی ذمہ داری پوری طرح محسوس نہ کرے گا کیونکہ آخری ذمہ داری گورنر پر عاید ہوتی ہے اور گورنر حکومت کے ہر شعبہ میں اس ذمہ داری کی بدولت مداخلت کر سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں وزیر کا کوئی حکم صوبہ کے امن کے لئے خطرناک ہوگا اور واضح رہے کہ اس بات کا فیصلہ کہ کوئی چیز گورنر کی مخصوص ذمہ داریوں کے تحت میں آتی ہے صرف گورنر پر منحصر ہے

اور اُس کا فیصلہ کسی عدالت میں نہیں جانچا جا سکتا۔) مزید برآں گو پولیس وزیر کے دستِ اختیار میں ہے تاہم اُس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ پولیس کے انتظام یا بھرتی کے لئے کوئی قانون بنائے۔ یہ اختیار صرف گورنر کو ہے۔

فرض کیجئے کہ کسی صوبہ میں انارکسٹ صوبہ کے امن میں خلل اندازی کرتے ہیں، قدرتاً وزیرِ انتظامیہ کا فرض ہے کہ وہ ایسی خلافِ قانون کارروائیوں کا انسداد کرے۔ مگر ایسا نہیں۔ نیا آئین گورنر کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر اپنی مخصوص قوتوں سے کام لے اور اپنے کابینہ کے مشورہ کے بغیر جو مناسب سمجھے کرے، وزیرِ انتظامیہ کو اتنا بھی حق نہیں کہ وہ گورنر کو رائے دے، یہی نہیں بلکہ آئین اجازت دیتا ہے کہ ایسے حالات میں گورنر ایک خاص افسر انارکسٹ فتنہ کے انسداد کے لئے مقرر کر سکتا ہے یہ افسر مجلسِ قانون ساز کا ممبر ہوگا، وہاں ہر بحث میں اور اجلاس کی عام کارروائی میں حصہ لے سکتا ہے اُس کے اختیارات ایسے ہی ہیں جیسے کہ ایک منتخب شدہ ممبر کے..... (مگر یہ افسر کسی معاملہ میں رائے نہیں دے سکتا) آئین کی یہ دفعہ صاف ظاہر کرتی ہے کہ ابھی تک ہندوستانی وزرار اس قابل نہیں کہ اُن پر اعتماد کیا جا سکے۔ بجائے اس کے کہ ہر معمولی انتظام کی طرح انارکسٹ جیسے فتنوں کا انتظام بھی وزیر کے سپرد کیا جائے آئین ایک نئی مشین بہم پہنچاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجلس قانون ساز کا منتخب کردہ نمائندہ (وزیرِ انتظامیہ) مجلس کی بحث و تنقید سے بچ جاتا ہے۔ اس کے بجائے ایک خاص افسر گورنر کی کارروائیوں کی وضاحت کرے گا۔ ایسا افسر کہاں تک اپنی ذمہ داری محسوس کرے گا، اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

اس خیال کی تائید کہ نیا آئین ہندوستانی وزرار پر زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہتا اس سے ہوتی ہے کہ خفیہ پولیس کی تمام کارروائیاں صیغۂ راز میں رکھی جائیں گی اور کوئی شخص اُن تک راہ نہیں پا سکتا حتےٰ کہ وزیرِ انتظامیہ خود — البتہ صرف وہ پولیس افسر جنہیں انسپکٹر جنرل اجازت دے یا وہ اشخاص جن پر گورنر کی نظرِ کرم ہو خفیہ پولیس کی کارروائیوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

ہندوستانی وزیر کے ہاتھ سے انتظامی ادارہ کی اصلی قوت چھین لینے کے لئے یہی کافی تھا کہ صوبہ کا انتظام اور امن گورنر کی مخصوص ذمہ داری بنا دیا جائے اُس پر خصوصی اختیارات دینا اور وزیر کو خفیہ پولیس کی کارروائیوں سے دُور رکھنا، نئے آئین کو نہایت غیر مرغوب رنگ میں ظاہر کرتا ہے۔

گورنر کی دوسری ذمہ داری اقلیتوں کی جائز خواہشات کا تحفظ ہے — اس ضمن میں یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ اقلیت سے کیا مُراد ہے۔ اقلیت معاشی، مذہبی، لسانی ..... کئی حیثیت سے تصور کی جا سکتی ہے۔ غالباً ہندوستان میں اقلیت سے مُراد ایک مذہبی گروہ سے ہے۔ یہ اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ کب اور کس طرح ہندوستانی سیاست کا "لاینحل" مسئلہ بنا یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہیں۔ غالباً ۱۹۰۶ء سے پہلے یعنی سر علی امام اور سر آغا خاں کے شملہ ڈیپوٹیشن سے پہلے ہندوستانی لفظ اقلیت سے بھی نا شناسا تھے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے سامنے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کا خیال ہوا اور اُنہوں نے لارڈ منٹو سے درخواست

کی کہ وہ ان کے مفاد کا تحفظ آئینی شکل میں کریں۔ لارڈ منٹو نے اُن کے اس مطالبہ کو منظور کیا اور آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان جُداگانہ نیابت اور انتخاب کے حقدار ہیں ـــــ قومی سیاست کو اس قسم کے تحفظات سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے اُس پر بحث کرنا موجودہ موضوع سے خارج ہے۔ مگر اس کا قدرتی نتیجہ جو جلد یا بدیر ظاہر ہونے والا تھا وہ یہ ہوا کہ اب دوسرے مذہبی گروہ بھی اپنے مخصوص مفاد کو آئینی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان مطالبات کا نتیجہ "کمیونل اوارڈ" ہے۔ یہی نہیں بلکہ نیا آئین نسلی اقلیت کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اینگلو انڈین جماعت کو ریلوے ملازمتوں پر خاص حقوق عطا کئے گئے ہیں۔

یہ قیاس کرنا کہ اقلیتوں کے مفاد کو اکثریت کے تدبر و سیاست پر چھوڑ دینا چاہئے ایک سخت غلطی ہے، کوئی نظامِ حکومت مطمئن اقلیت کے بغیر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ ہر وہ ملک جہاں اقلیت غیر مطمئن ہے، جہاں کی اقلیت کو اکثریت پر بھروسہ نہیں، جہاں اقلیت اپنی زندگی کو دوسروں کے رحم و کرم پر مبنی تصور کرتی ہے ہمیشہ بدنظمی اور سیاسی پیچیدگیوں میں مبتلا رہیگا۔ یہ سب سچ ہے مگر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اقلیتوں کے تحفظ کا کیا طریقہ ہے۔ کیا اُن کے "جائز" مطالبات کو آئین میں منضبط کر دینا چاہئے یا جائز مطالبات کا فیصلہ کسی شخصِ واحد کی رائے پر منحصر ہونا چاہئے۔ نیا آئین آخری صورت کو قبول کرتا ہے لہٰذا گورنر اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ کسی اقلیت کے کیا حقوق کس وقت، کہاں اور کیسے غصب کئے گئے ہیں۔ گورنر کو ایسا شخص خیال کیا گیا ہے جو کبھی غلطی نہ کرے، وہ ایسی مشین ہے جو خارجی اثرات سے محفوظ ہے، اس کا فیصلہ ہر قسم کی نکتہ چینی و نظرِ ثانی سے بالاتسلیم کیا گیا ہے مگر کیا یہ سب کچھ ہندوستان کی مکدر سیاسی فضا اور پارٹی گورنمنٹ میں ممکن ہے؟ اس کا جواب مستقبل دے گا۔[1]

گورنر کی ذمہ داری اقلیتوں کے "جائز" مفاد کا تحفظ ہے۔ آئینِ نو میں لفظ "جائز" کی کہیں تشریح نہیں کی گئی۔ قدرتاً لفظ "جائز" کا اطلاق ہر اُس چیز پر ہو سکتا ہے جسے گورنر کا دماغ قبول یا ایجاد کرے۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد　　　جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بلاشبہ اقلیت کو اکثریت پر بھروسا اور یقین ہونا چاہئے مگر بھروسے اور یقین کی جگہ دل ہے نہ کسی کی چوکھٹ!

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقلیتوں کے حقوق کا تصفیہ بجائے مجلسِ قانون ساز کے گورنر کے ڈرائنگ روم میں ہوا کرے گا[2] ہر وہ ہندوستانی جو پچھلے بیس پچیس برس کی سیاسی تاریخ سے واقف ہے اس قسم کے آئینی تحفظات کے عملی نتائج کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں اقلیتوں کی خواہشات کا تحفظ اس طرح بھی کیا گیا ہے۔ کہ انہیں جُداگانہ نیابت اور انتخاب عطا کیا گیا۔

---

[1] لارڈ مارلے وزیرِ ہند نے ان مطالبات کو آئینی شکل دینے سے انکار کر دیا تھا۔

[2] راماسوامی۔ نئے آئین پر ایک نظر۔

اُن کے نمائندے مجلسِ قانون ساز میں اپنے مطالبات پیش کرسکتے ہیں اور اُن مطالبات کا منوانا اقلیت کی معنوی قوت پر جو اُس کی تنظیم اور سیاسی ارتقا سے وابستہ ہوگی، منحصر ہوگا۔

یہ سمجھنا کہ گورنر ہر دفعہ اقلیت کا تحفظ کرسکتا ہے پارٹی گورنمنٹ کی عملی سیاست سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔ اگر کوئی اکثریت کسی اقلیت کے حقوق غصب کرنے کا تہیہ کرے تو گورنر کے سامنے صرف دو راستے کھلے ہیں، یا تو وہ اقلیت کے حقوق کا تحفظ نہ کرے یا اکثریت کو دبانے کی غرض سے تمام نظامِ حکومت کو پلٹ دے۔ نئے انتخابات ہوں، نئی وزارت بنے اور مجلسِ قانون ساز میں اقلیت کی سیاسی حیثیت بھی بدل جائے۔ کیا کوئی گورنر ہمیشہ مؤخرالذکر طریقہ اختیار کرسکتا ہے۔

اقلیتوں کو اور تقویت دینے کے لئے "پرچۂ ہدایات" (*Instrument of Instructions*) گورنر کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ حتےالامکان اُن کے نمایندہ کو کابینہ میں جگہ دے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ یہ اقدام کابینہ کی مجموعی ذمہ داری کو گزند نہ پہنچائے۔ گورنر کہاں تک اس ہدایت پر عمل کرسکتا ہے وہ پچھلے چند دنوں کی صوبجاتی سیاست نے واضح کردیا ہے۔ اُڑلیسہ کیبنٹ میں کسی مسلمان وزیر کو جگہ نہیں دی گئی مسلمانوں نے گورنر سے استدعا کی کہ وہ اپنی مخصوص ذمہ داری اور "پرچۂ ہدایات" کی بدولت مداخلت کرے اور اقلیت کے مفاد کا خیال کرتے ہوئے ایک مسلمان وزیر کو کابینہ میں جگہ دے ــــ گورنر نے ایسا کرنے سے انکار کردیا کیونکہ اس کی رائے میں اقلیتوں کے حقوق ہر طرح سے محفوظ ہیں۔

ظاہر ہے بحالاتِ موجودہ اقلیتوں کے جائز مفاد کا گورنر کے ہاتھ میں ہونا قومی اور ملکی مصالح کے بھی خلاف ہے اور اقلیتوں کو بھی اُن کے حسب منشا فائدہ پہنچانے سے قاصر ہے۔ اِن حالات میں دوسری صورت یہی ہوسکتی ہے کہ وہ بنیادی حقوق جو کسی قوم کی مذہبی، ثقافتی، لسانی اور سیاسی زندگی کے حفظ و بقا کے لئے ضروری ہیں آئین میں منضبط کردیئے جائیں اور جب بھی مجلسِ قانون ساز میں ایسا قانون پیش کرنے کی کوشش کی جائے جو کسی اقلیت کے حقوق پر ناروا حملہ ہو تو قانون کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ فیڈرل کورٹ جیسے ادارہ کے سپرد کردیا جائے، جس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ آئین کی تشریح کرے۔ فیڈرل کورٹ کا یہ اہم ترین فرض ہے کہ وہ آئین کے متعلق تمام مسائل کا فیصلہ کرے اس لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں اقلیتوں کا مسئلہ بھی اسی غیرجانبدار ادارہ کے سپرد نہ کردیا جائے۔ گورنر کا فیصلہ چاہے کتنا ہی حق بجانب ہو مگر اس پر ہمیشہ شک کی نظریں پڑیں گی، ایسے فیصلہ میں روایتی تعصب، نسلی امتیاز اور حاکمانہ مصلحت اندیشی کی جھلک نظر آئے گی۔ مگر عدالت کا فیصلہ بجائے دماغ کے علاوہ نفسی رجحانات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، لہٰذا ایسا فیصلہ زیادہ قابلِ قبول ہوتا ہے اور آئین پسند دماغوں پر جو سیاسی جدوجہد کے علمبردار ہوتے ہیں، عدالت کی انصاف پسندی نقش ہوجاتی ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مابہ النزاع مسائل امن و آشتی سے طے پا جاتے ہیں۔ ورنہ دوسری صورت میں ہمیشہ گورنر کا فیصلہ خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے، جس کا حل

خطرناک نتائج کا حامل ہوتا ہے، آزادی طلب قوم، بدیسی حکمرانوں کے عمل کو شک کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ اقلیتوں کے رہنما ہر اُس فیصلہ کو جو کسی دوسری اقلیت کو تھوڑا سا فائدہ پہنچائے، اپنے لئے مضر اور آئندہ جنگ" کے لئے ایک بہانہ بنا لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے نیا آئین ان نتائج کا کوئی تسلی بخش حل پیش نہیں کرتا۔ گورنر کو اتنی قوت دے دی گئی ہے کہ وہ اُسے کسی پارٹی، کسی گروہ، کسی اقلیت کو "سیاسی انعام" دینے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

گورنر کی تیسری ذمہ داری ملازمتوں کے متعلق ہے۔ آئین چاہتا ہے کہ گورنر ملازموں اور اُن کے متعلقین کے اُن حقوق کی نگرانی کرے جو قانوناً اُن کو بخش دیئے گئے ہیں۔۔ اس دفعہ کی پہلی شق یہ ہے کہ گورنر ملازمتوں کے جائز حقوق کا تحفظ کرے۔ دوسری شق کا اثر ہماری قومی سیاست کے لئے مضر نہیں ہو سکتا کیونکہ اُن کا تعلق زیادہ تر پنشن یا ملازمتوں پر حقوق وغیرہ سے ہے۔ مگر پہلی شق زیادہ واضح الفاظ میں بیان نہیں کی گئی، یہاں بھی لفظ "جائز" استعمال کیا گیا ہے اور اس "جائز" کا فیصلہ کرنے والا صرف گورنر ہے ۔۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کا انتظام بغیر ایک ایسی منتظم جماعت کے جو اپنے آپ کو مشاہرہ اور مدتِ ملازمت کے متعلق محفوظ خیال کرے، محال ہے۔ کیونکہ نمائندہ حکومت (Representative Government) ایک ایسی جماعت کے سپرد ہوتی ہے جس کا قیام مجلسِ قانون ساز پر منحصر ہوتا ہے۔ کابینہ کی مدتِ حیات غیر مستقل ہوتی ہے، لہٰذا حکومت کی پالیسی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، مگر یہ پالیسی جاری کرنے والا محکمہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محکمہ جانتا ہے کہ انتظامی مشکلات کیا ہوتی ہیں۔ نئی پالیسی کس طرح جاری کرنی چاہئے۔ قانون کیسے نافذ کئے جاتے ہیں وغیرہ۔ الغرض اس محکمہ کا تجربہ ہر حکومت کے لئے ضروری اور لازم ہوتا ہے، ظاہر ہے یہ تجربہ حاصل کرنے کے لئے ملازموں کی ایک مطمئن جماعت موجود ہونی چاہئے، ایسی جماعت تیار کرنے کے لئے آئین اُن کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے، مگر ان حقوق کا محافظ گورنر کو بنانا قوم پرستوں کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ انڈین سول سروس، انڈین میڈیکل سروس وغیرہ ملازمتوں کے قانون وزیرِ ہند کے منشا کے مطابق بنتے ہیں، ان کا تقرر و تنزل اس کے ہاتھ میں ہے، وہ اس کے مطیع ہیں اور اسی کے سامنے ذمہ دار ہیں . . . . مگر حکومت کی مشین میں وہ انتظامی اداروں کے افسر ہونے کی حیثیت سے ایسے وزیروں کے ماتحت ہیں جو مجلسِ قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہیں۔ وزیر اگر چاہے کہ اس کا ماتحت افسر (کوئی آئی سی۔ ایس) ایسے قوانین پر عمل کرے جو خود وزیر نے اپنے محکمہ میں زیادہ تسلی بخش انتظام کے لئے وضع کئے ہوں اور اُس کا ماتحت افسر ایسے قوانین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے یا اُن کی خلاف ورزی کرے تو کیا وزیر اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر سکتا ہے یا اس کو ایسی سزا دے سکتا ہے جو اس نے اُن قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے کے لئے تجویز کی ہو؛ جہاں تک آئین کا تعلق ہے، آئین وزیر کو اس قسم کا کوئی اختیار نہیں دیتا۔ وزیر اپنے ایک ماتحت افسر کے خلاف، چاہے وہ افسر وزیر کی کسی پالیسی، تجویز یا کسی حکم کے خلاف عمل کرے، خود کوئی سزا یا سزا تجویز نہیں کر سکتا۔ ایسے عمل کا حکومت اور ملک پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

کابینہ میں تقسیم کار اور طریقۂ عمل کا فیصلہ گورنر اپنی مرضی کے مطابق کرے گا۔ آئین کی یہ دفعہ بہت اہم ہے، گورنر کے اس اختیار کے اثرات سے وہی لوگ زیادہ واقف ہیں جو حکومت کی مشین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس اختیار کی بدولت گورنر اگر چاہے تو کسی محکمہ کی اصلی قوت اپنے ہی ہاتھ میں رکھ سکتا ہے ــ طریقۂ عمل کے ضمن میں گورنر کو قانوناً ایسا انتظام کرنا پڑیگا جس کی بدولت وزیر اور اُن کے سکرٹری مجبور رہوں گے کہ وہ خاص اُمور کے متعلق تمام اطلاعیں گورنر کو پہنچاتے رہیں۔ گورنر اگر چاہے تو وہ تمام خبریں اس طرح سے حاصل کرسکتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر ایک وزیر اور سکرٹری کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسی چیز جو گورنر کی "مخصوص ذمہ داری" سے متعلق ہو، فوراً گورنر کو پہنچا دے۔ اس دفعہ کی آئینی پیچیدگی یہ ہے کہ سکرٹری کو وزیر کا سا درجۂ امتیاز دیا گیا ہے۔ سکرٹری جو اکثر آئی۔سی۔ایس افسر ہوتا ہے اس کا مجاز ہوگا کہ وہ گورنر سے براہِ راست، وزیر کی مداخلت بلکہ حکم و مرضی کے بغیر کسی خاص محکمہ کے متعلق گفتگو کرسکے، وہ گورنر کو تمام ایسے حالات بتا سکتا ہے جن کا بتانا شاید وزیر مناسب نہ سمجھے، کیا گورنر ایسے موقعوں پر سکرٹری کو وزیر پر ترجیح دے گا؟ یا وزیر خود اپنے سکرٹری پر اعتماد کرے گا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو "رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند" کے تحت آتے ہیں ــ گورنر کے اسی اختیار کے متعلق پارلیمنٹ میں ایک مخالف ممبر نے کہا تھا "کہ سکرٹری کو وزیر پر ایک محافظ کتّے کی طرح مسلط کردیا گیا ہے"۔

یہ ایسے ہی ملازموں کے لئے ہے کہ اُن کے جائز حقوق کی نگہداشت گورنر کی مخصوص ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ مضبوط اور انصاف پسند حکومت کے لئے مطمئن ملازم ضروری ہیں تو یہ اور بھی زیادہ صحیح اور اہم ہے کہ ملازموں اور وُزراء کے تعلقات خوشگوار ہونے چاہئیں، اُن میں آپس میں اعتماد، تعاون اور پبلک مفاد کے سامنے ذاتی اغراض کو بھول جانے کی ہمت ہونی چاہئے۔ بے شک آئین ایسا سازگار ماحول پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں ادارہ پبلک سروس کمیشن ہے۔ مگر کیا آئین ہر اُس کوشش کو دبانے کا انتظام کرتا ہے جس کا مقصد ملازمت اور وزارت میں کشمکش پیدا کرنا ہو؟ کیا "جائز حقوق" میں سزا پانے کا "حق" بھی شامل ہے؟ کیا گورنر کو اختیار ہے کہ وہ آئی۔سی۔ایس افسروں کو سزا دے سکے؟ نئے آئین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سزا دینے اور موقوف کرنے کا اختیار بھی صرف سکرٹری آف سٹیٹ (وزیرِ ہند) کو ہے۔ ظاہر ہے گورنر صرف اُن حالات میں مداخلت کرے گا جب کوئی وزیر کسی "ملازم" کے خلاف کوئی اقدام کرے اُس وقت وسیع المعنی لفظ "جائز" (جس کی آئین میں کچھ تشریح نہیں کی گئی) لامحدود قوت عطا کرسکتا ہے۔ یہاں بھی ضروری تھا کہ ملازمت کے حقوق کی حفاظت ایک ایسے ادارہ کے سپرد کی جاتی جو پبلک میں اعتماد پیدا کرسکے۔ جس کا فیصلہ پارٹی گورنمنٹ کی ریشہ دوانیوں اور سیاسی جوڑ توڑ سے بالاتر ہو، ایسا ادارہ پبلک سروس کمیشن ہوسکتا ہے۔ یہی ادارہ اُمیدواروں کی جانچ کرتا ہے، اسی کی سفارش اور جانچ پر سکرٹری آف سٹیٹ مختلف آسامیاں پُر کرتا ہے۔ اگر ایسے ہی غیر جانبدار ادارہ کے ہاتھ میں تمام جھگڑے

لہ Sec 59, cl.(c)

جھکانے کی قوت بھی دے دی جائے تو زیادہ خوشگوار نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ایسے حالات میں یہ یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ ایک محکوم ملک جہاں ایسی قوم پرست قوتیں برسرِ عمل ہوں جو بدیسی حاکموں کے اثر و اقتدار کو ملک کی آزادی میں رکاوٹ سمجھتی ہوں اُن کے پیشِ نظر یہ بات نہیں ہوتی کہ یہ اثر و قوت قوم و ملک کی بھلائی کے لئے استعمال کئے جارہے ہیں۔ وہ صرف یہی دیکھتی ہیں اور غالباً دیکھنا چاہتی ہیں کہ موجودہ حالات اُن کی قومی فلاح کے منافی ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس قوت پر پبلک میں اعتماد پیدا کیا جائے، اس کی اعانت حاصل کرنے کے لئے دیانت دارانہ کوششیں کی جائیں اور یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک سیاسی قوت بجائے عوام کے کسی ایک شخص کے فہم و منشا پر منحصر ہے۔

گورنر کی چوتھی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسے قانون پاس نہ ہونے دے جو ایسے مقاصد کے منافی ہوں جن کے حاصل کرنے کے لئے امتیازی سلوک والی آئینی دفعات وضع کی گئی ہیں۔

اس پیچیدہ دفعہ کے سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کو "مالی خود مختاری"[1] عطا کی گئی تھی مرکزی مجلس قانون ساز کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ تجارتی معاہدوں پر بحث کرسکے اور اپنے حسبِ منشا، اُن کو طے کرے اور اگر چاہے تو کسی ملک سے ترجیحی سلوک روا رکھے۔ اسمبلی کا ان معاملات پر کہاں تک اختیار تھا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے برطانیہ کے ساتھ ترجیحی معاہدہ (اوٹاوہ پیکٹ) ختم کرنے کا ووٹ دیا اور حکومتِ ہند نے اس فیصلہ پر عمل کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسمبلی کو تمام مالی اُمور پر اختیار تھا، بلکہ یہ ایک محدود قوت تھی جو ہندوستانیوں کو تجارتی معاہدے طے کرنے اور کچھ محصول لگانے کے لئے دی گئی تھی۔ تاہم اس کا اتنا اثر ضرور تھا کہ تجارتِ درآمد پر محصول لگانے سے ملکی صنعت کو فروغ ہوا۔ ظاہر ہے اسمبلی برطانوی سامانِ تجارت پر بھی محصول لگاسکتی تھی —— مگر اب یعنی فیڈریشن کے قیام کے بعد یہ گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ہر اُس امتیازی قانون کو پاس نہ ہونے دے جس کا اثر برطانوی مال یا باشندوں پر پڑے، چونکہ ہندوستان یا بالفاظِ دیگر فیڈریشن کی مالی پالیسی بھی گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری ہے اور صوبوں کو "مالیات" پر کوئی اختیار نہیں لہٰذا یہ گورنر جنرل ہی کا اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے ہندوستان کی مالیات کا انتظام کرے اور اس لئے کہ صوبوں میں کوئی ایسا قانون نہ پاس کیا جائے جو اس مصلحت کے خلاف ہو، یہ گورنر کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ایسی کوششوں کی روک تھام کرے، اور فیڈرل اسمبلی یا وائسرائے کے پاس کردہ قوانین کو اپنے صوبے میں نافذ کرے —— فیڈریشن کی مالی پالیسی کو گورنر جنرل کی ذمہ داری قرار دینا، ۱۹۲۱ء میں عطا شدہ "مالی خود مختاری" پر ایک ایسی بندش ہے جو قوم پرستوں کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتی رہے گی۔

علاوہ ازیں یہ دفعہ ملکی تجارت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، ہر اُس ملک میں جو صنعت کے میدان میں نیا نیا اُترا ہے، اتنی قوت نہیں ہوتی کہ وہ بیرونی ممالک سے مقابلہ کرکے اپنی ملکی منڈیوں کو اپنے تجارتی سامان کی کھپت کے لئے محفوظ کرے۔ حکومت ایسے

[1] Fiscal Autonomy

موقع پر قومی مفاد کے پیش نظر ملکی صنعت کو محصولِ درآمد اور دیگر ذرائع سے مدد پہنچاتی ہے تاآنکہ ملکی صنعت بھی اس قابل ہو جائے کہ بغیر مدد کے بیرونی مسابقت کا مقابلہ کر سکے۔ ہندوستان ایک نیا صنعتی ملک ہے۔ ضرورت ہے کہ حکومت اس کی نوخیز صنعت کی اعانت کرے تاکہ وہ سامان جو یہاں بکفایت تیار ہو سکتا ہے، ملکی منڈیوں میں مہیا کیا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ تامینی[1] پالیسی کا اختیار کرنا خطرات سے خالی نہیں تاہم قومی مفاد کے لئے اشیاء کی قیمت میں گرانی اور عوام کی قوتِ خرید میں کمی تھوڑے عرصے کے لئے برداشت کی جا سکتی ہے، ۱۹۲۱ء کی مالی خود مختاری کی بدولت اسمبلی اس تامینی پالیسی پر کاربند تھی اور اسی کی برکت تھی کہ ہندوستان لوہے، شکر، دیاسلائی وغیرہ اشیاء کے لئے بیرونی ممالک سے بے نیاز ہوتا جا رہا ہے . . . مگر کیا آیندہ بھی اسی پالیسی پر جس کا مقصد ملکی صنعت کا فروغ ہے عمل کیا جا سکے گا؟ اس کا جواب امید افزا نہیں قرائن بتا رہے ہیں کہ شاید یہ پالیسی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دی جائے گی۔

محصولِ درآمد کے علاوہ حکومت کبھی کبھی بعض صنعتوں کی پیداوار پر مقدار کے لحاظ سے نقد[2] روپیہ بھی دیا کرتی ہے، اس کا مقصد بھی ملکی صنعت کو "مصنوعی مدد" سے ترقی دینا ہوتا ہے، اب فرض کیجئے کہ حکومت فیصلہ کرتی ہے کہ اونی مصنوعات کو ایسی مدد کی ضرورت ہے، لہٰذا ہندوستانی خزانہ سے اس صنعت کو نقد روپیہ دیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اونی مصنوعات تیار کرنے کے کارخانے ہندوستانی اور برطانوی ہر قسم کے سرمایہ سے تیار کئے گئے ہیں ـــ کیا اسمبلی اعتراض کر سکتی ہے کہ ہندوستان کا روپیہ کسی انگریزی کارخانہ کو نہ دیا جائے؟ امتیازی سلوک والا آئین ایسے اعتراض کو جائز قرار نہیں دے سکتا، کیونکہ ایسے قانون کا اثر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی (انگریزی) کارخانوں میں امتیاز پیدا کرنا ہوگا۔ اس طرح سے یہ قانون غیر ہندوستانی سرمایہ اور کمپنیوں کا تحفظ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا جا سکتا جو برطانوی باشندوں پر اس قسم کی پابندیاں عاید کر سکے جیسی آج کل جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر عائد کی جا رہی ہیں، برطانیہ کا ہر باشندہ تجارت اور کاروبار وغیرہ میں اُن تمام مراعات کا مستحق ہوگا، جو کسی ہندوستانی کو حاصل ہونگی، اس کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کو یہی حقوق انگلستان میں حاصل ہوں گے۔

یہ قانون ہندوستان کی معاشی زندگی اور صنعتی ترقی پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے، گورنر جنرل کی اس ذمہ داری پر ہندوستان کی آیندہ خوشحالی منحصر ہے۔ مالی پالیسی پہلے ہی اسمبلی کی نگرانی اور خردہ گیری سے محفوظ تھی، اب فیڈریشن کے بعد تجارتی معاہدے بھی اس طرح طے کئے جائیں گے کہ ایک نوخیز صنعتی ملک کے مفاد کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے، بلکہ دُنیا کے معاشی حالات سے قطع نظر ایک محدود جغرافی اور سیاسی سلطنت کے قیام کو مقصدِ اولین سمجھا جائے۔ یہ ایسے شبہات ہیں جو ہر قوم پرست کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں، تاہم یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستان باقی دُنیا کی طرح تاریخی قوتوں کے زیر اثر ہے۔ ممکن ہے قوم پرستوں کے شبہات کبھی عملی صورت اختیار نہ کریں۔

[1] Protectionist Policy [2] Bounty

گورنر کی پانچویں ذمہ داری، ایسے علاقوں کی خوش انتظامی سے متعلق ہے جن کا انتظام باقی صوبے کے مانند کسی ترقی یافتہ نظامِ حکومت کا اہل نہیں۔ سنہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے ماتحت یہ علاقے گورنر اور اس کی کونسل (جماعتِ وزراء) کے زیرِ نگرانی تھے۔ ان کی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ نہ تو ان کے نمائندے مجلس قانون ساز کے ممبر ہو سکتے تھے اور نہ مجلس قانون ساز کو کسی قسم کی مداخلت کا اختیار تھا۔ دراصل یہ ایسے سرحدی یا جنگلی علاقے ہیں جو تمدنی اور سیاسی اعتبار سے اس قابل نہیں کہ وہاں ترقی یافتہ سیاسی نظام، عوام یعنی وہاں کی آبادی کے لئے مفید ثابت ہو سکے، کوشش یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ان کو باقی صوبے کی سیاسی سطح پر لایا جائے ـــــ نئے آئین کے مطابق ان علاقوں کی حکومت صرف گورنر کو تفویض کی گئی، کسی وزیر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ گورنر کو ان معاملات پر کوئی رائے دے، مجلس قانون ساز کو پہلے کی طرح وہاں کے حالات پر کوئی اختیار نہیں۔ وہاں سے کوئی نمائندہ نہیں بلایا جائے گا، گورنر صوبے کے خزانہ سے روپیہ لے کر جس کی منظوری مجلس قانون ساز کے ہاتھ میں نہیں ایسے علاقوں کی حکومت اپنے فہم و مرضی کے مطابق کرے گا۔ قوم پرستوں کا خیال ہے کہ مجلس قانون ساز کو کم از کم نکتہ چینی کا پورا اختیار ہونا چاہیے۔ دوسرے وہ چاہتے ہیں کہ ایسی حکومت کی میعاد کم از کم مدت تک محدود ہونی چاہیے تاکہ برطانوی ہندوستان اور ریاستی ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا نیا ہندوستان نہ بس جائے ـــــ

گورنر کی باقی دو ذمہ داریاں فیڈریشن سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں، لہٰذا ان پر تبصرہ کرنا موجودہ بحث سے خارج ہے۔ تاکہ گورنر ان ذمہ داریوں کو بوجہ احسن سرانجام دے سکے، پارلیمنٹ نے اس کو آرڈیننس جاری کرنے کی قوت بھی دی ہے، گورنر کے آرڈیننس دو قسم کے ہوں گے (۱) وزیر کا آرڈیننس، (۲) گورنر کا آرڈیننس۔

وزیر کا آرڈیننس، وزیر کے مشورے پر جاری کیا جائے گا مگر صرف اس وقت جب کہ مجلس قانون ساز کا سیشن (مدتِ اجلاس) ختم ہو چکا ہو، ایسے آرڈیننس کے لئے ضروری ہے کہ گورنر کو یقین ہو جائے کہ حالات فوری احکام کے مقتضی ہیں، ایسے آرڈیننس مجلس قانون ساز کے اجلاس میں پیش کیا جائے گا اور اگر مجلس اس کی نامنظوری کا رزولیوشن پاس کر دے تو آرڈیننس ختم ہو جائے گا دوسری صورت میں مجلس کے اجلاس کے چھ ہفتہ بعد، آرڈیننس از خود بلا بغیر کسی رزولیوشن کے ختم ہو جائے گا، گورنر اور شاہنشاہ معظم بھی آرڈیننس کو واپس لے سکتے ہیں۔

گورنر کا آرڈیننس اس وقت جاری ہوگا جب حالات ایسے ہوں جن میں اسے اپنے فہم و مرضی کے مطابق عمل کرنا ہے، یہ آرڈیننس چھ ماہ تک جاری رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر چھ ماہ سے زیادہ توسیع کرنے کی ضرورت ہو تو یہ آرڈیننس وزیرِ ہند کے توسل سے پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے گا۔ ایسا آرڈیننس گورنر یا شاہنشاہ معظم واپس لے سکتے ہیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ آرڈیننس کس قوت کے زیرِ اثر ہیں، وزیر کا آرڈیننس مجلس قانون ساز کے ماتحت ہے بصورتِ دیگر کونسل کے اجلاس کے

چھ ہفتے کے بعد خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ مگر گورنر کا آرڈیننس کسی مجلس کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا اور اُس صورت میں جبکہ اِسے چھ ماہ سے زیادہ نافذ کرنے کی ضرورت ہو اُس وقت بھی پارلیمنٹ اُسے رد نہیں کر سکتی، ایسا کرنا صرف ایک آئینی رسم کا پُورا کرنا ہے۔ اس کا جاری کرنے اور واپس لینے والا صرف گورنر ہے ـــــ یہی نہیں اس کے علاوہ گورنر اگر چاہے تو قانون بھی بنا سکتا ہے، ایسا قانون "گورنر کا ایکٹ" کہلائے گا۔ ایسے حالات جن میں گورنر اپنے فہم یا مرضی کے مطابق عمل کر سکتا ہے اُسے یہ حق دیتے ہیں کہ وہ فوراً "گورنر کا ایکٹ" پاس کر دے یا مجلس قانون ساز میں ایک پیغام مجوزہ بل کے ساتھ بھیج دے۔ اگر مجلس یہ قانون پاس نہ کرے تو ایک ماہ کے بعد یہ بل از خود قانون بن جائے گا ـــــ ایسے موقع پر گورنر مجلس اور کونسل کی ترمیمیں قبول کرنے پر مجبور نہیں گو وہ ان پر غور کر سکتا ہے۔

یہ آمرانہ قوتیں، صوبے کی عام سیاسی زندگی کو شل کر سکتی ہیں، ذمہ داریوں کے علاوہ گورنر کو اتنی قوت دینا، وزرا کے معمولی اختیارات کی حقیقت ظاہر کر دیتا ہے، مالیات کو مرکزی حکومت یعنی فیڈریشن کے سپرد کر دینا اور فیڈریشن کی مالی پالیسی کو گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری قرار دینا، صوبوں کو مفلوج کر دیتا ہے، حکومت کے کاروبار سے وزرا، اتنا روپیہ نہیں بچا سکتے کہ وہ تعلیم، حفظانِ صحت، بے روزگاری کے انسداد، وغیرہ قومی کاموں پر صرف کریں . . . . . . ان تمام تحفظات کے باوجود یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ حکومت نظری فلسفہ نہیں بلکہ اس کا تعلق عملی سیاست سے ہے، بے شک نیا آئین قوم پرستوں کی آرزوؤں کی تکمیل نہیں۔ تاہم یہ اتنا بے جان بھی نہیں کہ ہندوستان کے اُن ننگوں اور بھوکوں میں جو دُور اُفتادہ علاقوں میں بستے ہیں سیاسی بیداری پیدا نہ کر دے، نئے انتخابات اس بات کی کافی شہادت ہیں کہ لوگ آئینی مشین سے ڈرتے نہیں بلکہ اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک سیاسی پارٹی کا احتجاج، ملک میں ہیجان پیدا کر سکتا ہے، مگر عوام کو ملکی مسائل سے آشنا کر کے، سیاسی قوت اُنہیں دے دینا زیادہ مشکل اور اہم ہے۔ اور یہی ہمارا مطمح نظر ہونا چاہئے۔ ذرائع حصول میں اختلاف ہو سکتا ہے، کوئی چاہتا ہے کہ خونی انقلاب کی ایک ہی کروٹ یہ سب کچھ عطا کر دے اور کوئی سمجھتا ہے کہ بتدریج ارتقائی منازل طے کرنا ہمارے لئے زیادہ قرینِ دانش ہے مگر کیا اس پُر شورش، بدلتی دُنیا میں عوام کی قوت سے کوئی انکار کر سکتا ہے؟

محمد صدیق تائونی

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

۱۹۳۸ء

پیغمبرِ دینِ خودی

منتظر اُس مردِ حق کا ہے جہانِ بے ثبات
جس کا اک جلوہ ہو بُنیادِ فروغِ شش جہات

مدّتوں گردش میں رہتا ہے چراغِ مہر جب
صُبح ہوتی ہے شبِ تاریکِ بزمِ کائنات

گھومتا ہے جب تلاشِ نوحؑ میں سوں فلک
کشتیٔ انساں کو طوفانوں سے ملتی ہے نجات

صاحبِ ضربِ کلیم آتا ہے اک صدیوں کے بعد
گرچہ اس دُنیا میں بنتے ہیں سدا لات و منات

اک حسینؓ تشنہ ہوتا ہے حرم سے جلوہ گر
جستجو میں مدّتوں روتی ہے جب رودِ فرات

دُودمانِ عشق سے محمود روز اُٹھتے نہیں
نت نئے تیار ہوتے ہیں خرد کے سومنات

تلخیٔ دوراں رُلاتی ہے ہزاروں سال جب
پھوٹتی ہے زندگی کے نخل سے شاخِ نبات

اب ہمیشہ روئیں گے اقبال کو دیر و حرم
"عُمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات

تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں"
(در زبورِ عجم)

حفیظ ہوشیارپوری

(۱)

پلیگ اور کوارنٹین!

ہمالہ کے پاؤں میں لیٹے ہوئے میدانوں پر پھیل کر ہر ایک چیز کو دھندلا بنا دینے والی کُہر کے مانند پلیگ کے خوف نے چاروں طرف اپنا تسلط جما لیا تھا۔ شہر کا بچہ بچہ اُس کا نام سُن کر کانپ جاتا تھا۔

پلیگ تو خوفناک تھی ہی، مگر کوارنٹین اُس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ لوگ پلیگ سے اتنے ہراساں نہیں تھے جتنے کوارنٹین سے اور یہی وجہ تھی کہ افسرانِ محکمۂ حفظانِ صحت نے شہریوں کو چوہوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے لئے جو قدِ آدم اشتہار چھپوا کر دروازوں، گزرگاہوں اور شاہراہوں پر لگایا تھا اُس پر "نہ چوہا نہ پلیگ" کے عنوان میں اضافہ کرتے ہوئے "نہ چوہا۔ نہ پلیگ۔ نہ کوارنٹین!" لکھا تھا۔

کوارنٹین کے متعلق لوگوں کا خوف بجا تھا۔ بحیثیت ایک ڈاکٹر کے میری رائے نہایت مستند ہے اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنی اموات شہر میں کوارنٹین سے ہوئیں اتنی پلیگ سے نہ ہوئیں۔ حالانکہ کوارنٹین کوئی بیماری نہیں۔ بلکہ وہ اُس وسیع رقبہ کا نام ہے جس میں متعدی وبا کے ایام میں بیمار لوگوں کو تندرست انسانوں سے از روئے قانون علیحدہ کر کے لا ڈالتے ہیں۔ تاکہ بیماری بڑھنے نہ پائے۔ اگرچہ کوارنٹین میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا بندوبست تھا، مگر مریضوں کے کثرت سے وہاں آجانے پر اُن کی طرف فرداً فرداً توجہ نہ دی جا سکتی تھی۔ خویش و اقارب کے قریب نہ ہونے سے میں نے بہت سے مریضوں کو بے حوصلہ ہوتے دیکھا۔ کئی تو اپنے نواح میں لوگوں کو پے بہ پے مرتے دیکھ کر مرنے سے پہلے ہی مر گئے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ کوئی معمولی طور پر بیمار آدمی وہاں کی وبائی فضا ہی کے جراثیم سے ہلاک ہو گیا۔ اور پھر کثرتِ اموات کی وجہ سے آخری رسوم بھی کوارنٹین کے مخصوص طریقہ پر ادا ہوتیں یعنی سینکڑوں لاشوں کو مردہ کتوں کی نعشوں کی طرح گھسیٹ کر ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں جمع کیا جاتا۔ اور بغیر کسی کی مذہبی رسوم کا احترام کئے پٹرول ڈال کر سب کو نذرِ آتش کر دیا جاتا۔ اور شام کے وقت جب ڈوبتے ہوئے سورج کی آتشیں شفق کے ساتھ بڑے بڑے شعلے یک رنگ و ہم آہنگ ہوتے، تو دوسرے مریض یہی سمجھتے کہ تمام دنیا کو آگ لگ رہی ہے۔

کوارنٹین اس لئے بھی زیادہ اموات کا باعث ہوئی کہ بیماری کے آثار نمودار ہوتے تو بیمار کے متعلقین اُسے چھپانے لگتے تاکہ کہیں مریض کو جبراً کوارنٹین میں نہ لے جائیں۔ چونکہ ہر ایک ڈاکٹر کو تنبیہ کی گئی تھی کہ مریض کی خبر پاتے ہی فوراً مطلع کرے۔ اس لئے لوگ ڈاکٹروں سے علاج بھی نہ کراتے۔ اور کسی گھر کے وبائی ہونے کا صرف اُسی وقت پتہ چلتا جب کہ جگر دوز آہ و بُکا کے درمیان ایک لاش اُس گھر سے نکلتی۔

اُن دنوں میں کوارنٹین میں بطور ایک ڈاکٹر کے کام کر رہا تھا۔ پلیگ کا خوف میرے دل و دماغ پر بھی مسلط تھا۔ شام کو گھر آنے پر میں ایک عرصہ تک کار بالک صابن سے ہاتھ دھوتا رہتا اور جراثیم کش مرکب سے غرارے کرتا۔ یا پیٹ کو جلا دینے والی گرم کافی یا برانڈی پی لیتا۔ اگرچہ اُس سے مجھے بے خوابی اور آنکھوں کے چندھے پن کی شکایت پیدا ہو گئی۔ کئی دفعہ بیماری کے خوف سے میں نے قے آور دوائیں کھا کر اپنی طبیعت کو صاف کیا۔ جب نہایت گرم کافی یا برانڈی پینے سے پیٹ میں تخمیر ہوتی اور بخارات اُٹھ اُٹھ کر دماغ کی طرف جاتے، تو میں اکثر ایک حواس باختہ شخص کے مانند طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا۔ گلے میں ذرا بھی خراش محسوس ہوتی تو میں سمجھتا کہ پلیگ کے نشانات نمودار ہونے والے ہیں — اُف! میں بھی اُس موذی بیماری کا شکار ہوں گا..... پلیگ! اور پھر — کوارنٹین!

اُنہیں دنوں میں "نو عیسائی" ولیم (بھاگو خاکروب) جو میری گلی میں صفائی کیا کرتا تھا میرے پاس آیا اور بولا "بابو جی — غضب ہو گیا۔ آج ایمبو اسی محلہ کے قریب سے بیس اور ایک بیمار لے گئی ہے۔"

"اکیس؛ ایمبولینس میں..... ؟" میں نے متعجب ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

"جی ہاں..... پورے بیس اور ایک — اُنہیں بھی کونٹن (کوارنٹین) لے جائیں گے — آہ! وہ بیچارے کبھی واپس نہ آئیں گے کیا؟"

دریافت کرنے پر مجھے علم ہوا کہ بھاگو رات کے تین بجے اُٹھتا ہے۔ آدھ پاؤ شراب چڑھا لیتا ہے۔ اور پھر حسب ہدایت کمیٹی کی گلیوں میں اور نالیوں پر چونا بکھیرنا شروع کر دیتا ہے تاکہ جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔ بھاگو نے مجھے مطلع کیا کہ اُس کے تین بجے اُٹھنے کا یہ بھی مطلب ہے کہ بازار میں پڑی ہوئی لاشوں کو اکٹھا کرے اور اُس محلہ میں جہاں وہ کام کرتا ہے اُن لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کاج کرے جو بیماری کے خوف سے باہر نہیں نکلتے۔ بھاگو تو بیماری سے ذرا بھی نہیں ڈرتا تھا اُس کا خیال تھا کہ جو مرنا ہو گا تو خواہ وہ کہیں چلا جائے۔ بچ نہیں سکتا۔

اُن دنوں جب کوئی کسی کے پاس نہیں پھٹکتا تھا، بھاگو سر اور مُنہ پر منڈاسا باندھے نہایت مستعد ہو کر بنی نوع انسان کی خدمت گزاری کر رہا تھا۔ اگرچہ اُس کا علم نہایت محدود تھا تاہم اپنے تجربہ کی بنا پر وہ ایک مقرر کی طرح لوگوں کو بیماری سے

بچنے کی ترکیب بتاتا - عام صفائی، چونا بکھیرنے اور گھر سے باہر نہ نکلنے کی تلقین کرتا - ایک دن میں نے اُسے لوگوں کو شراب کثرت سے پینے کی تلقین کرتے ہوئے بھی دیکھا - اُس دن جب وہ میرے پاس آیا - تو میں نے پُوچھا۔ "بھاگو! تمہیں پلیگ سے ڈر بھی نہیں لگتا؟"

"نہیں بابوجی ــــ بن آئی بال بھی بینکا نہیں ہوگا - آپ اتنے بڑے حکیم ٹھہرے - ہزاروں نے آپ کے ہاتھ سے شفا پائی - مگر جب میری آئی ہوگی تو آپ کا دارو درمن بھی کچھ اثر نہ کرے گا . . . . ہاں بابوجی ــــ آپ بُرا نہ مانیں میں ٹھیک اور صاف صاف کہہ رہا ہوں" اور پھر گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے بولا "کچھ کونٹن کی کہئیے بابوجی ــــ کونٹن کی"

"وہاں کوارنٹین میں ہزاروں مریض آگئے ہیں - ہم حتےالوسع اُن کا علاج کرتے ہیں - مگر کہاں تک - نیز میرے ساتھ کام کرنے والے خود بھی زیادہ دیر اُن کے درمیان رہنے سے گھبراتے ہیں - خوف سے اُن کے گلے اور لب سُوکھے رہتے ہیں پھر تمہاری طرح کوئی مریض کے مُنہ کے ساتھ منہ نہیں جا لگاتا - نہ کوئی تمہاری طرح اتنی جان مارتا ہے ..... بھاگو! خدا تمہارا بھلا کرے جو تم بنی نوع انسان کی اس قدر خدمت کرتے ہو ــــ!"

بھاگو نے گردن جھکادی اور منڈاسے کے ایک پلو کو مُنہ پر سے ہٹا کر، شراب کے اثر سے سُرخ ہوچکے ہوئے چہرے کو دکھاتے ہوئے بولا "بابوجی، مَیں کس لائق ہوں - مجھ سے کسی کا بھلا ہو جائے - میرا یہ نکما تن کسی کے کام آجائے - اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہوسکتی ہے - بابوجی! بڑے پادری لابے (ریورینڈ مونٹ ل آبے) جو ہمارے محلوں میں اکثر پرچار کے لئے آیا کرتے ہیں - کہتے تھے - خداوند یسوع مسیح یہی سکھاتا ہے کہ بیمار کی مدد میں اپنی جان تک لڑا دو ــ میں سمجھتا ہوں . . . . ."

مَیں نے بھاگو کی ہمت کو سراہنا چاہا - مگر کثرتِ جذبات سے میں رُک گیا - اُس کی خوش اعتقادی اور عملی زندگی کو دیکھ کر میرے دِل میں ایک جذبۂ رشک پیدا ہؤا - میں نے دِل میں فیصلہ کیا کہ آج کوارنٹین میں پوری تن دہی سے کام کرکے بہت سے مریضوں کو بقیدِ حیات رکھنے کی کوشش کروں گا - اُن کو آرام پہنچانے میں اپنی جان تک لڑا دوں گا - مگر کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے - کوارنٹین میں پہنچ کر جب میں نے مریضوں کی خوفناک حالت دیکھی اور اُن کے مُنہ سے پیدا شدہ تعفن میرے نتھنوں میں پہنچا تو میری رُوح لرز گئی اور بھاگو کی تقلید کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

تاہم اُس دن بھاگو کو ساتھ لے کر میں نے کوارنٹین میں بہت کام کیا - جو کام مریض کے زیادہ قریب رہ کر ہوسکتا تھا وُہ مَیں نے بھاگو سے کرایا - اور اُس نے بلا تامل کیا . . . . . خود مَیں مریضوں سے دُور دُور ہی رہتا - اِس لئے کہ مَیں موت سے بہت خائف تھا اور کوارنٹین سے اُس سے زیادہ خائف!

مگر کیا بھاگو موت اور کوارنٹین دونوں سے بالاتر تھا؟

اُس دن کوارنٹین میں چار سَو کے قریب مریض داخل ہوئے اور اڑھائی سَو کے لگ بھگ لقمۂ اجل ہوگئے!

(۲)

یہ بھاگو کی جانبازی کا صدقہ ہی تھا کہ میں نے بہت سے مریضوں کو شفایاب کیا۔ وہ نقشہ جو مریضوں کی رفتارِ صحت کے متعلق چیف میڈیکل آفیسر کے کمرے میں آویزاں تھا۔ اُس میں میرے تحت میں رکھے ہوئے مریضوں کے اوسطِ صحت کی لکیر سب سے اُونچی چڑھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میں ہر روز کسی نہ کسی بہانہ سے اُس کمرہ میں چلا جاتا اور اُس لکیر کو سَو فیصدی کی طرف اُوپر ہی اُوپر بڑھتے دیکھ کر دِل میں بہت خوش ہوتا۔

ایک دن میں نے برانڈی ضرورت سے زیادہ پی لی۔ میرا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ نبض گھوڑے کی طرح دوڑنے لگی اور میں ایک جنونی کی مانند ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ مجھے خود شک ہونے لگا کہ پلیگ کے جراثیم نے مجھ پر آخر کار اپنا اثر کر ہی دیا ہے۔ اور عنقریب ہی گلٹیاں میرے گلے یا رانوں میں نمودار ہوں گی۔ میں بہت ہی سراسیمہ ہوگیا۔ اُس دن میں نے کوارنٹین سے بھاگ جانا چاہا۔ جتنا عرصہ بھی میں وہاں ٹھہرا۔ خوف کے کانپتا رہا۔ اُس دن مجھے بھاگو کو دیکھنے کا صرف دو دفعہ اتفاق ہُوا۔

دوپہر کے قریب میں نے اُسے ایک مریض سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ وہ نہایت پیار سے اُس کے ہاتھوں کو تھپک رہا تھا مریض میں جتنی بھی سکت تھی اُسے مجتمع کرتے ہوئے اُس نے کہا "بھئی اللہ ہی مالک ہے۔ اس جگہ تو خدا دشمن کو نہ لائے۔ میری دو لڑکیاں . . . . . ."

بھاگو نے اُس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "خداوند یسوع مسیح کا شکر کرو بھائی —— تُم تو اچھے دکھائی دیتے ہو۔"

"ہاں بھائی شکر ہے خدا کا —— پہلے سے کچھ اچھا ہی ہوں —— اگر میں کوارنٹین . . . . . ."

ابھی یہ الفاظ اُس کے مُنہ میں ہی تھے کہ اُس کی نسیں کھچ گئیں۔ اُس کے مُنہ سے کف جاری ہوگیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں کئی جھٹکے آئے اور وہ مریض جو ایک لحہ پہلے سب کو اور خصوصاً اپنے آپ کو اچھا دکھائی دے رہا تھا، ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ بھاگو اُس کی موت پر دکھائی نہ دینے والے خُون کے آنسو بہانے لگا۔ اَور کون اُس کی مَوت پر آنسو بہاتا۔ کوئی اُس کا وہاں ہوتا تو اپنے جگر دوز نالوں سے ارض و سما کو شق کر دیتا۔ ایک بھاگو ہی تھا جو سب کا رشتہ دار تھا۔ سب کے لئے اُس کے دل میں درد تھا۔ وہ سب کی خاطر روتا اور کُڑھتا تھا —— ایک دن اُس نے خداوند یسوع مسیح کے حضور میں نہایت عجز و انکسار سے اپنے آپ کو بنی نوعِ انسان کے گناہ کے کفارہ کے طور پر بھی پیش کیا۔

اسی دن شام کے قریب بھاگو میرے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھُولی ہوئی تھی اور وہ ایک دردناک آواز سے کراہ رہا تھا بولا۔ "بابوجی —— یہ کوارنٹین تو دوزخ ہے دوزخ۔ پادری لابے اسی قسم کی دوزخ کا نقشہ کھینچا کرتا تھا . . . . . ."

میں نے کہا "ہاں بھائی۔ یہ دوزخ سے بھی بڑھ کر ہے —— میں تو یہاں سے بھاگ نکلنے کی ترکیب سوچ رہا ہوں . . . ."

میری طبیعت آج بہت خراب ہے۔"

"بالوجی اس سے زیادہ اور کیا بات ہو سکتی ہے .... آج ایک مریض جو بیماری کے خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اُسے مُردہ سمجھ کر کسی نے لاشوں کے ڈھیر میں جا ڈالا۔ جب پٹرول چھڑکا گیا۔ اور آگ نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تو میں نے اُسے شُعلوں کے درمیان ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا۔ میں نے کُود کر اُسے اُٹھا لیا۔ بالوجی! وہ بہت بُری طرح جھلسا گیا تھا۔ اُسے بچاتے ہوئے میرا دایاں بازو بالکل جل گیا ہے ——"

میں نے بھاگو کا بازو دیکھا۔ اُس پر زرد زرد چربی نظر آ رہی تھی۔ میں اُسے دیکھتے ہوئے لرز اُٹھا۔ میں نے پوچھا "کیا وہ آدمی بچ گیا ہے پھر ——؟"

"بالوجی —— وہ کوئی بہت شریف آدمی تھا۔ جس کی نیکی اور شریفی (شرافت) سے دُنیا کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکی۔ اتنے درد و کرب کی حالت میں بھی اُس نے اپنا جھلسا ہُوا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور اپنی مریل سی نگاہ میری نگاہوں میں ڈالتے ہوئے اُس نے میرا شکریہ ادا کیا۔"

"—— اور بالوجی" بھاگو نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کے کچھ عرصہ بعد وُہ اتنا تڑپا۔ اتنا تڑپا کہ آج تک میں نے کسی مریض کو اس طرح جاں توڑتے نہیں دیکھا ہوگا —— اس کے بعد وہ مر گیا۔ کتنا اچھا ہوتا۔ جو میں اُسے اسی وقت جل جانے دیتا۔ اُسے بچا کر میں نے اُسے مزید دُکھ سہنے کے لئے زندہ رکھا۔ اور پھر وہ بچا بھی نہیں۔ اب انہی جلے ہوئے بازوؤں سے میں پھر اُسے اُسی ڈھیر میں پھینک آیا ہوں ——"

اس کے بعد بھاگو کچھ نہ بول سکا۔ درد کی ٹیسوں کے درمیان اُس نے رُکتے رُکتے کہا "آپ جانتے ہیں ..... وُہ کس بیماری ..... سے مرا۔ پلیگ سے نہیں —— کونٹین سے —— کونٹین سے!"

(۳)

اگرچہ "ہمہ یاراں دوزخ" کا خیال اُس لامتناہی سلسلۂ قہر و غضب میں لوگوں کو کسی حد تک تسلی کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔ تاہم مقہور بنی آدم کی فلک شگاف صدائیں تمام شب کانوں میں آتی رہتیں۔ ماؤں کی آہ و بکا، بہنوں کے نالے، بیویوں کے نوحے، بچوں کی چیخ پکار شہر کی اُس فضا میں جس میں کہ نصف شب کے قریب اُلّو بھی بولنے سے ہچکچاتے تھے ایک نہایت المناک منظر پیدا کرتی تھی۔ جب صحیح و سلامت لوگوں کے سینوں پر منوں بوجھ رہتا تھا تو اُن لوگوں کی حالت کیا ہو گی جو گھروں میں بیمار پڑے تھے اور جنہیں کسی یرقان زدہ کے مانند در و دیوار سے مایوسی کی زردی ٹپکتی دکھائی دیتی تھی۔ اور پھر کوارنٹین کے مریض جنہیں مایوسی کی حد سے گزر کر ملک الموت مجسّم دکھائی دے رہا تھا، وہ زندگی سے یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے کسی طوفان میں کوئی کسی درخت کی چوٹی سے چمٹا ہوا ہو۔ اور پانی کی تیز و تند لہریں ہر لحظہ بڑھ کر اُس چوٹی کو بھی ڈبو دینے کی آرزومند ہوں۔

میں اُس روز تو ہم کی وجہ سے کوارنٹین بھی نہ گیا۔ کسی ضروری کام کا بہانہ کر دیا۔ اگرچہ مجھے سخت ذہنی کوفت ہوتی رہی تھی کیونکہ بہت ممکن تھا کہ میری مدد سے کسی مریض کو فائدہ پہنچ جاتا۔ مگر اُس خوف نے جو میرے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ مجھے پابہ زنجیر رکھا۔ شام کو سونے وقت مجھے اطلاع ملی کہ آج شام کو کوارنٹین میں پانسو کے قریب مزید مریض پہنچے ہیں۔

میں ابھی ابھی معدے کو جلا دینے والی گرم کافی پی کر سونے ہی والا تھا کہ دروازے پر بھاگو کی آواز آئی۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو بھاگو ہانپتا ہوا اندر آیا۔ بولا "بابو جی — میری بیوی بھی بیمار ہو گئی . . . . . اس کے گلے میں گلٹیاں نکل آئی ہیں . . . . خدا کے واسطے اُسے بچاؤ . . . . . اُس کی چھاتی پر ڈیڑھ سالہ بچہ دُودھ پیتا ہے، وہ بھی ہلاک ہو جائے گا!"

بجائے گہری ہمدردی کا اظہار کرنے کے میں نے خشمگیں لہجہ میں کہا:۔ "اس سے پہلے کیوں نہ آسکے — کیا بیماری ابھی ابھی شروع ہوئی ہے؟"

"صبح معمولی بخار تھا — جب میں کوارنٹین گیا . . . ."

"اچھا — وہ گھر میں بیمار تھی۔ اور پھر بھی تم کوارنٹین گئے؟"

"جی بابو جی —" بھاگو نے کانپتے ہوئے کہا: "وہ بالکل معمولی طور پر بیمار تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید دُودھ چڑھ گیا ہے — اس کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں — اور پھر میرے دونوں بھائی گھر پر ہی تھے . . . . . . اور سینکڑوں مریض کوارنٹین میں بے بس . . . . ."

"تو تم اپنی حد سے زیادہ مہربانی اور قربانی سے جراثیم کو گھر لے ہی آئے نا۔ میں نہ تم سے کہتا تھا کہ مریضوں کے اتنا قریب مت رہا کرو — دیکھو میں آج اسی وجہ سے وہاں نہیں گیا۔ اس میں سب تمہارا قصور ہے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم سے جانباز کو اپنی جانبازی کا مزا بھگتنا ہی چاہیئے۔ جہاں شہر میں سینکڑوں مریض پڑے ہیں . . . ."

بھاگو نے ملتجیانہ انداز سے کہا "مگر خداوند یسوع مسیح . . . ."

"چلو ہٹو — بڑے آئے کہیں کے — تم نے جان بوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالا۔ اب اس کی سزا میں بھگتوں؟ قربانی ایسے تھوڑی ہوتی ہے۔ میں اتنی رات گئے وقت تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتا —"

"مگر پادری لابے . . . ."

"چلو — جاؤ — پادری لابے کے کچھ ہوتے . . . . ."

بھاگو سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ اُس کے جانے کے آدھ گھنٹہ بعد جب میرا غصہ فرو ہوا تو میں اپنی حرکت پر نادم ہونے لگا میں عاقل کہاں کا تھا جو بعد میں ہدف ملامت پشیمانی ہو رہا تھا۔ میرے لئے یہی یقیناً سب سے بڑی سزا تھی کہ اپنی تمام خودداری کو

پامال کرتے ہوئے بھاگو کے سامنے اپنے گذشتہ رویہ پر اظہار معذرت کرتے ہوئے اُس کی بیوی کا پُوری جانفشانی سے علاج کروں۔
میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور دوڑا دوڑا بھاگو کے گھر پہنچا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ بھاگو کے دونوں چھوٹے
بھائی اپنی بھابج کو چارپائی پر لٹائے ہوئے باہر نکال رہے تھے ۔۔۔
میں نے بھاگو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا" اِسے کہاں لے چلے ہو؟"
بھاگو نے آہستہ سے جواب دیا" کونٹین میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
"تو کیا اب تمہاری دانست میں کوارنٹین دوزخ نہیں رہا ۔۔۔ بھاگو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
"آپ نے جانے سے انکار کر دیا۔ بابو جی ۔۔۔ اور چارہ ہی کیا تھا۔ میرا خیال تھا۔ وہاں حکیم کی مدد مل جائے گی اور دُوسرے
مریضوں کے ساتھ اِس کا بھی خیال رکھوں گا۔"
"یہاں رکھ دو چارپائی ۔ ۔ ۔ ۔ اب بھی تمہارے دماغ سے دوسرے مریضوں کا خیال نہیں گیا ۔ ۔ ۔ ۔ احمق ۔ ۔ ۔"
چارپائی اندر رکھ دی گئی اور میرے پاس جو تیر بہدف دوا تھی میں نے بھاگو کی بیوی کو پلائی اور پھر اپنے غیر مرئی حریف یعنی
موت سے مقابلہ کرنے لگا۔ بھاگو کی بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔
بھاگو نے ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہا" آپ کا احسان ساری عمر نہ بھُولوں گا ۔۔۔ بابو جی"
میں نے کہا" مجھے اپنے گذشتہ رویہ پر سخت افسوس ہے بھاگو ۔۔۔ ایشور تمہیں تمہاری خدمات کا صلہ تمہاری بیوی کی شفا
کی صُورت میں دے ۔۔۔"
اُسی وقت میں نے اپنے غیر مرئی حریف کو اپنا آخری حربہ استعمال کرتے دیکھا۔ بھاگو کی بیوی کے لب پھڑکنے لگے۔ نبض جو
میرے ہاتھ میں تھی مدھم ہو کر شانہ کی طرف سرکنے لگی۔ میرے غیر مرئی حریف نے جس کی عموماً فتح ہوتی تھی حسب معمول پھر مجھے چاروں شانے
چت گرایا۔ میں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا" بھاگو! بدنصیب بھاگو تمہیں اپنی قربانی کا یہ عجیب صلہ ملا ہے ۔۔۔ آہ!"
بھاگو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
آہ! وہ نظارہ کتنا دلدوز تھا جبکہ بھاگو نے اپنے بلبلاتے ہوئے بچے کو اسکی ماں سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا اور مجھے
نہایت عجز و انکسار سے واپس لوٹا دیا۔
میرا خیال تھا کہ اب بھاگو اپنی دُنیا کو تاریک پا کر کسی کا خیال نہ کرے گا ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اُس سے اگلے روز میں نے اُسے
بیش از پیش مریضوں کی امداد کرتے دیکھا۔ اُس نے سینکڑوں گھروں کو بے چراغ ہونے سے بچا لیا ۔۔۔ اور اپنی زندگی کو بالکل
ہیچ سمجھا۔ میں نے بھی بھاگو کی تقلید میں نہایت مستعدی سے کام کیا۔ کوارنٹین اور ہسپتالوں سے فارغ ہو کر اپنے فالتو وقت میں ہم

نے شہر کے غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر جو کہ بدرروؤں کے کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے یا غلاظت کے سبب بیماری کا مسکن تھے، رجوع کیا۔

(۴)

اب فضا بیماری کے جراثیم سے بالکل پاک ہو چکی تھی۔ شہر کو بالکل دھو ڈالا گیا تھا، چوہوں کا کہیں نام و نشان دکھائی نہ دیتا تھا سارے شہر میں صرف ایک آدھ کیس ہوتا جس کی طرف فوری توجہ دیئے جانے پر بیماری کے بڑھنے کا احتمال باقی نہ رہا۔

کاروبارِ شہر نے اپنی طبعی حالت اختیار کر لی، سکول، کالج اور دفاتر کھلنے لگے۔

ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی وہ یہ تھی کہ بازار میں گزرتے وقت چاروں طرف سے انگلیاں مجھی پر اٹھتیں۔ لوگ حاسدانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے۔ اخبارات اور مجالس متفقہ طور پر میری تعریف میں رطب اللسان تھے۔ اخباروں میں تعریفی کلمات کے ساتھ میری تصاویر چھپیں۔ اس چاروں طرف سے تحسین و آفرین کی بوچھاڑ نے میرے دل میں کچھ غرور سا پیدا کر دیا۔

آخر ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں شہر کے بڑے بڑے رئیسوں اور ڈاکٹر مدعو کیے گئے۔ گورنر صاحب بہادر نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ میں صاحبِ صدر کے پہلو میں بٹھایا گیا کیونکہ وہ دعوت دراصل میرے ہی اعزاز میں دی گئی تھی۔ ہاروں کے بوجھ سے میری گردن جھکی جاتی تھی اور میری شخصیت بہت نمایاں معلوم ہوتی تھی۔ پُرغرور نگاہ سے میں کبھی ادھر دیکھتا کبھی اُدھر۔۔۔۔۔ 'بنی آدم کی انتہائی خدمتگزاری کے صلہ میں کمیٹی شکر گزاری کے جذبہ میں معمور ایک ہزار ایک روپے کی تھیلی بطور ایک حقیر رقم کے مجھے نذر کر رہی تھی'!

جتنے بھی لوگ موجود تھے سب نے میری خصوصاً اور میرے رفقاءِ کار کی عموماً تعریف کی اور کہا کہ گذشتہ آفت میں جتنی جانیں میری جانفشانی اور تن دہی سے بچی ہیں ان کا شمار نہیں۔ میں نے نہ دن کو دن دیکھا نہ رات کو رات۔ اپنی حیات کو حیاتِ قوم اور اپنے سرمایہ کو سرمایۂ ملت سمجھا اور بیماری کے مسکنوں میں پہنچ کر مرتے ہوئے مریضوں کو جامِ شفا پلایا!

گورنر صاحب نے میز کے بائیں پہلو میں کھڑے ہو کر ایک پتلی سی چھڑی ہاتھ میں لی اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے اُن کی توجہ اُس سیاہ لکیر کی طرف دلائی جو دیوار پر آویزاں نقشے میں بیماری کے دنوں میں صحت کے درجہ کی طرف ہر لحظہ اُفتاں و خیزاں بڑھی جا رہی تھی۔ آخر میں گورنر صاحب نے نقشہ میں وہ دن بھی دکھایا جب میرے زیرِ نگرانی چوّن مریض رکھے گئے اور وہ تمام کے تمام صحت یاب ہو گئے یعنی نتیجہ سو فیصدی کامیابی رہا اور وہ سیاہ لکیر اپنی معراج کو پہنچ گئی۔

ہال تالیوں اور تحسین و آفرین کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

اس کے بعد گورنر صاحب نے اپنی تقریر میں میری ہمت کو بہت کچھ سراہا اور کہا کہ لوگ یہ جان کر بہت خوش ہوں گے کہ بخشی جی اپنی خدمات کے صلہ میں لفٹیننٹ کرنل بنائے جا رہے ہیں۔

ہال ایک دفعہ پھر نہایت پُرشور تالیوں سے گونج اٹھا۔

اُنہی تالیوں کے شور کے درمیان میں نے اپنی پُرغرور گردن اُٹھائی اور گورنر اور معزز حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس میں علاوہ اور باتوں کے میں نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی توجہ کے قابل ہسپتال اور کوارنٹین ہی نہیں تھے بلکہ اُن کی توجہ کے قابل غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر تھے۔ وہ لوگ اپنی مدد کے بالکل ناقابل تھے اور وہی زیادہ اُس موذی بیماری کا شکار ہوئے ہیں۔ میں نے اور میرے رُفقا نے بیماری کے صحیح مقام کو تلاش کیا اور اپنی پوری توجہ بیماری کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے میں صرف کر دی۔ کوارنٹین اور ہسپتال سے فارغ ہو کر ہم نے راتیں اُنہیں خوفناک مسکنوں میں گزاریں۔

آخر میں مَیں نے خدا سے دُعا مانگی کہ وہ انسان کو ایسے عذابوں سے بچائے اور کہا کہ کاش مجھ کو اور میرے بھائیوں کو ہمت ہو کہ وہ اپنی زندگی پر کھیل کر بنی آدم کی امداد کیا کریں۔

گورنر صاحب کی اور میری تقاریر پریس میں بڑی بڑی سُرخیوں سے چھپیں اور میں چند ہی دنوں میں صوبوی شہرت کا مالک ہو گیا۔

اسی دن جلسہ کے بعد جب میں بطور ایک لفٹیننٹ کرنل کے اپنی پُرغرور گردن کو اُٹھائے، ہاروں سے لدا پھندا، لوگوں کا "ناچیز ہدیہ" ایک ہزار ایک روپے کی صورت میں جیب میں ڈالے ہوئے گھر پہنچا تو مجھے ایک طرف سے آواز آئی "بابوجی ۔۔۔ بہت بہت مبارک ہو" ۔۔۔ اور بھاگو نے مبارک باد دیتے وقت اپنی پُرانی جھاڑو ایک طرف رکھ دی۔ میں بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔ یکایک میرے دماغ میں گذشتہ واقعات نے چکر لگایا اور میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی پُرغرور گردن کو اُٹھائے ہاروں سے لدا پھندا آسمان سے سر کو لگائے کتنا چھوٹا تھا۔ اخبارات اور جلسوں نے میری کتنی عزت و توقیر بڑھائی مگر اس بچارے کو کسی نے نہ پوچھا اور اسے ذرا بھی افسوس نہیں۔ حالانکہ اس کی خدمات کے مقابلہ میں میری خدمات کتنی ہیچ ہیں۔ یہ ہے دُنیا کی بے انصافی! ۔۔۔ اس کے سامنے ایسی وضع قطع بنا کر کھڑا ہونا میرے لئے کتنا باعثِ ننگ ہے۔ ہاں اس کے سامنے جس نے اپنی بیوی اور بعد میں اپنے بچے کو بھی اپنے فرض پر قربان کر دیا ہے ۔۔۔ آہ!

میں کچھ دیر بالکل مبہوت کھڑا رہا۔

پھر میں نے نہایت آہستہ اور ملائم آواز میں کہا "بھاگو ۔۔۔ بھائی ۔۔۔ نزدیک تو آؤ"

بھاگو نزدیک آیا تو میں اُس کے گلے سے لپٹ گیا، اپنے ہار اُتار کر اُس کے پاؤں پر رکھ دیئے۔ ایک ہزار ایک روپے کا بٹوہ اُس کی مٹھی میں دے دیا . . . بھاگو حیران و ششدر کھڑا رہ گیا۔ میں نے اُسے زبردستی خاموش رہنے کو کہا۔

"اگر دنیا نہیں جانتی بھاگو، تو نہ جانے، میں تو جانتا ہوں۔ تمہارا یسوع تو جانتا ہے ۔۔۔ پادری ل آبے کے بے مثال چیلے تجھ پر خدا کی رحمت ہو ۔۔۔ !"

پھر اتنے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود میں بے توقیر ہو کر اس قدر ناشناس دُنیا کے ماتم میں رونے لگا۔

راجندر سنگھ بیدی

علامۂ اقبال مرحوم

موت کی تاریکیوں میں سو رہی تھی زندگی
خلوتِ خاموشِ شب میں سو رہی تھی زندگی

انتظارِ نغمہ زن میں زندگی کا ساز تھا
بر لبِ خاموشِ ہستی گوش بر آواز تھا

یک بیک اِک طائرِ آتش نوا پیدا ہُوا
آسماں کی سرزمیں پر حشر سا برپا ہُوا

جانبِ پستی اُڑا وہ خوش نوا گاتا ہُوا
آتشیں نغموں سے اپنے آگ برساتا ہُوا

زہرہ و ناہید کی محفل کو گرماتا ہُوا
خونِ تازہ زندگی کی رگ میں دوڑاتا ہُوا

صبح کی قندیل روشن کی سوادِ شام میں
جان سی پھر ڈال دی خاکسترِ ایّام میں

نغمۂ اقبال تھا یا صُورِ اسرافیل تھا
دم بخود، ہیبت زدہ، سہما ہُوا جبریل تھا

مرتبہ اقبال کا دُنیا نے پہچانا نہیں
یہ مجاہد کون تھا خلقت نے پہچانا نہیں

آہ محفل میں نہیں وہ ساقیٔ محشر بدوش
جس کے ہنگاموں سی برپا تھا قیامت کا خروش

"جس کے آوازے سے لذّت گیر اب تک گوش ہے"

"وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟"

مظفر حسین شمیم

تربیتِ جنسی اور سماج

جب شباب کا آغاز ہو اور رگوں میں جوانی کا خون جوش مارتا ہو تو ہر نوجوان دِل کی دھڑکنوں کے ساتھ رنگین اُمیدیں ورش نے لگتی ہیں۔ جذبات کی دُنیا لہراتی ہے، زندگی یکسر رومان اور فضا نغمہ و تبسم سے لبریز نظر آتی ہے سنہری تخیلات کی موجیں ہونٹوں مسکراہٹ بن کر تھرتھراتی ہیں، ہر سانس ساغر چھلکاتی اور ہر نفس صبائے کیف لنڈھاتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان ہواؤں تیر رہا اور لہروں پر سو رہا ہے۔ عمر کا یہی وہ حصّہ ہے جب بے اختیار گنگنانے، بے وجہ مُسکرانے اور کسی کی بارگاہِ ناز میں سجدہ ہائے زپیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اس "جوشِ نمو" اور "سکر و کیف" کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ اس تمام "ذوقِ عبودیت" کی تہ میں شدید ترین تقاضائے جنسی" کی تڑپ ملتی ہے اور عشق و محبت اور حُسن و شباب کی تمام کارفرمائیاں اسی عنوان سے شروع ہوتی ہیں۔ محبت کوئی بلند سے بلند اور پست سے پست تصوّر آپ کر لیجیے، اس کی بُنیاد آپ اسی جنسی تڑپ پر پائیں گے جو نیک و بدسیرتوں کے سینوں میں مختلف جلووں کی مظہر بنتی ہے، کیونکہ "تقاضائے جنسی" یا دوسرے الفاظ میں "محبت" کا مقصدِ اصلی "حظِ نفس" ہے، اور تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ نفس کی تسکین کے پہلو مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ کسی نفس کا منتہائے نظر صرف "اتصالِ جنسی" ہوتا ہے، کسی کا اتصالِ بدن، اور کسی کا اتصالِ روح و نظر۔ محور ان سب کا ایک ہی ہے اگرچہ گردشیں مختلف ہیں۔ اس کا ایک آسان ثبوت ہے کہ صورت کا حسن، سبزہ کی لہک، پھولوں کی مہک، آبشار کے ترنم، شفق کی رنگینی، ہوا کی سنسناہٹ اور کلیوں کی چٹک وغیرہ سے بچوں اور بوڑھوں کے دلوں میں والہانہ کیف اور "گم شدگی" کی وہ کیفیت نظر نہیں آتی جو نوجوانوں میں پائی جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عہدِ طفولیت اور سنِ کہولت میں "جذبۂ نفس" و "تقاضائے جنسی" بہت کمزور اور پژمردہ ہوتا ہے اور جوانی میں پورے دور شباب پر۔

الغرض تقاضائے جنسی ایک فطری جذبہ ہے اور اس کی طاقت عظیم الشان طاقت ہے۔ اس کی اگر نفسیاتی اصُولوں پر صحیح تربیت نہ کی جائے تو انتہائی وحشت و بربریت پر منتج ہوتا ہے جس سے نفس کی گندگی بہت گھناؤنے طریقہ پر اُبل پڑتی ہے، اور اسی دلدل سے تمام اخلاقی برائیوں کے مچھر اُڑنے لگتے ہیں۔ لیکن تربیت پا جانے کے بعد یہی وہ طاقت ہے جو اخلاق کی پاکیزگی اور انسانیت کے مجد و شرف کا معیاری نمونہ پیش کرتی ہے اور دِل کا یہی گداز خلوص و ایثار کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ایک بھڑکتا

ہوا شعلہ ہے جو قابو میں آجانے کے بعد تعمیرِ تمدن میں بہت مفید مسالے کا کام دیتا ہے، اور قابو سے باہر ہو کر پوری عمارت کو خاک کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس کا اشارہ پاکر مردہ و بے حس روحوں میں زندگی کی وہ تڑپ پیدا ہو جاتی ہے جو عناصر کو مسخر کر سکتی اور مہر و ماہ پر حکم چلا سکتی ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ ہماری سماج کے نزدیک کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ دو انسانی ہستیوں کے درمیان میلانِ جنسی کی بنیادوں پر کوئی رابطہ پیدا ہو جائے، کس قدر حیرت کی بات ہے کہ فطرت کا ایک شدید ترین تقاضا جس کو کسی صورت سے فنا نہیں کیا جا سکتا اور اگر ایک طرف سے اُس پر دباؤ پڑے تو دُوسری جانب زیادہ شدت کے ساتھ اُبھر آتا ہے، سماج کے قانون میں سب سے بڑا جرم قرار پاتا ہے اور اس کے سنوارنے پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ بلکہ اس کا تذکرہ بھی بہت معیوب اور انتہائی بے شرمی و بداخلاقی سمجھا جاتا ہے۔

افسانے اور شاعری کی دُنیا میں تو رکیک سے رکیک جذبات کا تذکرہ نہ صرف ناگزیر بلکہ مستحسن ہے، لیکن علمی حیثیت سے ہم نے اِس وقت تک، جیسا کہ چاہئے، اس طرف توجہ نہیں کی۔ دو ایک کتابیں اُردو میں اس موضوع پر ضرور لکھی گئیں یا ترجمہ کی گئیں، لیکن وہ یا تو اتنی ادق ہیں کہ ہر شخص اُن سے استفادہ نہیں کر سکتا یا پھر بعض میں سرسری طور پر ضمناً اس کا تذکرہ کر دیا گیا اور افادی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہماری تربیت گاہوں میں اس کی اصلاح و تربیت پر کوئی مستقل درس نہیں دیا جاتا۔ دراںحالیکہ جذبۂ جنسی اخلاق کی تعمیر کا وہ بنیادی پتھر ہے جس سے قطع نظر کر لینے کے بعد اخلاق کی عمارت حوادث کے تھپیڑوں اور سیلاب کے مقابلہ کے لئے زیادہ استقلال و پایداری اپنے اندر نہیں رکھتی۔

اس مضمون کے ناظرین میں بعض بزرگ مجھ کو بے حیائی و بے شرمی کا نقیب ضرور قرار دے رہے ہوں گے، لیکن میں ادب سے عرض کروں گا کہ علمِ حقائق کا پردہ پوش نہیں بلکہ حقیقت کے چہرے کا نقاب کُشا ہوتا ہے، یہ بے حیائی کی دعوت نہیں بلکہ حقیقت کی جستجو ہے، کیا ہم اپنے بچوں کو کھانے پینے کے طریقے نہیں سکھاتے، اُن کو گفتگو کے آداب سے واقف نہیں کرتے، کیا سونے جاگنے چلنے پھرنے کے متعلق گفتگو کرنا عیب ہے؟ یہ سب فطری احتیاجیں ہیں، اگر تمدن نے ان کے متعلق کچھ آداب اور طریقے بنائے ہیں تو جنسی احتیاج کے متعلق بھی بنائے ہوں گے جن سے واقفیت حاصل کرنا اور نوجوانوں کو اس کی تعلیم دینا ہمارا فرض ہے۔ آپ خود غور کیجئے کہ ہماری یہ غفلت ہماری جوان نسلوں میں کن مفاسد کا بیج بو رہی ہے؛ اور اس جذبہ کی تربیت سے زندگی کے کن شعبوں میں کام نہیں لیا جا سکتا؛ اب آیئے اُن اسباب کو تلاش کریں جو اس بے توجہی پر زندگی کے تمام شعبوں میں خرابیوں کی پرورش کر رہے ہیں!

اوّل اوّل جب آغازِ شباب میں دل میں لطیف خلش پیدا ہوتی اور جذبات میں ہلچل مچتی ہے تو لڑکا نہ تو خود ان احساسات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی سمجھ والا ہی اُسکو سمجھاتا ہے۔ وہ خود بھی ہدفِ ملامت بننے کے ڈر سے اپنے ان نئے محسوسات کو کسی سے

سامنے ظاہر نہیں کرتا۔ اس طرح اس میں بے حسی جڑ پکڑ لیتی ہے اور اپنے اور دوسروں کی حسیات کا تجزیہ کرنے اور اُن کو سمجھنے کی صلاحیت فنا ہوتی جاتی ہے۔

پھر جن کے سامنے یہ باتیں ظاہر کی جاتی ہیں وہ اس کے ہم سن اور اسی کی طرح نابلد ہوتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ حسین صورت کا نظارہ کیوں ان کے دل کی دھڑکن تیز کر دیتا ہے؛ دلکش راگ کیوں ان کی طبیعت کو لبھاتا ہے؛ اتفاقاً کسی جوان جسم کا لمس کیوں ان کے بدن میں بجلی کا سا ارتعاش پیدا کر دیتا ہے؛ اُن کے دل میں بیٹھا بیٹھا درد کیوں ہوتا ہے؛ کیا چیز ان کو گنگنانے اور آپ ہی آپ مسکرانے پر اُکساتی ہے؛ اور کبھی کبھی ان کو بلاوجہ تنہائی کس لئے مرغوب ہوتی ہے؟

علاوہ ازیں وہ نہیں جانتے کہ انہوں نے زندگی کی کس منزل میں قدم رکھا ہے اور اس راستہ پر ان کو کس طرح چلنا ہے؛ لہٰذا ہوا کے موافق یا مخالف جھونکے جدھر چاہتے ہیں اُن کو موڑ دیتے ہیں اور اس طرح طبیعت میں جو ہچکچاہٹ اور گھٹاؤ یا بہیمانہ آزادی اور غیر ذمہ داری جڑ پکڑ لیتی ہے وہ آخر عمر تک نہیں جاتی۔

اس وقت اُن کے معلمین کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور اُن کے حرکات و سکنات سے اُن کے جذبات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر کے، نفسیاتِ شباب کے اصولوں کے ماتحت اُن کو صحیح تربیت دیں اور بتلائیں کہ وہ اب زندگی کی کس راہ پر گامزن ہیں اور یہاں اُن کو کس طرح قدم اُٹھانا چاہئے۔

چونکہ سماج کے نزدیک محبت جرم ہے لہٰذا جب دو انسانی ہستیوں میں اس قسم کی یگانگت پیدا ہوتی ہے تو وہ ہیئتِ اجتماعی کے زیرِ اثر یہ سمجھ کر کہ ہم کسی بہت ہی خطرناک اور ناپاک جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں اپنے خیالات و جذبات کو ناجائز حد تک چھپا کر مجرمانہ ذہنیت کے مہلک اور سریع التاثیر جراثیم غیر شعوری طور پر اپنے اندر پالتے رہتے ہیں۔ افشائے راز کا خوف ہر وقت ان پر مسلط رہتا ہے، وہ چھپ چھپ کر ملاقات و گفتگو کے مواقع نکالتے ہیں۔ اور نتیجہ ان سب کا یہ ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی ساخت مستقل طور پر سازشی اور بزدلانہ نوعیت اختیار کر لیتی ہے، صداقت و حقیقت کی طرف سے ان کے دل میں ہمیشہ کے لئے ڈر بیٹھ جاتا ہے، مکر و دروغ ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے، ان کے ذہن میں پستی، کردار و عزائم میں کمزوری، مزاج میں تلون، لہجہ میں فتادگی، طبیعت میں بزدلانہ شرم اور اخلاق میں ریاکاری آجاتی ہے۔ وہ بے باک فطرت، نڈر دل، بلندیٔ نظر، صفائی قلب اور اخلاقی جرأت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جنسی جذبات پر سماج بجز ملامت و سرزنش کے اور کسی حیثیت سے توجہ نہیں کرتی اس لئے محبت کی تباہ کاریاں ہی زیادہ دکھلائی دیتی ہیں۔ اگر کسی کا دماغ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے تو وہ از خود اپنے جذبۂ جنسی کی تربیت کر کے اپنی انسانیت پر جلا کر لیتا ہے، ورنہ عام طور پر اس کا تاریک پہلو ہی منظرِ عام پر آتا رہتا ہے، جس کے باعث اس کو اور زیادہ قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔

اگر آپ تحقیق کریں تو بہت تھوڑی جستجو کے ساتھ آپ کو ایسی متعدد مثالیں ملیں گی کہ ایک نیکی فطرت کا لڑکا جو بلند الطبع بھی ہے اور فکر و نظر اور کردار و عزم کے اعتبار سے بھی پست ہے جو اپنی زندگی کا مصرف نہیں جانتا اور اس کو ناقابلِ برداشت بوجھ تصور کرتا ہے، محبت کا سہارا پا کر اُٹھتا ہے، حیرت انگیز طریقہ پر اپنا چولا بدل کر کشاکشِ حیات میں مردانہ وار حصّہ لیتا اور زندگی کا اعلیٰ نصب العین حاصل کر لینے میں محیّر العقول کارنامے دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، گویا اس کے سازِ زندگی کے بہترین نغمے سوئے ہوئے تھے، جو مناسب مضراب پڑتے ہی تارتار سے نکلنے لگے، یا یہ کہ ایک اچھا خاصا ترقی کرنے والا نوجوان محبت میں ناکام ہو جانے اور سماج کے زیرِ عتاب ہو جانے کے بعد یکایک بلندی و رفعت کے منارے سے پستی و جہالت کے گہرے اور تاریک غار میں اوندھے منہ جا گرتا ہے، گویا وہ شبنم کا ایک قطرہ تھا جو تمازتِ آفتاب کی تاب نہ لا کر فنا ہو گیا۔ اور اُن خوش قسمتوں کی تعداد تو بہت ہی کم ہے جو حُسنِ اتفاق سے اپنی فطرت کے مطابق شریکِ زندگی حاصل کر کے شادی ہو جانے کے بعد محبت کی لذتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔

علم و بصیرت کے اس دَور میں محبت صرف رومانی گیتوں کے لئے ہی مخصوص نہیں رہی ہے، بلکہ وہ اس وقت علم النفس کی ایک جُداگانہ شاخ اور فلسفہ کا ایک اہم موضوعِ بحث ہے جس کے ماتحت مہذب قومیں اپنے نوجوانوں کے جذبۂ جنسی کی صحیح اُصولوں پر تربیت کر کے ان کو قوم و وطن کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد بناتی ہیں۔

اگرچہ میں نے اس مضمون میں صرف مردوں کے جذبات سے بحث کی ہے اور وہ بھی بہت ہی تشنہ و نامکمل ہے لیکن تربیتِ جنسی صنفِ نازک کے لئے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ صنفِ قوی کے لئے بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ مرد کے مقابلہ میں عورت زیادہ ذہین اور ذکی الحس ہوتی ہے، وہ اضطرابِ درونی و خلشِ باطنی کو مرد سے پہلے محسوس کرتی ہے۔

بہرحال ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سماجی حیثیت سے ان تمام اُمور کے پیشِ نظر تقاضائے جنسی و جذبۂ نفسانی کے متعلق اپنے روایتی فیصلۂ نفرت و ملامت پر نظرِ ثانی کر کے اپنے قانونِ تربیت میں چند دفعات کا اضافہ کریں اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ تربیتِ جنسی کے لئے بھی اپنے معاشرتی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ اصُول وضع کریں۔ کیونکہ ذہنی و اخلاقی تربیت کا تمام تر دارومدار اسی تربیتِ جنسی پر ہے۔ مجھ کو اُمید ہے کہ ہمارے ملک کے اربابِ فکر و بصیرت اس پر اپنی آراء کا اظہار کرتے ہوئے کوئی صحیح راہِ عمل متعین کریں گے۔

نعمان شاغل بھوپالی

محبت روحِ جسمِ عارضی ہے — محبت زندگی کی زندگی ہے
محبت غایت الغایاتِ ہستی — محبت حق نما ہے حق رسی ہے

اللہ والا فلسفی

کیوں گزشتہ ساعتیں پھر مجھ کو تڑپانے لگیں
زندگی کی حسرتیں پھر دل میں گھبرانے لگیں

بن گیا پھر کیوں پریشاں کُن یہ فانوسِ خیال
وحشتیں پھر کیوں مری تخئیل پر چھانے لگیں

انبساطِ زندگی کی خوش نُما تنویر میں
مَوت کی سی صُورتیں کیوں کر نظر آنے لگیں

اُٹھ گیا دُنیا سے کوئی زندۂ جاوید کیا
کیوں فنا کی بدلیاں دُنیا پہ منڈلانے لگیں

رو رہا ہے کون یہ لے لے کے نام اقبال کا
کچھ لحاظ اس کو نہیں مجھ سے پریشاں حال کا

کیوں نہ مضطر ہُوں، نہیں اے دوست بیجا اضطراب
اور بڑھنا چاہئے اس وقت میرا اضطراب

مجھ پر اپنا کر قیاس اے ہمنوا تُو ہی بتا
آہ اطمینان حاصل ہے تجھے یا اضطراب

جانتے تھے اپنا رہبر ہم سبھی اقبال کو
کیوں نہ ہوں پھر اس کی فرقت میں سراپا اضطراب

کیا خبر تھی یہ خبر اس درجہ ہوگی جانگُسل
ہوگیا محتاجِ تدبیر آہ دل کا اضطراب

اطلاعِ رحلتِ اقبال میں کیونکر سُنوں؟
یہ خبر اُچٹ سے ہے نقیبِ جادۂ پیغمبرؐ سُنوں؟

مُلک وملت کا حقیقی رہنما جاتا رہا
آدمیت کا دلِ دردآشنا جاتا رہا

قوم کی بیداریوں کو ناز تھا جس فرد پر
آہ وہ فردِ یگانہ کیا ہُوا؛ جاتا رہا

کیوں نظر آتا نہیں وہ رہبروں کا راہبر
مُدعی جو رہنمائی کا نہ تھا، جاتا رہا

حاسّہ بیدار اس نے کر دیا کُل قوم کا
جاذبِ مخلص دلِ حسّاس کا جاتا رہا

جو کشش اس کی قیادت میں تھی اوروں میں کہاں

آہ وہ حسنِ تخاطب، اُف وہ تاثیرِ بیاں

اس کی تعلیمات سے روشن ہوئے صدہا چراغ — تھا دل افروزِ کبارِ قوم وہ روشن دماغ

ہند میں رہ کر حجازی منزلیں کرتے ہیں طے — ہم نے کیسے کیسے اس رہبر سے پائے ہیں سُراغ

فرق پر اس کے جنابِ قاسمِ کوثر کا ہاتھ — ہاتھ میں اس کے مئے عرفاں کا نورانی ایاغ

غم رُبا اقبال کا ہر شعر عشرت ریز ہے — ہر پیام اس کا ہمارے واسطے گلریز باغ

بھر دیا مقصود کے پھولوں سے دامن قوم کا
عطر افشاں ہے انہیں پھولوں سے مسکن قوم کا

ہو گیا شل اس کی زد سے مُفسدوں کا دستِ کید — حسبۃً للہ مٹایا اختلاف عمر و زید

مستفید اس سے ہوا ہر فرد، دیکھو تو سہی — کون ہے صیّاد خوشدل؟ کون ہے غمناک صید؟

قوم کو سمجھا دیئے اس نے نکاتِ اتحاد — اس کی آزادانہ رَو نے توڑ دی فرقوں کی قید

اب ہے جس منزل میں وہ اللہ والا فلسفی — اس سے اے منظور واقف ہیں سنائی و جنید

دے رہے ہیں گرچہ ظاہر میں صدائے الوداع
اس حیاتِ آثار سے تو کہہ بجائے الوداع :—

السلام اے رہنمائے مُلک و ملّت السلام! — السلام اے پیروِ ختمِ رسالت السلام!

در ضیائے ملّتِ بیضا لوائش یافتی — السلام اے طلعت افروزِ قیادت السلام!

آیتے بودی تو از آیاتِ ایمان و یقیں — السلام اے صاحبِ فضل و کرامت السلام!

جلوۂ تنظیمِ ملّت می دہد ہر نظمِ تو — السلام اے شاعرِ خورشید سیرت السلام

بر سپہرِ مجد نامِ روشنت تابندہ باد!
با ہزاراں جاہ و نعمت قومِ تو پایندہ باد!

علی منظور حیدرآبادی

اُمیدوں کی دُنیا

یہ افسانہ میں نے ۸ ؍ فروری ۱۹۳۸ء کی شام کو آل انڈیا ریڈیو کے لاہور اسٹیشن سے براڈکاسٹ کیا۔ (ح - ۲)

حمید ایک ایسے خاندان کا چشم و چراغ تھا جس کے افراد پشتوں سے غریبی اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے آئے تھے۔ ابھی اُس نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ماں نے اکلوتے بیٹے کی نگہداشت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ محنت مشقت کر کے اور اکثر اپنی بساط سے بڑھ کر اُس کی پرورش کا خیال رکھتی اور اسے دیکھ دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی کیونکہ اس تیرہ و تاریک دُنیا میں وہی اُس کی اُمیدوں کا آخری سہارا تھا۔ ذرا سیانا ہُوا تو اس میں غیر معمولی ذہانت کے آثار نظر آنے لگے۔ ماں نے کچھ اپنی مزدوری کے بل بُوتے پر اور کچھ محلے والوں کی امداد کے بھروسے پر اُسے سکول میں داخل کرا دیا۔ یہ اُس کے لئے اجتماعی زندگی کی ابتدا تھی کیونکہ اس سے پہلے ماں نے اُسے کبھی گھر سے باہر نہیں جانے دیا تھا۔ وہ اُسے لمحہ بھر کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی، اس خیال سے کہ اُسے کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔ لیکن غالباً اس کی سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ محلے کے امیر اور آسودہ حال بچّوں کو دیکھ کر اُسے اپنی خراب حالت اور غربت کا احساس نہ ہو اور یہ احساس بڑھتے بڑھتے اُسے پست ہمت نہ کر دے، اور وہ اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھنے لگے۔

گھر سے باہر اُس کی دُنیا سکول کی چار دیواری تک محدود تھی۔ یہاں اُس نے طرح طرح کے لڑکوں کو دیکھا ان میں سے بعض امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے، بعض مالی حیثیت سے درمیانے درجے کے والدین کی اولاد تھے اور بعض اُس کی طرح خستہ حال، وہ ان سب کی شکل و صورت اور لباس کو غور سے دیکھتا۔ اس فرق پر حیران ضرور ہوتا لیکن ان سب سے الگ تھلگ رہتا۔

حمید اپنے ہم جنسوں میں بہت کم گو اور خاموش مشہور تھا لیکن اس کم گوئی اور خاموشی کا راز اُس کی ماں کے سوا اور کسی کو معلوم نہ تھا۔ سکول سے واپس آتا تو وہ گہری نظر سے اُس کے چہرے کا مطالعہ کرتی اور سکول کی زندگی کے متعلق اُس کے احساسات معلوم کرنے کے بہانے سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی۔ اگر وہ اس کے جواب میں کوئی ایسی بات کہتا جس سے اُس کی خود داری کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہوتا تو اسے تسلی دینے کے لئے فرضی قصّے کہانیاں سُناتی،

ماں کی بروقت تربیت کا یہ اثر ہُوا کہ غریب ہونے کے باوجود وہ تعلیم میں تمام ہم جماعتوں سے بڑھ گیا۔ جب اُستاد بھی حوصلہ افزائی کرنے لگے تو اُس کے پاس اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کی کوئی وجہ نہ رہی۔ وہ فخر آمیز مسکراہٹ سے اپنے اُن حریفوں کی طرف

دیکھتا جو غرور کی وجہ سے اُس کی حالت پر ہنسا کرتے تھے۔ ماں جب یہ دیکھتی کہ میری محنت کارگر ثابت ہوئی تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ وہ سکول سے فارغ ہو کر سیدھا گھر پہنچتا تو اُس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ حمید کو اب یقین ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ اُسی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ جن قصّے کہانیوں کو وہ محض فرضی سمجھتا تھا اب اُن میں حقیقت کی جھلک نظر آنے لگی اور اُس کے دل میں اپنے آپ پر اعتماد کا جذبہ روز بروز ترقی کرتا گیا۔

تعلیم میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے سبب ہر درجے میں انعام اور وظیفے حاصل کرتا جس سے مالی مشکلات بھی ذرا کم ہو گئیں۔ نادار طلبہ کے لئے عموماً سکول کی تعلیم کے بعد اعلےٰ تعلیم کا جاری رکھنا مشکل ہو جایا کرتا ہے۔ اکثر ایسے ہونہار اور قابل طالب علم جن کے متعلق یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر انہیں موقع دیا جائے اور تمام سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تو شہرت کے آسمان پر سورج کی طرح چمکیں گے، محض مفلسی کی وجہ سے زندگی کی کٹھن منزل میں گردِ راہ بن کر رہ جاتے ہیں بہت سے بے بہا گوہر اسی طرح بے قدری اور مایوسی کی خاک میں مل جایا کرتے ہیں۔

لیکن حمید اس معاملے میں ذرا خوش قسمت واقع ہوا تھا۔ کیونکہ جب اُس نے انٹرنس میں اعلےٰ درجے کی کامیابی حاصل کی اور اُسے وظیفہ مل گیا تو اُس کی غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کو دیکھ کر اُستادوں نے اُسے تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا، اور ہر ممکن طریقے سے اُس کی امداد کا وعدہ کیا۔ اگر اُس کے اپنے شہر میں کالج نہ ہوتا تو شاید وہ اس مشورے پر عمل نہ کر سکتا کیونکہ اُس صورت میں خرچ زیادہ ہو جانے کے علاوہ ماں اُس کی جُدائی گوارا نہ کر سکتی۔ خیر حالات نے اُس سے موافقت کی اور وہ جُوں تُوں کر کے کالج میں داخل ہو گیا۔

یہاں کی فضا سکول سے بالکل مختلف تھی۔ سکول میں تو اُسے اپنے جیسے بہت سے طُلبہ کو دیکھ کر کچھ تسلی بھی ہو جاتی تھی مگر یہاں اُس قسم کے طالب علموں کی تعداد زیادہ تھی جن کی تلخ یاد سکول کی زندگی نے ہمیشہ کے لئے اُس کے دل سے وابستہ کر دی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ وہ اس نئے ماحول میں جی ہار بیٹھتا لیکن ماں کی محبت آمیز نصیحتیں اور ثابت قدمی کی تلقین یہاں بھی بار آور ثابت ہوئی اور حمید کا نام اُن طلبہ میں شمار ہونے لگا جو کالج کے لئے فخر کا باعث سمجھے جاتے تھے، وہ ہر امتحان اور ہر مضمون میں اوّل رہنے لگا۔

دو سال کی مختصر مدت خواب کی طرح گزر گئی اور حمید نے ایف۔ اے کے امتحان میں بھی گذشتہ روایات کو قائم رکھا۔ اس کا نام کالج کے "اعزازی بورڈ" کی زینت بن گیا جسے بعض حسد اور بعض رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

اب وہ بی۔ اے میں تعلیم پا رہا ہے۔ وظیفے اور ٹیوشنوں کی قلیل آمدنی سے تعلیم کا خرچ بھی پُورا کرتا ہے اور بمشکل اپنا اور ماں کا پیٹ بھی بھرتا ہے۔ ماں اُس کی روز افزوں ترقی کو دیکھ کر جی رہی ہے اور خُدا کی درگاہ سے ایک شاندار مستقبل کی

آس لگائے بیٹھی ہے۔

(۲)

رات کافی گزر چکی ہے، سڑک پر آمد و رفت بھی کم ہو گئی ہے۔ حمید ایک بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑا روشنی میں کتاب پڑھ رہا ہے، تھک جاتا ہے تو کتاب بغل میں داب کر سڑک کے آر پار ٹہلنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر اس خیال سے کہ صبح امتحان ہے اور آخری پرچہ ہے، کتاب کھول لیتا ہے۔ کبھی مطالعہ کے دَوران میں ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک چلا جاتا ہے کبھی ایک ہی کھمبے کے نیچے کھڑا ہو جاتا ہے، کبھی نیند کے غلبے سے کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر اس طرح گر جاتی ہے، جیسے سوتے ہوئے بچے کے ہاتھ سے کھلونا۔ آخر قوتِ ارادی کے سہارے دوبارہ مطالعے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ غرض اس طرح وہ امتحان کے آخری پرچے کی تیاری کر رہا ہے۔

"پوں۔ پوں۔ پوں"۔۔۔۔ دفعتہً موٹر کے ہارن کی آواز سُنائی دیتی ہے۔

"بے وقوف! آنکھیں خراب کرے گا!" ان الفاظ کے ساتھ ہی موٹر کے اندر سے ایک زبردست قہقہے کی آواز بلند ہوتی ہے اور وہ فراٹے بھرتی ہوئی پاس سے گزر جاتی ہے۔ لیکن حمید ٹس سے مس نہیں ہوتا جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دو آدمی اُسی راستے سے گزرتے ہیں اور اس حالت میں اُسے مصروفِ مطالعہ پا کر جی کھول کر ہنستے ہیں۔

"عجیب احمق ہے! یہ امتحان میں ضرور کامیاب ہوگا!"

اس قسم کے بہت سے آوازے کان میں پڑتے ہیں۔ یک لخت کتاب ہاتھ سے گر پڑتی ہے اور وہ اپنے خیالات میں کھو جاتا ہے۔

"بے وقوف! احمق!!" لیکن کیا یہی دُنیا بھر کی عقل کے اجارہ دار ہیں؟ اگر یہ غلط ہے تو اس تمسخر کا مطلب؟ وہ تنگ و تاریک کوٹھڑی جس میں مٹی کا دیا تک نہیں..... مگر نہیں! مجھے ان لوگوں کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ یہ عقلمند ہیں، میں بے وقوف! یہ سب کچھ درست، مگر صبح امتحان ہے، اور میرے مستقبل کا فیصلہ آج کی رات پر منحصر ہے، پہلے پرچے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ اگر صبح کے پرچے میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو خُدا جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ پچھلے سال مُنیر نے تمام پرچوں میں اوّل درجہ کے نمبر حاصل کئے تھے، لیکن صرف ایک پرچے میں فیل ہو جانے سے وہ امتحان میں ناکام رہا۔ اگر میں اس سال فیل ہو گیا تو اگلے سال مقابلے کے کسی امتحان میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔"

زمین سے کتاب اُٹھا کر پڑھنا چاہتا ہے لیکن ایک اور موٹر کے ہارن کی آواز خیالات کے اس سلسلے کو منقطع کر دیتی ہے اور وُہی الفاظ پھر کانوں میں گونجنے لگتے ہیں

"بے وقوف! آنکھیں خراب کرے گا" اس کے ساتھ ہی یہ الفاظ بھی یاد آ جاتے ہیں؛

"عجیب احمق ہے۔ یہ امتحان میں ضرور کامیاب ہوگا!"

آنکھیں مجبوراً کتاب کے صفحے پر جمی ہوئی ہیں۔ لیکن دل میں خیالات کا ایک طوفان برپا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دُنیا میں اس طرح محسوس کرنے لگتا ہے جیسے کوئی پاگل کسی اجنبی شہر میں جا نکلے جہاں اُسے جاننے اور پہچاننے والا کوئی نہ ہو۔ طرح طرح کے خیال دل میں گزرتے ہیں۔

"چند گھنٹے اور باقی ہیں کل دوپہر تک امتحان ختم ہو جائے گا۔ شب و روز کی لگاتار محنت! اور اس سے بڑھ کر ماں کی دُعائیں! میں ضرور کامیاب ہوں گا۔ ممکن ہے اوّل درجے میں پاس ہوں، عجب نہیں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہوں۔ مقابلے کا امتحان معمولی بات ہے، اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو ممکن ہے کسی بڑے عہدے پر پہنچ جاؤں پھر میں بھی دُنیا میں عقلمند کہلاؤں گا۔ بے زری اور مفلسی کا داغ میری جبیں سے دُھل جائے گا! اور وہی لوگ جو آج میری خستہ حالی کا مذاق اُڑا رہے ہیں مجھے احترام کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ قرض خواہوں کے آئے دن کے تقاضے بھی ختم ہو جائیں گے۔"

"ٹن ٹن ٹن ٹن . . . ." بارہ بج گئے! آج وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے، ماں میری راہ تک رہی ہوگی اور میرے لئے دُعائیں مانگ رہی ہوگی۔ ممکن ہے کہ مستقبل کی وہ روشن تصویر جو میری چشمِ تصوّر کے سامنے پھر رہی ہے اُس کی نظروں کے سامنے بھی ہو اور یہی اُسے میرے لئے شب بیداری پر مجبور کر رہی ہو۔ مجھے اُس نے کس محنت اور مشقت سے پالا، اگر کل کا پرچہ خراب ہوگیا تو اُس کی آرزوؤں کا کیا حشر ہوگا۔ لیکن اُسے اُن طعنوں اور پھبتیوں کی کیا خبر جو میں روز سُنتا ہوں، خیر، یہ آخری رات ہے! سڑک پر بجلی کی روشنی میں امتحان کی تیاری کی آخری رات! کل اطمینان کی سانس لوں گا۔"

رات کی پُرسکون اور خاموش فضا میں حمید بظاہر تنہا لیکن دل میں اُمیدوں اور آرزوؤں کی ایک دُنیا بسائے کھڑا تھا۔ اس تنہائی میں اُمید و یاس کی اُس پیہم کشمکش کا کوئی راز دار نہیں تھا جو اُس کے سینے میں جاری تھی۔ ہاں بوڑھی ماں کا خیال جس نے تمام راحتیں اپنے اکلوتے بیٹے پر قربان کر دی تھیں بار بار آتا اور یہی خیال اُس کی زندگی کا سہارا تھا۔ اور ہمیشہ مایوسیوں کے اندھیرے میں اُمید کی کرن بن کر اُس کی رہنمائی کیا کرتا تھا۔ پے در پے مصیبتوں کے دَوران میں انسان کو اکثر ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ اگر اس کی زندگی کی جدوجہد کا کوئی مرکز نہ ہو تو اُس کے لئے جینا دوبھر ہو جائے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ساری تگ و دَو کیوں ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ یہی وجہ تھی کہ جہاں کہیں یاس دامنگیر ہوئی فوراً اُس کا خیال ماں کی طرف جاتا تھا۔ چنانچہ اس خیال نے اُسے دوبارہ کتاب اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ آنے والے امتحان کے لئے پہلے سے زیادہ توجہ کے ساتھ مطالعہ میں مصروف ہوگیا

اب اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ کسی اَور طرف توجہ بٹنے نہیں دوں گا۔ خیالات کی پریشانی پر بھی قابُو پا لیا تھا۔ نیند کے غلبے کو شکست دینے کے لئے مطالعہ کے دوران میں ٹہلنا شروع کر دیتا، اب اُسے یقین تھا کہ کوئی چیز کتاب کے پڑھنے میں مُخل نہیں ہو گی، کبھی کبھی دُور سے کتّوں کے بھونکنے کی آواز یا کسی سنتری کی للکار سنائی دیتی تھی۔ لیکن وہ ان دونوں کا عادی ہو چکا تھا، اب اُس کی توجہ کا یہ عالم تھا کہ کوئی راہ گیر بھی اُس طرف سے گزرتا تو اُسے معلوم نہ ہوتا۔ کتاب کو بند کر کے کبھی ایک کھمبے سے دُوسرے کھمبے تک جاتا اور جو کچھ پڑھا ہوتا اُس پر غور کر کے اُسے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا۔ اسی حالت میں کبھی سڑک کے آر پار جاتا، کبھی دماغی اور جسمانی تکان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ایک آدھ منٹ کے لئے بیٹھ جاتا۔ اب اُسے ذہنی کشمکش سے کسی قدر نجات مِل چُکی تھی، اور اُس کے خیالات کا تنہا مرکز کتاب تھی، مختصر یہ کہ اب نہ اُس کے دِل میں سوسائٹی کی بے انصافی اور لوگوں کے ہنسی مذاق کی یاد تازہ ہوتی تھی اور نہ وہ ذہنی طور پر ان کا بدلہ لینے کے لئے ہوا میں موہوم اُمیدوں اور آرزوؤں کے محل کھڑے کرتا تھا، شعوری طور پر اُس کی نگاہیں کتاب کے صفحات پر مرکوز تھیں لیکن اُس کی توجہ کا غیر شعوری مرکز ستم رسیدہ ماں کا خیال تھا۔

مطالعہ کا یہ غیر معمولی اور صبر آزما طریقہ جاری تھا کہ دُور سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ لیکن اِس دفعہ وہ اُس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہ کر سکی۔ اُس نے آواز تو سُنی لیکن بدستور کتاب میں محو رہا۔ اس وقت وہ سڑک کے آر پار ٹہل رہا تھا کبھی اِدھر جاتا کبھی اُدھر اور یہ کوئی خلافِ معمول بات نہیں تھی۔

ہارن کی دوسری آواز عین اُس وقت آئی جب وہ سڑک کے درمیان موٹر کی زد میں آ کر گر چکا تھا۔

"صبح امتحان ہے" ان الفاظ کے ساتھ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

(براجازت آل انڈیا ریڈیو) ——— **حفیظ ہوشیارپوری**

اقبالؒ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حصولِ قطرۂ نیساں کی خاطر جان کھوتی ہے

تو ہوتا ہے صدف کے صاف سینے سے گہر پیدا

لطافت قوّتِ نشو و نما میں جذب ہوتی ہے

ہزاروں کوششوں کے بعد ہوتا ہے ثمر پیدا

خلش دردِ وطن کی رُوح میں نشتر چبھوتی ہے

یونہی ہوتا نہیں پیغامِ شاعر میں اثر پیدا

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

(اقبالؒ)

بہ ایں معنٰے ہمیں اُمید رکھنی چاہیئے لیکن

نہیں ممکن کہ ہو اقبال اب بارِ دگر پیدا

شاد عارفی

دعوت

افسانہ نگاری میں فیاض محمود کی غیر معمولی فنی مہارت نے ایک قلیل مدت میں قابلِ رشک شہرت حاصل کر لی ہے۔ یہ مقبولیت اُنہیں کو حاصل ہے کہ اگر کچھ دیر مضمون نگاروں کی فہرست میں اُن کا نام نظر نہ آئے تو ہمیں قارئین کی طرف سے تقاضے کے خطوط موصول ہونے لگتے ہیں۔ معاصر ادبا میں فیاض محمود کی کردار آفرینی کا جواب پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ اُن کا افسانہ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے آفریدہ کردار جسداً ہمارے سامنے آموجود ہوئے ہیں اور ہم اُن کی حرکات و سکنات ہی کا نہیں بلکہ اُن کے بُشرے کی شکنوں اور اُن کے مافی القلب جذبات تک کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ فیاض محمود حقیقت نگار ہیں اور اُن کی خرد بینی جزئیات نمائی اُن کی حقیقت نگاری کو سزا آتشہ کر دیتی ہے لیکن اس پر مستزاد اُن کے قلم کی ساحرانہ جنبشیں ایک فوق العادت صناعانہ کمال کے ساتھ حقیقت میں رومان کو یوں سمو دیتی ہیں کہ افسانہ خواں کا تصور ایک صوبے رسائے کی سی لاویز جھلملاہٹ میں کسی دیکھی اور پھر اَن دیکھی خیالی جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ — حامد علی خاں

آپ لوگ غالباً صوبیدار میجر شاہد علی خان صاحب کے نام سے واقف ہوں گے۔ میں اُن کا بھانجا ہوں، اگرچہ اس میں میرا کوئی ذاتی کمال نہیں۔ صوبیدار صاحب کے متعلق کچھ عرصہ پہلے بھی میں نے دوستوں کے کہنے پر ایک حکایت لکھی تھی۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ کام خطرہ سے خالی نہیں، مگر چونکہ میں نے اپنا اور اُن کا نام بدل دیا ہے اور انہیں اخبارات اور رسائل سے قطعی نفرت ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ ایک عرصے سے سفر میں ہیں مجھے اُمید ہے کہ ان کے سوانح کی یہ دوسری قسط بھی ان کے علم میں نہ آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اطمینان سے ان کی معمول سے زیادہ مصروف زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

صوبیدار صاحب کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ اس لئے انہوں نے مجھ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یوں بھی نوکروں کو سخت سُست کہنے کے علاوہ انہیں شاید اس امر کی خواہش بھی ہو کہ کوئی خاص الخاص مقرب بھی چاہئے جسے دعوے کے ساتھ جو جی میں آئے کہا جا سکے اور جو ہر حالت میں، ہر موقع پر دل کی بھڑاس نکالنے میں خاموش سامع کا کام دے سکے اور ایک وجہ یہ بھی ہوگی، اگرچہ یہ وجہ فقط مجھی کو معلوم ہے، کہ چونکہ زنان خانہ میں صوبیدار صاحب کے اکثر عادات پر بے لاگ نکتہ چینی کرنا ممانی جان کی طبیعت میں داخل ہو گیا ہے، اس لئے صوبیدار صاحب کو اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ انہیں کوئی ایسا ہم نشیں مل جائے جس کے سامنے وہ طبقۂ نسوانی کے متعلق نہایت واضح الفاظ میں، بغیر کسی رعایت کے، اپنے چیدہ چیدہ خیالات کا اظہار کر سکیں۔ چنانچہ اس منصب کے لئے، میرے اعمال کی یادداشت میں اور قضا و قدر کے کسی پُراسرار فیصلہ کے مطابق ماموں جان نے مجھے منتخب کیا۔ شاید اس لئے بھی کہ والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور والدہ صاحبہ کو یہ اشارہ ہی کافی تھا کہ صوبیدار صاحب کی جو جائداد ہے وہ کہاں جائے گی، نہ ان کا کوئی بھائی ہے نہ بھتیجا۔ بہرحال میں کچھ عرصہ سے صوبیدار صاحب کی کوٹھی "کہکشاں" میں مقیم ہوں اور ان کے لاتعداد ارادوں، اور منصوبوں کی ترتیب، انتظام اور انجام میرے ہی سپرد ہے۔

جس دعوت کے متعلق یہ واقعہ آپ کو سُنا رہا ہوں، اس کی تھوڑی بہت "شانِ نزول" بھی ضرور بیان کرنی چاہیئے۔ آغاز یوں ہوا۔ ایک دن صبح نَو بجے کے قریب، جنوری کے دنوں میں، چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم دونوں گفتگو کا کوئی موضوع تلاش کر رہے تھے کہ یکایک ماموں جان نے پوچھا "تم خان بہادر چودھری علی نواز خان ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر کو جانتے ہو؟" میں نے کہا "نہیں" اس پر اُنہوں نے مجھے گھورتے ہوئے مگر نہایت منصفانہ لہجے میں کہا "تم بالکل بُدھو ہو، کسی کام کے آدمی کو نہیں جانتے، معلوم نہیں تمہاری پرورش کہاں ہوئی ہے۔ ماں بیچاری تو تمہاری اچھی سمجھدار ہے، معلوم نہیں تم نے ایسا کُند دماغ کہاں سے پایا ہے کہ ذہن میں فقط وہ چیزیں موجود ہیں، جن کی کوئی ضرورت نہیں، یا شعر یا فلسفہ۔ اخبار اور کتابیں تو ہر وقت پڑھتے رہتے ہو مگر نام سے کسی مشہور آدمی کے تم واقف نہیں۔" اس لمبی تقریر کو میں خاموشی سے سُنتا رہا۔ جب اُنہوں نے ذرا دم لیا تو میں نے پوچھا "آپ کن مشہور آدمیوں کا ذکر کر رہے ہیں؟" کہنے لگے "ارے اُلّو آدمی" (یہ لقب مجھے آپ کی طرف سے عنایت ہو چکا ہے) انہیں خان بہادر چودھری علی نواز خان کو لو جو میرے سب سے عزیز دوست ہیں، ہر سمجھدار شخص نے جو بالکل جاہلِ مطلق نہیں، ان کا نام سُنا ہو گا۔"

میں نے نہایت ادب سے پوچھا "مگر وہ کہاں ڈپٹی کمشنر تھے؟"

میری طرف غور سے دیکھ کر فرمانے لگے "ارے تم واقعی اتنے احمق ہو یا یونہی جاہل بننے میں تمہیں لُطف آتا ہے، ان چودھری صاحب کو تو میں نے کہتے سُنا ہے کہ پنجاب میں کوئی شخص نہ ہو گا جو انہیں نہ جانتا ہو اور تم پڑھ لکھ کر کہتے ہو کہ تُم انہیں نہیں جانتے۔"

میں نے کہا "حضرت پنجاب میں بیسیوں ضلعے ہیں۔ میں کس کس ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو جانتا پھروں؟"

اس پر اُنہوں نے بڑے وثوق اور "قطعی پن" سے کہا "میرا خیال ہے تم دُنیا کے معاملات میں بالکل کورے ہو۔ ارے یہ چودھری صاحب برسوں کانگڑے اور کُلّو کی طرف رہے ہیں اور میں نے تو انہیں کہتے سُنا ہے کہ لاہور میں بھی کچھ عرصہ رہے ہیں، معلوم نہیں کس عُہدے پر مگر کسی بڑے عہدے پر ہی رہے ہوں گے۔ سرکار کے ہاں ان کا بڑا رسُوخ ہے۔ سُنا ہے سینکڑوں کو نوکر کرایا ہے۔ صاحب اُٹھ اُٹھ کے سلام کرتے ہیں۔"

میں نے بمشکل اپنے آپ کو لاحول ولا کہتے کہتے روکا، مگر یہ کہنے سے باز نہ رہ سکا "کونسے صاحب کالے یا گورے؟" میرے لہجے میں طنز تو تھی مگر اس کا ڈر نہ تھا۔ ماموں جان طنزوں کی پروا نہیں کرتے بلکہ اکثر انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی طنز کر رہا ہے۔ میں نے سُنا ہے بڑے آدمیوں کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے۔ کم از کم اس لحاظ سے تو ماموں جان بہت عظیم الشان شخصیت کے مالک ہیں۔ پھر کسی کی رائے پر عمل کرنا وہ اپنی ہتک خیال کرتے ہیں اور اپنی غلطیوں کا اقرار

دوسروں کو ٹھہرانا ان کا دستور ہے۔ یہ سب باتیں ان کی بڑائی کا ثبوت دیتی ہیں۔ مگر میں نے جو کہا "کالے یا گورے "، تو شاید ناراض ہوئے اور ماتھے پر بل بھی آگیا، مگر میری خوش قسمتی کہ میں اخبار لئے بیٹھے تھا۔ جونہی یہ لفظ میرے مُنہ سے نکلے میں اخبار پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ بچاؤ اس لئے بھی ہوگیا کہ ان کی ایک عادت سے میں واقف تھا اور وہ یہ کہ وہ کتنے طیش میں کیوں نہ ہوں، سوائے نوکروں کے وہ کسی سے رو در رو ہوکر کچھ کہنا پسند نہیں کرتے۔ ممانی جان سے دو بدو تو شاید کتنی کتنی مدت نہیں ہوتے۔ اندر آتے جاتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، سب طرح کے تعلقات قائم ہیں مگر کسی معاملہ میں اگر دونوں کا اختلاف ہو اور اختلاف ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں تو ماموں جان اپنے اردگرد ہر چیز کی طرف نظریں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گے، ایک نہ دیکھیں گے تو ممانی جان کی طرف اور یہ انہیں بھی معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ممانی جان کو بحث میں ان پر ہمیشہ فتح رہتی ہے اور یہ بات مجھے بھی معلوم تھی۔ میں نے احتیاطاً انہیں ترچھی نظر سے دیکھا۔ ان کے چہرہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرا سوال انہیں ناگوار معلوم ہوا ہے۔ مگر نہ دو منٹ انہوں نے مجھے بلایا اور میں نے اخبار سے نظر اُٹھائی۔ البتہ میں نے دو تین دفعہ اخبار کو ضرورت سے زیادہ کھڑکھڑاہٹ پیدا کرکے کھولا، تاکہ انہیں میرے انہماک کا علم ہوجائے۔ غالباً دو ایک منٹ سوچنے کے بعد اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ میرا مطلب اس سوال سے گستاخی نہ تھا۔ چنانچہ سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا "مجھے کیا معلوم؛ میں نے تو سُنا ہے۔" مطلع صاف ہوگیا۔ میں نے شکر کیا اور اخبار کو تہ کر دیا۔

اس طرح چودھری علی نواز خان کا ذکر شروع ہوا۔ انجام اس کا ضروری تھا کہ مجھ سے تعلق رکھتا ہو۔ معلوم ہوا کہ خان بہادر صاحب لاہور جارہے ہیں، اگر انہیں خط لکھ دیا جائے تو وہ امرتسر سے اُتر کر ہمارے پاس دو ایک دن کے لئے ہوتے جائیں۔ ماموں جان کا ارادہ تھا کہ خان بہادر کو لینے کے لئے وہ موٹر امرتسر ہی بھیج دیں۔ یوں خان بہادر صاحب گاڑی سے بھی آ سکتے تھے۔ کیونکہ امرتسر سے ہمارے شہر کی طرف چار یا پانچ گاڑیاں چلتی ہیں۔ مگر موٹر نئی تھی۔ ماموں جان نے جو عام طور پر موٹر کا بہت خیال رکھتے ہیں، کہا کہ بیس میل کا فاصلہ موٹر کے لئے کچھ نہیں۔ بارے میں نے سمجھایا کہ کہیں چودھری صاحب یہ نہ سمجھیں کہ ہمیں موٹر کی نمائش مقصود ہے، اس پر ماموں جان نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا کہ ہاں لوگ بہت کمینے ہوتے ہیں۔ اچھا تو جانے دو، چودھری صاحب کو گاڑیوں کے اوقات لکھ دو اور اسٹیشن پر موٹر بھیج دینا۔ آخر ٹانگے میں، انہیں آنے کی تکلیف کیوں دی جائے۔ اگرچہ ہماری تو فٹن بھی ہے۔" میں نے کہا" تو فٹن بھیج دیجئے، ہماری تو فٹن بھی بہت خوبصورت ہے۔" کہنے لگے " نہیں سردیوں کا موسم ہے، موٹر میں ہوا نہ لگے گی، ان کے سامان اور نوکر کے لئے البتہ ٹانگہ بھیج دینا۔"

مگر یہ آغاز تھا۔ خط تو اسی وقت لکھ دیا گیا مگر انہیں تشویش ہی رہی، کہنے لگے اگر خط انہیں نہ ملا تو؟" میں نے عرض کیا" آخر کیوں؛ اور خط تو پہنچ جاتے ہیں، اس کے لئے پہنچنا کیا مشکل ہوگا، مگر ان کی تسلی نہ ہوئی۔ فرمایا" ایک اور

خط لکھواور اسے رجسٹری کرا کے آؤ۔" میں نے کہا "حضرت دو خط اور ایک ہی مضمون کے اور ایک ہی ڈاک میں؟ آپ کے دوست کیا کہیں گے؟" کہا "تم فضول اعتراض کرتے ہو۔ ڈپٹی کمشنر رہ رہے ہیں، کیا اُنہوں نے کبھی رجسٹری شدہ خط نہیں وصول کیا؟ بس اپنے یقین کے لئے لکھتے ہیں۔ انہیں کیا؛ انہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ ایسا ویسا بُلاوا نہیں اور ہاں رجسٹری جلدی سے خود ہی کرا آؤ۔ بائیسکل لے جاؤ، ایسے کاموں میں نوکروں پر اعتبار کرنا عقلمندی نہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا "مگر نوکر بھی، تو رسید لے آئے گا۔" مگر اُنہوں نے عمداً میرے الفاظ کو نہ سُنا۔

بہر حال اپنے احکام کو قطعی بنانے کی غرض سے وہ میرے پاس سے اُٹھ کر اپنے خاص کمرے میں چلے گئے۔ اس کمرہ کا ذکر شاید میں نے آپ سے نہیں کیا۔ یہ کمرہ دیکھنے کے قابل ہے۔ اسے وہ اسلحہ خانہ کہتے ہیں۔ ان کی بندوقیں، پستول، کارتوس بنانے کی مشین، پیش قبضیں، چاقو اور تلوار، دو ایک چیتوں کی کھالیں، ایک آدھ ریچھ کی، ایک دوبارہ سنگھے کے منڈھے ہوئے سر سینگوں سمیت اور ایسی ہی چیزیں اس کمرے کی دیواروں پر یا ادھر اُدھر لٹکی یا پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ کمرہ صوبیدار صاحب کی جائے پناہ ہے۔ جب بھی ممانی جان کی زبان زیادہ تیزی سے چلنے لگے اور ماموں جان کو خانہ جنگی میں شکست ہو تو اس کمرے میں قلعہ بند ہو جایا کرتے ہیں اور عموماً میں نے انہیں ایسے موقعوں پر بندوق کی نال صاف کرتے دیکھا ہے۔ اس کام میں وہ اس توجہ اور سرگردگی سے مشغول ہو جایا کرتے ہیں کہ کچھ عرصے کے لئے دُنیا کی کوئی چیز انہیں پریشان نہیں کر سکتی۔

ان کے اس شغل کے متعلق مجھے کئی لطیفے یاد ہیں مگر پھر کبھی سناؤں گا۔ اس وقت تو اس دعوت کا حال سنیئے۔ رجسٹری کرا کے جو میں واپس آیا تو دیکھا کہ ایک ہنگامہ سا برپا ہے۔ نوکر ادھر اُدھر بھاگ رہے ہیں، کوئی گاما کو آوازیں دے رہا ہے، تو کوئی کلو کو۔ کوئی خانساماں خانساماں پکارتے جا رہا ہے اور کوئی مُرغیاں گن رہا ہے۔ میں جو نوکروں کو نظر پڑا، دو ایک میری طرف لپکے۔ میں نے پوچھا "خیر تو ہے" کہنے لگے "چھوٹے میاں"۔ یہ کم بخت اصل میں مجھے بچپن سے ہی چھوٹے میاں کہتے آئے ہیں اور مجھے اس نام سے اُلجھن ہوتی ہے اور اگرچہ میں نے کئی دفعہ انہیں ٹوکا ہے مگر یہ باز نہیں آتے۔ خیر تو کہنے لگے "چھوٹے میاں! بڑے صاحب نے تو ہم سب کو گھبرا دیا ہے۔ کیا بات ہے؟ کسی پلٹن کی دعوت ہے؟" میں نے پوچھا "کیوں؟" کہا "خانصاحب تو بکرے اور مُرغیاں اور بٹیر اور مٹھائی اور جانے کیا کیا کچھ گنوا رہے ہیں۔" میں نے کہا "اچھا صبر کرو۔ ابھی پوچھتا ہوں۔ تم جاؤ۔"

آگے بڑھا تو دیکھا کہ صوبیدار صاحب اوور کوٹ کے جیب میں ہاتھ ڈالے برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور ارد گرد خانساماں، شوفر، مالی اور منشی جی کھڑے ہیں، اور ماموں جان ہیں کہ حکم پر حکم صادر کر رہے ہیں۔ شوفر سے کہہ رہے ہیں کہ موٹر ٹھیک ٹھیک کر رکھے۔ نیچے اُوپر سے خوب دھو کر اسے بالکل نئی بنا دے۔ منشی جی کو حکم تھا کہ مضافات میں جا کر مرغیاں اور انڈے

سکیں تو بٹیریں اور تیتر درجنوں کی تعداد میں خرید لائے ۔ خانساماں سے یہ گلہ تھا کہ اسے کچھ پکانا نہیں آتا ۔ دعوت کیسی
ئی خاک کرے ! پڈنگ اسے اچھی نہیں بنانی آتی ، شامی کبابوں میں وہ انار دانہ کافی نہیں ڈالتا وغیرہ وغیرہ ۔ مجھ پر جو نظر
ں تو پوچھا " رجسٹری کرا آئے ہو ؟ " میں نے کہا " جی ہاں " ۔ پوچھا " تمہارے سامنے ہی کردی تھی یا یونہی فرصت میں کرینگے " ۔
نے کہا " جی سامنے ۔ میں وہاں سے یوں ٹلنے والا تھا رسید ساتھ لے کے آیا ہوں " ۔ اس پر کہا " اب اسے مل جائے
جاتا ہے ، کوئی اور نہ دستخط کر کے لے لے " ۔ میں نے کہا " حضرت اسی احتیاط سے واپسی رسید والی رجسٹری کرا کے لایا ہوں "
ں کے قدرے تسلی ہوئی مگر پھر بھی سر ہلاتے ہی رہے ۔

جب دو تین منٹ بعد شک رفع ہوا تو مجھ سے پوچھا " کیا کر رہے ہو ؟ " میں نے کہا " کچھ نہیں " کہنے لگے " یہی تو میں
ر کہتا ہوں ، تمہیں ذمہ داری کا احساس مطلقاً نہیں ! خان بہادر آئے کھڑے ہیں ، آج ہے منگل اور جمعہ کی شام کو وہ آجائینگے
تم یوں کھڑے ہو جیسے کوئی کام ہی نہیں " ۔ میں نے کہا " فرمایئے تو کیا کام ہے ؟ " ارشاد ہوا " کیا تمہارے خیال میں
ت ایک آدمی کی ہی ہوگی ؟ یہ خان بہادر بہت بڑے آدمی ہیں ، ان کی دعوت پر کم از کم شہر کے چند رؤسا اور حکام تو بلانے
ہیں ۔ ان کو اطلاع دینی ہے ۔ دعوت کا انتظام کرنا ہے اور تم یہاں سارس کی طرح کھڑے ہو کبھی ایک ٹانگ پر اور کبھی
سری پر " ۔ کھڑا تو میں دونوں ٹانگوں پر ہی تھا مگر کیا جواب دیتا ۔ ماموں جان ذاتیات پر تو فوراً اُتر آتے ہیں ۔ خیر میں نے کہا
و انہیں دعوت نامے بھیج دیتے ہیں " ۔ اس پر کچھ سوچنے لگے ۔ برآمدے کے دو ایک چکر کاٹنے کے بعد پوچھا " دعوت نامے
چھپے ہوئے بہتر ہوتے ہیں " ۔ میں نے کہا " چھپے ہوئے تو کوئی ہمارے پاس ہیں نہیں اور پھر یہ تو خاص تقریب ہے ۔ آپ لوگوں
خان بہادر سے ملنے کے لئے مدعو کریں گے ، یہ عام دعوت ناموں پر تو نہیں لکھا ہوتا " کہنے لگے " تو پھر " ۔ میں نے عرض کیا " تو
ں ٹائپ کر بھیج دیتا ہوں ، آخر ٹائپ کی مشین گھر میں ہے ، آپ نے خاص طور پر خرید رکھی ہے " ۔ یہ سُن کے کچھ چیں بجبیں ہوئے ۔
ل میں مجھے یہ کہنا نہیں چاہئے تھا ۔ کیونکہ مجھ سے پوچھو تو ٹائپ رائیٹر کی ہمارے ہاں کوئی خاص ضرورت نہ تھی مگر ماموں جان
شاء اللہ رئیس آدمی ہیں ۔ جائداد کافی ہے ، اراضی ہیں اور مکانات دُکانیں اور منڈی ہے ، ان کے انتظام میں جو لکھنا پڑھنا
پڑتا ہے وہ منشی جی کر ہی لیا کرتے تھے ، مگر جب میں نے بی ۔ اے پاس کیا تو کہنے لگے " میاں تمہیں نوکری کی ضرورت تو ہے
نہیں مگر تم ٹائپ کرنا سیکھ لو " ۔ چنانچہ مجھے ٹائپ کرنا سیکھنا پڑا ۔ جب میں نے سیکھ لیا تو فرمانے لگے ہمیں بھی تو ٹائپ مشین
کی ضرورت ہے " ۔ میں نے کہا " کیسے ؟ " کہا " تھوڑی خط و کتابت ہوتی ہے ، افسروں سے سرکار سے ہر ایک سے واسطہ پڑتا
ہے ۔ اب تمہیں ٹائپ کرنا تو آتا ہی ہے ، ٹائپ کر کے خطوں کا جواب دیا کریں گے " ۔ ماموں جان تھوڑی بہت انگریزی تو جانتے
ہی ہیں ۔ یہ نیا شوق جو چرایا تو میں کیسے انہیں باز رکھ سکتا تھا ۔ چنانچہ ہم نے ٹائپ کی مشین خرید لی ۔ مگر اس کے استعمال

کرنے کی کم ہی نوبت آتی تھی۔ اور میں نے جو ٹائپ کی طرف اشارہ کیا تو کچھ ناراض ہوئے، بلکہ میرے کہنے کا اُلٹا ہی اثر ہوا۔ اور اگر میں نے سوچا ہوتا تو میں ٹائپ کا ذکر ہی نہ کرتا، کیونکہ ایسے حالات میں دوسروں کے مشورہ کے برعکس، کام کرنا ماموں جان کی سرشت میں داخل ہے۔ کہنے لگے "میاں تمہیں نہ عزت کا خیال ہے نہ حیثیت کا۔ اگر تمہارے مشوروں پر چلا کروں تو معلوم نہیں کیا سے کیا ہو جائے۔ خان بہادر جیسے معزز شخص کی دعوت اور دعوتی رقعے ٹائپ کئے ہوئے کاغذوں پر! حیف ہے تم پر! خدا تمہیں عقل دے، یہ تم نے جو بی اے پاس کیا ہے کس کام کے لئے کیا ہے؟"

پھر خود ہی سوچ کے فرمانے لگے "تم امرتسر جاؤ۔" میں نے چونک کر کہا "کیوں؟" کہا "کارڈ چھپوا کے لاؤ"۔ میں نے حیرانی سے پوچھا "آج؟" کہنے لگے "کیوں نہیں؛ آج کیا چھپ نہیں سکتے؟ اور دیکھو سنہری حروف ہوں اور سنہری کنارے، اور ہاں کارڈ بڑھیا قسم کے ہوں، لو اب جلدی کرو، مضمون بناؤ۔ جلدی کرو۔ جلدی"۔ اس جگہ اعتراض تو الگ کسی چون وچرا کی گنجائش نہ تھی۔ لہٰذا مضمون بنا کے لے آیا۔ سنایا۔ اس پر بحث ہوئی، بالآخر مضمون پاس ہو گیا اور اسی وقت مجھے امرتسر روانہ کر دیا، اور ساتھ ہی حکم دے دیا کہ شام سے پہلے واپس آجانا۔ ورنہ کوئی انتظام نہیں ہو سکے گا" اس وقت ایک بجا تھا۔

شام کے آٹھ بجے کے قریب تھکا مارا میں امرتسر سے کارڈ چھپوا کے واپس آیا۔ راستہ میں دعائیں مانگتا آیا کہ جناب والا کو پسند آجائیں۔ خیر ستارہ نیک تھا، یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ کارڈ پسند آ گئے، مگر حکم ہوا کہ کھانا کھا کے ابھی ابھی نام بھر دو۔ ناموں کی فہرست تیار ہی تھی، میں نے کھانا کھانے سے پہلے ہی نام ان میں بھر دیئے۔ میرا تو خیال تھا کہ اسی وقت نوکر کو بھیجیں گے مگر معلوم نہیں کیوں؛ خیال آگیا کہ اس وقت نہیں، کچھ دیر ہی ہو گئی ہے۔ صبح کو سہی۔ مگر اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ مجھے چھٹی مل گئی۔ توبہ! توبہ!! جب ان کے سر میں کوئی سودا سمایا ہوتا ہے تو وہ نیند یا آرام کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے۔ آرام ان کے نزدیک محض سستی اور بیکاری کا دوسرا نام ہے۔ میں نے مؤدبانہ گزارش کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں سو رہوں، سارا دن امرتسر مارا مارا پھرتا رہوں۔ پوچھا "تم جوان ہو کے اتنے سست کیوں ہو؟ اگر ایک دن ہاتھ پاؤں ہلا لئے تو کیا آفت آ گئی۔ تمہیں شکار پر جانا پڑے تو معلوم ہو جائے۔" میں نے کہا "میں شکار پر جاؤں ہی کیوں؟" مگر یہ کہنے کی جرأت بھی مجھے اسی لئے ہوئی کہ تھکنے کی وجہ سے کچھ طبیعت چڑچڑی سی ہو رہی تھی اور کھانا کھانے کے بعد کچھ غنودگی سی طاری ہوتی جا رہی تھی، مگر شکر ہے وہ میری کاہلی کے مسئلہ میں ایسے مصروف تھے کہ میرے الفاظ کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ورنہ شکار پر تو بیدار صاحب جان دیتے ہیں۔ شکار کا ایک قصہ مجھے یاد آتا ہے، مگر۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔ پھر سہی۔۔۔۔

صبح چار سے ابھی فارغ نہ ہوئے تھے کہ دعوت نامے بھیج دیئے گئے اور جب نوکر چلا گیا تو آپ کو خیال آیا کہ یونہی بلا آر دعوت نامے بھیج دینے سے کیا فائدہ ہے۔ فوراً اس کے پیچھے آدمی دوڑایا اور مجھے ارشاد ہوا کہ ناموں کی فہرست تیار کر دو ہیں

نے پوچھا "ان کو کیا بھیجئے گا؟" فرمایا "تمہیں بات بات پر ٹوکنے کی عادت کہاں سے پڑی ہے، بات بات پر حجّت! یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے عرض کیا "ماموں جان!" اور یاد رہے کہ اثنائے گفتگو میں میں اپنا رشتہ کم ہی جتایا کرتا ہوں، اس لئے کہ اس خطاب کا اثر قائم رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ آپ جانتے ہیں، ان کے ساتھ رہ کے ہر اُونچ نیچ کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ خیر تو میں نے کہا "ماموں جان! میں نے تو فقط پوچھا ہے، اس میں حجّت کی کیا بات ہے" فرمایا "اچھا! تو خیر فہرست بنا دو اور دعوتی رقعوں کے ساتھ بھیج دو اور دیکھو تاکید کردو کہ ہر شخص کے دستخط کرا کے لائیں، خود دیکھ لینا۔ اور ہاں! یہ بھی سوچا ہے دعوت کہاں ہوگی؟ کھانے کا کمرہ چھوٹا ہے۔ ہال میں انتظام کرانا ہے۔"

آپ سے شاید میں نے ہال کا ذکر ابھی تک نہیں کیا۔ یہ کمرہ ماموں جان کی آنکھ کا تارا ہے۔ یعنی اگر اتنے لمبے چوڑے کمرے کو آپ تارا تصوّر کر سکتے ہیں۔ اور یہ کمرہ ہماری کوٹھی کے عین وسط میں واقع ہے۔ سنگِ مرمر اور سنگِ سیاہ کا فرش ہے اور چاروں طرف ڈیڑھ ڈیڑھ گز تک دیواروں میں جڑی ہوئی نیلی پیلی اور سفید ٹائیلیں آنکھوں کو چکا چوند کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ میں نے ایک دفعہ کہیں دبی زبان سے کہہ دیا تھا کہ ان ٹائیلوں کی جگہ اگر ساگوان کی تختیاں لگ جاتیں تو اچھا ہوتا۔ بس صوبیدار صاحب اتنا گرجے کہ میں جل تو جلال تو پڑھتا سارا دن ممانی جان کے پاس بیٹھا رہا۔ ہاں تو ماموں جان کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ ہال میں کسی بڑی دعوت کا سامان ہو۔ اگرچہ ایک دو دفعہ آپ کو موقع مل بھی چکا تھا مگر ابھی ان کی تسلّی نہ ہوئی تھی۔ اب جو خان بہادر صاحب کا آنا ہُوا تو اُنھوں نے فیصلہ کر لیا کہ تمام ہال کو سجائیں گے اور ان کے خیالات اور فیصلوں کو عملی جامہ پہنانا چونکہ میرا کام ہوتا ہے، اس لئے انہیں فیصلہ کرنے میں دقّت پیش نہیں آئی، چنانچہ حکم ہو گیا کہ جھنڈیاں اور جھالریں اور زنجیرے اور جانے کیا کیا کچھ تیار ہو جائے۔ میں نے بہت سماجت سے سمجھایا کہ حضرت یہ کوئی خاص تقریب نہیں، جھنڈیاں اور جھالر کسی اَور موقع پر اُٹھا رکھئے۔ معلوم نہیں لوگ کیا کہیں۔ تو کہنے لگے "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو، لوگ ایسے بدطینت ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ! اچھا تو ہال کو صاف کراؤ۔ ابھی سے سب کام شروع ہو جائے۔"

باقی دو دن میں ہی جانتا ہوں ہم سب نے کس طرح کاٹے ہیں۔ صوبیدار صاحب کو ہر جگہ اور ہر ایک کے ساتھ اور ہر کام میں اُلجھنے کا جو کمال حاصل ہے اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے، کبھی مالی سے جھگڑ رہے ہیں کہ جنوری میں گلدانوں کے لئے اچھے اچھے پھول کیوں نہیں ملیں گے اور کبھی خانساماں سے بحث ہے کہ آج کل کے بکروں کا گوشت بہت پھیکا اور بے ذائقہ ہوتا ہے، اور کبھی منشی جی کو پریشان کرتے ہیں کہ جنوری میں بٹیریں کیوں نہیں مل سکتیں اور نہیں تو کہیں سے مُرغابیاں منگواؤ اور دیکھو تازہ ہوں اور چربدار۔ اور کبھی مجھ سے تکرار کہ کھانے کی کرسیاں ہمارے پاس اگر کم تھیں تو تم نے اَور کیوں نہیں بنوائیں تمہیں کسی بات کا دھیان بھی رہے، اگر میں ان چیزوں کا خیال نہ رکھوں تو کوئی کام پُورا نہ ہو سکے۔ غرض یہ کہ جہاں کہیں کوئی

کام کر رہا ہو، وہیں ماموں جان بادھمکتے اور اب جو سوچتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے سب سامان تیار کیسے ہو گیا۔

آخر کار جمعہ کا دن آ گیا، اور خان بہادر صاحب کا جواب بھی کہ ہم ضرور آئیں گے۔ صبح ناشتہ کرتے ہی آپ دورہ لگانے لگے۔ موٹر کا معائنہ ہوا، فٹن دیکھی گئی، تانگہ پر بھی تبصرہ کیا گیا۔ پھر اپنی سواری کے گھوڑے کے متعلق سائیس سے بحث کی۔ اس کے بعد ہال کمرے میں پہنچے، میز، کرسیاں ابھی ایک طرف بے ترتیبی سے ہی پڑی تھیں۔ بس تو نیز سے طوفان آ گیا، نوکر چاکر سب اکٹھے کر لئے اور نہایت فراخدلی کے ساتھ گالیوں سے اُن کی تواضع کی۔ میزیں اسی وقت لگوائی گئیں، میز پوش نکلوائے گئے کرسیاں دوبارہ صاف کرائیں، گلدان اپنی اپنی جگہ رکھ دیئے گئے، غرضیکہ بارہ بجے سے پہلے پہلے سب چیزیں قرینے سے رکھوا دیں۔ کھانا کھانے کے بعد میرے اصرار پر کچھ دیر اندر زنان خانہ میں سکئے تو ہم نے سانس لیا۔ مگر مجھے تنبیہ کر گئے کہ اب تم باورچی خانہ سے باہر قدم نہ رکھنا۔ سب چیزیں اپنی نگرانی میں پکواؤ اور ذرا دیکھو کہ کھانا میری ہدایات کے مطابق نہیں تیار ہو رہا تو فوراً خانساماں کو ڈانٹ دو۔ خیر وہ تو بیچارا خانساماں ہی بہت پرانا ملازم ہے اور کھانا اچھا پکاتا ہے، ورنہ معلوم نہیں ان کی ہدایات کا کیا کچھ نتیجہ نکلتا۔

چار بجے سے ہی آپ نے شوفر کو آوازیں دینی شروع کیں۔ میں نے کہا ابھی کہ ابھی بہت وقت ہے، کہا "اگر تم پر چھوڑ دوں تو خان بہادر کو پیدل آنا پڑے"۔ اگرچہ اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ پیدل کیسے؟ کیونکہ کرایہ کے تانگے تو بیشمار اسٹیشن پر موجود رہتے ہیں۔ مگر خیر شوفر ان کے مزاج کو خوب سمجھتا ہے۔ اس نے کہا "حضور موٹر نکال لی ہے، اسے جاتی دفعہ نرم کپڑے سے چمکا رہا ہوں، جب وہاں پہنچے گی تو بالکل نئی معلوم ہو گی۔ اس پر آپ بہت خوش ہوئے اور کہا "ہاں اچھی طرح چمکاؤ، خان بہادر کیا کہیں گے"۔ پھر خانساماں کی طلبی ہوئی۔ مالی کو ڈانٹ ڈپٹ کی کہ ابھی گلدانوں میں پھول نہیں رکھے گئے اور نہیں تو نرگس کے پھول تو رکھ ہی سکیں گے، فوراً پیدا کرو۔ اسی وقت پھول سجا کے لے آؤ۔ خانساماں آیا تو اس سے کھانے کی بابت استفسار ہوا، اس نے ہر طرح تسلی دینے کی کوشش کی۔ ایمان کو بالائے طاق رکھ کر انہیں یقین دلایا کہ سب کچھ ان کے حکم کے مطابق پکایا گیا ہے۔

گاڑی ساڑھے پانچ بجے پہنچتی تھی مگر آپ نے موٹر کو ساڑھے چار ہی گھر سے روانہ کر دیا ہوتا اگر میں نہ کہتا کہ وہاں گھنٹہ بھر جو کھڑی رہے گی تو گرد سے اٹ جائے گی اور دس برس کی پرانی گاڑی معلوم ہو گی۔ وقت پر بھیجئے تو یوں معلوم ہو گی جیسے کل خریدی گئی ہے"۔ کہا "اچھا"۔ میں نے کہا "جی"۔ کہنے لگے "تو پانچ بجے تو ضرور ہی روانہ ہو جائے"۔ میں نے شوفر کو جا کے سمجھا دیا۔ جب ساڑھے پانچ بج گئے تو کہنے لگے "کیوں بھئی ساڑھے پانچ تو ہو گئے ابھی تک کوئی آیا نہیں؟" میں نے کہا "مہمانوں کو سات بجے کا وقت دے رکھا ہے اور گاڑی ابھی اسٹیشن پر پہنچی ہو گی، یہاں کون اس وقت آ جائے"۔ مگر

یے جواب سے ان کی طبیعت خوش نہیں ہوا کرتی۔ اگر میں کہہ دیتا کہ واقعی کسی نہ کسی کو تو آجانا چاہئے تھا تو شاید انہیں تسلی ہو
تی۔ مگر آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ کچھ ایسا ہی آسان کام ہے کیونکہ اگر میں کہہ بھی دیتا کہ ہاں ساڑھے پانچ تو بج گئے اور ابھی تک
ی کا نشان تک نہیں، تو مجھے یقین ہے فوراً اُلٹ جاتے اور کہتے "وقت سے پہلے کون بیوقوف کہیں جاتا ہے، تمہارا تو دماغ
اب ہو گیا ہے"۔

انہیں باتوں میں پونے چھ بج گئے۔ بس اب تو ان کے لئے صبر ناممکن تھا۔ شوفر کو لگے گالیاں سنانے کہ موٹر ضرور فیل ہو گئی
دگی۔ میں اسے سارا دن کہتا رہا کہ موٹر ٹھیک کر، اسی لئے کہتا تھا نا کہ چار بجے ہی یہاں سے چلا جائے"۔ اگرچہ یہ نہیں انہوں
نے بتایا کہ چار بجے سے جانے سے وہ کیسے نہ بگڑتی۔ مگر ابھی وہ شروع ہی ہوئے تھے کہ ہمارے شہر کے تحصیلدار صاحب جو
ن کے بہت گہرے دوست ہیں تشریف لے آئے۔ انہیں ذرا پہلے بلا رکھا تھا۔ آپ نے بڑھ کے ان کا خیر مقدم کیا، اور
پھر ان کی مزاج پرسی کے بعد ان سے ڈرائیور کی شکایت لے بیٹھے اور کہا کہ دیکھو چھ بج رہے ہیں، نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں"
در پھر میری طرف دیکھ کے "دیکھو میاں تم فٹن تیار کرا کے لے جاؤ، ٹانگہ تو ان کے سامان کے لئے بھیج ہی دیا تھا ـــ ابھی
جاؤ، لو اب دیر نہ کرو۔ اُٹھو"۔ اگر تحصیلدار صاحب وہاں نہ ہوتے تو شاید مجھے جانا ہی پڑتا۔ مگر وہ سمجھدار آدمی ہیں۔ کہنے لگے،
"خانصاحب بگھی تیار کرنے میں بھی تو کافی وقت لگے گا اور اگر موٹر فیل بھی ہو جاتی تو وہاں ٹانگے تھوڑے ہیں، اور پھر ابھی وقت
بھی کوئی ایسا نہیں ہوا، اسٹیشن بھی تو یہاں سے دو میل ہو گا"۔ اس پر میں نے بھی کہا "شاید گاڑی ہی دیر میں آئی ہو"۔ مگر
ماموں جان کا اضطراب بڑھتا ہی گیا۔

جب چھ بج کے بھی پانچ منٹ ہو گئے اور کوئی نہ آیا، نہ موٹر نہ خان بہادر، تو میری طرف اس غصے میں دیکھا ہے کہ توبہ
ہے میری! گویا خان بہادر چودھری علی نواز خان کے نہ آنے کا سبب میں ہی ہوں۔ ابھی تحصیلدار صاحب انہیں تسلی ہی دے رہے
تھے کہ موٹر واپس آ گئی اور ڈرائیور نے اطلاع دی کہ خان بہادر صاحب تشریف نہیں لائے۔ اس پر ماموں جان کا غصہ دیکھنے کے
قابل تھا۔ اس بات پہ اور بھی کہ شہر کے مجسٹریٹ جن کی صوبیدار صاحب بہت عزت کرتے ہیں اور کئی ایک معزز اشخاص کو مدعو
کر رکھا تھا۔ تحصیلدار صاحب نے کہا کہ "شاید ٹرین نہ مل سکی ہو گی"۔ بلکہ میں نے تو یہ بھی کہا کہ بیمار ہو گئے ہوں گے۔ مگر وہ دم بدم
غصہ سے لال پیلے ہو رہے تھے، جب ہم کہتے کہ کوئی خاص وجہ ہو گی جو نہ آ سکے ہوں گے تو اور چڑتے۔ ابھی ہم اُن کا غصہ
فرو کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے کہ تار والا تار لے کے آیا۔ میں نے کہا "لیجئے تار آ گیا"۔ تحصیلدار صاحب نے کہا "واقعی
اتنے بڑے آدمی ہیں کوئی معقول وجہ ہی ہو گی جو نہ آ سکے ہوں گے"۔ تار کو کھولا یہ مضمون تھا "افسوس ہے ضروری کام پڑ گیا پھر
کبھی سہی"۔ تار پڑھتے ہی آگ بگولا ہو گئے، کہنے لگے "اس خبیث نے سمجھا ہی کیا ہے! نواب زادہ کہیں کا! کام پڑ گیا ہے!

رائی کین کے سالے کو! پھر کبھی سہی! کمینہ! چودھری بنا پھرتا ہے! میں جانتا ہوں اس کی حقیقت کو! خان بہادر! ہونہہ! ساری عمر سرکار کے سامنے ناک رگڑتا رہا ہے، خان بہادر ہو گیا تو کہاں سے خدا ہو گیا ہے! اب اسے کام پڑ جاتے ہیں!" جب میں نے اور تحصیلدار صاحب نے انہیں تحمل کرنے کو کہا تو اور چراغ پا ہوئے۔ کہنے لگے "تمہارے لئے تو آسان ہے کہنا، ناک مہمانوں کے سامنے میری کٹ جائے گی، لوگ کیا کہیں گے؟" ہم نے سمجھایا کہ تار تو آ ہی چکا ہے، لوگ خود سمجھ جائیں گے کہ کوئی ایسا ہی کام ہوگا، ورنہ خط جو لکھ دیا تھا کہ ضرور آئیں گے۔ خط کا یاد دلانا گویا آگ پر تیل ڈال دینا تھا، وہ بپھرے کہ الاماں! فرمایا "حرامزادہ! اگر آنا نہیں تھا تو خط کیوں لکھا تھا۔ معلوم نہیں سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو، کبھی لکھتا ہے آؤں گا، اور کبھی نہیں! جیسے مجھے اس کے بلانے میں کوئی انعام ملنا تھا۔ بدذات! ڈپٹی کمشنر بنتا ہے! اچھے مہینے پنشن ملنے سے پہلے کہیں ڈپٹی کمشنر لگ گیا، اپنے آپ کو لاٹ ہی سمجھنے لگا ہے۔ کوئی یہ پوچھے تم ہو کون؟ تمہارا باپ کون تھا؟ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ اکڑتا تو ایسے ہے جیسے میں نے اس کی لڑکی کا رشتہ مانگا تھا۔ کمینہ! بدمعاش! کُتا!"

اُوہ! اتنا بگڑے کہ کیا بتاؤں! جیسے ہی میں اور تحصیلدار صاحب کچھ کہنے وہ ایسے چنگھاڑتے کہ ہم خاموش ہو جاتے۔ اب اس کے آدھ گھنٹہ بعد جو دعوت کا لطف آ سکتا ہے اس کا آپ ہی اندازہ لگائیں!

مہمانوں کے رخصت ہونے پر خان بہادر کی اور اُن کے خاندان کی اور اُن کے ہر ملنے والے کی زندگی پر جن اُبلتے ہوئے الفاظ میں اُنہوں نے روشنی ڈالی ہے، وہ میں کوشش بھی کروں تو ادا نہیں کر سکتا۔

یہ تھی وہ مشہور دعوت جس کا نام ماموں جان کی موجودگی میں بھولے سے بھی کوئی نہیں لیتا!

سیّد فیاض محمود

[illegible]

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اقبال

تاریخ وفات ڈاکٹر سر اقبال مرحوم

وَالْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ

۱۳۵۷ھ

مرثیہ ڈاکٹر سر اقبال مرحوم

کچھ نہیں دہر جز فریبِ نظر — اِک طلسمِ فنا ہے سرتاسر
اس جہاں میں وجودِ انسانی — ہے سرِ راہ بادِ شمعِ سحر
فرصتِ عمرِ دہرِ فانی میں — طپشِ برق ہے کہ تابِ شرر
نفسِ چند ہے قیام اس میں — ہے یہ دنیا سرائے راہگذر
تار و پودِ حیاتِ انسانی — رگِ گُل سے سوا ہے نازک تر

اُستواری نہیں ثبات نہیں
خاک دُنیا کی کائنات نہیں

جی لگے خاک تیرہ زنداں میں — کہ نہیں شمع بزمِ دوراں میں
کوسِ رحلت ہے بانگِ خندۂ گُل — سب مسافر ہیں اِس گلستاں میں
روئیں اب عمرِ جاوداں کو خضر — مِل گیا زہر آبِ حیواں میں
کیوں عناصر میں اختلال ہے آج — کیوں تغیّر ہے چار ارکاں میں
حرکت ہے زمین[1] میں پیدا — ہے سکوں دَورِ چرخِ گرداں میں

کیا زمانہ میں انقلاب ہے آج

[1] بہ خیالِ قدیم زمین ساکن ہے۔

آب آتش ہے آتش آب ہے آج

چشمِ عبرت سے اے تماشائی
دیکھ نیرنگِ چرخِ مینائی

صبح ہوتے ہی ہو گئی نابود
شب کے تاروں کی جلوہ آرائی

تھی جو گلشن میں صبحِ فصلِ بہار
وہ کہاں ہے خزاں میں رعنائی

اب کہاں ہے وہ بزمِ جمشیدی
اب کہاں ہے وہ بادہ پیمائی

ہو گئی خاک میں مل کر
شانِ اسکندری و دارائی

آج "اقبال" کا بھی ماتم ہے

یہ نیا حادثہ نیا غم ہے

شاعرِ سحر کار تھا اقبال
آہ معجز نگار تھا اقبال

اس کے زیرِ نگیں تھا مُلکِ سخن
خسرو و تاجدار تھا اقبال

چمنستانِ حُسنِ معنی میں
اِک گُلِ نو بہار تھا اقبال

دورِ حاضر میں ملک و ملّت کا
سببِ افتخار تھا اقبال

سلطنت کیلئے بھی اِک حد تک
مایۂ اعتبار تھا اقبال

وادریغا کہ آں سخندان مُرد

فخرِ حسّان و رشکِ سحبان مُرد

کوئی بھی ایسا نکتہ داں نہ ہُوا
نغز گفتار و خوش بیاں نہ ہُوا

ایک عالم میں اس کی شہرت تھی
اُس کا شہرہ کہاں کہاں نہ ہُوا

کچھ خداداد تھا قبولِ سخن
کونسا شعر حرزِ جاں نہ ہُوا

تھی جُدا سب سے اس کی طرزِ بیاں کوئی بھی اُس کا ہم زباں نہ ہُوا
تھا وہ نازک خیال کچھ ایسا دِل پہ اُس کا سخن گراں نہ ہُوا
خاص حِصّہ تھا اُس کا رنگینی
شاعری اُس کی تھی کہ گُل چینی

تھا وہ اِک نقشِ بے مثال و نظیر مایۂ نازِ خامۂ تقدیر
صدر آرائے بزمِ حالی و داغ شہرت افزائے نامِ ذوق و نصیر
کلۂ افتخارِ ملّت و ملک طُرّۂ اعتبارِ تاج و سریر
فلسفہ اور پھر زبانِ غزل اور پھر یہ جزالتِ تحریر
شہد سے بھی زیادہ شیریں تھی اُس کی ہر بات اُس کی ہر تقریر
شاعرِ دَورِ انقلاب تھا وُہ
نقطۂ فردِ انتخاب تھا وُہ

جائے اُو در جوارِ رحمت باد مرقدش روضۂ ز جنّت باد
روزِ پرسش مغفرت بود ز خُدا بہرہ اش از نبی شفاعت باد
سایۂ رحمتِ خدائے کریم بر سرش تا دمِ قیامت باد
حرزِ جانہا کلامِ اُو بادا صیتِ نطقش بہر ولایت باد
از پیاسش فروغِ دین بادا شمعِ ایماں چراغِ تربت باد
اطہر این نوحہ و دُعا گفتم
آنچہ گفتم بصد بُکا گفتم

اطہر ہاپوڑی

بُرقع

افرادِ ڈراما

احسان — ایک نوجوان طالب علم
امجد — احسان کا دوست اور ہم جماعت
محسن — احسان کا بڑا بھائی عمر ۳۵ سال
ناصر علی — احسان اور محسن کا باپ
مریم — محسن کی بیوی
رحمت — ملازم لڑکا

منظر:- ایک آراستہ کمرہ۔ احسان ایک صوفے پر بڑے آرام سے لیٹا ہے۔ ٹانگیں آگے کو پھیلا رکھی ہیں۔ ہاتھ میں کوئی اُردو رسالہ پکڑے بڑی لَے سے اشعار پڑھ رہا ہے۔ کسی کے آنے کی آہٹ پا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ دائیں دروازے سے اُس کا بڑا بھائی محسن داخل ہوتا ہے۔ احسان اپنی ٹانگیں سمیٹ کر صوفے پر سیدھا ہو بیٹھتا ہے۔)

محسن۔ احسان ایک کام تو کرو؛

احسان۔ فرمائیے!

محسن۔ مریم کو اس کی چچی کے مکان پر پہنچا آؤ۔

احسان (رسالہ تپائی پر رکھتے ہوئے) ابھی؛

محسن۔ ہاں

احسان۔ بھابی تیار ہیں؛

محسن۔ ہاں بالکل۔ (واپس جاتا ہے۔ احسان اُٹھتا ہے اور تپائی پر سے رسالہ اُٹھا کر کھولتا ہے۔ ایک دو لمحے پڑھتا رہتا ہے۔ پھر "ترے خیال کی بپتا بیاں معاذ اللہ۔ کہ ایک بار بھلاؤں تو لاکھ بار آئے" گاتا ہوا سنگار میز کی طرف جاتا ہے۔ وہاں سے کنگھی اُٹھا کر اپنے گھنے بالوں کو درست کر رہا ہے کہ اتنے میں مریم اپنے بازو پر ریشم کا رنگین برقع ڈالے داخل ہوتی ہے۔)

مریم۔ چلو احسان — ابھی تیار نہیں ہوئے تم؟

احسان (کھونٹی پر سے کوٹ اُتارتا ہے) میرے تیار ہونے میں کیا دیر ہے۔ (کوٹ پہنتا ہے۔ مریم پہلے برقع کا نچلا حصہ پہنتی ہے پھر اوپر کا نقاب والا حصہ۔ ریشم کا نرم و رنگیں برقع کسی قدر تنگ تراشا جانے سے مریم کے فربہ بدن سے چمٹ جاتا ہے، مزید برآں اُس کا میانہ قد اُس کی ہیئت کذائی کو عجیب سا بنا دیتا ہے۔)

احسان۔ بھابی میں نے کئی بار کہا ہے میرے ساتھ چلتے وقت یہ برقع نہ پہنا کرو۔

مریم (اپنے آپ پر ایک جھلتی نظر ڈالتے ہوئے) کیا ہے اس برقع میں؛

احسان۔ میں کیا بتاؤں اس برقع میں کیا ہے! ایک ریشم کا دوسرے رنگدار اور پھر حیثیت بیلا ہوا۔ اس کی تراش تو دیکھو۔

مریم۔ ساری دُنیا ایسے بُرقع پہنتی ہے۔

احسان۔ اگر ساری دُنیا پہنتی ہے تو موٹر میں بیٹھتی ہے۔

تانگے میں پھرتی ہے، بازاروں میں یوں پیدل تو خاک
چھانتی نہیں پھرتی۔ اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو مہربانی
کرکے دوسرا برقع پہن آؤ۔ اس برقع میں ساتھ لے جانے
کے لئے میں ہرگز تیار نہیں۔

مریم۔ تمہارے بھائی جان کو تو اس برقع میں ساتھ لے جاتے
ہوئے آج تک عار نہیں آئی۔ تم آئے ہو بڑے کہیں کے۔۔۔

احسان۔ بھائی جان کی سمجھ پر تو مدت سے پردے پڑ چکے
ہیں، اُن کا تو ذکر ہی چھوڑو۔ انہیں عار آئے یا نہ آئے
مجھے اس سے غرض نہیں۔ (مریم کمرے سے باہر جاتی ہے
احسان صوفے پر بیٹھ کر رسالہ پڑھتا ہے۔ ایک دو لمحے اسٹیج
پر خاموشی رہتی ہے۔ مریم اور محسن داخل ہوتے ہیں)

محسن۔ احسان تم جاتے کیوں نہیں اِن کے ساتھ؟

احسان۔ بھائی جان کم از کم اس برقع کے ساتھ میں نہیں
جاسکتا۔ آپ خود ہی دیکھئے تو۔ مجھے بھابی کے ساتھ
جب اُنہوں نے یہ نیلا برقع پہن رکھا ہو بازار سے گزرتے
شرم آتی ہے۔ میں ہر دکاندار اور ہر راہ گیر کی نگاہ کا مرکز
نہیں بن سکتا۔ کوئی دوست کوئی واقف کار مل جاتا ہے،
اور کچھ نہیں تو تانگہ لے لیجئے۔ کوئی سادہ سا برقع ہو تو بات
بھی ہے۔ ایسا برقع پہن کر بازار میں گزرنا سراسر۔۔۔

محسن۔ کیا ہے اس برقع میں۔ ساری دُنیا پہنتی ہے۔

احسان۔ جی ہاں ساری دُنیا تو پہنتی ہے بھابی نے جو کہدیا
کیا آپ نے کوئی ایسا شریف آدمی دیکھا ہے جو بیوی کو
اس قسم کا جاذبِ نظر ریشم کا برقع پہنا کر سرِ عام پیدل
لئے پھرتا ہو؟

محسن۔ کیا ہوا احسان۔ آدمیوں کی آنکھیں تو نکلوائی نہیں جا
سکتیں۔ وہ کمبخت تو ہر صورت دیکھیں گے۔ جاؤ۔
جاؤ تکرار نہیں کیا کرتے۔

احسان۔ نہیں بھائی جان میں اس برقع کے ساتھ نہیں لے
جاسکتا۔ دوسرا سفید برقع پہن لیں۔

مریم۔ وہ تو دھوبی کو دے رکھا ہے۔

محسن۔ یہاں قریب ہی تو جانا ہے۔

احسان۔ چاہے قریب ہی جانا ہے، آخر بازار میں سے ہو
کر جانا ہے۔ رحمت کو بھیج دیجئے۔ آپ چلے جائیے۔

محسن۔ احسان تمہیں ابھی تک بات کرنے کا سلیقہ نہیں آیا
(مریم سے) جاؤ رحمت کو لے جاؤ۔

مریم۔ (آہستہ سے) وہ ننھی کو باہر لے گیا ہے۔

محسن۔ (کمرہ سے باہر نکلتے ہوئے غصہ سے) یہ ڈھیٹ تو بحث
کرنا جانتا ہے۔ کام نہ کاج کہیں کا بڑا عزت دار (مریم
بھی اُس کے پیچھے چلی جاتی ہے)

احسان۔ (بڑبڑاتا ہے) بات کرنے کا سلیقہ ۔۔۔ !!! اونہہ
ریشم کے رنگین برقع کے ساتھ ساتھ بازار میں سے
سینکڑوں کی نگاہوں کا مرکز بن کر گزروں۔ ہر قدم کی جنبش
سے ریشمی برقع پر لہریں اُٹھیں لگ میری طرف گھوریں
کوئی مُنہ پھٹ بکنے لگے، میں آنکھوں سے اندھا کانوں
سے بہرہ بے غیرت بے حیا چلتا جاؤں۔ کوئی دوست
ملے میں آنکھ بچالوں۔ کوئی بے تکلف پوچھے میں کہوں

میری بھابی ہے۔ بھائی جان کی بیگم صاحبہ! — مجھے بات کرنے کا سلیقہ نہیں؟ اُونہہ —! نیچے سے آواز آتی ہے — "احسان")

احسان۔ (کھڑکی میں سے نیچے دیکھ کر) کون ہے: امجد!! آجاؤ اُوپر (ایک کرسی کو راستہ میں سے ہٹاتا ہے

امجد بائیں دروازے سے مسکراتا ہوا داخل ہوتا ہے۔)

امجد۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) خوب ہوا آج۔ خلیل کے دوست بھی عجیب ہیں؟

احسان۔ کیا ہوا؟

امجد۔ پہلے یہ بتاؤ وہ رنگیلی لڑکیاں ابھی تک یہیں ہیں نا؟

احسان۔ کونسی؟

امجد۔ وہی جو اُس رات سینما گئی ہوئی تھیں، ریشم کے نیلے اور سیاہ بُرقع یاد نہیں۔ تم نے بتایا تھا نا کہ تمہارے پڑوس میں رہتی ہیں۔ بڑی رنگین مزاج ہیں۔

احسان۔ ہاں ہاں، شاید ابھی تک تو مکان نہیں بدلا، کیوں؟

امجد۔ میں اور خلیل تمہارے ہاں آرہے تھے۔ یہاں تمہاری گلی کے سرے پر خلیل کو کوئی دوست مل گیا۔ بہت بے تکلف معلوم ہوتا تھا۔ ہرچند کہا کہ تمہارے ہاں جانا ہے مگر اُس نے ایک نہ سُنی اور خلیل کو کھینچ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اِس سلسلہ میں ابھی تکرار ہو رہی تھی کہ ایک دوہرے بدن کی میانے سے قد کی عورت نیلے رنگ کا ریشمی بُرقع پہنے گلی سے باہر آتی دکھائی دی۔

خلیل نے اُسے دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ انہیں رنگیلی عورتوں میں سے ہے جو احسان کے ساتھ والے مکان میں رہتی ہیں۔ میں نے بھی اُس کی چال ڈھال اور تیز رنگ کے بُرقع سے یہی اندازہ لگایا۔ اتنے میں وہ عورت ہمارے قریب آگئی۔ جُونہی ہمارے پاس سے گزری خلیل کے دوست نے بے دھڑک کہا "اتنا حسین بُرقع اور پیدل۔ کہو تو موٹر پر لے چلوں"۔ ہم اُس کی اس دلیری پر بہت گھبرائے۔

احسان (اپنے چہرے پر سے گھبراہٹ کے آثار چھپاتے ہوئے) یہ سُن کر وہ عورت کچھ نہ بولی!

امجد۔ نہیں۔ اُس نے ایک نظر خلیل کے دوست کی طرف دیکھا اور بغیر بولے آگے چلی گئی۔ ہم نے اُس شخص سے کہا کہ اُسے یوں نہ کہنا چاہئے تھا۔ کیا پتہ کسی شریف گھرانے کی ہوتی، مگر وہ بات پر اڑا رہا کہ شریف گھرانے کی عورتیں ایسے جاذب نظر بُرقع پہن کر برسرِ عام تھوڑی پھرا کرتی ہیں۔ ان عورتوں کا تو مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ شوقین مزاج لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے، خلیل نے بھی کسی قدر میرا ساتھ دیا مگر وہ شخص چڑ گیا اور یہ کہہ کر کہ اچھا آپ کو آزمائش کر کے دکھاتا ہوں، اُسے کھینچ کر اسی عورت کے تعاقب میں چلا گیا

احسان۔ (کھویا سا جاتا ہے) "چلا گیا؟؟! پھر —"

امجد۔ پھر کیا — میں تو یہاں آگیا ہوں مجھے کیا پتہ۔

احسان (گھبرا کر) بڑا بیہودہ مذاق ہے۔

امجد۔ (مسکرا کر) یوں کہو بڑا بیہودہ تھا وہ بُرقع جس نے
اُس شخص کو یہ کہنے کی جرأت دلائی ورنہ کسی کی مجال ہے
کہ بُرقع پوش عورت کو کچھ کہہ سکے۔
احسان۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں یہ بھی ٹھیک ہے سارا
قصور برقع کا تھا مگر ۔۔۔
امجد۔ تم گھبرا کیوں گئے ہو۔ تمہاری بلا سے۔ اپنی پڑوسنوں
سے اتنی ہمدردی کا آخر مطلب کیا؟ (خفیف سا قہقہہ)
خدا جانے لاہور میں ہر روز ایسے کتنے واقعات ہوتے
ہیں ۔ ہیں کیا؟
احسان۔ یہ تو ٹھیک ہے، مگر پردہ کے متعلق تمہارا کیا
خیال ہے؟
امجد۔ پردہ بجائے خود اچھی چیز ہے مگر یہ پردہ چھپ
چھپ کر دیکھنا اور دیکھ دیکھ کر چھپنا جس سے ہم آئے
دن دوچار ہوتے ہیں، فوراً ترک کر دینے کے قابل ہے۔
احسان۔ میرے خیال میں بُرقع بجائے خود ایک مذاق ہے
اور اب وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے جب لوگوں کی نگاہیں
برقع کی قدر کرتی تھیں اور وہ ایک برقع پوش عورت کی طرف
نگاہ اُٹھانا معیوب سمجھتے تھے۔
امجد۔ اِس میں کیا شک ہے۔ تم یہ سُن کر حیران ہو گے کہ ہمارے
قرابت داروں میں چند عورتوں نے مختلف رنگوں
کے چار پانچ بُرقع سلوا رکھے ہیں اور وہ شادی بیاہ
کے موقعوں پر اُنہیں اُسی طرح بدل بدل کر پہنتی ہیں،
جس طرح عام پہننے والے کپڑوں کے مختلف جوڑے
پہنے جاتے ہیں۔
احسان۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ برقع کا پردہ بھی فیشن سے محفوظ
نہیں رہا اور یہی وجہ ہے کہ اُس کا صحیح مقصد فوت ہو
رہا ہے۔
امجد۔ وہ زمانہ اب ختم ہو چکا ہے جب برقع صحیح معنوں میں
برقع تھا۔ اب اگر کوئی عورت صاف ستھرا بُرقع اور
اور کوئی اچھا سا جوتا پہن کر بازار میں نکلے تو بیسیوں کیا
سینکڑوں لوگ پہلے پاؤں سے سر تک پھر سر سے
پاؤں تک جا پہنچتے ہیں اور اگر تنہا ہو تو خدا ہی حافظ۔
احسان۔ اور اگر برقع ہو رنگین یا ریشم کا تو لوگ بخدا ایسے
دیکھتے ہیں کہ کھا جائیں گے۔ ہمارے بڑے نہیں
سمجھتے کہ اب زمانے کی روش اور ذہنیت ایک خطرناک
صورت اختیار کر چکی ہے ۔ ۔ ۔
امجد۔ بالکل ۔۔۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ موجودہ لوگ وہی لوگ ہیں جو
آج سے بیس برس پہلے تھے۔
(دائیں دروازہ سے رحمت داخل ہوتا ہے)
رحمت۔ بڑے میاں جی آ گئے۔
احسان۔ ابا جان؟
رحمت۔ جی ہاں۔
احسان۔ انہیں تو آج شام کو آنا تھا۔ اچھا جاؤ۔
(رحمت جاتا ہے)
امجد۔ بھئی میں بھی چلتا ہوں
احسان۔ وہ کیوں؟

امجد۔ تمہیں والد صاحب سے ملنا ہوگا (اُٹھتے ہوئے) پھر
ملیں گے۔ آج شام لارنس گارڈن آنا گے؛
احسان۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔
(دونوں بائیں دروازہ سے نیچے اُتر جاتے ہیں۔ اسٹیج
پر ایک لمحہ خاموشی۔ محسن اور ایک اُدھیڑ عمر کا شخص بائیں
دروازہ سے داخل ہوتے ہیں۔ پیچھے پیچھے رحمت آتا ہے)
ناصر علی۔ یہاں تو نہیں؛
محسن۔ یہیں تھا
رحمت۔ اُن کا کوئی دوست آیا تھا، اُن کے ساتھ چلے
گئے ہیں شاید۔
محسن۔ (ایک کُرسی پر سے کتاب اُٹھا کر) آپ بیٹھئے
آجاتا ہے ابھی۔
ناصر علی۔ کچھ پڑھتا پڑھاتا بھی ہے یا دوستوں کے ساتھ
ہی پھرتا رہتا ہے؛
محسن۔ پڑھتا ہے۔ آرام طلب بہت ہے، گستاخ ہے جو
مُنہ میں آتا ہے کہہ دیتا ہے۔
ناصر علی۔ بہت لڑکے ہوسٹلوں میں رہنے سے آرام طلب
ہو جاتے ہیں۔ (احسان بائیں دروازہ سے داخل ہوتا ہے
اپنے باپ کو مُؤدبانہ سلام کر کے ایک کُرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
بھئی کہاں تھے تم؛
احسان۔ ایک دوست کے ساتھ نیچے تک گیا تھا۔
ناصر علی۔ ہم جماعت تھا کوئی؛
احسان۔ جی ہاں!

ناصر علی۔ (محسن کی طرف دیکھ کر) مریم کہاں ہے؛
محسن۔ اپنی بھابی کے ہاں گئی ہے (رحمت سے) جاؤ بُلا
لاؤ۔ جلدی آنا۔ (رحمت جاتا ہے)
احسان۔ (والد سے) آپ کو تو آج شام آنا تھا۔
ناصر علی۔ ہاں۔ رحمان اپنی کار میں آ رہا تھا۔ میں بھی اُس
کے ساتھ ہی آ گیا۔
احسان۔ اُس کے کاروبار کا اب کیا حال ہے؛
ناصر علی۔ اچھا ہے۔ اب تو خوب کما رہا ہے۔ (دائیں
دروازہ سے مریم داخل ہوتی ہے۔ ناصر علی کو سلام
کرتی ہے)
محسن۔ تمہیں تو ابھی رحمت لینے گیا تھا۔
مریم۔ مجھے ابھی زینہ میں ملا ہے۔ میں نے میاں جی کو دیکھ
لیا تھا۔ ہم اوپر بیٹھک میں تھے جب ان کی کار کو چوک
میں رُکنا پڑا۔ میری نظر اتفاق سے ہی پڑ گئی۔
ناصر علی۔ ہاں بہت بھیڑ تھی وہاں۔ تم اکیلی آئی ہو کیا؛
مریم۔ جی نہیں۔ رمضانی پہنچا کر گیا ہے (احسان سے
تم نہ گئے تو میں کیا پہنچ نہ سکی؛
احسان۔ (اس ناگہانی غیر متوقع حملہ سے گھبرا سا جاتا ہے
اُس کے چہرہ پر غصہ کے آثار پیدا ہوتے ہیں اور الفاظ
اُس کے مُنہ سے غیر ارادی طور پر نکلتے ہیں) اچھا تم
پہنچ گئیں تو۔ پھر کسی کو ساتھ لے جانے کی ضرورت
کیا ہے۔ بس بُرقع اُٹھایا اور چل دیں۔
ناصر علی۔ ہیں بات کیا ہے؛

محسن ۔ کچھ بھی نہیں ۔ یونہی جھگڑتے ہیں ۔ مریم احسان سے کہتی تھی مجھے چچی کے مکان تک پہنچا آؤ ۔ یہ نہ گیا ۔ وہ اکیلی چلی گئی ۔

ناصر علی ۔ یہ بُری بات ہے احسان ۔ گھر کی عورتوں کو بازار میں اکیلے نہیں جانا چاہیے ۔ تم کیوں نہ گئے ؟

احسان ۔ (پیچ و تاب کھاتا ہے ۔ ماتھے پر تیوری ہے ۔) میں کیا بتاؤں اباجان ، بھائی جان یا بھابی سے پوچھیے میرے نہ جانے کی وجہ کیا تھی ۔ وہ کیوں نہیں بتاتے ؟

ناصر علی ۔ یہ بُری بات ہے احسان ۔ تمہاری آرام طلبی اور گستاخی کی شکایت ہوتی ہے ۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے ۔

(رحمت داخل ہوتا ہے)

رحمت ۔ چائے تیار ہے جناب ۔

محسن ۔ اچھا چلو (سب اُٹھتے ہیں ۔ احسان بیٹھا رہتا ہے)

ناصر علی ۔ (دروازہ کے قریب جا کر) آؤ احسان

احسان ۔ (اُٹھتے ہوئے) آپ چلیے میں ابھی آیا ۔ (سب چلے جاتے ہیں ۔ احسان مُنہ بسُورے کُرسی پر بیٹھا رہتا ہے ۔ اور آہستہ آہستہ کہتا ہے) میری آرام طلبی اور گستاخی کی شکایت ہوتی ہے ۔ میں آرام طلب ہوں میں گُستاخ ہوں ۔ اُونہہ ۔۔۔ !!! کیوں کہا کہ میں نہیں جاتا ۔ برقع کا فساد ۔ تم نہ گئے تو میں کیا پہنچ نہ سکی (نچلے لب کو دانتوں تلے دبالیتا ہے ، کچھ سوچتا ہے) اونہہ ۔۔۔۔ عورت ۔۔۔۔ سگ باش برادرِ خُرد ۔ ۔

(رحمت داخل ہوتا ہے)

رحمت ۔ میاں جی بُلاتے ہیں ، چائے پی لیجیے ۔

احسان ۔ (غصہ میں) چلا جا یہاں سے ۔ چائے چاٹے کی بکواس ۔ میں نہیں پیونگا (مُنہ ایک طرف کرکے آہستہ سے) چائے کا بچہ ۔ خبیث (رحمت چلا جاتا ہے ۔ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ۔ چائے پی لو ۔ زہر ہی لو

(باہر دُور سے ناصر علی کی آواز آتی ہے) " احسان ! "

احسان (آہستہ سے) میں نہیں پیوں گا چائے ۔ ۔ ۔ ۔

(ناصر علی کی پھر آواز آتی ہے ۔) " احسان "

احسان (آواز دیتا ہے) آیا جی ۔

(چہرے پر غصہ ہے ۔ جاتا ہے ۔ دروازہ کا کواڑ زور سے بند کرتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

آغا بابر بٹالوی
بی ۔ اے (آنرز)

محفلِ ادب

اقبال کی تعلیم

(از جناب ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب ایم۔ اے ڈی فل (آکسن) صدر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے فرمایا کہ یہ کوئی مقالہ نہیں خراجِ عقیدت ہے جو میں اقبال کی جناب میں اس موقع پر پیش کرتا ہوں)

ستر اسی برس ہوئے ہندوستان کی اسلامی فضا میں ایک آواز گونجی جس سے زمین اور آسمان بھر گئے۔ اس آواز کا منبع علی گڑھ تھا۔ سرسید نے اس زور شور کے ساتھ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا کہ در و دیوار گونج اُٹھے اور عالمِ اسلام میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔

مسلمانوں کے ماضی و حال کو دیکھ دیکھ کر سرسید کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہتے تھے اور اُن کے استقبال پر نظر کرکے سرسید کے زبان اور قلم تنبہ اور تنبیہ، تدبّر اور تدبیر کا تلاطم پیدا کر رہے تھے۔

پہلا شخص جس نے سرسید کا پیغام شعر کے سانچہ میں ڈھالا وہ حالی تھا۔ حالی نے مسلمانوں کے ماضی و حال کا ایسا نقشہ کھینچا اور ایسے دردِ دل کے ساتھ اس داستان کو بیان کیا کہ شعر کی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے۔ دوست دشمن سب نے گردن ڈال دی اور حالی اسلام کا سب سے بڑا قومی شاعر مان لیا گیا۔

لیکن سرسید کا پیغام ابھی اجمالی تھا۔ اُنہوں نے قوم کو اس قابل بنایا کہ اپنی حالت کو سمجھے اور حالات کو سمجھے اور پھر یہ بھی سمجھے کہ اس کا مستقبل کیا ہونا چاہئے۔ اس مستقبل کی تفصیل ابھی باقی تھی۔

وہ شخص جس نے اس اجمال کی تفصیل کی جس نے ماضی سے استقبال کی طرف نگاہ کو پھیرا، وہ **اقبال** ہے۔ اقبال نے اس جوش و خروش اور اس ولولہ اور اُمنگ کے ساتھ زبانِ شعر و ادب میں اس مضمون کو ادا کیا کہ یہ اُس کا حصّہ ہوگیا۔ حالی ہمارے حال کا شاعر تھا اقبال ہمارے استقبال کا شاعر ہے۔

ہندوؤں، بدھوں اور عیسائیوں کی تعلیم یعنی نفیِ خودی مسلمانوں میں پھیل گئی تھی۔ تصوّف دانوں نے اُن کے ہاتھ پیر شل کر دیئے تھے۔ نفیِ خودی کی بدولت وہ انفرادی خودی میں سکڑ کر رہ گئے تھے۔ اقبال نے بتایا کہ سرِ حیات نفیِ خودی میں

نہیں بلکہ خودی میں مضمر ہے۔ یہ کائنات خودی کا مظہر ہے۔ خودی پیدا کر۔ یہی خودی ہے جو تجھے ایک اعلیٰ تر خودی یعنی بےخودی میں لے جائے گی اور تو انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت میں آ جائے گا۔

یہ تمام مقامات اقبال نے خود طے کئے۔ وہ آغاز شعر میں نفی خودی اور وحدتِ وجود میں مبتلا تھا۔ پھر اُس پر خودی اور وحدتِ وجود کا بھید کھلتا ہے۔ اور آخر میں وہ بےخودی پر منتہی ہو جاتا ہے۔

اقبال کی عظمت کا یہ ثبوت ہے کہ وہ جس جس مقام سے گزرتا ہے ایک عالم کے عالم کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ جب وہ نفی خودی کا راگ گا رہا تھا لوگ اُسے الاپ رہے تھے۔ جب اُس نے خودی کا ڈنکا بجایا ہر ساز سے یہی آواز آنے لگی۔ اب جب کہ اُس نے بےخودی یعنی للٰہیت اور قوم پرستی کا آوازہ بلند کیا سب اُسی میں آواز مِلا رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کا تمدن اور اُن کی سیاسیات بدرجۂ غایت اقبال کے شرمندۂ احسان ہیں۔

مسلمان ایک گم کردہ راہ قافلہ کی طرح سیاسیات کے لق و دق بیابان میں بھٹکتے پھر رہے تھے مگر اس فلسفۂ حیات اور اسلامیات کے مبصر نے اُن کے لئے ایک مطمح پیدا کر دیا۔ جس کے صائب ہونے کو لوگ نہایت سُرعت کے ساتھ مانتے جا رہے ہیں۔ قوت آ رہی ہے اس کا جھنڈا عنقریب بلند ہو جائے گا۔

اقبال کہتا ہے کہ ع من نوائے شاعرِ فردا ستم۔ لیکن یہ ایک صدائے بازگشت ہے۔ اے اقبال! تیری صدائے عالم اسلام کے دل و دماغ بھر گئے ہیں۔ وہ تیری ہی تعلیم کی طرف جا رہے ہیں۔ تو شاعرِ فردا ہی نہیں، تو شاعرِ امروز بھی ہے۔ اور تیرا اثر اتنا بڑا ہے کہ شاید ہی کسی اور شاعر کا کبھی ہؤا ہو۔ تو قومی شاعر ہی نہیں تو شاعرِ عہد ہے۔ یہ عہد تیرا عہد ہے۔ عہدِ اقبال ہے۔ کون شاعر تجھ سے پہلے یا تیرے زمانہ میں، ہندوستان یا ایران و خراسان بلکہ عربیہ و فرنگستان میں ایسا ہؤا ہے جس کا تتبع اس درجہ کیا گیا ہو، جس کی آواز میں اس طرح آواز مِلائی گئی ہو۔ آج جو شخص بھی شعر کہتا ہے، وہ اقبال کے رنگ میں کہتا ہے، جو مضامین بھی وہ بیان کرتا ہے اقبال کے مضامین ہوتے ہیں۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بحریں بھی اقبال ہی کی ہوتی ہیں اور شعر سُنانے کا طریقہ بھی اقبال ہی کا طریقۂ ترنم ہوتا ہے۔ ہاں یہ باوجود اس کے کہ ترنم کی کم نوائی شوکتِ مضمون کی متحمل نہیں!

زمانہ پر فرنگ چھا گیا تھا، اُس کا سیلِ بے پایاں ایسا چڑھا تھا کہ عالمِ اسلام بھی اُس میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔ اے اقبال! تو نے اپنی معنی خیز اور سوز انگیز آواز سے ایک سدِ سکندری کھڑی کی اور اسے بتا دیا کہ ؎

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اُٹھا، یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اسلام اور ادبِ اسلامی ہمیشہ تیرا مرہونِ منت رہے گا۔ اسلام کو حق ہے کہ تجھ پر فخر کرے اور ہندوستان کا فرض ہے کہ تجھ جیسے فرزند پر نازاں ہو + ہم دُعا کرتے ہیں کہ تیرا کلام ہمیشہ قوم کے دِل کو گرماتا رہے۔ اور اُسے عُروج و اقبال کے آسمان تک پہنچائے تاکہ تیری دلی تمنا پوری ہو اور تو قوم کا اقبال بن کر دیر تک باقی اور صحت و سلامتی کے ساتھ اس کا رہنما رہے!

اقبال نمبر
علی گڑھ میگزین اپریل ۱۹۳۸ء

اقبال کا نظریۂ فنون

آرٹ کے متعلق جس میں شاعری شامل ہے علامہ اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی انسانی عمل کا منتہائے مقصود ہے اور اس کو شاندار اور باوقار بنانے کے لئے انسان ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ تمام آرٹ کو اس مقصد کے تابع فرماں رکھا جائے۔ افضل و اعلیٰ آرٹ وہ ہے جو ہماری خفتہ طاقتوں کو بیدار کر کے ہمیں زندگی کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے قابل بناتا ہے۔ وہ علوم و فنون جو ہمیں تعلیم عمل دینے اور ہماری قوتوں کو بیدار کرنے کے بجائے ہم پر غفلت و بیہوشی طاری کر دیں ہمارے لئے موت کا حکم رکھتے ہیں۔" آرٹ کا فرض یہ ہے کہ ہمارے اندر بیداری کی رُوح پھونکے۔ نہ کہ ہم پر حالتِ سُکر طاری کرے۔ فنونِ لطیفہ کی تعریف اُنہوں نے خود یوں کی ہے:۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصودِ ہُنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا!

اقبال کی شاعری کو معجزے کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔

اقبال نمبر
علی گڑھ میگزین اپریل ۱۹۳۸ء

دی اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری

مؤلفہ

انجمن ترقی اُردو (ہند)

جس قدر اُردو ڈکشنریاں اب تک شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے، چند خصوصیات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ یہ بالکل جدید ترین لغت ہے، انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں۔

۲۔ اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے اسی طرح ان قدیم و متروک الفاظ کے معنی بھی درج کئے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں۔

۳۔ ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں اور امتیاز کے لئے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دے دیا ہے۔

۴۔ ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور ان کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا اُن کی وضاحت مثالیں دے کر کر دی گئی ہے۔

۵۔ اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کیلئے ایسا اُردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے اور اس غرض کیلئے تمام اُردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے، یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی۔

۶۔ ان صورتوں میں جہاں موجودہ اُردو زبان کا ذخیرہ انگریزی مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ جمع کئے گئے ہیں جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں۔

۷۔ اس لغت کے لئے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا ہے جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے طباعت کیلئے اُردو اور انگریزی بہود خوبصورت ٹائپ استعمال کئے گئے ہیں۔ جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے۔

ڈِمائی سائز، صفحات (۱۵۱۲ + ۳۲) قیمت سولہ روپے [illegible]

ملنے کا پتہ

دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند) اورنگ آباد دکن

کمزور بچوں کی طاقت کیلئے
بچوں کو
ڈونگرے کا بال امرت
دینا چاہیئے
ملنے کا پتہ :- ہر بڑے دوا فروش کے ہاں بکتا ہے

تمام امراض معدہ کے لئے مفید ہے
ملنے کا پتہ:۔ حمیدیہ فارمیسی رجسٹرڈ لاہور
مضامین فلک پیما
ہم مسرت سے اعلان کرتے ہیں
المشتہر

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱؎ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؎ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

The Title Page and Picture Printed at Half-Tone Press,
Dev Samaj Road, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔اے

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ اگست ۱۹۳۸ء

تصویر:- قبضۂ مخالفانہ

چندہ سالانہ صہ — ششماہی سے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

"ہندو مسلم اتحاد کا انحصار محض اُردو کی بقا پر ہے!"

یہ ہے سرتیج بہادر سپرو کا سنہری قول۔ ایک انصاف پسند صاحبِ نظر ہندوستانی کی زبان سے ہمیں ایسی ہی دل ملانے والی باتیں سننے کی اُمید ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اس فرقہ وار جھگڑوں کے تاریک زمانے میں اپنی مشعل بلند رکھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ سچائی کا تقاضا یہی ہے۔

سرتیج بہادر نے انجمن بہارِ ادب لکھنؤ کے جلسے میں اَور بھی بڑے پتے کی باتیں کہیں کہ "اُردو دراصل ہندو اور مسلمانوں دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے، اُردو زبان کا بڑا کام یہ رہا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن کے سمجھنے اور اختیار کرنے میں سہولت ہوتا کہ باہمی یک جہتی اور ہم آہنگی قائم ہو سکے۔"

یہ تو ہے بقول مولوی عبدالحق صاحب کے ایک "حقیقت شناس" کا قول۔ اب اس کے مقابلے میں بعض اور بڑے بڑے آدمیوں کے عمل دیکھئے۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ وہ کانگرس جسے ملک کی واحد سیاسی انجمن ہونے کا دعوےٰ ہے وہ کانگرس جس نے واقعی اس بدبخت ملک کے لئے آزادی کے بارے میں سب سے زیادہ مفید کام کیا ہے وہ کانگرس جو اپنے کراچی کے اور بعد کے ریزولیوشنوں میں ہندوستانی کو ملکی زبان تسلیم کر چکی ہے جو اُردو اور ہندی کے بارے میں انصاف کی ترازو تھامے رکھنے کی مدعی ہے جو اُردو اور ناگری دونوں خطوں کے متعلق غیر جانبداری کا اعلان کر چکی ہے دونوں کو قومی خط بھی تسلیم کر چکی ہے دیکھئے اُسی قومی اور قوم پرست اور قومیت پرور کانگرس کا قول کیا ہے اور عمل کیا ہے؛ مولانا ابوالکلام آزاد مسٹر جناح کی فرقہ پرستی پر قومیت کے تیر برساتے ہوئے اُن کی اس شکایت کو کہ کانگرس ہندی کا پروپیگنڈا کر رہی ہے جہالت کا اظہار پکارتے ہیں لیکن مولانا کا تجاہلِ عارفانہ ملاحظہ ہو کہ محض کانگرسی قراردادوں کا لیبل سنبھالے واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کئے اُردو کی حمایت کرنے والوں کو بُرا بھلا کہے جاتے ہیں۔ اِسے کہتے ہیں **جماعت بندی!**

قراردادوں اور اعلانوں کا بلند آواز سے شکریہ ادا کرنے کے بعد آیئے ہم دیکھیں کہ غریب اُردو پر اِن قوم پرستوں کے ہاتھوں کیا گذر رہی ہے؛ اور چونکہ ممکن ہے کہ ہمیں فرقہ پرست اور کوتاہ بیں سمجھا جائے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم بعض انصاف پسند قوم پرستوں ہی کے قدموں میں جا بیٹھیں اور اُن کی زبانی سُنیں کہ وہ کیا فرماتے ہیں:

اِس وقت اُردو کے تین مؤقر رسالے میرے سامنے پڑے ہیں۔ "اُردو" بابت اپریل ۱۹۳۸ء جس کے محترم ایڈیٹر کو سب اصحاب

متفقہ طور پر ایک غیر سیاسی انصاف پسند خادمِ زبان جانتے ہیں۔ "ایشیا" بابت جنوری فروری مارچ ۳۸ء جس کے دلکش شخصیت رکھنے والے مدیر کو کانگرس سے محبت اور بھارت ماتا سے سچا عشق ہے۔ "نگار" بابت جون ۳۸ء جس کے فاضل مدیر ہمیشہ سے مسلم لیگ کے مخالفین کے حلقے میں شریک رہے ہیں۔ ذرا سنیئے یہ تینوں فاضل ادیب جنہیں اسلامی فرقہ پرستی سے ذرا واسطہ بھی نہیں کانگرسی انصاف پسندی کی کیسی تصویر کھینچتے ہیں۔ ذیل میں مدیرِ اردو نے بمبئی میں کانگرسی وزیر اعظم کی توجہ حکومت کے اس اعلان کی طرف منعطف کرائی کہ بمبئی میں ہندی کی اشاعت و ترقی کے لئے ایک رقم مخصوص کر دی گئی ہے۔ جواب ملا کہ ہم سے غلطی ہوئی ہماری مراد ہندوستانی تھی۔ اس پر مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہے کہ یہ غلطی اکثر کانگرسی حکومتوں اور ان کے وزراء سے ہوتی ہے۔ اور افسوس ہے کہ مجھے کانگرس کی حکومتوں اور کانگرس کے وزراء کو یہ بتانا پڑتا ہے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اس کی اصلاح کر دی جائے گی اور جو آپ کا منشا ہے وہ مجھے لکھ دیجئے تاکہ اس پر عمل درآمد کیا جائے"۔ لیکن مولوی صاحب کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی"۔ جب انہوں نے اس کے بعد ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۱ اپریل ۳۸ء میں انہیں وزیر صاحب کی تقریر پڑھی کہ "سب نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ مشترک زبان ہندی ہونی چاہئے"۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں "یا تو یہ لوگ ہندی ہندوستانی کا فرق نہیں سمجھتے یا کسی نہ کسی طرح سے ہندی کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔ اوّل ہندی کہتے ہیں جب اعتراض ہوتا ہے تو ہندی یا ہندوستانی کہہ کر خاموش کر دیتے ہیں"۔ "بہت دنوں کے غور کے بعد" ایک "راز کھلا اور وہ یہ ہے کہ کانگرس سے بھی بالا اور اعلےٰ ایک ہستی ہے جس کے ایک اشارے ایک لفظ کے سامنے کانگرس کے تمام ریزولیوشن اس کا دستور اور اس کے ضوابط اور قواعد سب ہیچ ہیں۔ گاندھی جی نے چونکہ ملک بھر میں ہندی کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے اس لئے کانگرس کا ہر وزیر اور ہر رکن وہی کہتا ہے جو "مہاتما جی" کہتے ہیں۔ جو نیت امام کی وہی ان کی"۔ "اور لطف یہ ہے کہ گاندھی جی سیاسیات سے بالکل کنارہ کش ہو گئے ہیں اس لئے ان سے کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ آپ کانگرس کے رزولیوشن کی کیوں پابندی نہیں کرتے۔ باوجود اس کے کانگرس ان کی انگلیوں پر ناچتی ہے۔ اور پھر "لطف یہ ہے کہ ہندوستانی کا رزولیوشن جو کانگرس نے منظور کیا وہ حضرت (گاندھی جی) ہی کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، کانگرس والے تو ان کے منشا اور نیت کو دیکھتے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگرس کا نام بدل کر گاندھی کانگرس رکھ دیا جائے۔ کہیں تو قول و فعل میں مطابقت ہو۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی گاندھی جی مسٹر جناح سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس پر میر صاحب کا یہ مصرع یاد آتا ہے:

"دریا کا پھیر پایئے تیرا نہ پایئے"

"کانگرسی حکومتوں کے اکثر وزیر محض ایک بڑے شخص کی تقلید میں اندھوں کی طرح کام کر رہے ہیں"۔ "گاندھی جی کیا جانیں کہ ہندوستانی تہذیب کا ہندوستانی زبان سے کیا تعلق ہے۔ ہندوستانی زبان سے غفلت کرنا ہندوستانی تہذیب کا برباد کرنا اور ہندو مسلم اتحاد کی جڑ کاٹنی ہے"۔

"طرفہ بات یہ ہے کہ جناب سبھاش چندر بوس نے انڈین نیشنل کانگرس میں جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ ایسی مشکل ہندی میں تھا کہ

خود بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور ایک شخص پیچھے بیٹھا ہوا برابر لقمہ دیتا جارہا تھا۔ شاید اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ کانگرس والوں کے قول اور فعل میں بڑا بل ہے۔ یہیں ۲۰ فروری کو کانگرس ہی کے پنڈال میں راشٹر بھاشا (قومی زبان) کا اجلاس ہوا۔ یہ راشٹر بھاشا خدا کے فضل سے ہندی تھی!

ایشیا کے مدیر کانگرس کی جی کھول کر تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

"کانگرس زبان کے مسئلہ کے متعلق بارہا اپنا فیصلہ بیان کر چکی ہے اور جب ضرورت ہوتی ہے اس کا اعادہ بھی کرتی رہتی ہے لیکن کانگرس کے تمام لیڈر جس میں گاندھی جی بھی شریک ہیں ناگری رسم الخط اور خالصاً ہندی زبان کے مؤید ہیں۔" "اس حیثیت سے کہ صدر کانگرس جملہ اقوام ہند کی محبوب ترین متاع ہیں مسلمان یہ دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہری پورہ کانگرس میں جس زبان میں انہوں نے اپنا خطبۂ صدارت فرمایا کیا اس زبان کو ہندوستانی کہا جاسکتا ہے؟" "اس کے معنی کیا ہیں؟ کہ آپ رزولیوشنوں قراردادوں اور اجلاسوں میں بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اور آپ کا عمل سرتاسر آپ کے قول کے خلاف ہوتا ہے۔ کرتے آپ ہیں اور بھرنی ہم کو پڑتی ہے یعنی آپ کا طرزِ عمل اُن لوگوں کو مخالفین کے سامنے سرنگوں کر دیتا ہے جو آپ کے ساتھی اور ہندوستان کے فطرۃً دیوانے ہیں۔" "متحدہ قومیت کے بلند اور ارفع تصور کی پیداوار وہ زبان ہے جس کو اردو (یا ہندوستانی) کہتے ہیں۔ یہ زبان ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے میل جول اور ربط و اتحاد سے بنی۔ مسلمان قوم کی ہند پرستی کا اندازہ اس تاریخی حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ مسلم بادشاہوں نے فارسی اور ترکی کو اس زبان کی خاطر ترک کر دیا جو ہندوستان کی خالص پیداوار تھی اس لئے اس کو بجا طور پر قومیت متحدہ کی قومی زبان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔"

"گاندھی جی اور اُن کے خاص متبعین جو کانگرس کے ہائی کمانڈ سے تعلق رکھتے ہیں کُلی طور پر یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ تمام ہندوستان کی زبانوں اور رسم الخطوں کو دفن کر دیا جائے اور ناگری رسم الخط کو جاری کیا جائے اور اگر یہ خیال غلط ہے تو کوئی ہمیں بتائے کہ ہم مسلم لیگ کے سامنے اس حقیقت کی کیا تاویل کریں کہ ہری پورہ کانگرس کے پنڈال میں "آل انڈیا ہندی سمیلن" منعقد ہوتا ہے اور ہندوستان کی واحد سیاسی نمائندہ انجمن کا خطبۂ صدارت ٹنڈن صاحب کی اُس زبان میں پڑھا جاتا ہے جس کو وہ خود ہی سمجھتے ہیں جو مسلمان ہری پورہ کانگرس میں شریک ہوئے اُن کا بیان ہے کہ خطبۂ صدارت کا ایک لفظ بھی وہ نہیں سمجھ سکے۔ کیا راشٹریہ بھاشا کا یہی تصور ہے جس کی بنا پر آپ ایک زبان پیدا اور وضع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

"ایک طرف اس کی کوشش ہوتی ہے کہ "مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی" بنائے اور دوسری سمت وہ ایسا طرزِ عمل اختیار کرتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کانگرس ناگفتنی مشکل میں تبدیل ہوتی جارہی ہے!؟" "کانگرس کے لئے یہ طرزِ عمل نازیبا و ناروا ہی نہیں خطرناک ہے۔"

"اس کا واحد حل یہ ہے کہ جب ۱۹۳۹ء کے اجلاس کانگرس میں صدر اس عجیب و غریب زبان میں خطبہ ارشاد فرمائے تو ایک گوشے

سے ۵۰ ہزار مسلمان کھڑے ہو کر اس سے صاف کہہ دیں کہ ہم نہیں سمجھتے۔ اگر ہم کو سمجھانا چاہتے ہو تو ہندوستانی زبان میں ہم کو مخاطب کرو۔"

خدا کرے میرے عزیز دوست ساغؔر صاحب کا یہ واحد "حل" کارگر ثابت ہو اور اُن کا پچاس ہزار کا اُردو لشکر اپنی یلغار میں پوری طرح کامیاب و ظفرمند ہو جائے (آمین)۔

جناب مدیر نگار فرماتے ہیں :۔

"میں کانگرسی خیال کا آدمی ہوں" "یہاں تک کہ میں نے مُسلم لیگ کے وجود کو ہمیشہ بے کار سمجھا"۔ "جس وقت کانگرس کی طرف سے "پورنا سوراج" کا اعلان ہوا تو میں نے غور کیا کہ کیا واقعی وہ مذہب و دولت کی دُنیا سے علیحدہ صرف "انسانیت" کے اصُول پر عمل کرے گی لیکن قبل اس کے کہ میں کسی نتیجے پر پہنچا خود کانگرس ہی کے طرزِ عمل نے بتا دیا کہ اتنی بلند چیز سے اس کو نسبت دینا درست نہیں"۔

"اگر ہم کو گاندھی جی کی ذہنیت کا اندازہ ہو جائے تو کانگرس کا اصُولِ کار آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔" "لفظ پورنا کی جو عملی صورت گاندھی جی کے ذہن میں ہے وہ یا تو اتنی ناقص ہے کہ ہم اس کا ترجمۂ کامل کر ہی نہیں سکتے یا پھر وہ اتنی انتہا پسند ہے جسے ہم صرف عصبیت کہہ سکتے ہیں یا زیادہ واضح الفاظ میں "ہندو راج"۔" "الغرض گاندھی جی کا ضمیر کیسا ہی پاک و صاف ہو لیکن جو راہ اُنھوں نے کانگرس کے لئے متعین کی ہے اس میں ضرور ایسی آلودگیاں نظر آتی ہیں جو ایک بلند تخیل کی ڈیماکریسی کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں"۔ "گاندھی جی کے ڈپلومیٹ ہونے میں شک نہیں۔ اُن کے عزائم میں ایک شیر کا سا ولولہ نہیں ہے بلکہ گھات میں لگے رہنے کا سا انداز ہے"۔ "گاندھی جی کی ڈکٹیٹر شپ نے کانگرس کی طرف سے ملک کے بعض طبقوں کو بدظن کر دیا ہے اور وہ کانگرسی حکومت میں وہ صاف باطنی نہیں پاتے جو مختلف الخیال جماعتوں میں اعتماد پیدا کر کے مرکزیت پیدا کر دیتی ہے۔" "حقیقت یہ ہے کہ ہندو جماعت جس کا ذہن آزادئ کامل کے تصوّر سے بالکل خالی ہے اِس (نو آبادیاتی آزادی) سے زیادہ کی تمنا کر بھی نہیں سکتی"۔

"دُنیا کی اور چیزوں کی طرح حکومت کے بھی دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ داخلی و خارجی۔ خارجی پہلو کے متعلق تو خیر کچھ کہنا ہی فضول ہے کیونکہ صفائی و پاکیزگی کا جو مفہوم ہندو قوم نے متعین کیا ہے وہ بالکل علیحدہ ہے اور اس لئے اگر ہمیں کانگرسی حکومت کے دفاتر میں ظاہری بدترتیبی، گندگی اور پھوہڑپن نظر آتا ہے تو حیرت نہ کرنا چاہئے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس کا داخلی پہلو بھی قابلِ تعریف نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ ہندوؤں کا واقعی منشا کیا ہے اور گاندھی جی کی رہنمائی میں کونسی ذہنیت نشو و نما پا رہی ہے؟"

یہ سب نیاز صاحب کے ارشادات ہیں۔ پھر وہ لکھتے ہیں :۔

"یقیناً کانگرسی حکومت نے کبھی سرکاری طور پر اس کا اعلان نہیں کیا کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں ہندوؤں کا ساتھ دے گی لیکن اُس کے عمل سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔" "اُن کی پیدا کی ہوئی ذہنیت مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کے بجائے اور زیادہ افتراق کی صورتیں پیدا کرتی چلی جارہی ہے۔ یہ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت ہندوؤں سے بالکل مختلف ہے اور ہندوؤں نے اگر اُن کی خصوصیاتِ قومی کو ملحوظ نہ رکھا تو اتحاد ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ زبان کا ہے لیکن بدقسمتی سے اُس کو بہت معمولی سمجھا جاتا ہے۔"

"آل انڈیا کانگرس کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ وہ ایک مشترک زبان" ہندوستانی" کے نام سے رائج کرنا چاہتی ہے جو اُردو اور ہندی رسم خط دونوں میں لکھی جائے لیکن کانگرسی حکومتوں کو جو مطلب اس کا بتایا جاتا ہے وہ کچھ اور ہے۔ چنانچہ ہمارے صوبے (یو۔پی) کی حکومت کا طرزِ عمل ملاحظہ ہو۔ کیا مشترک زبان پیدا کرنے کی یہی صورت ہوا کرتی ہے؟" "ہمارے صوبے کی کانگرسی حکومت نے ہندوستانی زبان کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ ہر وہ لفظ جو فارسی یا عربی الاصل ہے خارج کر دینے کے قابل ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی عام فہم کیوں نہ ہو" (اس کے بعد بعض کانگرسیوں کے ایجاد کردہ ترجمے لکھے گئے ہیں مثلاً Applicable کا ترجمہ نافذ کی بجائے لاگو۔ صوبہ متحدہ کی جگہ جُٹ صوبہ۔ Supplementary question کا ترجمہ دُم سوال) جناب مُدیر لکھتے ہیں" جل جلالہ۔ بوجھیں لال بجھکڑ اور نہ بوجھے کوئے۔" پھر فرماتے ہیں: "میں نے بہت غور کیا کہ ایسا کیوں ہے اور ہندوؤں کی ذہنیتوں میں یہ تغیر کیوں ہوا تو اس کا سبب سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مسلمانوں سے بالکل علیحدہ ہو کر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسی کو زندہ رہنے کا مستحق سمجھتے ہیں جو گا بتری کا جاپ کر سکتا ہے اور گائے کی پوجا —— ہندو مہا سبھا اور اس جماعت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ وہ علی الاعلان مسلمانوں کی مخالف ہے اور یہ گھات سے کام لے رہی ہے۔" اخیر میں مدیر نگار رقمطراز ہیں کہ "ضرورت ہے کہ اجتماعی حیثیت سے (کانگرس میں) جوق در جوق شرکت کی جائے اور کانگرسی وزارتوں کے اس طرزِ عمل پر جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہو نکتہ چینی کی جائے اور اُن کے خلاف نہایت وسیع محاذِ جنگ تیار کیا جائے!"

خدا کرے کانگرس کے ہائی کمانڈ والے اس "نہایت وسیع محاذِ جنگ" کی تیاری کا حال سُن کر خالص "ہندوستانی" کے "راشٹر بھاشا" ہو جانے کا فوراً اعلان کر دیں!

بشیر احمد

قبضۂ مخالفاں

جہاں نما

گیتا کا پیغام

ہندوؤں کے نزدیک زندگی کے تصور میں دھرم کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا یہ کافی ثبوت ہے کہ ہندو قدیم زمانے ہی سے ویدوں کے بیشتر حصے کو دھرم ہی کی تفسیر و تشریح سمجھتے رہے ہیں۔ دھرم کی اہمیت ہمیشہ مسلّم رہی ہے البتہ اس کی غرض و غایت کے متعلق خاصا اختلاف رہ چکا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انسان کے معاشری اور ہر قسم کے اجتماعی مفاد پر دھرم کا اثر کچھ ہی کیوں نہ ہو در اصل اس کا مقصد محض کسی نہ کسی قسم کے ذاتی فائدے کا حصول ہے۔ خواہ یہ ذاتی فائدہ اس دُنیا کے متعلق ہو یا دوسری دُنیا کے متعلق۔ بعض اور لوگوں کا خیال تھا کہ دھرم کا یہ تصور اُس کے مرتبے کو پست کر دیتا ہے اور اس کی حیثیت محض ایک وسیلے کی سی رہ جاتی ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ دھرم اپنا مقصد آپ ہے۔ یہ بجائے خود سراسر بھلائی ہے اور ایسی بھلائی ہے جسے خود اسی کے لئے، نہ کسی اور مقصد کے لئے، حاصل کرنا چاہیے۔ ہندوؤں کے فلسفے کی کتابوں میں اس بات کے بہت سے ثبوت ملتے ہیں کہ ایک زمانے میں ان دونوں نظریوں کا کافی زور تھا لیکن اب بہت عرصے سے ویدانت کے نظریے نے ان کی جگہ لے لی ہے اور یہی نظریہ اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے مطابق اُوپر کے دونوں نظریوں میں سے کوئی بھی پورا پورا درست نہیں۔ ویدانتی خیال کے مطابق یہ بات درست نہیں کہ دھرم بجائے خود کوئی مقصد ہے کیونکہ جس قسم کی جد و جہد کی ترغیب یہ دیتا ہے وہ کسی خاص معین مقصد کے بغیر جاری نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اوپر کے دو نظریوں میں سے پہلے نظریے کی طرح یہ نظریہ بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ دھرم ایک وسیلہ ہے لیکن اس کے خلاف یہ اس بات کی تردید کرتا ہے کہ اس کا آخری مقصد کوئی اُس قسم کا شخصی مفاد ہے جو اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ یہ درست ہے کہ دھرم کا کام ایک وسیلے کا سا ہے لیکن جو مقصد یہ وسیلہ حاصل کرتا ہے وہ نظری خواہشات کی تسکین نہیں۔ ان خواہشات کی تو اصلیت ہی ایسی ہے کہ وہ کبھی پوری قطعی تسکین نہیں پا سکتیں۔ دھرم کا مقصد یہ ہے کہ ان خواہشات پر انسان پورا پورا غلبہ پا لے۔ کیونکہ اسی طرح انسان اپنی اصلیت کو پہنچ سکتا ہے۔ اصطلاحی الفاظ میں یہ بات یوں بیان ہو سکتی ہے کہ دھرم پر پورا پورا عمل کرنے سے انسان "ستو اسدھی" یعنی صفائے قلب حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس طرح "موکشا" یا خود شناسی کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے یہ گیتا کی مشہور تعلیم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم محض "فرض برائے فرض" کے عقیدے سے بہت زیادہ ہے۔

بعض لوگ اس خیال کو دوسری طرح پیش کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ گیتا کے خدا پرستانہ پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس نظریے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان آخر کار "موکشا" کے قابل بننے کے لئے فرض کو بے غرضانہ طور پر ادا کرتا رہے۔ بلکہ

یہ ہے کہ وہ تمام دھرم (سروادھرمان) کو چھوڑ کر اب اور اسی دُنیا میں خدائی زندگی کی پیروی اختیار کرے ۔ اور اس طرح خدا کی ذات میں پناہ حاصل کرلے۔ مسٹر آروبند وگھوش کا عقیدہ بھی یہی تھا اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سری کرشن ایک سے زیادہ مرتبہ ارجن کو جس قسم کی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، وہ ویسی ہی زندگی ہے جیسی خود کرشن گزار رہے تھے۔

بُدھ کی اخلاقیات

سر ایس رادھا کرشنن جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی مذاہب کے پروفیسر ہیں لکھتے ہیں کہ بلند نظرانہ مثالیت اور جاہلانہ توہمات کی یکجائی سے اتنی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے کہ بعض عام مذہبی مبلغ بہت سی خارج از قیاس اور بعض اوقات ملحدانہ تعلیمات کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں ۔ یہی حال بُدھ کے زمانے میں ہو گیا تھا ۔

بدھ در اصل تمام اُن آزاد اور باریک بیں دماغ رکھنے والوں سے مخاطب ہوا تھا جو نہ صرف مذہبی معاملات میں متخاصم آراء سے گھبرائے ہوئے تھے بلکہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اُن کو مذہب کی کوئی ضرورت نہیں ۔ ان لوگوں کے لئے خدا کی حقیقت ایک لفظ سے اور مذہب کی حقیقت ایک قدیم غلطی سے زیادہ نہ تھی ۔ بدھ نے اس قسم کے لوگوں کی ہدایت کے لئے ان کے سامنے اصول اخلاق کو ان کی حیثیت مطلقہ میں پیش کیا ۔ اُس نے کہا کہ ہم ضبطِ نفس، ہمدردی اور محبت کی زندگی بسر کرنے سے اپنی ہستی میں ایک ایسی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں جو ہمیں انسانی معراج تک پہنچا سکتی ہے ۔ یہ راستہ مرد عورت امیر غریب سب کے لئے کھلا ہے ۔

پروفیسر صاحب نے بتایا کہ اخلاقیات کا اعتلا بدھ کی تعلیم کی کُنجی ہے اور یہ حقیقت اس کی زندگی اور خیالات میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے ۔ وہ زیادہ نفس پرستی کو ادنےٰ بہیمیت اور زیادہ نفس کشی کو دیوانگی اور وہم پرستی سمجھتا ہے ۔

اس نے اپنے پیرؤں کو حد سے زیادہ نفس کشی سے روکتے ہوئے اعتدال کا رستہ دکھایا ہے ۔

بُدھ کائنات اور اُس کی غرض و غایت کے متعلق فلسفیانہ غور و فکر کرنے سے منع کرتا ہے ۔ کیونکہ نجات کا جو طریقہ اُس نے بتایا ہے اُس سے اِن باتوں کا کوئی تعلق نہیں ۔

دُنیا اور رُوح کے متعلق بُدھ نے جو حقائق پیش کئے ہیں ان کی محرک بھی محض یہی بات ہے کہ بدھ کو اخلاقیات سے بے حد دلچسپی تھی ۔

سکھ مذہب کی نشو و نما

پروفیسر تیجا سنگھ نے سکھ مذہب کے متعلق ایک مضمون لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس مذہب کی بنیاد رکھنے والے گرو رہنموں

کے اقتدار، بت پرستی اور شرک سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے کسی قومیت کی بنیاد نہیں رکھی تھی بلکہ بعض مختلف الرائے
مذہبی فرقوں کو نشوونما دی تھی جو اُن کے مرنے کے بعد بھی اپنی حالت پر قائم رہے۔

اصلاح کے صحیح طریقوں کے استعمال کی سعادت گرُو نانک کے لئے مقدر ہو چکی تھی اور گرو نانک ہی نے گرو گوبند سنگھ کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا چنانچہ اُنہوں نے گرُو نانک کی قائم کردہ بنیادوں پر ایک نئی ملّت کی تشکیل کی اور مذہبی سیاسی اور ملی مساوات کے اصُول کو عملی صُورت میں پیش کیا۔ دس بڑے گرُوؤں میں سب سے پہلے گرُو نانک (۱۴۶۹ء سے ۱۵۳۹ء) نے خدا کی وحدانیت کا اعلان کرکے اپنے مذہب کی بُنیاد رکھی۔ اُنہوں نے مذہبی ضروریات کے لئے مقامی زبان کا استعمال کرکے لوگوں میں قومیت کا جذبہ پیدا کر دیا اور چونکہ یہ لوگ اکٹھے ہو کر ایک ہی قسم کے مذہبی گیت گاتے تھے، اس لئے مقصد اور خیال کی یک جہتی سے یہ جذبہ اور بھی قوی ہو گیا۔ گرو نانک جہاں جاتے تھے وہاں اپنے چیلوں کی "سنگتیں" قائم کر دیتے تھے۔ یہ سنگتیں اِدھر چیلوں کو آپس میں متحد کر دیتی تھیں اور اُدھر اس نظام کے مرکز کے طور پر گرد سے بھی لوگوں کا تعلق استوار ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد گرو انگد نے برہمنوں سے پوری طرح نجات حاصل کرنے کے لئے ایک نیا رسم الخط اختیار کر لیا۔ گرو امر داس نے سنگتوں کے بہتر انتظام کے لئے انہیں چھوٹے چھوٹے دائروں میں تقسیم کر دیا۔ گرو رام داس نے امرت سر کو مرکز بنایا اور ہر طرف مسند (مبلغ) بھیج کر جماعت کو مضبوط بنایا۔ گرو ارجن نے امرتسر میں دربار صاحب تعمیر کرایا اور اس میں اپنا مرتبہ گرنتھ صاحب رکھا۔ مذہبی حیثیت سے یہی گرنتھ مستند سمجھا جاتا ہے۔ اس گرنتھ صاحب میں گرو ارجن اور اُن کے پیشروؤں کی تحریروں کے علاوہ بعض ہندو اور مسلمان بزرگوں کی تحریریں بھی جمع کی گئی ہیں۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ان بزرگوں میں سے بیشتر اچھوت تھے۔

اسلام

اسلام ایک معاشری نظام ہے جس کے قوانین انسان کی فطری زندگی سے بالکل ہم آہنگ ہیں۔ ان قوانین میں ہر موقع اور محل پر کام دینے کے لئے کافی وسعت اور لچک ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ ہے کہ یہ وسعت اور لچک اسلام کو باوجود اس قدر ہمہ گیر ہونے کے انسانی فطرت کی اُن بُنیادی صداقتوں کی حد سے کسی طرح باہر نہیں ہونے دیتی جو قرآن مجید پیش کر چکا ہے۔ زندگی کے متعلق اسلام کی نظر ارتقائی ہے اور وہ معاشرہ کی پیہم تغیر پذیر ہیئتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ انسانی فطرت کے اُن قوانین کی سختی سے پابندی کراتا ہے جنہیں فطرتِ انسانی مسلّمہ طور پر غیر متبدل ثابت کر چکی ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کے معاشری، سیاسی اور اقتصادی قوانین اس طرح ڈھالے گئے ہیں کہ وہ انسانی فطرت سے کسی طرح متصادم نہ ہوں۔ انسانی فطرت کی عالمگیری اور ناتغیر پذیری تو بہرحال مسلّم ہے ہی۔

دوسرے قوانین کے علاوہ اسلام نے تقسیم دولت اور تقسیم جائداد کے متعلق بھی نہایت واضح اور کھلے ہوئے قوانین بنا دیئے ہیں اور یہ قوانین ایک نہایت معتدل اور قابلِ عمل اشتراکیت کی اوّلیں اور قطعی بنیاد قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان قوانین کے نفاذ اور جبر و ناانصافی کی روک تھام کے لئے اسلام ایک

امیر حمزہ اور عمرو عیار

داستانہائے اردو کے یہ جلیل القدر کردار اس دفتر بے کراں سے تعلق رکھتے ہیں جسے داستانِ امیر حمزہ کہا جاتا ہے۔ یہ داستان ایک مصنف کی شرمندۂ قلم نہیں، اور نہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پہلے پہل یہ کب لکھی گئی۔ سب سے پرانا نسخہ جو میں نے دیکھا ہے وہ ایک قسم کا خلاصہ ہے اور وہ ۱۱۵۵ھ میں کلکتہ میں طبع ہوا۔ اور شاہزادہ فتح حیدر خلف اکبر سلطان ٹیپو شہید کے داماد نواب میرزا امان علی خان لکھنوی نے فارسی زبان سے اس کا ترجمہ کیا۔ نواب امان علی خان تمہیداً لکھتے ہیں کہ اس داستان کی بنیاد سلطان محمود غزنوی کے وقت سے ہے اور وجہ اس کی تصنیف کی یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے ہر طرح کی خلقت کا طریق معلوم ہوتا ہے اور قلعہ ستانی اور ملک گیری کا خیال دل میں آتا ہے۔ اس لئے بادشاہ مذکور ہمیشہ اسے شوق سے سنا کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اصل فارسی میں یہ داستانیں خواہ کسی مطلب کے لئے لکھی گئی ہوں۔ اردو میں انہیں لکھنے کے محرک لکھنؤ اور اس کے اطراف کے رؤسا اور امرا کی بیکاری اور انیسویں صدی کا رواج داستان گوئی ہے۔ چنانچہ تین نامور داستان گویوں کے نام اس طویل حکایت سے وابستہ ہیں۔ شیخ تصدق حسین، سید محمد حسین جاہ اور منشی احمد حسین قمر، اگرچہ تین اور حضرات یعنی مولوی محمد اسمٰعیل، میر احمد علی اور منشی انبہ پرشاد کا نام بھی حوالتہً بیان کیا جاتا ہے۔ چھپنے سے پہلے یہ داستان جو کم از کم تیس دفاتر پر مشتمل ہے رؤسائے لکھنؤ و شاہزادگان اودھ کے سامنے ہر بار کسی نہ کسی قدر اضافہ کے ساتھ پڑھی جا چکی تھی۔ ان حضرات کے حوالہ جات معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان کے بہت سے حصص شیخ ابوالفیض فیضی نے برائے تفریح طبع شہنشاہ اکبر فارسی میں رقم کئے تھے جن میں سے مندرجہ ذیل بہت مقبول ہوئے:— نوشیرواں نامہ، ہرمز نامہ، کوچک باختر، بالا باختر، ایرج نامہ، طلسم ہوشربا، صندلی نامہ، تورج نامہ، لعل نامہ۔ ان کے علاوہ بھی ان حضرات نے ترجمہ، تصرف اور تصنیف کی بدولت در جنوں دفاتر اور مرتب کئے۔ الفہرست میں ایسی چھیالیس جلدوں کے نام درج ہیں۔ فقط شیخ تصدق حسین نے ہی اکتیس[۳۱] جلدیں لکھی ہیں یعنی بڑی تختی کے کم از کم چھتیس ہزار صفحات۔ یہ سب منشی نولکشور اور ان کے صاحبزادہ منشی پراگ نرائن نے ان حضرات سے لکھوا کر ۱۸۸۱ء سے ۱۹۱۰ء کے درمیان چھپوائیں۔ انیسویں صدی کے ربع سوم میں اس داستان کے سات دفتر[۵۱] سلطان نصیر الدین شاہ ایران نے تاجروں کے ذریعے ہندوستان سے مواد منگوا کر اور اپنے ہاں کے شاعروں اور نثاروں سے لکھوا کر دو ضخیم جلدوں میں طبع کرائے۔

---

۵۱ منشی احمد حسین قمر اس کا حوالہ طلسم ہوش ربا کی جلد ششم کے تتمہ میں دیتے ہیں۔

اس داستان کے سب دفاتر میں زلزلۂ قاف، ثانیٔ سلیمان یعنی امیر حمزہ صاحبقران، ان کے بیٹوں، پوتوں، نواسوں اور بہتر ہزار، بہتر بہتران یعنی مہر سپہر عیاری خواجہ عمرو بن امیہ ضمیری اور ان کے فرزندوں اور شاگردوں کی ملک گیری طلسم کشائی اور جہاں گردی کا حال بالتفصیل درج کیا ہوا ہے۔

آغاز ہر داستان کا کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ یا امیر حمزہ اور ان کا لشکر کسی جھوٹے خدا کی بیخ کنی کرنے کے لئے جگہ جگہ جاتے ہیں یا بوقت شکار یا عین لڑائی میں امیر حمزہ کے لشکر سے کوئی جادوگر یا جادوگرنی کسی شہزادہ کو لے اڑتی ہے اور کہیں جاکر یا اسے دشمنی سے قید کردیتی ہے یا طالب وصل یا مدد ہوتی ہے، ہر سہ صورتوں میں کسی نہ کسی کو اس کے پیچھے جانا پڑتا ہے چنانچہ علم نجوم سے معلوم کیا جاتا ہے کہ فلاں طلسم کا فاتح کونسا فرزند یا نبیرۂ حمزہ ہے، پھر وہ شاہزادہ بعض دفعہ اپنے عیار کے ساتھ اور اکثر تنہا طلسم کشائی کو نکلتا ہے۔ بعد از ہزار صعوبت و پریشانی چند شاہزادیانِ طلسم کی مدد سے ضرور اس آفتاب حسن اور صاحب سطوت وصولت پر عاشق ہو جاتی ہیں وہ شیر بیشۂ جرأت اس طلسم کو فتح کر لیتا ہے۔ اس طرح سینکڑوں طلسم پسران اور نبیرگان حمزہ نے فتح کیے ہیں۔ ہر جگہ، ہر وقت، ہر مصیبت میں عیار آکر اُن کی مدد کرتے ہیں۔ جادوگروں کو دھوکا دے کر مارتے ہیں اور صحیح معنوں میں طلسم توڑتے ہیں۔ مختلف دفتروں میں امیر حمزہ کے نامور فرزندوں اور پوتوں کے عروج اور فتاحی کے قصے درج ہیں۔ مثلاً ہرمز نامہ میں قاسم خونریز نقاب ارسرخ پوش بن کر آتا ہے اور امیر حمزہ سے مقابلہ کے دعوے کرتا ہے اور بانہائے صاحبقرانی چھین لینے کا دم بھرتا ہے۔ کوچک باختر میں شاہزادہ بدیع الزماں ملک سنجان کو فتح کرتا ہے اور بہت شوکت کے سامان پیدا کرتا ہے۔ بالا باختر میں زمرد شاہ باختری سے جو خدائی کا دعوےٰ کرتا ہے مقابلہ ہوتا ہے اور یہاں بدیع الزمان اور قاسم اور آخر میں اسد بن کرب اور شاہزادہ نورالدہر بہت معرکہ آرائیاں کرتے ہیں۔ ایرج نامہ میں ایرج بن قاسم جو ایام طفلی میں گم ہو گیا تھا، آفتاب پرستوں میں پرورش پاکر انہیں کا مذہب اختیار کر لیتا ہے اور امیر حمزہ کے لشکر سے مقابلہ کرتا ہے اور بہت عروج پاتا ہے۔ اسی میں نورالدہر بن بدیع الزماں کی جنگ آزمائیاں بھی درج ہیں۔

صندلی نامہ میں قہور بن حمزہ اور حمزۂ ثانی کے عروج کا قصہ ہے اور تورج نامہ میں رستم ثانی بن ایرج اور بدیع الملک بن نورالدہر کی رستمی اور طلسم کشائی کے قصے لکھے گئے ہیں۔

یہ جوانانِ صف شکن اور شاہزادگانِ تہور شعار سب امیر حمزہ کی طرز پر وضع کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ایک آدھ خصوصیت ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لئے ضرور ان میں رکھ دی جاتی ہیں۔ جو صفات امیر حمزہ میں موجود ہیں وہی ان سب میں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ امیر ان سے حلم میں، زور میں، برداشت میں اور مروت میں قدرے بڑھے ہوئے ہیں۔ عیارانِ لشکر جن کی تعداد ایک لاکھ چوراسی ہزار ہے، خواجہ عمرو عیار کے شاگرد ہیں اور ان کی شکل و شباہت میں فرق ہو یا نہ ہو مگر

طریق عیاری میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ کبھی ایک حسین و جمیل عورت کا بھیس بدل کر ساحروں کو لبھاتے ہیں اور دارو ئے بیہوشی شراب میں ملا کر یا کبھی پھول سنگھا کر یا آگ پر کچھ ڈال کے یا حباب مار کر ان کو بیہوش کرتے ہیں اور اسی صورت میں انہیں قتل کرتے ہیں۔ ان عیاروں میں سب سے نامور مہتر قران خلیفہ عمرو عیار ہے جو پہلے ملک حبش کا بادشاہ تھا، خواجہ عمرو کبھی براہِ شفقت اسے "میرا جان بخش" یا "میرا کالیا" کہہ کے پکارتے ہیں۔ پھر مہتر برق فرنگی جو قوم کا انگریز ہے، پھر مہتر برک خطائی اور مہتر چالاک بن عمرو۔ ان چار مہتروں کے بعد چودہ سرہنگ ہیں جن میں سے یہ چند بزرگ بہت مشہور ہیں :۔ ابوالفتح اسیارہ بن عمرو، جواہر بن عمرو، امیہ بن عمرو، سمک بلبانی، گلباد عراقی، اتنا پور شیر دل وغیرہ۔ ان کی عیاریوں کا رنگ ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہے سوائے مہتر قران اور برق فرنگی اور کہیں کہیں چالاک بن عمرو کے۔ مگر ان سب کے استاد اور در اصل شہنشاہ اوجِ عیاری خواجہ عمرو ہیں جن کے پاس تحفہ جات ہفت پیغمبران ہیں اور جو واقعی عیاری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

امیر حمزہ خواجہ عبد المطلب بن ہاشم کے فرزند ہیں اور قوت میں، جسارت میں، جلالت میں صاحب قران ہیں۔ ان کے خروج کا قصہ یہ ہے۔ نوشیروان شاہ ایران نے ایک رات ایک بھیانک خواب دیکھا، جسے وہ صبح اٹھتے ہی بھول گیا۔ بر سر دربار اس نے اپنے وزراء سے یہ کیفیت بیان کی۔ اس کے وزیر بزرجمہر نے جو علم کہانت میں کمال رکھتا تھا زائچہ کھینچ کر یہ تعبیر بتائی کہ مشرق کی طرف سے شہر خیبر کا بادشاہ کسی زمانہ میں آپ پر چڑھائی کرے گا اور شہر مکہ سے ایک جوان حمزہ نامی آکر آپ کو بچائے گا۔ نوشیروان نے بزرجمہر کو اسی وقت مکہ بھیجا کہ وہاں جاؤ اور اگر وہ لڑکا پیدا ہوا ہو تو ہمارا فرزند مشہور کر کے اس کی مناسب پرورش کا انتظام کر کے آؤ۔ بزرجمہر نے مکہ پہنچ کر خواجہ عبد المطلب کا گھر دریافت کیا اور پھر مکہ کے ان نوزائیدہ بچوں کو طلب کیا جو ایک دن ہی پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ حمزہ اور عمرو اور مقبل تین بچے اس کے سامنے لائے گئے۔ اسے علم نجوم سے معلوم ہو ہی چکا تھا کہ تینوں اور خصوصیت سے اول الذکر دونوں بہت نامور ہوں گے۔ چنانچہ ان کا خاطر خواہ انتظام کر کے واپس مدائن آگیا۔

جب یہ جوان ہوئے تو اپنے اپنے ہنر میں فرید روزگار اور پیغمبروں کے منظورِ نظر ہوئے۔ جب حشام بن علقمہ خیبری نے نوشیرواں پر چڑھائی کی تو امیر حمزہ نے جا کر اسے زیر کیا۔ چنانچہ ان کی اور ان کے یاران نامور یعنی عمرو عیار اور مقبل وفادار کی بہت قدر ہوئی۔ امیر حمزہ ملکہ مہرنگار دختر نوشیرواں پر عاشق ہوئے اور اس عشق میں بہت مصیبت اٹھائی۔ نوشیرواں کا دوسرا وزیر بختک بہت شیطان صفت تھا، وہ ہمیشہ اسے بری صلاح دیا کرتا تھا۔ اس کے مشوروں سے نوشیرواں بہت تباہ حال ہوا۔ اول تو اس نے حمزہ کو ہندوستان بھیجا کہ دارائے ہند لندھور بن سعدان جیسے کوہ پیکر پہلوان کو زیر کرے جس کا قد ایک سو چھپیس گز کا اور جس کا گرز ایک ہزار سات سو من کا تھا۔ امیر اس سے پہلے دو بہادروں یعنی عمرو معدی کرب اور بہرام گرد بن خاقان چین کو زیر کر چکے تھے۔ ہندوستان پہنچ کر لندھور کو بھی زیر کیا۔ کوہ سراندیپ پر خواب میں انہیں انبیائے کرام نظر آئے اور انہیں بہت

سے تحفے عطا کئے۔ عمرو عیار بھی ساتھ تھے۔ انہیں بھی وہاں سے بہت تحائف ملے جن میں سب سے افضل حضرت آدم کی زنبیل تھی جو بظاہر ایک بڑے کے مانند تھی مگر اس کے اندر بہت سے ملک آباد تھے، اس میں جو چیز ڈالتے سما جاتی اور جو چیز چاہتے نکل آتی، اس پر ہاتھ رکھ کر اگر دعا کرتے تو جس طرح چاہتے صورت تبدیل ہو جاتی حضرت داؤد نے لحن داؤدی اور موسیقی میں کمال عطا فرمایا۔ اسی طرح حضرت دانیال نے ایک بارگاہ دی جو چاہتے تو سمٹ کر چھتری بن جاتی اور اگر پھیلاتے تو اس میں ہزار دل آدمی بیٹھ سکتے، حضرت الیاس نے ایک جال دیا کہ جو اور جس قدر اشیا اس میں باندھتے بندھ جاتیں اور اٹھانے والے کو بوجھ محسوس نہ ہوتا۔

ہندوستان سے واپسی پر بختک نے پھر نوشیرواں کو بہکایا کہ امیر کو اب کسی اور مہم پر بھیجو تاکہ وہاں جا کے مارا جائے اور تمہیں اپنی بیٹی اسے نہ دینی پڑے۔ چنانچہ نوشیرواں نامہ میں انہی مہمات کا ذکر ہے۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے اور امیر نے بہت سے ممالک فتح کئے کہ ایک دن امیر کو شہپال بن شہرخ بادشاہ پر دہائے قاف نے دنیا سے اٹھوا منگوایا کیونکہ دیوں نے بغاوت کر کے اس کا پایہ تخت چھین لیا تھا۔ امیر نے قاف میں اٹھارہ سال صرف کئے اور تمام دیوؤں کو زیر کیا اور زلزلۂ قاف لقب پایا وہاں آسمان پری دختر شہپال سے شادی کی۔ ۱۸ سال بعد دنیا میں واپس آئے۔ اس دوران میں عمرو عیار جسے وہ اپنا نائب کر گئے تھے لشکر کو اور ملکہ مہر نگار کو جب امیر نوشیرواں کے جور و جفا سے تنگ آ کے مدائن سے نکال لائے تھے مختلف قلعوں میں چھپاتا اور دشمنانِ امیر سے بچاتا رہا۔ اکثر سردار منتشر ہو گئے تھے، زندگی اجیرن ہو گئی تھی، دشمن چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے کہ امیر واپس آئے اور سب کو شکست دی۔ نوشیرواں جسے بختک ملک بملک پھراتا اور حمزہ سے دشمنی پر ہمیشہ اکساتا رہتا تھا لڑ لڑ کے عاجز آ چکا تھا آخر ایک جگہ شکست فاش کھا کے اور مجبور ہو کر اس نے امیر کی مہر نگار سے شادی پر رضامندی ظاہر کی اور بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ ملکہ مہر نگار کے بطن سے شاہزادہ قباد پیدا ہوا جسے امیر نے بادشاہ بنا کر اسلام کیا۔ بعد میں امیر نے بہت سے محل کئے جن سے چند ایک نامور فرزند پیدا ہوئے جن میں رستم پیلتن اور بدیع الزماں بہت مشہور ہیں۔ رستم کے لڑکے قاسم خونریز خاوری اور پوتے ایرج نوجوان اور بدیع الزماں (جن کا لقب گردن کش مشہور تھا) کے بیٹے نور الدہر نے بہت نام پایا۔ امیر حمزہ کی ایک دختر بلند اختر بھی تھیں جن کا نام زبیدہ شیر گیر تھا اور وہ بدیع الزماں کی حقیقی بہن تھیں ان کے بطن سے اسد غازی پیدا ہوا جس نے طلسم ہوشربا جو داستان امیر حمزہ کا مقبول ترین حصہ ہے عمرو عیار اور پانچ اور عیاران جانباز کی امداد سے فتح کیا۔ امیر حمزہ عمر کے آخری حصہ میں ذیل رستمی حمزہ ثانی کو دے کر مکہ معظمہ چلے جاتے ہیں اور وہاں لشکر اکت رسول اکرم جنگ احد میں لڑتے ہیں اور اسی غزوہ میں شہید ہو جاتے ہیں۔

امیر حمزہ اور عمرو عیار کے کردار مثالی ہیں اور ان کے اوصاف مافوق الفطرت، اس لئے ان کو جانچتے وقت ہم وہ قوانینِ فن نگاہ میں نہیں رکھ سکتے، جنہیں عام افسانوں یا ناولوں کی تنقید کے موقع پر ہم منتر کی طرح جپتے ہیں۔ ان پر افسانہ نگاری کا

پہلا اصول ہی عاید نہیں ہوتا۔ یعنی ان کی ترکیب میں حقیقت نگاری سے کام نہیں لیا گیا اور ان کے کارہائے نمایاں میں واقعیت سرے سے ہے ہی نہیں۔ مگر صاحب کمال ہو کر اور محیر العقل اوصاف کے مالک ہوتے ہوئے بشریت سے کام لینا بھی تو ایک قسم کی حقیقت نگاری ہے۔ مثلاً امیر حمزہ کے کردار کو لیجئے۔ امیر شجیع ہیں، شکیل ہیں اور ایک بلند نظر خوش خلق اور بامروت انسان کا نمونہ ہیں۔ ان کی خلقت ہی اس طرح ہوئی ہے کہ ان سے کوئی کم ظرفی، بدعہدی یا ظلم نہیں ہو سکتا۔ نوشیرواں کی لڑکی پر عاشق ہو گئے ہیں۔ مہرنگار خود ان پر مائل ہے اور باوجودیکہ بختک کے پنجۂ ستم و مکر سے مامون کرنے کے لئے اُسے خود اپنے لشکر میں لے گئے ہیں مگر بغیر رضامندیٔ نوشیرواں کے شادی سے گریز کرتے ہیں۔ یہ بات غیر معمولی جذب اور تدبر کا پتہ دیتی ہے۔ آپ مہرنگار سے عہد کرتے ہیں کہ جب تک اس سے شادی نہ ہو کہیں اور بیاہ نہیں کریں گے مگر پرد ہٗ قاف میں ایک چھوڑ تین نکاح کر لیتے ہیں۔ آسمان پری سے، ریحانہ پری سے اور قمر چہرہ سے۔

نوشیرواں ہزار بار دھوکا دیتا ہے سینکڑوں دفعہ وعدہ خلافی کرتا ہے مگر طرح دینے ہیں اور اگرچہ اس پر قبضہ کر کے اسے اس کی فریب کاریوں کی سزا دے سکتے ہیں مگر باز رہتے ہیں مگر جب عمرو عیار بختک کی شیطنت سے تنگ آ کر اسے قتل کر کے اس کا حریسہ پکاتا ہے اور نوشیرواں کو کھلا دیتا ہے تو امیر اس مکروہ حرکت کو نظر انداز بھی کر دیتے ہیں۔ پھر اگرچہ امیر حمزہ بہت حلیم ہیں مگر جب انہیں غصہ آجاتا تو بے وجہ اور بہت جلال سے آتا ہے مثلاً ہرمز نامہ میں لندھور بن سعدان کا مقابلہ ایک پہلوان سے ہوتا ہے۔ مبارزہ میں لندھور جھلا کے اپنے حریف کو ایک گھونسا رسید کرتا ہے جس سے اس کا مدِمقابل نیورا جاتا ہے اور لندھور اسے گرا دیتا ہے۔ وہ بہادر زیر تو ہو جاتا ہے مگر جب امیر حمزہ مسلمان کرنے پر اس سے سوال کرتے ہیں کہ تجھے لندھور نے کیسے زیر کیا تو وہ شکایت کرتا ہے۔ امیر حمزہ لندھور سے ناراض ہوتے ہیں اور بہت نازیبا طور پر اور اسے لشکر سے نکال دیتے ہیں۔ لندھور ان کا یار غار ہے، ان کا جانشین ہے، دست راست کے بہادروں کا سردار ہے مگر نہ اس کی منتوں کی پروا کرتے ہیں اور کسی کی سفارش کو منظور کرتے ہیں۔ حتےٰ کہ حکم دیتے ہیں کہ جو لندھور کی سفارش میں زبان ہلائے گا اسے بھی دربار سے نکال دیا جائے گا۔ لندھور معافی مانگتا ہے اسے معافی نہیں دیتے حتےٰ کہ وہ سب ہتھیار چھوڑ، فرزند اور فوج چھوڑ جنگل میں نکل جاتا ہے اور فقیر ہو جاتا ہے اور اس پر بہت مصیبتیں آتی ہیں مگر امیر بہت مدت تک غصہ نہیں چھوڑتے۔ یہ ضد امیر میں موجود ہے۔

پھر ایرج نامہ میں امیر اپنے یار جانی اور محبوب خواجہ عمرو عیار سے بگڑ جاتے ہیں اور اسے ایک دشمن کے حوالے کر دیتے ہیں کیونکہ عمرو عیار نے اس دشمن کو کوڑوں سے مارا تھا۔ وہ دشمن عمرو عیار کو باندھ کے کوڑوں سے بے حد مارتا ہے۔ امیر حمزہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ آخر عمرو عیار اس بے عزتی کو برداشت نہ کرتے ہوئے لشکر سے نکل جاتا ہے اور ایرج کو ڈھونڈ کر اسے تعلیم دیتا ہے اور فنونِ سپہ گری میں طاق کر کے امیر پر حملہ کراتا ہے۔ مگر امیر عمرو پر ایسے ناراض ہیں کہ اس کا نام نہیں

لیتے۔ یہ خصوصیت ان کے حلم کے منافی ہے مگر جیسے ہم سب کبھی نہ کبھی بے وجہ اور نامناسب طور پر ناراض ہو جاتے اور پھر اپنی ضد پر قائم رہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں، اسی طرح امیر حمزہ میں بھی یہ کمزوری پائی جاتی ہے۔ اپنے رواداری اور مروت اور حسن سلوک کے اصول کو اس شدید طریقہ سے نباہتے ہیں کہ کئی دفعہ انہوں سے ناانصافی ہو جاتی ہے اور امیر پروا نہیں کرتے۔

ان متضاد خصوصیات کی موجودگی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ امیر حمزہ کے کردار میں کہیں نہ کہیں بشریت کے آثار ضرور پائے جاتے ہیں۔

مگر ان کا کردار جامد ہے۔ یعنی جو طبیعت ان کی جوانی کے عالم میں ہے، آخر تک بغیر کسی تغییر یا ترقی کے رہتی ہے۔ بڑھاپے میں مصنفین ان کے بال سفید کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر ان کی قوت و شہامت میں کوئی فرق نہیں آتا شاید بزرگان دین کی نظر کے طفیل سے یا شاید صاحبقرانی کی وجہ سے کسی پہلوان یا بہادر سے زیر نہیں ہوتے، جہاں رستم پیلتن جیسے بہادر اور بدیع الزماں جیسے زور آور اور قاسم خونریز خاوری جیسے تند مزاج اور ایرج اور نور الدہر اور اسد بن کرب غازی جیسے صف شکن بہادر لڑتے لڑتے تھک آجاتے ہیں وہاں امیر اس عمر میں بھی جا کر دشمن کو زیر کر لیتے ہیں۔

پھر شاہزادوں کا ایک عجیب قاعدہ ہے۔ امیر اور اُن کے فرزند جہاں کہیں پہنچتے ہیں شادی کر لیتے ہیں اور دو ایک ماہ وہاں رہ کے آگے روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے لڑکے جب سن بلوغت کو پہنچتے ہیں جس کے لئے انہیں اکثر بارہ برس ہی لگتے ہیں، تو کوئی ایک ملک فتح کر کے نقابدار بن کر امیر کے لشکر سے آکر مقابلہ کرتے ہیں۔ اپنے بھائیوں بھتیجوں سے لڑتے، ان سے نہ زیر ہوتے ہیں اور نہ اکثر انہیں زیر ہی کر سکتے ہیں، سوائے بدیع الزماں کے جو زور میں باقیوں سے کچھ فوقیت رکھتے ہیں۔ آخر امیر کے ہاتھ سے زیر ہو کر اپنا نام بتاتے ہیں۔ یہ قاعدہ آخر تک جاری رہتا ہے اور امیر حمزہ آخر تک ہر جوان بیٹے یا پوتے پر خواہ وہ کتنا ہی بہادر اور کیسا ہی بطل زمان کیوں نہ ہو، حاوی رہتے ہیں۔

اگر آپ یہ کہیں کہ امیر بمقابلہ لندھور، قندز، سرشبان، ہردم، سرپال یا گاؤلنگی جو قد میں امیر سے کم از کم سو سو گز لمبے ہیں کیسے ان کے سروں پر گرز لگا سکتے ہیں یا ان کے سر پر امیر کی تلوار ہی کیسے پہنچتی ہے، یا یہ کہ دوران جنگ یا مبارزت میں امیر کے لنگر کو کوئی نہیں ہلا سکتا اور یوں ہر ایک عیار انہیں بیہوش کر پشتارہ باندھ اپنی راہ لیتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے، اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوہ سراندیپ پر حضرت آدم نے امیر سے وعدہ کیا تھا کہ لڑائی کے وقت تمہارے بازو کسی حملہ یا ضرب کی وجہ سے خم نہیں ہونگے اور تم جس کسی حریف پر حملہ آور ہو گے خواہ وہ کتنا ہی بلند قامت کیوں نہ ہو تمہارا حربہ اس کے سر تک پہنچے گا۔ اور عیار جو انہیں اُٹھا لیتے ہیں تو بیہوش کر کے اُٹھاتے ہیں۔ جب امیر ہوش میں ہوں اور بوقت کشتی لنگر مار لیں تو کوئی انہیں ایک انچ نہیں ہلا سکتا۔ دوسرے یہ کہ ہم ممکنات کی دُنیا کی سیر ہی نہیں کر رہے ہم تو اس دُنیا میں ہیں جو تخیل کی سدرۃ المنتہا ہے۔ یہاں کا کارخانہ ہی الگ ہے، یہاں ہم جیسے بندے نہیں بستے، یہاں ہزار ہزار من کے گرز عام ہوتے ہیں اور ایک سو اسی گز اونچے پہلوان،

اور سمندوں ہزار دست جیسے دیو، یہاں میرے اور آپ کے وضع کئے ہوئے تنقیدی اصول بیکار ہیں۔ اس دُنیا میں داخل ہونے کی شرط ہی یہی ہے کہ آپ اعتراض نہ کریں اور خوش اعتقادی سے کام لیں۔

اب رہے خواجہ عمرو عیار۔ یہ حضرت عیاری اور مکاری کے دیوتا ہیں۔ دورانِ جنگ میں اس طرح نعرہ لگاتے ہیں:-

عمرو ہوں میں عیار صاحبقراں — مرے مکر سے کانپتا ہے جہاں
تراشندۂ ریش کفار ہوں — زمانے کا مکار غدار ہوں
مرا تیز رفتار ہو کر قدم — صبا ٹھوکریں کھائے ہر ہر قدم
اُڑا دوں صبا کے بھی میں ہوش کو — نپائے مری گردِ پاپوش کو
دوندہ جہاں گرد طرار ہوں — جہانگیر عالم کا عیار ہوں

خواجہ کی یہ تعلّی بلاسبب نہیں۔ بڑے بڑے نامور ساحروں نے جو خدائی کا دعوےٰ رکھتے تھے اور عیاروں کی حقیقت پشّہ کے برابر بھی نہیں سمجھتے تھے آخر عمرو سے دھوکا کھایا اور مارے گئے۔ ان کا حلیہ بیان کرنے میں جس ظرافت کو کام میں لایا گیا ہے اس کا معیار بہت بلند نہیں اور میرے خیال میں یہ مصنّفین کے فنِ تخلیق پر ایک بدنما دھبا ہے۔ خواجہ کو اُنھوں نے دُبلا، پتلا، تانبیا، بدشکل اور بدقطع لکھا ہے۔ بدمانس اور غول بیابانی کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، تفصیل سے ان کا سراپا یوں کھینچتے ہیں "تو مڑیا سا سر تھا، زیرہ سی آنکھیں، خوبانی سے کان، کلیجہ کی طرح گال، تاگا سی گردن، رسی سے ہاتھ پاؤں، نیچے کا جسم چھ گز اور اوپر کا تین گز تھا"۔ یہ حلیہ مضحکہ خیز ضرور ہے مگر خواجہ کا کردار محض مسخرے کا نہیں، خواجہ سے آپ ہر قسم کی حرکت کی توقع کر سکتے ہیں مگر وہ بھانڈپن پر کبھی نہیں اُترتے۔ عیاری کے موقع پر بھونڈے مذاق بھی ان سے ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے ساحروں یا خدائی کے دعویداروں کی داڑھی پیشاب سے مونڈنا بھی ان سے بعید نہیں مگر اس سے لازم نہیں آتا کہ ان کا حلیہ بھی کریہہ بنا دیا جائے تاکہ عورتیں انہیں دیکھ کر ڈر جائیں مگر مصنّفین نے انہیں امیر حمزہ کے حسن کے مقابل میں بدشکل بنا کر گویا ایک قسم کا توازن یا ضد قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ خواجہ کے کمالات کو دیکھ کر کوئی بھی ان کے حلیہ کو یاد نہیں رکھ سکتا۔

ان کی عیاری کیا تھی کرامات تھی، طلسم ہوشربا میں اور دوسرے دفاتر میں ان کی بہت سی بے نظیر عیاریاں مرقوم ہیں۔ ایک دفعہ خداوند نہنگ بن کر جہاندار شاہ بادشاہ بیابان گلریز کو پکڑ لیا اور اسے مطیع کیا۔ لاہوت جادو اور اس کی بیوی زلزلہ محل نشین کے باغ میں جو سحر بند تھا سوارانِ لشکرِ اسلام قید تھے، افراسیاب جادو شہنشاہ طلسمِ ہوش رُبا بنفسِ نفیس وہاں موجود تھا۔ اس کی عیارنی بچی ملکہ صرصر بھی ہمراہ تھی، عمرو عیار پہلے ایک کالی بلی بن کر آئے، پھر شہنشاہ و جنّات بنے اور اس لطف سے عیاری کی کہ صرصر جیسے دعوےٰ تھا کہ عمرو کوئی عیاری کرے وہ پہچان لے گی سب ہیکڑی بھول گئی اور شاہِ جنّات کو دیکھتے ہی کانپ اُٹھی اور عمرو

نے اپنے سب رفیق قید سے چھڑا لئے۔ خداوندِ جمشید جادو بن کر افراسیاب جادو سے لوحِ طلسمی کا پتہ لیا، لاچین جادو سابق شاہِ طلسم اور بدیع الزمان جو دس سال سے طلسم میں قید تھے ان کی قید کا مقام دریافت کیا۔ پھر حیات جادو نے جو ملکہ حیرت جادو زوجہ افراسیاب کا دالد اور بڑا ہی جید ساحر تھا، بلا بھیجا تو وہاں جا کے عیاری کی اور حاضرات کے دھوکے سے امیر حمزہ کی زمرد شاہ خداوند لقا سے جنگ کا نقشہ دکھایا اور صاف بچ کے نکل آئے۔ یہی وہ عیاریاں ہیں جن کی وجہ سے ساحران کے نام سے کانپتے تھے۔

کہیں وہ نازنین بنے کسی جادوگر کا مال ہتھیانے کی فکر میں ہیں، کہیں یونہی خوش وقتی کے طور پر کسی جادوگر کو لوٹ کر اس کا مال زنبیل کی نذر کرتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہیں جہاں طائرِ وہم بھی نہ پر مار سکے۔ جب[1] افراسیاب جادو سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو آفتاب فلک سیر جادو سے چند تحائفِ طلسمی کو جو اس کے آباو اجداد نے سامری و جمشید سے حاصل کئے تھے، افراسیاب لاتا ہے اور ایک گنبد سحر تعمیر کر کے وہ تحفہ جات وہاں لٹکا دیتا ہے ان کی تاثیر سے جو دشمن بھی اس گنبد کے سایہ میں پہنچتا ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا ساحر کیوں نہ ہو، اتنے برچھے اور بھالے اور تلواریں اس پر پڑتی ہیں کہ وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ خواجہ عمرو جان پر کھیل کر آفتاب فلک سیر سے آئینہ طلسمی لاتے ہیں اور اس کی بیوی گلزار جادو کی شکل میں وہ آئینہ اس گنبد کو دکھا کے اسے برباد کرتے ہیں۔ افراسیاب کو تو آخر میں وہم ہو جاتا ہے کہ جہاں خواجہ کا نام کسی نے ایک دفعہ لیا، انہیں معلوم ہو گیا اور دوسری دفعہ نام لینے پر وہ اس طرف چل پڑے اور تیسری دفعہ جو نام لیا وہ آئے اور پھر کسی کی قضا آئی۔ اسی لئے سب انہیں شہنشاہ اقلیم عیاری کہتے ہیں۔

بعض عادات خواجہ کی بہت دلچسپ ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ حد درجے کے بخیل اور حریص ہیں اگر کسی جادوگر کو مارتے ہیں تو اس کے کپڑے تک اُتار لیتے ہیں۔ شاگردوں کو خلعت ملے تو ان سے وہ بھی رکھوا لیتے ہیں۔ جب امیر حمزہ نے خواجہ عمرو، مہتر قران، برق فرنگی، ضرغام اور جانسوز کو شاہزادہ اسد کے ساتھ طلسم ہوشربا کی طرف جانے کو کہا تو خواجہ نے کہا ہم تو مکہ زیارت کو جاتے ہیں جب امیر نے پانچ لاکھ روپیہ زادِ راہ دینے کا نام لیا تو خواجہ نے روپیہ چھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور اسد کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے جب کبھی کسی مہم پہ جانا ہو تو پہلے خواجہ اسی طرح بگڑتے جب کچھ روپیہ مل جاتا تو ہلتے۔ بعض دفعہ ان کی اور اسد یا امیر یا بدیع الزماں کی خوب نوک جھونک ہوتی، وہ کہتے ہم واپسی پر روپیہ دیں گے۔ خواجہ پیشگی پر اصرار کرتے۔ مگر یہ سب کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بہانے ہیں، خواجہ جانے کو پہلے سے ہی تیار رہتے۔ مگر جب امیر نے اس دفعہ باقی کے چار عیاروں کو بھی پانچ لاکھ روپیہ عنایت کیا تو عمرو نے کہا "یا امیر آپ ناحق میرے شاگردوں کو روپیہ دے کر خراب کرتے ہیں" پھر اُن عیاروں سے کہا "اونا شدنیو تم یہ پانچ لاکھ روپیہ لے کر سب برباد کرو گے لاؤ مجھ کو دو میں رکھ چھوڑوں، وقت پر تمہارے کام آئے گا۔ استاد روپیہ لے کر تم عیاری خاک کرو گے، کیا اپنے پاس کا روپیہ صرف کر کے طلسم میں جاؤ گے"۔ عیار سمجھے کہ اُستاد روپیہ دیکھ چکے ہیں، چھوڑیں گے نہیں۔ غرض انہوں نے وہ روپیہ بھی عمرو کی نذر کیا۔

[1] طلسم ہوشربا۔ جلد ہفتم

جہاں لشکرِ اسد کو فتح ہوتی اگر خواجہ ساتھ ہوتے تو پہلے ہی جا کر جال الیاسی مار کر ایک ہی ہلہ میں سب خزانہ داخلِ زنبیل کر لیتے اور بارگاہ میں آ کر مسکین سی صورت بنا کر بیٹھ رہتے اگر کوئی پوچھتا تو کہتے کہ لڑائی میں خیال نہ رہا، دو صندوقچے جواہرات سے بھرے ہوئے کہیں گر پڑے، اب مہاجن سُود کے لئے پیچھے پڑے ہیں۔ اگر کسی زبردست ساحر سے مقابلہ ہوتا اور سردارانِ لشکر خواجہ سے کہتے کہ خواجہ بہرِ خدا جاؤ اور عیاری کرو تو مُنہ پھُلا کے کہتے "میں مقروض ہوں، قرضخواہ سُود کے لئے پیچھے پڑے ہیں۔ باہر نکلنا بند ہے۔ باہر جاؤں تو کیسے جاؤں" سب سردار خوشامد کرتے مگر خواجہ کہتے "بھائیو باتوں سے کچھ نہیں بنتا۔ کچھ روپیہ خرچ کرو تو بنے" سب طرف سے اشرفیاں اور زیورات انہیں دیئے جاتے تو وہاں سے ہٹتے۔ خواجہ کو روپیہ اتنا عزیز تھا کہ اگر حیرت جادو کی مدد کو کوئی اس کا عزیز لشکر لے کر آتا اور حیرت جادو اس پر زر نچھاور کرتی آتی تو خواجہ کسی شہدے کا بھیس بدل کے یہ روپیہ ہی لُوٹتے پھرتے۔ جب افراسیاب جادو مارا گیا اور اس کا خزانہ اسد کے ہاتھ آیا تو خواجہ کی طبیعت کو جانتے ہوئے انہوں نے باغبان جادو اور سمار قدرت دو افسرانِ لشکر کو خزانہ کا روپیہ شمار کرانے پر منتظم مقرر کیا اور حکم دیا کہ خواجہ کو ادھر نہ آنے دینا۔ چنانچہ اُنہوں نے خواجہ کو تو اُدھر آنے سے منع کیا۔ مگر خواجہ نے منت کی کہ وہ اور کچھ نہیں چاہتے فقط اِدھر سے اُدھر پھر کے روپوں کے انباروں سے گذر جائیں گے۔ ان کا کیا حرج ہے۔ مگر اسد بن کرب جو جوانی کے عالم میں خود قزاقی کیا کرتے تھے خواجہ کی چالاکیوں سے واقف تھے انہوں نے خواجہ کی جوتیوں کی طرف نگاہ کی۔ دیکھا گیا کہ خواجہ نے تلوں کے نیچے موم لگا رکھا ہے اور اِدھر سے اُدھر گزرنے پر کچھ اشرفیاں تلوں سے چمٹ گئی ہیں۔

خواجہ کی اس خصوصیت پر اِس قدر زور دیا گیا ہے کہ بعض دفعہ تو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ ظرافت میں بھی غلو کام نہیں دیتا مگر اس سے یہ مُراد نہیں کہ خواجہ نے کبھی روپیہ خرچ نہیں کیا۔

جب کرب غازی کی نسبت ملکۂ زبیدہ شیر گیر سے پختہ ہو گئی تو کرب[1] غازی جنہیں خواجہ عمرو نے اپنا فرزند بنا رکھا تھا اور جن سے انہیں بہت اُلفت تھی بہت ملول و پریشان ہوئے کہ میں اتنا امیر نہیں کہ دخترِ امیر کا ہم پلّہ ہو سکوں، اس کی حیثیت کے مطابق برات اور زیور لے جا سکوں تو خواجہ نے تمام خرچ اپنے ذمے لیا اور اس فراخدلی سے خرچ کیا اور اس دھوم دھام سے برات لے کر گئے کہ شاہانِ عالم دنگ رہ گئے۔ پھر جب[2] امیر نے خواجہ کو ملک سنجان میں شاہزادہ بدیع الزمان کی خبر کو بھیجا تو خواجہ راہ میں زمرد شاہ کے پایہ تخت سائل ہیں سے گزرے جو باختر میں خدائی کرتا تھا وہاں کئی ایک توڑے اشرفیوں کے گردمرو عیار سے شرط میں جیتے۔ اس شہر میں خواجہ کی ہمشیرہ اور بہنوئی اخی سعید رہتے تھے۔ خواجہ جب اپنی ہمشیرہ سے ملنے گئے تو وہ سب توڑے اشرفیوں کے اپنی بہن کی نذر کئے۔ مگر ایسے واقعات خواجہ کی زندگی میں شاذ ہی گزرتے تھے اور عام طور پر ان کی حرص کی کیفیت سے بیان میں ظرافت کی چاشنی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔

[1] ہرمز نامہ ۔ ۳۔ ۵ کوچک باختر

خواجہ عمرو دُنیائے ظرافت کے ایک اور مشہور کردار کی طرح خود ہی ظریف نہیں بلکہ دوسروں میں بھی ظرافت کا باعث ہوتے ہیں۔ یعنی بختیارک بن بختک جو پہلے نوشیرواں پھر فرامرز اور ہرمز فرزندان نوشیرواں کا وزیر ہوتا ہے اور بعد میں خداوند لقائے باختری کا شیطان بنتا ہے، ایک اور مزاحیہ کردار ہے۔ خواجہ اس سے ہمیشہ ریش کا خراج لیتے ہیں۔ وہ اُن کے نام سے کانپتا ہے جب کبھی اسے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ محفل میں موجود ہیں تو اونچی آواز میں صلوٰۃ برابراہیم کہنے لگتا ہے اور ایسی مسخرہ پن کی باتیں کرتا ہے کہ پڑھنے والا اکثر بے ساختہ مسکرا دیتا ہے۔

مگر خواجہ کا کردار بھی امیر حمزہ کی طرح جامد وساکن ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک اُن کی طبیعت میں کوئی فرق اور فطرت میں حوادثِ زمانہ یا تجرباتِ زندگی سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ یعنی وہ شروع ہی سے ایک مکمل شخصیت کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں اور آخر تک ان میں وہی خصوصیات قائم رہتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ دونوں کردار دو قسم کی شخصیتوں کے نمونے ہیں مکمل جیتے جاگتے گوشت پوست رکھنے والے کردار نہیں۔ ہمیں امیر کی بہادری، پہلوانی اور جہانگیری کے علاوہ سوانے ان کے متعدد معاشقوں کے جو ایک دوسرے سے سرِ مو فرق نہیں رکھتے، اور کچھ معلوم نہیں۔ امیر کسی قتالۂ جہاں کو دیکھ کر اسی طرح بیہوش ہو جاتے جیسے وہ حسینہ آپ کو دیکھ کر اور یہی طرزِ عشق بازی دوسرے شاہزادوں اور شاہزادیوں کی ہے۔ چند ایک مصائب کے بعد کہ یہ مصائب بھی تقریباً ایک ہی تراش خراش کے ہوتے ہیں، ان دونوں عشق زدوں کا انجام بخیر ہو جاتا ہے۔ یہ کہ امیر ان بیویوں سے کیسا سلوک کرتے ہیں، صبح اُٹھتے ہیں تو ان کا مزاج کیسا ہوتا ہے، اتنے فرزند اور پوتے ہیں، کس کو کس سے زیادہ چاہتے ہیں اور ایسی ہی اور باتوں کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی فقط ایک ہی شکل دیکھتے ہیں۔ انہیں ہر رُخ اور ہر پہلو سے نہیں دیکھ سکتے۔

ایسے ہی خواجہ عمرو کو ہم ایک جانباز کی حیثیت سے ایک نڈر، چالاک، بیباک، طرار، مکار عیار کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، یا ایک لالچی اور ظریف شخص کے رُوپ میں یا ایک بے مثال گویتے کے رنگ میں۔ ہمیں ان کے خیالات، ان کے ذاتی افکار ان کے خانگی حالات، ان کی صحت، ان کی طرزِ بود و ماند ان کی چھوٹی چھوٹی جزئی باتوں سے مصنف آشنا نہیں کرتے۔ لہٰذا ان کا کردار فنی لحاظ سے ادھورا اور یک رُخہ رہ جاتا ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں ان کی باتیں سنیئے۔ ان کی عیاریاں دیکھیے، ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور دانشمندی ملاحظہ کیجئے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بیشک خواجہ عمرو عیار اُردو فسانہ نگاری کے ایک بطلِ عظیم ہیں۔

اب ذرا دو کلمے ان داستانوں کی طرزِ نگارش کے متعلق کہنا چاہتا ہوں:-

اس داستان طویل میں تخیل کی جو فراوانی پائی جاتی ہے وہ شاید دُنیا کی کسی اور داستان میں صرف نہیں کی گئی۔ افسوس اس امر کا ہے کہ اگرچہ تخلیق کے موقع پر تخیل سے کام نہیں لیا گیا مگر ضبط اور اصول کی پابندی کا بالکل خیال نہیں رکھا۔ مبالغہ آمیزی کسی حد تک

ایسی داستانوں کی جان ہوتی ہے مگر نہ اس حد تک کہ بدیع الزماں گنجاب شاہ سنجان کے لشکر پر تیس شب خون اکیلا مارتا ہے
پھر جب اس کا ہم چشم قاسم خونریز باختر میں جا کر لقائے باختری کے لشکر پر اسی طرح اکیلا ۳۵ شب خون مارتا ہے تو بدیع الز
چالیس روز خوں مارتا ہے۔ لاکھوں کا لشکر اور یہ شب خون اور روز خون ہر شب اور ہر روز اور ان دونوں کو کوئی خفیف سی ضرب آ
تو آجائے ورنہ کوئی زخم کاری نہیں لگتا۔ ایک اور ظلم ملاحظہ ہو، اور یہاں تو قاعدہ اور تناسب چھوڑ صریحاً جہالت اور کور ذوقی ۔
لیا گیا ہے۔ سرفتنہ نورافشاں میں مندرجہ ذیل شاہزادے برائے فتاحیٔ طلسم نکلتے ہیں: شاہزادہ سکندر زریں علم بن ایرج شا
ضیغم شیر شکار بن اسد غازی، شاہزادہ سرو سہی قبا بن سعد بن قباد بن حمزہ اور شاہزادہ مہران جواں بخت بن نورالدہر۔ یہ امیر
پوتوں کے بھی پوتے ہیں اور طلسم کشائی امیر حمزہ کے ہاتھ سے ہوتی ہے۔ جہاں شاہزادیاں طلسم ان جوان شاہزادوں پر عاشق
ہیں وہاں امیر پر بھی اسی طرح فدا ہوتی ہیں اور امیر کی وجاہت اور شکل و صورت کی بھی انہیں الفاظ میں تعریف ہوتی ہے جو
ان پڑپوتوں کی۔

نوشیرواں نامہ میں مصنف کو رستم پیلتن فرزند حمزہ کی شوکت دکھانی منظور ہے، چنانچہ ایک جگہ لندھور بن سعدان جانش
کو جسے امیر جوانی کے عالم میں بھی سر سے بلند نہ کر سکے تھے رستم پیلتن مع لندھور کے ہاتھی میمونہ کے سر سے اونچا اٹھ
ہیں۔ یہاں اس بات کی شکایت نہیں کہ یہ شاہزادے دیووں کو اٹھا کے پھینک دیتے ہیں اور اژدہوں کو چیر ڈالتے ہیں اور ش
کو گھونسا مار کے ہلاک کر دیتے ہیں، ہاتھی کی سونڈ پکڑ کر مع زنجیرہ اس کی گردن کھینچ لیتے ہیں۔ یہ تو اُن کا روزمرہ ہے مگر یہ اعت
ضرور ہوتا ہے کہ فقط امیر کے ایک فرزند کی شوکت نمائی کے لئے ایسے بہادر کی یوں توہین کرنا اصول داستان نویسی کے خلاف

ایک اور امر جو خاص طور پر ان داستانوں میں ناظرین کی آنکھ میں کھٹکتا ہے وہ مصنفین کا ان بہادروں سے برتاؤ ہے جو
اس کے فرزندوں سے زیر ہو جاتے ہیں، یا ان جادوگروں اور جادوگرنیوں سے جو لڑ کر مطیع لشکر اسلام ہو جاتی ہیں۔ یہ بہادر جب
اول مقابلے میں آتے ہیں تو ہر شاہزادے سے لڑتے اور بہتوں سے برابر رہتے ہیں اور یہ ڈر ہوتا ہے کہ یہ بہت زبردست پہلوا
کی بدعت سے خدا بچائے مگر کوئی نیا پہلوان یا بہادر یا بادشاہ لڑنے کو آتا ہے تو یہ پہلوان پر اتنی فوقیت رکھتا ہے کہ اس کو ز
میں پھر صاحبقران سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ سوائے معدودے چند مثلاً لندھور مالک اژدر، بہرام گرد یا ایک آدھ اور کے طلسم
میں جو نئی جادوگرنی یا جادوگر آتا ہے بہت زبردست دکھائی دیتا ہے مگر جب مطیع ہوتا ہے تو پھر اس سے کوئی خاص نمایاں کا
نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر فقط دو شہزادیوں کو لیجئے، ملکہ ماران زمین کن اور ملکہ لعل سخندان۔ یہ دونوں جب افراسیاب کی ط
آتی ہیں تو ان سے سب لشکرِ اسلام کانپتا ہے اور جب یہ طرفدارِ اسد ہو جاتی ہیں تو ان کا رتبہ ان شاہزادیوں سے بہت کم
جو اول اول مطیع ہوئیں، مثلاً ملکہ بہار گلعذار اور مخمور سرخ چشم اور برق والدہ رعد جادو اور برق لامع وغیرہ سے۔

[1] کوچک باختر۔ [2] بالا باختر۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس داستان کا چونکہ ہر کردار جامد و ساکن ہے اس لئے ان پر دس پندرہ سال کی مُدت کچھ اثر پیدا نہیں کر سکتی۔ مثلاً غضنفر بن اسد غازی طلسم ہوشربا کی جلد اوّل میں جب اپنے قزاقوں سمیت لشکر اسد کی مدد کو آتا ہے تو اس کی عمر بارہ برس کی ہوتی ہے اور پندرہ سال گزرنے پر جب جلد ہفتم میں شریکِ لشکر طلسم کشا ہوتا ہے تو اسی طرح کمسن ہوتا ہے اور گھوڑے پر اس کی پٹڑی ابھی تک ٹھیک طور سے نہیں جمتی۔

ایک بات جو عیاروں یا عیار بچیوں کی عیاریوں میں سمجھ میں نہیں آتی یہ ہے کہ خواجہ عمرو جن کا قد نو گز کا ہے کیسے صرصر شمشیر زن عیار بچی افراسیاب جادو کا بھیس بدل سکتے ہیں یعنی وہ اپنے قد کو کیا کرتے ہیں، یا صرصر جب عمرو عیار کا بھیس بدل کر اور شکل بنا کے لشکر اسلام میں جاتی ہے تو وہ اپنے بوٹے سے قد کو کھینچ کر اتنا لمبا کیسے بنا لیتی ہے۔ اسی لئے مہتر قران کی عیاری ہمیشہ پسندیدہ سادہ اور انوکھی ہوتی ہے، وہ کبھی عورت کا بھیس نہیں بدلتے اور نہ کسی چھوٹی عیاری میں شرکت ہی کرتے ہیں۔

اب رہا ان مصنفوں کا اسلوب بیان:۔

ہر سہ حضرات نے ترجمہ کرتے وقت نہایت فراخدلی سے داستان میں تصرف کیا ہے اور کبھی اضافہ کرتے وقت سلسلہ بیان کو قطع کر کے اس امر کا فخریہ اظہار کر دیتے ہیں، جو اکثر پڑھنے والے کو ناگوار ہوتا ہے۔ ان تینوں حضرات میں سے شیخ تصدق حسین میں تکلف زیادہ ہے، یعنی اگرچہ اکثر سلیس زبان لکھتے ہیں مگر مقفیٰ ہونے کے سبب زبان آج کل کے ناظرین کو پر تصنع معلوم ہوتی ہے۔ منشی احمد حسین قمر کی زبان نسبتہً علمی ہے۔ سید محمد حسین جاہ کی زبان میں روزمرہ کی چاشنی اور سادگی زیادہ ہے خصوصاً عورتوں کی زبان وہ خوب لکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ چند سطور لیجئے:۔

"ضرغام اسد بن کرب کا عیار حیرت جادو کے لشکر میں عیاری کرنے گیا، گرفتار ہو گیا، ایک زنجیر میں لٹک گیا۔ حیرت نے سحر پڑھا، زنجیر ضرغام کو حیرت کے سامنے لے آئی۔ حیرت نے اسے زنجیر سے چھڑایا اور پہچان کر ایک طمانچہ ڈھیلے ہاتھ سے اسے مارا کہ موئے تو یہاں کہاں آیا۔ ارے موذی کاٹو تم تو ہمزاد ہو گئے کہ جہاں جاؤ وہاں ساتھ۔ ضرغام نے کہا میرا بھی جی سیر کو چاہا آپ کے ساتھ چلا آیا مثل چلی آتی ہے کہ گھر آتے کُتّے کو بھی نہیں نکالتے، تم نے تو طمانچہ مارا۔ ملکہ اس بے باکانہ کلام سے ہنس پڑی اور کہا ہم ایسے ہی بے مروت ہیں مگر آپ تشریف لے جایئے۔ اس نے جواب دیا کہ کیا میں اس زمین کے موتی توڑ لوں گا، اتنا اترانا اچھا نہیں، سیر کو آئے تھے چلے جائیں گے۔" یا اس مثال کو لیجئے:۔ "کنیزان حیرت جادو میں ایک کو احتیاج ہوئی —— اس نے اپنے ساتھ والیوں سے کہا بہنا مجھ کو جائے ضرور پر جانا ہے کوئی چلتا ہے میرے ساتھ اس نے کہا تجھ کو ہر بار ایسی ہی جگہ پر احتیاج ہوتی ہے بھلا یہ کون موقع ہے شہنشاہ آنے والے ہیں، نہ بی بی ہم میں سے کوئی نہ جائے گا۔ یہ کیا تو نے عادت سیکھی ہے کہ ایک تو آپ جاتی ہے اور دوسرے اور کو لے جاتی ہے۔ ایک عورت نے ان میں سے کہا کہ یہ رنڈی اپنے پیلے چمڑے پر اتراتی ہے۔ اس نازنین نے جواب دیا کہ اُوئی اتنا بیرا

پوچھنا کہ ساتھ چلو غضب ہو گیا، ہزاروں باتیں تم نے مجھے پکڑائیں، اگر تم میرے ساتھ نہ جاؤ گی تو مجھ کو کوئی کھا نہ جائے گا۔"

مگر سب کی زبان عام طور پر مقفّیٰ ہوتی ہے مثلاً یہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

" ارے مردانِ عالم سے آنکھیں چار کرا ہم پر وار کر، غیر ساحر کو دیکھ کر بہت پھولا، اپنی حقیقت بھولا۔" یا ملک اطلس نے قہقہ آواز دی" او افراسیاب کیوں جامے سے باہر ہے ہمارے بندوبست سے نہیں باہر ہے، ہمارا تیرا چھلی دامن کا ساتھ ہے لیکن ا گریبان ہے اور میرا ہاتھ ہے۔" یا پھر:۔ "بے حیائی آنکھوں میں سمائی، کبر و غرور کی مزاج میں رسائی، شیطان کا سگا بھائی۔"

ہر سہ حضرات نے تعریفِ حُسن یا مناظرِ قدرت یا کیفیت عشاق یا رزمیہ بیان میں ایک جیسی تراکیب استعمال کی ہیں اور ایک جیسا پایا ہے۔ ہر نازنین کے حُسن کی ایک جیسے الفاظ میں تعریف کرتے ہیں مثلاً " طاؤس طناز، ماہ رخسار، گلعذار، کبک رفتار، شیریں گفتہ بوستانِ خوبی، غنچۂ حدیقۂ محبوبی، دریائے جواہر میں غوطہ زن، معشوق پُرفن، رشکِ چمن۔" عاشق کسی محبوبہ کو یوں پکارتے ہیں" اے گُلِ خوبی، اے سروِ نوخاستۂ حدیقۂ محبوبی، اے سروِ خرامانِ گلشنِ دلفریبی، اے شاخِ نہالِ چمنستانِ رنگیں مزاجی۔" وغیرہ۔ خواجہ عمرو لعنتی ہیں تو مسجع عبارت میں مثلاً "منم مہرِ سپہرِ عیاری وہیرِ بردشت طراری، ماہ آسمان مکاری، آفتاب چرخ خنجر گزاری۔" اگر کسی شاہزا کرنی ہو تو اسد بن کرب غازی کی تعریف کو نمونہ سمجھ لیجئے:۔" شاہبازِ اوجِ شوکت، عقابِ شکارگاہ جرأت و لیاقت، یکہ تازِ میدان شہسوارِ معرکۂ ہمت، صاحبِ جاہ و وقار اسد نامدار۔"——

عاشق و معشوق کے فراق یا وصال کے بیان میں بھی وہی مشابہت ہے۔ عورت کے سراپا اور وصل کی کیفیتوں کے بیان کرنے میں کہیں کہیں عریانی سے کام لیا گیا ہے، یہ بات خصوصیت سے محمد حسین جاہ میں پائی جاتی ہے۔

مگر جہاں یہ تصنّع موجود ہے وہاں ناموں کی شوکت اور جنگ کی کیفیت بیان کرنے میں یہ لوگ بہت کمال رکھتے ہیں۔ ہوشربا میں جب افراسیاب سب طرف سے گھر جاتا ہے تو اس کی آخری لڑائی سے وہ شوکت اور جلال ٹپکتا ہے کہ ہر کس و ناکس خوا دوست اس کے سحر سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ واقعی یہ لڑائی بہت پُر زور انداز میں لکھی گئی ہے۔ پہلوانوں، جادوگروں اور کے نام بہت دلچسپ ہیں۔ مندرجۂ ذیل نام ملاحظہ ہوں" شبرنگ سیہ فام سگ پیکر خوک دندان اژدر چشم تیرہ پیشانی جادو۔" اس نام یہ ہے" ظلمات تیرہ فام میمون صُورت خرس دندان شیر صولت درازلب بلند بینی جادو۔" چند پہلوانوں کے نام جو ایک ہی گئے ہیں یہ ہیں:۔" توسن اشہب سوار۔ عیوق برف بار، سالارِ آسمان سیر۔ منقار کرگدن سوار۔ اختر گلگوں پوش، شیدائے ارہام دراز بینی، مبہوت شیر پیکر۔ ببرانِ صحرا نورد وغیرہ۔" فقط ان شہزادیوں کے نام ملاحظہ ہوں جو شاہزادہ اسد بن کرب غازی ہوئیں:۔ "مہ جبیں الماس پوش۔ لالان خوں قبا۔ لعل سخنداں، مواج قطرہ زن، طاؤس پری چہرہ۔ ملکہ ناہید کاکل کشا، ملکہ پوش اور ملکہ خورشید روشن جمال" وغیرہ۔

روزمرہ تو بالکل لکھنؤ کے انداز میں ہے۔ خواہ ماں بیٹی کی گفتگو ہو خواہ کنیزوں کی نوک جھونک، بیوی خاوند سے گلہ کرے خواہ ماں بیٹی کا بین کرے سب نہایت سلیس بامحاورہ اور پُرلطف زبان استعمال کرتی ہیں۔ بازار کے لوگوں کی گفتگو، فوجیوں کی تُو تُو مَیں مَیں شہدوں فقیروں اور گھوسیوں کی زبان ان کے اپنے طبقے کی زبان ہوتی ہے مگر ایک نقص ضرور ہے کہ خواہ حیرت جادو ملکہ طلسم ہوشربا افراسیاب کو دوسری بیوی کر لینے پر کوسے، خواہ گلچین جادو زوجہ باغبان قدرت وزیر اعظم افراسیاب جادو اپنے خاوند سے تکرار کرے ان میں اور عام طبقہ کی عورتوں کی زبان اور انداز میں کم فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً حیرت جادو اپنی بہن بہار جادو کو جو شریک عمرو ہے یوں کوستی ہے" ارے تونا شاد مرے، اپنی جوانی سے جائے تو مُوئی میرے وارث کو کوستی ہے، تیری سلطنت کو خاک میں ملاؤں، تجھے گہری گور میں توپوں"۔ ناقوس جادو کے مرنے پر اس کی بیوی نے نتھ اُتاری، چوڑیاں توڑیں، لاشہ پر بین کرنے لگی کہ" ہے ہے وارث میرے، ہے ہے راج سہاگ میرے۔ ارے میرے سر سے بادشاہی چتر اُٹھ گیا، میرا راج لُٹ گیا، اب میں کس کی رہوں گی ہائے افسوس مجھ کو رانڈ کر گئے۔ ارے صاحب کچھ میرے لئے کہہ بھی نہ گئے، اس لونڈی سے کیا تقصیر ہوئی جو خفا ہو گئے"۔

پھر بھی سید محمد حسین جاہ نے جو زبان میں مٹھاس پیدا کی ہے اور جو نقشے فوجی لوگوں، میاں بیوی، خادم و کنیز کے کھینچے ہیں، وہ لکھنؤ کی تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔ مثال دیتے وقت ایک جادوگر سے جسے عمرو عیار نے اپنی زنبیل میں کچھ عرصہ قید رکھا تھا، یہ کہلواتے ہیں "عمرو کی قید بدتر از قیدِ فرنگ ہے"۔ فوج میں بھگدڑ پڑی ہے۔ محمد حسین جاہ اس حالت کو یوں بیان کرتے ہیں "سب سردار بیدل ہوئے، رعایا وغیرہ اپنا اپنا انتظام کرنے لگے کہ شاہِ طلسم نے ملکہ کو پکڑوا منگوایا ہے مبادا کوئی آفت آ جائے تو اسباب لُٹ جائے گا، غفلت میں جان جائے گی، اس سے مناسب ہے کہ اسباب ہٹا دیں، آپ ٹل بیٹھیں پھر جس راجہ کا راج ہوگا دیکھ لیا جائیگا"۔ یہ خالصتہً ہندوستانی افواج کا نقشہ ہے۔

غرض یہ کہ اگر آپ جادوگری اور ناممکنات داستان کو ایک لمحہ نظرانداز کر دیں تو عام لوگوں کی زندگی کے بیان پڑھتے وقت آپ کو محسوس ہوگا کہ لکھنؤ کے اطراف کا حال بیان کیا جا رہا ہے [1]

سیّد فیاض محمود

---

[1] یہ مضمون مختصر صورت میں آل انڈیا ریڈیو لاہور سے ۲۵ مئی ۱۹۳۸ء کو نشر کیا گیا تھا۔

کامنی

(۱)

بدن چرائے، نظر جھکائے
یہ کون نازک سی کامنی ہے ؟
خرام کا لوچ کیا ہے گویا
ندی کی خاموش راگنی ہے

حسین قامت کی شوخیوں میں
عجب قیامت کی دلکشی ہے
کہ جیسے چمپا کی نرم ٹہنی،
ہوا کی رو میں لچک رہی ہے

نگاہ اُٹھ اُٹھ کے رُک رہی ہے دراز پلکوں کی چلمنوں میں
کہ جیسے سہمے ہوئے پرندے جھجک رہے ہوں نشیمنوں میں

(۲)

مہین آواز نم لبوں سے
پھوار بن کر ٹپک رہی ہے
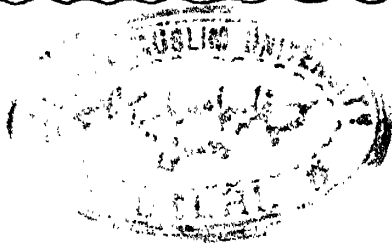
بسنت کی چاندنی میں گویا
کسُم سے شبنم چھلک رہی ہے

شباب یوُں مُسکرا رہا ہے
رُخِ حسیں کی صباحتوں میں
کنوَل کوئی جیسے کھل رہا ہو
سحر کی دوشیزہ طلعتوں میں

سیاہ زلفوں کی کچھ لٹیں مستیوں میں عارض کو چُومتی ہیں
کہ جیسے ساون کی نم گھٹائیں اُفق پہ لہرا کے جھُومتی ہیں

(۳)

عمیق جھیلوں کی ظلمتیں ہیں
سیاہ آنکھوں کی دلکشی میں
شفق کی گلرنگ سُرخیاں ہیں
لبوں کی نورس شگفتگی میں

جمالِ رُخ کے سلونے پن میں
عجب طلسمی صباحتیں ہیں
ملاحت افروز تازگی ہے

حباب کی سی نزاکتیں ہیں

ابھی ابھی سانولا تھا چہرہ، ابھی ابھی رنگ کھل گیا ہے
کہ جیسے کچنار کا شگوفہ کہ مینہ برسنے سے دھل گیا ہے

(۴)

جبیں پہ معصومیت کی لہریں
نظر میں عفت کی سادگی ہے
یہ وہم ہے شوق کے فسوں کا
کہ واقعی مسکرا رہی ہے؟

لبوں پہ ہلکا سا کچھ تبسّم
مگر تبسّم ملول سا ہے
سُتا ہوا ہے حسین چہرہ
حسین چہرہ جو پھول سا ہے

حیا میں کچھ ایسی تمکنت ہے کہ سب کی آنکھیں جھکی ہوئی ہیں!!
اگرچہ حیرت کا ہے یہ عالم دلوں میں سانسیں رکی ہوئی ہیں!!

ذوقی

سفینۂ راحل

کبھی کی یاد

(۱)

یاد ہے کچھ؟ اے چاند! وہ نقشہ — اِک شب میں اور وہ بُتِ ترسا
آئے تھے یاں بر لبِ دریا — اور اُلفت کا عہد کیا تھا
محرمِ راز ہمارا تُو ہے — اِس لئے مجھ کو پیارا تُو ہے!!

عندلیب

(۲)

سکوتِ شام تھا، ہم تم تھے، دریا کا کنارہ تھا — جُدا ہونے سے پہلے کس قدر دلکش نظارہ تھا
سفینہ چاندنی کا تھا رواں دریا کے سینے پر — ہمارے عیش کے دِن جا رہے تھے اُس سفینے پر

تابش

سوزِ ناتمام

(۱)

گلستاں گرمیٔ انفاس گُل سے تمتما اُٹھا — کہ رُوحِ عشق لے کر زندگانی کا شرار آئی
گھِر آیا جھومتا، دھومیں مچاتا ابرِ آزاری — اور اُس کی پیشوائی کو یہ چشمِ اشکبار آئی
صبا کے مست سحر انگیز جھونکے پے بہ پے آئے — بھلانے پر بھی یاد اُس بے خبر کی بار بار آئی

حامد علی خاں

(۲)

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب — مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب
چشمک چلی گئی تھی ستاروں کی صبح تک — کی آسماں نے دیدہ درائی تمام شب
تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے — دیتے رہے ہیں میر دکھائی تمام شب

میر تقی

راحل ہوشیارپوری

اقبال اور گارڈنر

"ایک زمانہ سے میرے نام مسٹر گارڈنر کا یہ خط بہ زبان انگریزی میری فائل میں پڑا تھا۔ اتفاقاً ایک ساتھ دو ایسی باتیں پیش آگئیں کہ طبیعت خواہ مخواہ مجبور ہو گئی کہ اس کا اُردو ترجمہ شائع کر دوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی ابھی مسٹر کونڈر کوچ کی کتاب "مضامین گارڈنر" پر میری نظر پڑی اور اپنے خط کو مضمون کی شکل میں اس میں درج پایا اور دوسرے یہ کہ اس مضمون کے آخری حصّہ میں اس مایۂ ناز ہستی کا تذکرہ آگیا ہے جس کے کھو جانے کی تلافی کم از کم اس صدی میں نہیں ہو سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا مضمون اس مرحوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ آہ ——— اقبال!"

کوکب

۱

مائی ڈیئر مسٹر گارڈنر!

میں چونکہ انگریزی جریدہ نویسی کی دُنیا میں صرف آپ ہی کا قائل ہوں، اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ ایک نہایت ہی اہم سوال آپ کے سامنے پیش کروں اور مجھ کو یقین ہے کہ آپ اس کا بہترین جواب دیں گے جس کے بعد ایک طویل مضمون ہندوستانی رسالوں کے لئے قلمبند کروں گا۔ **سوال:** موجودہ ہندوستان میں آپ کس کو سب سے بڑا انسان سمجھتے ہیں اور کیوں؟؟

خاکسار سیّد ظفر احمد کوکب

۲

فلیٹ اسٹریٹ، لندن۔

ڈیئر مسٹر ظفر!

یہ ممکن تھا کہ میں بتا سکتا کہ دُنیائے جدید کے مشہور اکابر کون کون ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں پوپ، کالے اور لائڈ جارج، برنارڈ شا اور چارلی چپلن، ٹروٹسکی اور مسولینی اور آئینسٹین اور روور فورڈ کے موازنے دُنیا کے سامنے پیش کر سکتا لیکن آپ کے سوال کا تشفی بخش جواب دینا صرف میرے لئے نہیں بلکہ تمام لوگوں کے لئے غیر ممکن ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اندازہ کر سکتے ہیں اور اس میں غلطی کا امکان ہے۔ دُنیا کا سب سے بڑا آدمی کسی اور جگہ چھپا رہتا ہے۔ مرنے کے بعد البتہ اُس کی شہرت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ شیکسپیئر کو لیجئے۔ کس کو معلوم تھا کہ وہ ایک دن فلکِ شہرت کا سب سے بڑا ستارہ مان لیا جائے گا! اس کے مرنے کے دو سو سال بعد اس کی حقیقت معلوم ہوئی اور اس پر طرّہ یہ کہ پہلے پہل غیر ملکی نقادوں نے اس کو ثابت کیا۔ کیا آپ کو تاریخ کے اوراق نہیں

بتاتے کہ زمانہ بعید میں روما کے تخت پر ایک شخص آگسٹس سیزر جلوہ افروز تھا جس کی شہرت تمام عالم میں ایک دیوتا سے کم نہ تھی لیکن اسی زمانے میں ایک معمولی سے صوبہ میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی پرورش پا رہا تھا جس کی تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ وہ جوان ہو کر دُنیا کا نقشہ بدل دیگا۔ اور سیزر کی روشنی اس کے سامنے بالکل ماند پڑ جائے گی۔ یہ کون تھا؟ (حضرت) عیسےٰ (علیہ السلام)!

پھر آپ فرض کیجئے کہ آپ ۱۵۰۶ء میں بمقام ولیڈ ولیسٹوک مقیم ہیں اور آپ سے یہی سوال کیا جاتا ہے۔ آپ یقیناً کہیں گے کہ پاپائے روم یا شہنشاہ فرڈیننڈ سب سے بڑی ہستیاں ہیں۔ آپ کو کبھی خیال نہیں ہوتا کہ ایک مشہور شہر کی ایک معمولی گلی میں ایک بچہ جو زندگی کی کٹھن گھڑیاں گزار رہا ہے اُن ظاہری بڑے لوگوں سے حقیقتہً کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس نے صرف ایسٹ انڈیز کی نئی راہ نکالی بلکہ اس لئے کہ اس نے امریکہ ایسے ایک عظیم الشان برّاعظم کو دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ کیا اس حقیقت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ اس صدی نے کولمبس کا کوئی دوسرا مقابل پیدا نہیں کیا؟

اچھا آگے چلئے اور سمجھئے کہ ۱۵۳۰ء میں مجھ سے کوئی سوال کرتا کہ اس دَور کے سب سے بڑے لوگ کون کون ہیں۔ بلاشبہ میں کہہ دیتا کہ ہنری ہشتم، چارلس پنجم، اور فرانسس اوّل اور ان میں افضل ترین اور اکبر ترین ہنری ہشتم۔ لیکن یہ میری ایک زبردست غلطی ہوتی کیونکہ دراصل اس کا حقدار ایک دوسرا شخص تھا جو دریائے وِسٹولا کے کنارے پیدا ہُوا تھا اور جس کا نام کوپرنکس تھا۔ اِسی شخص کی بدولت انسان اِس دُنیا کو بالکل ایک نئی چیز سمجھنے لگا اور یہ امر واضح اور ثابت ہو گیا کہ اس کے قبل اس زمین کے متعلق جتنے علوم دریافت ہو چکے تھے قطعی غلط تھے۔ یہ زمین جس کو زمانہ ایک وسیع شے سمجھے ہوئے تھا محض ایک ذرّہ بے حقیقت نکل آئی۔ اس زمانے میں اگر یہی کوپرنکس ایسی بات کرتا تو غالباً وہ دُنیا کا افضل ترین انسان نہ سمجھا جاتا۔

اب دوسری مثال آپ اٹھارھویں صدی کی لیجئے۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے سوال کے جواب میں ہر سمجھدار انسان پِٹ، برک، جانسن، واشنگٹن، نلسن اور نپولین کے نام گنوا دیتا، اس کا خیال کبھی اُس ایک حقیر شخص کی طرف نہ جاتا جو گلاسگو کی یونیورسٹی میں محض ایک مستری کا کام کر رہا تھا۔ لیکن حقیقت پوچھئے تو وہ جیمز واٹ ہی تھا جس کا مقابل آج تک دُنیا پیدا نہ کر سکی۔ اس نے انسان کی سب سے بڑی مخفی طاقت کا انکشاف کیا۔ یہ ریل گاڑی جو پٹڑیوں پر گڑگڑاتی نظر آتی ہے، یہ جہاز جو ہوا اور پانی کی راہ پیمائی کرتا نظر آتا ہے، یہ انجن جو بڑے بڑے کارخانوں کو چلانے میں مشغول ہے، اسی عجیب و غریب انسان کے خیالاتِ پریشاں کے اجزا ہیں۔

اس لئے میں آپ کو صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہو جو آئندہ مکمل ہونے والے نئے معلومات کے ذخیرے میں چُپ چاپ ذہن پردازی کر رہا ہو اور ہو سکتا ہے کہ یہ ایک دن دُنیا کو ہلا دے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک شاعر ہو یا ایک سائنسدان۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک سپاہی

یا قومی لیڈر نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ دُنیا میں ایک ہیجان ڈال ضرور جانتے ہیں لیکن خاص طور پر یہ کوئی ایسی بات نہیں نکالتے جس پر مستقل طور پر عمل کر کے آئندہ نسل ترقی کر سکے۔ نوعِ انسان کا سب سے بڑا فرد بہ ظاہر بالکل خاموش ہوتا ہے۔ اس کی آواز دیر میں پہنچتی لیکن پہنچتی ہے تو اس طرح کہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔

آپ منصفی کا واسطہ دے کر یہی سوال اپنی قوم کے اکابر سے کر سکتے ہیں۔ کیا اُن کو نہیں معلوم ہے کہ جگدیش بوس، رابندرا ناتھ ٹاگور اور اقبال کی آواز جو ابھی دھیمے طور پر ان کے کانوں تک پہنچتی ہے بلند ہو گی اور ایسی بلند ہو گی کہ ہمیشہ ایورسٹ کی ہم پایہ رہیگی

گو میرا یہ طویل جواب بھی بالکل ناکافی ہے لیکن آپ میری مجبوری سمجھ کر مجھے ضرور معاف فرمائیں گے۔

آپ کا ....

اے۔ ایچ۔ گارڈنر

سید ظفر احمد کوکب

اے ندی

اے ندی تیرے کنارے دن ڈھلے — پانی بھرنے آتی تھی لڑکی کوئی

جب بجاتی تھی تُو اپنا جلترنگ — چھیڑتی تھی وہ بھی کوئی راگنی

اور یونہی کھوئی ہوئی سی دیر تک — کھیلتی رہتی تھی لہروں سے تری

اب کہاں ہے وہ بتا سکتی ہے تُو؟

گیت اُس کا یا سُنا سکتی ہے تُو؟

تاجور سامری

خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل (اقبال)

اُس کو بھی مَوت آگئی میرے خدا!
جس نے اِک عالم کو زندہ کر دیا

بجلیاں جس کے قلم میں تھیں نہاں
تھا جو آوازِ رحیلِ کارواں

جو بڑا ہیسی عمل کا تھا نشاں
جس کو بت خانے[1] میں تھا حکمِ اذاں

ایشیا کو جس نے بخشا سوز و ساز
جس نے کرگس کو بنایا شاہباز

جس نے گائے دِل کی آزادی کے گیت
عاشقی میں جان دینا جس کی ریت

جس نے سینوں میں اُبھارے ولولے
برف کے ٹکڑوں میں شعلے بھر دیئے

تنگ تھا جس کے عمل کو یہ جہاں
ذوقِ رفعت لے گیا اُس کو کہاں؟

ہم ہی کو سب ترستے رہ گئے
ماہ و انجم منہ ہی تکتے رہ گئے

[1] اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ (اقبال)

عطاء اللہ سجاد

سات بہنیں

لارڈ آرچیبالڈ کیمبل ایک بہادر جنگجو تھا۔ اُس کی ایک ہی بیوی کے بطن سے سات لڑکیاں تھیں جن کی باہم محبت عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ آپس میں نسبی مشابہت اور حُسن میں برابر کی حصّہ دار ہونے کی وجہ سے وہ اس طرح معلوم ہوتی تھیں جیسے نرگس کے سات پھولوں کی مالا ہو۔ لارڈ کیمبل جنگجوئی کا اس قدر دلدادہ تھا کہ اس کو میدانِ جنگ سے کبھی فرصت نہ ملتی اور وہ اپنی بیٹیوں کی خبر گیری نہ کر سکتا۔ وہ سات بہنیں بائینوری میں جو شہر سے ایک بالکل الگ تھلگ مقام تھا، رہتی تھیں۔

افسوس! افسوس!! بائینوری کی تنہائی پر افسوس!!!

ایک دن دلفریب موسم تھا۔ مغرب کی خوشگوار ہوا مستانہ وار چل رہی تھی۔ سمندر میں جہازی لٹیروں کا ایک گروہ آئرلینڈ سے بائینوری کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اتفاقاً اُن کا جہاز سکاٹ لینڈ کے ساحل سے ٹکرا گیا اور وہ بچاؤ کے لئے فوراً ساحل پر اُتر آئے۔ (چونکہ جہاز ضائع ہو چکا تھا اس لئے خشکی پر چلنے کا ارادہ کیا) اور گروہ کے لیڈر نے اپنا بگل بجایا۔

افسوس! افسوس!! بائینوری کی تنہائی پر افسوس!!!

حسبِ معمول وہ ساتوں بہنیں اپنے تہ خانہ میں جو درختوں کے سایہ میں تھا ہرن کے بچوں کی طرح آرام سے بیٹھی تھیں۔ اچانک اُنہوں نے آدمیوں اور گھوڑوں کے آنے کا شور سُنا اور تشویش و اضطراب میں اپنی حفاظت کی خاطر اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں۔ اس وقت اُن کے دلوں پر یاس و حسرت کے بادل چھا گئے گویا وہ موت کے مُنہ میں جا رہی ہیں۔ لیکن یہ سب اُن کے باپ کی بے پروائی کا نتیجہ تھا۔

افسوس! افسوس!! بائینوری کی تنہائی پر افسوس!!!

وہ سات چاند سی صُورتیں جس قدر ممکن تھا بھاگیں لیکن نوجوان جہازی لٹیرے رُعب دار ڈانٹ ڈپٹ کے آوازے کستے ہوئے وادیوں اور پہاڑوں میں اُن کا تعاقب کرتے رہے، وہ اُن کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ اُن کے ساتھ چلیں اور اُن کی محبت کو قبول کریں اور اُن کو اطمینان دلاتے تھے کہ اُن کا باپ گھر کو اُن سے خالی دیکھ کر کچھ خیال نہ کرے گا۔

افسوس! افسوس!! بائینوری کی تنہائی پر افسوس!!!

وہ کچھ دیر اسی حالت میں دوڑتی رہیں، لیکن بالآخر اُنہوں نے جہازی لٹیروں کے قبضہ میں آنے کو مذموم خیال کر کے مرنے اور اکٹھا مرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ وہ ایک ندی کی طرف آئیں جس کے کنارے اس قدر اونچے تھے کہ آج تک اُن پر کوئی فردِ بشر نہیں گیا تھا۔ غیرت سے مجبور ہو کر اُنہوں نے اپنے آپ کو ندی کے گہرے پانی میں دے مارا۔ اور نظر سے غائب ہو گئیں۔

افسوس! افسوس!! بائینوری کی تنہائی پر افسوس!!!

یہ ندی ایک خطرناک وادی میں سے گزرتی ہے۔ اِس کا پانی جب پھسلتا چکّر کھاتا جا کر گھاس اور پتھروں پر سے بہتا ہے تو اس سے ایک قسم کا شور پیدا ہوتا ہے اور وہ شور اس طرح معلوم ہوتا ہے گویا ندی اُن سات بہنوں کا ماتم کر رہی ہے۔ اُس ندی میں سات جزیرے پیدا ہو گئے ہیں جن پر گھاس ہی گھاس ہے اور درخت کا نشان تک نہیں۔ ماہی گیروں کے قول کے مطابق یہ سات جزیرے اُن سات بہنوں کی قبریں ہیں جن کو پریوں نے دفن کیا۔

افسوس! افسوس!! بائینوری کی تنہائی پر افسوس!!!

محمد سراج منشی فاضل

(ترجمہ از انگریزی)

مکتب کے دن

ایک کتاب کا ایک دلچسپ باب

یہ افسانہ بھیجنے کی جرأت اس خیال سے کر رہا ہوں کہ اُردو میں اس قسم کے افسانے کمیاب ہیں۔ "ہمایوں" کے پڑھنے والوں میں ایک کثیر تعداد طلبہ کی اور اُن لوگوں کی ہے جن کی زندگیاں طلبہ سے وابستہ ہیں۔ یہ طبقہ اس قسم کے افسانوں یعنی مکتبی افسانوں (School boy stories) میں یقیناً زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔

مرالہ ایک اعلیٰ پایہ کا اقامتی سکول ہے۔ یہاں کے طلبہ دو گروہوں میں منقسم ہیں، اُردو خواں اور انگریزی خواں۔ اوّل الذکر اُردو کے حامی ہیں۔ اُردو میں گفتگو اور خط و کتابت کرنا نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ برعکس اس کے آخر الذکر انگریزی کے حامی ہیں۔ انگریزی میں گفتگو اور خط و کتابت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ دونوں علیحدہ علیحدہ اقامت خانوں میں رہتے ہیں۔ ان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے زبردست مقابلہ رہتا ہے۔ مجید انگریزی خوانوں کا کپتان ہے، اُردو خوانوں کا کپتان مسعود ہے اور یہی سکول کا کپتان بھی ہے۔ اُردو خواں تقریباً ہر بات میں اپنے حریفوں سے بازی لے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں باہمی چشمک رہتی ہے۔ سارے سکول کے طلبہ کے تین درجے ہیں، بڑے، درمیانے اور چھوٹے۔ فریقین کے چھوٹے لڑکے ان حریفانہ سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کی آئے دن کی مقابلہ بازی کو روکنے کے لئے اور خصوصاً دونوں طرفوں کے ننھے شیطانوں کی توجہات کو اس طرف سے ہٹانے کے لئے ان کے اُستاد نے سکول میں ایک دُکان کھول دی ہے اور ان کی انتظامیہ کمیٹی بنا دی ہے اور اس طرح ان کو اخوت کی ایک لڑی میں منسلک کر دیا ہے۔

اشرف اُردو خوانوں میں ایک غریب اور الگ تھلگ رہنے والا لڑکا ہے۔ ایک دن دریا میں مچھلی کا شکار کھیلتے ہوئے اس نے ایک غریب ملاح کی کشتی جس میں وہ تنہا کھیل رہا تھا توڑ دی۔ سوءِ اتفاق سے اگلے ہی روز بشیر جو سکول کی کلب کا خزانچی ہے اس کے کمرے سے کلب کی کچھ رقم گم ہو گئی۔ ادھر اشرف نے خلافِ اُمید کشتی کی قیمت ادا کر دی۔ اس پر طرہ یہ کہ کسی نے اُسے بشیر کے کمرے سے نکلتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور وہ بھی اس وقت جب کہ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ بس انگریزی خوانوں کو ایک نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ انہوں نے مشہور کر دیا ہے کہ اشرف نے وہ رقم چرائی ہے۔ اشرف کی حرکات و سکنات عجیب تو ہیں ہی۔ وہ بجائے کھیلنے کے سکول کے ایک غیر آباد حصے کے ایک کمرے میں چھپ کر مرالہ کے لئے گم ہو گیا ہے جس سے شبہ اور بھی قوی ہو گیا ہے۔

خوش قسمتی سے چند روز کے بعد دھوبن کے ہاں سے گمشدہ رقم مل گئی ہے اور اس کی خبر سب سے پہلے دکان کمیٹی کے نو ارکان تک پہنچ گئی ہے۔

قارئین کی سہولت کے لئے یہاں یہ بھی لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مجید، احسن، مظفر، اصغر، حمید، انور، ظفر، جمیل، خالد اور رفیق انگریزی خواں ہیں اور مسعود، بشیر، نذیر، مظہر، سلیم اور اسلم اُردو خواں۔

مترجم

بشیر کے اس انکشاف نے انگریزی خوانوں کی ہزیمت کو مکمل بنا دیا اور یہ خبر کچھ اس طور سے اُن کے کانوں تک پہنچی کہ وہ زخم جو ان کے دلوں پر لگا ہوا تھا اس کا کچھ اندمال نہ ہو سکا۔

دکان کمیٹی والوں میں اس خبر سے جس کا حامل نذیر تھا ایسا جوش پیدا ہوا کہ اُنھوں نے اسی وقت اسے خود اشرف کے الزام لگانے والوں تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ سب کے سب انگریزی خوانوں کے بورڈنگ ہاؤس حمیدیہ ہال کی طرف چل دیئے۔

انور نے کہا "مجید اب خوب کھسیانا ہوگا۔ میں کہتا ہوں کیوں نہ یہ خبر اسے باری باری سے سُنائی جائے۔ اس طرح وہ اسے نَو بار سُنے گا۔ کیوں؟ میں پہلے جاؤں گا"

خیال نہایت اچھوتا تھا۔ اگرچہ خطرے سے خالی نہ تھا۔ ظفر نے اندازہ لگایا کہ تقریباً چوتھی بار کے بعد مجید غضب ناک ہو جائیگا۔ اس لئے اس نے جھٹ انور کے بعد جانے کا اعلان کر دیا۔ جمیل اور خالد نے تیسری جگہ کے لئے مقابلہ کیا جس میں اول الذکر کامیاب رہا۔ رفیق جو پانچویں نمبر پر جانے والا تھا اس کے دل میں شک پیدا ہو چلا تھا کہ اس مذاقیہ کھیل میں کہیں اُلٹے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں اور اُردو خوانوں نے تو صاف کہہ دیا کہ ہم کھیل میں اس شرط پر شریک ہوں گے کہ دوسرے بوقتِ ضرورت مدد کے لئے موقع پر موجود ہوں۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ مجید کے کمرے کی چابی اتنے وقت کے لئے علیحدہ کر دی جائے۔ مبادا وہ "کمرہ بند" ہو کر اس خوشخبری کو اندر پہنچنے سے روکے رکھے اور یہ کہ ہر خبر رساں کے اعلان کے بعد دو منٹ کا وقفہ ہو۔

مجید اس عذاب سے بے خبر جو اس کے لئے تیار ہو رہا تھا اپنے کمرے میں بیٹھا بظاہر تیاریٔ اسباق میں مشغول تھا۔ اسباق کے علاوہ اسے اور بہت باتوں کی فکر تھی۔ اس سہ ماہی میں حالات سخت ناساعد ثابت ہوئے تھے۔ احسن میں اور اس میں کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔ مظفر کی اصغر سے پٹ جانے کے بعد سے کوئی حیثیت ہی نہ رہ گئی تھی۔ حمید باغی ہو چکا تھا اور لڑکوں کو آہستہ آہستہ دشمن کی طرف لے جا رہا تھا۔ اصغر نے کامیابی کے ساتھ مجید کی اختیاری طاقت کا مقابلہ کیا تھا اور چھوٹے لڑکے اس پر انگلیاں اُٹھانے لگے تھے۔ یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ حالانکہ مجید پختہ ارادہ کر کے آیا تھا کہ اس سہ ماہی میں اپنے فریق کی برتری

کے لئے جان تک لڑا دے گا۔ اور مرالہ میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز محمد آئی بنے گا۔

تاہم اسے اس خیال سے ایک گونہ تسکین حاصل ہوتی تھی کہ اُردو خوانوں کا دامن بھی بالکل پاک نہیں ہے۔ اُن میں کا ایک ایک لڑکا معزور چور ہے اور اُن کا دامن ایک بہت بدنما داغ سے آلودہ ہے۔

وہ اس طرح اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں دے رہا تھا۔ اسی ایک خیال میں اسے راحتِ دل کا کچھ سامان نظر آتا تھا۔

یکایک دروازہ کھلا۔ اور انور کھٹ سے اندر داخل ہوا۔

"میں کہتا ہوں مجید۔ بشیر کو وہ رقم مل گئی ہے۔ اشرف چور نہیں ہے۔ کہو خوش تو ہو؟ آہاہاہا!"

اور ایک لمحہ توقف کئے بغیر وہ اسی طرح کمرے سے باہر نکل گیا جس طرح کہ وہ داخل ہوا تھا۔ مجید کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، اور وہ حیرت سے دروازے کی طرف تکنے لگا۔ اسے اس کا وہم و گمان تک نہ تھا۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ نہایت ہی بُرا۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ مسعود سچا تھا اور کہ وہ اور احسن ——

دروازہ پھر کھل گیا۔ اور ظفر دوڑا ہوا اندر آیا۔

"آہا! مجید۔ وہ روپے مل گئے ہیں۔ اشرف چور نہیں ہے۔ کہو خوش تو ہو؟" یہ کہہ کر وہ بھی غائب ہو گیا۔

اس میں کچھ تو سچائی ضرور ہے، اور وہ اس خیال سے کانپ گیا کہ سارے سکول میں اس کی ہنسی اُڑے گی اور بڑی فضیحت ہو گی! لیکن شاید یہ محض اشرف کے بچاؤ کے لئے ایک سازش ہو۔ شاید ——

دروازہ ایک دفعہ پھر کھلا اور جمیل اندر آیا۔

"مجید۔ میں کہتا ہوں —— آہا! وہ روپے مل گئے ہیں۔ اشرف چور نہیں ہے۔ کہو خوش تو ہو؟"

"تو گویا اس رفتار سے مجھے یہ خبر سننا پڑے گی۔ یہ تو بڑا غضب ہوا۔ اس طرف والے تو بس زمین و آسمان سر پر اُٹھا لینگے!" وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں بشیر نے ایسا عمداً تو ——

دروازے پر پھر پاؤں کی چاپ سُنائی دی اور خالد نمودار ہوا۔

"آہا مجید!" اس نے کہا۔ "آہاہا مجید! وہ رقم مل گئی ہے اور اشرف چور نہیں ہے، کہو خوش تو ہو؟ —— اور واہ میں کہتا ہوں مجید! —— آہاہا!"

"ادھر آؤ؟" مجید نے تحکم آمیز کرخت لہجے میں کہا۔ مگر توبہ توبہ! خالد کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی۔ اسے ایک نہایت ضروری کام تھا اور وہ ایک منٹ نہ ٹھہر سکتا تھا۔

غصے سے بھرا ہوا مجید بڑبڑانے لگا "نامعقول! شیطان! بڑے آئے ہیں خبر سنانے والے۔ شیطانوں کو مزا چکھا دوں

ــــہ prefect

تو بھی۔ میرا خیال ہے کہ اب مسعود ـــــ"

دروازہ آہستہ سے پھر کھلا اور رفیق دروازے کے ساتھ چپکا ہؤا اندر داخل ہؤا۔

"آہا ہا مجید! اشرف چور نہیں ہے۔ وہ رقم مل گئی، کہو خوش تو ہو؟ مجھے بڑی مسرت ہے ـــــ السلام علیک ـــــ"

سلام ادھورا رہ گیا، کیونکہ غضب ناک مجید نے ایک رُول سے خبر رساں کے سر کا نشانہ کیا تھا۔ رفیق نے بروقت سر کو جھکا لیا۔ اور رُول ہوا کو چیرتا ہؤا باہر برآمدے میں جا پڑا۔ جہاں نذیر نے جس کی اگلی باری تھی اس پر قبضہ کر لیا۔

"شکر ہے اِن پاجیوں کا خاتمہ ہؤا۔ اُنھوں نے ضرور عمداً ایسا کیا ہے اور میں انھیں اس کا مزا چکھا کر رہوں گا۔ وہ بیوقوف بشیر۔ اس نے ضرور ـــــ"

دروازہ آہستہ سے کھٹکھٹایا گیا۔ اور ساتھ ہی نذیر نے معذرت چاہتے ہوئے اندر جھانکا۔

"کیا چاہتے ہو؛ تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

نذیر نے غیر معمولی رفتار سے بولتے ہوئے جواب دیا "بہت بہتر مجید، میں نے سوچا کہ تم یہ جان کر خوش ہو گے کہ میرے بھائی کو وہ رقم مل گئی ہے۔ آہا ہا ہا! اشرف چور نہیں ہے۔ کہو خوش تو ہو! ـــــ اوئی"

جلا بھنا مجید خبر رساں پر جھپٹا۔ اور اگرچہ وہ اس کی لپیٹ سے بچ نکلا، تاہم اس کا چہرہ نچ گیا۔ اور یہ آخری کلمہ اسی کا نتیجہ تھا۔

"میرا تو اُنھوں نے ناک میں دم کر دیا۔ بدبخت! لعین! ـــــ چابی کہاں گئی؟"

چابی کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ اس نے باہر برآمدے میں نظر ڈالی۔ وہاں بھی نہ تھی۔ کوئی اور بھی آس پاس دکھائی نہ دیتا تھا وہ غصّے میں بھرا ہؤا واپس اپنی جگہ آ بیٹھا۔ اور پھر کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔

دروازہ کھل گیا تھا اور پیشتر اس کے کہ کمرے کے مالک کو اس تازہ مداخلت کا علم ہو۔ مظہر دبے پاؤں کمرے کے اندر موجود تھا۔

"اشرف چور نہیں ہے۔ کہو خوش تو ہو؛ وہ روپے مل گئے ہیں۔ آہا ہا مجید!" تمام لفظ ایک ہی سانس میں ختم کر کے اپنی کامیابی پر نازاں مسرت سے رقص کرتا ہؤا کمرے سے باہر نکل آیا۔

سلیم نے جس کی باری اب تھی کہا "واہ وا۔ لیکن بھلا میں کس طرح اس کام کو سرانجام دوں گا؟"

اسلم نے کہا "جی مت چراؤ۔ میں تمہارے بعد آ رہا ہوں۔"

سلیم نے کہا "دیکھو بھئی، اگر تم لوگ میری مدد کرو، تو میں اپنا تیر روشندان کے راستے چھوڑ دوں گا۔ میں اس کھڑکی پر سے ہو کر وہاں تک پہنچ سکتا ہوں۔ تم مجھے ذرا نیچے سے سہارا دینا۔"

اسلم نے داد دیتے ہوئے کہا "بہت ہی خوب! لیکن بہتر ہوگا کہ ہم دروازے کو باہر سے مقفل کر دیں۔ ورنہ اگر کہیں خدانخواستہ وہ باہر نکل آیا اور تمہیں سہارا دیتے ہوئے ہمیں دیکھ لیا تو ہمیں تم کو چھوڑ دینا پڑے گا۔

پس چابی آہستہ سے قفل میں ڈال کر گھما دی گئی۔ سلیم اپنے ساتھیوں کا سہارا لے کر اوپر چڑھنے لگا اور آخر ایک پانی کے نل کو پکڑ کر اپنے کو اوپر کھینچ لیا۔ اور اپنا سر روشندان میں ڈال دیا۔ ادھر مجید یہ ہال کا کپتان اپنے آپ کو مبارک باد دے رہا تھا کہ اب کم از کم باقی وقت کے لئے یہ تکلیف دہ خبر سننے کی اذیت سے خلاصی پائے گا کہ یکایک ایک تیز آواز نے اسے چونکا کر بدحواس کر دیا۔

"اخاہ مجید! کہو خوش تو ہو؛ اشرف چور نہیں ہے۔ وہ رقم مل گئی ہے۔ السلام علیکم ـــــ بھاگ چلو دوستو! جلدی کرو!"

جونہی حیرت ذرا کم ہوئی۔ ستم رسیدہ کپتان پہلے روشندان کی طرف دیوانہ وار جھپٹا اور یہ دیکھ کر کہ پرندہ وہاں سے اُڑ گیا ہے دروازے کی طرف گیا جو اس نے مقفل پایا۔ باہر برآمدے کے فرش پر بہت سے پیروں کے گھسنے کا شور سنائی دے رہا تھا اور پھر یکایک گویا بھاگڑ سی پڑ گئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہاں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ اگر کوئی آواز تھی تو ہمارے مقتدر ہیرو کے اپنے ہی دروازے کو زور زور سے ٹھوکریں مارنے کی۔

اسلم نے جب وہ اپنے کمرے میں محفوظ ہو گئے اپنے آپ کو کاغذ سے ہوا دیتے ہوئے کہا "اُفوہ! بھائیو! اب کے تو بال بال بچے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح یہ کام کر سکوں گا۔"

کسی نے رائے دی "تو جانے دو پھر"

اسلم نے اسے اپنی توہین خیال کرتے ہوئے بُرا مانا۔

اس نے کہا "ہرگز نہیں۔ اگر تم میری پشت پر رہو تو میں ضرور یہ کر کے رہوں گا۔"

اور ایک منٹ کے بعد جب دروازے کو ٹھوکریں مارنے کی آواز بند ہو گئی تھی اور مجید بظاہر پھر کام میں مشغول ہو گیا تھا اسلم دبے پاؤں باہر نکلا۔ اس کے ساتھی بھی چپکے سے اس کے ساتھ ہو لئے۔ جونہی وہ سیڑھیوں کے سرے کے پاس سے گزر رہے تھے وہ ٹھٹک کے رہ گئے۔ نیچے سے آتی ہوئی اُنہوں نے ہیڈ ماسٹر کی آواز پہچانی۔ جو درمیانے درجے کے ایک لڑکے سے معلوم کر رہے تھے کہ آیا مجید اپنے کمرے میں ہی ہے۔

لڑکے نے کہا "جی ہاں۔ کیا میں اسے بتاؤں کہ آپ اُس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

ہیڈ ماسٹر نے جواب دیا "نہیں۔ میں خود اس کے کمرے میں جاؤں گا۔"

اسلم کے مُنہ سے نکل گیا "اُف! یہ تو بڑا غضب ہوا۔ دروازہ باہر سے مقفل ہے!"

انور نے کہا "میں چپکے سے جا کر چابی گھما آتا ہوں۔ لیکن تم ذرا ہوشیار رہنا کہیں وہ مجھ پر یکایک نہ ٹوٹ پڑے۔"

مگر اس پیش بندی کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ انور جس نے کہ حسنِ اتفاق سے ابھی ابھی جوتے اُتارے تھے دبے پاؤں دروازے تک جا پہنچا۔ اور اس کے ساتھیوں نے اپنی کمین گاہ سے اسے آہستہ سے چابی گھماتے اور واپس آتے دیکھا۔ یہ ظاہر ہے کہ متعینگران کو اس کا علم نہ ہونے پایا۔

خوش قسمتی سمجھئے کہ ہیڈ ماسٹر کے اوپر پہنچنے کے بس ایک لمحہ پیشتر انور واپس پہنچ گیا اور دوڑتا ہوا اپنے دوستوں کی گود میں جا پہنچا جنہوں نے اسے صحیح سلامت واپس پاکر گہرا اطمینان کا سانس لیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب دراصل اپنے خیالات میں اس قدر اُلجھے ہوئے تھے کہ انہیں بھولے سے بھی خیال نہ آسکتا تھا کہ مجید کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے نو ننھے سر برآمدے کے دوسرے سرے کے ایک کمرے کی درزوں میں سے اُن کے ہر ہر قدم کا جائزہ لے رہے تھے۔

مظہر نے خوف زدہ دبی آواز میں کہا" میں کہتا ہوں ۔ جراس نے سمجھا کہ ہم میں سے کوئی ہے اور پل پڑا استو!"

جمیل کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔" یا اللہ!"

اُنہوں نے دیکھا کہ اس باوقار ہستی نے ایک لمحہ دروازے پر ٹھہر کر مٹھی گھُما دی۔

اگلے لمحے میں ایک بڑی ضخیم لغات کی ضرب سے جراس کے سر پر سے ماری گئی تھی، وہ چکرا کر اور لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے فرش پر گرتے گرتے بچا۔ اس کے مُنہ سے ایک کلمہ تعجب نکل گیا۔

کمین گاہ کے نو مکین سناٹے میں آگئے اور جب ذرا ہوش درست ہوئے تو مِلے جُلے خوف و خوشی کے جذبات میں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اور ایک لمحہ بعد جب اُنہوں نے ہیڈ ماسٹر کو اپنا آپ سنبھال کر دوبارہ آگے بڑھتے اور اس دفعہ اپنے پیچھے دروازے کو بند کرتے ہوئے دیکھا تو وہ خدا کا شکر بجالائے کہ ان میں سے کوئی اس وقت حمید بیہال کا کپتان نہ تھا۔ کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ بدنصیب مجید کی قسمت میں جو آنے والے پانچ منٹ لکھے ہیں وہ کسی طرح بھی قابلِ رشک نہیں۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ معاملہ کس طرح سلجھایا گیا۔ لیکن چونکہ نہ تو خفگی کی آوازیں کمرے سے برآمد ہوئیں اور نہ ہیڈ ماسٹر نے کسی کو اپنا بید لینے کے لئے بھیجا اس لئے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مجید نے نہایت عاجزی کے ساتھ اپنی غلطی کی معافی مانگ لی ہوگی۔

اسلم نے تین منٹ گزر چکنے کے بعد کہا" ہوشیار رہنا۔ میں اب کوشش کروں گا ——— یہ آخری موقع ہے۔ تم اُردو خوان لڑکے تیار رہنا۔ جونہی میں واپس لوٹتا ہوں ہم اپنے بورڈنگ ہاؤس کو بھاگ چلیں گے۔"

پس اس طرح سرپٹ دوڑتا ہؤا کہ جیسے وہ کہیں دُور سے آرہا ہے اور مجید کو اپنے کمرے میں اکیلا پانے کا متوقع ہے وہ بے تکلف اس کے کمرے میں در آیا اور جیسے اس دوسری ممتاز ہستی کو جو کمرے کے اندر تھی نہیں دیکھا ہے، چلّا کر کہا:۔

"میں کہتا ہوں مجید۔ آہا! وہ رقم مِل گئی ہے۔ اشرف چور نہیں ہے، کہو خوش تو ہو؟ —— اوہو! ہیڈ ماسٹر صاحب ہیں! معاف کیجئے گا جناب۔"

ایک لمحہ بعد وہ سلیم، مظہر اور نذیر تین تین سیڑھیوں کو ایک ایک قدم میں پھلانگتے ہوئے نیچے اُتر رہے تھے۔ اُن کے ننھے دل وفورِ مسرت و اطمینان سے چھلک رہے تھے کیونکہ انہوں نے اتنی مشکلات کے باوجود ایک نہایت اہم فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی تھی۔

اسلم نے کہا "میرا خیال ہے کہ اب وہ اسے اچھی طرح سمجھ گیا ہوگا —— اور جو کچھ کسر رہ گئی ہے تو وہ ہیڈ ماسٹر صاحب پُوری کر دیں گے۔"

لیکن بدنصیب مجید کو اب اس کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا کہ اس نے بھونڈے پن سے صُورتِ حالات کو بگاڑ دیا ہے اور اب سکول کی مکدّر فضا کے لئے وہی ذمّہ دار ہے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب صرف اس رقم کے مِل جانے کی خبر لائے تھے اور چاہتے تھے کہ مجید حمیدیہ ہال کا کپتان ہونے کی حیثیت سے اسے وسیع پیمانے پر مشتہر کر دے۔

اُنہوں نے کہا "میں اب اس صریح ظلم اور ناانصافی کا ذکر نہیں چھیڑنا چاہتا ہوں جو جلد بازی سے اشرف پر شبہ کرنے میں اس کے ساتھ کی گئی ہے، اور جس کے احساس سے مجھے سخت قلق ہوتا ہے۔ اس کے بھاگ جانے سے سکول کے نام پر جو دھبّا آیا ہے، وہ ابھی تک قائم ہے۔ لیکن اس سے بدتر دھبّا کہ مدرسہ کا ایک طالب علم چور تھا خوش قسمتی سے مٹ گیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ حمیدیہ ہال کا ہر لڑکا جلد سے جلد اس سے آگاہ ہو جائے۔"

یہ کہہ کر ہیڈ ماسٹر صاحب چلے گئے اور اسے اس کڑوی گولی کو جس طرح بھی بن سکے نگلنے کے لئے چھوڑ گئے۔

"مجھے کیوں یہ کام کرنا پڑے؛ شبہات قائم کرنے میں میں نے پہل نہ کی تھی۔ یہ کام احسن کا تھا —— احسن جس کے ساتھ اس کی اَن بن ہو چکی تھی۔ یہ کام اس کے سپرد کیوں نہ کیا جائے؟" سُوءِ اتفاق کہیئے یا مجید کی بدقسمتی کہ احسن حمیدیہ ہال کا کپتان نہ تھا۔ اس افواہ کے اُڑانے کا وہ ایسا ذمہ دار نہ گردانا جا سکتا تھا جیسا مجید اپنی مخصوص حیثیت میں اسے قبول کر لینے اور فروغ دینے سے۔

اسے یہ ہمت نہ پڑتی تھی کہ تمام طلبہ کے سامنے اس خبر کا اعلان کر دے۔ وہ اس کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ اگر احسن اور مظفر اب بھی اس کے مددگار ہوتے تو شاید تینوں مِل کر اور ڈھٹائی سے کام لے کر اسے کر سکتے۔ مگر وہ تو اپنے کمروں میں اپنا اپنا غم لئے پڑے تھے اور جو کچھ بھی کرنا تھا مجید کو یکّہ و تنہا ہی کرنا تھا۔

پس وہ رنجیدہ خاطر بیٹھ گیا اور قلم کاغذ لے کر ذیل کی فیصلہ کُن اطلاع ہال کے نوٹس بورڈوں کے لئے لکھی:۔

"اطلاع —— ہیڈ ماسٹر صاحب چاہتے ہیں کہ ہر کوئی یہ جان لے کہ کلب کی گمشدہ رقم خزانچی کو مل گئی ہے۔

محمد عبدالمجید"

اس ناپسندیدہ تحریر کی اس نے تین نقلیں اُتاریں اور چونکہ تمام لڑکے اپنے کمروں میں بند تیاریٔ اسباق میں مشغول تھے۔ اس نے اس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے ہاتھ سے ان کو نوٹس بورڈوں پر چسپاں کردیا۔ ایک ہال کے دروازوں پر اور ایک سیڑھیوں کے اُوپر۔

اس نے اپنے کمرے کی طرف لوٹتے ہوئے حقارت سے زیر لب کہا "بس میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرسکتا"

ایک گھنٹے بعد جب سونے کی گھنٹی بجی تو ہر طرف ایک شور برپا ہوگیا۔ نوٹس بورڈوں کے سامنے بڑی ریل پیل تھی۔ اکثر طلبہ نے تو اسے ظرافت میں اُڑادیا، اور جب دُور برآمدے کے دوسرے سرے سے اور نیچے سے قہقہوں کی پُرشور آوازیں آئیں تو یہ ظاہر ہوگیا، کہ حمیدیہ ہال کے ساکنوں نے اس واقعہ کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔

مجید دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "کس قدر بیہودگی کی ہے بشیر نے۔ گدھا کہیں کا سارے سکول کو آفت میں ڈال دیا ہے"

لڑکے ایک ایک کرکے بستروں پر دراز ہوگئے اور آہستہ آہستہ حمیدیہ ہال پر ایک سکوت کا عالم طاری ہوگیا۔

جب ہر طرف خاموشی چھاگئی۔ اور مجید نے سمجھا کہ سب سوگئے۔ تو وہ بھی سونے کے لئے چلا۔ نوٹس بورڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے اس تحریر پر جس نے اسے اس قدر شدید ذہنی کرب میں مبتلا کررکھا تھا۔ ایک نظر ڈالی۔ وہ وہیں موجود تھی۔ لیکن ویسی نہیں جیسی وہ چھوڑ گیا تھا۔ ایک زاید فقرہ اس کے اپنے الفاظ اور دستخط کے درمیان کاغذ کے آخری سرے پر گھسیٹ دیا گیا تھا۔ یہ اس کے نستعلیق خط کی ایسی عمدہ نقل تھی کہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اسی کی تحریر کا جزو نہیں ہے۔

یہ ترمیم شدہ اطلاع پڑھ کر مجید کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لکھا تھا:۔

"اطلاع ـــ ہیڈ ماسٹر صاحب چاہتے ہیں کہ ہر کوئی یہ جان لے کہ کلب کی گمشدہ رقم خزانچی کو مل گئی ہے اور یہ کہ میں نہایت ذلیل اور گندہ ذہن ہوں کہ اشرف پر چوری کا الزام لگایا۔

محمد عبدالمجید"

اس نے کاغذ کو بورڈ پر سے پھاڑ ڈالا اور حالتِ غیظ و غضب میں اسے پاؤں تلے روند ڈالا۔ تب وہ دوسرے نوٹس بورڈ کی طرف چلا۔ یہ بھی ہو بہو ویسا ہی تھا۔ شاید نقل پہلے سے بھی بہتر تھی۔ اس نے اسے بھی پُرزے پُرزے کرڈالا اور تیسرے نوٹس بورڈ کی طرف چلا۔ وہاں بھی اسی طرح اس کی توہین کی گئی تھی۔

اس کا مصنف کون تھا! قیاس دوڑانے کی اسے کامل آزادی تھی۔

عبدالکریم مرادپوری

ریل کا راگ

محافظ نے جس وقت سیٹی بجائی
بہ اذنِ سفر سبز جھنڈی دکھائی

سٹیشن سے اُس دم رواں ہو گئی میں
ہوئی تیز پھر اور رواں ہو گئی میں

لگی موج میں آ کے بھرنے سپاٹا
تو میلوں کی منزل کو منٹوں میں کاٹا

چھلاوہ ہوں سیماب پا ہوں ہوا ہوں
بگولا ہوں آندھی ہوں برق و بلا ہوں

مراحل کو پیوستہ للکار ہوں میں
دھواں دھار سرگرم رفتار ہوں میں

بصد جوش میں پابجولاں چلی ہوں
گرجتی ہوئی شکلِ طوفاں چلی ہوں

کئے پے سپر میں نے کتنے ہی جل تھل
چلم چل - چلم چل - چلم چل - چلم چل

عجب زور میں بھر رہی ہوں طرارے
دہن سے نکلنے لگے ہیں شرارے

مری سدِ راہ ہے نہ گنگا نہ جمنا
جو منزل سے چلنا تو منزل پہ تھمنا

میں ندیوں کے پُل سے گزرتی ہوں بےغم
زدم دم - زدم دم - زدم دم - زدم دم

مہیبانہ آتی ہوں جب دندناتی
زمیں کی دہلتی ہے یکلخت چھاتی

ہوں پابند گو جادۂ آہنیں کی
ابھی کھینچ دوں گی طنابیں زمیں کی

بہت کم رہی اب تو منزل بلاشک
چھکا چھک، چھکا چھک، چھکا چھک، چھکا چھک

سید حمید کاظمی بی۔ اے
(علیگ)

"سر اقبال دے نال میل"

"پیر خانے" دے اندر

علامہ اقبال علیہ الرحمتہ سے ملاقات کی یہ دلچسپ تفصیل پنجابی رسالہ سارنگ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں چھپی تھی۔ اس رسالے کے ایڈیٹر ایک ہندو نوجوان مسٹر ایس۔ ایل۔ پراشر تھے۔ علامہ اقبال سے یہ ملاقات غالباً مسٹر ایس ایل پراشر نے خود کی تھی۔ میں نے اس مقالہ کا لفظی ترجمہ کیا ہے اور حتے الامکان کوشش کی ہے کہ اصل پنجابی اندازِ بیان بڑی حدتک قائم رہے۔ حامد علی خاں

آج ڈاکٹر سر اقبال کا نام دُنیا میں بڑے فخر سے لیا جاتا ہے۔ سارے ہندوستان کو اُس کی ذات پر ناز ہے۔ واقعی اقبال نے پنجاب کو سر اونچا کرنے کے قابل بنا دیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو بہت کم یہ خیال آتا ہے کہ اقبال پنجاب کا رہنے والا اور پورا پکا پنجابی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اقبال کی ساری شاعری اُردو یا فارسی زبان میں ہے۔ اور اُس میں پنجاب کی زندگی یا پنجاب کی خوبصورتی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُس کی شاعری کا پیغام کسی خاص ملک کے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ساری دُنیا کے لئے ہے۔ اُس کی نظموں کے مردوں، عورتوں، پرندوں، جانوروں، گھاس بوٹیوں، پھولوں اور پودوں کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔ یہ سب خیال کی تخلیق ہیں تخیل ہی انہیں پیدا کرتا ہے تخیل ہی مارتا ہے اور تخیل ہی بٹھاتا اور [illegible]تا ہے۔ اِقبال اپنے تخیل کی دُنیا میں خیالوں کی آمد و شُد کا تماشا دیکھنے میں مست ہو چکا ہے :-

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندِ دِگر

خیالوں کا یہ کھیل اقبال کے لئے شطرنج کی بازی سے بھی زیادہ پُر لطف ہے، وہ شاہ کو مات کرنے کی دھن میں لگا ہوا ہے کسی وقت دم بھر کے لئے وہ حُقے کا ایک آدھ کش لگاتا ہے اور پھر اپنی بازی میں محو ہو جاتا ہے۔ اُسے کسی دُوسری بات کی سُدھ بدھ نہیں۔ کوٹھی کا احاطہ ویرانہ سا ہو رہا ہے۔ گلر اور خاک دھول کی کثرت سے جگہ اُجڑی اُجڑی لگتی ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی بیریوں کی ایک قطار کسی خانقاہ کے مجاور کے حجرے کی راہ دکھاتی ہے۔ صفائیوں کا کس کو دھیان ہے؟ کون یہاں بیٹھا گھاس پھول اُگایا کرے؟ باغ کے حال کی کسی کو خبر بھی ہو!

ہمیں یاد ہے جب ہم اقبال صاحب سے ملنے گئے تو وہ بیٹھک میں ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے سخت کالر لگا رکھا تھا او...

[illegible] ۱۹۰ [illegible] سے پہلی کوٹھی کا ذکر ہے۔

پرانے زمانے کا کالا انگریزی سُوٹ پہنے حقّہ پی رہے تھے شکل وصُورت سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی یونیورسٹی کے فلسفے کے استاد ہیں پل بھر کے لئے ہم نے سامنے بیٹھے ہوئے وکٹورئینؔ[1] سے آنکھ بچا کر کمرے کی چیزوں پر ایک نظر ڈالی۔ ہمارے سامنے ہی انگیٹھی پر ملکۂ وکٹوریا کی تصویر پڑی تھی۔ ہم سے مسکرائے بغیر نہ رہا گیا اور ہم نے اُن سے پوچھا "اس تصویر سے کوئی خاص پیار ہے ؛ یا کسی خاص مطلب سے یہاں رکھی گئی ہے ؟" اُنہوں نے جواب دیا "یہ تصویر ایک دفعہ میرا بھائی کہیں سے لے آیا تھا اُس نے یہاں رکھ ڈالی ہے۔ اور یہ یہاں پڑی ہے میں نے تو کبھی خیال ہی نہیں کیا کہ ہے بھی یا نہیں۔" یہ اقبال کا حال ہے۔ وہ اپنی دُنیا میں مست ہے اُسے باہر کی چیزوں کے دیکھنے بھالنے کی فرصت ہی نہیں۔

اُنہوں نے خود ہی ہمیں بائیں ہاتھ کی دیوار پر دو میموں کی تصویروں کی طرف توجّہ دلائی اور ہنس کر ایک مولوی صاحب کی بات سنائی : "ایک دفعہ ایک مولوی میرے پاس آیا ہُوا تھا۔ نماز کا وقت ہُوا تو وہ اس کمرے میں نماز پڑھنی شروع کرنے لگا لیکن ان تصویروں کو اپنے سامنے دیکھ کر رُک گیا اور بولا "یہ تصویریں یہاں سے ہٹوا دیجئے۔" میں نے کہا آپ ان تصویروں کی طرف دھیان ہی نہ کیجئے۔ یہ اس جگہ دیوار کا عیب چھپانے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ لیکن مولوی نہ مانا۔"

ہم نے اقبال صاحب سے پوچھا کہ "آپ کا پنجابی بولی کے متعلق کیا خیال ہے ؟" ان کا جواب یہ تھا کہ "پنجابی بولی اس وقت علمی زبان نہیں، اس میں نثر بہت کم ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ نثر کے لکھے جانے سے یہ علمی زبان نہ بن سکے۔ پنجابی میں "جٹکاپن"[2] بہت ہے لیکن اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ عام طور پر کم پڑھے لکھے آدمی ہی اسے پڑھتے لکھتے رہے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمیوں کی ہمت سے اس میں لطافت اور نزاکت پیدا کی جا سکتی ہے۔ پنجابی میں "ہنتر" (Form) پر بہت کم زور دیا جاتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ بحروں کا لحاظ قائم نہیں رہتا۔ بہاولپور کے احمد یار نے تھوڑی بہت ہمت کی ہے۔ اُس کا دعوےٰ ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے بحر قافیے اور ردیف کا اتنا خیال نہیں رکھا۔ پنجابی شاعری بڑی بڑھیا شاعری ہے اور خاص طور پر جذبات سے بھیگی ہوئی ہے۔ پنجابی شاعری کی زبان بڑی سیدھی سادھی نرم اور میٹھی ہوتی ہے، جذبات سچے ہوتے ہیں اور بڑے کھُلے الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں لیکن تشبیہوں میں بعض اوقات مذاق پست ہو جاتا ہے۔ ایک شعر میں نتھ کا بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے سے

جے بینسری جھمک لباں تے آئی کوئی آب حیات دے پُونے نوں
یا وٹ پٹ جلیب حسن دی پئی کرداہ تلیوُنے نوں (علی حیدر)

عشق کے رموز پنجابی میں خوب بیان کیا جا سکتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پنجابی شاعری میں صرف مجازی عشق ہی ہوتا ہے نہیں بلکہ عشقِ حقیقی زیادہ ہوتا ہے۔ پنجابی شاعری تصوف سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں تصوف کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ پنجابی شاعری میں ایک اور خصوصیت ہے اِس میں وطن کی محبت کے متعلق بڑے پرجوش گیت ملتے ہیں فوجی

[1] وکٹوریا کے زمانے کا آدمی۔ اُس عہد کے فیشن کا پابند۔ [2] گنوار پن۔

گیتوں کی بھی کمی نہیں۔ عام لوگوں کے گیتوں اور "بولیوں" کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ اُردو میں تصوّف کی شاعری سے ہی نہیں صرف ایک میر درد کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں وطن کی محبت کی شاعری اور فوجی گیت بھی نہیں ہیں۔ اُس کی عشقیہ شاعری میں بناوٹ زیادہ اور جذبات کا دور کم ہے۔ عام لوگوں کے گیت تو اس میں بالکل نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو شاعری درباروں اور امیروں اور مصاحبوں کے ہاتھوں میں پھلی پھولی ہے۔ وہ لوگ یا تو ایرانی تھے یا ایرانی مذاق کو پسند کرتے تھے۔ اُن کا میل جول عام لوگوں سے نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اُردو شاعری میں امیرانہ رنگت آگئی تھی۔ وہ شعر کہنے کو ایک فیشن سمجھتے تھے۔ شعر گوئی پر قدرت حاصل کرنا ہی شاعر کی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات صرف بحر، قافیے اور ردیف کی خاطر بناوٹی جذبے اور بناوٹی خیال گھڑنے کی ضرورت پڑتی تھی لیکن پنجابی کے لئے اُردو کی خوبیوں کی ضرورت ہے۔ پنجابی شاعروں کو اُردو شاعروں کی طرح "بندش"[1] پر قدرت حاصل کرنی چاہئے اور اُردو شاعری کی قوت اور پاکیزگی پنجابی شاعری میں پیدا کرنی چاہیئے۔"

ہم نے اقبال صاحب کے بڑے گاڑھے یار محمد حسین صاحب سے سُن رکھا تھا کہ اقبال صاحب پنجابی شعر پڑھنے سُننے کے بڑے شوقین ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ غلام قادر کی "چٹھیاں"[2] سنتے ہوئے وہ رو پڑے تھے۔ پھر بھی ہم پنجابی شاعری کی حقیقت سے اُن کی یہ واقفیت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ اُنہوں نے اُردو شاعری سے مقابلہ کر کے دونوں زبانوں کی شاعری کے مذاق کا خلاصہ بیان کر دیا تھا۔ پنجابی شاعری کی بُنیاد عام لوگوں کی زندگی پر ہے اور اُردو شاعری کی بُنیاد امیروں اور مصاحبوں کی زندگی پر۔

اس موقع پر ہمیں بہت افسوس آیا کہ پنجابی کی بہت سی کتابیں گورمکھی حروف میں ہیں جس کے باعث لوگوں کو پنجابی کے علمی خزانوں کا حال معلوم نہیں۔ پنجابی بولی کے متعلق اقبال صاحب کے خیالات سُن کر ہماری ہمت بندھی اور ہم نے پوچھا کہ "کیا آپ کے لئے زبان کا سوال پیدا نہیں ہوا تھا؛ آپ کو پنجابی زبان میں لکھنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا؟"

اقبال صاحب نے جواب دیا "نہیں۔ میری تعلیم ہی کچھ ایسی ہوئی تھی کہ مجھے کبھی پنجابی لکھنے کا خیال نہیں آیا تھا اور نہ میں اب لکھ سکتا ہوں۔"

ہم نے پوچھا "فارسی میں لکھنے کا خیال آپ کو کس طرح آیا؟" اُنہوں نے جواب دیا "میں نے دیکھا تھا کہ فارسی میں میرے خیالات اچھی طرح ادا ہو سکتے ہیں دوسرے فارسی دُنیا کے بہت سے حصّوں میں سمجھی جاتی ہے۔"

ہم نے کہا "ہمیں تو بڑا افسوس ہے کہ آپ کے سے جاننے اور ماننے ہوئے پنجابی نے اپنی زبان میں نہیں لکھا۔ پنجابی کو تو آپ جیسے آدمی کی ضرورت تھی جس طرح گوئٹے نے اپنے وقت کی بے حقیقت جرمن بولی کو دُنیا کی ایک مسلّمہ عظیم الشان زبان بنا دیا تھا اُسی طرح آپ بھی پنجابی زبان کو ترقی دے سکتے تھے۔"

سر اقبال نے کہا "کوئی بولی بھی ہو ایک زبردست شخصیت اُسے بنا سکتی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پنجابی کو بھی کوئی

[1] خیالات و الفاظ کی تراش خراش اور بناوٹ۔ [2] پنجابی گیتوں کی ایک قسم جس میں محبوب کے نام خط لکھا جاتا ہے۔

گو ئٹے جیسا آدمی مل جائے۔"

ہم سے یہ پوچھے بغیر نہ رہا گیا کہ "کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ اپنی شخصیت کا پورا اظہار اپنی زبان کے سوا اور کسی زبان میں نہیں ہو سکتا؟"

اُنہوں نے جواب دیا "میں نہیں مان سکتا کہ اپنی زبان کے سوا آدمی اور کسی زبان میں اپنا مطلب پوری طرح بیان نہیں کر سکتا میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا۔ خواہ کوئی زبان ہو، صرف مشق ہونی چاہیئے۔ ہر ایک زبان میں لکھا جا سکتا ہے۔ اصل چیز تو خیال ہے۔"

ہم اقبال صاحب کے اس جواب پر حیران ہوئے کہ ایک شاعر کا یہ خیال ہے کہ آدمی اپنی نج کی زندگی کا "اظہار" پرائی بولی میں کر سکتا ہے۔ مگر ہم سمجھ گئے کہ اُنہوں نے صرف اپنی شاعری کو پیشِ نظر رکھا ہے جس میں زیادہ تر تخیل کا اُتار چڑھاؤ دکھایا گیا ہے۔

ہم نے پھر کہا "معاف کیجئے آپ کا یہ عقیدہ کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا ایک ناول یا ڈراما لکھنے والے کیلئے کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ ناول یا ڈراما لکھنے والے کو بہرحال لوگوں کی زندگی سے سابقہ پڑتا ہے۔ اُس کے لئے لوگوں کی زبان استعمال کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "ہاں ناول یا ڈراما لکھنے کے لئے لوگوں کی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص پنجابی ناول یا ڈرامے لکھنا چاہے تو کیا حرج ہے اگر وہ پنجابی میں لکھے۔"

ہم نے کہا "کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر رچرڈ کا خیال ہے کہ ایک بدیشی آدمی دوسرے ملک کی شاعری سے پوری طرح لطف نہیں اُٹھا سکتا۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

اقبال صاحب کے جواب نے ان کی صفائی پیش کر دی۔ اُنہوں نے کہا "میں ایسی شاعری کو شاعری نہیں سمجھتا۔ اصل شاعری روح کی شاعری ہوتی ہے اور وہ ساری دُنیا کے لئے ہوتی ہے۔" گفتگو کا رُخ بدلنے کے لئے اقبال صاحب نے قرآن کی ایک آیت پڑھی جس کا مطلب بابا نانک کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے:۔ "رل مل بیٹھو صفا سجھا لے"

يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (قرآن مجید)

مطلب یہ ہے کہ ہم سب خدا کو مانتے ہیں۔ ہمیں مل جُل کر رہنا چاہیئے، اس لحاظ سے جو بھی خدا کو مانتا ہے وہ مسلمان ہے۔

ہم نے کہا "تو پھر آپ کی شاعری میں مسلمانوں سے خطاب ایسے ہی مسلمانوں کے لئے ہوتا ہے؟"

اُن کا جواب تھا "ہاں آپ نے ٹھیک بوجھ لیا ہے۔"

ہم کہنے ہی والے تھے کہ پھر آپ اپنی شاعری میں مسلمانوں کے پیغمبروں کے نام اور اُن کی روائتیں کیوں لے آتے ہیں کہ اُنہوں نے خود ہی کہہ دیا "میں اپنے ہندو اور سکھ دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ آپ مسلمان اولیا اور پیغمبروں کے ناموں کی جگہ بیشک ہندو اور سکھ بزرگوں کے نام استعمال کر لیا کیجئے۔ میں جو مسلمان بزرگوں کے نام لکھتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک مسلمان گھر میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا اور میری تعلیم اسلام کی تاریخ اور مذہب میں ہوئی ہے۔"

حامد علی خان

ہار

(مختصر انگریزی افسانے کا آزاد ترجمہ)

بوڑھی ماں اپنے دونوں لڑکوں ڈیوڈ اور پال کی ہر ایک بات کو پسند کرتی لیکن صرف ایک وجہ سے ان دونوں کو کم عقل ٹھہراتی ——— وہ کہتی "تم محنتی، عقلمند، طاقتور اور مردانہ حسن رکھ کر بھی اس بات کا فیصلہ ابھی تک نہ کرسکے کہ خوبصورت مرسی کا شوہر کون ہوگا؟"

ان کی زندگی نہایت سادہ لیکن پُرمسرت تھی۔ ماں اور بھتیجی مرسی مل کر گھر کے سارے کام کرلیتیں۔ ڈیوڈ باغبان تھا اور پال انجنیئر۔ ڈیوڈ بڑا لڑکا نہایت متین اور سنجیدہ تھا اور پال نہایت ظریف ہنس مکھ اور جلد باز۔ مرسی نہایت حسین اور جفاکش لڑکی تھی۔ مدتوں سے یہ لوگ اسی مکان میں رہتے آئے تھے جس کو ڈیوڈ کے باپ نے بنوایا تھا ——— بچپن سے گذر کر یہ لوگ جوان بھی ہوئے لیکن ان کی طرزِ زندگی میں کوئی فرق نہ آیا اور اس بات کا بھی فیصلہ نہ ہوسکا کہ مرسی کس کے عقد میں آئے گی۔

آخرکار ایک دن جب سب اپنے روزانہ فرائض کو پورا کرکے شام کی آمد پر مسرور تھے کہ میز پر جمع ہوکر خوش گپیوں اور دن بھر کے واقعات کے کہنے اور سننے سے لطف اندوز ہوں گے تو لڑکوں کی بوڑھی ماں میز کے قریب آئی جہاں ڈیوڈ اور پال پہلے سے موجود تھے اور سختی سے کہنے لگی:-

"اب تم دونوں کی سستی ایسا رنگ لارہی ہے کہ تمہارے غیر فیصل شدہ معاملے کا نتیجہ ہی دوسرا ہو ——— تمہاری اس لاپروائی اور نرالے اندازِ الفت سے دوسرے خوب واقف ہوچکے ہیں اور وہ زمانہ دور نہیں کہ مرسی کسی تیسرے آدمی کے ہاتھ آجائے۔ یہاں غصے سے اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ڈیوڈ نے واقعے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے کہا "تو پھر آپ ہی اس کا فیصلہ کیجئے۔"

ماں "اپنی بیوی کا انتخاب تمہیں بہتر کرسکتے ہو۔ میرا فیصلہ اس میں اتنا ہی بیکار ہے جتنا کہ ایک بیلے آدمی کو اپنی بیوی سے دست بردار ہونے پر مجبور کرنا۔"

ڈیوڈ "اماں جان میرا تو یہی خیال ہے کہ پال اور مرسی ہم عمر ہیں ——— میں ان سے بہت بڑا ہوں ——— دوسرے یہ کہ وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لہٰذا میں اپنے حق سے دست بردار ہوتا ہوں۔"

پال جواب تک مسکراتے ہوئے ماں اور ڈیوڈ کی گفتگو سن رہا تھا کہنے لگا " انسان کو اپنے حق کے لئے ہر وقت ہر حالت میں اور ہر حیثیت میں لڑنا چاہئے ۔ یہ کوئی بات نہیں کہ عمر بڑی ہونے سے آپ اپنا حق چھوڑ دیں ـــــ ہم دونوں زندگی میں یکساں کامیاب ہیں ـــــ دونوں جسمانی حالت اور دماغی قابلیت میں برابر کے حصہ دار ہیں ـــــ اور سب سے بڑی بات یہ کہ جس قدر مری ہم دونوں کو پسند کرتی ہے اسی قدر ہم دونوں اس کو چاہتے ہیں "

ماں ۔ " یہ فضول بحث ہے ۔ اس کا فیصلہ اسی وقت ممکن ہے جب کوئی اپنا حق دوسرے کو دے دے ۔ کم سے کم بڑے بھائی کے لئے تم ہی مری کے خیال سے باز آؤ "

پال ۔ (ہنستے ہوئے) " یہ آپ نے ایک ہی کہی ۔ میں کیوں اپنا حق چھوڑ دوں ۔ نہ میں چھوڑوں نہ ڈیوڈ "

ماں نے مایوسی کے انداز میں کہا " تب تو اس کا فیصلہ قطعی ناممکن ہے "

پال (اُسی انداز میں) " ناممکن ہے ـــــ نہیں ـــــ سنو ! میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں ۔ اگر ہم تینوں اس پر متفق ہو جائیں تو کل تک ضرور مری ہم دونوں میں سے ایک کی ہو جائے گی "

ڈیوڈ اور ماں (بہ یک وقت) " وہ کیا ؟ "

پال ۔ " لیجئے وہ یہ کہ کل صبح میں اور ڈیوڈ آپ سے پوشیدہ رکھ کر علیحدہ علیحدہ پھولوں کے دو ہار لائیں گے جو آپ کے سامنے فیصلے کے لئے پیش کئے جائینگے ۔ آپ جس کا ہار انتخاب کرینگی بس وہی مری کا شوہر ہوگا بتایئے کیا آپ اس پر راضی ہیں "

دونوں اس پر رضامند ہو گئے ۔

دوسرے دن ڈیوڈ کے ایک کمرے میں بند ہو کر اُنہوں نے پھولوں کا انتخاب شروع کیا ۔ پال نے یاسمن کو پسند کیا اور ڈیوڈ نے نرگس کو ـــــ دونوں پھول توڑنے لگے ۔ ڈیوڈ چونکہ باغبان تھا اس نے نہایت پختہ کاری سے اچھے اچھے پھول چن کر نہایت دیدہ زیب اور نظر فریب ہار تیار کیا ۔ ان نرگس کے پھولوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ نتیجہ سننے کے لئے بیتاب ہیں ۔

پال نے بیدردی سے پھول جمع کرنے شروع کئے جس سے اکثر پھولوں کی پنکھڑیاں جا بجا سے علیحدہ ہو گئیں ۔ ڈیوڈ نے ہر چند منع کیا کہ نہ پھول توڑنے کا یہ طریقہ ہے اور نہ انہیں اس طریقے پر ہار میں جایا جاتا ہے ۔ مگر اس پر بھی وہ اپنا کام کئے گیا اور تازہ لیکن شکستہ پھولوں کا ایک ہار تیار کر لیا ۔ ان ہاروں کو صرف پال ہی نے ماں کے آگے پیش کر دیا اور خود باہر چلا گیا ۔

ماں ہاروں کو دیکھ کر بے حد غمگین ہو گئی ۔ اس نے خیال کیا کہ اس میں سے ایک کا انتخاب ضرور دوسرے کے لئے سوہان روح ہوگا ۔ وہ اپنے لڑکوں سے یکساں محبت کرتی تھی ۔ اس کے لئے اس سے زیادہ پریشان کن کوئی امتحان نہ تھا ۔ آخر

جی کڑا کر کے اس نے یاسمن کے ہار کو یہ کہتے ہوئے باہر پھینک دیا۔
"جو شخص اپنی ہونے والی دُلہن کو اس قدر شکستہ اور پائمال پھُولوں کا ہار پیش کرے اس سے ہرگز آئندہ خوشگوار زندگی گزارنے کی توقع نہیں ہو سکتی۔"

اس شام کو ڈیوڈ اور پال بہت جلد پہنچ گئے۔ ڈیوڈ اپنا نتیجہ سننے کے لئے مضطرب اور ہراساں تھا برخلاف اس کے پال ایک حد تک افسردہ اور خاموش تھا۔

تھوڑی دیر بعد مریٰ نرگسی پھُولوں کا ہار گلے میں ڈالے کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس کے پیچھے ان کی ماں بھی نتیجہ سننے کے لئے فوراً آپہنچی۔ ڈیوڈ کو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہ آتا تھا۔ پال نے مسکرا کر کہا "مبارک ہو!"

ماں پر بیک وقت خوشی اور غم کے دونوں اثرات ہوئے۔ وہ اس امتزاج سے ساکت سی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا "لاپروا پال! جس چیز کو محنت اور سلیقہ حاصل کر سکتا ہے اس کے بارے میں دِل لگی اور لاپروائی برتنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے — چلو اب شرط کے مطابق ہمیں علیٰحدہ گھر میں رہنا پڑا۔" — پھر چھوٹے لڑکے کی قسمت کا خیال کر کے مغموم سی ہوگئی ڈیوڈ اور مریٰ کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔

پال نے آہستہ سے کہا "ہاں اماں جان، چلئے اب ہم اپنے لئے نیا گھر تعمیر کریں گے . . . . بھائی ڈیوڈ کا حق انہیں مل گیا!" اس نے خفیف سی مسکراہٹ سے دونوں کی طرف دیکھا۔

اس بات کا علم سوائے پال اور اس کے خدا کے کسی اور کو نہ تھا کہ کتنے صبر اور کتنی عقلمندی سے اپنے حق کا ایثار کر کے اس نے دُوسرے کی دُنیا بنا دی . . . . . . "ہار بنانے میں ہارنے کا راز پنہاں تھا۔"

"ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق"

ہمنوا حیدرآبادی

جو نظر آتے ہیں نہیں آتے

جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

آہ وہ برساتیں

اللہ اللہ زمانے کی گردشیں بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہیں۔ اب نہ وہ پہلے لوگ ہیں اور نہ وہ پہلی سی باتیں۔ غریب دلّی جو کسی زمانے میں چوتھی کی دُلہن تھی اب سُہاگ لُٹی بیوہ کی طرح اور بھی لنڈمنڈ ہوگئی ہے۔ اس کی وہ اگلی بہاریں دیکھنی تو کُجا اب سُننے میں بھی نہیں آتیں۔ بچاری ابتدا ہی سے بس بس کر اُجڑی اور اُجڑ اُجڑ کر بستی رہی، اور شاید اسی لئے یہاں کی قدیم روایات اور پرانی معاشرت روز بروز معدوم ہوئی جا رہی ہیں۔ اب تو بھائی نیا دَور ہے اور نئے لوگ، نئی باتیں ہیں اور نئی تہذیب اور نئے زمانے کی جب ہر چیز نرالی ہے تو پھر سیر و تفریح الوکھی کیوں نہ ہو۔ جو ہے وہ دلچسپی کے لئے نت نئے طریقے اختیار کر رہا ہے درآنحالیکہ طریقے دلبستگی کا نہیں بلکہ روپے کی تباہی اور صحت کی بربادی۔ کا باعث ہوتے ہیں۔ آج کا رنگ ڈھنگ اور طور طریق تو آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی ہیں ذرا اگلے وقتوں کی برسات کا حال بھی سُن لیجئے۔ آہ! وہ سُہانے سمے اب صرف لوحِ قلب پر ایک دُھندلے سے نقش کی طرح مرتسم ہیں اور بس۔

برکھا رت ہے نکھار کے دن ہیں چاروں طرف سے جامنی گھٹائیں اُٹھ اُٹھ کے برس رہی ہیں۔ برس رہی ہیں اور گرج رہی ہیں۔ گرج رہی ہیں اور برس رہی ہیں۔ اب وہ مئی کی چلچلاتی دُھوپ اور جُون کی قیامت خیز گرمی رخصت ہو چکی۔ زمین اب آگ کے شعلے نہیں اُگلتی اور نہ آسماں کائنات کے ذرّے ذرّے کو لوؤں کے تھپیڑوں سے جھلساتا ہے۔ برسات کے چھینٹوں سے آتشیں پٹیں بجھ بجھا کر سرد پڑ چکی ہیں۔ جدھر دیکھئے ہریاول ہی ہریاول ہے۔ خزاں رسیدہ درخت جو چند روز پہلے درسِ فنا دے رہے تھے اب پھر سے جوانی کے سانس لے رہے ہیں۔ پھننگوں تک پر دھانی اور سُرخی مائل کونپلیں پھوٹ آئی ہیں گویا سبزے نے مُرجھائی ہوئی زندگی میں نئی جان ڈال دی ہے۔ بوڑھے شاداں، جوان فرحاں اور بچّے اپنے گیلیے پھر رہے ہیں۔ لڑکی بالیاں اور کنواری بیاہیاں اپنا رنگ الگ جما رہی ہیں۔ ہر طرف بے فکری اور تر و تازگی کا دَور دَورہ ہے۔ رنج و فکر کوسوں دُور ہیں۔ دُنیا کے بکھیڑوں اور آپس کے جھنجھٹوں سے آزادی پا کر ہر شخص مسرّت کی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ کہیں سے دھیمے سُروں میں ملہار گانے کی آواز آ رہی ہے اور کہیں سیر کے لئے جانے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔

برشگال گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کا پیغام لایا ہے۔ سرِ شام ہی سے قطب صاحب جانے کی صلاح ہو رہی ہے۔ طے پانے کے بعد تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ ایک ایک گھر میں کئی کئی کُنبے رہتے ہیں۔ اخراجات کو پُورا کرنے کے لئے سب نے پتی ملائی ہے۔

کچھ مرد بہارکس (بیل گاڑی۔ رتھ) والوں سے معاملہ کرنے اور سائی دینے چلے گئے۔ باقی سودا سُلف خریدنے جارہے ہیں۔ چھپا چھپ چیزیں منگائی جارہی ہیں۔ اوڑھنے بچھونے ٹھیک کئے جارہے ہیں۔ رات بھر سونے کی فرصت کم ملے گی۔ آخر ہری مرچیں اور قیمہ بھری اور بیسنی روٹیاں، اِشٹو اور آم کا اچار بھی تو تیار کرنا ہے! ابھی مرغ نے آمدِ صبح کا اعلان نہیں کیا، تین ہی بجے ہوں گے مگر عورتوں اور بچوں نے ناک میں دم کر دیا ہے کہ "جلدی گاڑی لاؤ، دیر ہو رہی ہے، اتنی دُور جانا ہے، سُستی کرو گے تو قطب کیسے پہنچیں گے؟" مرد کسمساتے اُٹھے اور گجردم قاضی کے حوض پہنچے۔ بہارکس والے بیل جوت رہے ہیں۔ "کہو چودھری! کیا دیر دار ہے؟ آسمان تو دیکھو، گھٹا ٹلی کھڑی ہے۔"

"آئیے مولیصاب! بس تیار ہی سمجھئے۔ ارے بخشو ذرا ذلدی (جلدی) کر۔ دیکھ تو دن بچاروں کو خود آنا پڑا۔"

ابھی پَو نہیں پھٹی، آسمان کے کناروں پر سیاہ بدلیوں کی گوٹ ٹنکی ہوئی ہے۔ دِلّی دروازے سے باہر آٹھ دس بہارکسیں آگے پیچھے لین ڈوری بنائے چلی جارہی ہیں۔ بیلوں کے گھنگرو اور گھنٹیاں اور ہنکانے والوں کی ٹخ ٹخ اور چمکاریں سُنائی دے رہی ہیں۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مرد بھی ہنستے بولتے گاڑیوں کے دائیں بائیں پیدل چل رہے ہیں۔ جب تھک جائیں گے تو دو گھڑی کے لئے سوار ہو جائیں گے۔ جنتر منتر سے آگے نکل کر عورتوں کی بادشاہت ہے۔ کئی نے بُرقعے اُتار کر گھٹنوں کے نیچے دبا لئے ہیں۔ البتہ دو چار ہچکچا رہی ہیں مگر باقی کیوں چپ رہیں: ایک ادھیڑ عمر کی بوی بولیں "دئی بُرا! یاں کونسا نگوڑا غیر مرد وا ہے جو تم اپنا دم گھونٹ رہی ہو!" دِن ڈھلتے فیروز شاہ کے کوٹلے، پُرانے قلعے، نظام الدین اولیاؒ اور ہمایوں کے مقبرے ہوتے ہوئے مدرسے (صفدر جنگ) پہنچے۔ بھوک نے ہلبلا دیا ہے۔ اس پر غضب یہ ہے کہ بارش کے ایکا ایکی رُک جانے سے گُھٹی گرمی پڑ گئی ہے۔ دوپہر کا کھانا یہیں کھایا جائے گا۔ ذرا دم لے کر پھر لمبا سفر کرنا ہے۔ ان دنوں مدرسے میں میلہ سا لگا ہے۔ ہر طرف سیلانی جیوڑوں، خوش باش بے فکروں اور بڑی چھوٹی عورتوں کے جمگھٹے ہیں۔ یہ سب بھی یہیں بیٹھ جائیں گے۔ دسترخوان پھیلا دیا گیا۔ سب ساتھ مل کر کھا رہے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں نکال رہی ہیں، کنواری بیٹیاں ایک ایک کے آگے رکھ رہی ہیں۔ جب سب کھا چکیں گے تو بچا کھچا ان کے حصّے میں آئے گا۔ اِسی لئے تو کہتے ہیں ان بچاریوں کو اپنے گھروں میں اچھی طرح کھانے پینے دو، پھر تو یہ ساون کی چڑیاں ہیں، کچھ دنوں میں سُسرال کا ڈولا دروازے آ لگے گا۔ کون جانے یہاں ان کی قسمت میں کیا لکھا ہے! بچّے تو بچّے ہی ہیں، اُنہوں نے آکر آموں سے اپنے ہاتھ مُنہ سان لئے ہیں تو کیا ہُوا، بڑوں کو دیکھو بچّوں میں بچّے بنے ہوئے آم چُوس چُوس کر چھلکے اور گٹھلیاں نہر کے پانی میں کیسے خوش ہو ہو کر پھینکتے ہیں۔ بجلی کوندتی دیکھی تو کھا پی سب جلدی جلدی سوار ہو گئے۔ پُروا ہوا چلنے لگی ہے۔ بادل گھر گھر کر آ گئے ہیں۔ کہیں برس گیا تو کچّے گھروندوں کو لے بیٹھے گا۔ ابھی تو آدھا راستہ باقی ہے۔ ڈرتے ڈرتے چلنا ہی پڑے گا۔ مطلع ابر آلود ہوتے ہی مور ناچنے لگے ہیں۔ سرسبز جھاڑیوں

کے آس پاس طاؤسی رنگ کیا کھل رہا ہے۔ کوئل کی کوک اور پپیہے کی "پی کہاں" سُن کر بیاہی بیٹیوں کو ساجن یاد آ رہے ہیں۔ میکے آنے اور ساون منانے کی خوشی میں ایک دُکھ بھری یاد بھی تو شامل ہوگئی ہے۔ مگر کیا کریں، والدین کی خوشی مقدم ہے۔

خدا نے بڑی خیر کی۔ بدلیاں ہوا میں تیرتی رہیں اور بیل گاڑیاں دونوں وقت ملتے صحیح سلامت قطب صاحب پہنچ گئیں۔ اور جو کہیں آج کل کا زمانہ ہوتا تو جان ست ہی ست پر نہ ہوتی۔ موٹر میں بیٹھے اور آنکھ جھپکاتے قطب صاحب پہنچ گئے لیکن اس سے فائدہ تو کچھ نہ ہوتا۔ لطف تو اس میں ہے کہ بھیگ رہے ہیں اور بگڑ رہے ہیں مگر راستہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہونے پاتا۔ بیل تو ہی ہولے ہولے ڈگمگ ڈگمگ چلیں گے۔ قطب صاحب کی پشت پر مہرولی ہے جہاں ان دنوں بڑی رونق اور چہل پہل ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بازاروں کے دونوں طرف دو منزلے ہیں۔ نیچے دُکانیں اور اوپر کوٹھے۔ برسات میں یہ کوٹھے کرائے پر لے لئے جاتے ہیں۔ بھول کی ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ ایک زور کا کڑاکا ہوا اور آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی چمک دیواروں پر سے پھسلتی ہوئی یک لخت غائب ہوگئی۔ پھر تو چھاجوں ہی پانی پڑ گیا، گویا اب برس کر پھر کبھی نہ برسے گا۔ صبح ہوتے تک دُعائیں مانگی گئیں "الٰہی ابھی جھڑی نہ لگے ورنہ ہم بچاریوں کا سوا کرکرا ہو جائے گا"! اللہ میاں عورتوں کی دُعا جلدی قبول کر لیتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھواں دھار طوفان بوندا باندی ہو کر رہ گیا۔ دُکانیں کھُل گئیں، لوگ باگ اِدھر اُدھر پھرنے پھرانے لگے۔ بازاروں کی گہما گہمی سیر و تفریح کی دعوت دینے لگی۔ مرد تنوروں کے گرد بیٹھے ہیں۔ روے میدے کے پراٹھے اور بیسن کی روٹیاں پکوا کر لونگ چڑے، شامی کباب، آم اور جامنیں خریدیں گے۔ اتنے میں عورتیں چٹنی، اچار اور سالن تیار کر لیں گی۔ پھر کچھ گھر پر رہیں گے باقی سیر کے لئے نکلیں گے۔ کم از کم آٹھ دس دن ٹھیرنا ہے اس لئے باری باری سب ہی سیر کر لیں گے۔ کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی۔ پھر کوئی مُنہ کیوں پھُلائے۔

شمسی باغ کے پیچھے اندھیری باغ میں بڑی بہار ہے۔ دلّی والے میلے ٹھیلوں کے رسیا برسات کا لطف اٹھانے آئے ہیں۔ سارا باغ آم اور جامن کے درختوں سے پٹا پڑا ہے۔ امریوں میں آج کل کونے کونے اور چپے چپے پر ہما ہمی ہے۔ کھم گڑے ہیں، جھولے پڑے ہیں، اکڑاہیاں چڑھی ہوئی ہیں۔ پکوان ہو رہے ہیں۔ گھٹا جھوم جھوم کر چھا رہی ہے۔ پھوار بھی پڑنے لگی ہے لڑکی بالیاں جھولنے میں مشغول ہیں۔ پینگیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ رنگ برنگی کپڑوں اور گنگا جمنی جھولوں نے عجب سماں پیدا کر دیا ہے۔ جھولنے والیاں ہولے ہولے گاتی بھی جاتی ہیں۔ کنواری بچیوں کا گیت سنیئے :-

ننھی ننھی بوندیاں رے ساون کا مورا جھولنا

ایک جھولا ڈالا میں نے امواکے ڈال پر   چھوٹی بڑی پینگیں رے ساون کا مورا جھولنا

ننھی ننھی بوندیاں رے

بیاہیوں کا گیت مختلف ہے :-

جھلوا جھولت ناگن ڈس گئی — اور ڈس گئی اُنگلی کی پور
ساس جی سے کہیو ہمارے پیّاں لاگوں — اور نند جی سے کہیو سلام
سیاں جی سے کہنا ناگن ڈس گئی — جھلوا جھولت ناگن ڈس گئی

کوئی زیرِ لب یہ الاپ رہا ہے :۔

چھائی بدریا کالی

اور کہیں سے یہ گانے کی آواز آرہی ہے :۔

جھولا کن نے ڈالو رے امریاں

دو سکھی جھولیں، دو ہی جھلائیں، چاروں مل گئیاں — شوخ رنگ سیاں، بھول بھلیاں

جھولا کن نے ڈالو رے امریاں

باغ اندھیری اٹال کنارے، مُرلا جھنگارے — بادل کارے برسن لاگیں بوندیں پھوئیاں پھوئیاں

جھولا کن نے ڈالو رے امریاں

قطب صاحب اور مہرولی کی سیر کے بعد دوسری جگہوں کا نمبر ہے۔ اِدھر حوضِ خاص اور منصور کا مقبرہ اور اُدھر تغلق آباد اور اوکھلا خاص مقامات ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قطب کی لاٹھ تک آئیں اور ان یادگاروں کی سیر نہ کریں؛ بھری برسات ان مقامات پر رنگ رلیاں اور جشن رہتے ہیں۔ لوگوں کی آمد میں کوئی فرق نہیں آتا، بلکہ جوں جوں گھٹائیں زیادہ کالی کالی اُٹھتی ہیں سیلانی جیوڑوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔

برسات اب بھی ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جو لطف اگلے وقتوں کے "جاہل اور غریب" لوگوں نے اُٹھالیا ہم "ترقی یافتہ اور دولت مند" لوگ قیامت تک نہیں اُٹھا سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ اُس وقت لوگوں کے پوٹے ترستے۔ دھیلی بارہ آنے کماتے تھے، تو پاؤلی جمع بھی کرتے تھے۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ روپیہ کی آمدنی ہو تو سوا روپیہ خرچ۔ پھر ان کا دل بڑا تھا اور وہ خوشی کے وقت خوش ہونا جانتے تھے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ خوش ہونا چاہیں تو بھی معذور ہیں۔ اُن کے سینوں میں طاقت اور جسم میں جان تھی۔ اسی لئے اُن کے قہقہے دیوار کے پیچھے تک سنائی دیتے تھے۔ برخلاف اس کے ہماری ہنسی مدقوق کی کھانسی سے زیادہ نہیں۔

بس بھائی! رات جا چکی۔ صبح کا ستارہ جھلملا رہا ہے۔ صحبتِ شب کے افسانے ختم ہوئے۔ اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ ہم بڈھے ٹھڈے قبروں میں پیر لٹکائے موت کے منتظر ہیں۔ کچھ ہم نے سُنا اور دیکھا تو اگلے وقتوں کے میلے ٹھیلوں کھیل

تماشوں، رنگ رلیوں کی ایک جھلک دکھا بھی دی، کل کوئی یہ جھلک دکھانے والا بھی نہ ہوگا۔

سچ تو یہ ہے، بدنصیب دلّی کی داستانیں اب کوئی کتنی ہی عمدگی سے سُنائے، ان میں وہ حلاوت اور پاکیزگی نہیں جو دِلّی کے اُس ازلی پرستار کی تحریر و تقریر میں تھی جو علامہ راشد الخیری رح کی سنیت میں جلوہ آرا ہؤا اور اب خاکِ دِہلی میں آرام سے محوِ خواب ہے۔

صادق الخیری

غزل

تمہاری یاد میں ہے روح بے قرار ہنوز
ہے اشکبار مری چشمِ انتظار ہنوز

مرے چمن پہ ہے چھائی ہوئی خزاں اب تک
مری خزاں نہیں شرمندۂ بہار ہنوز

اگرچہ مدّتیں گزریں تمہیں بُھلائے ہوئے
تمہارے نام پہ آتا ہے پھر بھی پیار ہنوز

اگرچہ مدّتیں گزریں نہیں سلام و پیام
مگر ہے دِل کو کسی شے کا انتظار ہنوز

ملول رُوح میں کوئی خلا سا رہتا ہے
اُسی طرح دلِ محزوں ہے سوگوار ہنوز

وہ شرحِ دردِ محبت جو میں نے کی تھی کبھی
اُس اِک خطا پہ ہوں مَیں، آہ شرمسار ہنوز

اگر دلوں کو نہ تھا کوئی ربط آپس میں
تو پھر ضمیر ہے کیوں رُوح بے قرار ہنوز

سیّد ضمیر جعفری

اِختلاج کے لمحے

دوستو! اِس بے دلی کا بھی ہے کیا کوئی عِلاج ؟ بولتی ہے فاختہ ہوتا ہے مجھکو اختلاج

چاندنی راتوں میں جب آتی ہے کوئل کی صدا چھاؤں میں تاروں کی یہ کیوں دم اُلجھتا ہے مرا

جھٹپٹے کو گاؤں میں ہوتے ہیں جب روشن چراغ دیکھ کر اُن کو اُبھر آتے ہیں کیوں سینے کے داغ

جھوم کر آتی ہے جب برسات کی پہلی گھٹا دِل پہ چھا جاتی ہے کیوں رقّت یہ کیا ہے ماجرا

مطربوں کے راگ سے کیوں دل میں چُبھ جاتی ہی پھانس جب سنکتی ہیں ہوائیں کیوں اُکھڑ جاتی ہی سانس

شعر سُن کر اُوبھتا ہے دم یہ کیوں بے اختیار اشک بھر آتے ہیں کیوں جب شب کو بجتا ہی ستار

جب کوئی ماضی پہ کرتا ہے خیال آرائیاں وجہ کیا ہے سرد پڑ جاتی ہیں میری اُنگلیاں

قہقہوں کو سُن کے مَیں آنسو بہا دیتا ہوں کیوں؟

جب کوئی کرتا ہے ماتم مُسکرا دیتا ہوں کیوں؟

جلال ملیح آبادی

انقلابِ ایران کا ایک شاعر

آزادیِ تقریر ایشیا کے "رسمی" شعرا کے حصے میں نہیں آئی۔ ان کی قسمت میں کسی بے راہ رو امیر کی مدح خوانی ہے یا کسی حقیقی یا خیالی معشوق کی آستاں بوسی۔ مگر پیغمبرانِ سخن سے کوئی زمانہ خالی نہیں۔ ہر بلا انگیز دور میں جب بیداد و ستم کی حکومت ہو، فرعونی طاقتیں سربلند ہوں اور سچی بات کرنے پر زبان کٹتی ہو، کوئی مردِ خدا رسومِ شاعری اور آدابِ مدح کو بالائے طاق رکھ کر صدائے حق بلند کرتا ہے۔ ایسی مثالیں کم ہوں مگر ملتی ضرور ہیں۔ ہر فرعون کو ایک موسیٰ اور ہر فتنہ کو ایک ربانی قوت سے زیر ہونا پڑتا ہے۔ فارسی شاعری کی تاریخ بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ فتنۂ تاتار کو جس بیباکی سے سعدی نے للکارا تھا اسے کون نہیں جانتا اور فتنۂ قاچار کو جس طرح ادیب الملک امیری نے دعوتِ مقابلہ دی اس کا بیان ان صفحوں میں آئے گا۔

خاندانِ قاچار اپنے آخری دور میں چنگیز اور ہلاکو کی تباہ کاریوں کی یاد دلاتا ہے۔ اگرچہ روسی جنگوں نے شاہی وقار کو خاک میں ملا دیا تھا اور ملک پے در پے شکستوں سے کمزور ہو چکا تھا اور خزانہ مصارفِ جنگ اور شاہی اسراف کا متحمل نہ ہو سکتا تھا لیکن قاچاری غرور حسبِ دستور فرعون و نمرود کی روایات کو تازہ کرتا رہا۔ شکست خوردہ شاہ کی بدنصیب رعایا صبر آزما ذلتوں سے دوچار اور زہرہ گداز مظالم کا شکار ہوتی رہی۔ ایک عرصہ تک ان انسانیت سوز مظالم کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔ مطلق العنان شاہ اور اس کے نالائق مشیر خداوندِ مطلق بنے رہے اور جمہور خون کے گھونٹ پی کر صبر کرتے رہے لیکن آخر صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور حق اپنی بے سروسامانی کی پروا نہ کرتے ہوئے باطل کی قوتوں سے معرکہ آرا ہوا۔ حق و باطل کی اس جنگ میں سب سے پیش پیش ادیب الملک شیخ امیری فراہانی تھے جنہیں اپنے وقت کا سعدی کہنا چاہیے۔ کیونکہ شیخ شیراز کی طرح شیخ فراہان بھی انعام و اکرام کی طمع سے بے نیاز ہو کر قید و بند کی سختیوں کو خاطر میں نہ لا کر اعلانِ حق کرنا اپنا فرض ہی نہیں بلکہ مقصدِ حیات سمجھتے تھے۔

حق پرست امیری نے اپنے مقصدِ زندگی کا اعلان ان الفاظ میں کیا ہے:

۱۔ برآنم کہ گر بخت نیرو دہد	ستارہ مرا فال نیکو دہد
میرا ارادہ ہے کہ اگر قسمت یاور ہو	اور ستارہ نیک ہو (تو)
۲۔ برآرم ز بن بیخ بیداد را	بگردوں زنم پایۂ داد را
ظلم و ستم کو جڑ سے اکھیڑ دوں	اور انصاف کا نام بلند کروں

۳۔ بشویم رُخِ گیتی از اہرمن — برانم دو از دشت و زاغ از چمن

اہرمن کو دُنیا سے مٹا دوں۔ — دیوؤں کو صحرا سے اور کوّوں کو باغ سے نکال دوں

اس کے بعد شیخ ملوکیت کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کرتا ہے۔ ظالم بادشاہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تم ہو کس خیال میں۔ جو جی میں آتا ہے کرتے ہو، جو مُنہ میں آتا ہے کہہ دیتے ہو۔ ہوش میں آؤ۔ تمہارے سر میں کیا سودا سمایا ہُوا ہے؛

۱۔ بیندیش از انجامِ بد زینہار — باندیشۂ خود مکن ہیچ کار

اپنے بُرے انجام کا خیال کرو — ہمیشہ اپنی مرضی پر ہی نہ چلو

۲۔ کہ ناید دلت راز یزداں سروش — سخن ز آسمانت بیاید بگوش

تم پر آسمان سے وحی تو نازل نہیں ہوتی — (البتہ) یہ صدا ضرور آتی ہے

۳۔ تو شاہی ہمانا پیمبر نہ — بگوہر ازیں خلق برتر نہ

تم بادشاہ ہو پیغمبر نہیں ہو — تم ان لوگوں سے بہتر چیز کے بنے ہوئے نہیں ہو۔

عالی نسبی کے دعوے کی دھجیاں بکھیرنے کے بعد شاعر بادشاہ کو اس لطیف نکتہ سے آگاہ کرتا ہے کہ اس کی عظمت کا انحصار رعیت کی بہبود پر ہے۔ رعیت آسودہ ہے تو بادشاہ سربلند ہے۔ اگر رعیت پریشاں حال ہے تو بادشاہ کا تزک و حشم بھی چند روزہ ہے۔ اگر سلطنت انصاف پر مبنی ہے تو وہ چٹان کی طرح ہر سیلِ مخالف کا مقابلہ کرے گی اور اگر اس کی بنیاد انصاف پر نہیں تو سیلاب کا پہلا ریلا اسے خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ بادشاہ کو اپنی سلطنت کی حفاظت کے لئے دہقان کے مضبوط بازو کی ضرورت ہے اور دہقان انصاف کا طالب ہے ؎

۱۔ شاہی بسپاہ است و سپاہی باز ر — زر از کفِ دہقاں رسد اندر کشور

سلطنت فوج سے قائم ہے اور فوج روپیہ سے — دہقاں کا ہاتھ بادشاہ کو روپیہ دیتا ہے

۲۔ دہقاں بادا د ماند اے شہ بنگر — کایں داد درخت است و شہی او را بر

دہقاں انصاف سے قائم ہے۔ اے بادشاہ! دیکھ — کہ انصاف ایک درخت ہے جس کا پھل بادشاہی ہے

شاہِ ایران اس منطق کا قائل نہ ہُوا۔ اس نے ایک اور قسم کا باغ لگایا جس کا منظر شاعر نے اس دردناک نظم میں کھینچا ہے ؎

۱۔ بباغِ خویش بنازد شہنشہِ ایراں — چنانکہ مانی بر کارخانۂ ارژنگ

شاہِ ایران کو اپنے باغ پر ناز ہے — جس طرح مانی مصوّر کو اپنے نقشِ ارژنگ پر

۲۔ چگونہ باغے کز ہر طرف درو نگری — زخونِ بیگنہاں لالہ رستہ رنگا رنگ

کیا باغ ہے کہ جدھر دیکھو — بے گناہوں کے خون سے رنگ رنگ کے لالے کھلے ہوئے ہیں

۳۔ ہمی تو گوئی کا ینجا حدیقۃ الموت است — بجائے سرو دراں نیزہ جاے سبزہ خدنگ

یہ گمان ہوتا ہے کہ گویا موت کا باغ ہے — جہاں سرو کی جگہ نیزہ اور سبزہ کی جگہ تیر ہیں

۴۔ بجائے نارِ دلِ بیدلاں طپیدہ بخوں — بجاے تاک سرِ خستگاں زدار آونگ

جہاں انار کی جگہ خوں شدہ دل ہیں — اور انگور کے خوشوں کی بجائے غریبوں کے سر درختوں پر لٹک رہے ہیں

۵۔ ریاضِ آں ہمہ آگندہ از بلاد نقم — حیاضِ آں ہمہ انباشتہ بزہر و شرنگ

اس کے باغ مصیبتوں اور بلاؤں سے پٹے پڑے ہیں اور اُس کے حوض زہر اور اندرائن سے بھرے ہوئے ہیں

۶۔ زسیلِ اشکِ یتیماں و خونِ مظلوماں — بگل فرو درود رپاے اسپ تا آرنگ

یتیموں کے آنسوؤں اور بے گناہوں کے خون سے — گھوڑا تا بہ کمر کیچڑ میں دھنس جاتا ہے

فرائضِ شہنشاہی سے یہ مجرمانہ غفلت دیکھ کر شیخ فراہان کے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ تاریخ کی عدالت میں شاہِ ایران کا امتحان لیتا ہے اور اس کے لئے مناسب تعزیر تجویز کرتا ہے۔ پہلے وہ قانون کی وضاحت کرتا ہے ؎

۱۔ شہاں را نباید کہ رامش کنند — بگلگشتِ بستاں خرامش کنند

بادشاہوں کو ناچنا گانا نہیں چاہئے — اور نہ اپنا وقت باغوں میں (عیش و عشرت میں) ضائع کرنا چاہئے۔

۲۔ بُتِ سادہ را با شہاں کار نیست — بطِ بادہ را نزدِ شہ بار نیست

حسین معشوق بادشاہ کے لئے نہیں — اور شراب کا داخلہ شاہی مجلس میں ممنوع ہے

۳۔ سرودِ شہاں ست گفتارِ پیر — زخوں بادہ و شاہد از تیغ و تیر

بادشاہ کے لئے بوڑھوں کی نصیحت ہی ایک نغمہ ہے — اس کی شراب خون ہے اور تیغ و تیر اس کے معشوق ہیں۔

اس کے بعد شیخ فراہاں فیصلہ سناتا ہے ؎

۴۔ چو شہ تیغ راہشت و ساغر گرفت — بداں تیغ باید سرش برگرفت

اگر بادشاہ تلوار کو چھوڑ کر شراب کا پیالہ اُٹھالے — تو اسی کی تلوار سے اس کا سر کاٹ دینا چاہئے

ملوکیت کے قتل نامہ پر مہر ثبت کرنے کے بعد شاعر بربادیِ وطن پر آنسو بہاتا ہے اور غدارانِ ملت کے رویہ پر پیچ و تاب کھاتا ہے

۱۔ اے دریغا رفت آں قصرے کہ بود اندر کنارش — دامنِ قلزم زسوے، ساحلِ جیحوں زیکسو

افسوس! وہ قصر مٹ گیا جس نے ایک طرف قلزم اور دوسری طرف جیحوں کا دامن تھاما ہوا تھا

۲۔ اے دریغا! رفت آں گنجے کہ بردے رشک بروے — دستِ موسٰے یک طرف گنجینۂ قاروں زیکسو

افسوس! وہ خزانہ لٹ گیا جس پر ایک طرف دستِ موسٰے اور دوسری طرف گنجِ قاروں رشک کرتے تھے۔

۳۔ زیں تجارت آتشم در دل فروزد چونکہ بینم — سودِ سوداگر زسوے حسرتِ مغبوں زحیو

اس تجارت کو دیکھ کر میرا دل جل جاتا ہے — کہ ایک طرف سوداگر نفع اٹھاتا ہے دوسری طرف جس کا مال گیا ہے وہ روتا ہے

تیسرے شعر میں ان وطن فروشوں کی طرف اشارہ ہے جو شیر و آفتاب کی سرزمین کو اغیار کے حوالے کرنے پر رضامند ہو گئے تھے۔

شیخ فراہان وطن کی حفاظت کے لئے ہر ممکن قربانی کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا ہر شعر مردانہ جذبات کو اُبھارتا ہے اور قوتِ عمل کو اُکساتا ہے۔ اس کا سادہ اور پُرجوش اندازِ تحریر اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ ہر ایرانی کا دل اس کے اشعار سُن کر تڑپتا ہے اور ایران کے ہر گوشہ میں اس کا نعرۂ جنگ گونجتا ہے:—

۱۔ زمردن میندیش و باعزم باش — شب و روز آمادۂ رزم باش

موت سے نہ ڈرو اور ارادوں کو کمزور نہ ہونے دو۔ — ہر وقت جنگ کے لئے کمربستہ رہو

۲۔ چرا باید اندیشہ کردن زجنگ — نہ ما از گلو خیم و دشمن زسنگ

جنگ سے ڈرنا فضول ہے۔ — نہ ہم کچی مٹی کے بنے ہیں اور دشمن پتھر کے

۳۔ چرا تن بزنجیرِ دشمن دہیم — بزندانِ اہرمیناں تن دہیم

ہم دشمن کی زنجیروں کو کیوں قبول کریں اور — اس کے زندان میں رہنا اختیار کریں

۴۔ گر او را بود دست و شمشیر تیز — ترا ہم بود دست و شمشیر نیز

اگر اس کے ہاتھ ہیں اور ہاتھ میں تلوار ہے تو — تمہارے بھی ہاتھ ہیں اور تمہارے ہاتھ میں بھی تلوار ہے

۵۔ مبر آشتی نام ہنگامِ جنگ — مبر دل زنام و مدہ تن بہ ننگ

جنگ کے وقت صلح کا نام نہ لو۔ دل سے عزت کے خیال کو دُور نہ کرو اور بے غیرتی قبول نہ کرو۔

ان اشعار سے اس نتیجہ پر نہ پہنچنا چاہئے کہ شیخ فراہان کو جنگ کے شعلوں سے عشق ہے اور وہ ہر حالت میں امن سوزی کو جائز سمجھتا ہے۔ یہ خیال سراسر غلط ہے۔ وہ جنگ کو بامرِ مجبوری اختیار کرتا ہے، وہ جنگ کا نہیں بلکہ ان قابلِ قدر اصُولوں کا شیدا ہے جن کے لئے جنگ کی جاتی ہے، جن اصُولوں کی قیمت ان لاتعداد جانوں سے بھی زیادہ ہے جو جنگ میں قربان کی جاتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں جب جنگ کے مہیب بادل فضا میں منڈلا رہے ہیں شیخ فراہان کا کلام آفتابِ ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیخ کو جنگ کی تباہ کاری اور ہلاکت آفرینی کا پورا احساس ہے اس لئے وہ اس کا نقشہ کھینچنے کے لئے ایک صحیح اور سبق آموز پیرایہ اختیار کرتا ہے، ذیل کے اشعار کسی موجودہ یا آئندہ زمانہ کی جنگ پر صادق آئیں گے۔

۱۔ برہم زنند منزل و ماوائے یکدگر — ویراں کنند خیمہ و خرگاہِ خویشتن

ایک دوسرے کے گھروں، شہروں اور اپنے خیمہ و خرگاہ کو تباہ کرتے ہیں

۲۔ طیارہ ہا چو رعد خروشاں فرازِ تل — عرادہ ہا چو برق شتابندہ در دمن

ان کے طیارے پہاڑوں پر بادل کی طرح گرجتے ہیں — ان کی توپیں میدانوں میں بجلی کی طرح چمکتی ہیں

۳۔ جائے زہور زہر بروید ز شاخسار — جائے گل و شگوفہ دمد از شجر شجن

کلیوں کی بجائے شاخوں سے زہر نکلتا ہے۔ — پھولوں اور کونپلوں کی بجائے درختوں سے آگ پھوٹتی ہے

۴۔ دُنیا خراب شد پے آزادیِ نفوس — دریا سراب شد پے آبادیِ وطن

آزادی کا نام لے کر دُنیا برباد کر دی گئی ہے۔ وطن کی آبادی کا نام لے کر سمندروں کو سراب بنا دیا گیا ہے۔

۵۔ بانگے دگر برآید ازیں طشتِ نیلگوں — نقشے دگر نماید ازیں اطلس کہن

اب اس نیلگوں طشت سے نئی صدا نکلے گی — اس پرانے اطلس پر نیا نقش ظاہر ہوگا

۶۔ غواصہ شاں در آب چو تابوتِ موسوی — طیارہ شاں بکوہ چو فرہادِ کوہکن

پانی میں ان کی آبدوزیں تابوتِ موسوی کی طرح ہیں — ان کے طیارے فرہاد کی طرح پہاڑوں کو کھود رہے ہیں

۷۔ یا ویلتا کہ جملہ کرند از جوان و پیر — واحسرتا کہ یکسرہ کورند مرد و زن

افسوس کہ جوان اور بوڑھے سب بہرے ہو گئے ہیں — افسوس مرد و زن سب اندھے ہو گئے ہیں

امیری کے سینہ میں ایک حساس دل ہے جو انسانوں کو خاک و خون میں لوٹتے دیکھ کر تڑپ جاتا ہے، وہ جنگ کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

جنگ ننگ است در شریعتِ من — جز پئے پاسِ دین وحفظِ وطن

ز ردِ دین و وطن چو نیست ترا — صلح کل شو مدار چون و چرا

جنگ محض وطن اور مذہب کی حفاظت کے لئے جائز ہے لیکن حقیقی وطنیت اور حقیقی مذہب امن کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر سب لوگ وطنیت اور مذہب کی حقیقت سے واقف ہوں تو جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔

۱۔ مرا عالم وطن باشد بشر خویش — نخواہم غیر ازیں بنگاہ و بنیاد

تمام دُنیا میرا وطن ہے اور سب انسان میرے بھائی ہیں — مجھے کسی اور گھر کی ضرورت نہیں

۲۔ جز ایں افسانہ باشد ہر چہ گوئی — زمیں از خاک و مردم آدمی زاد

صرف یہ اتنا سچ ہے اور باقی سب جھوٹ ہے — کہ زمین خاک کی ہے اور ہر آدمی زادہ انسان

یہ ہے اس شریف النفس شاعر کا سیاسی مسلک اور ہمیں اس مقالہ میں صرف اسی موضوع پر بحث کرنا تھی ورنہ ادیب الملک کے کلیات تنوع سے خالی نہیں خصوصاً اس نے ہجو کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے مثلاً عورت کی ہجو، پارلیمنٹ کی ہجو، چار کی ہجو وغیرہ لیکن اس کی ہجوں کا محرک ہمیشہ ہمدردیٔ انسان

رفتارِ زمانہ

مٹی نہیں ہوسِ جاہ و اقتدار ابھی
بجھی نہیں طلبِ حق و اختیار ابھی

قیودِ خواجگی و بندگی نہیں ٹوٹیں — وہی ہے دبدبۂ تاج و تاجدار ابھی
حدودِ برتری و کمتری نہیں ٹوٹیں — وہی ہے طنطنۂ شہر و شہریار ابھی

جہاں سے مسئلۂ جبر و اختیار چلا — وہیں ہے مسئلۂ جبر و اختیار ابھی
جہاں سے قافلۂ صبر و اضطرار چلا — وہیں ہے قافلۂ صبر و اضطرار ابھی

ہوائے افسر و اورنگ ہی جلال آرا — جہاں کشائی کے گلشن میں ہی بہار ابھی
ادائے ساقیٔ گلرنگ ہی خیال آرا — نہالِ عیش میں تازہ ہیں برگ و بار ابھی

غرورِ دولت و طاقت کا رنگ قائم ہے — جھکا نہیں ہے سرِ کبر و افتخار ابھی
سرورِ عظمت و نخوت کا رنگ قائم ہے — نشہ ہے اور نہیں اندازۂ خمار ابھی

وہی ہے قاعدۂ جستجوئے زرگیری
نگاہ مکر کی ہے "آدمی شکار" ابھی
وہی ہے حوصلۂ آرزوئے زرگیری
وہی ہے دامنِ افلاس تار تار ابھی

مطاعِ زشت و زبوں کوششِ ظفر میں ہی
ملا نہیں ہے اسے گوشۂ قرار ابھی
متاعِ امن و سکوں معرضِ خطر میں ہی
بڑھا نہیں ہے کہیں دستِ اعتبار ابھی

نہ غم کہ ان سے کوئی ہاتھ کچھ صلہ مانگے
نہیں مشقّتِ مزدور کامگار ابھی
نہ خوف یہ کہ مکافات خوں بہا مانگے
گراں نہیں سرِ شاہی پہ خوں کا بار ابھی

نہ فکر کوئی کہ بھڑکے گی انتقام کی آگ
وہی ہے سلسلۂ قتل و خون و دار ابھی
نہ ذکر کوئی کہ زہری بہت ہے بھوک کا ناگ
نہیں نگاہ میں انسان کا وقار ابھی

"یہ کہہ رہی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی
زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی"
(آصفجاہ ہفتم)

وقار انبالوی

ایمانِ محکم

ایمانِ کامل مومن کا معیار
ایمانِ ناقص قوموں کا ادبار
ایماں نبوّت کا درسِ اوّل
ایماں خدا کے آئیں کا شہکار
ایماں سے محکم حمزہؓ کے بازو
ایماں سے فاتح حیدرؓ کی تلوار
ایماں ہمارا سازِ تمدّن
ایماں ہمارا سامانِ پیکار
مومن کے تابع ساری خدائی
مومن خدا کا احکام بردار
ایمان محکم ہوتا ہے اُس دم
جب ضربِ غم سے ہو روح بیدار
ذکرِ خدا سے تازہ ہو احساس
ذوقِ خودی پر مائل ہوں افکار

— زینب عثمانیہ لودھیانوی

مسافر

مسافر یونہی گیت گائے چلا جا
سرِ رہگذر کچھ سنائے چلا جا
تری زندگی سوز و سازِ محبّت
ہنسائے چلا جا رُلائے چلا جا
ترے زمزمے ہیں خنک بھی تپاں بھی
لگائے چلا جا بجھائے چلا جا
کوئی لاکھ روکے کوئی لاکھ ٹوکے
قدم اپنے آگے بڑھائے چلا جا
محبّت کے نقشے، تمنّا کے خاکے
بنائے چلا جا مٹائے چلا جا
قدامت حدیں کھینچتی ہی رہے گی
قدامت کی بُنیاد ڈھائے چلا جا
قسم شوق کی فطرتِ مضطرب کی
یُونہی نت نئی دُھن میں گائے چلا جا
جو پرچم اُٹھا ہی لیا سرکشی کا
اِسے آسماں تک اُڑائے چلا جا

— مجاز بی۔ اے (علیگ)

محفلِ ادب

لطائفِ اقبال

(جناب فضل کریم صاحب درّانی بی۔اے)

حسرت صاحب کو اصرار ہے کہ میں اقبال کے متعلق کچھ لکھوں اور مجھے اُردو نویسی کی مشق نہیں۔ علامۂ مرحوم کے ساتھ میری گفتگو عموماً دینی یا سیاسی مباحث پر ہوا کرتی تھی اور یہ دونوں موضوع بشیر ازم کے لائحۂ عمل سے باہر ہیں۔ اس ازراہِ امتثالِ امر صرف دو ایک لطیفوں پر اکتفا کروں گا۔ جن سے اقبال کی سیرت اور عقاید پر روشنی پڑتی ہے۔

آنحضرت صلعم سے عشق:۔

۱۹۳۵ء کے گرما میں ختم نبوّت کی بحث بہت گرم تھی۔ علامۂ مرحوم نے اس سال کے ماہِ مئی میں قادیانیوں کے خلاف ایک بیان دیا تھا جس نے اس جماعت کے دونوں فریقوں کو ڈاکٹر صاحب سے ناراض کر دیا تھا اور انہوں نے ایک لایعنی بحث چھیڑ دی تھی۔ یاد نہیں علامۂ مرحوم نے کس غرض سے طلب فرمایا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ گفتگو زیادہ تر ختم نبوّت کے مسئلہ پر ہوئی تھی۔ آپ نے مقامِ نبوّت پر تقریر کرتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی سیرت سے ایک واقعہ بیان فرمایا اور کہا حضرت ابوبکر رضہ سے کسی نے پوچھا۔ کیا آپ کو اللہ کے ساتھ زیادہ محبت ہے، یا اللہ کے رسول کے ساتھ۔ ایک خشک زاہد تو عموماً یہی جواب دے گا کہ مجھے اللہ کے ساتھ زیادہ محبت ہے کیونکہ رسول کے ساتھ زیادہ محبت اس کے نزدیک شرک ہوگا۔ لیکن حضرت ابوبکر نے فرمایا، مجھے اللہ کے رسول کے ساتھ زیادہ محبت ہے۔ کہنے لگے رسول اللہ کی بعثت سے پہلے ہم بھی یہیں تھے اور اللہ بھی یہیں تھا۔ نہ اس نے ہم کو پوچھا نہ ہم نے اس کو پہچانا۔ جو اللہ کا رسول آ گیا تو ہم نے اللہ کو پہچان لیا اور اللہ نے بھی ہم کو پہچان لیا۔ علامۂ مرحوم نے فرمایا میں نے یہ واقعہ شعر میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ آپ نے دو شعر سنائے۔ علامۂ مرحوم کو آنحضرت صلعم سے عشق تھا اور میرا ایمان ہے کہ حضور صلعم سے عشق ایک انسان کی نجات کے لئے کافی ہے۔ آپ نے ایک شعر تو صاف پڑھ لیا۔ تیسرے مصرعہ پر رقت طاری ہوئی۔ گھگی بندھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بڑی مشکل سے شعر پورا کیا۔ شعر رموزِ بیخودی میں ہیں ؎

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر — بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ — از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

اَلاَرضُ لِلّٰہ

علّامۂ مرحوم نے ایک دن ذیل کا لطیفہ بیان فرمایا:-

جنگ سے غالباً پہلے یا شاید جنگ کے دنوں کا واقعہ ہے۔ پنجاب گورنمنٹ انہار پر مربعہ جات تقسیم کر رہی تھی۔ میں ان دنوں انارکلی میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن مغربی پنجاب کے ایک پیر صاحب تشریف لائے۔ عموماً آیا کرتے تھے، شریف آدمی تھے اور میری ان کی دیرینہ ملاقات تھی۔ (ڈاکٹر صاحب نے ان پیر صاحب کا نام ومقام بھی بتایا مگر مجھے یاد نہیں رہا۔) کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب مجھے ایک درخواست لکھ دیجئے کہ مجھے بھی کچھ مربعے دیئے جائیں۔ میں نے کہا۔ یہ بھی آپ نے دریافت کرلیا ہے کہ زمین کس کی ہے؟ پیر صاحب میرے سوال سے کچھ پریشان سے ہو گئے اور جلدی میں کہنے لگے۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا۔ پہلے آپ یہ دریافت کر آئیں کہ زمین کس کی ہے۔ پھر میں درخواست لکھ دوں گا۔ چنانچہ پیر صاحب چلے گئے، دوسرے دن پھر آئے اور کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کا سوال سمجھ میں نہیں آیا۔ زمین گورنمنٹ دے رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ زمین گورنمنٹ کی اپنی ہی ہوگی۔ میں نے کہا۔ شاہ صاحب ایک کتاب ہے بہت پرانی، اس کو لوگ قرآن کہتے ہیں۔ ایک شخص ہمارے یہاں سے دُور ملک عرب میں ہوا ہے، اس کا نام تھا محمد صلعم، یہ کتاب اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی، اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ہے۔ اب آپ فرمائیں تو میں اللہ تعالےٰ کے نام چٹھی لکھ دیتا ہوں۔

پیر کے سینے میں ایمان کی روشنی باقی تھی، وہ بےحد متاثر ہوا۔ رو پڑا اور کہنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کوئی درخواست نہ لکھیئے میں زمین کے لئے انگریز سے درخواست نہیں کروں گا۔

اتفاق سے پیر صاحب کو دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں فوج میں ان کے بہت سے مرید تھے۔ اُنہوں نے پیر صاحب کی ضیافت کی، جس میں اپنے افسروں کو بھی بلایا جن میں کمانڈر انچیف بھی تھا۔ کھانے کے بعد یکایک ایک مُرید نے اُٹھ کر تقریر کی کہ ہم سب لوگ ان پیر صاحب کے مرید ہیں۔ ہمارے پیر کو زمین ملنی چاہیئے۔ کیونکہ ان کے لنگر کا خرچ بہت زیادہ ہے، فوجی افسر سادہ لوح ہوتے ہیں اور ان کو اپنے سپاہیوں کی مدارات کا بہت خیال ہوتا ہے۔ قصّہ مختصر کمانڈر انچیف نے اپنے طور پر سر مائیکل اوڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب کو لکھا اور پیر صاحب کو دس مربعہ زمین بغیر درخواست مل گئی۔

شانِ بے نیازی:-

علامہ مرحوم کچھ دن ریاست بہاول پور کے قانونی مشیر بھی رہے تھے۔ ایک دفعہ ریاست کے کسی کام پر ان کو وائسرائے سے ملاقات کے لئے دلی جانا پڑا۔ دورانِ ملاقات میں وائسرائے نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ کل شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں، وائسرائے کی دعوت اہلِ جاہ کے لئے بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اس قسم کی دعوت حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے جتن کئے جاتے ہیں

پھران دعوتوں کا اشتہار اخباروں میں شائع ہوتا ہے۔ سرکاری گزٹ نکلتا ہے اور جن کو یہ نعمت حاصل ہو جائے، وہ اس گزٹ کو حرزِ جاں بنائے رکھتے ہیں اور پشت در پشت اس گزٹ کی حفاظت کرتے ہیں لیکن ؎

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ — پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

علامہ مرحوم نے وائسرائے کی دعوت کا جواب دیا۔ میں کل تک نہیں ٹھہر سکتا۔ میں تو آج شام کو لاہور واپس چلا جاؤں گا۔ وائسرائے نے اصرار کیا کہ ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ کل چلے جانا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اگر آپ کو کھانا کھلانے پر بہت اصرار ہے۔ تو آج شام کو کھلا دیجئے تاکہ میں رات کی گاڑی میں سوار ہو سکوں۔ لیکن کل تک تو میں ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔ اُدھر سے اصرار، اِدھر سے انکار۔ آخر وائسرائے مجبور ہو گیا، اور پہلے کے تمام انتظامات کو درہم برہم کر کے ڈاکٹر صاحب کے لئے کھانے کا جلدی جلدی اسی دن انتظام کیا گیا اور ڈاکٹر صاحب کھانے کی رسم ادا کر کے اسی شام لاہور روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچنے پر ان کو ریاست کی طرف سے ایک تار ملا کہ فوراً بہاولپور پہنچو۔ ڈاکٹر صاحب کو تار دیکھ کر سخت غصہ آیا۔ کہنے لگے ان کمبختوں نے مجھے اپنا نوکر سمجھ لیا ہے۔ میں نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ کی آمدنی پر لات مار دی اور استعفیٰ بھیج دیا۔

شیوادرہ

ڈاکٹر اقبال

(علی بخش کی زبانی)

(۲)

میاں علی بخش کا قاعدہ ہے کہ وہ علامہ اقبال کی زندگی کے حالات بیان کرتے کرتے غیر متعلق باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ خیر اس کا تو یہ علاج ہے کہ لکھتے وقت ان باتوں کو قلم انداز کر دیا جائے۔ لیکن ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ کسی ترتیب سے حالات بیان نہیں کرتے بلکہ ۱۹۱۰ء کے واقعات بیان کرتے کرتے دفعتہً ۱۹۳۰ء کے حالات بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کی زندگی کے کسی پہلو کے متعلق اُنہوں نے ایک ملاقات میں چند باتیں کہیں اور چپکے ہو گئے۔ دُوسری ملاقات میں اسی موضوع کے متعلق چند اور باتیں بیان کر گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ سوانح نگاری کے عام اصولوں کے پیش نظر ان تمام باتوں کو یکجا اور ایک خاص ترتیب سے بیان کرنا چاہئے تھا لیکن اس طرح یہ مضمون میاں علی بخش کا بیان نہ رہتا، بلکہ ڈاکٹر صاحب کے مرتب سوانح حیات کی صورت اختیار کر لیتا۔ اس لئے میں نے کسی ترتیب کا خیال نہیں رکھا بلکہ میاں علی بخش نے جو جو باتیں کہی ہیں انہیں اسی طرح لفظ بلفظ نقل کر دیا ہے۔

حسرت

یہ بات نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو اچھے کھانے کا شوق نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ سے بہت خوش خوراک تھے۔ دسترخوان پر ہمیشہ دو

ین قسم کا سالن ضرور ہوا کرتا تھا۔ البتہ وہ کھاتے بہت تھوڑا تھے۔ عام طور پر صرف ایک وقت کھانا کھاتے تھے۔ بہت ہوا تو رات کو نمکین چائے پی لی۔ صبح کو چائے بھی نہیں پیتے تھے۔ اکثر اوقات کچھ کھائے پئے بغیر کالج چلے جاتے تھے اور دوپہر کو آ کے کھانا کھاتے تھے۔

خشکہ ان کی طبیعت کو راس نہیں آتا تھا۔ اس لئے وہ عام طور پر روٹی ہی کھاتے تھے۔ شبدیگ کا بہت شوق تھا اور شبدیگ ہمیشہ خشکہ کے ساتھ کھاتے تھے۔ آخر آخر میں صبح کو چائے بھی پینے لگے تھے اور پلاؤ بھی بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے۔

صبح کی نماز اور قرآن خوانی مدت سے ان کا معمول تھا۔ قرآن بلند آواز سے پڑھتے تھے، آواز ایسی شیریں تھی کہ ان کی زبان سے قرآن سن کر پتھروں کے دل پانی ہو جاتے تھے۔ بیماری کے زمانے میں قرآن پڑھنا چھوٹ گیا تھا۔ نماز بھی کم پڑھتے تھے۔ موت سے کچھ عرصہ پیشتر مجھ سے کہنے لگے "علی بخش میرا جی چاہتا ہے کہ آج نماز پڑھوں"۔ میں نے کہا۔ آپ پلنگ پر بیٹھ جائیے۔ میں آپ کو وہیں بیٹھے بیٹھے وضو کرا دیتا ہوں۔ وضو کر چکے تو میں نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب میں نے مہر صاحب کو لیٹے لیٹے نماز پڑھتے دیکھا ہے خدا جانے یہ کیا بات ہے؟ کہنے لگے، ہاں مجبوری کی حالت میں یہ بھی جائز ہے۔

جن دنوں ہم بھاٹی دروازہ میں رہتے تھے ایک دفعہ وہ پورے دو مہینے بڑی باقاعدگی سے تہجد کی نماز پڑھتے رہے۔ ان دنوں ان کا عجب حال تھا۔ قرآن اس خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے تھے کہ جی چاہتا تھا بس سارے کام کاج چھوڑ چھاڑ کر انہیں کے پاس بیٹھا رہوں۔ اس زمانہ میں کھانا پینا بھی چھوٹ چکا تھا۔ صرف شام کو تھوڑا سا دودھ پی لیا کرتے تھے۔ خدا جانے اس میں کیا رمز تھی۔

جوانی میں ورزش بھی کرتے تھے۔ بھاٹی دروازے والے مکان میں تو صبح سویرے اٹھ کر ڈنٹر پیلنا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی مگدر بھی ہلاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اورینٹل کالج میں تھوڑے ہی دن رہے، وہاں سے گورنمنٹ کالج میں چلے گئے۔ اس زمانے میں سید نقی شاہ۔ بابو میراں بخش، فقیر افتخار الدین اور شیخ عبدالقادر سے ان کا بڑا میل جول تھا۔ مولوی حاکم علی سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن ان کے وقت کا زیادہ حصہ لکھنے پڑھنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ لکھتے کم تھے۔ پڑھتے زیادہ تھے۔ جس کمرہ میں وہ سوتے تھے اس میں ایک بڑی میز پر کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی میں ان کتابوں کو ترتیب سے الماری میں رکھ دینے کا ارادہ کرتا تھا تو کہتے تھے انہیں پڑا رہنے دو۔

کانگڑے کے زلزلہ میں لاہور پر بھی بڑی آفت آئی۔ شہر میں بہت سے مکان گر پڑے۔ ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ کبھی گھبرا کر کوٹھے پر چڑھ جاتا۔ کبھی نیچے آ جاتا تھا۔ جب زلزلہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹے کتاب پڑھ رہے تھے۔ لیکن جس طرح لیٹے تھے۔ اسی طرح لیٹے رہے۔ ذرا ہلے جلے تک نہیں۔ ہاں میری بے تابی دیکھ کر ایک دفعہ کتاب

پڑھتے پڑھتے سر اُٹھایا اور کہنے لگے۔ علی بخش! یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو۔ سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر پھر اسی اطمینان سے کتاب پڑھنے لگے۔

زلزلہ کے بعد میں گھر سے نکلا تو معلوم ہؤا کہ ڈاکٹر صاحب کے دوست شیخ عبدالقادر کا مکان گر پڑا۔ شیخ صاحب اس وقت ولایت میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ خبر سُن کر بہت افسوس ہؤا اور اسی وقت انہیں یہاں کے سارے حالات لکھ بھیجے۔

ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب پلنگ پر بیٹھے ہیں۔ سامنے کاغذ اور پنسل ہے۔ کبھی کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ کبھی کاغذ پر پنسل سے کچھ لکھ لیتے ہیں۔ کبھی پیشانی پر بل پڑے ہوئے ہیں اور سر جُھکا ہؤا۔ کبھی ہونٹوں پر مُسکراہٹ ہے اور آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت تو میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ بعد میں معلوم ہؤا کہ ڈاکٹر صاحب شاعر ہیں اور ان کے شعر کہنے کا یہی انداز ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ شعر، شاعر اور شاعری کا مطلب بہت دیر کے بعد میری سمجھ میں آیا۔

شعر کہتے وقت ڈاکٹر صاحب کی عجب کیفیت ہوتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے لیٹ جاتے، بار بار پہلو بدلتے، پھر اُٹھ بیٹھتے، کبھی چہرہ پر اضطراب ہوتا تھا کبھی بشاشت۔ ان کے پلنگ کے پاس ایک میز ہوتی تھی۔ اس پر ایک کاپی پڑی رہتی تھی۔ جب شعر کہنے کو طبیعت چاہتی لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ملنے کو آجاتا تھا تو اسے شعر لکھوا دیتے تھے۔

ایک دفعہ شیخ عبدالقادر کو شعر لکھوانے شروع کئے اور دونوں ساری رات بیٹھے لکھتے لکھاتے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے نظم ختم ہوگئی۔ یہ نظم انجمن کے جلسے میں پڑھی گئی۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ کونسی نظم تھی؛ شکوہ؛ نہیں شکوہ نہیں تھا، شکوہ جس جلسے میں پڑھا گیا۔ اس میں میں بھی موجود تھا۔ ابھی ڈاکٹر صاحب نے چند شعر ہی پڑھے تھے کہ ایک بوڑھے آدمی نے جس کے بال روئی کی طرح سفید تھے۔ الّا اللہ کہا اور جلسہ گاہ کے درمیان میں آگیا اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر دوسرے لوگوں پر بھی بہت اثر ہؤا۔ کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔

میں پڑھا لکھا نہیں اور نہ ڈاکٹر صاحب کے شعروں کا مطلب سمجھ سکتا ہوں۔ ان کی باتوں میں ایسی رمزیں ہیں کہ اللہ والے ہی انہیں سمجھ سکتے ہیں۔ مگر شکوہ کے کچھ شعر مجھے بھی یاد ہیں اور اسی زمانے سے یاد ہیں۔

علی بخش نے یہاں پہنچ کے شکوہ سنانا شروع کر دیا۔ اس وقت رات کی تاریکی پوری طرح جاوید منزل پر چھا چکی تھی۔ یہ سپید پیل پایوں والی عمارت تاریک فضا میں سر اُٹھائے کچھ سوچتی اور غور کرتی معلوم ہوتی تھی۔ میں اور علی بخش آمنے سامنے چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ اس کے پہلو میں ڈاکٹر صاحب کا دوسرا ملازم رحماں بیٹھا تھا۔

میں نے کہا "میاں علی بخش۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا لباس کیا تھا؟"

وہ کہنے لگا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب عام پنجابیوں کی طرح شلوار اور قمیص پہنتے تھے قمیص پر کوٹ نہیں فراک کوٹ نہیں۔ یہی م کوٹ۔ جو آپ اور ہم پہنتے ہیں، لیکن اتنا چھوٹا نہیں، البتہ جاڑے میں وہ بند گلے کا فراک پہنتے تھے۔ سر پر سپید ململ کی پگڑی ہوتی ی، موتیے رنگ کی پگڑی کا بھی شوق تھا۔ بعد میں ترکی ٹوپی بھی اوڑھنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب نے ولایت جانے سے پہلے سوٹ کبھی نہیں پہنا۔ اور سوٹ بھی کبھی کبھار ہی پہنتے تھے، ورنہ انہیں دل سے دیسی اس پسند تھا۔ ان دنوں گورمکھ سنگھ کے قلعہ میں نظام الدین نام ایک بڈھا درزی تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کپڑے اسی سے سلواتے تھے سے بھی ڈاکٹر صاحب سے بڑی محبت تھی، اور ان کے کپڑے بڑی محنت سے سیا کرتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا "علی بخش میں شیخ صاحب سے بہت ڈرتا ہوں بھئی آخر شاعر ہیں، کہیں غصہ میں آ کر میرے خلاف ایک آدھ شعر لکھ دیں تو میں کہیں کا نہ رہوں۔"

سچ پوچھئے تو ڈاکٹر صاحب کو اچھے لباس کا شوق نہیں تھا، جیسا کپڑا کسی نے لا دیا۔ پہن لیا۔ کپڑے پسند کرنے کا کام یا شی طاہر الدین کے سپرد تھا یا میرے۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ کپڑا اچھا نہیں۔ اس کا رنگ خراب ہے۔ اصل میں انہیں ان ییزوں کی پرواہی نہیں تھی۔ بیماری کے زمانے میں کچھ انگریز سوداگر[1] قالین لے کے آئے۔ ظاہرا ان کے رنگ بہت شوخ اور خوبصورت تھے۔ اس وقت جتنے لوگ پاس بیٹھے تھے، سب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب انہیں خرید لیجئے۔ غرض بارہ سو روپیہ کے قالین خرید لئے۔ لیکن کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کمبخت دگنی تگنی قیمت لے گئے ورنہ قالین بہت گھٹیا ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب نہایت باقاعدگی سے رکھتے تھے۔ منشی طاہر الدین کے پاس آج بھی تیس پینتیس سال کا سارا حساب لکھا ہوا موجود ہے۔ کیا مجال ہے کہ اس میں ایک پائی کا بھی فرق ہو۔ منشی طاہر الدین کو آپ جانتے ہوں گے، وہ رت تک ڈاکٹر صاحب کے پاس رہے ہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب وکالت کرتے تھے تو سارا کام کاج منشی جی کے سپرد تھا لیکن انہوں نے وکالت چھوڑ دی تو منشی جی نے اپنا علیحدہ کاروبار شروع کر دیا۔ لیکن آخری وقت تک حساب کتاب انہیں کے سپرد رہا۔ انہیں س کام کی باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے ولایت جانے سے کچھ عرصہ پہلے ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب پر جو ان دنوں فورٹ سنڈیمن میں انجنیئر تھے ایک مقدمہ بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس سلسلہ میں بلوچستان جانا پڑا۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا "بلبل کی فریاد" جو ان کی مشہور نظم ہے، انہوں نے راستہ میں ہی لکھی تھی۔ مقدمہ بہت دیر چلا۔ آخر شیخ عطا محمد بری ہو گئے۔ شاید اسی مقدمہ کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو قانون کی طرف توجہ ہوئی اور انہوں نے بیرسٹری کی تعلیم کے لئے ولایت جانے کا ارادہ کر لیا کچھ روپیہ

[1] غالباً یہ سوداگر ہالینڈ کے رہنے والے تھے۔

اُنھوں نے خود جمع کر رکھا تھا۔ کچھ شیخ عطا محمد سے لیا اور ولایت روانہ ہو گئے۔ کانگڑہ کا زلزلہ کس سال آیا تھا؟ ۱۹۰۵ء میں۔ تو زلزلے کوئی سال بھر بعد یعنی ۱۹۰۶ء میں وہ ولایت گئے ہوں گے۔

اصل میں ڈاکٹر صاحب دُنیا دار آدمی نہیں تھے اور دُنیا والوں کے اینچ پینچ اور اُلٹ پھیر انہیں نہیں آتے تھے۔ وہ کبھی اپنے پاس روپیہ پیسہ نہیں رکھتے تھے۔ منشی طاہر الدین ان کے خزانچی تھے اور ان کے ہاتھوں روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ مجھے کئی دفعہ ان کے ساتھ سفر کا اتفاق ہوا ہے۔ سفر میں روپیہ پیسہ بلکہ ریلوے کا ٹکٹ تک میرے پاس رہتا تھا۔ اپنے پاس وہ پھوٹی کوڑی تک نہیں رکھتے تھے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُنھوں نے جو نظمیں کہی ہیں ان کو چھاپ کے فروخت کیا جا سکتا ہے۔ کچھ نظمیں شیخ عبدالقادر چھاپنے کو لے جاتے تھے۔ کچھ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار میں چھپ جاتی تھیں۔ ان دنوں منشی فضل الٰہی مرغوب رقم ایک خوشنویس ہوا کرتے تھے۔ اُنھوں نے بھی ڈاکٹر صاحب کی بہت سی نظمیں کتاب کی صُورت میں چھاپیں اور ہزاروں روپے کمائے اور شاید انہیں کبھی کتابیں چھاپنے کا خیال ہی نہ آتا۔ بھلا ہو چودھری محمد حسین صاحب کا جنھوں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ بات سمجھائی۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاں چودھری صاحب کا آنا جانا مدت سے ہے جب وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اکثر آیا کرتے تھے لیکن جب وہ کالج چھوڑ کر ملازم ہوئے تو روزانہ آنے لگے۔ شاید ہی کبھی کوئی ایسا اتفاق ہُوا ہو کہ چودھری صاحب نہ آئے ہوں ورنہ مینہ آئے یا آندھی چودھری صاحب ضرور شام کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پہنچ رہتے تھے۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی پہلی کتابیں ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے خود چھاپیں۔ ان کے بعد تو سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بانگِ درا چھاپنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کو بڑی محنت کرنی پڑی۔ بانگِ درا کی ساری نظمیں مختلف اخباروں اور رسالوں میں چھپ چکی تھیں اور ان میں سے اکثر ایسی تھیں جن کی نقل بھی ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود نہیں تھی۔ البتہ بہت سے لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کا کلام جمع کر رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے یہ ساری نظمیں جمع کی گئیں اور بہت سی کانٹ چھانٹ کے بعد انہیں چھاپا گیا تھا۔

شیرازہ

مطبوعات

طنزیاتِ مانپوری ۔ یہ جناب مانپوری کے چودہ طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین دلچسپ اور بعض مقامات پر قابلِ داد ہیں مجلد شائع ہوئی ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ: مینیجر صاحب رسالہ "ندیم" گیا ۔

ہمارے نبی کے صحابہؓ ۔ از محمد اعجاز الحق صاحب قدوسی۔ یہ کتاب اسوۂ صحابۂ رسولؐ کا دل افروز مرقع ہے۔ اسلامی روایات کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ اس میں موجود ہے۔ حجم ۱۲۰ صفحے۔ قیمت ۸؍۔ پتہ: عبدالقادر تاجر کتب چار مینار حیدر آباد (دکن)

سراپائے رسولؐ ۔ یہ بھی اعجاز الحق صاحب کی کتاب ہے۔ حضورؐ کا حلیۂ مبارک، عادات و خصائل، لباس، معاشرت، آداب و اطوار اور عام طورِ زندگی کی مختصر سرگزشت۔ قیمت ۶؍۔ پتہ: عبدالقادر صاحب تاجر کتب چار مینار حیدر آباد دکن۔

شمعِ راہ ۔ محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی مرحوم کے مذہبی خطبات کا مجموعہ۔ حسبِ ذیل موضوع زیرِ بحث لائے گئے ہیں (۱) کعبہ (۲) شادی اور تدبیر منزل (۳) ذکر میلاد (۴) تعلیم۔ مضمون پڑھنے کے قابل ہیں۔ حجم ۱۱۳ صفحات۔ کاغذ نفیس قیمت ۱۲؍۔ پتہ: دفتر کتابت صفوۃ اللہ بیگ صاحب صوفی سجاد منزل دہلی۔

سرسید و حالی ۔ یہ جناب تبسم قریشی کی نظم ہے جس میں سرسید و حالی کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شعر اچھے ہیں ۔ قیمت ا؍۔ تبسم قریشی صاحب ناظم بزمِ سیرت گجرات پنجاب سے طلب کیجئے۔

مولویت اور اسلام ۔ از حاجی نبی احمد صاحب بریلوی۔ یہ کتاب مولوی حضرات کے خلاف لکھی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خود کام مولویوں کے جہل و توہم پرستی اور خود غرضی نے اسلام کو کیا نقصان پہنچایا۔ قیمت ۴؍۔ پتہ: حاجی نبی احمد صاحب بریلی۔

احکام القرآن ۔ بزبانِ اردو۔ یہ کتاب مسلمانوں کے لئے دستور العمل کا کام دے سکتی ہے۔ اس میں ۱۱۵ احکام درج کئے گئے ہیں اور ہر جگہ آیت وغیرہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مؤلف مولوی حبیب حسین صاحب صدیقی۔ قیمت ۸؍۔ پتہ: سجاد حسین عبدالرزاق صاحبان، اددولی۔ ضلع بارہ بنکی۔

النبی الخاتم ۔ سوانح رسولِ مقبولؐ از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ یہ مختصر مگر جامع اور بصیرت افروز کتاب ہر مسلمان کو پڑھنی چاہیے۔ حجم ۱۷۰ صفحات، کاغذ و کتابت نفیس قیمت ۸؍۔ پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔

جگ بیتی ۔ یہ ایک نئے طرز کی مثنوی ہے جو اُردو مثنوی کی تاریخ میں ایک نیا عہد قائم کرتی ہے۔ اس کے مصنف اُردو کے زبردست عالم اور سرپرست علامہ برجموہن دتاتریا کیفی دہلوی ہیں۔ مثنوی کا اندازِ نگارش اور طریقِ بیان ہی نیا نہیں بلکہ اس میں

حالات و واقعات بھی بالکل جدید معاشرہ کے ہیں۔ حجم ۶۶ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔

نغمۂ نصیر: مرتبہ مسٹر من موہن لال ماتھر دہلوی ایم اے پروفیسر اردو و فارسی، ہندو سبھا کالج امرت سر۔ قیمت قسم اعلیٰ عہ معمولی ۱۲ر اس کتاب میں منشی گوری شنکر صاحب نصیر دہلوی کی بے نظیر ٹھمریاں، وادرے، رنگین ہولیاں، دلکش ملاریں اور بھجن درج ہیں۔ حجم ۶۰ صفحات۔ پتہ: کائستھ اردو سبھا دہلی۔

خادماتِ خلق۔ بہی خواہِ خلائق خواتین کے حالات مرتبہ مرحومہ سیدہ خاتون صاحبہ۔ حجم ۱۲۱ صفحات، کتابت طباعت اور کاغذ نفیس قیمت ۱ر۔ پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔ اس کتاب میں ژان دارک۔ سارہ مارٹن، گریس ڈارلنگ، فرانسس ویلارڈ، سسٹر ڈورا، مس ویٹلے، فلورنس نائیٹنگیل، اگنس جونس وغیرہ کے سبق آموز حالات درج ہیں۔ یہ کتاب ہر گھر میں موجود ہونی چاہیے۔

پیامِ حریت۔ جناب ظ انصاری کی حریت آموز نظم۔ قیمت ار، پتہ: عبدالقدیر صاحب ۱۷۵۱ شاہ گنج الہ آباد۔

غالب شکن۔ از "امام الغزل" میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی۔ حضرت امام الغزل نے اس کتاب میں غریب غالب کے خلاف "چنگیزیت" کے خوب جوہر دکھائے ہیں، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اس کتاب سے کسی قسم کا علمی یا ادبی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ کاش میرزا صاحب کسی مفید کام میں وقت صرف کریں اور غالب کو مٹانے کے بجائے اُن شعرا کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں جن کو وہ اس قابل سمجھتے ہیں۔ پتہ: اردو

رقصِ حیات۔ یہ جناب کامدار الدنی کے افسانوں کا مختصر مجموعہ ہے۔ الدنی صاحب ایک نوجوان اور ہونہار افسانہ نویس معلوم ہوتے ہیں۔ قیمت ۸ر۔ پتہ آفتاب بک ڈپو علی گڑھ۔

حُسنِ کلام۔ مجموعۂ کلام حضرت ظفر ہاشمی۔ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت فی جلد عہ۔ پتہ: حضرتِ ظفر۔ رائٹ انسٹیٹیوٹ ۲۱ ایسٹ لنکاشائر رجمنٹ کسولی۔ حضرتِ ظفر ایک خوشگو نوجوان شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں مذہب تصوف اور تغزل کا امتزاج ہے۔

گلشنِ فانی۔ مجموعۂ کلام محب الدین احمد صاحب لدھیانوی تلمیذ حضرتِ بیخود دہلوی۔ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت ۸ر۔ مطبوعہ جید برقی پریس دہلی اشعار دلکش ہیں اور زبان صاف ہے۔

ماہِ عرب۔ سوانح رسولِ مقبولؐ۔ مؤلفہ سید محمد ہادی بی۔ اے۔ حجم ۸۵ صفحات قیمت ۲ر۔ یہ کتاب بچوں کے لئے بہت مفید ہے سادہ اور سلیس زبان میں دلکش طریقے سے لکھی گئی ہے، پتہ: سید محمد ہادی صاحب ہیڈ ماسٹر انجمن اسلام ہائی سکول، احمد آباد۔

گیتا ولی۔ مصنفہ پنڈت اند جیت صاحب شرما (ماچھرہ ضلع میرٹھ) قیمت ۴ر۔ یہ گیتوں کا مجموعہ دلکش اور سادہ ہندوستانی زبان میں لکھا گیا ہے۔ گیت پڑھنے کے قابل ہیں۔ جنابِ مصنف سے طلب کیجیے۔

نواب حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان کے شاہکار۔ مؤلفہ آر عبد القادر۔ حجم ۱۲۸ صفحات قیمت ۵ر، پتہ ہمدرد بکڈپو نیو مارکٹ بنگلور۔ مسلمانانِ میسور کی ہزار سالہ تہذیب، تمدن، صنعت و تجارت اور زراعت وغیرہ پر تبصرہ، آثارِ قدیمہ کے حالات، تاریخ

کے شائقین کے لئے قابل مطالعہ ہے۔

آفتابِ رسالت۔ یہ سرکار دو عالم کی مختصر سیرت ہے۔ مؤلف جناب راؤ بہادر محمد عبد الحمید خاں صاحب ہیں۔ یہ کتاب مسلمان بچوں کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ حجم ۱۲۸ صفحات، قیمت ۳ مع محصول۔ پتہ: سکرٹری بزمِ ادب۔ باغپت ضلع میرٹھ۔

یادگارِ محشر۔ جوانا مرگ شاعر عبید اللہ محشر تیمی مرحوم کا مجموعۂ کلام۔ کاغذ کتابت اور طباعت نفیس ہے۔ حجم ۴۸ صفحات۔ پتہ: عاصی پریس گورکھپور، یو پی۔

قادیانی قول و فعل۔ اس کتاب میں سلاح الدین صاحب الیاس برنی ایم اے ایل ایل بی علیگ پروفیسر جامعہ عثمانیہ دکن نے دلائل کے ساتھ قادیانی مذہب کو غلط ثابت کیا ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات قیمت ۱۲؍ پتہ: اکمال احمد صاحب فاروقی بیت السلام حیدر آباد دکن۔

نورِ مشرق۔ مجموعۂ کلام مہر لعل صاحب ضیا ایم اے فتح آبادی۔ ضیا صاحب ایک ہونہار اور نوجوان شاعر ہیں۔ اُن کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی وقت اُردو شاعری میں نام پیدا کرلیں گے۔ حجم ۱۳۶ صفحات۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔ پتہ: گوبند لال صاحب سونی، کٹرہ کرانا، پھاٹک حبش خان، دہلی۔

۱۔ مویشی۔ ۲۔ کسان کے حقوق و فرائض ۳۔ مٹی ۴۔ پنجاب کی فصلیں ۵۔ پنچایت ۶۔ قانون اور پولیس ۷۔ کسان کے دوست پرندے ۸۔ کسان کے دشمن پرندے ۹۔ حکومت اور انسدادِ امراض ۱۰۔ انسان اور شہریت ۱۱۔ عالمِ نباتات ۱۲۔ کسان اور اُس کا مکان ۱۳۔ آبپاشی ۱۴۔ آلاتِ زراعت ۱۵۔ بُری رسمیں اور اُن کا انسداد ۱۶۔ زمیندار اور اس کے ذاتی معاملات ۱۷۔ کیڑے۔

مندرجۂ بالا ۱۷ رسالے ہمیں گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ ان سب کا تعلق دیہاتی سائنس سے ہے۔ یہ مضمون حال ہی میں پنجاب کے نارمل اور ورنیکلر مڈل سکولوں کے نصاب میں داخل کیا گیا ہے۔ مندرجۂ بالا رسالے گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ کے ہونہار طلبہ کی کاوش سے تیار ہوئے ہیں۔ یہ رسالے اپنے اپنے موضوع کے متعلق بہت مفید اور دلچسپ معلومات سے پُر ہیں۔ زمینداروں اور دیہاتی سائنس کے اساتذہ اور طلبہ کے لئے ان کا مطالعہ خاص طور پر مفید ہوگا۔ زبان صاف ستھری ہے اور جگہ جگہ تصویریں دے کر مضمون کی وضاحت کی گئی ہے۔ ہم نارمل سکول گکھڑ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس کے طلبہ اس قدر مفید اور اعلیٰ کام کرسکتے ہیں۔ تمام رسالوں کے مجموعہ کی قیمت غالباً ایک روپیہ ہے اور گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ ضلع گوجرانوالہ پنجاب سے مل سکتے ہیں۔

انتظامِ کتب خانہ۔ قیمت ۴؍ اس کتاب میں کتب خانے کے انتظام کے متعلق مفید ہدایات درج ہیں۔ مجلسِ کتب خانہ جات حیدر آباد دکن سے طلب کیجیے۔

نظم اقبال ۔ مرتبہ حسین صاحب تاج ۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو علامہ اقبال نے [illegible] کے طور پر لکھیں۔ نظموں کے متعلق سر عبدالقادر اور علامہ اقبال کی مختصر تحریریں بھی ساتھ شامل ہیں۔ پہلی نظم کا عنوان [illegible] صاحب [illegible] کے متعلق ہے۔ دوسری نظم گورستانِ شاہی شاہانِ گولکنڈہ کے مزاروں کو دیکھ کر لکھی ہے۔ قیمت ۴ر ۔ پتہ: احمدیہ پریس چار مینار حیدر آباد دکن۔

تین افسانے ۔ یہ سر عبدالقادر کے حسب ذیل تین افسانوں کا مجموعہ ہے (۱) تاجدار یری کا بے تاج شوہر (۲) وطن آخر وطن ہے۔ (۳) دل ہی تو ہے + سر عبدالقادر کا نام ان افسانوں کی خوبی کا ضامن ہے۔ پتہ: احمدیہ پریس حیدر آباد دکن۔

تعلیم بالغاں ۔ یہ بڑی عمر کے لوگوں کو اردو سکھانے کے لئے نہایت کارآمد قاعدہ ہے جو ایس ایم شاہ ولی حسینی صاحب بی ۔ اے آنرز ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ نے لکھا ہے۔ اس قاعدہ میں بالغوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر مناسب طریقہ استعمال کیا گیا ہے اور قاعدے کے اسباق میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ پڑھنے والے جلد نوشت وخواند کے قابل ہو جائیں۔ قیمت ۴ر ۔ مصنف سے منگایئے۔

سہ نظم ہاشمی ۔ یہ مولوی سید ہاشمی صاحب کی تین نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہاشمی صاحب جدت پسند اور صاحبِ ذوق لیکن کم گو شعراء میں سے ہیں۔ ان کی یہ تینوں نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں۔ قیمت ۴ر ۔ پتہ: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔

آئی سی ایس اور دوسری کہانیاں ۔ از سید عباس علی صاحب حسینی ۔ یہ ہندوستانی زندگی کے چند دلکش مرقع ہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ کاغذ اور کتابت و طباعت اچھی ہے۔ قیمت مجلد ۱۲ر ۔ پتہ: انڈین پریس الٰہ آباد۔

میثاق النبیین ۔ مولوی عبد الحق صاحب ودیارتھی نے جو سنسکرت اور عبرانی کے فاضل ہیں اس کتاب میں اُن پیشینگوئیوں کا ذکر کیا ہے جو تمام مذاہبِ عالم کی کتابوں میں رسول مقبولؐ کی آمد کے متعلق موجود ہیں۔ مذہبی معلومات کے لئے کتاب بہت اچھی ہے حجم ۲۲۴ صفحات قیمت [illegible] محصول۔ دار الکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگ لاہور سے مل سکتی ہے۔

طب العرب ۔ یہ پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کا ہیلتھی تاریخی لکچر ہے جس کا ترجمہ حکیم سید علی احمد صاحب نیر واسطی نے کیا ہے۔ عربی کے طب کے نشوونما و ارتقاء کے متعلق یہ تاریخی مقالہ بہت قابلِ قدر ہے۔ ترجمہ بہت اچھا ہے۔ فاضل مترجم نے جگہ جگہ نہایت اچھے حواشی درج کئے ہیں۔ قیمت ۱۲ر ۔ پتہ: منیجر رسالہ الشمس [illegible] لاہور۔

اسلامی معاشرت ۔ یہ کتاب [illegible] نے اسلام کے معاشرتی قوانین کے متعلق لکھی ہے۔ [illegible] کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۸ر ۔ پتہ: شیخ فضل الٰہی [illegible] لاہور۔

چھپ گئی
مضامین فلک پیما
صفحات ۴۰۰
ہم مسرت سے اعلان کرتے ہیں۔ کہ (ہمایوں) کے مقالہ نگار خصوصی حضرت فلک پیما کے گراں قدر مضامین
کا مجموعہ جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ چھپ کر تیار ہوگیا ہے۔ اس کا کاغذ اور طباعت نہایت
نفیس اور قیمت صرف دو روپے (عہ) علاوہ محصولڈاک ہے۔ فلک پیما کے مضامین کی تعریف تحصیل
حاصل ہے۔
فرمائش جلد بھیجیے۔ تاکہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔
محصولڈاک ۸
طلسم زندگی
میاں بشیر احمد صاحب کی مشہور کتاب "طلسم زندگی"
جس پر ملک کے اخبار اور جرائد اور رسائل نے نہایت حوصلہ افزا ریویو کئے ہیں۔ اور جو اپنے بیش قیمت
کاغذ اعلے کتابت وطباعت گرانمایہ رنگین تصاویر صفحات جمیل اور مطلا جلد کے لحاظ سے ہندوستانی
مطبوعات کیا یورپ کی حسین ترین کتابوں کے مقابلہ میں پیش کی جاسکتی ہے۔ اس مہینے اس کی بقیہ
جلدیں نصف قیمت پر فروخت ہوں گی۔ ڈھائی روپے اس کتاب کی اصل لاگت سے بھی کم
ہیں۔ امید ہے۔ کہ شائقین اس موقعہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔
المشتہر
منیجر ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ
لاہور
مقامی ایجنٹ:۔
اردو اکیڈمی بیرون لوہاری دروازہ
لاہور

کمزور بچوں کی طاقت کے لئے

بچوں کو

ڈونگرے کا بال امرت

دینا چاہیئے

ملنے کا پتہ:- ہر بڑے دوا فروش کے ہاں بکتا ہے۔

گراموفون کے ریکارڈ

اگر آپ کے پاس ہوں تو

انہیں مت پھینکئے۔ سائنسدانوں نے ایک مصالحہ حال ہی میں دریافت کیا ہے۔ جس کو

زیڈ ZED زیڈ

کہتے ہیں۔ اس کے لگانے سے ریکارڈوں میں گھسی ہوئی لکیریں ابھری ہو جاتی ہیں۔ اور آواز بہت تیز ہو جاتی ہے۔ وہی دلکش نغمے جو بہت بھلے لگتے ہیں۔ از سر نو عود کر آتے ہیں مگر گھڑگھڑاہٹ بالکل مٹ جاتی ہے نیز ریکارڈوں پر زیڈ لگانے سے عمر بڑھ جاتی ہے۔ اور وہ عرصہ تک نہیں گھستے۔ خوب بک رہا ہے آپ بھی خرید لیجئے

قیمت ایک شیشی دو روپے (۲ر)

ملنے کا پتہ گرین فیلڈز (انڈیا) کمپنی پنڈری (سی پی)

ہمایوں

و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "ہمایوں" ۳۳ ... روڈ لاہور سے شائع کیا۔

بلا

ے

قواعد

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

منیجر رسالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ- لاہور

The Title and Picture Page Printed at Half-To
Dev Samaj Road, Lahore.

یادگارِ علامۂ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

نمبر
(۳)

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ ستمبر ۱۹۳۸ء

تصویر:- معصومیت

چندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

میرے ایک پنجابی پروفیسر دوست جو لدھیانہ میں خاموشی سے اپنا کام کرتے ہیں ملّی و مُلکی جھگڑوں سے بھی الگ رہتے ہیں بلکہ جنہوں نے اردو میں خط لکھنا بھی میری ترغیب پر شروع کیا۔ میری طرف اپنے ایک خط میں ایسے جذبات کا اظہار کرتے ہیں جو جد و جہد کی اس دُنیا میں ایک علمی و ادبی ذوق رکھنے والے شخص کے دِل میں پیدا ہوتے ہیں اور ایک حد تک اُسے اس جد و جہد میں کسی نہ کسی شکل میں حصّہ لینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

مجھے "ڈیر" سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ ڈیر کچھ رسمی ڈیر نہیں ہے اگرچہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس کا اُردو مترادف کیوں نہیں لکھا۔"

"یہ روٹی کمانے کے لئے تگ و دَو بھی ضرورت سے زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس سے تنگ آکر خیال کرتا ہوں کہ اگر میرا وقت میرا اپنا وقت ہوتا تو اس کا بہتر استعمال کر سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس حجت میں میری کاہلی کارفرما ہو اور "غم روزگار" سے نجات پاکر میں سینکڑوں دوسرے ہندوستانیوں کی طرح نہایت لغو اور ناکارہ زندگی بسر کرتا۔"

"کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ روٹی کمانے کا تازیانہ میری کاہلی کے دُور کرنے کے لئے لازمی ہی سہی لیکن میری آمدنی قلیل کیوں ہے! اب "ناشکری" کی آواز میرے دِل کے کانوں میں گونج اُٹھی ہے اور دِل کی آنکھ میں اُن ہزاروں شکلوں کا تصوّر پھر رہا ہے جو میری آمدنی کے دسویں پندرھویں حِصّے کے لئے بھی بےتابی کے ساتھ متلاشی ہیں اور پھر یہ مجھ سے کِس نے کہا تھا کہ تین نہ چار اکٹھے چھ بچوں کا باپ بن بیٹھوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"یہ سلسلۂ خیالات ایک گونہ Anti-illiteracy Campaign[1] سے متعلق ہے۔ گزشتہ سال سے میں کالج کے طلبا کو اَن پڑھوں کے پڑھانے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں چند طالب علم خدا واسطے اپنے گاؤں یا قصبے کے اَن پڑھوں کو پڑھائیں گے اور میں چھٹیوں کے بارہ ہفتے ضلع کا گشت کیا کروں گا۔ کہیں خود بھی پڑھاؤں گا کہیں طالب علموں کی مدد کروں گا اور یہ بھی کوشش کروں گا کہ یہ کام کالج کھُلنے کے بعد گاؤں کے پڑھے لکھے خود جاری رکھیں۔ طالب علموں کی ٹولیاں بنانے اُنہیں ضروری ہدایات دینے اُنہیں پڑھانے کے طریق سکھانے میں رات کے گیارہ بارہ یُونہی بج جاتے ہیں۔

یہ کام ہے بڑا نیک لیکن مشکل بھی بہت ہے۔ مجھے ہنسی آتی ہے کہ مرکزی حکومت مغرب سے ماہرین اس قدر روپیہ صرف کرکے بلواتی ہے کہ وہ ہمیں نئے نئے تعلیم کے طریقے اور نصاب بتلائیں گویا ہندوستانی یا ہندوستان میں ملازم انگریز قطعی لاعلم اور بے وقوف ہیں اور نہیں

[1] جہالت کے خلاف جہاد

آج تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ تعلیم و تعلّم چیز کیا ہے۔ موجودہ طریقِ تعلیم و نصاب کے نقائص کیسے معلوم نہیں لیکن اُن کی اصلاح سے بھی زیادہ ضروری چیز ہمدرد حکومت اور بے لوث و شفیق اُستاد کی ہے۔ مرض معلوم ہے حکیم نہیں ملتا اور مریض بھی صد درجہ لاپرواہ ہے، اگرچہ میں اسے چنداں قصور وار نہیں ٹھہراتا۔ گاؤں کا رہنے والا صدیوں کی جہالت و غفلت اور اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کی خود غرضیوں کا شکار رہا ہے جو بھی اُس کے پاس جاتا ہے عموماً کسی ذاتی مقصد کو لئے ہوئے جاتا ہے اور اُس کی قربانی سے اپنی فلاح ڈھونڈتا ہے، پھر کیا عجب کہ وہ اتنی ایسی اصلاح اور ایسے مُصلحوں سے بیزار ہے اور اُن کی باتوں پر کان نہیں دھرتا۔ مجھے یقین ہے کہ سچی ہمدردی اور بے غرض خدمت اُس کے دل میں گھر کر سکتی ہے۔ کتنا آسان ہے اُس کی خامیوں گناہوں اور جُرموں پر ہنسنا! کسی چائے پارٹی میں صوفوں کے نرم نرم گدیلوں پر بیٹھ کر یا سرمایہ داری کی دُنیا کے سامانِ عیش و عشرت مہیا پاکر یا اتفاقیہ حکومت کی کُرسی پر بیٹھ کر اُس کی غلاظت جہالت توہمات رسم و رواج قرض، لڑائیاں، جھگڑے قتل کس قدر مکروہ اور قبیح معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کبھی کسی نے سوچا کہ اگر ہماری بود و باش بھی انہیں حالات میں ہوتی تو پھر؛ اُس آدمی کے لئے جس کی رُوحانی آنکھ تعصب اور تنگ نظری نے بالکل بند نہیں کر دی کیا فی تکلیف دہ اور پریشان کُن سوال ہے!

میں دیہات کے رہنے والے کی خامیوں اور جُرموں سے ہمدردی نہیں رکھتا لیکن خود اُس سے ضرور رکھتا ہوں اور یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ اُس کی اس حالت کی ذمہ داری زیادہ تر سرمایہ داروں پر یا سوسائٹی یا حکومت پر ہے۔ لہٰذا اُسے اُبھارنے اور غفلت اور جُرم کے گڑھوں سے نکالنے کا فرض بھی بدرجۂ اتم ان پر عائد ہوتا ہے۔

اُس کی اصلاح کے لئے کئی سالوں کی متواتر اور بے غرض محنت اور خدمت درکار ہے اور اگر یہ میسّر نہیں تو محض نیک الفاظ یا خواہش نہ کبھی کچھ کر سکی ہیں اور نہ کر سکیں گی۔ میں عموماً نااُمید نہیں ہوتا، شکست بھی حتے الامکان نہیں مانتا لیکن یہ ڈر مجھے ضرور ہے کہ اگر اب بھی یہ پڑھانے کا زور شور محض تجویزوں کے دکھلاوے اور رپورٹ بازی میں ختم ہو کر رہ گیا تو کئی ایک دِل سے کام کرنے والوں کو نہ صرف صدمہ ہوگا بلکہ کام کرنے میں اُن کے حوصلے بھی کچھ نہ کچھ پست ضرور ہو جائیں گے۔ دُعا کریں کہ جس نیک جوش سے اس کام کو ہم پنجابی اور دوسرے صوبوں والے شروع کر رہے ہیں وہ بڑھتا چلا جائے اور ہمارے مُلک سے بھی جہالت کی لعنت کچھ تو دُور ہو!"

"یہ خط ضرورت سے زیادہ لمبا ہو گیا ہے۔ اپنی سمع خراشی اور اُردو کے اِس "قتل" کی ذمہ داری آپ پر ہے" "بہر حال شاگرد حاضر اور تمنائی ہے، اب اصلاح آپ کے ہاتھ میں ہے"

ڈیرسر! کام کرنے والوں کی باتیں بنانے والے کیا اصلاح کریں گے۔ اور اُردو کے بارے میں تو ہم پنجابیوں کو خاصی آزادی حاصل ہے۔ سو آپ بیدھڑک اُردو میں لکھتے جایئے اور اپنا شہری اور دیہاتی کام کئے جایئے!

بشیر احمد

جہاں نما

میاں محمد شاہنواز مرحوم

افسوس کہ ۱۱ اگست ۱۹۳۸ء کی صبح کو ۱/۲ ۴ بجے "موتی محل" سولن میں فالج کے ایک ناگہانی حملے سے میاں محمد شاہنواز کا انتقال ہو گیا۔ میاں صاحب اکتوبر ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک کامیاب بیرسٹر ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے زمیندار بھی تھے۔ سیاسیات سے انہیں بے حد دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ آٹھ سال تک مرکزی اسمبلی اور سات سال تک پنجاب کونسل کے ممبر رہے اور کچھ عرصے تک مرکزی اسمبلی کی معتمدی اور "ایچ آف کنسنٹ کمیٹی" کی رکنیت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اب کئی سال سے مرحوم علالت کے باعث عملی سیاسیات سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے اور زیادہ تر صاحبِ فراش ہی رہتے تھے۔

اس دردناک حادثے میں جمہور کے علاوہ اکابرِ ملک نے جن میں وائسرائے، گاندھی، گورنر اور وزراء وغیرہ شامل ہیں محترمہ بیگم شاہنواز سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

علامۂ اقبال علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد ہی میاں محمد شاہنواز کا انتقال خلوص و محبت کے اُس رشتے کی یاد تازہ کر دیتا ہے جو اِن دونوں بزرگوں کے درمیان ابتدا سے قائم تھا۔ گزشتہ "یومِ اقبال" کے موقع پر میاں محمد شاہنواز نے علامۂ اقبال کی اجازت سے اپنی اراضی میں سے دس مربعے اُن کے صاحبزادے جاوید اقبال کے نام منتقل کر کے اپنی دیرینہ آرزو پوری کی۔ یہ گویا اُس محبت کا عملی ثبوت تھا۔

اب چند سال سے دونوں دوست بیماری کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہو کر خانہ نشیں ہو چکے تھے اور باہمی ملاقاتوں کا سلسلہ بڑی حد تک منقطع ہو گیا تھا لیکن پھر بھی جب میاں صاحب کو علامۂ اقبال کی شدید علالت کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ملازم سے کہا کہ مجھے موٹر میں بٹھا کر جاوید منزل لے چلو۔ موٹر "جاوید منزل" کے برآمدے کے سامنے جا کر رکی تو ڈاکٹر صاحب حسبِ معمول برآمدے میں پلنگ پر لیٹے تھے۔ نہ ڈاکٹر صاحب میں طاقت تھی کہ وہ اپنے دوست کی پیشوائی کے لئے اُٹھیں اور نہ میاں صاحب میں سکت تھی کہ اُٹھ کر اُن تک پہنچیں۔ دونوں دوستوں کی حسرت آمیز نگاہیں ایک دوسرے کی عیادت کر رہی تھیں۔ اس موقع پر علامۂ اقبال کی فطری بذلہ سنجی کو تحریک ہوئی اور اُنہوں نے اس ملاقات پر "چکوی چکوے کی ملاقات" کی پھبتی کہی۔

علامۂ اقبال کی موت کی خبر میاں شاہنواز سے خاص اہتمام کے ساتھ چھپائی گئی تھی لیکن ایک مہینے کے بعد کسی ملاقاتی نے

بے خبری میں یہ راز فاش کر دیا۔ یہ خبر سُن کر میاں صاحب کو ناقابلِ بیان صدمہ ہوا اور وہ اُسی وقت مرحوم دوست کے بچوں سے ملنے کے لئے کسی نہ کسی طرح "جاوید منزل" میں پہنچ گئے۔

اس کے تقریباً تین ہی مہینے بعد وہ اپنے دوست کے پاس حقیقی جاوید منزل میں جا پہنچے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

نئی ترکی پر ایک نظر

حال میں "مجلس ملی کبیر" کے ایک اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے کمال اتاترک نے کہا کہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ترکی قوم کو تہذیب اور خوشحالی کے بلند ترین معیار تک پہنچا دیں۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قول اور عمل کی رفتار یکساں ہو۔ کامیابی کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ایک باقاعدہ نظامِ عمل تیار کر کے اس پر پوری تندہی سے عمل شروع کر دیا جائے۔

ترکی قوم کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے کہا کہ کوئی ایسی رُکاوٹ جو ہمارے قومی مفاد کی راہ میں حائل ہو نہ اب برداشت کی جاتی ہے اور نہ آئندہ کبھی برداشت کی جائے گی۔ انقلاب سے ہمارے مُلک میں جو اہم تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اُن کا قائم رکھنا ہر حال میں ضروری ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہر شخص کو مسلسل جد و جہد کرنی چاہیئے۔

حکومت کی زراعتی حکمتِ عملی کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے کہا کہ ملک میں ایک بھی کاشتکار زمین کے بغیر نہ رہنا چاہیئے اور مناسب ہے کہ یہ زمین ناقابلِ تقسیم قرار دی جائے، بڑے زمینداروں کی ملکیت میں جو زمین رہے اُس کی مقدار بھی حکومت کی طرف ہی سے مقرر ہو گی، اس سلسلے میں یہ بھی لازم ہے کہ زمین کی زرخیزی اور مقامی معاشی حالات مدِ نظر رکھے جائیں۔ چھوٹے چھوٹے کاشت کاروں کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے گی، اور انہیں نئے زراعتی آلات مہیا کئے جائیں گے۔ اِن مقاصد کی تکمیل کے لئے اتاترک ملک کو مختلف زراعتی رقبوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ ہر رقبے میں کاشتکاروں کی مدد اور رہنمائی کے لئے ایک زراعتی مرکز قائم کیا جائے گا۔

اتاترک نے کہا کہ ترکی کو ہر طرح ترقی یافتہ اور خوش حال بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ صنعتی کارخانوں کو فروغ دیا جائے اور ملک میں جگہ جگہ نئے کارخانے قائم کئے جائیں۔ ہمیں لازم ہے کہ اپنے پہلے پنج سالہ صنعتی منصوبے کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں۔ اور باقی چند مجوّزہ کارخانے بھی جلد قائم کر دیں تاکہ اس کے بعد مزید ترقی کی تجویزوں پر عمل کیا جائے۔

صنعت اور زراعت کی مناسب تنظیم اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ حکومت ملک کی تجارتی سرگرمیوں کی کڑی نگرانی کرے ہماری بیرونی تجارتی حکمتِ عملی کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ ہم اسے ملکی اور خارجی معاشی حالات کے مطابق ڈھالتے رہتے ہیں۔

تجارتی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہمیں جہازوں کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے بیرونی ممالک سے انتظام کیا جا چکا ہے اور وہ آئندہ موسم بہار میں ہمیں مل جائیں گے۔ یہ سچ ہے کہ جہازوں کی یہ زائد تعداد بھی ہماری آیندہ بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے ناکافی ہوگی مگر ہمیں اطمینان ہے کہ اپنے منصوبوں پر باقاعدہ عمل کرنے سے ترک قوم جلد ہی ایک بڑی بحری قوم بن جائے گی کیونکہ ہمارے ملک کی تین اطراف سمندر سے گھری ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اتاترک نے ترکی کی ان ترقیوں کی طرف اشارہ کیا جو ریلوے کی توسیع سڑکوں اور پلوں کی تعمیر اور قوم میں ایک ذہنیت پیدا کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تبدیلیوں نے نہ صرف وقت اور فاصلے کی طنابیں کھینچ دی ہیں بلکہ ترکی کی معاشی ترقیوں میں مدد دے کر ملک کو زیادہ طاقت ور اور خوشحال بھی بنا دیا ہے۔

اس کے بعد اتاترک نے ترکی کی قابل اطمینان مالی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا بجٹ نہ صرف متوازن ہوتا ہے بلکہ اس میں ہر سال ملکی حفاظت اور تعمیری و تجارتی مقاصد کے مصارف کو پورا کرنے کے لئے بھی گنجائش رکھی جاتی ہے۔

تعلیمی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے ترکی میں تین نئی یونیورسٹیوں کے قیام کا ذکر کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے "مجلس تاریخ" اور "مجلس ترقیٔ زبان ترکی" کی سرگرمیوں کو سراہا۔

فوج کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے اس کی قوت، اس کی تربیت اور اس کی حب وطن کی تعریف کی اور کہا کہ فوج ہی ہمارے ملک کی ناقابل تسخیر محافظ ہے اور یہی اس منظم جدوجہد کے جاری رہنے کی ضامن ہے جو ہم اپنے بلند مقاصد کے لئے عمل میں لا رہے ہیں۔ ہماری ہوائی فوج بھی روز بروز زیادہ تربیت یافتہ ہو رہی ہے اور اس سلسلے میں ہمارا سہ سالہ منصوبہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے مگر آیندہ یہ نہایت ضروری ہے کہ ہمارے تمام ہوائی جہاز اور ان کے انجن ترکی ہی میں بنیں۔

ترکی افغانستان عراق اور ایران کے درمیان اتحاد کے معاہدے کا ذکر کرتے ہوئے اتاترک نے کہا کہ اس سے اخوت اور دوستداری کی اس حکمت عملی پر روشنی پڑتی ہے جو ہم نے مشرقی ممالک میں اختیار کر رکھی ہے۔

آخر میں جمہوری جماعت کے اصولوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان اصولوں کو الہامی کتابوں کے آسمانی اصولوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہمارے الہام کا ماخذ آسمان نہیں بلکہ چلتی پھرتی زندگی کا تجربہ ہے۔ ہمارا نظام عمل ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ملک کے کسی خاص فرقے کی طرف زیادہ توجہ کریں کیونکہ ہم تمام ترک قوم کے خادم ہیں۔

غذائیں اور حیاتین

نئی طب سے اس بات کی تحقیق ہوئی ہے کہ مختلف غذاؤں میں مختلف قسم کی قوت حیات یا غذائی جوہر ہوتا ہے۔ اصطلاحاً

اس غذائی جوہر کو حیاتین کہتے ہیں۔ حیاتین کی ماہیت کے متعلق ابھی کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ لیکن مختلف جانوروں اور انسانوں پر مختلف غذاؤں کا تجربہ کرنے سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ ہر قسم کے حیوانوں اور بالخصوص انسان کی صحت برقرار رکھنے کے لئے مختلف قسم کے غذائی جوہروں یا حیاتینوں کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے چونکہ حیاتینوں کی ماہیت کے متعلق ابھی کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوا، اس لیے فی الحال مختلف حیاتینوں میں تمیز کرنے کے لئے انہیں الف' ب' ج وغیرہ نام دیئے گئے ہیں۔

مدت تک ایک ہی قسم کی غذا کھاتے رہنے سے صحت پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً ایک قسم کی غذا میں ہر قسم کی حیاتین نہیں ہوتی۔ چنانچہ جسم کو دوسری حیاتینوں کی کمی سے نقصان پہنچتا ہے۔ اس باب میں دودھ کسی حد تک مستثنے قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں تقریباً ہر قسم کی ضروری حیاتینیں ایک معتدل حد تک موجود ہیں۔

چونکہ اکثر بیماریاں غذا کی بے اعتدالی اور حیاتینوں کی کمی سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے آج کل کے بعض نئے ڈاکٹر علاج بالغذا کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ اس طریق علاج میں غذا کی اصلاح سے بیماری کی روک تھام کی جاتی ہے۔

ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ مختلف قسم کی حیاتین کی کمی سے کون کون سے امراض پیدا ہوتے ہیں اور کون کون سی غذائیں ان مختلف قسم کی حیاتینوں کی کمی کو پورا کر کے جسم کو صحت مند بنا دیتی ہیں۔

حیاتین (ا) اس حیاتین کی کمی سے پھیپھڑے کے امراض مثلاً سل، نمونیا، کھانسی وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کساح، آنکھوں کی سوزش اور خشکی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ گھی، چربی، دودھ، مکھن اور کلیجی وغیرہ میں حیاتین (ا) کافی مقدار میں موجود ہوتی ہے اس لئے ان اشیاء کا استعمال ان امراض کے دفیعئے کا باعث ہوتا ہے۔

حیاتین (ب) اس حیاتین کی کمی سے بیری بیری کا مرض ہو جاتا ہے۔ اس مرض میں اعضا سن ہو کر کھال اترنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ بھوک بھی بند ہو جاتی ہے۔ کبھی قے اور دست آنے لگتے ہیں۔ پیشاب میں یورک ایسڈ بڑھ جاتا ہے۔ دل، گردہ، جگر، معدہ اور دماغ کمزور ہو جاتے ہیں۔ تلی بڑھ جاتی ہے اور معدے کی رطوبتیں جو ہاضمے میں مدد دیتی ہیں پیدا نہیں ہوتیں یا کم ہو جاتی ہیں۔ انڈا، گاجر، ٹماٹر، شفتالو، انگور، نیبو، بادام وغیرہ میں حیاتین ب کی کافی مقدار موجود ہوتی ہے اور ان اشیاء کے استعمال سے ان امراض کے دفیعئے میں بہت مدد ملتی ہے۔

حیاتین (ج)۔ اس حیاتین کی کمی سے جوڑوں کا درد، پائیوریا اور استسقا کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ مولی، گاجر، شلغم، کریلے وغیرہ میں حیاتین (ج) کی مقدار کافی ہوتی ہے اور ان اشیاء کے استعمال سے مذکورۂ بالا امراض کے دفیعئے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

حیاتین (د)۔ اس حیاتین کی کمی سے کساح کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ اس میں بچوں کی ہڈیوں کا نشوونما بند ہو جاتا ہے اور

ہڈیاں نرم ہو جاتی ہیں۔ عوام اس مرض کو سوکھا کہتے ہیں۔ نیبو کے عرق یا پالک، گوبھی، شلغم، بالائی، اخروٹ، ٹماٹر، انگور، نارنگی وغیرہ میں حیاتین (د) کافی مقدار میں موجود ہوتی ہیں۔ ان اشیاء کے استعمال سے اس مرض کا دفعیہ ہوسکتا ہے۔ وُقس علیٰ ہذا۔

مسولینی کا باپ

یورپ کے چار آمروں کی بعض خصوصیتیں مشترک ہیں۔ مسولینی، مصطفےٰ کمال، اسٹالن اور ہٹلر چاروں غریب دیہاتی والدین کے گھر پیدا ہوئے۔ چاروں کے باپ سخت گیر اور تند مزاج تھے اور مائیں رحمدل اور مذہب کی طرف میلان رکھنے والی۔ چاروں آمروں کی ابتدائی تربیت قریب قریب یکساں حالات میں ہوئی۔ یہاں صرف مسولینی اور اُس کے باپ کے متعلق کچھ حالات درج کئے جاتے ہیں:۔

مسولینی نے اپنے باپ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ علم سے بالکل نابلد تھا۔ دس برس کی عمر میں وہ قریب کے ایک گاؤں میں ایک لوہار کے پاس کام سیکھنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ آخر اُس نے اپنے گاؤں میں آکر الگ دُکان کھول لی۔ اسی زمانے میں اُس کا تعلق اشتراکی جماعت سے ہوگیا۔ مسولینی کے باپ کے دل میں اشتراکی خیالات نے ایسا گھر کرلیا کہ وہ ایک جتھا بنا کر کسانوں میں ان خیالات کی تبلیغ کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس جتھے کا زور بہت بڑھ گیا اور پولیس اس کی کارروائیوں سے تنگ آگئی چنانچہ جبراً اس کا خاتمہ کردیا گیا۔

مسولینی بچپن میں اپنے باپ کی دُکان پر لوہار کا کام سیکھتا رہا لیکن اس کا جی اس کام میں نہ لگتا تھا۔ دکان آگ اور تپے ہوئے لوہے کی گرمی سے جہنم کا نمونہ بن جاتی تھی۔ مسولینی اپنے منہ کو اس گرمی سے بچانے کے لئے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیتا۔ اس پر اُس کا سخت گیر باپ اُسے خوب پیٹتا۔ آخر مسولینی باپ کے ظلم وستم سے تنگ آکر گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کی عمر اُس وقت سات سال کی تھی۔ مسولینی کی تربیت باپ نے جس طریق سے کی اُس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک دفعہ مسولینی کو اُس کے باپ نے ایک کھلونا لاکر دیا۔ بچہ کھلونا لے کر بہت خوش ہوا اور کھیلتا ہوا باہر نکل گیا۔ ایک اور لڑکے نے اُس سے یہ کھلونا مانگا اور مسولینی کے انکار کرنے پر مار پیٹ کر اُس سے چھین لیا۔ مسولینی روتا ہوا گھر کو لوٹا اور باپ سے شکایت کی۔ باپ نے جب تمام واقعہ سُنا تو اپنے لڑکے کی بزدلی پر غصے سے دیوانہ ہوگیا۔ اس نے تڑا تڑ چانٹوں سے مسولینی کے گال اُڑا دیئے اور کہا کمبخت لڑکیوں کی طرح روتا ہے! ارے تو اُس لڑکے سے ڈرا کیوں؟ تو نے بھی اُسے پیٹا ہوتا۔ اب جا اور اُسے مار ورنہ گھر کا رُخ نہ کیجیو۔

لڑکا باپ سے یہ تعلیم حاصل کرکے باہر گیا اور اُس لڑکے کو تلاش کرکے ایک پتھر اُس کے سر پر دے مارا۔ سر کے پھٹنے سے لڑکا لہولہان ہوگیا۔ اس کے بعد مسولینی کبھی کسی سے نہ ڈرا بلکہ نہایت شریر اور سرکش ہوگیا۔ اب وہ راہ چلتے لڑکوں سے اُلجھ پڑتا اور اُسے روز کوئی نہ کوئی زخم لگتا مگر وہ پروا نہ کرتا بلکہ برابر بدلہ لینے کی تاک میں لگا رہتا۔

نو برس کی عمر میں مسولینی اپنے باپ سے الگ ہوگیا کیونکہ اُسے تعلیم کے لئے ایک دُور کے گاؤں میں جانا پڑا۔ لیکن باپ نے اُسے سرکشی اور بیباکی کی جو تعلیم دی تھی وہ اُسے کبھی نہیں بھُولا۔

حامد علی خاں

محبت و مجیب

"بھین بھرا دے گیت"

پنجابی شاعری میں اپنی ایک مخصوص دلکشی ہے۔ اس میں جذبات کا جو خلوص ملتا ہے وہ زیادہ علمی زبانوں کی شاعری میں قریب قریب نا پید ہے۔ پنجابی بڑے بڑے شہروں اور اُونچے اُونچے محلوں میں رہنے والے اُمرا کی زبان نہیں، بہ چھوٹے چھوٹے اور نیچے نیچے کچے گھرونڈوں میں بسنے والے غریب کسانوں کی بولی ہے۔ جیسے سیدھے سادے دیہات کے رہنے والے ہیں ویسی ہی سادہ اور تکلف سے پاک اُن کی شاعری ہے۔

علامہ اقبال نے ایک موقع پر اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "پنجابی شاعری میں شعر کی ظاہری تراش خراش کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا۔ اسی وجہ سے اس میں بحروں کا بھی کوئی خاص لحاظ نہیں رہا" علامہ اقبال کی رائے بالکل درست ہے لیکن پنجابی شاعری کے اسی عیب نے اُس کی جذبات نگاری میں خلوص اور زبان میں لوچ پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ اسی موقع پر علامہ اقبال نے یہ رائے بھی ظاہر کی تھی کہ "پنجابی شاعری بڑی اچھی شاعری ہے اور اس کا صرف صرف جذبات میں ڈوبا ہوا ہے"

سچ تو یہ ہے کہ اگر پنجابی شاعری بھی بعض جدید پنجابی اُدبا کی کوششوں کے طفیل بحروں کی سخت قیود و قافیہ اور عروض کی جکڑبند میں پھنس گئی تو پھر اس کی سادگی اور خلوص بھی اہلِ علم کی منطقیانہ ظاہر پرستی اور ضابطہ پسندی کی نذر ہو جائے گا اور یہ بھی بعض زیادہ ترقی یافتہ زبانوں کی طرح محض اہلِ علم یا اہلِ دولت کے محدود طبقے کی مصنوعی زندگی کی بے روح تصویر بن جائے گی۔

ملک کے قومی ادب میں دیہاتی گیتوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ ان میں سے بعض گیت بہت پُرانے ہیں اور ہمارے قدیم تمدن و معاشرت، رسم و رواج اور اَن لکھی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ گیت جہاں ہمیں اپنے بہت سے تمدنی و معاشرتی نقائص کی طرف متوجہ کرتے ہیں وہاں کتنی ہی ایسی خوبیوں کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں جو اب ہماری معاشرتی زندگی کا جزو نہیں رہیں۔

پنجابی گیتوں کی کئی قسمیں ہیں:۔ ہولر، لوری، گھوڑیاں، سہاگ، ڈھولے، اپٹے، ماہیئے، تھال، کلکلی وغیرہ۔ ہر قسم کے گیتوں کا موضوع مخصوص ہوتا ہے لیکن یہاں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ہمیں پنجابی گیتوں کی ایک خاص نوع سے سروکار ہے یعنی "پنجابی بہن کی محبت کے گیت"۔ دُنیا کی بہت کم زبانوں میں بہن کی محبت کے ایسے پُرخلوص ترانے مل سکتے ہیں جیسے پنجابی میں ہیں۔ زیادہ علمی زبانوں میں شاعری کی اس شاخ کو ایسی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ ہر ملک کی بہنوں کو بھائیوں سے محبت ہوتی ہے لیکن ہندوستان اور بالخصوص پنجاب میں دیہات کے خاص معاشری

قوانین اور قدیم رسم ورواج کی پابندی نے بھائی کے وجود کو بہن کے لئے اور بھی محبوب تر بنا دیا ہے۔ دیہات میں شادی کے بعد لڑکیوں کی حالت صدیوں سے قابلِ رحم رہی ہے۔ دوسرے اسباب کے علاوہ دیہات کا افلاس وجہالت اور متمدن دنیا سے علیحدگی بھی اس خرابی کا باعث قرار دی جاسکتی ہے۔ سسرال میں لڑکی کی حیثیت ایک کامِن یا لونڈی کی سی رہ جاتی ہے۔ ساس، سسر، جیٹھ، دیور، نند سب کی خدمت اُس کے سپرد ہوتی ہے اور سب کی ڈانٹ ڈپٹ اور طعن وتعریض اسے برداشت کرنی پڑتی ہے۔ شوہر کی شرافت کا معیار یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ اس ظلم وستم کے خلاف بی بی کی حمایت میں ایک حرف تک مُنہ سے نہ نکالے۔ بی بی کو سب سے بُرا کھانے کو اور سب سے بُرا پہننے کو ملتا ہے اور ساس سسر دیور اور جیٹھ وغیرہ بعض اوقات اسے ذرا ذرا سی بات پر جسمانی سزا بھی دے سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکیاں سسرال میں رہنے پر موت کو ترجیح دیتی ہیں۔ ساس کے ظلم وستم کا دیہات میں گھر گھر چرچا ہوتا ہے اور اُس کی سخت گیری ہی نے دیہاتی بہوؤں سے اس قسم کے گیت کہوائے ہیں:۔

نگدی

تے سستے پَیر لگ لین دے	اے ساس ذرا میرے قدم بھی یہاں جم لینے دے
تیری گُت گلیاں وِچ رُلدی	پھر تجھے دکھا دوں گی کہ تیری کٹی چوٹی کس طرح گاؤں کی گلیوں میں خوار ہوتی پھرتی ہے

دیہات کی لڑکیاں عموماً ساون کے مہینے میں میکے جاتی ہیں۔ اس موقع پر اکثر بھائی ہی بہن کو لینے کے لئے جاتا ہے، چنانچہ بہن اپنے بھائی کو قدرۃً نجات دہندہ اور سورما سمجھتی ہے اور اسے وِیر یا بیر یعنی بہادر کہتی ہے اور کیوں نہ کہے کہ بھائی ہی اُس کی حفاظت کرتا ہے۔ سسرال والوں سے اس کی حمایت میں لڑتا جھگڑتا ہے اور اسے عزت اور قدر ومنزلت سے اپنے ساتھ لے جاتا ہے غالباً انہیں حالات نے دیہاتی بہن کے دل میں بھائی کی محبت دہ چند کردی ہے۔ سسرال کی کیفیت کو پیشِ نظر رکھ کر مظلوم لڑکی کا میکے کی یاد میں تڑپنا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے جہاں وہ آزادی اور خودداری کی فضا میں بے فکری سے بچپن کے پیارے پیارے کھیل کھیل چکی ہے۔ ساون کے شروع ہوتے ہی دیہاتی دُلہنیں میکے جانے کیلئے بیقراری کے ساتھ بھائی کا انتظار کرنے لگتی ہیں۔

پنجابی شاعری میں بہن کی محبت کا سُراغ جگہ جگہ ملتا ہے۔ مشہور پنجابی نظم ہیر میں مذکور ہے کہ جب ہیر اور رانجھا کے عشق کا راز کھلا اور لوگوں میں اُن کا چرچا ہونے لگا تو ہیر کا بھائی سلطان غیرت کے مارے اپنی ماں کے پاس گیا۔ وارث شاہ کہتا ہے ؎

سُلطان بھائی آیا ہیر سندا آکھے ماں نوں ہیر نوں تاڑ اماں	جیکر پھیر میں باہر ایہ ڈِٹھیائی پھیراں لیسدی دھون تلوار اماں
اِہدے گُجھیاں جہنیاں ڈُوب دِتا اسیں جگ سنسار خوار اماں	ایہ دھی بُریار نہ رکھ مائے مُو ہرا ڈسے کے ایسنوں مار اماں

ترجمہ:۔ ہیر کے بھائی سُلطان نے آکر ماں سے کہا "اماں، ہیر کو سختی سے ڈانٹ ڈپٹ کر رکھ۔ اگر میں نے اب اسے گھر سے باہر قدم رکھتے دیکھ لیا تو تلوار سے اس کی گردن کاٹ دونگا۔ لوگوں کے چھپواں طعنوں سے میری جان ہلکان ہوئی جاتی ہے اور ہم دُنیا جہان میں ذلیل ہو رہے ہیں۔ اے اماں یہ بدقماش بیٹی زندہ رکھنے

کے قابل نہیں اسے زہر دے کر مار ڈال "

بھائی کی یہ درشت اور ملامت آمیز تقریر سُن کر ہیر نے جو جواب دیا وہ جہاں عشق کی سرمستی میں ڈوبا ہوا ہے وہاں اُس سے پنجابی بہن کی محبت بھی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہے ؎

اکھیں لگیاں مُڑان نہ ویر میرے بیبا وار گھتی بلہاریاں وے
وہن پئے دریا نہیں کدی مُڑدے وڈے لا رہے زور تے زاریاں وے
بدی لکھی ہے ایہ نصیب میرے بھاویں وڈھ توں نال تلواریاں وے
اوّل روز دا لکھیا آن ملیا ہیر گھول گھتی وار و واریاں وے

ترجمہ :۔ میرے پیارے بھائی میں تجھ پر واری جاؤں۔ جب آنکھ کہیں اُلجھ جائے تو بس نہیں چلتا۔ دریا بہ نکلے تو اُس کا رُخ کون موڑ سکتا ہے؟ اس کوشش میں بڑے بڑے زور آزمائی کر کے آخر کر رو دھو چکے ہیں تو چاہے مجھے تلوار سے کاٹ ڈال مگر میری قسمت کی لکھی یہ بدی نہیں ٹل سکتی۔ ہیر کی زندگی تجھ پر بار بار قربان ہو بھائی! ازل کا لکھا ہوا آخر پیش آ چکا ہے۔

دیہاتی بہن سُسرال میں بھائی کے انتظار کے دن گِن گِن کر کاٹتی ہے اور اس کی تواضع کے لئے اچھی اچھی چیزیں جمع کرتی رہتی ہے کھانڈ، بادام، گری، چھوہارے، دودھ اور گھی بہت مرغوب غذائیں ہیں۔

ایک پنجابی بہن اپنے بھائی کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی ہے اور بے اختیار اس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلتے ہیں ؎

چاندی — چاندی
تے چھیتی چھیتی آ ویرا — پیارے بھائی اب تو ادھر کا رُخ کر
میری کھنڈ سُسری پئی کھاندی — اب تو تیرا انتظار کرتے کرتے میری کھانڈ بھی اتنی پُرانی ہو گئی ہے کہ اس میں سُرسُریاں سرسرانے لگی ہیں۔

یہ ٹپہ ہے۔ ٹپوں کا ابتدائی لفظ محض قافیہ ملانے کے لئے مہمل طور پر آتا ہے۔

ایک اور بہن کہتی ہے ؎

چھاواں — چھاواں
تے کھوہ وچوں کڈھ ویر وے — اے میرے بھائی مجھے سُسرال کے اندھے کنوئیں سے نکال
تینوں سوہریاں دا حال سُناواں — کہ میں تجھے یہاں کی بپتا سناؤں۔

بھائی ہی مصیبت سے نجات دلانے والا ہے اور وہی بہن کے دُکھڑے سُنتا ہے۔

ساون آ گیا ہے لیکن بھائی بہن کو میکے لے جانے کے لئے نہیں آیا۔ لڑکی عالمِ خیال میں ماں سے کہتی ہے :۔

پنج ست پنیاں پا کے میریئے مائے نی — اماں پانچ سات پنڈیاں بنا کر میرے بھائی کو

پھر کہتی ہے:- اُچڑا اُچڑا اچونترڑا تے سوہنا میرا ویر — میرا چبوترہ بلند ہے اور میرا بھائی خوبصورت ہے۔

کھلی میں اُڈیکاں راہ ساون آیا۔ — میں چبوترے پر کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی ہوں کہ ساون آیا ہے۔

اتنے میں بھائی آ پہنچتا ہے اور بہن کو بُرے حال میں دیکھ کر پوچھتا ہے:-

رتے رتے پیڑھے توں بیٹھی اماں جائیے نی — میری ماں جائی تو سُرخ سُرخ پیڑھے پر بیٹھی ہے۔

کیا تیرا ائیلا بھیس ساون آیا۔ — لیکن تیری پوشاک ایسی میلی کچیلی کیوں ہے؟

کس دے دُکھے توں دُکھی میرئیے بھینے نی — اے میری بہن کس نے تجھے دُکھیا بنا دیا ہے۔

کون وڈے وڈے بول ساون آیا۔ — کون بُرے بُرے بول بولتا ہے۔

بہن جواب دیتی ہے:-

سائو دے دُکھے میں دُکھی اماں جایا وے — میرے ماں جائے بھائی ساس کے آزار نے میرا یہ حال کر دیا ہے

نند وڈے وڈے بول، ساون آیا۔ — اور میری نند بُرے بُرے بول بولتی ہے۔

یہ سن کر بھائی تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ساون آ گیا ہے، اب میں تجھے سُرخ ڈولی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

رتے رتے ڈولڑے تُوں بیٹھیں اماں جائیے نی — (میری پیاری بہن غم نہ کھا) میں تجھے سُرخ ڈولی میں بٹھا کر ساتھ لے جاؤں گا

ویرا گھوڑی اسوار ساون آیا۔ — تیرا بھائی گھوڑی پر سوار ہو کر آن پہنچا کہ ساون آیا ہے۔

بہن کنوئیں پر گھڑا بھر رہی ہے، اردگرد سہیلیوں کا جمگھٹا ہے۔ اتنے میں ایک سہیلی اچانک آ کر بھائی کی آمد کی خبر سناتی ہے۔ یہ خوشخبری سُن کر بہن خوشی سے بے خود ہو کر چلا اُٹھتی ہے:-

کیہڑی سہیلی آن دسیا ویر آیا اے — پیاری سہیلیو یہ خوشخبری میں نے کس کے مُنہ سے سُنی کہ بھائی آیا ہے۔

لسی شستی دُور کرو تے ماجھا دُدھ پیایا اے۔ — اب چھاچھ واچھ کا نام بھی نہ لو اور میرے بھائی کے لئے بھینس کا گاڑھا دودھ لاؤ۔

بھائی کی آمد کی خبر سُن کر ایک بہن خوشی خوشی اس کے خیر مقدم کی تیاریاں کر رہی ہے۔ فرطِ مسرت سے اس کے گھر کے در و دیوار بھی جگمگا اُٹھے ہیں۔ چاول پک رہے ہیں اور بہن عالمِ طرب میں اُبلتی ہوئی دیگچی سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:-

اُبل اُبل ولٹوہیئے نی لپ چولاں دی پاواں — اُبل اُبل اے تنگ مُنہ کی دیگچی اُبل میں تجھ میں مٹھی بھر چاول ڈال دوں۔

جے ویر ڈٹھا آؤندا لپ ہور وی پاواں — بھائی کو آتے دیکھ لوں گی تو مٹھی بھر چاول اور ڈال دوں گی۔

جے ویر آیا روڑے، روڑے ہُونج سٹاواں — بھائی گاؤں کے میدان میں پہنچے گا تو راستے کے کنکر اُٹھا کر پھنکوا دوں گی۔

جے ویر آیا گلیاں پٹ دریائی وچھاواں — بھائی گلی میں پہنچے گا تو میں وہاں ریشم کا فرش بچھا دوں گی۔

جے ویر آیا [illegible] — بھائی [illegible] پہنچے گا تو میں [illegible] کے لئے سُرخ پلنگ بچھوا دوں گی۔

جے ویر منگے پانی بُوری مجھ چوآواں	بھائی پانی مانگے گا تو میں اسے بھوری بھینس کا (گاڑھا) دُودھ پلاؤں گی۔
جے ویر منگے روٹی گِری چھوارے کھواواں	بھائی روٹی مانگے گا تو میں اسے گِری اور چھوہارے کھلاؤں گی۔
جے ویر بیٹھا چونکے بھانڈیاں تِرشاں چھڈاواں	بھائی آکر رسوئی میں بیٹھے تو برتن اتنے چمکاؤں کہ روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں
جے ویر اندر وڑیا۔ دیوا لٹ لٹ بلیا	بھائی اندر گیا تو دیئے کی لاٹ اور بھی زیادہ روشن ہو گئی
جے ویر چڑھیا کوٹھے بالا چند بھی چڑھیا	بھائی کوٹھے پر چڑھا تو ساتھ ہی دُوج کا چاند بھی نظر پڑا۔

ایک لڑکی ساون میں اپنے سُسرال والوں سے بھائی کے ساتھ میکے جانے کی اجازت طلب کرتی ہے سُسرال والے طرح طرح کے حیلے تراشتے ہیں اور کسی طرح اُسے اپنے کاموں سے فارغ نہیں ہونے دیتے۔ اس کا گیت بھی سنیئے:۔

لڑکی۔ نینداں آئیاں سسُّو ساون پیٹے پہنچا

ساس۔ مَیں کی جاناں نُوہیں، کونت نوں پچھ کے جاویں پچھا کے جاویں جھبّے مُڑ آویں

ترجمہ { اے ساس اب مجھے ساون کی نیندیں آتی ہیں۔ مجھے جلد میکے پہنچا دے۔
مَیں کیا جانوں بہو اپنے خاوند سے پوچھ پچھا اور چلی جا مگر جلد واپس آجائیو۔ }

لڑکی۔ کونتا کم کریندیا مَیں گھر آیا وِیر سونے دا تیر لنگی پٹ دار جُتی تِلے دار مَیں جاناں پیٹے

خاوند۔ مَیں کی جاناں نارے سَوہرے نوں پچھ کے جاویں پچھا کے جاویں جھبّے مُڑ آویں۔

ترجمہ { میرے کام میں لگے ہوئے شوہر گھر میرا ویر آیا سونے کا تیر آیا۔ لنگی ریشمی، جوتا طلائی کامدار۔ میں میکے جانا چاہتی ہوں۔
نیک بخت میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اپنے سُسر سے پوچھ پچھا اور چلی جا مگر جلد واپس آجائیو۔ }

لڑکی۔ سوہریا پلنگ بیٹھیا مَیں گھر آیا وِیر سونے دا تیر لُنگی پٹ دار جُتی تِلے دار میں جانا پیٹے

سُسر۔ مَیں کی جاناں دِھیئے جیٹھ نُوں پچھ کے جاویں پچھا کے جاویں۔ جھبّے مُڑ آویں۔

ترجمہ { پلنگ پر بیٹھے ہوئے سُسر میرے گھر ویر آیا سونے کا تیر آیا۔ لنگی ریشمی جوتا طلائی کامدار مجھے میکے جانے دے۔
بیٹی میں کیا جانوں اپنے جیٹھ سے پوچھ پچھا اور چلی جا مگر جلد واپس آجائیو۔ }

لڑکی۔ جیٹھا کھوہ تے بیٹھیا مَیں گھر آیا وِیر سونے دا تیر لُنگی پٹ دار جُتی تِلے دار مَیں جانا پیٹے

جیٹھ۔ مَیں کی جاناں بھابی نند نوں پچھ کے جاویں پچھا کے جاویں جھبّے مُڑ آویں۔

ترجمہ { کنوئیں پر بیٹھے ہوئے جیٹھ میرے گھر ویر آیا سونے کا تیر آیا۔ لُنگی ریشمی، جُوتا طلائی کامدار مجھے میکے جانے دے۔
بھابی میں کیا جانوں اپنی نند سے پوچھ پچھا اور چلی جا مگر جلد واپس آجائیو۔ }

لڑکی۔ نندے چرخا کتدیئے میں گھر آیا وِیر سونے دا تیر لُنگی پٹ دار جُتی تِلے دار میں جانا پیٹے۔

نند - بھابو گھر آیا ئیں لعل، توں پنجا کے جاویں، کتا کے جاویں، وٹا کے جاویں، اُنا کے جاویں، دھوا کے جاویں، رکھا کے جاویں جھبے مُڑ آویں۔

ترجمہ { چرخا کاتنے والی نند میرے گھر بیر آیا۔ سونے کا تیر آیا۔ لنگی ریشمی جوتا طلائی کا مدار مجھے میکے جانے دے۔
بھابی گھر روئی آئی ہے اسے دُھنوا کر جائیو، کتوا کر جائیو۔ بٹوا کر جائیو۔ بُنوا کر جائیو، دھلوا کر جائیو، رکھوا کر جائیو۔ پھر جلد واپس آجائیو۔

لڑکی جھنجھلا کر کہتی ہے :-

وِیرا سُن وے میری نند دا مر گیا اَبا میں بن وِچ دباں، میں دھڑ دھڑ پٹّاں میں نہیں جانا پیکے - ویرا توں جا وے -

میرے پیارے بھائی سُن میری نند کا باپ مرگیا میں بن میں اس کی قبر بناؤں گی میں دھڑ دھڑ پیٹوں گی میں میکے نہ جاؤں گی - اب تُو جا خدا حافظ -

بچپن کے زمانے ہی سے دیہاتی لڑکی کے دل میں بھائی کی محبت راسخ ہوجاتی ہے - چنانچہ وہ اپنے کھیلوں میں جو گیت گاتی ہے اُن میں بھی بہن کی معصوم محبت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں - دیہاتی لڑکیاں بچپن میں کچے سُوت کی گیندوں سے کھیلتی ہیں اور اُچھلتی گیند کی تال کے ساتھ اس قسم کے "تھال" گاتی ہیں :-

تن کتیر ـــ گلی گلی کھڈاواں ویر	تن کتیر ـــ میں گلی گلی "بیر" کو کھلاتی پھروں
گلی گلی لون لگے چھتے	گلی گلی گھونگروؤں کی صدا سے جھنجھنا اُٹھے
ویر میرے نوں اللہ رکھے	یا اللہ میرے بھائی کی نگہبانی کر
رکھن والا اللہ	میرے بھائی کا رکھوالا اللہ ہے
کھڈان والا چھلّا	اُس کا دل بہلانے والا چھلّا ہے -

کلکلی دیہاتی لڑکیوں کا ایک نہایت مرغوب کھیل ہے - ایک دوسری کا ہاتھ پکڑے لڑکیاں پھُدک پھُدک کر چکّر کھاتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس قسم کے گیت گاتی ہیں :-

کِلکلی کلیر دی
پگ میرے ویر دی
دوپٹہ میرے بھائی دا
لال شپاہی دا

اس گیت میں بھائی کی پگڑی اور چادر وغیرہ کی بلائیں لے کر بہن نے فخر سے اُسے "لال سپاہی" کہا ہے - دیہاتی بہنیں ہمیشہ اپنے بھائیوں کو اچھے سے اچھے عہدوں پر فائز دیکھنا چاہتی ہیں - چنانچہ ایک بہن کہتی ہے :-

آری ـــ دو ویر دے وے ربّا	آری ـــ یارب مجھے دو بھائی عطا کر
اِک مُنشی تے اِک پٹواری	جن میں سے ایک مُنشی بنے اور ایک پٹواری ہو -

کیوں نہ ہو، بہن کے لئے بھائی سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ ایک لڑکی کہتی ہے: ؎

چھوئی ــــ گھم گھم سڑک دگے　　　چھوئی ــــ سڑک پر راہ گزروں کی بڑی گہما گہمی ہے

میرے ویر جیہا نہیں کوئی　　　مگر ان میں میرے بھائی جیسا گبرو کوئی بھی نہیں۔

ایک لڑکی تنور میں روٹی لگا رہی ہے۔ اتنے میں ڈاکیا اُسے بھائی کا خط دے جاتا ہے۔ وہ روٹیوں کو جلتا ہوا چھوڑ کر اُس کے پیچھے خط پڑھوانے کے لئے بھاگتی ہے کہ روٹیاں جائیں بھاڑ میں "بیرن" کی چٹھی تو سُن لوں: ؎

تنور ی تائی ہوئی آ

تے کھسماں نوں کھان روٹیاں ــــــ چیٹھی ویر دی آئی ہوئی آ

ایک بہن نے گوبھی پکائی ہے۔ بکھار تے وقت اُسے خیال آتا ہے، کاش آج بھائی بھی آتا اور گوبھی کھاتا۔ اس خیال سے وہ گوبھی کا کچھ سالن الگ رکھ دیتی ہے، اتفاقاً آدھی رات کے وقت بھائی بھی آن پہنچتا ہے ؎

اساں گوبھی تڑکی اے

تے ادھی راتی ویر آیا ــــــــ گرگابی کھڑکی اے

لاڈلا بھائی عام دیہاتیوں کی طرح بھدا گامے شاہی جوتا پہن کر نہیں آتا۔ اس کے قدموں کی چاپ ہی بتا دیتی ہے کہ: "گرگابی کھڑکی اے"

ایک لڑکی کا بھائی سنگدل اور اکل کھرا ہے لیکن پنجاب کی بہن کو کسی طرح یقین نہیں آسکتا کہ کوئی بھائی بھی ایسا بُرا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی بُرائی کا الزام اپنی سیالکوٹی بھاوج کے سر چپک دیتی ہے: ؎

فیتا ــــ تے بھابیئے سیالکوٹنے

کہیا ویر دا پتھر دِل کیتا

گویا "ویر" کا دِل سیالکوٹن بھابی ہی نے پتھر بنایا ہے۔ وہ تو بچارا موم کی ناک ہے۔

لوگوں کو نہر کے کنارے ایک نوجوان کی لاش پڑی ملتی ہے جسے چوروں نے مار ڈالا ہے۔ لاش کو دیکھ کر دیہاتی لڑکی کی خواہرانہ محبت جوش میں آجاتی ہے اور وہ کہتی ہے۔ آہ! یہ بھی کسی نصیبوں جلی بہن کا بھائی ہوگا۔ بھائی کی موت اُسے ہر دوسرے عزیز کی موت سے زیادہ دردناک معلوم ہوتی ہے ؎

کھیرا ــــ تے نہر کنڈھے چور ماریا

کسے بھین تتی دا ویرا

غور کیجئے وہ یہ نہیں سوچتی کہ یہ کسی دکھ جلی ماں کا بیٹا، کسی بے کس بچے کا باپ، یا کسی نوجوان رانڈ کا شوہر ہے۔ اُسے سب سے زیادہ دردناک موت بھائی ہی کی معلوم ہوتی ہے۔

آخر میں ایک پُرلطف گیت سنیئے۔ اس میں دیہاتی لڑکی کی میکے سے محبت اور سُسرال سے نفرت بہت دلچسپ طریقے سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ گیت "بوٹے کے گیت" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ہر مصرع میں بہن اپنے بھائی کی بلائیں لیتی ہے اور ساتھ ساتھ اپنے پسندیدہ بوٹے پر فخر کا اظہار بھی کرتی جاتی ہے۔ گیت کا مضمون یہ ہے کہ عالمِ خیال میں جوہڑ کے کنارے شیشم کے ایک درخت پر بہن چڑھتی ہے اور دوسرے بھائی پہلے وہ بھائی کو تصوّر میں اپنا میکہ دکھاتی ہے جہاں اُن کا خوشحال باپ موٹی تازی دودھیل بھینسیں چراتا نظر آتا ہے اور بھینسوں کی کٹڑیوں کی حفاظت پر اُس کا چھوٹا بھائی مامور ہے۔ اس کے بعد وہ اُسے سُسرال کی ایک جھلک دکھاتی ہے جہاں اُس کا سُسر کُتیاؤں کو ہانک رہا ہے اور اُس کا دیور کُتے کے پلّوں کے پیچھے پیچھے پھرتا نظر آتا ہے۔

بوٹے کا گیت

واری چھپڑ کنڈھے دو ٹاہلیاں واری اُگیاں سِدھیاں تیر
میرا بوٹا نرمے دا
واری اِکی ٹاہلی میں چڑھاں، واری اِکی چڑھے میرا ویر
میرا بوٹا نرمے دا
واری اُتر ویرا اِہُن میں چڑھاں واری ویکھیئے پیکا دیس
میرا بوٹا نرمے دا
واری پیکیاں دا کی ویکھناں، واری پیکیاں دا کی ویکھناں
میرا بابل تے مجھیں چار دا تے کٹیاں مغر میرا ویر
میرا بوٹا نرمے دا
واری اُتر ویرا اِہُن میں چڑھاں واری ویکھیئے سوہرا دیس
میرا بوٹا نرمے دا
واری سوہریاں دا کی ویکھناں واری سوہریاں دا کی ویکھناں
میرا سوہرا تے کُتیاں چار دا تے کتوریاں مغر میرا دیور
میرا بوٹا نرمے دا

حامد علی خاں

* یہ مضمون کسی قدر مختصر صورت میں آل انڈیا ریڈیو لاہور سے نشر کیا گیا تھا اور اب حسبِ اجازت شائع کیا گیا ہے۔

شرح مبادلہ

(۱)

پچھلے چند دنوں سے روپیہ اور سٹرلنگ کی باہمی شرح مبادلہ کے متعلق اخبارات میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ شرح مبادلہ کا یہ سوال یوں تو بہت عرصے سے زیر بحث چلا آرہا ہے لیکن اب کانگریس کے پریذیڈنٹ مسٹر سبھاس چندر بوس نے اس مسئلہ میں از سرِ نو تازگی پیدا کر دی ہے۔

مجوزہ قانون کے مطابق ایک ہندوستانی روپیہ ایک برطانوی شلنگ اور چھ پنس کے برابر ہے۔

مسٹر سبھاس چندر بوس نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ اس شرح مبادلہ کو بدل کر اس کی جگہ ایک ایسی شرح مقرر کی جائے جس میں روپے کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس سے کم ہو۔ مثلاً ایک شلنگ چار پنس۔ حکومت نے اس کے جواب میں ایک اعلان شائع کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ موجودہ شرح کو کسی صورت میں بھی کم و بیش کرنے کے لئے تیار نہیں۔ شرح مبادلہ جو اب ہے وہی رہیگی۔

حکومت کے اس اعلان کے شائع ہونے پر کئی ہندوستانی تجارتی جماعتوں اور ایوانوں نے وائسرائے کو تار دیئے کہ حکومت کا یہ فعل نہایت ہی غیر مستحسن اور ہندوستان کے مفاد کے منافی ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے۔ لیکن حکومت کے رویہ میں ابھی تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ اس پر ہندوستان کے مختلف اخبارات نے اس موضوع پر افتتاحی مقالے لکھے، تبصرے کئے اور مختلف خیالات کا اظہار کیا۔ بعض نے حکومت کی پالیسی کی تائید کی اور بعض نے کانگریس کے مطالبہ اور نقطۂ نظر کی حمایت۔ لیکن بات وہیں کی وہیں رہی۔

عوام میں سے بہت کم لوگ اس معاملہ کو سمجھ سکے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ سوال ہی کچھ ایسا پیچیدہ ہے کہ ماہرین معاشیات میں سے بھی اکثر اس کی تہ تک نہیں پہنچتے۔ یہ مسئلہ بے حد اختلافی ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ قارئین کے سامنے چند اہم امور غیر جانبدارانہ رنگ میں پیش کروں تاکہ اُنہیں یہ تو معلوم ہو سکے کہ آخر یہ جھگڑا کیا ہے اور اس کی بنا کیا ہے اور وہ خود اس کے متعلق اپنی رائے قائم کر سکیں۔

(۲)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی ایام میں ہندوستان میں بے شمار قسم کے سکے رائج تھے۔ چاندی بھی چلتی تھی اور سونے کی مُہریں بھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اُس وقت ہندوستان میں ۹۹۴ قسم کے مختلف سکے مستعمل تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں کاروباری

لین دین کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔ تجارت کی ترقی کے لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ سارے ملک میں ایک ہی مشترکہ سکہ رائج ہو اور تمام سودے اور معاہدے اسی ایک سکے کے ذریعے سے طے کئے جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے انیسویں صدی میں بہت کوششیں کی گئیں۔ اور یہ ان ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج طول و عرض ہند میں صرف ایک ہی زرِ مستند ہے یعنی چاندی کا روپیہ۔

۱۸۳۵ء اور ۱۸۷۲ء کے درمیان ہندوستان میں سونے کا سکہ رائج کرنے کی بہت سی تجاویز کو آزمایا گیا۔ لیکن اُن میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ ۱۸۷۱ء سے لے کر ۱۸۹۳ء تک چاندی کی قیمت گرتی چلی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روپیہ کی قیمت بھی گرنی شروع ہوئی۔ اسی زمانہ میں بین الاقوامی بائی میٹلزم (یعنی چاندی اور سونے کے سکے ساتھ ساتھ چلانے کی تجویز) کے قیام کے لئے کئی کانفرنسیں ہوئیں لیکن یہ سکیم منظور نہ ہو سکی۔ کیونکہ خود انگلستان اس کے خلاف تھا اور طلائی معیار ہی کو جاری رکھنا چاہتا تھا اور دوسری یورپین اقوام انگلستان کی تقلید کو باعثِ سعادت سمجھتی تھیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بائی میٹلزم جاری نہ ہو سکا۔ ہندوستان کو بائی میٹلزم سے قدرے فائدہ پہنچتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں ہر ملک کے لئے چاندی کا استعمال لازمی ہو جاتا اور اس سے چاندی کی قیمت میں اضافہ ہونا ضروری تھا۔ اس طرح ہندوستانی روپیہ کی قیمت بھی چڑھ جاتی، اور روپیہ کی قیمت گرنے سے جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ دُور ہو جاتیں۔

۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۰ء تک روپیہ کی قیمت بدستور گرتی رہی۔ ۱۸۷۱ء میں ایک روپیہ دو شلنگ کے برابر تھا مگر ۱۸۹۲ء میں اس کی قیمت صرف ایک شلنگ تین پنس رہ گئی تھی اور ۱۸۹۵ء میں اس سے بھی کم یعنی صرف ½۱۲ پنس۔ شرح مبادلہ کی اس تغیر پذیری سے ہندوستان کی خارجی تجارت کو بہت نقصان پہنچا۔ جو تاجر باہر کے ملکوں سے چیزیں منگواتے تھے یا جو مال باہر بھیجتے تھے انہیں کبھی یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ اُنہیں کیا قیمت دینی پڑے گی یا کیا رقم ان کو ملے گی۔ تجارت ایک جوا سا بن گئی تھی اور کوئی بات بھی وثوق کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔

لوگوں کا خیال تھا کہ تجارتِ برآمد کو فائدہ پہنچے گا کیونکہ پونڈ اور شلنگ کی ایک مقررہ رقم کے عوض میں اُنہیں زیادہ روپے ملیں گے۔ اس کے برعکس مزدوری اور پیداوارِ خام کی قیمت زیادہ نہیں دینی پڑے گی اور سارا منافع تاجر کی جیب میں رہیگا۔ مگر اس سلسلے میں عجیب بات یہ ہے کہ لوگوں کے یہ قیاسات غلط ثابت ہوئے کیونکہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۶ء تک شرح مبادلہ میں ½۱۱ فیصدی کی واقع ہوئی لیکن تجارت برآمد کی مقدار پچھلے پانچ سالوں سے زیادہ ہونے کی بجائے کم ہو گئی اور جب ۱۸۸۸-۱۸۹۰ء میں شرح مبادلہ میں کچھ ثبات کے آثار نظر آئے تو تجارت میں چھ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ چنانچہ شرح مبادلہ کے گرنے سے تجارتِ برآمد میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ اگرچہ خالص نظریہ کی رُو سے ایسا ہونا چاہئے تھا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں صرف نظریوں پر ہی بھروسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ عملی صورتِ حالات کا مطالعہ بھی کرنا چاہئے۔ اس کے بغیر ہم کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے علم معاشیات

کے اصُولِ طبیعیات یا ریاضی کے اصُولوں کی طرح اٹل اور ناقابلِ تغیر نہیں ہیں!

شرحِ مبادلہ کے گر جانے کا اثر حکومت کی مالی حالت پر بھی پڑا۔ حکومتِ ہند کو ہر سال ایک بھاری رقم انگلستان بھیجنی پڑتی ہے حکومتِ ہند کی اپنی آمدنی تو چاندی کے روپے میں گنی جاتی ہے۔ لیکن جو رقم اسے حکومتِ انگلشیہ کو دینی پڑتی ہے وہ پونڈوں اور شلنگوں میں شمار ہوتی ہے۔ چنانچہ ۹۳-۱۸۹۲ء میں ½ ۱۶ ملین پونڈ واجب الادا تھے۔ اُس وقت کی شرح مبادلہ کے حساب سے حکومتِ ہند کو ½ ۲۶ کروڑ روپے ادا کرنے پڑے۔ حالانکہ اگر ۷۴-۱۸۷۳ء کی شرحِ مبادلہ کے حساب سے یہ رقم ادا کی جاتی تو صرف ۷ء ۱۷ کروڑ روپے دینے پڑتے۔ (سنہ ۱۸۹۲ء میں شرح ایک شلنگ تین پنس تھی اور سنہ ۱۸۷۳ء میں ۲ شلنگ)۔

ان تمام حالات کے پیشِ نظر حکومتِ ہند نے ہرشل کمیٹی مقرر کی۔ لارڈ ہرشل اس کمیٹی کے پریذیڈنٹ تھے۔ اس کمیٹی کی سفارش کے مطابق سنہ ۱۸۹۳ء میں دارالضرب کا آزادانہ استعمال بند کر دیا گیا اور اس طرح چاندی اور روپے کی قیمت میں جو بالواسطہ تعلق تھا وہ منقطع ہو گیا۔ اور اس وقت سے آج تک ہندوستانی روپیہ ایک زرِ وضعی کی حیثیت سے رائج ہے۔ روپے میں جو مقدار چاندی کی ہے اُس کی اپنی قیمت ۱۰ آنے نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں روپے کی قیمت مصنوعی طور پر اس معیار پر قائم رکھی گئی ہے۔

ہرشل کمیٹی نے شرحِ مبادلہ ایک شلنگ ۴ پنس تجویز کی تھی۔

(۳)

سنہ ۱۸۹۸ء میں فولر کمیٹی کا تقرر عمل میں لایا گیا اور سنہ ۱۹۱۳ء میں چیمبرلین کمشن مقرر ہوا۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں بیبنگٹن سمتھ کمیٹی اور سنہ ۱۹۲۶ء میں ہلٹن ینگ کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی۔

اگر ان مختلف کمیٹیوں اور کمشنوں کی تمام سفارشات کو یہاں پیش کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ ان رپورٹوں میں ہندوستانی زر کے متعلق نہایت مفید واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے۔ اور اس سوال کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ بحث کی گئی ہے لیکن اس وقت ہمیں تفصیل میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارے مضمون کے لئے سنہ ۱۹۲۶ء کے ہلٹن ینگ کمیشن کی رپورٹ سب سے زیادہ اہم ہے۔

اس رپورٹ کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں موجودہ یعنی سنہ ۱۹۲۶ء کے سسٹم کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس میں چند تبدیلیاں تجویز کی گئی ہیں جو نقائص کو دُور کر کے اس کو زیادہ کارآمد آسان اور ترقی یافتہ بنا دیں۔ رپورٹ کے دوسرے حصے میں ایک مرکزی بنک کے مسئلے پر غور کیا گیا ہے اور گورنمنٹ سے سفارش کی گئی ہے کہ جلد از جلد ملک میں ایک ریزرو بنک قائم کیا جائے۔

اور تیسرے حصہ میں شرحِ مبادلہ پر ایک عالمانہ بحث کرنے کے بعد گورنمنٹ سے سفارش کی ہے کہ ایک ہندوستانی روپے کی قیمت ۸ء۴۷۵۱۲ گرین سونے کی قیمت کے برابر مقرر کی جائے یعنی ایک شلنگ ۶ پنس کے برابر۔ اُس وقت سے یہی شرح مبادلہ چلی آ رہی ہے۔

(۴)

جو دلائل ہلٹن ینگ کمشن کے سامنے ایک شلنگ چھ پنس یا ایک شلنگ چار پنس کے حامیوں نے پیش کئے تھے، وہی آج پھر دُہرائے جا رہے ہیں۔ شرح مبادلہ کو پھر ۱۶ پنس پر لانے کے حق میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اس سے ملک کی اقتصادی بدحالی دُور ہو جائے گی۔ پیداوار خام کی قیمتیں بڑھ جائیں گی، صنعت وحرفت میں ترقی ہو گی اور تجارت فروغ پائے گی۔ اس دعوے کی تائید میں دُنیا کے دوسرے ممالک کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ انگلستان، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، کینیڈا وغیرہ سب ملکوں نے اپنے سکوں کی خارجی قیمت کم کر دی ہے۔ اُدھر تو اُور اُن ملکوں نے بھی جنہوں نے مجموعی طور پر ایک "طلائی بلاک" بنا رکھا تھا اپنی ہٹ دھری کو چھوڑ دیا ہے اور بین الاقوامی رَو کے ساتھ بہ نکلے ہیں۔ اس "بلاک" میں فرانس، اور سکنڈے نیوی ممالک شامل تھے۔ اب دُنیا کی حالت یہ ہے کہ کہیں بھی تجارتی آزادی نہیں۔ اور مختلف قسم کی پابندیوں، معاہدوں اور نہ جانے کن کن ذرائع سے تمام ممالک اپنی اندرونی حالت کو بہتر بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔ خصوصاً جرمنی میں تجارت خارجہ پر بہت سخت پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں اور انہیں پابندیوں کی وجہ سے ہندوستان کی تجارت کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ مختصر یہ کہ دُنیا کے کسی بھی حصے میں "رسد" اور "طلب" کی طاقتوں کو آزادانہ عمل کا موقع نہیں دیا جاتا۔ ہمیں اس وقت اس سے غرض نہیں کہ دُنیا کو ان طریقوں سے فائدہ پہنچ رہا ہے یا نقصان؛ فی الحال ہمیں ان پابندیوں کی موجودگی کو پیش نظر رکھ لینا ہی کافی ہے۔

گویا ۱۶ پنس کے حامیوں کا یہ دعوے ہے کہ جب دُنیا کے ہر ملک میں حکومت تجارت کی مدد کے لئے کئی قسم کی کوششیں کر رہی ہے تو ہندوستان کی حکومت کا بھی فرض ہے کہ اس سلسلہ میں اپنے فرائض سے عہدہ برا ہو اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ روپے کی خارجی قیمت (یعنی شرح مبادلہ) کو کم کیا جائے۔

جب روپے کی خارجی قیمت زیادہ ہو جاتی ہے (یا کر دی جاتی ہے) تو ملک میں قیمتوں کا عام معیار گر جاتا ہے اس سے مینداروں اور دوسرے صناعوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہندوستان کے کارخانہ داروں کو بھی خسارہ اُٹھانا پڑتا ہے مقروضین بھی گھاٹے میں رہتے ہیں۔ اس کی صورت یوں ہے کہ فرض کیجئے آج آپ نے ۱۰۰ روپیہ قرض لیا اور ایک سال کے بعد ۵ فیصدی سُود کے ساتھ واپس کرنے کا وعدہ کیا۔ اگر اس دَوران میں اجناس کے نرخ میں تبدیلی نہ ہو تو آپ ۱۰۵ روپے ادا کر کے اپنا حساب بے باق کر دینگے لیکن اگر روپے کی قیمت بڑھا دی جائے یا دوسرے الفاظ میں اجناس کے نرخ گر جائیں تو آپ کو نقصان ہو گا۔ دینے تو اب بھی آپ کو ۱۰۵ روپے ہی ہوں گے لیکن ان ۱۰۵ روپوں کی قدر اب زیادہ ہو گی مثلاً اگر آپ نے اپنی کاروباری ضروریات کے لئے قرضہ لیا ہے تو آپ کو زیادہ چیزیں بیچنی پڑیں گی۔ تب جا کر آپ ۱۰۵ روپے حاصل کر سکیں گے۔ اگر قیمتوں میں ۱۰ فیصدی کی واقع ہو گئی ہے تو آپ سال کے شروع کی بہ نسبت دس فیصدی زیادہ مال فروخت کرنا پڑے گا تب جا کر آپ اتنی رقم حاصل کر سکیں گے جتنی کہ سال کے شروع

میں اس سے دس فیصدی کم چیزیں بیچ کر آپ حاصل کر سکتے تھے۔ اسی طرح اگر قیمتوں میں اضافہ ہو جائے تو قرضخواہ کو نقصان ہوتا ہے۔
حاصل مطلب یہ ہے کہ شرح مبادلہ میں تغیر و تبدل کی وجہ سے خاطر خواہ تجارت نہیں ہو سکتی۔ کبھی ایک جماعت کو نقصان پہنچتا ہے اور کبھی دوسری کو، لیکن شرح مبادلہ کے زیادہ کرنے سے نقصان پہنچتا ہے زمینداروں کو، ٹیکس دہندوں کو، کارخانہ داروں کو اور قرضداروں کو اور یہی وہ جماعتیں ہیں کہ جن کی بدحالی ملک کی بدحالی گنی جاتی ہے اور جن کی خوشحالی میں ملک کی خوشحالی مضمر ہے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر ایک شلنگ چھ پنس کے مقابلہ میں ایک شلنگ چار پنس ملک کے لئے فائدہ مند ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ایک شلنگ چار پنس کے مقابلہ میں ایک شلنگ دو پنس اور بھی زیادہ مفید ہوگا۔ اور صرف ایک شلنگ اس سے بھی زیادہ مفید وَ قِس علیٰ ہذا۔ لیکن کہاں تک ؛ شرح مبادلہ کو کم کرنے کے حامی کہاں جا کر رکیں گے اور کیوں ؛

شرح مبادلہ میں کمی قیمتوں کو بڑھانے کا باعث ہوتی ہے، اور اس سے کارخانہ کے مزدوروں کو، زراعتی مزدوروں کو، ان کاشتکاروں کو کہ جن کے پاس فروخت کے لئے فالتو پیداوار نہیں ہوتی، اور اُس طبقہ کو۔ جس کی آمدنی معین ہے (مثلاً کلرک، سرکاری ملازم پیشہ لوگ وغیرہ) نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔

ایک شلنگ چھ پنس کے حامیوں کا دعوےٰ ہے کہ روپوں کی ایک خاص تعداد کے عوض لنڈن میں زیادہ پونڈ اور شلنگ مل سکتے ہیں اس سے ان سوداگروں کو فائدہ پہنچے گا جو تجارت درآمد میں مشغول ہیں اور ان لوگوں کو بھی نفع ہوگا جنہیں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو انگلستان میں روپیہ بھیجنا ہوتا ہے۔ اور سب سے زیادہ نفع گورنمنٹ کو ہوگا (جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ہر سال حکومت ہند کو "مطالباتِ وطن" ادا کرنے ہوتے ہیں اور شرح مبادلہ زیادہ ہونے سے حکومت کو کم روپے دینے پڑیں گے۔)

شرح مبادلہ کے تغیّر سے زمینداروں کے قرضہ کے اصلی بوجھ پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اگر شرح کم کردی جائے، اس سے قیمتیں بڑھ جائیں گی اور قرضہ کا اصلی بوجھ کم ہو جائے گا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کے زمینداروں کا مجموعی قرضہ ۹۰۰ کروڑ کے قریب ہے صرف پنجاب کے قرضداروں کا قرضہ ۱۹۲۹ء میں ۱۳۵ کروڑ کے قریب تھا (یہ اعداد مسٹر ڈارلنگ اور بنکنگ انکوائری کمیٹیوں نے مرتب کئے ہیں۔)

شرح مبادلہ کا اثر صارف پر بھی پڑتا ہے، اگر شرح کم کردی جائے تو درآمدہ چیزوں کی قیمت میں اضافہ ہوگا اور صارف کو ان چیزوں کے خریدنے میں نقصان ہوگا اور شرح مبادلہ کے زیادہ کرنے کی صورت میں وہ فائدہ میں رہیگا۔ علاوہ بریں جو مشینری ہم غیر ممالک سے منگواتے ہیں اس کی قیمت پر بھی اثر پڑے گا اور اس کی صورت وہی ہوگی جو اور درآمدہ چیزوں کی ہے۔

ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شرح مبادلہ میں کمی کرنا تجار برآمدہ، زمینداروں، کارخانہ داروں اور قرضداروں کے لئے مفید ہے اس کے برعکس شرح مبادلہ میں زیادتی کرنا حکومتِ ہند، تجار درآمدہ، تنخواہ دار ملازمین اور مزدوروں کے لئے

فائدہ مند ہے۔

مگر اس سلسلہ میں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ یہ سب فوائد یا نقصانات محض اس صورت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں جب کہ شرحِ مبادلہ یا تو گر رہی ہو یا چڑھ رہی ہو۔ لیکن جب ایک خاص معیار پر پہنچ کر ٹھہر جائے اور تجارتی حالات اپنے آپ کو اس کے موافق درست کرلیں تو پھر فوائد یا نقصانات کا سوال ہی نہیں رہتا۔ بین الاقوامی تجارت اصل میں خالص مبادلہ ہے مختلف ممالک کی پیداوار کا۔ اور محض شرحِ مبادلہ کے اُتار چڑھاؤ سے کوئی ملک امیر یا غریب نہیں بن سکتا۔ توازنِ تجارت کو آخر کار چیزوں کی درآمد اور برآمد سے ہی قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اور اگر درآمد زیادہ ہو اور برآمد کم تو سونا یا چاندی باہر بھیجنا پڑتا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں ہندوستان سے کافی سونا باہر بھیجا جا چکا ہے اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ ہندوستان میں پیداوار کی برآمد پہلے سے کم ہو رہی تھی اس لئے توازنِ تجارت کو قائم رکھنے کے لئے سونا ہندوستان سے باہر بھیجنا پڑا۔

آج ہندوستان بلکہ ساری دُنیا کی صورتِ حالات ۱۹۲۶ء سے بالکل مختلف ہے۔ جب ہلٹن ینگ کمیشن نے شرحِ مبادلہ کو ایک شلنگ چھ پنس مقرر کرنے کی سفارش کی تھی تو حکومتِ ہند پر یہ پابندی نہیں عائد کی گئی تھی کہ اس شرح کو کبھی کم و بیش نہ کیا جائے۔ کیونکہ ایسا کرنا حماقت کی انتہا ہوتی۔ شرحِ مبادلہ کو صورتِ حالات کے موافق بدلتے رہنا چاہئے۔ لیکن ہندوستان کو ان معاملات میں ابھی تک آزادی اور خود مختاری حاصل نہیں ہوئی اس لئے ایسا ہونا مشکل ہے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہونی چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ شرحِ مبادلہ میں کمی واقعی ہندوستان کے لئے مفید ثابت ہو لیکن ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ دونوں فریق مبالغہ سے کام لیتے ہیں ہمارے لئے نہ ایک شلنگ چھ پنس کوئی مقدس چیز ہے اور نہ ایک شلنگ چار پنس۔ اصلی سوال شرحِ مبادلہ کو صورتِ حالات کے مطابق مقرر کرنے کا ہے، ۱۶ پنس یا ۱۸ پنس کا نہیں۔ شاید پندرہ یا سترہ پنس زیادہ فائدہ مند ہو!

۱۹۳۴ء کے ریزرو بنک ایکٹ کے ماتحت ریزرو بنک کو یہ حق دیا گیا ہے کہ جب بین الاقوامی حالات موافق معلوم ہوں، وہ حکومتِ ہند کو ہندوستان کے زرئی معیار کے متعلق اپنی رائے سے مطلع کرے اور حکومت اُس کی سفارشات کے مطابق (یا خلاف!) جو تبدیلی چاہے کرسکتی ہے۔ مطلب یہ کہ اس معاملے میں پہل ریزرو بنک کی طرف سے ہونی چاہئے حکومتِ ہند از خود کچھ نہیں کرے گی۔

(۵)

مسٹر سبھاس چندر بوس نے کہا ہے کہ "صورتِ حالات کو جانچنے کے لئے کانگرسی وزراء سے بہتر اور کون ہوسکتا ہے۔ حکومتِ ہند اور ریزرو بنک غیر ملکی ادارے ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ ہندوستان کا اصلی مفاد کس بات میں ہے۔ وہ تو صرف انگریزوں کے فائدہ کو ہی مدِنظر رکھتے ہیں۔"

ممکن ہے کسی حد تک مسٹر بوس کا یہ الزام درست ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دستورِ ہند کے مطابق اور قانون کے رُو

سے اس معاملہ میں کانگرسی وزارتیں بھی کچھ نہیں کرسکتیں۔ہاں اگر وہ اس سوال پر تمام صوبوں میں مستعفی ہونے کو تیار ہوں تو پھر حکومت اور ریزرو بنک کو اس سوال کا کوئی مناسب حل ڈھونڈنا پڑے گا لیکن جہاں تک اخبارات سے پتہ چلتا ہے کانگرسی وزارتیں کوئی ایسا قدم اُٹھانے کے لئے تیار نہیں۔چنانچہ شرح مبادلہ بدستور ایک شلنگ چھ پنس ہی ہے۔دیکھیں کب اس میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے اور اس کا ملک پر کیا اثر پڑتا ہے۔

نوٹ (۱):۔اس مضمون پر کتابیں تو کئی لکھی جاچکی ہیں مگر ان میں سے اکثر پُرانی ہوچکی ہیں اور موجودہ صُورتِ حالات کو بیان نہیں کرتیں تاہم ان کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔اس مضمون کے تیار کرنے میں جن کتب وغیرہ سے امداد لی گئی ہے اُن میں سے بعض کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

1. Reports of the Indian Currency Committees and Commissions published by the Govt, of India. 2, Jather and Beri — Indian Economics (1937 Edn). 3, A.N. Bali — Indian Economics, 4, L.C. Jain — Indian Monetary Problems. 5, Findlay Shirras — Indian Finance and Banking. 6, B.R. Ambedkar — The Problem of the Rupee. 7, H.D. Macleod — Indian Currency. 8. E.W. Kemmerer — Modern Currency Reforms. 9, V.G. Kale — Indian Economics. 10, Hawtrey — Currency and Credit. 11, Keynes — Indian Currency and Finance. 12. Howard — India and the Gold Standard. 13, Vakil and Muranjan — Currency and Prices in India. 14, Stanley Jevons — Money, Banking and Exchange in India. 15, Chablani — Studies in Indian Currency and Exchange.

نوٹ (۲):۔اصطلاحات کے ترجمہ کے لئے انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) کی شائع کردہ "فرہنگ اصطلاحات علمیہ" سے مدد لی گئی ہے۔

Rate of Exchange	شرح مبادلہ	Standard coin	زرِ مستند
Gold Standard	معیارِ طلائی	Export Trade	تجارتِ برآمد
Mint	دارالضرب	Token Coin	زرِ وضعی
Gold Bloc	طلائی "بلاک"	Supply	رسد
Demand	طلب	Home Charges	مطالباتِ وطن
Balance of Trade	توازنِ تجارت	External Value	خارجی قیمت
Monetary Standard	زری معیار	Indian Constitution	دستورِ ہند

Consumer ـــ صارف

انوار الحق ایم۔اے

فکرِ ہر کس

دن رات تلاش ہے یہ آخر کس کی جس کے پیاسے ہیں ہم، وہ دریا ہے کہاں
مدت سے "خدا خدا" کہا کرتے ہیں، آخر اُس اسم کا مسمّٰی ہے کہاں
یہ لاینحل سوال، کس سے پوچھیں
کیسا ہے وہ ذوالجلال، کس سے پوچھیں

خطاب مولوی صاحب سے:- (۱)

ہاں مولوی صاحب! آپ تو عالم ہیں کچھ اس کا پتہ آپ بتا سکتے ہیں
فرمایا، کہ ہے عرشِ بریں اُس کا مقام ہم بندے کہاں عرش پہ جا سکتے ہیں
کیوں راہِ طلب میں خود کو گُم راہ کرو
بیٹھے ہوئے گھر میں 'اللہ اللہ' کرو

خطاب فلسفی صاحب سے:- (۲)

ہاں فلسفی صاحب! آپ کیا کہتے ہیں کیا ہم بندوں کا کوئی مولا ہی نہیں؟
کہنے لگے، کیا خدا خدا بکتے ہو یہ اسم وہ ہے، جس کا مسمّٰی ہی نہیں
دُنیا میں کوئی خُدا سے آگاہ نہیں
یہ اپنی ہی من گھڑت ہے 'اللہ' نہیں

خطاب سائنس سے:- (۳)

پھر ماہرِ سائنس سے ہم نے پوچھا اس بارے میں کہئے، آپ کیا کہتے ہیں
فرمایا، گذشتہ سے تو لا علم ہیں ہم، اس وقت تو 'برق' کو خدا کہتے ہیں
بجلی کی تجلّیوں کا سب جلوہ ہے

موسیٰ نے اسی کو طور پر دیکھا ہے

(۴)

خطاب صوفی صاحب سے:۔

صوفی صاحب! ذرا مراقب ہو کر کچھ آپ اپنی زباں سے فرمائیے گا
کہتے ہیں کسے خدا؟ تو ارشاد ہُوا وہ ساتھ ہے آپ کے جہاں جائیے گا
مظہر ہیں اسی کے سب، یہ سافل عالی
خود اپنا وجود، اس سے کب ہے خالی

(۵)

خطاب شاعر سے:۔

شاعر صاحب! خدا کو تم کیا سمجھے شاعر بھی تو دُور کی خبر لاتے ہیں
کچھ وزن میں گنگنا کے یوں فرمایا ہم اپنے خیال میں اسے پاتے ہیں
دُنیا والے خیال کہتے ہیں اسے
ہم جلوۂ ذوالجلال کہتے ہیں اسے

(۶)

خطاب امجد صاحب سے:۔

امجد صاحب! کچھ آپ ارشاد کریں ہم بھی تو سنیں کہ آپ کیا کہتے ہیں
فرمایا کہ "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" کے تحت ہم "طاقتِ غیبی" کو خدا کہتے ہیں
وہ طاقتِ غیبی، جو "محیط الکُل" ہے
ثابت کرتی ہے جس کا ہونا، ہر شَے

راوی

کوئی نہ ملا، اُس سے مِلانے والا دیکھا نہ گیا، کوئی دکھانے والا
اس دَور میں ایک بھی کو لمس نہ ہُوا امریکہ کا پتہ چلانے والا

ہم موردِ الطاف و کرم کس کے ہیں
یا خوگرِ صد جور و ستم، کس کے ہیں
ہر چیز جہان میں ہے اِس کی، اُس کی
لیکن نہیں معلوم کہ ہم کس کے ہیں؟

سمجھایا ہر اِک نے اپنے اپنے ڈھب سے
لیکن ہم کو تو کوئی رستہ نہ مِلا
پہنچے ہم اسی فکر میں اِک دوست کے گھر
واں کھیل رہا تھا ان کا کم سن بچہ
پھولے ہوئے گال، رُخ پہ بکھرے ہوئے بال
اک چاند کا ٹکڑا، بدرِ کامل کی مثال

ہم نے اسے گود میں اُٹھا کر پوچھا
معصوم فرشتے! تم ہی کچھ سمجھاؤ
بولو، کہ خدا کہاں ہے؟ اور کیسا ہے؟
ہنس کر بولا، کہ آؤ گھر میں آؤ
جس کو تم پوچھتے ہو، وہ تو یاں ہے
کیا تم کو بتا ہی دوں؛ وہ "میری ماں" ہے
بچّوں کی زباں پر ہے ہر دم امّی
تم کہتے ہو رَبّی رَبّی، اور ہم، امّی

مقولۂ طفل:-

رُباعی

تم بھی یوں ہی تمام رحمت ہو جاؤ
دُنیا کے لئے مُوجبِ راحت ہو جاؤ
بن سکتے ہو تم خود بھی خُدا، گر چاہو
بس کچھ نہیں بندۂ محبت ہو جاؤ

رُباعی

"

رب، اپنے ہر اِک بندے کے ہمراہ ہُوا
اس واسطے انتظامِ دِل خواہ ہُوا
ہے رحم و کرم ہی سے خدائی کا رواج
اللہ بھی محبّت ہی سے "اللہ" ہُوا

سیّد احمد حسین

اگلے وقتوں کی دِلّی

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز (حالیؔ)

جمنا کے آس پاس کے اُس علاقے میں جو اراولی کی پہاڑیوں کے انتہائی شمالی سرے کے قریب ہے قدیم زمانے سے کئی بڑے بڑے شہر ایک دوسرے کے بعد بس بس کر اُجڑتے رہے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا شہر اندرپرست تھا جو مہابھارت کی روایت کی رُو سے پانڈوؤں کے سردار یدھشٹر نے آباد کیا تھا۔ اس میدان پر قبضہ جمانے کے لئے بڑی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ یہ شہر عظمت و شوکت میں ہومر اور ورجل کے یونانی شہروں ایلیڈ اور اینیئڈ سے کم نہیں تھا۔

دِلّی بھی اسی علاقے میں مختلف مقامات پر بس بس کر اُجڑتی رہی اور جتنے انقلاب اس نے دیکھے ہیں ہندوستان کے کسی اور شہر نے نہیں دیکھے ہوں گے۔ یہ شہر نہ صرف بڑی بڑی سلطنتوں کی راجدھانی رہا ہے بلکہ اس کے دامن میں کئی تہذیبوں اور تمدنوں نے پرورش پائی جن کے آثار آج تک ہماری آنکھوں کے لئے عبرت کا سرمایہ ہیں۔

فرشتہ لکھتا ہے کہ سب سے پہلے راجہ دِلّو نے اسکندرِ اعظم کے حملے سے پہلے دِلّی کی بُنیاد رکھی تھی۔ لیکن یہ نظریہ قابلِ اعتبار نہیں۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔

اوّل یہ کہ یونانی مؤرخوں نے سکندرِ اعظم کے حملے کے جو حالات لکھے ہیں اُن میں دلّی کا کہیں ذکر نہیں۔ اگر اُس وقت دِلّی آباد ہوتی یا اُسے وہ نمایاں حیثیت حاصل ہوتی جو بعد میں ہوئی تو اس پر سکندر کی نظر ضرور پڑتی یا کم از کم یونانی مؤرخ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مسیح سے تین سَو سال پہلے جو سکندرِ اعظم کے حملے کی تاریخ ہے دِلّی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس کے بعد دُوسری صدی قبلِ مسیح میں یونان و باختر کی متحدہ فوجیں حملہ آور ہوئیں۔ اُن کے تذکروں میں بھی دلّی کا نام کہیں نہیں آتا۔

چینی سیّاح فاہیان اور ہیون سانگ جو پانچویں اور ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آئے اُن کے سفرناموں میں بدھ مت کے مقدس مقامات کا ذکر تو ہے لیکن دِلّی کا نام موجود نہیں۔

اب ذرا آگے چلئے۔ محمود غزنوی نے پہلی دفعہ ایک ہزار عیسوی کے قریب حملہ کیا اور اس کے بعد کئی متواتر حملے کئے۔ اُس کے

حملوں میں قنوج اور متھرا کے ساتھ دِلّی کا ذِکر کہیں نہیں آیا۔

دِلّی کا نام پہلی دفعہ ایک پُرانے منظوم قصّے میں آتا ہے جس میں لکھا ہے کہ آٹھ سو برس تک یہ شہر ویران رہا۔ اس کے بعد دوبارہ آباد ہوا۔ افسوس کہ پچھلے دو تین ہزار سال کی تاریخ ہی نہیں ملتی۔ کتبوں سے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں، اُن کا تعلق زیادہ تر مذہبی اُمور سے ہے۔

تاریخ میں پہلی دفعہ دِلّی کا ذکر راجہ انَنگ پال کے نام کے ساتھ آتا ہے جس نے ۱۰۵۲ء میں یہ شہر آباد کیا۔ دِلّی کی مشہور لوہے کی لاٹ پر بھی یہی تاریخ درج ہے۔ اگر اس منظوم قصّے کی روایت درست مان لی جائے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دِلّی تین سو عیسوی کے قریب آباد ہوئی۔ پھر آٹھ سو سال تک ویران رہی اور انَنگ پال نے اسے نئے سرے سے بسایا۔

انَنگ پال تومار قوم کا راجپوت تھا۔ اُس نے دِلّی کا شہر اُس مقام پر آباد کیا تھا جہاں آج کل قطب مینار ہے۔ اس علاقے کے اردگرد جس پُرانے قلعے کے مٹے ہوئے آثار موجود ہیں وہ انَنگ پال ہی نے بنوایا تھا۔ لوہے کی لاٹ بھی انَنگ پال نے متھرا سے لا کر یہاں نصب کی تھی۔

لاٹ کے متعلق ایک عجیب غلط روایت مشہور ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ ایک برہمن نے راجہ کو خوش کرنے کے لئے یہ افسانہ تراشا کہ لاٹ اتنی گہری چلی گئی ہے کہ "شیش ناگ" کا سر جو دھرتی کو سنبھالے ہوئے ہے اور دُنیا کے انقلابات کا باعث ہے اس سے زخمی ہو گیا ہے۔ اور اب وہ کوئی حرکت نہیں کر سکے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شہر پر ہمیشہ راجہ انَنگ پال کا خاندان حکمران رہے گا اور یہاں کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ راجہ یہ سُن کر بہت خوش ہُوا لیکن اُسے یقین نہ آیا۔ اطمینان حاصل کرنے کے لئے لاٹ کو کھُدوایا تو واقعی اُس کا سرا خُون سے بھرا ہُوا تھا۔ راجہ نے حکم دیا کہ لاٹ کو اُسی مقام پر دوبارہ نصب کر دیا جائے لیکن اُسے برہمن کی بات پر یقین نہ کرنے کی یہ سزا ملی کہ لاٹ پہلی سی مضبوطی کے ساتھ زمین میں نہ جم سکی اور "ڈھیلی" رہ گئی۔ اسی وجہ سے شہر کا نام "دہلی" پڑ گیا۔ یہ روایت اس اعتبار سے بھی ناقابلِ یقین ہے کہ دہلی کا لفظ تومار خاندان سے بہت پہلے کا ہے۔

انَنگ پال کا خاندان سَو سال تک دِلّی پر حکمران رہا۔ اس کے بعد اجمیر کا چوہان راجہ وسال دیو اس شہر پر قابض ہو گیا۔ وسال دیو کا پوتا پرتھوی راج اجمیر اور دہلی دونوں پر حکومت کرتا رہا۔ اُس نے "رائے پتھورا" کے نام سے دوسرا شہر آباد کیا جس کی شکستہ دیواریں قطب مینار کے اِردگرد دُور تک نظر آتی ہیں۔

پرتھوی راج کی مَوت کے ساتھ ہندو دہلی کی تاریخ ختم ہو گئی۔ ہندو دہلی کے تمدّن کی تاریخ نایاب ہے لیکن کم از کم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی کے اخیر میں یہ ہندوؤں کا مشہور ترین شہر تھا۔ اس میں ستائیس کے قریب مندر تھے۔ لوگ امن اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے اور ابتدائی مسلمان حملہ آور بھی اُن کے آرام و آسائش اور مدنی زندگی کی آزادی میں خلل انداز

نہیں ہوتے تھے۔

محمد غوری کے انتقال کے بعد اُس کے غلام قطب الدین ایبک نے دِلّی کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور خاندانِ غلاماں کی بنیاد رکھی۔ دِلّی کی پُرانی جامع مسجد "قوت الاسلام" کی تعمیر فتح دہلی کے بعد ہی شروع ہوگئی تھی۔ قطب مینار اسی عظیم الشان مسجد کا ایک مینار ہے جس پر سے اذان دی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ مسلمانوں کے فنِ تعمیر کی یادگار ہے لیکن اس کی مغربی دیواروں اور بعض دُوسرے حصّوں پر باریک نقاشی ہندو فنِ تعمیر کی یاد دلاتی ہے۔ ابن بطوطہ نے جو سلطان محمد تغلق کے زمانے میں دلی آیا اس مسجد کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ مسجد اس قدر وسیع و خوبصورت اور اس کا مینار اس قدر عظیم الشان ہے کہ اسلامی دُنیا میں ان کی نظیر نہیں، امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے قران السعدین میں بادشاہ کے ذکر کے ساتھ اس مسجد کا ذکر یوں کیا ہے ؎

مسجدِ اُو جامعِ فیضِ اِلٰہ زمزمۂ خطبۂ او تا بماہ

خاندانِ غلاماں کے بادشاہ خود عالم و فاضل اور علماء و فضلاء کے قدر دان تھے۔ اُن کے زمانے میں علُوم و فنون نے بہت ترقی کی۔ التمش عدل و انصاف کے ساتھ علم و فضل کی دولت سے بھی مالا مال تھا۔ بلبن کے متعلق بھی یہی لکھا گیا ہے۔ بلبن کا بڑا لڑکا خان شہید جو ولی عہد اور سندھ کا گورنر تھا عالم اور سخن فہم تھا۔ اہلِ علم کی بہت قدر کیا کرتا تھا۔ اس زمانے کے مشہور فقیہ اور صُوفی سلطان نظام الدین اولیاء کے مریدِ خاص امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی کے علاوہ اور بہت سے علماء اس کی ملازمت میں تھے۔ امیر خسرو کے شعر اب بھی تر و تازہ ہیں اور اُس زمانے کی یادگار ہیں ؎

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

اس زمانے کے ایک اور عالم و فاضل اور خدا رسیدہ بزرگ قطب الدین بختیار کاکی تھے۔ ایک دفعہ قوال شیخ احمد جام زندہ پیل کا یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

کہ وجد کی حالت میں آپ کا وصال ہوگیا۔ سُلطان شمس الدین التمش نے بھی اسی سال وفات پائی۔

التمش سے سلطان علاء الدین خلجی تک کا وہ زمانہ تھا کہ مغلوں کے لشکر تمام ایشیا اور یورپ کے مشرقی حصّوں کو تہ و بالا کر رہے تھے، ان بادشاہوں نے مغلوں کے پے در پے حملوں کا مقابلہ کیا۔ حملہ آوروں کی روک تھام کی مشکلات کے باوجود اس عہد میں علم و فضل کی جو قدر ہوئی وہ قابلِ تعریف ہے۔

علاء الدین خلجی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے سیری کے مقام پر فوجیں رکھا کرتا تھا۔ جب مغل واپس چلے گئے تو پُرانے شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھ کر اُس نے اس جگہ تیسرا شہر آباد کیا۔

غیاث الدین تغلق نے مشرق کی طرف چار میل کے فاصلے پر ایک نیا دارالخلافہ تغلق آباد کے نام سے بنایا۔ یہ دلی کا چوتھا شہر تھا۔ اس کے کھنڈر بھی اب تک موجود ہیں۔ شاہی خزانے اور محل یہیں تھے۔ اس نئے شہر میں بادشاہ نے ایک عالیشان محل تعمیر کرایا تھا جس کی اینٹوں پر سونا چڑھا ہوا تھا۔ جب اس پر سورج کی شعاعیں پڑتیں تو کوئی اس کی طرف آنکھ جما کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

تغلق خاندان کے دوسرے بادشاہ محمد تغلق نے علاء الدین کے زمانے سے پہلے کی دلی اور سیری کے اردگرد ایک فصیل کھینچ کر دونوں شہروں کو ملادیا اور اس پانچویں شہر کا نام جہاں پناہ رکھا۔ اس شہر میں ایک ہزار مدرسے، دو ہزار مسجدیں اور ستر ہسپتال تھے۔ شہر کے باہر دو میل لمبا اور ایک میل چوڑا حوض تھا جس کا نام "حوض شمسی" تھا۔ اس کے علاوہ چالیس گنبدوں والا ایک "حوض خاص" تھا جہاں اہل طرب کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور اسی نسبت سے اسے "طرب آباد" بھی کہتے تھے۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ محمد تغلق کے زمانے میں دلی آیا۔ بادشاہ نے اُسے شہر کا قاضی بنا دیا اور وہ نو سال تک وہیں رہا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں "شہر" کی خوبصورتی، پائداری اور فراخی کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی فصیل جس کی کوٹھڑیوں میں غلے کے کھتے یا انبار محفوظ رہتے ہیں بے نظیر ہے۔ شہر کے اٹھائیس دروازوں میں سے بعض مشہور یہ تھے:-

(۱) "بداؤں دروازہ" (۲) "مندوی دروازہ" (۳) "گل دروازہ" (۴) "کمال دروازہ" (۵) "غزنی دروازہ"۔

محمد تغلق کے زمانے کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ اُس نے اپنی رعایا کو دلی چھوڑ کر دولت آباد جانے پر مجبور کیا یہاں تک کہ شہر بالکل ویران ہوگیا۔ اور پھر دوسرے شہروں سے لوگوں کو لاکر وہاں آباد کرنا پڑا۔

محمد تغلق عربی اور فارسی کا ماہر اور فصیح وشیریں بیان مقرر تھا۔ شاعر اور خوش نویس بھی تھا۔ تاریخ، طب، حکمت، نجوم، ریاضی اور منطق میں مہارت حاصل تھی۔ ضروری تھا کہ جو بادشاہ اتنے علوم و فنون جانتا ہو وہ دوسرے عالموں اور فاضلوں کی بھی قدر کرے چنانچہ بادشاہ کے ساتھ خاص دسترخوان پر دونوں وقت دو سو عالم اور فاضل کھانا کھایا کرتے تھے اور اس وقت علمی گفت گو ہوتی تھی۔

اُس نے نہ صرف دلی کے علما کو اپنی سخاوت سے مالا مال کیا بلکہ دوسرے ممالک کے فضلا کی ہمت افزائی بھی کیا کرتا تھا۔ شمس الدین اندگانی حکیم اور شاعر کو، ۲۷ شعروں کے قصیدے کے صلے میں ہر بیت کے عوض ہزار دینار کے حساب سے انعام دیا۔ عبدالعزیز اردبیلی فقیہ اور محدث کو سونے کی تھالی میں دو ہزار اشرفیاں پیش کیں۔ خواجہ حافظ کے ہم عصر قاضی مجدالدین کو شیراز میں دس ہزار روپیہ بھیجا اور جب اُسے معلوم ہوا کہ بُرہان الدین واعظ کو قرض لے کر سخاوت کرنے کی عادت ہے تو اسے اپنے وطن میں چالیس ہزار دینار بھیجے اور ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ اُنھوں نے اس رقم سے قرض ادا کردیا اور ہندوستان نہ آئے۔

فیروز شاہ تغلق نے سری کے شمال مشرق کی طرف اپنا نیا دارالخلافہ فیروز آباد کے نام سے بنوایا۔ یہ گویا چھٹی دلی تھی۔

محمود تغلق کے زمانے میں امیر تیمور نے حملہ کیا۔ اگرچہ محمود نے شکست کے بعد سلطنت کا کچھ حصہ دوبارہ حاصل کرلیا لیکن چودہ

برس کے بعد اُس کا انتقال ہوگیا۔ پندرھویں صدی کے وسط تک خاندانِ سادات نے حکومت کی جس کے بعد لودھی خاندا
نے آگرہ کو دارالخلافہ بنالیا۔

ہمایوں نے پھر دہلی کو دارالخلافہ بنایا اور پرانا قلعہ تعمیر کیا۔ ہمایوں شعروسخن کا دلدادہ تھا اُس کے دربار کے فارسی شاعروا
میں یہ نام قابلِ ذکر ہیں:۔ جذبی بدخشانی، مُلا حیرتی، نادری سمرقندی الشیخ ابوالواحد فارغی اور حیدر تونیائی۔

شیر شاہ سُوری نے ہمایوں کو شکست دے کر فیروز آباد کے مقام پر از سرِ نو دِلّی تعمیر کی اور اس کے گرد ایک فصیل کھنچوائی۔
دِلّی کا ساتواں شہر تھا۔ شیر شاہ کے عہد میں اس نے بہت ترقی کی۔ نئے باغوں اور سڑکوں سے اس کی رونق کو چار چاند لگ گئے
ڈاکوؤں اور لٹیروں سے محفوظ ہوگیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں دِلّی کے امن وامان کی یہ حالت تھی کہ اگر سڑک پر کوئی چیز
نظر آتی تو کسی کو اُسے بُری نیت سے دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ شیر شاہ نے بہت سی سماجی اصلاحیں بھی کیں۔

ہمایوں نے دِلّی پر دوبارہ قبضہ کیا تو چھ مہینے کے بعد اُس کا انتقال ہوگیا۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں دارالخلافہ یا آگرہ
یا لاہور۔ اس لئے دلّی کی اگلی سی حالت نہ رہی۔

آخری اور آٹھویں مرتبہ شاہ جہان نے ۱۶۳۸ء اور ۱۶۵۸ء کے درمیان فیروز شاہ اور شیر شاہ کے شہروں کے کھنڈرو
موجودہ دلی بنائی اور اس کا نام شاہ جہان آباد رکھا۔

برنیر لکھتا ہے کہ شاہ جہان آباد جمنا کے دائیں کنارے ہلال کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ فصیل کا دَور چھ سات میل کے قریب
تھا۔ دروازوں کے باہر اُمراء کے لئے بہت سے باغات اور عشرت گاہیں تھیں۔ شاہی محل اگر دُنیا بھر میں نہیں تو مشرق میں
اپنی نظیر آپ تھا۔ فنونِ لطیفہ اور صنعت وحرفت کا بازار اس قدر گرم تھا کہ کارواں سرائیں ہمیشہ سوداگروں سے آباد رہتی تھیں
مصوّروں اور کاریگروں کی حوصلہ افزائی جی کھول کر کی جاتی تھی۔

اُمراء نے بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق وسیع اور عالیشان مکانات بنوائے۔ ان میں قمرالدین خاں، علی مردان خاں، غازی
خاں اور صفدر جنگ کی حویلیاں بہت مشہور تھیں۔ حویلیوں میں اصطبل، حمام، باغ اور محل سرائیں بھی شامل تھیں۔ دو سڑکیں بہت
عمدہ تھیں۔ ایک قلعے سے دہلی دروازے کو جاتی تھی جس میں فیض بازار اور نہر تھی۔ دُوسری قلعے سے لاہوری دروازے
جاتی تھی۔ جس میں چاندنی چوک اور کھاری باؤلی ہے۔ چاندنی چوک جس میں بارہا خُون کی ندیاں بہ چکی ہیں، دُنیا کے پُررونق
اور سب سے قیمتی بازاروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ شاہ جہان نے ڈیڑھ کروڑ روپے کے صرفِ کثیر سے ایک شالامار باغ بھی بنوایا
تھا مگر اب اُس کا کوئی نشان باقی نہیں۔

لال قلعے کی تعمیر شاہ جہان کی حکومت کے پہلے دس سالوں کے درمیان ہوئی۔ اس کی عمارت میں دیوانِ عام اور دیوانِ

خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔ دیوانِ عام کا طرزِ تعمیر ہندوانہ ہے۔ یہ عمارت سرخ پتھر کے ساٹھ ستونوں پر کھڑی ہے تختِ طاؤس جسے نادر شاہ ایران لے گیا تھا اسی ایوان کی کھلی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ فرانسیسی جوہری ٹیورینیر جس نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا، لکھتا ہے کہ یہ عظیم الشان تخت بیس یا پچیس انچ بلند چار سنہری پایوں پر کھڑا تھا۔ تخت کے اوپر "چھتر" کے نیچے بارہ ستون تھے۔ تخت لعلوں، زمردوں اور موتیوں سے جڑا ہوا تھا اور اس کی لاگت کا اندازہ ساٹھ لاکھ پونڈ تھا۔ دیوانِ خاص میں سنگِ مرمر پر نقاشی مغل آرٹ کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔

قلعے کے دو سال بعد جامع مسجد کی تعمیر ہوئی۔ اُردو یعنی ہندوستانی زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر کے ملاپ کی یادگار ہے، اسی کی سیڑھیوں پر پھلی پھولی اور یہی سیڑھیاں اس زبان کے بچپن کا گہوارہ تھیں۔

یہ ہے دلی جس نے سات سو سال میں نصف درجن سے زیادہ انقلابات دیکھے جس کی عظیم الشان شاہی عمارتیں جس کے کھنڈر ہندوؤں اور مسلمانوں کی عظمت کا افسانہ سُنا رہے ہیں اور جس کی خاک میں علم و فن، فضل و حکمت اور فقر و شاہی کے وہ گوہر نایاب پوشیدہ ہیں جن کی آب و تاب اب بھی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی ہے، یہ ہے دلی! جس کا آغاز "شمشیر و سناں" سے اور جس کا انجام "طاؤس و رباب" پر ہوا۔ علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

حفیظ ہوشیارپوری (بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

اُردو

سب زبانوں سے رسیلی ہے زبانِ اُردو
ہند کی ساری زبانوں کی ہے سالار اُردو

سادہ و دلکش و شیریں ہے بیانِ اُردو
کسی عنواں سے بھی دیکھو تو ہے سردار اُردو

اس میں کچھ مذہب و ملت کی نہیں ہے تخصیص
مصری و شامی و رومی کو بھی آساں ہے یہ

عام ہے سب کے لئے لذتِ خوانِ اُردو
ہند والوں کی تو بے شبہ ہے غمخوار اُردو

غلام یٰسین (لدھیانہ)

اُمید

اُمید ہے اِس طرح سے دل میں — جس طرح کہ دانہ آب و گل میں
بیضے میں خلش ہے جیسے جاں کی — پنجرے میں محبت آشیاں کی
خفتہ ہے رباب میں ترنّم — سوئے ہوئے طفل کا تبسّم
دریا کی تڑپ میں عکسِ مہتاب — مستقبلِ زرنگار کا خواب
جس طرح کہ ناشگفتہ کلیاں — سینے میں چھپائیں رنگ رلیاں
دریا میں صدف گہر در آغوش — تاریکیِ شب سحر در آغوش
ویرانے میں جس طرح خزانہ — یا تاک میں بادۂ مغانہ
اُمید میں اس طرح اثر ہے — جس طرح کہ سنگ میں شرر ہے
ظلمات میں رہبری خضر کی — تنویر ہے دُور رس نظر کی
ہے ہجر میں وصل کا اشارہ — طوفاں میں بن گئی کنارہ
تلخی میں بھی تیرا انگبیں سے — دوزخ میں بھی خلد آفریں سے
دل کیسے ہو بے اُمید کوئی — ہر قفل کی ہے کلید کوئی
ہے مہرِ ازل کا نُور تجھ میں — رحمت ہی کا ہے ظہور تجھ میں

آغاز ہے تجھ سے انتہا رس
انسان تجھی سے ہے خُدا رس

عبدالحکیم

گُلنار

شنبہ کی رات کو "دیارِ اخضر" میں معمول سے زیادہ ہماہمی تھی۔ غلام اور خواجہ سرا اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ امیر زید بن عاصم کی نشستگاہ فانوسوں اور قندیلوں کی روشنی میں بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ دیواروں کے ساتھ شیروں کی کھالیں اور ہرنوں کے سینگ لٹک رہے تھے۔ فرش پر بیش قیمت ایرانی قالین بچھے تھے۔ پیتل کی تکونی کٹوریوں میں لوبان اور عود کے جلنے سے فضا فرحت انگیز خوشبو میں بس گئی تھی۔ رومی وضع کے تکیے جن کے غلاف زرد اطلس کے تھے اور سروں پر ریشمی ڈوریاں لٹک رہی تھیں وسط میں رکھے تھے اور ان سے ٹیک لگا کر تین معزز عرب بیٹھے تھے، دائیں طرف صاحبِ خانہ زید بن عاصم جو خلیفہ ہارون الرشید کا منظورِ نظر درباری تھا بڑی تمکنت سے بیٹھا اپنے قابلِ احترام مہمانوں حصیر بن سنان اور ابو احمر کے ساتھ مشغولِ گفتگو تھا۔ یہ دونوں اصحاب بھی اپنے میزبان کی طرح خلیفہ کے خلوتیانِ راز میں سے تھے۔

حصیر زید کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا "جب تمہارے مالِ غنیمت سے لدے ہوئے اُونٹ یہاں پہنچے تو امیر المومنین انہیں دیکھ کر عش عش کر اُٹھے۔ بھرے دربار میں تمہاری جوانمردی کی بے حد تعریف کی اور فرمایا زید ہی تھا جس نے ایرانیوں کی یہ خوفناک بغاوت فرو کی اور مفسدوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔

ابو احمر کہنے لگا" اور یہ بھی کہا کہ ایسے نادر تحائف بھیجنے کے لئے ہم اس کے غایت درجہ ممنون ہیں"۔

یہ سُن کر زید کا چہرہ مسرت سے چمک اُٹھا۔ اس نے ہنسی کو بمشکل ضبط کر کے جواب دیا" یہ امیر المومنین کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں نے تو صرف اپنا فرضِ منصبی ادا کیا تھا۔ باغی بڑے سازوسامان کے ساتھ میدانِ جنگ میں آئے تھے۔ ہندوستان، روم، چین اور مصر سے جو ایرانی سوداگر تجارت کا مال لا رہے تھے قافلوں کو چھوڑ چھوڑ کر اپنے ہموطن غداروں کے ساتھ مل گئے یہی وجہ ہے کہ فتح کے بعد ہمیں بعض بیش بہا اشیا لُوٹ میں حاصل ہوئیں۔ چینی حریر کے گٹھے مصر کے طلائی منقش گلدان، روم کے نفیس قالین، ہندوستان کی زرنگار چادریں اور ایران کی گلبدن لونڈیاں ہماری جفاکوشی کا بہترین معاوضہ تھیں"۔

حصیر نے کہا" مگر تمہارے لئے ان سب سے کہیں زیادہ قابلِ قدر امیر المومنین کا انعام تھا۔ اُنہوں نے شاداب چمنستان سے گھرا ہُوا یہ عالیشان محل "دیارِ اخضر" تمہیں بخش دیا"۔

ابو احمر نے اپنے دوست کی تائید میں کہا" بیشک بیشک، یہ عنایت خسروانہ کا بہترین نمونہ ہے اور زید ہر طرح سے اس کے مستحق ہیں"۔

اتنے میں غلاموں نے دسترخوان بچھا کر مختلف قسم کے پرتکلف کھانے چُنے اور ساتھ ہی انگور سیب خوبانیاں اور سردے کی قاشیں نقرئی طشتریوں میں لگا کر پیش کیں۔ مہمانوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ ابو احمر اپنی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا "زید آج بادۂ ناب کا ساغر بھی ملے جو ایران کے تہ خانوں سے لائے ہو۔"

زید نے مسکرا کر تالی بجائی۔

دائیں طرف کے دروازے سے ایک سرخپوش حسینہ جس کے گلابی رُخساروں سے شراب کے قطرے ٹپکتے تھے ہاتھ میں بلّوریں صُراحی لیئے ہوئے عجیب دلفریب انداز سے اندر داخل ہوئی۔ زید کے اشارے پر اس نے ساغر میں شراب انڈیلی، اور شانِ دلبری سے جھک کر ابو احمر کو پیش کی۔ ابو احمر پیالے میں عارضِ گلگوں کی لپک دیکھ کر تڑپ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ساغر لے لیا اور اپنے نازک بدن ساقی کی طرف دیکھتے ہوئے ایک سانس میں پی گیا۔ پھر زید کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"واللہ اس سے پیشتر ابو احمر ابو احمر نہیں تھا۔"

حصیر اور زید کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ حصیر نے پوچھا "زید یہ ستارہ کہاں سے توڑ لائے اس میں ابھی تک شفق کی سُرخی جھلک رہی ہے۔"

زید نے کہا "جب باغی شکست کھا کر بھاگے اور ہم نے بڑھ کر اُن کی فرودگاہ پر قبضہ کیا تو میں نے ایک خیمے میں اسے چھپے ہوئے دیکھا۔ گرفتار کر کے ساتھ لے آیا ساقی کا کام بس اس پر ختم ہے۔ تم نے ابھی میرے ایرانی غلام کو نہیں دیکھا، وہ ایک باکمال مغنّی ہے۔"

حصیر نے اشتیاق سے کہا "تو پھر کیا چاہیئے ابھی اسے بلواؤ۔"

ابو احمر کنیز کے سراپا پر نگاہ دوڑا کر بول اُٹھا "ہاں ہاں۔ ایسے ملک فریب ساقی کے ساتھ مطرب ہو تو پھر نہیں کے ہو رہیں۔"

زید نے آواز دی "ہرمزان"

غلام گردش کا دروازہ کھلا اور ایک بلند بالا نوجوان نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ زرد اور اُداس تھا اس کی اُونچی ناک اور بلند پیشانی سے طبعی غرور کی علامات نمایاں تھیں جن کو چھپانے کے لئے وہ عجز آلود نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

زید نے حکم دیا "اپنا ساز لے آؤ"

تھوڑی دیر کے بعد ہرمزان ساز پکڑے ہوئے اندر داخل ہوا۔ ساز کی شکل حرف "ق" کی سی تھی اس کے شکم میں پندرہ تار لگے ہوئے تھے اور سرے پر عورت کا مجسمہ اس نزاکتِ فن سے تراشا گیا تھا کہ ساز کے تار اس کے سر کے بکھرے ہوئے بال معلوم ہوتے تھے۔

حصیر نے حیرت سے دیکھ کر پوچھا "یہ ساز تم نے کہاں سے لیا۔ میں نے اس شکل کا ساز کبھی کسی مطرب کے پاس نہیں دیکھا۔"

ہرمزان کی نیلی عنابی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ اس نے نیچے دیکھ کر آہستہ سے کہا "میرے والد نے اسے ایک چینی سوداگر سے خریدا تھا۔"

ابواحمر نے کہا "اور بجانا کس سے سیکھا۔ یہاں تو اسحق اور رضریاب بھی اسے دیکھ کر گھبرا جائیں!"

ہرمزان نے جواب دیا "میں پہلے چارتاروں والا بربط بجایا کرتا تھا اس کا ماہر کوئی نہ ملا تو خود ہی اس پر مشق کرنے لگا اور کچھ عرصے کے بعد چند راگنیاں نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔"

حصیر نے بے صبری سے کہا "اچھا اب شروع کرو۔"

ابواحمر نے آواز دی "الا یا ایہا الساقی"

کنیز مئے گلفام کے ساغر پیش کرنے لگی ہرمزان نے ساز کو اپنے زانو پر رکھا۔ زید کے مہمانوں نے بڑی حیرت سے ہرمزان کے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھا اس کی انگلیوں کے ناخن بڑھے ہوئے تھے اور انہیں کاٹ کر نکیلا کر دیا گیا تھا۔

"یہ وحشیوں کی طرح ناخن کیوں بڑھا رکھے ہیں۔"

زید نے متبسم ہوکر جواب دیا "یہ انہی ناخنوں سے ساز کو بجاتا ہے"

ہرمزان نے بجانا شروع کیا۔ ساز کی آواز نہایت لطیف تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہرمزان سمندر کی تہ میں بیٹھا ہوا ہے اور راگ پانی کی لہروں سے چھن چھن کر کانوں تک پہنچ رہے ہیں۔ وہ دیر تک سر جھکائے مختلف سُر نکالتا رہا۔ آخر ایک لمبا سانس لے کر ساز کو ہاتھ سے رکھ دیا۔ حصیر اور ابواحمر نے آفرین کہی۔ ہرمزان تعظیم دے کر باہر چلا گیا۔ کنیز بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ زید نے فخر کے انداز سے پوچھا۔

"کہو حصیر لطف آیا؟"

حصیر نے جواب دیا "واقعی کمال کر دیا۔ مگر زید اس کی شکل عجیب پُراسرار ہے۔"

زید ہنس پڑا اور طنزاً کہنے لگا "تم بھی عورتوں کی طرح توہم پرست واقع ہوئے ہو۔ میری بیوی ام عذرا بھی کہتی تھی کہ زرد رنگ اور گھنے ابروؤں سے یہ ساحر معلوم ہوتا ہے۔"

حصیر نے اطمینان سے کہا "وہ سچ کہتی ہیں۔ تمہاری حراست میں آنے سے پہلے یہ کس حیثیت کا آدمی تھا؟"

زید نے جواب دیا "یہ ایک بڑے دہقان کا بیٹا ہے۔ ان کا سارا خاندان بڑے کروفر سے لڑائی میں شامل ہوا۔ اس کا بوڑھا باپ بڑی شجاعت سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ باغیوں کو شکست ہوئی تو سب بھاگ اٹھے مگر یہ زخموں سے چور چور آخری وقت تک مقابلہ کرتا رہا اور گرفتار کر لیا گیا۔"

ابو احمر اپنی دُھن میں بیٹھا اُونگھ رہا تھا سر اُٹھا کر کہنے لگا "تمہاری ایرانی شراب کا بہت شہرہ سُنا تھا پے بہ پے کئی جام چڑھائے سُرور نہ آیا وہ تو کچھ ساقی کی نرگس شہلا تھی جس نے طبیعت کو سبک سار کر دیا۔"

حصیر نے مسکرا کر کہا "اچھا اُٹھو اب چلیں رات زیادہ چلی گئی ہے گھر جا کر دل کی حسرت نکال لینا۔"

وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ابو احمر بھی اس کا ہاتھ تھام کر اُٹھا دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ زید کہنے لگا "کہیں بدمستی میں لڑکھڑاتے نہ پھرو۔ میری تو عجیب حالت ہو گئی ہے۔"

"توبہ توبہ" ابو احمر نے تمسخر کے انداز سے کہا اور دونوں باہر نکل گئے۔

(۲)

مہمان رخصت ہو گئے تو زید کھوئی ہوئی حالت میں تکیہ سے لگ کر بیٹھ گیا اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور نتھنے پھُولے ہوئے تھے۔ کروٹ بدل کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور اپنے آپ کو تنہا محسوس کر کے زور سے آواز دی "لیلے!"

"لبیک" کی کمزور آواز کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی خشمگیں صورت والی عرب عورت داخل ہوئی۔

زید نے بغیر اس کی طرف دیکھے حکم دیا "گلنار کو بھیج دو" لیلے نے ایک لمحہ کے لئے ذومعنی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور واپس چلی گئی۔ وہ دیر تک اپنی جگہ لیٹا رہا۔ یکلخت اس کی نگاہ سامنے اُٹھی۔

اس نے چونک کر کہا "گلنار"

ایرانی کنیز شمعوں کی روشنی میں ساکت و صامت کھڑی ہوئی ایک آسمانی روح معلوم ہوتی تھی جو انسان کی قسمت میں شریک ہونے کے لئے زمین پر اُتر آئی ہو۔ اس کے چہرے پر روحانی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

"کیا حکم ہے؟" ایسا معلوم ہوا جیسے یہ الفاظ بغیر لب ہلائے اس کے مُنہ سے نکل گئے۔

زید سنبھل کر اپنی جگہ بیٹھ گیا اور کچھ عرصہ تک آرزو اور شوق کی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے یکبارگی اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور اندرونی جوش و اضطراب سے کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "گلنار! تم ایک پُراسرار عورت ہو۔ میں نے بڑا زمانہ دیکھا ہے۔ یہ باہیں بڑے بڑے مغرور حسینوں کی گردن میں حمائل ہوئی ہیں، میری جوانی عیش و عشرت کے ہنگامے میں گزری ہے مگر اس سے پہلے میں کبھی تم جیسی سحر عورت سے دوچار نہیں ہوا۔ تم نے انتہائی بے رحمی و بیدردی سے میری تمناؤں کو پامال کر دیا نفرت اور حقارت سے ٹھکرا دیا پھر بھی حیرت ہے کہ میں تمہیں دیکھتے ہی اپنی رگوں میں عنفوانِ شباب کی سرخوشی محسوس کرتا ہوں۔ تمہاری بے رُخی پر بجائے غصہ کے مجھے اور زیادہ پیار آتا ہے۔ شاید تم اپنی قدر و منزلت بڑھانے کے لئے مجھ سے کنارہ کشی کر رہی ہو۔ اگر یہ بات ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ساری عمر ان نشیلی آنکھوں کی پرستش کے لئے وقف کر دوں گا۔"

"..........."

زید اپنی باتوں کا جواب نہ پاکر اُٹھ کھڑا ہوا اور اشتیاق آمیز نگاہوں سے گلنار کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنی جگہ بےحس و حرکت کھڑی ہوئی تھی۔ زید بے صبر ہو کر آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ اس مجسمۂ مرمریں میں جنبش ہوئی۔

"پیچھے ہٹ جاؤ" نسوانی آواز کی موسیقی غضب آلود لہجہ میں بھنچ کر رہ گئی۔ زید نامحسوس طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، ان میں وحشیانہ جذبات کی جھلک تھی اور وہ غرور حسن سے ساری کائنات پر چھا جانا چاہتی تھیں۔

زید نے غصہ کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں حیران ہوں کہ تم سے کیا سلوک کروں۔ تم سے زیادہ مجھے اپنی بےبسی پر غصہ آتا ہے جب میں تمہیں کسی حقیر خدمت پر مامور کرتا ہوں تو تم خوش بخوشی اسے انجام دیتی ہو اور جب تمہارے سامنے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہوں تو تم شہزادیوں کی طرح مجھے اپنا غلام سمجھ کر دھتکار دیتی ہو۔ بہر حال میں انتظار کروں گا۔ میری محبت تمہارا دل کو موم کر کے رہے گی۔"

گلنار بے اختیار کہہ اُٹھی "محبت! جب تم جیسے نفس پرست اپنی ناپاک خواہشات میں کامیاب نہیں ہو سکتے تو اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کرنے کے لئے انہیں محبت کا نام دے دیتے ہیں۔ کتنی سادہ لوح عورتیں ہوتی ہیں جو اس مظلومیت میں بہیمیت اور اس سکینی میں درندگی کو نہیں دیکھ سکتیں۔" اس کا تمسخر آمیز انداز گفتگو نشتر کی طرح تیز تھا۔

زید کا غصہ عود کر آیا۔ اس نے بلند آواز سے کہا "خوب! میں مظلوم اور مسکین بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو تمہیں ظالم اور جابر بھی بن کے دکھا سکتا ہوں۔"

گلنار کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس نے مسکرا کر ایک چمکتا ہوا چھوٹا سا خنجر کمر بند سے نکالا اور اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"زید تم نے سچ کہا تھا تم مجھے نہیں سمجھ سکے۔ یاد رکھو جس دن تم نے مجھے سمجھنے کی کوشش کی وہ میرا آخری دن ہوگا۔ میں آخری بار کہے دیتی ہوں مجھے تم سے اور تمہاری قوم سے سخت نفرت ہے۔ تمہارے ہاتھ میرے خویش و اقارب کے خون سے آلودہ ہیں۔ مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ تم سے بات بھی کروں۔"

یہ کہہ کر گلنار نے خنجر کو کمر میں چھپایا، باوقار انداز سے دروازے کی طرف بڑھی، کواڑ کھولا اور باہر نکل گئی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ثریا کی لڑیاں بلوط کے درخت پر چمک رہی تھیں۔ گلنار دوسرے کمرے میں داخل ہونے لگی تو اس نے ایک لمبے سائے کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔

"کون؟"

"ہرمزان"

"کیا ہے؟"

"میں باہر کھڑا تمہاری باتیں سن رہا تھا"

"تو؟"

"مرحبا!"

سایہ ایک طرف ہٹ گیا اور گلنار جھپٹ کر اندر چلی گئی۔

(۳)

سہ پہر کا وقت تھا۔ زیتون کے ایک گنجان درخت کے نیچے مسند آراستہ تھی اور اس پر عذرا عنابی ریشم کا چار شف اوڑھے بیٹھی تھی۔ سر پر دمشق کی نرم ململ کا سیاہ رومال باندھا ہوا تھا۔ گھنیری تابدار زلفیں کانوں کے پیچھے ہو کر شانوں پر پڑی تھیں۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی، گول چہرہ، آنکھیں بڑی بڑی اور گہری سیاہ جن کی لمبی پلکوں کا سایہ آتشیں رخساروں کی لپک میں غائب ہو گیا تھا۔

سامنے ایک لڑکی اپنی پھٹی ہوئی عبا کو سنبھال کر ادب سے دو زانو بیٹھی کہہ رہی تھی۔

"آج پھر میرا باپ اور بھائی شہر سے باقی ماندہ سامان لانے کے لئے گئے ہیں۔ بکریاں جب ہی ساتھ لے آئے تھے کسی دن کشتی کو بھی ادھر کھے لائیں گے۔"

عذرا نے کہا "ہمارے ہاں ملازمت کرنے کے بعد تمہیں ملاحی کی کیا ضرورت ہے۔ یوں بھی اس طرف لوگوں کا رجحان نہیں ہوا۔ دریا کے رستے بہت کم سوداگر ادھر آتے ہیں۔"

لڑکی نے اطمینان سے کہا "والد کہتے تھے کہ موصل اور دیارِ بکر سے آنے والے قافلوں کے لئے ادھر کا رستہ بہت نزدیک ہے۔ جب تاجروں کو "دیار اخضر" کے آباد ہونے کی خبر ہوئی تو وہ یہیں سے گزرا کریں گے۔ قافلوں کے مالک عموماً امیر کبیر ہوتے ہیں اس لئے خوب فراخدلی سے انعام دیں گے۔"

عذرا جواب دینا چاہتی تھی کہ سامنے دیکھ کر چپ ہو رہی تھی۔ اس کا عم زاد بھائی حمزہ بن قیس ان کی طرف آ رہا تھا نزدیک آیا تو عذرا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا جس سے اس کے چہرے کی خشونت اور درشتی زیادہ نمایاں ہو گئی اسے دیکھ کر لڑکی نے نقاب لے وڑھ لیا اور اٹھ کر ایک طرف چلی گئی۔

حمزہ آتے ہی قالین پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "عذرا یہاں تنہا بیٹھ کر اس گنوار لڑکی سے باتیں کرنے میں تمہیں کیا لطف آتا ہے۔ میں دوپہر کو شہر سے آیا تھا پہلے اندر بیٹھا تمہارا انتظار کرتا رہا جب تمہیں کہیں نہ دیکھا تو پوچھتا ہوا ادھر نکل آیا۔"

عذرا نے بائیں جانب انجیر کی جھرمٹ میں دیکھتے ہوئے کہا "لونڈیوں کی چیخ پکار سے طبیعت بیزار ہو گئی تھی اس لئے یہاں آ بیٹھی

ہاں تمہاری فوج کس دن روانہ ہوگی ؟"

حمزہ نے امعانِ نظر سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "کیا تمہارا منشا یہ ہے کہ میں جلد از جلد یہاں سے چلا جاؤں"؟

عذرا نے جلدی سے جواب دیا "حمزہ تم کبھی میری باتوں کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے"۔

حمزہ نے سنجیدگی کے لہجہ میں آہستہ سے کہا "میں کہتا ہوں کہ شاید ہی کبھی ایسا کرنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو"۔

عذرا نے اس کا جواب دیئے بغیر ادھر اُدھر دیکھا اور آواز دی "لیلےٰ! گلنار!! کہاں غائب ہوگئیں مجھے پیاس لگی ہے"۔

گلنار ایک بڑی جھاڑی کے پیچھے سے نمودار ہوئی مگر پھر غائب ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں وہ ایک نیلگوں پیالہ لئے ہوئے آئی۔ نزدیک پہنچی تو حمزہ نے اُٹھ کر پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اتنے میں ہرمزان سامنے سے مٹی کا ایک آبخورہ اُٹھائے ہوئے قریب آیا۔ اس کا جبّہ گرد آلود ہو رہا تھا شاید کدال چھوڑ کر آیا تھا۔ حمزہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر پانی کا پیالہ عذرا کو پیش کیا۔ ہرمزان یہ دیکھ کر وہیں رُک گیا۔

عذرا کہنے لگی "حمزہ یہ پانی گرم ہوگا۔ ہرمزان ادھر آؤ آبخورہ مجھے دو"۔

ایک ہی لمحہ میں دو چہروں پر انقباض اور انبساط کے آثار نمایاں ہو گئے جب ہرمزان نے جھک کر آبخورہ عذرا کے ہاتھ میں دیا تو حمزہ نے اپنا پیالہ زور سے ایک طرف پٹخ دیا۔

عذرا اطمینان سے پانی پی کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور قصر کی جانب چلی گئی۔ حمزہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ گلنار انہیں جاتے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اس نے ہرمزان کے لئے پیچھے مڑ کر دیکھا مگر وہ جا چکا تھا۔

(۴)

اُن کے جانے کے بعد دھوپ پیلی پڑ گئی کھجوروں کے سائے بڑھتے بڑھتے اُفق سے جا ملے۔ سورج نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ دیکھتے دیکھتے شفق کی سُرخی سیاہی میں تبدیل ہوگئی۔ آسمان پر ہر طرف ستارے نکل آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سورج کی کرنیں ذوقِ خود نمائی سے اس کا پیچھا چھوڑ کر لاکھوں ستاروں میں منقسم ہوگئی ہیں۔

حمزہ شام سے پہلے ہی شہر چلا گیا تھا۔ عذرا کھانے سے فارغ ہو کر دیر تک ماں کے پاس بیٹھی خاموشی سے اس کی باتیں سُنتی رہی پھر برداشتہ خاطر سی ہو کر اُٹھی اور اپنی خوابگاہ میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد لیلےٰ اور گلنار بھی شمعدان اُٹھائے ہوئے اندر آگئیں۔ گلنار چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گئی مگر لیلےٰ نے عذرا کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا "آج حضور کی طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے"۔

عذرا نے افسردگی کے انداز سے مسکرا کر کہا "نہیں لیلیٰ اچھی ہوں آج بدن دبانے کی ضرورت نہیں، تم سو جاؤ"۔

لیلےٰ اور گلنار دن بھر دوڑ دوڑ کر تھکی ہوئی تھیں لیٹتے ہی خراٹے لینے لگیں۔ عذرا ٹھوڑی کو ہاتھ کی ٹیک دیئے دیر تک اپنے

خیالات میں مستغرق بیٹھی رہی پھر ردا اُتار کر ایک طرف رکھی اور بستر پر لیٹی تھی کہ پھر سنبھل کر اُٹھ بیٹھی۔

باغ کے مشرقی کونے سے ساز کے بجنے کی آواز آنے لگی۔ اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر غرفے سے باہر جھانکا۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی تھی۔ لمبے تڑنگے درخت ان بھُوتوں کی طرح دم بخود کھڑے تھے جنہیں عامل نے اپنے کلام سے مسخّر کر لیا ہو عذرا نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر کے درخت کے نیچے دیکھا مگر کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔

ساز کی آواز ان ننھی لہروں کی طرح جو یکے بعد دیگرے تالاب کے کنارے سے ٹکرا کر معدوم ہو جاتی ہیں مسلسل اور پیہم تھی۔ وہ آہستہ سے اُوپر اُٹھتی پھر تھوڑے عرصے کے لئے درختوں کی ٹہنیوں میں تھرتھرا کر فضا کی سیاہی میں مٹ جاتی۔ عذرا دیر تک محویت کے عالم میں غرفے کے پاس کھڑی رہی۔ یکلخت اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ پُراسرار آواز اِدھر اُدھر پھیلنے کی بجائے سمٹ سمٹا کر سیدھی اس کی طرف آ رہی ہے۔ اسے شمعوں کی روشنی میں اپنی نیم عریانی کا احساس ہُوا۔ وہ لپک کر بستر کی طرف گئی اور لمبی سیاہ چادر اپنے گرد لپیٹ لی۔ مگر آواز برابر آ رہی تھی۔ اس نے جھلا کر لیلے کو پکارا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

عذرا نے سختی سے پوچھا "یہ کون اس وقت باغ میں ساز بجا رہا ہے؟"

لیلے نے آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا "ہرمزان ہوگا۔"

عذرا نے حکم دیا "جلدی جا کر اس سے کہو یہاں سے اُٹھ جائے۔ ہماری نیند خراب ہوتی ہے۔"

لیلے کچی نیند سے بیدار کئے جانے پر کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر منہ پھُلایا اور آنکھیں نکالتی ہوئی باغ کی طرف چلی۔ عذرا بے اختیار دوڑ کر غرفے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اتنے میں لیلیٰ کی آواز آئی "ارے ساحر کے بچے! لوگ پڑے سوتے ہیں اور تو یہاں بیٹھا کسی پر جادو کر رہا ہے۔ اُٹھ اور دُور چلا جا، بالوں کی نیند میں خلل مت ڈال۔"

نغمہ پھُوٹ پھُوٹ کر لیلے کی درشت آواز میں فنا ہو گیا۔ عذرا کو اس کا سخت لہجہ بہت ناگوار گزرا۔

لیلے نے اندر آ کر کہا "حضور وہ چلا گیا" مگر کچھ جواب نہ پا کر اپنی جگہ دراز ہو گئی۔

(۵)

آفتاب نصف النہار پر آ گیا تھا۔

بہار کی خوشگوار ہوا میں آغازِ موسمِ گرما کی حدت آ چلی تھی۔ پیڑوں کے جھُولنے میں تھکن کا احساس ہوتا تھا۔ پرندوں کی نغمہ سنجی ہنگامہ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ ہرمزان کدال سے باغ کی روشیں اور نالیاں بنا رہا تھا۔ جب وہ کدال چلاتا چلاتا تھک جاتا تو بائیں ہاتھ سے کمر تھام کر سیدھا کھڑا ہو جاتا اور پیشانی سے پسینے کے بڑے بڑے قطرے پونچھ کر پھر اپنے کام میں لگ جاتا۔ اُس کے سفید نازک ہاتھ گرد سے اٹے ہوئے تھے کبھی کبھی ان کے چھالوں سے پانی رِسنے کی وجہ سے کدال کا دستہ تر ہو جاتا

اور ہاتھ سے نکل نکل جاتا مگر وہ پھر اسے سوکھی مٹی لگا لیتا۔ درد اور کرنت سے اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے اور بعض دفعہ نامحسوس طور پر آنسو پسینے کے قطروں کے ساتھ مل کر اس کے گالوں پر بہہ نکلتے۔

کام ختم کر کے اس نے لمبا سانس لیا اور کھجوروں کے جھنڈ کے نیچے کھڑے ہو کر غمناک نظروں سے بل کھاتی ہوئی آبجو کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں قدموں کی آہٹ ہوئی۔ زیتون کے ایک درخت کی اوٹ سے گلنار نمودار ہوئی۔ دھوپ میں اس کا چہرہ تمتما رہا تھا وہ خاموشی سے آ کر ہرمزان کے پاس ٹھہر گئی۔ اس نے ایک نظر ہرمزان کے افسردہ چہرے کی طرف دیکھا پھر جھک کر کمر سے ایک لمبا آبدار خنجر نکالا اور ہاتھ بڑھا کر کہنے لگی "لو میں تمہارے لئے چھپا لائی ہوں"۔

ہرمزان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "کس لئے؟"

گلنار نے مسکرا کر جواب دیا "یہ تمہیں آزادی کے حصول میں مدد دے گا"۔

ہرمزان کے منہ سے بے اختیار نکلا "آزادی؟"

وفورِ تعجب سے گلنار کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ از خود پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے تیز نگاہوں سے ہرمزان کی طرف دیکھ کر کہا "ہرمزان انجان مت بنو۔ یہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ابھی اگلے دن ہم نے وطن کو بھاگ جانے کا مشورہ کیا تھا"۔

ہرمزان جو سامنے قصر کی دیوار پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ زیرِ لب کہنے لگا "مگر میں آزادی نہیں چاہتا"۔

اگر وہ خونخوار صحرائی بھیڑیوں کو اپنی طرف لپکتے ہوئے دیکھتی تو اتنی حواس باختہ نہ ہوتی جتنی ہرمزان کے اس فقرے سے ہوئی۔ دوسرے ہی لمحہ میں اس کی آنکھوں کے گلابی ڈورے گہرے سرخ ہو گئے۔ اس نے فوق العادۃ کوشش سے اپنے جذبات کو ضبط کیا اور بھرائی ہوئی آواز سے کہنے لگی۔

"ہرمزان! ہوش میں آؤ۔ تمہاری رگوں میں وہ خون دوڑ رہا ہے جو دنیا کے بیش بہا موتیوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں اس کو اس ویران گوشہ میں غلامی کا پسینہ بن کر گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ اپنی موجودہ ذلت و خواری کا پچھلی حشمت و عزت سے مقابلہ کرو۔ اپنے وطن سے اپنے خویش و اقربا سے اپنے یگانوں اور دوستوں سے دور رہ کر اس حقیر و ذلیل حالت میں سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے ایسے نفس پرست لوگوں کی صحبت میں رہ کر تم اپنی زندگی کے باقیماندہ ایام گزارنا چاہتے ہو۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ تم میں غیرت و حمیت، تہور شجاعت کی کمی نہیں۔ میں نے ان آنکھوں سے تمہیں شاپور کی زہرہ گداز لڑائی میں شیرِ ژیاں کی طرح دہاڑتے ہوئے دیکھا تھا جب تم پارس مقدس کے غیور مگر بدنصیب فرزندوں کی اگلی صف میں دشمنوں کو پامال کر رہے تھے۔ ہرمزان ایک لمحہ کے لئے ان محبانِ وطن کی خون میں نہائی ہوئی صورتوں کا تصور کرو جو ان بیرحم عربوں اور ہم وطن غداروں کے ظلم و ستم کا شکار ہو گئے۔ کیا وہ منظر بھول گئے ہو، جب تمہارے جانباز بھائی نے دشمنوں کے نرغے میں پھنس کر بلوط کے نیچے جامِ اجل نوش کیا تھا اور جب تمہارے بوڑھے جنگجو باپ

کی سفید نورانی داڑھی اس کے سینے سے اُبلتے ہوئے خون سے لت پت ہوگئی تھی۔
ہرمزان کے مُنہ سے بے اختیار نکلا "رحم! رحم!!" اس کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور وہ درخت کی جڑ کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔
گلنار اپنی دھن میں کہتی گئی مگر اب اس کی تند اور کرخت آواز میں نسوانی لچک آ گئی تھی۔
"سچ کہتے ہو۔ مگر میں تم سے کہیں زیادہ رحم کی مستحق ہوں۔ اے کاش تم محبت کا وہ معاہدہ ہی یاد رکھتے جو گذشتہ بہار اپنے تاکستان میں انگوروں کی سرسبز بیلوں کے نیچے کھڑے ہو کر تم نے مجھ سے کیا تھا۔ شاید اس قعرِ ذلت میں تمہارے تمام لطیف جذبات مرجھا کر رہ گئے ہیں۔ اگر کسی بدگمانی کی بنا پر تم مجھ سے بے اعتنائی برتنے لگ گئے ہو تو اس ناپاک خیال سے اپنے آپ کو گنہگار نہ کرو۔ میں متقدس آتشکدہ کی آگ کی مانند پاک اور باعصمت ہوں۔ تم جانتے ہو کس طرح زید نے بارہا میری دوشیزگی کو آلودہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ہمیشہ ناکام رہا۔ اگر تمہیں پتہ لگے کہ اس نفرت کو جو مجھے اس خاندان سے ہے دبانے کے لئے مجھے کس طرح مصنوعی تبسم پیدا کرنا پڑتا ہے تو تم تھرا اٹھو۔ میں ذلیل سے ذلیل کام خوشی سے انجام دیتی ہوں مگر اسی سُرخی میں جو اس مسرت سے میرے چہرے پر آتی ہے غم و غصہ کے سینکڑوں جذبات کا خون جھلک رہا ہوتا ہے ہرمزان! اپنی منگیتر کی عصمت کی حفاظت کا خیال کرو۔ اب جبکہ میں نے یہاں سے بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا ہے میرے لئے ایک ایک ثانیہ صدیوں سے زیادہ گرانبار ثابت ہو رہا ہے۔"
یہ کہتے ہوئے گلنار نے دلی اطمینان سے ہرمزان کے اندرونی جوش سے تمتمائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ اتنے میں کھجوروں کے جھنڈ کے پیچھے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ گلنار نے گھبرا کر اس طرف دیکھا اور جلدی سے کہا "دیکھو عذرا اس طرف آ رہی ہے جلد بتاؤ کب چلو گے؟"
یہ سُن کر ہرمزان کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس کی نگاہیں سامنے کھجوروں کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس نے مری ہوئی آواز سے جواب دیا "میں یہیں رہوں گا۔"
گلنار کو چکر سا آ گیا۔ وہ گرتے گرتے سنبھل گئی۔ اس نے پتھرائی نظروں سے ہرمزان کی طرف دیکھا اور اپنے پاؤں کو جو شدتِ مایوسی سے بوجھل ہو گئے تھے بدقت اُٹھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ہرمزان نے اپنے لمبے گرد آلود بالوں سے چہرہ چھپا لیا اور اوندھے مُنہ زمین پر گر پڑا۔

(۶)

رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔ آسمان پر ادھ کٹا چاند چمک رہا تھا۔ اس کی نزہت بخش چاندنی سے جو دریچے کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہی تھی شمعوں کی تیز روشنی نے مل کر زریں غبار کی شکل اختیار کر لی تھی۔
عذرا خوابِ راحت میں مست پڑی سو رہی تھی۔ نرم و گداز بازو اِدھر اُدھر بے پروائی کے انداز سے پڑے ہوئے تھے سپید

منور شانوں پر بالوں کی لمبی لٹیں بکھری پڑی تھیں۔ اس کے نیم وا ہونٹوں میں موتی جیسے دانت شبنم کے ان شفاف قطروں کی طرح دکھائی دیتے تھے جو لالے کی پتیوں پر آفتاب کے خوف سے سہمے ہوئے پڑے لرزتے ہیں۔ گستاخ شمعیں بھڑک بھڑک کر اس طرف جھانک رہی تھیں اور نظارۂ آتشیں کی تاب نہ لا کر اندر ہی اندر گھلی جاتی تھیں۔ یکایک اس رنگیں سکوت میں ساز کے بجنے کی آواز آنے لگی۔

عذرا نے گہرا سانس لیا اور کروٹ بدل کر منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ مگر اس کی آنکھیں نامحسوس طور پر کھل گئیں۔ کچھ عرصہ تک وہ بے معنی نظروں سے سامنے دیکھتی رہی، پھر چادر کو بدن پر لپیٹ لیا۔ اتنے میں اسے نغمہ کی ہلکی صدا کا احساس ہوا۔ وہ اپنی جگہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ آہستہ سے اُٹھی اور دریچے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ چاندنی نے درختوں کی ٹہنیوں سے چھن چھن کر زمین پر نقرئی مشجر بچھا رکھا تھا۔ ہوا ساکن تھی اور آبجو کی ننھی لہریں چاندنی کی چادر اوڑھے بے خبر سو رہی تھیں۔ ساز کی آواز ایسی دلکش اور عمیق تھی کہ عذرا عرصہ تک وہاں کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پُراسرار آواز لمحہ بہ لمحہ اس سے پرے پرے ہٹتی جا رہی ہے۔ وہ بے اختیار دروازے کی طرف بڑھی آہستہ سے ایک کواڑ کھولا اور درختوں کے نیچے نیچے آواز کی طرف تیز تیز قدم اُٹھانے لگی۔ اس کا چہرہ کبھی چاندنی میں چمک اُٹھتا اور کبھی درختوں کے تاریک سائے میں جھلملا کر رہ جاتا۔ اس وقت وہ الف لیلہ کی حسین ملکہ معلوم ہوتی تھی جو رقصِ شبینہ میں شامل ہونے کے شوق میں جلدی جلدی آگے بڑھ رہی ہو۔ اس کی چادر کئی بار جھاڑیوں میں اُلجھ گئی مگر وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو رہی تھی۔ باغ کے درمیان پہنچی تھی کہ نغمہ پھر بلند ہونے لگا جیسے اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھ رہا ہے، وہ قریب ہی ایک درخت کی جڑ سے لڑکھڑاتا ہوا ساری فضا پر چھا رہا تھا۔ عذرا کی سانس پھُول رہی تھی مگر وہ تیزی سے اس کی جانب لپکی۔ نزدیک پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ہرمزان درخت کی ٹیک لگائے محویت کے عالم میں اپنے ساز پر جھکا ہُوا تھا۔ قدموں کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عذرا جنوں آمیز نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

عذرا نے زیرِ لب پوچھا "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

ہرمزان حیران تھا کہ کیا کہے۔ آخر اس نے جرأت کر کے جواب دیا "غلام سوائے شفقت کے کیا چاہے گا"

عذرا نے بیتاب ہو کر کہا "یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

یہ سُن کر ہرمزان کے زرد چہرے پر سُرخی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ عذرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مطمئن آواز سے کہنے لگا۔

"آقازادی! اچھا ہوتا اگر آپ یہ سوال کسی دوسرے رنگ میں کرتیں۔ میں نہیں چاہتا کہ مزید حیلہ جوئی سے آپ کو اور اس سے زیادہ اپنے آپ کو پریشان کروں۔ معلوم نہیں میرے مُنہ سے نکلنے والے الفاظ مجھے مَوت کے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیں گے یا ...... مگر یہ ناممکن ہے۔ بہرحال میں قسمت کے سامنے سرِ نیاز خم کرتا ہوں اور اس اُمید کی بنا پر جو آپ کے حُسنِ سلوک نے میرے دِل میں پیدا کر دی ہے

میں آپ کے سامنے ایک خطرناک اعتراف کرتا ہوں جو غالباً آپ کو سخت ناگوار گزرے گا مگر ان روح فرسا خیالات سے بچنے کے لئے جو مجھے ہر وقت تباہی اور ہلاکت کی آندھیوں پر اُڑائے پھرتے ہیں اگر میں ایک لحظہ کے لئے خود غرض بھی ہو جاؤں تو یقیناً آپ کے نزدیک قابلِ تعزیر نہیں ٹھہروں گا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

عذرا نے تیزی سے اس کی بات کاٹ کر کہا " ہرمزان! تم کیا چاہتے ہو" اُس نے اس انداز سے پوچھا جیسے پہلی مرتبہ سوال کر رہی ہے۔

ہرمزان دو قدم آگے بڑھ آیا اور باوقار لہجہ میں کہنے لگا " میں ڈرتا ہوں کہ یہ حقیقت جس کا وجود میرے اپنے وجود سے زیادہ قرینِ اصلیت ہے بعد میں وہم باطل نہ بن کے رہ جائے۔ صرف ایک لمحہ کے لئے مجھے اس تصور سے محظوظ ہونے کی اجازت دیجے کہ آپ اس شعلہ کی لپک سے جو میری روح، میری غیرت، میری قومیت اور شاید میری محبت کے ایندھن سے بھڑک اُٹھا ہے خوف کھا کر دُور نہ بھاگ جائیں گی۔ عذرا! عذرا!! مجھے تم سے عشق ہے "

آخری فقرہ اس نے بلند آواز سے کہا اور اس کے سامنے زمین پر گر پڑا۔ عذرا تھر تھر کانپنے لگی مگر فوراً تڑپ کر پیچھے ہٹی اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے واپس چلی گئی۔ اپنی خوابگاہ میں پہنچی تو اس کے اعضا شکستہ ہو رہے تھے۔ اس نے مدہوشی کے عالم میں زور سے کواڑ بند کئے۔ گلنار چونک پڑی۔

اس نے نیم بیداری کی حالت میں پوچھا " بانو! آپ کہاں؟ ۔ ۔ ۔ "

مگر عذرا نے کچھ جواب نہ دیا اور بستر پر گر پڑی۔ گلنار کو ساری رات نیند نہ آئی۔

(۷)

رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ چاند قدیم مقبروں کے اوپر چمک رہا تھا جس سے ان کی شکستگی زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔ گلنار نے آہستہ سے اپنا دایاں ہاتھ لیلٰے کے بازو کے نیچے سے نکالا اور اُٹھ بیٹھی۔ اس کا چہرہ پژمردہ ہو گیا تھا اور رسیلی نمناک آنکھیں خشک دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے عذرا کے خالی بستر کی طرف دیکھا پھر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ لیلٰے کے چہرے پر ڈالی اور باہر نکل گئی۔

کھجوروں کے درخت سر نکالے ہوئے کھڑے تھے۔ صحرا سے بدوؤں کے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ گلنار اُدھر اُدھر دیکھتی آگے بڑھتی گئی۔ زیتون کے درخت کے نیچے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ گلنار ایک طرف چھپ کر بیٹھ گئی۔ ہرمزان پُرجوش آواز سے کہہ رہا تھا۔

" جاڑا شباب پر ہوتا ہے۔ بادِ شمالی کے جھکڑوں میں پرندوں کے کراہنے کی آواز سنائی نہیں دیتی مگر فاختہ انجیر کے سُوکھے ٹُنڈ پر بیٹھی صرصر کے تند اور یخ بستہ جھونکوں میں آنے والی بہار کے سانس کو محسوس کر لیتی ہے اور موجودہ زبوں حالی کو بھول کر اپنا

بے ہنگام راگ الاپنے لگتی ہے۔ عذرا! یہی حالت میری تھی، میری حریت کے جذبات مرجھا کر رہ گئے تھے، دن رات کی غلامانہ مشقت نے میرے دل کو حد درجہ مضمحل کر دیا تھا۔ اس وقت تمہارا چہرہ ___ جو اس دھندلکے میں ماہِ چہاردہم کی طرح چمک رہا ہے دیکھ کر میرے خشک سینہ میں محبت کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ میں نے غلامی کے طوق پر قناعت نہ کرتے ہوئے تمہاری محبت کی زنجیریں پہن لیں اور راتوں کو جاگ جاگ کر اپنے ساز کے ذریعے سے تم پر اپنی بے پناہ الفت کا اظہار کیا۔"

گلنار نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کی مگر عذرا کی مترنم آواز نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

عذرا کہنے لگی "تمہارے اس عجیب ساز نے مجھے بے حد پریشان کیا۔ اس کی آواز نے میرے شیریں خوابوں کو منتشر کر دیا۔ بسا اوقات میری آنکھوں کو نیند کی گرانی سے دور ہونے لگتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ میری نیند کا تعاقب کر رہی ہے اور وہ کراہتی ہوئی اس کے آگے بھاگ رہی ہے۔"

ہرمزان نے ہنستی ہوئی آواز سے کہا "بھولی عذرا! یہ سارے فتنے میری محبت نے اٹھائے تھے ورنہ . . . ."

گلنار کی رگ رگ میں آتشِ غضب بھڑک اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ بڑھ کر ہرمزان کا سینہ اپنے ناخنوں سے چیر ڈالے مگر کسی خیال نے اسے ضبط کا حوصلہ دیا اور وہ اٹھ کر واپس چلی گئی۔

(۸)

ہرمزان نے عذرا کے اصرار پر ساز اٹھایا اور مدھم سروں میں بجانے لگا۔ وہ سامنے بیٹھی ہوئی والہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بل کھاتا ہوا نغمہ عذرا کی شکل اختیار کر رہا ہے۔

چاند جو بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا نکل آیا۔ افق کے قریب بعض تاریک بادلوں کے ٹکڑے ان بدلیوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے جو ماہتاب کے قریب جگمگا رہی تھیں۔ دلاویز نغموں کو سننے کے لئے تنک تاب ستارے زہرہ کے رقص سے بے پروا ہو کر زمین کی طرف لٹکے پڑتے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد مسکراتے ہوئے اس نے ساز کو نیچے رکھ دیا۔ پھر ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی یہاں تک کہ زہرہ کی پازیب کی جھنکار سنائی دینے لگی۔ ہرمزان عقیدتمندانہ لہجہ سے کہنے لگا۔

"عذرا! تم نے میری تجویز پر غور کیا؟"

عذرا نے چونک کر کہا "کونسی تجویز؟"

ہرمزان نے متبسم ہو کر کہا "بھول گئیں؟ میں نے کل رات تم سے کہا تھا کہ ہمیں یہاں سے ایسی سرزمین کو نکل جانا چاہیے جہاں محبت آزادی کے ساتھ سانس لے سکے۔"

یہ سُن کر عذرا نے سر جھکا لیا پھر افسردہ چہرے کو اُٹھا کر کہنے لگی "مجھے منظور ہے میں اس کے سوا کر ہی کیا سکتی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ جا کر ہمیشہ کے لئے اپنے والدین کو ذلیل کر جاؤں گی مگر میرا خیال ہے کہ ایک خوش باش گنہگار لڑکی کا تصور ان کے لئے اتنا سوہانِ رُوح نہیں ہو گا جتنا ایک بے گناہ مگر غمزدہ لڑکی کا فکر جو ان کی آنکھوں کے سامنے روز بروز اندرونی مرض سے گھل گھل کر قبر کی طرف جا رہی ہو۔"

ہرمزان نے کانپتی ہوئی آواز سے جواب دیا "عذرا! میرے لئے تم فوق الفطرت ایثار کر رہی ہو۔ آتشکدہ کی قسم میں ایک موبد کی طرح تمہاری پرستش کروں گا۔"

یہ سُن کر عذرا نے آسمان کی طرف دیکھا اور فیصلہ کُن انداز سے کہا "تو پھر کل رات کو تیار رہنا۔ اب دیر ہو گئی ہے مجھے جانا چاہیے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی لمبی ردا کو سر سے بازوؤں تک لپیٹا اور درختوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔

ہرمزان دیر تک اپنے خیالات میں غرق اُسی جگہ بیٹھا رہا۔ اتنے میں پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ وہ پیچھے مُڑ کر دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ اس کے سر پر پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ دوسرا وار اس کی گردن پر ہؤا۔ اور وہ زمین پر لیٹ کر تڑپنے لگا۔ اس نزع کے عالم میں اس کی نگاہیں دو چہروں پر گڑ گئیں جو اس پر جھکے ہوئے تھے۔

بے اختیار اس کے مُنہ سے نکلا "گلنار تُم بھی؟"

"ہاں میں بھی" اس آواز کے ساتھ ایک جسم زور سے اس پر گر پڑا۔ زید نے لپک کر گلنار کو زمین سے اُٹھانا چاہا۔ مگر اُس کا ہاتھ اس کے پہلو سے بہتے ہوئے خون سے تر ہو گیا۔

"ابو!" زید دیوانہ وار چِلّا اُٹھا۔

غلام دوڑ کر آگے بڑھا۔

"کیا ہؤا؟"

"حضور؟"

"ابو!"

"حضور"

"انہیں یہیں دفن کر دو۔"

یہ کہہ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر واپس چلا گیا۔

×—×—×—×—×
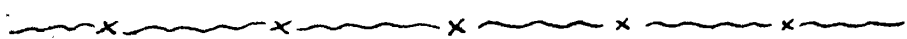
(۹)

صبح قریب تھی۔ تارے پیچھے پیچھے ہٹتے معلوم ہوتے تھے۔ باغ کے پاس سے ایک قافلہ گزر رہا تھا۔ جلاجل کی آواز عجیب مستانہ آہنگ کے ساتھ آرہی تھی۔

عذرا کو ساری رات نیند نہ آئی تھی۔ وہ ابھی تک بستر پر اپنے خیالات میں کھوئی پڑی تھی۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر یہاں سے چلے جانے کا عزم صمیم کرلیا تھا۔

یکایک دروازہ زور سے کھلا۔ لیلےٰ ہانپتی کانپتی بگولے کی طرح اندر داخل ہوئی۔

عذرا چونک پڑی اور حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیوں لیلےٰ!"

"رات کو . . . . . "

عذرا نے سٹپٹا کر پوچھا "آخر ہؤا کیا؟"

"ہرمزان گلنار کو لے کر کہیں بھاگ گیا"

عذرا دھک سے رہ گئی اور اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

باہر پو پھوٹ رہی تھی۔

سیّد علی عباس بی اے جلالپوری

سڑک سے پرے باغیچے کے ایک کونے میں بیری کا درخت ہے۔ موسم آنے پر بیری کے پھول آئے، بیر لگے، پکے، ہوا کے جھونکوں نے، مالی نے بیروں کو گرایا، اکٹھا کیا لیکن بعض بیر یا اُن کی گٹھلیاں وہیں درخت کے نیچے پڑی رہ گئیں۔ برسات آئی، مینہ برسا، کئی چھوٹی چھوٹی بیریاں زمین سے سر اُبھارنے لگیں۔

باغیچے کی دوسری طرف سڑک کے قریب گلاب کے پودوں کا ایک قطعہ ہے۔ ہر قسم کے اچھے سے اچھے گلاب لگے ہیں۔ دن چڑھتے چڑھتے کئی کلیاں شگفتہ ہو کر پھول بن گئیں۔ پھول اپنی مہک سے باغ کو معطر کرنے لگے۔ دوپہر ہونے کو آئی۔ پھول کی پتیاں جھڑنے لگیں۔ پھر رفتہ رفتہ باقی بچتے بھی جھڑ گئے لیکن میری آنکھ بے سُود تلاش میں ہے کہ بیری کی طرح کوئی حسین گلاب بھی خود بخود گلاب کے پیڑ تلے اُگ کھڑا ہو۔ نہیں نہیں اُگتا!

سعادت علی (پروفیسر لدھیانہ کالج)

غزل

وہ نہ ہوں تخئیل میں بھی دل کا جب ماتم رہے
ہم نفس اُن کا تصور کیوں شریکِ غم رہے

صورت ایسی بے تماشا حسرتِ پیہم رہے
جلوہ ایسا آنکھ دیکھے اور نامحرم رہے

دیدنی ہے اختیارِ گریہ پر یہ صبر و جبر
ہائے وہ آنسو کہ جو آنکھوں میں آ کر تھم رہے

تم سراپا حسن ہو پر عشق سے بیگانہ ہو
یہ وُہ دُنیا ہے کہ اس دُنیا میں ہم ہی ہم رہے

دینے والے لذّتِ غم ہی نہ کھو دینا کہیں
دے اور اتنا دے مجھے احساسِ رنج و غم رہے

فکر رہتی ہے یہی بگڑے نہ ظالم کا بناؤ
ہم کو اُلجھن ہو تو ہو زلفوں میں پیچ و خم رہے

سب ہی اچھے ہو گئے گلزارِ خوبی کے مریض
اُن کے بیماروں میں اک نرگس رہی اِک ہم رہے

ضبط کے معنی یہ ہیں ٹپکے نہ آنسو ایک بھی
عاشقوں کی آبرو اُسے دیدۂ پُرنم رہے

قصۂ فرقت نہ سُننا ہی بہت اچھا ہُوا
آپ کے عشرت کدہ میں کیوں کسی کا غم رہے

چار کے کاندھوں پہ ہوں اللہ رے بیچارگی
پائے نافرماں لحد کا قرب پا کر تھم رہے

مُسکراتے بزم کی بالیں پہ آ جائیں جو آپ
زندگی کو رشک ہو وہ موت کا عالم رہے

مرزا عاشق حسین بزم

واقعاتِ سنہ ہجری پر ایک نظر

سنہ ۱ھ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور اسی سال مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی۔

سنہ ۲ھ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ ابوجہل اسی لڑائی میں مارا گیا اور نماز روزہ بھی اسی سال فرض ہوئے۔

سنہ ۳ھ جنگِ اُحد میں رسول اللہ صلعم کے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور اسی سال آپ نے حفصہ رض سے نکاح کیا۔

سنہ ۴ھ شراب حرام ہوئی اور امام حسین رض کی ولادت ہوئی۔

سنہ ۵ھ ابوسفیان کی سپہ سالاری میں دس ہزار قریش کے سیلاب نے مدینہ کا رُخ کیا۔ آنحضرت ص نے مدینہ سے باہر نکل کر سلع کے آگے ایک خندق تیار کرائی جس کا رواج اس سے پہلے عرب میں نہ تھا۔

سنہ ۶ھ آنحضرت ص نے چودہ سو پیدل اور دو سو سواروں کے ساتھ خیبر کا رُخ کیا اور اسی سال مرحب حضرت علی رض کے ہاتھ سے مارا گیا۔

سنہ ۸ھ آنحضرت ص نے مکہ فتح کیا۔

سنہ ۹ھ آنحضرت ص نے ازواج مطہرات سے ناراض ہو کر علیحدگی اختیار کر لی جس کی وجہ سے لوگوں کو گمان ہوا کہ آپ نے تمام ازواج کو طلاق دے دی ہے۔ اس سے سب کو رنج تھا لیکن حضرت عمر رض کے کہنے پر آپ نے سب کو بُلا لیا تھا۔

سنہ ۱۰ھ تمام اطرافِ عرب سے نہایت کثرت کے ساتھ سفارتیں آئیں اور ہزاروں لاکھوں آدمی اسلام کے حلقہ میں آئے۔

سنہ ۱۱ھ حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا اور خلافت کا سب سے پہلا زینہ قائم ہوا اور تمام اُمت نے حضرت ابوبکر صدیق رض کو اپنا امام تسلیم کیا۔

سنہ ۱۳ھ حضرت ابوبکر صدیق سوا دو برس خلافت کر کے انتقال فرما گئے اور اسی سال حضرت عمر رض نے عنانِ خلافت اپنے ہاتھ میں لی۔

سنہ ۱۴ھ حضرت عمر فاروق نے تراویح کی نماز کے لئے سب کو جمع کیا۔

سنہ ۱۵ھ حضرت سعد نے کوفہ آباد کیا۔

سنہ ۱۶ھ بغداد کے شہر جلولا میں ایسی زور سے آندھی آئی کہ زمین و آسمان میں اندھیرا چھا گیا اور اُسی روز مسلمانوں اور ایرانیوں کی زبردست لڑائی ہو رہی تھی۔ حضرت سعد نے عراق میں سب سے پہلی بار جمعہ پڑھا اور اسی سال بیت المقدس فتح ہوا۔ حضرت عمر رض صحابہ کرام اور ہرمزان کے مشورہ سے سنہ ہجری قائم ہوا۔ آنحضرت صلعم نے

ربیع الاول میں ہجرت فرمائی تھی۔ اس لئے سنہ ہجری کی ابتدا ربیع الاول سے ہونی چاہئے تھی۔ مگر چونکہ عرب میں سال محرم سے شروع ہوتا ہے اس لئے دو مہینہ آٹھ دن چھوڑ دیئے گئے۔

۱۷ھ شام و مصر و عراق میں سخت وبا پھیلی۔ اور اسلام کی بڑی بڑی یادگاریں خاک میں مل گئیں۔ کوفہ میں آگ لگ گئی جس سے جامع مسجد، ایوان حکومت، دفتر اور قید خانہ کی عمارتیں جل گئیں۔ حجاز میں سخت قحط پڑا۔ لیکن جب لوگوں نے صدق دل سے دُعائیں مانگیں تو اُسی وقت بارش شروع ہوئی اور کئی روز تک متواتر رہی۔

۲۰ھ حضرت عمر رضہ نے خیبر اور نجران سے یہود کو جلاوطن کیا اور اسی سال نہاوند فتح ہُوا تھا۔ اس فتح سے پورے عراق عجم پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس لڑائی میں تیس ہزار عجمی مارے گئے۔

۲۳ھ حضرت عمر رضہ کو شہادت نصیب ہوئی۔

۲۴ھ حضرت عثمان بن عفان تختِ خلافت پر رونق افروز ہوئے۔

۲۶ھ حضرت عثمان نے کچھ مکانات خرید کر مسجد حرام کو وسیع کر دیا۔

۲۸ھ امیر معاویہ پہلی مرتبہ اسلامی بیڑا لے کر بحر روم میں اُترے۔

۲۹ھ حضرت عثمان غنی رضہ شہید کر دیئے گئے۔ اور امیر المؤمنین حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ مسندِ خلافت پر جلوہ فرما ہوئے۔

۳۵ھ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ خلیفہ بنائے گئے۔

۴۰ھ کوفہ میں حضرت علی کو (جبکہ نمازِ صبح کے واسطے مسجد جا رہے تھے) عبدالرحمٰن ابنِ ملجم نے زہر آلود تلوار سے زخمی کیا۔

۴۱ھ حضرت امام حسن کے بعد حضرت معاویہ تمام عالم اسلام کے خلیفہ مانے گئے۔

۴۲ھ امیر معاویہ کا رومیوں سے پہلی بار مقابلہ ہُوا۔ رومیوں نے شکست فاش کھائی اور ان کے بطریقوں کی بڑی تعداد کام میں آئی۔

۴۹ھ حضرت حسن رضہ کو زہر دے کر شہید کر ڈالا گیا۔

۵۲ھ جنادہ ابی اُمیہ نے رودس کو فتح کیا اور حضرت امیر معاویہ نے یہاں بہت سے مسلمان آباد کئے۔

۶۰ھ یزید خلیفہ ہُوا۔

۶۱ھ محرم کی دسویں کو حضرت امام حسین بمقام کربلا مع کثیر رفقا اور عزیزوں کے شہید ہوئے۔

۶۲ھ یزید نے مکہ معظمہ میں منجنیق سے پتھر برسائے جن کے شراروں سے کعبہ شریف کا پردہ اور اُس کی چھت اور اُس دُنبہ کے سینگ جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فدیہ کے لئے بھیجا گیا تھا اور جو اب تک خانہ کعبہ کی چھت میں آویزاں تھے، سب جل گئے اور اسی سال خدا نے یزید کو ہمیشہ کے لئے سُلا دیا۔

۶۴ھ یزید کا بیٹا معاویہ وارثِ تختِ خلافت ہُوا۔ لیکن وہ خود ہی چند روز کے بعد خلافت سے دستبردار ہو

کر دوسرے ماہ وفات پا گیا۔

سنہ ۸۰ھ حضرت امام ابوحنیفہ رح کوفہ میں پیدا ہوئے۔

سنہ ۸۳ھ حجاج نے شہر واسط کی بنیاد ڈالی۔

سنہ ۸۷ھ ولید نے جامع دمشق کی بنیاد ڈالی اور اسی سال مسجد نبوی کی توسیع اور تعمیر کے احکام جاری کئے۔

سنہ ۱۳۰ھ عربوں نے طارق بن زیاد کی قیادت میں ہسپانیہ کو فتح کیا اور اسی سال ہندوستان میں مسلمان داخل ہوئے۔

سنہ ۱۴۰ھ منصور نے شہر بغداد کی بنیاد ڈالی۔

سنہ ۱۴۵ھ منصور بغداد کی تعمیر سے فارغ ہوا۔

سنہ ۱۵۰ھ حضرت امام ابوحنیفہ رح نے بغداد میں انتقال فرمایا۔

سنہ ۱۵۱ھ منصور نے شہر اصافہ کو بنایا اور اس کی دیواروں میں مضبوطی کے واسطے چونہ گچ وغیرہ لگایا۔

سنہ ۱۶۱ھ مہدی نے مکہ معظمہ کی سڑک اور سرائے اور حوض بنوائے۔

سنہ ۱۶۴ھ امام احمد بن حنبل بغداد میں تولد ہوئے۔

سنہ ۱۶۶ھ مہدی نے یمن میں سب سے پہلے اونٹوں اور خچروں کی ڈاک مقرر کی اور اسی نے حجاز اور عراق میں بھی۔

سنہ ۱۶۷ھ مہدی نے توسیع مسجد حرام کے متعلق حکم دیا اور اس میں بہت سا رقبہ شامل کر لیا۔

سنہ ۱۶۹ھ مہدی نے شکار کے پیچھے گھوڑا ڈالا۔ شکار ایک بڑے گھر میں جا گھسا۔ گھوڑا بے تحاشا دوڑتا ہوا مکان میں گھس گیا۔ مہدی کی کمر میں دروازہ کے اندر داخل ہوتے ہوئے ایسی چوٹ لگی کہ مہدی اسی وقت جاں بحق تسلیم ہو گیا۔

سنہ ۱۸۰ھ عہد ہارون الرشید میں ایک سخت زلزلہ آیا جس کے صدمہ سے اسکندریہ کے مناروں کے اوپر کا حصہ گر پڑا۔

سنہ ۱۸۳ھ ارمینیہ میں زبردست غدر ہوا۔ قوم خزر نے مسلمانوں کی بہت زیادہ خونریزی کی۔ حتیٰ کہ انہوں نے ایک لاکھ سے زاید مسلمانوں کو قید کر لیا اور بہت سے شہید کر دیئے۔

سنہ ۱۸۹ھ رومیوں نے اپنے یہاں سے مسلمانوں کو نکال دیا اور وہاں کوئی بھی مسلمان نہ رہا۔

سنہ ۲۱۲ھ مامون نے حدود روم کے قریب طوانہ میں جو ایک معمولی قصبہ تھا ایک شہر بسایا۔

سنہ ۲۱۶ھ بادشاہ روم نے طرطوس وغیرہ پہنچ کر نہایت بے رحمی سے دو ہزار مسلمان شہید کر دیئے۔

سنہ ۲۱۸ھ خلیفہ المعتصم باللہ نے بابک کے مقابلہ میں جب فتح پائی تو سب سے پہلے بغداد میں اس کی خبر کبوتر لایا۔

سنہ ۲۲۴ھ عراق میں نہایت زور سے باد سموم چلی جس کی وجہ سے کوفہ، البصرہ اور بغداد کی تمام کھیتیاں جل گئیں اور مسافر ہلاک ہو گئے۔ یہ نقشہ پچاس روز تک اسی طرح رہا۔ حتےٰ کہ ہمدان میں بھی آگ پہنچ گئی۔ اور وہاں کی کھیتیاں بھی جل گئیں اور مویشی مر گئے۔ سنجار میں بھی یہی حال ہو گیا۔ لوگوں نے بازاروں میں نکلنا بند کر دیا، رستوں کی آمد و رفت رک گئی اور ایک خلقت عظیم اس قیامت کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد دمشق میں زلزلہ آیا اور ایسا

آیا کہ ہزاروں مکان گر گئے اور اُن کے نیچے صدہا اشخاص دب کر مر گئے اور یہی حال اہلِ کیہ جزیرہ اور موصل میں بھی ہُوا۔ اس خوفناک حادثہ میں پچاس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔

۲۳۵ھ متوکل نے تمام نصاریٰ کو گلوبند باندھنے کا حکم دیا۔

۲۳۷ھ عسقلان میں آگ لگ گئی۔ تین روز میں تمام گھر اور شہر جلا کر ڈھیر کر دیئے۔

۲۵۱ھ المستعین باللہ نے ترکی فوج سے بغداد کا محاصرہ کرایا جس سے کہ بغداد کو سخت نقصان پہنچا۔

۲۶۶ھ رومیوں نے کشت و خون کر کے دیار بکر پر قبضہ کیا اور اہلِ جزیرہ اور اہلِ موصل وہاں سے نکل بھاگے۔ اس سال اعراب خانہ کعبہ کے پردہ کو لوٹ کر لے گئے۔

۲۶۹ھ بغداد میں اس شدت سے اولے پڑے کہ عمارات کو بہت ضرر پہنچا اور یک بیک کچھ ایسی شدید سردی پیدا ہو گئی کہ تمام بہنے والی چیزیں جم گئیں۔

۲۷۰ھ دریائے نیل کا پانی سُوکھ گیا۔ کہیں بھی تری کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ جس کی وجہ سے مصر میں قحط پڑ گیا۔

۲۸۱ھ رے، طبرستان میں پانی کی کمی آ گئی حتےٰ کہ تین رطل پانی ایک درہم میں ملنے لگا۔ لوگوں نے قحط کے سبب مُردار کھانا شروع کیے اور اسی سال معتضد باللہ نے مکہ معظمہ میں دار الندوہ منہدم کر کے مسجد الحرام کے پاس ایک اور مسجد تعمیر کرائی۔

۲۸۵ھ بصرہ میں ایک زرد رنگ کی آندھی آئی پھر سبز ہو گئی، اس کے بعد سیاہ پڑ گئی اور تمام اطراف میں پھیل گئی۔ پھر آسمان سے ایک چادر گری جس کا وزن تقریباً ڈیڑھ سو درہم تھا۔ اس ہوا نے پانچ سو درخت اکھیڑ دیئے، پھر آسمان سے سیاہ و سفید پتھر برسے۔

۲۹۳ھ دجلہ میں بے حد طغیانی آنے کی وجہ سے بغداد کا اکثر حصّہ تباہ ہو گیا۔

۳۰۱ھ منصور اونٹ پر سوار ہو کر بغداد آیا اور اناالحق کا دعوےٰ کیا۔ المقتدر باللہ نے اُسے قید کر لیا۔

۳۰۲ھ مقتدر باللہ نے اپنے پانچ لڑکوں کے ختنہ کرانے میں چھ لاکھ دینار خرچ کیے اور اسی سال قوم دیلم جو مجوسی تھی حسن بن علوی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی۔

۳۰۸ھ حامد بن عباس نے جو بغداد کا حاکم تھا۔ بغداد پر بڑا ظلم توڑا جس کی وجہ سے رعایا میں بے چینی پھیل گئی اور غارت گری شروع ہو گئی۔ کئی روز تک لڑائی جاری رہی۔ قید خانوں میں آگ لگا دی گئی۔ وزیر سلطنت کو پتھر مار مار کر ہلاک کر ڈالا۔ اور دولتِ عباسیہ کا بدتر حال کر دیا۔

۳۰۹ھ قاضی ابو عمر وغیرہ کے فتووں کے موافق منصور سولی پر چڑھا دیا گیا۔

۳۱۴ھ دجلہ کا پانی اتنا منجمد ہُوا کہ جانور اس پر چلنے لگے۔ ایسا کبھی نہ ہُوا تھا۔

۳۱۵ھ دمیاط میں رومی گھس آئے۔ شہر کو لوٹا اور جامع مسجد میں ناقوس بجا دیا۔ اور دیلم نے رے اور جبال پر حملہ کیا۔ خلقت کو قتل اور بچوں کو ذبح کر ڈالا۔

۳۱۶ھ مقتدر باللہ نے قرمطی کے مقابلہ کے لئے فوجیں

روانہ کیں۔ مگر شکست کھا کر واپس آگئیں۔ نوبت باینجا رسید
کہ حج بند ہوگیا۔ مکہ والے مکہ شریف چھوڑ کر ادھر اُدھر بھاگے
اہلِ روم غلاطہ پر حملہ آور ہوئے اور وہاں کی جامع مسجد سے
منبر نکال کر اُس کی جگہ صلیب قائم کر دی۔

۳۱۷ھ عین حج کے دن ابوسعید بن حسن بن بہرام جبالی
کے لڑکے نے خانہ کعبہ کو تاخت و تاراج کیا۔ چاہِ زمزم اور
حرمِ کعبہ نعشوں سے بھر دیا۔

۳۲۲ھ محمد بن علی سمنانی کا ظہور ہؤا۔ اس کا دعویٰ تھا
کہ میں خدا ہوں اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں لیکن وہ قتل
کر دیا گیا۔

۳۲۳ھ جمادی الاول کے مہینے میں آندھی آئی جس سے
تمام دُنیا سیاہ ہوگئی اور ذوالقعدہ میں تمام رات بڑے
بڑے ستارے ٹوٹتے رہے جتنے اس سے پہلے کبھی نہ ٹوٹے تھے

۳۲۸ھ دجلہ میں اُنیس گز پانی چڑھ گیا جس کی وجہ سے
بغداد غرق ہوگیا۔ آدمی اور چرپائے ڈوب گئے مکانات
منہدم ہوگئے۔

۳۳۴ھ بغداد میں اس قدر گرانی ہوئی کہ لوگ مردار اور
لید تک کھانے لگے۔ بہت سوں نے کُتے کاٹ کاٹ کر
کھائے۔ مسکینوں کے پاس چھوٹے چھوٹے بھنے ہوئے
بچے پائے گئے گویا لوگ بچوں کو بھون بھون کر کھا گئے۔

۳۳۹ھ المطیع اللہ ابوالقاسم نے حجرِ اسود پھر اپنی جگہ رکھا
اور اس کے گرد ایک چاندی کا حلقہ بنوا دیا جس کا وزن تین
سو ساڑھے ستتر درہم تھا۔

۳۴۴ھ مصر میں ایک زبردست زلزلہ آیا جس کی وجہ سے
بہت سے مکانات منہدم ہوگئے۔ تین ساعت برابر زلزلہ رہا

۳۴۶ھ سمندر اسی گز اُتر گیا اور اُس میں پہاڑ اور
جزیرے اور ایسی ایسی اشیاء نظر آنے لگیں جو پہلے کبھی
نہ دیکھی تھیں۔ رَے اور اُس کے اطراف میں سخت زلزلہ
آیا اور مضافات میں ڈیڑھ سو گاؤں زمین میں اُتر گئے۔
مُردوں کی ہڈیاں زمین سے باہر نکل پڑیں۔ چشمے جاری
ہوگئے۔ ایک گاؤں ہوا میں لٹک گیا پھر گر کر دھنس گیا۔

۳۴۷ھ حلوان اور پہاڑوں میں پھر زلزلہ آیا۔ جس کی
وجہ سے بہت سی خلقت مر گئی۔ اس کے بعد ٹڈی آئی۔
اور دُنیا میں پھیل گئی جو کھیتوں اور درختوں کو صاف کر گئی۔

۳۵۰ھ جزیرہ اقریطش کو رومیوں نے مسلمانوں سے
چھین لیا۔

۳۵۹ھ عراق میں ایک ستارہ اتنا بڑا ٹوٹا کہ جس کی روشنی
دُنیا میں پھیل گئی حتیٰ کہ شعاع آفتاب کے مثل ہوگئی۔ ستارہ
ٹوٹنے کے بعد ایک سخت گرج کی آواز آئی۔

۳۶۲ھ عز الدولہ کے وزیر ابوالفضل شیرازی نے بغداد
میں ایسی آگ لگائی کہ بہت سے گھر اور آدمی آگ کی نذر
ہوگئے حتیٰ کہ وزیر تک بھی نہ بچ سکا اور جل گیا۔

۳۷۸ھ بصرہ میں سخت گرمی پڑی اور لُو چلی۔ پھر آندھی
آئی۔ دجلہ کا پانی اس قدر سوکھ گیا کہ زمین نظر آنے لگی۔

۳۹۶ھ ہندوستان میں سخت قحط پڑا جس کی وجہ سے
بہت سے آدمی ہلاک ہوگئے۔

۳۹۸ھ بغداد کے اندر شیعہ سنی فساد بہت زبردست ہؤا۔

۴۰۴ھ دجلہ چڑھ آیا جس سے سخت نقصان ہؤا۔

۴۱۰ھ سلطان محمود غزنوی نے دار السلطنت غزنین میں ایک مدرسہ جاری کیا اور فتوحات ہندوستان کا ایک قیمتی حصہ اس پر صرف کر دیا اور مصارف کے لئے دوامی جاگیر بھی وقف کر دی اور مسلسل لڑائیوں کے بعد سومنات کے مندر پر فتح حاصل کی۔

۴۱۸ھ مصر کے اندر ایسا قحط پڑا جس کی نظیر سوائے یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے اور کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔ یہ قحط سات سال تک رہا بعض آدمیوں نے دوسرے آدمیوں کو کاٹ کاٹ کر کھایا۔

۴۶۱ھ جامع دمشق میں آگ لگ گئی۔ اس کے نقش و نگار جل گئے ــ اس کی تمام خوبصورتی جاتی رہی۔ چھت میں جو چاندی سونا لگا ہؤا تھا وہ بھی جاتا رہا۔

۴۶۶ھ بغداد میں سیلاب چڑھ آیا۔ دجلہ میں تیس گز سے بھی زیادہ پانی آ گیا جو اس سے پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ چوپائے مر گئے۔ لوگ کشتیوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ مکان مسمار ہونے کی وجہ سے بغداد ایک چٹیل میدان بن گیا۔

۴۸۹ھ سوائے ستارۂ زحل کے تمام ہفت سیارے برج حوت میں جمع ہو گئے اس پر نجموں نے متفقہ حکم لگایا کہ عنقریب حضرت نوح جیسا طوفان آئے گا مگر اس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہؤا کہ حجاج جس وقت دار المناقب میں جمع ہوئے تو ایک سیلاب آیا اور اکثر حجاج کو بہا لے گیا۔

۴۹۱ھ اہل فرنگ نے شام پر پہلی پیش قدمی کی تھی اور جو لوگ دریائے قسطنطنیہ کے راستے سے ایک بڑی فوج کے ساتھ آئے تھے انہوں نے یہاں اپنی مرضی کے موافق خوب کفر جاری کیا۔

۴۹۲ھ اہل فرنگ نے ڈیڑھ سال کی قلعہ بندی کے بعد بیت المقدس کو فتح کیا اور اس کے ساتھ علماء و زہاد کی ایک جماعت کو جس کی تعداد ستر ہزار سے بھی زائد تھی قتل کر ڈالا۔ یہودیوں کو ایک کنیسہ میں جمع کر کے اُس میں آگ لگا دی۔ باقی ماندہ لوگ بغداد آ گئے اور اُنہوں نے وہاں کے ایسے ایسے مظالم بیان کئے کہ جن کو سُن کر لوگوں کے آنسو بے اختیار نکل آئے۔ ان اندوہناک مظالم کو سُن کر شاعروں نے ایسے پُر زور قصیدے لکھے کہ بادشاہوں نے غیرت زدہ ہو کر بالاتفاق حملہ کر دیا اور بیت المقدس فرنگیوں سے چھین لیا۔

۴۹۴ھ عراق میں باطنیوں کا زور پھیل گیا۔

۴۹۸ھ بغداد میں چیچک کے مرض کا اتنا زور رہا کہ لاتعداد بچے ضائع ہو گئے اس کے بعد سخت وبا پھیل گئی۔

۴۹۹ھ نہاوند میں ایک شخص نے نبوت کا دعوےٰ کیا بہت سے آدمی اُس کے ساتھ ہو گئے۔ آخر قتل کر دیا گیا۔

۵۰۰ھ قلعہ اصفہان جو باطنیوں کے قبضہ میں تھا، سلطان محمد نے ایک سخت محاصرہ کے بعد چھین لیا۔

۵۰۴ھ مصر میں ایسی کالی آندھی آئی کہ مارے اندھیرے

کے ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔

۵۱۱ھ ایک سیل آیا اور سخت بارش ہوئی جس کی وجہ سے بخارا اور گرد و نواح کے اکثر گاؤں ڈوب گئے۔ بہت سے آدمی ہلاک ہو گئے۔ حتّٰی کہ شہر کے دروازے تک پانی پہنچ گیا۔ دروازہ کو چند فرسخ تک پانی بہا لے گیا اور وہ مٹی کے اندر چھپ گیا۔

۵۲۴ھ بغداد میں پرواز بچھو ظاہر ہوئے جن کے دو کانٹے ہوتے تھے۔

۵۳۱ھ ۲۹ رمضان شریف کو چاند نہ دکھلائی دیا۔ اہلِ بغداد نے تمام دن روزہ رکھا۔ اور جس وقت شام ہوئی تو ۳۰ تاریخ کو بھی چاند نظر نہ آیا، حالانکہ مطلع بالکل صاف تھا یہ ایک ایسی بات تھی جو کبھی نہ ہوئی تھی۔

۵۳۴ھ بغداد میں سخت زلزلہ آیا اور اس مرتبہ بغداد پانی کی طرح ہل گیا۔ حلوان کا ایک پہاڑ ٹوٹ کر گرا۔

۵۴۵ھ یمن میں خون کی بارش ہوئی۔ زمین کئی روز تک سرخ رہی۔ لوگوں کے کپڑے بھی سرخ ہو گئے۔

۵۶۹ھ سلطان نورالدین نے آشیانۂ خلافت میں بہت سے تحائف روانہ کئے جن میں ایک گدھا بھی تھا جس کے بدن پر خط بنے ہوئے تھے، وہ گدھا بہت کودنے والا تھا۔ خطوط کی وجہ سے اس کو عتابی کہتے تھے۔ اس سال نارنگی کے برابر اولے پڑے جن کی وجہ سے گڑھے پڑ گئے۔ مویشی مر گئے۔ دجلہ اس قدر چڑھ آیا کہ بغداد ڈوب گیا۔ فرات چڑھ آیا جس کی وجہ سے گاؤں اور کھیتیاں غرق ہو گئیں مگر یہ بات تعجب کی ہے کہ اس قدر پانی ہونے کے باوجود دجیل کے باغات اور کھیت بغیر پانی کے سوکھ گئے۔

۵۷۴ھ بغداد کے اندر نہایت زور و شور کی آندھی رات کے قریب آئی اور آسمان کے اطراف میں آگ کے مینار سے قائم ہو گئے لیکن صبح کو یہ بات جاتی رہی۔

۵۷۶ھ الناصرالدین کے واسطے ہندوستان سے ایک آدمی ایسا طوطا لے گیا جو "قُل ہُوَ اللّٰہُ اَحَد" پڑھتا تھا لیکن جب وہ بغداد پہنچ چکا تو رات کو طوطا مرا ہوا پایا۔ صبح کو وہ شخص بہت پریشان ہوا، اتنے میں خلیفہ کا ایک خادم آیا۔ اور اس نے اس سے وہ طوطا طلب کیا۔ یہ رو پڑا اور کہا کہ وہ تو رات کو ہی مر گیا۔ خادم نے کہا ہاں مجھے معلوم ہے کہ وہ مر چکا۔ لا مرا ہوا ہی دے دے اور یہ بتلا کہ تجھے خلیفہ سے کتنے انعام کی توقع تھی اس نے کہا پانچ سو دینار کی امید کر کے چلا تھا۔ خادم نے پانچ سو دینار کھول کر رکھ دیئے اور کہا یہ لے خلیفہ نے تجھے عنایت کئے ہیں جس وقت تو ہندوستان سے لے کر چلا تھا اسی وقت خلیفہ کو تیری خبر ہو گئی تھی۔

۵۸۲ھ ساتوں ستارے برج میزان میں جمع ہو گئے۔ اس پر منجموں نے حکم لگایا کہ جمادی الآخر کی نویں رات کو سخت آندھی آئے گی جس سے تمام شہر کے مسمار ہونے کا اندیشہ ہے۔ لوگوں نے یہ سن کر گڑھے کھود کر ان میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ کھانا اور پانی بھی ان گڑھوں میں لے گئے اور نہایت تشویش کے ساتھ اس رات کا

انتظار کرنے لگے جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ قومِ عاد کی سی آندھی
آئے گی۔ لیکن اُس رات اتنی بھی ہوا نہ چلی کہ چراغ بھی گل کر دے

۵۹۱ھ ناصر الدین اللہ نے نامہ بر کبوتروں کے لئے ایک
وسیع محکمہ قائم کیا۔

۵۹۲ھ مکہ معظمہ میں کالی آندھی آئی جس کی وجہ سے دُنیا
میں اندھیرا چھا گیا۔ لوگوں پر سُرخ ریت برسی۔ رُکنِ یمانی
سے ایک قطعہ گر گیا۔

۵۹۳ھ ایک بہت بڑا ستارہ ٹوٹا اور اس کے ٹوٹنے
کے ساتھ اس قدر سخت دھماکا ہوا جس کی وجہ سے مکان
اور دیواریں ہل گئیں۔ لوگوں نے خیال کیا قیامت آگئی۔
اس سال ملک العزیز سلطان صلاح الدین کے بیٹے نے اہرام
مصر کو ڈھانا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

۵۹۶ھ دریائے نیل کا پانی اُتر گیا اور تیرہ گز تک پانی اندر
کی طرف ہو گیا اس کی وجہ سے اتنا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے
مُردار اور چمڑے کھلم کھلا کھانے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ
لوگ بھوک کے مارے مُردوں کو قبر سے اُکھاڑ اُکھاڑ
کر کھانے لگے۔ مصر بالکل تباہ ہو گیا۔ بھوک کے مارے اتنی
مخلوق مر گئی کہ جدھر قدم یا آنکھ پڑتی تھی۔ مُردوں پر پڑتی
تھی، مُردوں سے سڑک پٹی رہتی تھی۔ ان کا گوشت
پرند یا چوپائے کھاتے ہوئے دکھلائی دیتے تھے۔

۵۹۷ھ مصر، شام میں نہایت سخت زلزلہ آیا جس کی وجہ
سے مکان اور قلعے منہدم ہو گئے اور بصرہ کے قریب گاؤں
دھنس گئے۔

۵۹۸ھ مصر کا قحط ختم ہوا۔

۵۹۹ھ محرم کی چاند رات کو صبح تک اس قدر تارے
ٹوٹے کہ ٹڈیوں کی طرح اُڑتے ہوئے معلوم ہوتے تھے

۶۰۰ھ اہلِ فرنگ نے دریائے نیل کے راستہ سے
اشہد پر حملہ کیا۔ شہر پر قبضہ کر کے اس کو خوب لوٹا اور قتل و
غارتِ عام کر کے چلتے بنے۔

۶۵۲ھ عدن میں ایک آگ ظاہر ہوئی۔ اُس کے
شرارے رات کو سمندر کی طرف اُڑتے ہوئے معلوم ہوتے
تھے اور دن کو دریا سے دھواں اُٹھتا ہوا دکھلائی دیتا تھا
اور اسی سال مدینہ طیبہ میں بھی آگ ظاہر ہوئی۔

۶۶۱ھ بہت سے تاتاریوں نے ممالکِ اسلام میں سکونت
اختیار کی۔

۶۶۳ھ مصر میں ایک سخت زلزلہ آیا۔

۶۶۴ھ قاہرہ کے مختلف مقامات میں آگ لگی اور اسی
سال تاتاریوں کا سردار ہلاکو مرا۔

۶۶۵ھ الحاکم باللہ نے حسینیہ میں جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا

۶۷۸ھ لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی اور
شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں۔

۶۷۹ھ دیارِ مصر میں عرفہ کے روز بڑے بڑے اولے
پڑے اور بجلی گری۔

۶۸۰ھ تاتاری لشکر شام پہنچا اور مسلمانوں سے گھمسان
کی لڑائی ہوئی اور فتح مسلمانوں ہی کو ہوئی۔

۷۰۲ھ مصر اور شام میں ایک بہت بڑا زلزلہ آیا مکانوں

کے نیچے اکثر آدمی دب کر مر گئے۔

۷۱۸ھ دریائے نیل برابر چڑھا رہا اور ساڑھے تین مہینے متواتر کھڑا رہا اس کا نقصان اس کے نفع سے بہت زیادہ تھا

۷۱۹ھ دریائے نیل میں اتنی طغیانی آئی کہ کہیں سننے میں بھی نہ آئی تھی۔ بہت سی بستیاں اور آدمی ڈوب گئے۔

۷۲۰ھ مکہ معظمہ کی مسجد حرام اور اُس کے دروازوں کی تعمیر کی گئی۔

۷۳۳ھ کعبہ شریف کا دروازہ آبنوس کا بنوایا گیا۔ اور اس پر سونے کے پترے چڑھوائے گئے جن کا وزن پینتیس ہزار تین سو پینتالیس مثقال تھا۔ باب عتیق جس پر والی یمن کا نام کندہ تھا اکھاڑ دیا گیا۔

۷۴۴ھ محمد تغلق دہلی کے تخت پر بیٹھکر منصوبہ بندی کے سلسلہ میں سب بادشاہوں پر فوقیت لے گیا۔

۷۴۹ھ ایسا طاعون پھیلا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

۷۶۳ھ ہندوستان میں سخت قحط پڑا جس میں آدمی نے آدمی کو کھایا۔

۷۷۳ھ طاغی تیمور لنگ نے خروج کیا جس نے ہزاروں لوگوں کو ہلاک اور شہروں کو تباہ کیا۔

۷۷۶ھ دمشق میں سخت قحط پڑا۔

۷۷۸ھ آفتاب و مہتاب دونوں کو پورا گہن لگا۔ شعبان کی ۱۴ تاریخ کو جب چاند نکلا تو گہن لگا ہوا تھا اور ۲۸ شعبان کو جب سورج نکلا تو گہن لگا ہوا تھا۔

۷۸۲ھ حلب میں جامع مسجد کے اندر امام صاحب نماز پڑھا رہے تھے کہ کسی نے بیہودہ بکنا شروع کیا۔ امام صاحب نے نیت نہ توڑی بلکہ نماز پوری کر کے جب سلام پھیرا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس بیہودہ بکنے والے کی صورت سؤر کی سی ہو گئی ہے اور وہ جنگل کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔

۸۱۲ھ پہلے دن دریائے نیل اس قدر نیچے اُتر گیا کہ جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پھر خود بخود ہی اتنا چڑھ آیا کہ معمول سے بائیس گز اُوپر ہو گیا۔

۸۱۹ھ مصر میں ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ میں آسمان پر گیا اور وہاں خدا کو دیکھا اور ہمکلام ہوا لیکن لوگوں نے پاگل خیال کر کے پاگل خانہ میں بھجوا دیا۔

۸۲۲ھ آذربیجان میں ایک سخت زلزلہ آیا جس کی وجہ سے اکثر آدمی مر گئے۔

۸۲۳ھ شہر غزہ میں ایک اونٹ ذبح کیا گیا تو اس کا گوشت اس طرح چمکتا تھا جیسے چراغ چمکتا ہے۔ اس میں سے تھوڑا سا کتے کو ڈالا تو اُس نے بھی نہ کھایا۔

۸۲۴ھ دریائے نیل اپنے پورے منتہا تک چڑھ آیا جس کی وجہ سے بہت سی زراعت غرق ہو گئی۔

۸۲۵ھ قاہرہ میں ایک خفیف زلزلہ آیا اور دریائے نیل بڑا ہو گیا۔

۸۶۲ھ ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا۔

۹۱۱ھ اسپین کے سیاح کولمبس نے سب سے پہلے امریکا کا پتہ لگایا۔ ہسپانیوں نے غرناطہ پر حملہ کیا اور عربوں کو اندلس سے نکال دیا۔

۹۴۷ھ ترکوں نے وائنا پر حملہ کیا۔

۹۷۵ھ ہندوستان میں اکبرِ اعظم تخت نشین ہوا۔

۹۹۶ھ عمرِ خیام نے ۱۰ رمضان المبارک کو سنہ جلالی کی بنیاد ڈالی۔

۱۰۰۱ھ گری گورین اول کا فرمان اسپین، اٹلی، پرتگال، فرانس سوئٹزرلینڈ، جرمنی، نیدرلینڈ کے کیتھولک فرقوں میں جاری ہوا۔

۱۰۳۲ھ ہندوستان میں انگریز پہلی مرتبہ داخل ہوئے۔

۱۰۵۰ھ شاہجہاں نے ممتاز محل کی یادگار میں آگرہ کے اندر دُنیا کی سب سے حسین عمارت تاج محل کی بنیاد قایم کی۔

۱۰۷۵ھ شاہجہاں نے آگرہ کی موتی مسجد کو تعمیر کرایا۔

۱۰۶۰ھ دہلی کی جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔

۱۰۶۱ھ بمبئی کا احاطہ قائم ہوا۔

۱۱۰۹ھ کلکتہ کی بنیاد رکھی گئی۔

۱۱۲۶ھ اورنگ زیب فوت ہوا۔

۱۱۷۵ھ مشہور جنگ ہفت سالہ چھڑ گئی۔ یورپ، ہندوستان اور امریکہ تینوں کارزار قرار پائے۔

۱۱۷۶ھ انگلستان کے معاون فریڈرکِ اعظم نے فرانس کو ایک ایسی زبردست شکست دی کہ یورپ بھر میں اس کی ہوا اُکھڑ گئی اور اس فتح سے سلطنت جرمنی کی موجودہ عظمت کی بنیاد پڑی۔ کلائیو نے بھی اسی سال ہندوستان میں پلاسی کی مشہور لڑائی جیتی۔ جس سے کُل صوبہ بنگال پر انگلستان کا قبضہ ہوگیا۔

۱۱۷۸ھ امریکہ میں جنرل وُلف نے کوبیک کی لڑائی میں فرانسیسیوں کی ایسی خبر لی کہ ان کے اس ملک سے قدم اُکھڑ گئے۔

۱۱۷۹ھ کُل شمالی امریکہ پر انگلستان کا پھریرا لہرانے لگا۔

۱۲۰۲ھ انگلستان کو امریکہ کی آزادی تسلیم کرنی پڑی۔

۱۲۰۸ھ واشنگٹن امریکہ کا صدر مقرر ہوا۔

۱۲۲۴ھ نپولین پیرس میں داخل ہوا۔

۱۲۳۲ھ انگریزوں کا لنکا پر قبضہ ہوا اور اسی سال پتھر کے چھاپے کی کل ایجاد ہوئی۔

۱۲۴۹ھ ولایت میں پہلی مرتبہ ریل جاری ہوئی۔

۱۲۵۷ھ حصار، گوڑگانوہ، دہلی، اٹاوہ، مین پوری وغیرہ میں سخت قحط پڑا۔

۱۲۵۸ھ چین کی پہلی جنگ۔

۱۲۷۶ھ ہندوستان کا غدر مشہور ہے۔

۱۲۷۷ھ عمرِ خیام کی پچھتّر رباعیات کا انگریزی ترجمہ سب سے پہلی بار شائع ہوا۔

۱۲۸۰ھ اس قحط سے زیادہ ہندوستان میں کوئی سخت قحط نہ پڑا۔

۱۲۹۵ھ چین میں ریل جاری ہوئی۔

۱۲۹۶ھ روس اور ٹرکی میں لڑائی اسی سال ہوئی۔

۱۳۰۰ھ مصطفےٰ کمال پاشا سالونیکا میں پیدا ہوا۔

۱۳۲۴ھ پنجاب میں ایک زبردست زلزلہ آیا۔

۱۳۲۵ھ روس اور جاپان میں جنگ ہوئی۔

۱۳۳۸ھ افغانستان کی لڑائی مشہور ہے۔

۱۳۳۹ھ اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا اور تمام قوم پرستوں کو جزیرۂ مالٹا میں بھیج دیا۔ مجلسِ ملی کبیر کا اجلاس انگورہ میں۔ یونان کا حملہ۔ یونانیوں نے ترک قوم پرستوں کو قسطنطنیہ سے نکال دیا۔

۱۳۴۰ھ یونانیوں کی شکست اور مصطفےٰ کمال ترکی کا پہلا ڈکٹیٹر بنایا گیا۔

۱۳۴۱ھ سمرنا پر ترکوں نے قبضہ کرلیا اور چنک کے مقام پر انگریزوں سے لڑے۔

۱۳۴۲ھ انگورہ کو دارالسلطنت بنایا گیا۔

۱۳۴۴ھ مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافت کو ملیا میٹ کر کے جدید ترکی کی بنیاد ڈالی اور قدامت پسند دیو کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔

۱۳۴۶ھ شام کو ایک نور آسمان پر پیدا ہؤا اور اس نور میں "محمد" کا نام بخطِ نور نظر آیا۔ جو بہت دیر تک قائم رہا اور اس کو بہت سے شہروں میں لاکھوں ہندو مسلمانوں نے دیکھا اور اس واقعہ کی تصدیق جبلپور کے یورپین کلکٹر نے کی۔

۱۳۴۷ھ کشمیر میں زبردست سیلاب آیا۔ جس سے بڑی تباہی ہوئی۔ امیر امان اللہ خاں شاہِ کابل بھی اسی سال تخت سے دست بردار ہوئے۔

۱۳۵۳ھ صوبۂ بہار میں زلزلہ آیا جس سے بہت زیادہ نقصان ہؤا۔

۱۳۵۴ھ کوئٹہ کا زلزلۂ عظیم اب تک دلوں سے نہیں بھلایا جا سکا۔

۱۳۵۵ھ حبش والوں کو اپنی آزادی اٹلی کے حوالہ کرنا پڑی۔

۱۳۵۶ھ شہنشاہ جارج ششم کی تخت نشینی اور اسکندونہ کی واپسی۔

۱۳۵۷ھ ترکی میں ایسا قیامت خیز زلزلہ آیا کہ جس کی مثال پہلے کبھی ترکی میں نہیں ملتی۔ آٹھ سو آدمی ہلاک اور لاپتہ ہیں پچاس ہزار اشخاص بے گھر بار مارے مارے پھر رہے ہیں ہزارہ گاؤں صفحۂ ہستی سے قطعی نیست و نابود ہو گئے اور ۲۲ گاؤں تباہ و برباد ہو گئے زمین شق ہو گئی اور اس میں سے گرم پانی اُبل اُبل کر نکلنے لگا جاپان میں ایک زبردست سیلاب آیا اور اس سال شاعرِ اعظم علامہ اقبال کی وفات ہوئی —

اب آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

کامدار اُلدنی

نوٹ:۔ اس مضمون میں بعض واقعات غیر اہم اور بعض مشتبہ نوعیت کے ہیں۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی مضمون مفید ہے۔ اور نوجوان مؤرخ کامدار صاحب کی کاوش حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔ "ہمایوں"

یادِ اقبال

آہ! اے اقبال! اے ہندوستاں کے رہنما
کاروانِ قوم کے، سارے جہاں کا رہنما

یاد آتی ہیں تری رنگیں نوائیں آہ آہ
خواب بن کر رہ گئیں تیری صدائیں آہ آہ

کیا ہوا بزمِ جہاں میں گر نہیں موجود تو
نام دُنیا میں ترا وردِ زباں ہے چارسُو

موت کیا ہے؟ صورتِ ظاہر کا چھپ جانا کہیں
اس سے ہو جاتے ہیں لیکن جوہرِ شاعر مُبیں

موت پا کر جاودانی ہو گئی ہستی تری
موت نے پیغام تیرا کر دیا ہے سرمدی

روز و شب پیغامِ آزادی ہمیں دیتا ہے تو
اب بھی کشتی قوم کی، گرداب میں کھیتا ہے تو

تو پڑھاتا ہے ہمیں اب بھی وہی درسِ خودی
سونپ دی تدبیر کو تُو نے عناں تقدیر کی

رہنمائے نوعِ انساں اب بھی تیرا فلسفا
ہے جہاں میں جادۂ روشن برائے ارتقا

اب بھی کرتی ہے تری تعلیم دل پر وہ فسوں
چند لمحوں میں اُلٹ جاتی ہے تقدیرِ نگوں

کھول دیں گے اک زمانے پر خودی کا راز ہم
بسکہ ہیں گرمِ عمل سُن کر تری آواز ہم

منوہر لال ہادی

نغمۂ اقبال

مبارک تجھ کو اے اقبال ذوقِ زمزمہ خوانی
فروغِ محفلِ ملّت ہے تیری شعلہ افشانی

فضائے اوجِ انسانی پہ تو آباد ہے گویا
غلامی کے جہاں کا طائرِ آزاد ہے گویا

سوادِ ہند میں چھیڑا ربابِ دل نشیں تو نے
دیا دنیا کو پیغامِ محبت آفریں تو نے

تری تخئیل نے مردہ دلوں کو زندگی بخشی
جبینِ ذرّۂ ناچیز کو تابندگی بخشی

وہ تیرا نغمۂ رنگیں نشاطِ روح کا ساماں
مجسم رقص و موسیقی سراپا شعلۂ لرزاں

ترا نغمہ جنودِ ہند کو ہے درسِ بیداری
خرامِ موجِ آزادی، پیامِ اوجِ خودداری

ترا نغمہ عدو کے مکر کو بیکار کرتا ہے
جوانانِ وطن کو خواب سے بیدار کرتا ہے

فضائے روح پر چھایا سحابِ زندگی بن کر
گیا ہر باغِ ملّت میں شبابِ تازگی بن کر

عراق و ہند سب گرما گئے تیری نواؤں سے
عرب سے تا عجم چھائے ہوئے ہیں زمزمے تیرے

حجازی نغمہ کی لہریں ہیں بھارت کی ہواؤں میں
ہے بوئے گلشنِ بطحا ہمالہ کی فضاؤں میں

ہربنس لعل نسیم

ماضی حال اور مستقبل

یہ مضمون انگلستان کے مشہور مضمون نگار و فلاسفر مسٹر ایچ۔ جی۔ ویلز کے آیندہ زمانے کے متعلق خیالات کا نچوڑ ہے۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ یورپ کے حالات پر مبنی ہے۔ یعنی جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ ۱۸۸۷ء میں یہ حالت تھی اب یہ ہے اور پچاس سال کے بعد یہ ہوگی تو وہ صرف انگلستان یا زیادہ سے زیادہ یورپ کے حالات ہی کو مدِ نظر رکھ کر خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جو حالات وہ آج کل کے زمانے کے بتاتے ہیں وہ موجودہ ہندوستان پر عائد نہیں ہوتے بلکہ یورپ میں پچاس سال پہلے کی جو زندگی بیان کی گئی ہے وہ کم و بیش آج کل ہندوستان کی زندگی ہے۔ (ج)

مستقبل کے متعلق کوئی صحیح اندازہ لگانا ناممکنات میں سے ہے۔ باوجود اس کے ہم یہ ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ آئندہ زمانے میں کیا کیا امکانات موجود ہیں۔ آج کل کی دُنیا میں چاروں طرف جنگ و جدل کے مہیب بادل چھائے ہوئے ہیں جو یقیناً انسانی زندگی کے لئے خطرناک ثابت ہوں گے لیکن پھر بھی پچاس سال آئندہ کے عام لوگ ہم لوگوں سے کئی باتوں میں اچھے ہوں گے۔ یہ بربادیاں اور آفتیں جو آج کل ہم لوگوں کے سامنے نازل ہو رہی ہیں عام زندگی کی ترقی اور نئی ایجادات کو ہرگز نہ روک سکیں گی بلکہ نئی ایجادوں میں کچھ تاخیر بھی نہ ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی زندگی کا لازمہ ہے۔ شاید آدمی ابھی "انسان" نہیں بنا۔ قدیم وقتوں میں جب دُنیا میں تمام طرف تاریکی تھی اس وقت بھی دُنیا ساکت و ساکن نہ تھی بلکہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اور وقت کی تقسیم، فنِ جہاز رانی، علم کیمیا اور دھاتوں کے صاف کرنے کا فن ـــــ یہ تمام ترقی کر رہے تھے اور واقفیت کی روشنی میں آہستہ آہستہ نمودار ہو رہے تھے۔

۱۸۸۷ء کی زندگی:۔

۱۸۸۷ء میں عام لوگ گرہستی زندگی بسر کرتے تھے۔ صاحبِ خانہ کی ایک بیوی اور تین چار سے لے کر درجن بھر تک بچے ہُوا کرتے تھے۔ تمام کام گھر میں ہی ہُوا کرتا تھا، گھر کی صفائی گھر والے خود ہی کیا کرتے تھے۔ کپڑے گھر ہی میں دھوئے جاتے تھے۔ بچوں کے کپڑے گھر ہی میں سلتے تھے۔ کھانا گھر ہی میں پکتا اور گھر ہی میں کھایا جاتا تھا۔ ابھی لوگ "تیار کھانا" اور بند ڈبے کے مربّے اچار وغیرہ سے ناواقف تھے۔ دیہات میں ترکاری کے کھیت تھے۔ بچوں کو جس قدر جلد ممکن ہو سکتا تھا گھر کے کام میں لگا دیا جاتا تھا۔ اُن کی تعلیم بارہ تیرہ برس کی عمر تک یا اس سے بھی پیشتر ختم ہو جایا کرتی تھی اور تعلیم کے مدارج اکثر "گھر" ہی میں طے

ہوتے تھے ۔ یہ تھی وہ گھریلو زندگی جو اُن لوگوں کے نصیب میں تھی ۔

معاشرتی زندگی بھی زیادہ وسیع نہ تھی ۔ چند احباب کچھ ہمسائے اور زیادہ تر اپنے عزیز و اقارب بس انہی لوگوں سے ربط ضبط اور میل جول ہوتا تھا ۔ مرد میل ملاپ کے لئے اکثر شراب خانوں میں کچھ وقت گزارتے تھے ۔ اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کے نام سے وہ لوگ گھبراتے اور خوف کھاتے تھے ۔ ہر نئی چیز اور نئے خیال کو ایک انوکھی حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔

آجکل کی زندگی :۔

آج کل مذکورہ بالا قسم کے گھر کا وجود اقتصادی حالات کی وجہ سے ناممکن ہوتا جارہا ہے ۔ گھر میں بچوں کی تعداد میں نمایاں کمی ہوگئی ہے اور اب ان سے گھر کے کاموں میں بھی مدد نہیں لی جاتی ۔ اب گھر کے معنی صرف وہ چند کمرے ہیں جس میں ایک کنبہ سوتا ہے اور کھانا کھاتا ہے ، اسکول اب بچوں کی تعلیم و تربیت کا مرکز ہوگیا ہے اور بچوں کے کھیل کود اور تفریح کا سامان بھی وہیں مہیا کر دیا جاتا ہے ۔ اسکولوں کی تعداد اور اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے ۔ گھروں میں اب بہت تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں "گھر کی زندگی" تو اب غائب ہورہی ہے ۔

آج کل کا ایک عام شہری ۱۸۸۱ء کے عام لوگوں سے زیادہ تندرست ہے اور زیادہ دلچسپ زندگی بسر کرتا ہے ۔ اس کو مقابلتہً عام واقفیت بھی زیادہ ہے ۔ اپنے آبا و اجداد کے مقابلے میں اچھا کھاتا اچھا پہنتا اور اچھے مکانوں میں زندگی گزارتا ہے ۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز میں ایک "حسن" ہوتا ہے جس کو معلوم کرنے کے لئے انسان اُس پر غور کرتا ہے کام کرنے کے صحیح طریقے پر جتنا غور آج کل کیا جاتا ہے شاید کبھی یہ کیفیت نہ تھی ۔ آج کل کے لوگ روز بروز ترقی کی طرف مائل ہو رہے ہیں ۔ آپ چاہے ڈکٹیٹر ہوں یا جمہوریت میں اعتقاد رکھتے ہوں ۔ کوئی افسر ہوں یا کسی بھی عہدہ پر ممتاز ہوں اگر آپ پانی کا جہاز یا ہوائی جہاز بنانا چاہتے ہیں یا بجلی سے ایک شہر کو روشن کرنا چاہتے ہیں یا مدرسوں کی استعداد بڑھانا چاہتے ہیں ، آپ کو ہر حالت میں چند خاص طریق اختیار کرنے پڑیں گے اگر ایسا نہ کریں گے تو کامیابی حاصل نہ ہوگی ۔

آج کل دُنیا بہت منوّر ہے ۔ روس کا مشہور حکمران پیٹر اعظم عوام اور دُنیا سے چھپا کر ہر ایک بات کر سکتا تھا مگر زبردست اسٹیلن ایسا نہیں کر سکتا ۔ آج کل کے عام شہری کو خواہ وہ حاکم ہو یا غلام حکومت ایک خاص طرح رکھنے پر مجبور ہے ۔ حکومت کو سب کے لئے رہنے کی جگہ کا اور کھانے پینے کا انتظام کرنا پڑتا ہے ۔ سیر و تفریح کا سامان بھی مہیا کرنا پڑتا ہے ۔ عوام کی دلچسپیوں کا خیال رکھا جاتا ہے اور انہیں کسی قدر آزادی بھی دی جاتی ہے ۔

دُنیا روز بروز ترقی کر رہی ہے لاکھوں دماغ زندگی کو بہتر بنانے میں دن رات کوشاں اور مشغول رہتے ہیں ۔ ہم کسی بھی بنا پر یہ یقین نہیں کر سکتے کہ یہ ترقی بند ہو جائے گی یا یہ کوششیں رُک جائیں گی ۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ دُنیا کی ہر ایک

یز میں بھی ترقی ہوتی رہے گی۔ آہستہ آہستہ یہ انقلاب آتا رہے گا۔ دھیمے دھیمے بڑھتے ہوئے سیلاب کی طرح، جو اس کے سامنے
نے کی کوشش کرے گا منہ کی کھائے گا۔"

۱۹۸۷ء کی زندگی :-

انہی حالات کو مدِ نظر رکھ کر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ۱۹۸۷ء کی زندگی کیا ہو گی۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خانگی زندگی روز بروز
ِوال پر ہے پس ہم بلاشک یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۸۷ء میں خانگی زندگی کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا۔

اُس زمانے کے لوگ ہم لوگوں سے زیادہ توانا اور صحت مند ہوں گے اور قد میں بھی وسطاً ایک انچ کے لگ بھگ اونچے ہوں گے۔ وہ
ل زیادہ آزاد، زیادہ صاف گو اور صحیح معنوں میں خوش حال ہوں گے۔ ایک دوسرے کے کام سے انہیں دلچسپی ہو گی۔ حسد کا مادہ جاتا رہے گا۔ عام
وں سے انہیں انس ہو گا۔ طبیعت کے سست ہونے کی شکایت باقی نہ رہے گی۔

یہ خوش طبعی اُن کے لباس، اُن کی آرائش و آراستگی کے سامان، ان کے مکانات بلکہ شہروں کے نقشہ جات تک سے ظاہر ہو گی
سی جگہ یہ نوٹس لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہو گی کہ "یہ شارع عام نہیں ہے" یا "گزرنا منع ہے"۔ تمام راستے، گلیاں، سڑکیں کھیت
ر ایک کو خوش آمدید کہیں گے۔ ہر شخص ہر جگہ روک ٹوک کے بغیر جا سکے گا۔ بڑے بڑے کارخانوں میں بھی لوگ آزادی سے داخل ہو سکیں گے
ر کاریگروں کو چلتی ہوئی مشینوں پر کام کرتے ہوئے دیکھ سکیں گے۔ کوئی بات پوشیدہ نہ رہے گی اور نہ رکھی جائے گی۔

دستکاروں کو بہت سی نئی نئی چیزیں استعمال میں لانے کی مل جائیں گی۔ مکانات اب تک لکڑی پتھر اور اینٹوں سے ہی بنا کرتے
تھے۔ پھر لوہا بھی استعمال میں آنے لگا۔ اب چند ہی سال سے شیشہ بھی استعمال میں لایا جا رہا ہے کپڑے ہمیشہ سے اُون روئی، سلک یا سمور کے بنتے چلے آئے ہیں
ر آج کل دستکاروں اور کاریگروں کو ہزاروں زیادہ پائدار اور زیادہ خوبصورت نئی نئی چیزیں حاصل ہو گئی ہیں۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ہنری فورڈ
ِہ رہا تھا کہ اب میری موٹریں سویا بین کے بیجوں سے بنا کریں گی! کئی پُرانے خیالات کے کھوسٹ بُڈھے اپنی آنے والی نسلوں کو بدکار، سرکش، مصنوعی
بے حس، فضول خرچ اور بے وقوف سمجھتے ہیں۔ شاید وہ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: "واہ تم بھی خوب ہو، خوب تمہاری زندگی ہے۔
اہ ری نئی دُنیا واہ"۔ آئندہ آنے والی نسلوں سے ہمیں بہت اُمیدیں ہیں۔ چاہے کتنی ہی تباہ کاریاں اور حادثات پیش آئیں پھر بھی وہ لوگ
م سے زیادہ صحت مند زیادہ کشادہ دماغ اور زیادہ وسیع تعلقات والے ہوں گے۔ ہر چیز سے انہیں دلچسپی ہو گی۔ دن خوب بڑے بڑے ہوں گے۔ لوگوں
و خوب فرصت ملا کرے گی کیونکہ بہت سے کام مشینوں سے ہوا کریں گے۔ عام شہری اس زمانے میں بھی ایک کاریگر ہو گا لیکن زیادہ گندہ اور محنت طلب کام سب
شینیں کیا کریں گی۔ اس زمانہ کا ایک ادنیٰ ترین کاریگر آج کل کے اچھے اچھے کاریگروں سے بہتر ہو گا۔ آپ یہ پوچھیں گے "کیا وہ لوگ کچھ زیادہ خوشی اور
ناعت کی زندگی بسر کریں گے؟" ہرگز نہیں۔ وہ بھی ہر ایک نئی چیز کو مشکوک نگاہوں سے دیکھیں گے۔ نئی روشنی اور نئے خیالات کو بُرا بھلا کہتے پھریں گے
رانے وقتوں کو وہ ایک حسرت بھری نگاہ سے دیکھیں گے اور شکر کریں گے کہ وہ ۲۰۳۷ء میں جب اور بھی تبدیلیاں ہو جائیں گی زندہ نہیں رہیں گے۔

"حامد"

محفلِ ادب

آستانِ اقبال پر سجدہ ہائے عقیدت

(محمد فاضل)

حضرت علامۂ مرحوم کی شخصیت کی عظمت و مرتبت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ کروڑوں دلوں نے ان کے قدموں پر جبینِ نیاز خم کی لاتعداد انسانوں نے ان سے ملاقات کرنا اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور موجبِ فخر و مباہات واقعہ سمجھا۔ انہیں شہرتِ دوام حاصل ہوئی اور ان کا نام ان کی زندگی ہی میں اقصائے عالم میں پھیل گیا۔

حضرت علامۂ مرحوم کا نام میں نے پہلے پہل اپنے گاؤں کے سکول میں سُنا۔ "پوٹھوہار" تحصیل گوجر خاں کے اس دیہاتی علاقہ میں جہاں علم و ادب کو عنقا و ہما کا درجہ حاصل ہے اور جس علاقہ کے باشندوں کی جہالت دیکھ کر اسے "جاہلستان" کہنا زیادہ موزوں ہے لوگ دُنیا کے تمام نشیب و فراز سے ناواقف مگر حضرتِ مرحوم کے نام سے شناسا تھے۔ چوتھی یا پانچویں جماعت میں حضرت کا نام کانوں پڑا اور ساتھ ہی اپنے بعض اُستادوں سے سُننے میں آیا کہ سر محمد اقبال بڑے شاعر ہیں۔ لاہور رہتے ہیں اور ڈاکٹری پیشہ کرتے ہیں لیکن وہاں اس سے زیادہ کچھ نہ پتہ چل سکا کہ ڈاکٹر صاحب نے "نالۂ بلبل" اور "ہندوستاں ہمارا" کے سِوا کچھ اور بھی لکھا ہے۔

مڈل کی جماعتوں میں حضرت علامہ کی نظم "کوہِ ہمالہ" سماعت نواز ہوئی۔ اس نظم سے ہم اور تو کچھ حاصل نہ کر سکے۔ البتہ اس کے پہلے بند کے معانی پر اپنے اساتذہ کو خاموش اور انگشت بدنداں دیکھ کر یقین ہو گیا کہ سر اقبال کوئی بڑے آدمی ہیں کیونکہ ان کے شعر ہمارے اُستاد بھی نہیں سمجھ سکتے۔ حضرتِ علامہ کی شہرۂ آفاق نظم "شکوہ" تعلیم ختم کر چکنے کے بعد کسی کے پاس دیکھی اور پڑھی۔ "شکوہ" پڑھنے کے بعد احساس ہُوا کہ اس نظم کا لکھنے والا بڑا شاعر ہی نہیں بہت بڑا انسان بھی ہے۔

انہی ایام میں حضرتِ علامہ کو نادر شاہ شاہِ افغانستان کی دعوت پر افغانستان جانا پڑا اور خوش قسمتی سے ایک اخبار میں کے جانے کی تاریخ بھی مجھے معلوم ہو گئی۔ "فرنٹیئر میل" جس پر حضرتِ مرحوم کو سفر کرنا تھا ہمارے گاؤں کے نزدیک گوجر خاں سٹیشن پر ٹھہرتی تھی۔ گوجر خاں ہمارے گاؤں سے ۱۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ حضرت علامہ کے ساتھ سید راس مسعود مرحوم اور سید سلیمان ندوی ہم سفر تھے۔ مولانا غلام رسول مہر پرائیویٹ سکرٹری کی حیثیت سے حضرتِ مرحوم کے ہمراہ تھے۔ میں اپنے برادرِ محترم نیک محمد صاحب ساتھ لے کر گوجر خاں چلا گیا۔ ٹرین آئی تو ہمیں حضرت علامہ کا شاہی ڈبہ ڈھونڈنے میں کچھ دقت نہ ہوئی جونہی ہم ڈبہ کے پاس

بر کے "حصّۂ کچن" کا دروازہ کھلا اور ایک ہٹا کٹا نوجوان کوٹ پتلون میں ملبوس دکھائی دیا۔ میں نے خیال کیا کہ ہو نہ ہو۔ یہ یا تو ڈاکٹر اقبال
ں یا سید راس مسعود۔ وہ بھی نہیں تو مولانا مہر ہوں گے ورنہ راس مسعود کے پرائیویٹ سکرٹری ہوں گے۔ بہر حال میں نے جھک کر نہایت
دبانہ سلام کیا۔ اور مرعوب ہو کر کچھ بے معنی سا سوال کیا۔ معلوم ہوا کہ میرے قیاسات غلط تھے اور وہ بچارے کوئی ملازمین میں سے تھے
وں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب وغیرہ کو میں جانتا تو نہیں مگر جو ہیں وہ ڈبہ کی اگلی طرف ہیں۔ ہم آگے کی طرف بھاگے۔ دروازے بند تھے
تے ڈرتے شیشوں میں سے جھانکنا شروع کیا۔ تین آدمی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جن میں مولانا غلام رسول مہر غالباً نہیں تھے ہم
ے تینوں حضرات میں سے ایک کو ڈاکٹر اقبال، ایک کو راس مسعود مرحوم تصوّر کر کے دیکھ لیا اور مطمئن ہو گئے کہ آج ہم نے اپنی قوم کے دو
ے آدمیوں کو دیکھ لیا۔ سید سلیمان ندوی غالباً وہاں نہ تھے کیونکہ ان تینوں میں داڑھی والا کوئی آدمی نہ تھا۔

مدرسی کے مختصر سے زمانہ میں لاہور کے اخبارات اور ادبی رسائل کو دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ اے کاش! میں بھی اسی علم و ادب کی
نیا میں چل رہوں۔ جو علوم و فنون کا مرکز اور سالک، مہر، حفیظ، تاثیر اور ظفر علی خان اور سب سے بڑھ کر اقبال کی قیام گاہ ہے۔ ان ناموں
راں کے قلم سے نکلے ہوئے جواہر پاروں کو پڑھ کر دل بے اختیار پکار اٹھتا تھا یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ مَعَھُمۡ۔ خدا نے میری دُعا سن
ں اور میں اپنے ایک کرمفرما کی نوازش سے اچھی یا بُری زندگی گزارنے کے لئے لاہور آگیا۔

لاہور آ کر بدقسمتی سے مجھے احمدیہ بلڈنگز کے لوگوں میں رہنا نصیب ہوا جو بیشتر کورِ ذوق اور جذبات و احساساتِ لطیف سے
عرا تھے۔ ان کی کورِ ذوقی نے مجھے بھی ایک عرصہ تک لاہور کی علمی ادبی فضا اور اربابِ ذوق کی صحبتوں سے محروم رکھا۔ مگر بالآخر فطرتی
یلانِ طبع تمام پابندیوں پر غالب آیا۔

ادھر میرے سمندِ شوق نے پابندیوں سے آزاد ہونے کے لئے پَر تولے۔ ادھر محترمی سالک صاحب کی محبوب شخصیت نے اپنی طرف
ھینچا۔ سالک صاحب سے نیازمندانہ راہ و رسم ہو جانے اور ان مجالس سے فیضیاب ہونے کے بعد اقبال کی عظمت معلوم ہونے لگی۔
در اقبال کو اقبال کی حیثیت سے میں نے سالک صاحب کے فیضان سے ہی دیکھا۔ ان ہی ایام میں حضرت علّامہ کے نیاز حاصل کرنے
کے لئے بے تابی پیدا ہوئی اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتی رہی۔

انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہونے والا تھا۔ حضرت مرحوم کی صدارت کا اعلان ہو چکا تھا۔ میری مسرت و شادمانی کی کوئی انتہا
تھی اور میں اس خیال سے بے خود ہوا جا رہا تھا کہ عنقریب اس پیکرِ علم و فضل کے دیدار سے مشرف ہونے والا ہوں۔ جو فخرِ ایشیا،
شاعرِ مشرق اور پیغمبرِ آزادی ہے۔

جلسہ سے دو تین روز قبل ایک کرمفرما کی زبانی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت علیل ہے اور وہ غالباً جلسہ میں تشریف نہیں لا
سکیں گے۔ اس خبر سے دل میں مایوسی و محرومی کی ایک لہر دوڑ گئی مگر آتشِ شوق اور تیز ہو گئی تھی اور میں نے اس احساس کے باوجود کہ

ایک حقیر ذرہ آفتاب سے کسبِ فیض تو کرسکتا ہے مگر اس سے مِل نہیں سکتا حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے اور شرف باریابی حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ انجمن کا جلسہ دیکھنے کی غرض سے میرے بچپن کے ہم وقت دوست قاضی گلزار احمد صاحب آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے حضرت علامہ کی خدمت میں حاضری کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں پہلے ہی بیتاب تھا۔ قاضی صاحب کو ساتھ لیا اور حضرت علامہ صاحب کی کوٹھی کا رُخ کیا۔ ان ایام میں حضرت مرحوم میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔ اپنے مکان سے لے کر کوٹھی کے دروازہ تک ہم ہمہ تن شوق بنے چلے گئے مگر دروازہ پر پہنچ کر ہیبت طاری ہوگئی۔ قاضی صاحب جو پہلے بہت بیتاب تھے دروازہ پر پہنچ کر کہنے لگے، کہاں جارہے ہو۔ ذرا سوچو تو میں اور تم جہالت مآب علاقہ کے دو اکھڑ نوجوان علم وادب سے بے بہرہ اور آفتابِ اقبالِ علم کے دربار میں، دو حقیر قطرے بحرِ بیکراں کے سامنے، کیا کرو گے وہاں جاکر۔ اور مجھے بتاؤ تو سہی کہ اگر ہم آستانِ حضرتِ اقبال تک پہنچ بھی گئے تو تم وہاں جاکر کہو گے کیا؟

یہ باتیں خود میرے دل میں بھی پیدا ہورہی تھیں۔ میرے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ تاہم بے پناہ جذبۂ آستان بوسی اور آفتاب علم کی کشش ہمیں باندھ کر وہاں تک لے ہی گئی۔ حاضری کی اجازت حاصل ہونے پر ملازم نے جس کمرے کی طرف ہماری رہنمائی کی اُسے دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی۔ دروازے پر لٹکی ہوئی چق زمانۂ قبلِ مسیح کی معلوم ہوتی تھی، متعدد مقامات سے ٹوٹی ہوئی اور پُرانی۔ مکان کے آس پاس کوئی امیرانہ ٹھاٹ کا سامان نہ تھا۔ بایں ہمہ ہم دونوں کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ چق اُٹھا کر اندر داخل ہوئے تو بظاہر ٹوٹی پھوٹی اور ڈھیلی سی چارپائی اور سادہ مگر صاف ستھرے بستر پر تاجدارِ فلسفہ وشعر جلوہ فرما تھا۔ نیچوان حُقہ پاس ہی پڑا تھا۔ ہم نے ہاتھ اٹھا کر علیک سلیک کے بعد حضرت علامہ نے بیٹھ جانے کو ارشاد فرمایا اور ہم دونوں پاس ہی رکھی ہوئی کرسیوں پر مبہوت وحیران بیٹھ گئے۔ نہ معلوم ہم کب تک ساکت وصامت بیٹھے رہتے مگر حضرت علامہ نے ذرہ نوازی فرماتے ہوئے مزاج پُرسی کی۔ جو کچھ بن سکا جواب دیا۔ حضرت علامہ کے گلے میں خراش تھی اور باتیں کرتے ہوئے تکلیف محسوس کرتے تھے، اگر آپ نے باتیں کیں ہم ہمہ تن گوش بنے سُنتے رہے۔ آدھ گھنٹے کی مختصر سی ملاقات کے بعد میں نے یہ کہہ کر اجازت لی کہ حضرت! آج ہمیں جہانِ علم وادب کی معراج نصیب ہوئی۔ یہ بھی حسرت مٹ گئی کہ ہم زندگی میں خدائے سخن وپیغمبر شعر وشاعری سے نہ مل سکے۔ حضرت نے مسکرا کر اجازت دی۔ ہم باہر نکلے تو موسم کے اعتدال کے باوجود ہمارے جسم پسینہ میں شرابور ہورہے تھے۔ جیسے ابھی ابھی بھٹی سے نکلے ہوں۔ یہ حاضری گو بہت مختصر تھی۔ مگر حضرت مرحوم کے فیضانِ نظر نے ان مختصر لمحات میں ہی اپنے مقام سے آگاہ کردیا۔

حضرت علامہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد جذباتِ عقیدت کئی اور منزلیں طے کرگئے۔ حضرت علامہ کی شفقت نے اور بھی جرأت بڑھادی اور کئی بار حاضر ہونے کا شرف حاصل ہُوا۔ بعض اوقات کئی کئی گھنٹے بیٹھے رہتے اور ارشادات سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔ میں نے حضرت کو اس بیماری کی حالت میں دیکھا تھا جو آخر اُن کی جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس کے باوجود ان کی شیریں گفتاری اور حقائق ریزی کا خیال آتا ہے تو اُن لوگوں کی قسمت پر رشک کرتا ہوں جنہوں نے اس بلبلِ شیریں نوا کو موسمِ بہار میں چہکتے سُنا۔

جب حضرتِ مرحوم میکلوڈ روڈ سے جاوید منزل میں چلے گئے تو میں نے جاوید منزل کو کوچۂ محبوب سمجھ لیا۔ کبھی دروازہ تک جاکر اور کبھی مکان

کے گرد اگرد طواف کر کے واپس آجاتا اور کبھی نیاز بھی حاصل کر لیتا۔

جون ۳۷ئہ میں لبنان کے ایک عرب شاعر سید جمال صاحب سیاحت کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے۔ خوش بختی سے ان کو لاہور کی سیر کرانے اور لاہور میں مقیم اکابر سے ملاقات کرانے کی خدمت شیخ محمد امین صاحب سوداگر چرم اور خاکسار کے سپرد ہوئی۔ سید جمال صاحب حضرت علامہ کے سوا ہندوستان کے کسی بڑے آدمی سے ملنے کے زیادہ خواہشمند نہ تھے۔ صرف حضرت علامہ مرحوم سے ملنے کے لئے بے تاب تھے۔

ایک شام کو سید جمال صاحب اور شیخ محمد امین صاحب کی معیت میں حضرت کے دولتکدہ پر حاضری ہوئی۔ خوش نصیبی سے حضرت صحن میں تنہا پلنگ پر دراز تھے طبیعت بھی مسرور تھی۔ شیخ صاحب نے تعارف کرایا تو اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ گفتگو شروع کی تو حقائق کے دریا بہنے لگے۔ ساپنے سفر یورپ کے حالات، مصطفےٰ نحاس پاشا سابق وزیر اعظم مصر اور دیگر عمائدین و صوفیائے مصر سے ملاقاتیں۔ مصر میں ایک قادیانی کی معیت کے دلچسپ حالات۔ ممالک اسلامیہ بالخصوص قرطبہ کی سیر کے تاثرات حضرت اورنگ زیب عالمگیر کا زہد و تقوےٰ، مسلمانانِ عالم کا مستقبل غرضکہ بے شمار مسائل پر گفتگو فرمائی جو دل و دماغ کو موجب نشاط بھی تھی۔ اور ایمان والقیان کا ذریعہ بھی شگفتہ مزاجی کا یہ عالم تھا کہ بعض مواقع پر ہم بے اختیار ہنس پڑتے تھے۔

حضرت علامہ نے سید جمال صاحب سے پوچھا کہ "مجھ جیسے فقیرِ بےنوا سے ملنا تو آپ کی نوازش ہے۔ مگر آپ ہندوستان میں کسی بڑے آدمی سے بھی ملے؟" سید صاحب نے جواب دیا "قبلہ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن کی رُوحانی طاقت بہت قوی ہوتی ہے۔ اور ان پر اسی سبب سے پوری ملّت کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسے انبیا، شہدا، و صلحا۔ آپ بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔ آپ کو دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ساری ملّتِ اسلامیہ کو دیکھ لیا۔"

حضرت مرحوم نے یہ سُن کر آنکھیں جھکا لیں میں نے گزارش کی کہ حضرت سید صاحب کے نظریہ پر کلام مجید بھی مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ "کان ابراهيم امة واحدة" حالانکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام فردِ واحد تھے۔ حضرت اس پر مسرور ہوئے اور قرآن مجید کی آیت سے متاثر ہو کر آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔

حضرت مرحوم سید صاحب سے صاف سادہ شُستہ عربی میں گفتگو فرماتے رہے۔ جسے میں بھی بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ حضرت مرحوم عربی ذرا تکلف سے بولتے تھے۔ اس شام ہم نے حضرت کی محفل قدسی سے پورے تین گھنٹے حظ اُٹھایا۔ مجھے اپنی قوتِ تحریر کی تنگ دامانی کا علم ہے تاہم اگر اُسی ایک ملاقات کے ارشاداتِ گرامی کا تذکرہ تفصیل سے کروں تو ایک مکمل کتاب تیار ہو جائے۔

چلتے وقت حضرت نے ایک دن چھوڑ کر سید جمال کو کھانے پر بُلایا۔ شیخ محمد امین صاحب اور خاکسار بھی اس شفقت و رافت کی لپیٹ میں آ گئے۔ حضرت نے رخصت ہوتے وقت تاکیداً فرمایا کہ ہم دعوت والے روز وقت سے دو تین گھنٹے پہلے آجائیں تاکہ کچھ باتیں ہو سکیں۔ سید جمال صاحب حضرت کے اخلاقِ عالیہ سے بے حد متاثر ہوئے اور میں نے دیکھا کہ واپس آنے پر ان کا چہرہ اتنا مسرور تھا جیسے

ہمیں مقصدِ حیات حاصل ہو گیا۔

حضرت مرحوم کے ارشادِ دعوت کو میں نے بصحتِ ہوش و حواس اپنے کانوں سے سُنا تھا۔ پھر بھی دل یقین نہ کرتا تھا۔ شاعرِ مشرق اور مجدّدِ وقت کے دولتکدہ پر میری دعوت! مجھے یہ بات ایک رنگین اور شیریں خواب سا معلوم ہوتی تھی اور ہونی بھی چاہیئے تھی۔ میرے ماموں جان ایک دفعہ اپنے گاؤں کے فوجی جمعدار کے ہاں گئے۔ کھانا کھانے کا وقت آیا۔ تو جمعدار صاحب نے رسمی طور پر کھانا کھانے کو کہا۔ معمولی سے اصرار و انکار کے بعد ماموں جان نے کھانا کھا لیا۔ گھر آئے تو پھُولے نہ سماتے تھے۔ بڑے فخر و مباہات سے بیان کرتے تھے کہ میں نے جمعدار صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کئی دنوں تک اسی نشہ میں مخمور رہے۔ آپ ہی فرمایئے ایسے غریب گھرانے کا ایک حقیر فرد اگر دُنیا کے عظیم المرتبت انسان کے دولتکدہ پر مدعو ہو تو کیوں فخر نہ کرے۔ سچ پوچھئے تو میں نے یہ دو دن زمین پر نہ کاٹے۔ بلکہ اسی دعوت کے خیال میں مست آسمان کی بلندیوں پر اُڑتا رہا۔

دعوت والے دِن شیخ محمد امین صاحب کی مصروفیت کے سبب ہم ذرا دیر کر کے پہنچے۔ حضرت علاّمہ ہمارا انتظار فرما رہے تھے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کھانا کھایا۔ مجھے حضرت مرحوم کے بائیں پہلو میں جگہ مِلی حضرتِ مرحوم کھانا بھی کھاتے رہے اور مہمانوں کے لئے علی بخش کو ہدایات بھی دیتے رہے۔ مجھے کھانا تو کیا کھانا تھا۔ اسی نشہ میں مخمور اور محوِ حیرت رہا کہ آج میرا نصیبا! مجھے کہاں لے آیا۔

مَیں نے دَورانِ گفتگو میں گزارش کی کہ حضرت اس زمانے کے مسلمانوں نے تو آپ کی قدر نہ کی۔ آیندہ نسل آپ کی ذاتِ بابرکات سے محروم ہو جائے گی۔ توقع تھی کہ آیندہ نسل کے لئے خدا اَور کوئی "دانائے راز" بھیج دے گا مگر آپ نے فرما دیا ہے ؎

ازتب و تابم نصیبِ خود بگیر   بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

تو اس حالت میں مسلمانوں کا کیا حال ہو گا؟

یہ سُن کر حضرت کے چہرے پر انتہائی سوز و درد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ فرمایا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مسلمانوں کا حشر کیا ہونے والا ہے۔ مَیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اب ذلّت کی انتہا ہو چکی۔ اب یا تو خدا مسلمانوں کی حالت کو سدھارے گا یا پھر موجودہ نسل کو مِٹا کر نئی اور زندہ قوم پیدا کرے گا۔ ہاں! یہ بات میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں موجودہ نسل کا "آخری مسلمان" ہوں۔

وفات سے دو تین مہینے قبل ایک روز جاوید منزل میں پہنچا تو علی بخش نے اندر جانے سے روکا اور کہا ڈاکٹروں نے حضرت کو کِسی سے ملنے یا بات چیت کرنے سے منع کر دیا ہے۔ مَیں نے یہ سُن کر پہلے تو ڈاکٹروں کے لئے بارگاہِ الٰہی میں حصُولِ ہدایت کی دُعا مانگی۔ اور پھر علی بخش سے کہا کہ مَیں خاموش بیٹھا رہوں گا۔ مگر نیاز حاصل کِئے بغیر جاؤں گا نہیں۔ علی بخش نے یہ الفاظ حضرت سے جا کر کہہ دیئے۔ آپ نے حاضر ہونے کی اجازت دے دی۔ مَیں سلام دُعا کے بعد خاموش بیٹھ گیا۔ حضرت نے مزاج پُرسی کی۔ تو میں نے علی بخش سے عہد کا ذکر کیا۔ اور گزارش کی کہ مجھے ایک "درویش" اور "قلندر" کے دروازے پر دربان دیکھ کر کوفت ہوئی ہے۔ آپ نے علی بخش کو بُلا

کر فرمایا کہ "آئندہ یہ آئیں تو ان کو بلا روک ٹوک آنے دینا۔

اسی ملاقات میں میری گزارش پر حضرتِ مرحوم نے مجھے ایک مولوی صاحب کا قصہ سُنایا۔ مولوی صاحب حضرتِ مرحوم کی تحریر چاہتے تھے۔ پہلے تو حضرت نے انکار کیا اور مولوی صاحب کو کلامِ الٰہی کی طرف توجہ دی۔ "مقامِ مردِ مومن" سے آگاہ کرنا چاہا مگر جب مولوی صاحب کے عقیدت مندانہ اصرار میں کمی نہ ہوئی تو حضرت نے فی البدیہہ یہ قطعہ لکھ دیا ؎

بگو از ما بملّایاں سلامے — کہ پیغامے خدا گفتند مارا
مگر تاویل شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

ایک دفعہ میں حاضر ہوا تو کچھ ارادت کیش بیٹھے ہوئے تھے مسلمانوں کی زبوں حالی کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باقی لوگ اُٹھ کر چلے گئے تو حضرت نے میری طرف توجہ کی اور مسلمانوں کی پستی پر گفتگو فرمانے لگے۔ باتوں باتوں میں حضرت کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے اور فرمایا خدا نے ایسی مردہ قوم میں پیدا کیا ہے جو باوجود زور سے پکڑ پکڑ جھنجھوڑنے کے خوابِ غفلت سے بیدار ہوتی ہی نہیں، اس قوم کا مرضِ کور نگاہی "بہت دیرینہ ہو گیا ہے۔ حضرت کا یہ شعر بھی ان ہی تاثرات کا مظہر ہے ؎

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک — دیرینہ ہے تیرا "مرضِ کور نگاہی"

حضرت کی بارگاہ میں میری حاضری کا سلسلہ نہ بہت عرصہ رہا اور نہ بہت طول طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ علی بخش ہی کہہ کر جب حضرت نے مجھے حاضر ہونے کی کھلی اجازت دے دی تو پھر شاید میں ایک آدھ بار ہی حاضر ہوا ہوں گا۔ تاہم تھوڑی ہی ملاقاتوں میں فیضانِ نظر نے حضرت کی عظمت و مرتبت سے شناسا کر دیا۔ میں اور مجھ جیسے اور ہزاروں عقیدت مند جب آپ سے رخصت ہوتے تھے تو زبانِ حال و قال سے کہتے جاتے تھے کہ ؎

نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے — جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

حضرت سے ایک ہی ملاقات کر کے انسان کو یہ یقین ہو جاتا تھا کہ حضرت دورِ حاضرہ کے سب سے بڑے شاعر اور فلاسفر ہی نہیں بلکہ سب سے بڑے انسان، عاشقِ رسول اور محبِّ قرآن بھی ہیں۔ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتے ہی آپ پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کی تصانیف میں بھی جہاں کہیں حضور سرورِ کائنات کا ذکر آجاتا ہے۔ آپ پر ذوق و وجدان کا بے پناہ جذبہ طاری ہو جاتا ہے۔ آتشِ عشق تیز ہو جاتی ہے اور آپ عشقِ رسول صلعم کے بحرِ بے کراں میں بے اختیار کود پڑتے ہیں۔ جن لوگوں کی نظر سے رموزِ بے خودی کے آخر کی نظم "التجا بحضور رحمۃ للعٰلمین" گزری ہے وہ رحمۃ للعٰلمین سے اس مردِ قلندر کے عشق کا رُتبہ سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت مرحوم کی طبیعت میں انکسار بے حد تھا۔ وہ حقیقتہً شکوہِ خسروی اور شانِ سکندری پر درویشی اور قلندری کو ترجیح دیتے تھے۔ "یومِ اقبال" سے چند روز پیشتر میں حاضرِ خدمت ہوا۔ اور گزارش کی کہ میں نے یومِ اقبال پر پڑھنے کے لئے "اقبال اور یزداں" کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔ فرمایا۔ مجھے نفسِ مضمون سے بحث نہیں جو چاہو سو لکھو مگر یہ عنوان بدل دو۔ یزداں کے ساتھ اقبال اچھا نہیں لگتا۔ بہتر ہو کہ اس عنوان کو پھیلا کر "اقبال کی شاعری میں فلسفۂ یزدان و ابلیس" کر دو۔ میں نے تعمیلِ ارشاد کی مگر یہ مضمون پڑھنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

حضرت کی وفات ہوئی تو میں کراچی تھا۔ ایک صاحب وفات کی خبر سُن کر دوڑے دوڑے آئے۔ اور کہنے لگے۔ کہو بھائی حضرت کے معصوم بچوں کی یتیمی کا کیا ہوگا؟ میں نے کہا۔ آپ یہ کیا سوچ رہے ہیں۔ معصوم بچوں کا تو اللہ مالک ہے۔ سوچنا تو یہ ہے کہ اب ملّتِ اسلامیہ کی یتیمی کا کیا ہوگا۔

کراچی کی ایک مسجد میں حضرت علامہ کے بہت سے قطعے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے امام مسجد صاحب سے کہا۔ آج ان قطعوں کو لکھنے والا شاعر چل بسا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکے۔ میں نے کہا "حضرت! اقبال فوت ہو گئے"۔ کہنے لگے "اقبال کون تھا"۔ اللہ اکبر! یہ ہمارے قائدین اور رہبرانِ اسلام کی حالت ہے کہ وہ اقبال جیسے جلیل القدر فرزندِ اسلام سے ناواقف ہیں۔ ان مولوی صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ اقبال داڑھی نہ رکھتے تھے تو کہنے لگے۔ ایسے شخص کا غم کیا کرنا۔ یہ سُن کر میرا سینہ شق ہو گیا اور میں نے مشیت کی تنگ بخشی پر ماتم کیا کہ وہ مولوی تو بہت پیدا کر سکتی ہے لیکن ایسے دو چار داڑھی مُنڈے نہیں پیدا کرتی تاکہ قوم کا بیڑا پار ہو جائے۔

لاہور آ کر میں نے سالک صاحب قبلہ سے پوچھا کہ مولانا اِس وقت دُنیا میں کم و بیش ستر کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ فرمائیے ان ستر کروڑ مسلمانوں میں کون ہے جسے مسندِ اقبال پر بٹھایا جائے اور جس کے عالمِ فانی سے رخصت ہونے پر اسی طرح غم کی گھٹائیں دُنیا پر چھا جائیں جس طرح اقبال کی وفات پر! اس کا جواب سالک صاحب کے خونیں آنسوؤں نے دیا۔

اقبال جس کے قلم نے ہزاروں دلوں کو حیاتِ تازہ بخشی جس نے ملّتِ اسلامیہ کے تنِ مردہ میں زندگی کی لہر دوڑا دی جس نے نوجوانوں کے قلوب میں انقلاب برپا کر دیا جس کے وجود میں بیک وقت لینن، نطشے، ٹالسٹائی، امام ابن تیمیہ، شاہ ہمدان، برگسان، کارل مارکس، بائرن رومی اور جمال الدین افغانی کے کمالات نظر آتے تھے جس کے حلقۂ سخن میں ایسے ایسے گدا زیرِ تربیت تھے جو خود اسی کے الفاظ میں راہ و رسمِ کج کلاہی سے آگاہ تھے۔ آہ! وہ اقبال، جہانِ اسلام کا وہی آفتابِ علم ۲۱ر اپریل ۳۸ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۝

(رشید زاہد)

مطبوعات

خاتم النبیین مؤلفہ ابراہیم صاحب عمادی۔ استاذ اسلامیات اسمٰعیل ہائی سکول بمبئی۔ یہ سیرت نئی طرز میں لکھی گئی ہے۔ زیادہ حجیم نہ ہونے کے باوجود خاصی جامع ہے۔ انداز بہت محققانہ ہے۔ حجم ۲۴۲ صفحات قیمت ۱۰/۔ پتہ: ابراہیم عمادی صاحب استاذ اسلامیات اسمٰعیل بیگ محمد ہائی سکول بمبئی ۳۔

مولودِ ہمایوں۔ مرتبہ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس دتاؤلی ضلع علی گڑھ۔ اس کتاب میں رسولِ مقبول کی ولادت سے ہجرت تک کے حالات نہایت دلکش انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مؤرخانہ تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ حجم ۱۶۶ صفحات قیمت ۱۲/۔ پتہ:۔ مکتبۂ عہد آفریں اترپ بازار۔ حیدرآباد (دکن)۔

محبوبِ خدا۔ مرتبہ چودھری افضل حق صاحب۔ یہ کتاب چودھری صاحب نے جیل میں لکھی ہے، اس کا حرف حرف حضورؐ کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات۔ زبان سادہ و سلیس۔ قیمت مجلد ۱۲/۔ پتہ:۔ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔

مکتوباتِ امجد۔ مرتبہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ ملک حضرت امجد سے زیادہ تر ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے واقف ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ حضرت موصوف بہت صاف و سلیس اور بے تکلف نثر لکھنے پر بھی قادر ہیں۔ یہ دلچسپ کتاب حضرتِ امجد کے خطوں کا مجموعہ ہے۔ آج کل ادبیات میں خطوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول ہوگی۔ قیمت ۸/۔ پتہ:۔ شمس المطابع عثمان گنج حیدرآباد (دکن)۔

مشاہیرِ اُردو کے خطوط۔ مرتبہ پروفیسر مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل ہیڈ عربی، فارسی و اُردو ڈیپارٹمنٹ بنارس یونیورسٹی الہ آباد۔ اس کتاب میں اُردو ادب کے مشاہیر کے خطوط جمع کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بہت دلچسپ ہے اور مہیش صاحب شکریے کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے یہ اہم خطوط یکجا جمع کر دیئے۔ قیمت ۸/۔ پتہ: کے۔ پی اگروال صاحب۔ شانتی پریس الہ آباد۔

وفاقِ ہند۔ از خان بہادر ڈاکٹر سید نجم الدین صاحب جعفری۔ آج کل مسئلہ وفاق ملک کے اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ اس کتاب کی ابتدا میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد جدید دستور اور وفاقی حکومت کی تشریحات صحیح ہیں۔ کتاب پُر از معلومات اور پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۸/۔ پتہ: اعدو لٹریچر کمپنی دہلی۔

ہندوستان کا نیا دستورِ حکومت۔ مرتبہ کشن پرشاد صاحب کول ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ۔ اس کتاب میں جدید دستور، خصوصاً فیڈریشن اور دیگر اہم سیاسی مسائل پر بہت متانت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ موجودہ سیاسیات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید

ہے۔ قیمت ۸ر۔ پتہ: ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد۔

جدید دستور کا خاکہ ازین العابدین صاحب بی ایس سی پی ایچ ڈی (لنڈن) جدید دستور کے متعلق یہ مختصر سا رسالہ نہایت پُر از معلومات ہے۔ قیمت ۲ر۔ پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش ۔ از سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ ایڈیٹر ترجمان القرآن پٹھان کوٹ پنجاب۔ اس کتاب میں اسلامی ہند کی گزشتہ تاریخ موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک دلکش تبصرہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے لئے آئندہ مذہبی سیاسی نظامِ عمل پیش کیا گیا ہے۔ ہر مسلمان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ پتہ اوپر درج ہے قیمت درج نہیں۔ حجم ۱۲۶ صفحات۔

اسلام اور اشتراکیت ۔ از خان بہادر حاجی محمد یوسف احمد پانی آنریری مجسٹریٹ دہلی مؤلف نے بہت محنت اور تحقیق سے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ اور اُن کی یہ قومی خدمت قابلِ داد ہے کہ اُنھوں نے اس کتاب کو مفت تقسیم کیا ہے۔ پتہ اُوپر درج ہے۔

ضمیر ۔ زمانۂ حال کی زندگی کا ایک اخلاقی ناول از مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ ترک اور انگریز احباب کے ساتھ مصنف نے اصلاحِ معاشرت، ترکِ توہمات اور احیائے قومیت پر جو بحثیں کیں، یہ ناول اُن کا نچوڑ ہے۔ جگہ جگہ نہایت مفید اور دلچسپ معلومات ہیں۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب میر مجلس اعزازی حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ایجم پیٹ حیدرآباد (دکن)۔

بنات ۔ حضرت علامہ راشد الخیری مرحوم کا فیض اُن کے بعد بھی جاری ہے۔ علامہ مغفور اُردو کے شہرۂ آفاق ادیب اور عورتوں کے محسنِ اعظم تھے۔ ان کی حمایت اور بہتری کے لئے اُنھوں نے جو زبردست کوششیں کیں وہ اُن کے رسالوں کے ذریعے مستقل طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ ان رسالوں میں ایک "بنات" ہے جو گیارہ سال سے باقاعدہ کم عمر بچیوں کے لئے نہایت مفید اور دلچسپ مضامین شائع کر رہا ہے۔ اس میں بچیوں کی لیاقت اور زبان کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر مہینے کہانیوں نظموں تاریخ، جغرافیہ حساب اور سائنس کے مضامین کے علاوہ پہیلیاں، معمّے، دستکاری اور ہنڈکلیا کی ترکیبیں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ زبان اتنی سادہ اور دلکش ہوتی ہے کہ ننھی بچیاں بھی مزے لے لے کر پڑھیں۔ غرض باتوں باتوں میں ایسے بہت سے سبق پڑھا دیئے جاتے ہیں جو ایک اچھی بچی کے لئے ضروری ہیں۔ سال بھر کا چندہ صرف ڈیڑھ روپیہ ہے۔ پتہ: مینیجر رسالہ بنات دفتر عصمت دہلی۔

قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں ۔ از حضرت عرش تیموری۔ زیرِ جان مصنف جن کا تعلق دہلی کے شاہی خاندان سے ہے۔ اس کتاب میں اپنے بزرگوں کے حالات لکھے ہیں۔ اگرچہ واقعات سرسری طور پر پیش کئے گئے ہیں اور ان میں کوئی خاص ربط بھی نہیں لیکن پھر بھی اس سے قلعۂ شاہی کی معاشرت اور شوکت و عظمت کا دھندلا سا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کتاب خاصی دلچسپ اور مطالعہ کے قابل ہے۔ قیمت ۸ر۔ پتہ مکتبہ جہاں نما ۱ اسعد بازار جامع مسجد دہلی۔

قطراتِ شبنم ۔ یہ جناب گوردھن داس صاحب بی۔ اے کے منثورادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مقدمہ حضرت افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش دہلوی نے اور دیباچہ سید امتیاز علی تاج نے لکھا ہے۔ نوجوان مصنف نے مختلف تخیلات کو شاعرانہ نثر میں پیش کیا ہے اور وہ ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ متعدد تصاویر زینتِ کتاب ہیں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے
پتہ: تیج رام اینڈ سنز لاہور۔

اربعہ عناصر ۔ یہ حضرت محمود ماہر طبیب اکبرآبادی کی رُباعیات کا دلکش مجموعہ ہے جو خوشنما کاغذ پر مجلد چھپا ہے۔ شروع میں حضرتِ ماہر کی تصویر بھی دی گئی ہے۔ رُباعیات زندگی پر ہیں۔ قیمت عمر۔ پتہ: خاں صاحب محمود علی خاں صاحب ماہر، فراش خانہ، دہلی۔

ایوانِ تمدن ۔ از ڈاکٹر مرزا ریاض احمد بیگ صاحب چغتائی۔ اس ناول میں تہذیبِ حاضرہ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ قیمت عہ۔ پتہ: الہلال برقی پریس، سرکی والاں، دہلی۔

تفویض ۔ یہ مرزا عظیم بیگ صاحب کا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ مرزا صاحب کا اندازِ بیان بہت دلکش ہے۔ قصہ ہندستانی معاشرت کا ایک نہایت دلاویز مرقع ہے۔ قیمت ۵ر۔ پتہ ساقی بک ڈپو دہلی۔

کیمیاگر اور دیگر افسانے ۔ یہ پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) کے نو دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے جو نہایت حسنِ اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ یہ افسانے ہندوستانی زندگی کے بہت اچھے مرقعے ہیں۔ کتاب بہت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۲۵۵ صفحات قیمت درج نہیں۔ پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی۔

راسپوٹین ۔ از حضرتِ ملیح آبادی۔ یہ اُس مشہور شیطان سیرت راہب کے حالات ہیں جس کی سازشوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں نے روس کا تختہ اُلٹ دیا۔ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ حجم ڈیڑھ سو صفحات۔ قیمت ۸ر۔ پتہ۔ دفتر اخبارِ ہند کلکتہ

طوفانِ تبسم ۔ یہ حضرتِ شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ شوکت صاحب کے مزاحیہ مضامین مقبول ہو چکے ہیں۔ کتاب میں خاصا تفریحی سامان ہے۔ پتہ: مینجر شوکت بک ڈپو لکھنؤ۔

صیدِ زبوں ۔ از اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم اے۔ یہ ایک بلند مرتبہ معاشری ڈراما ہے جس کا مقصد اصلاحِ حالات ہے۔ اشتیاق صاحب یوں بھی اُردو ڈرامے کی اصلاح چاہتے ہیں اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ حجم ۱۰۰ صفحات۔ پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

فکر و نشاط ۔ یہ حضرتِ جوش ملیح آبادی کی پُرکیف نظموں کا ایک نہایت دلکش مجموعہ ہے۔ حضرت جوش کے کلام کی تعریف تحصیلِ حاصل ہے۔ یہ مجموعہ اُردو شعر سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے پاس ہونا چاہئے۔ قیمت مجلد عیر۔ پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

الہامی افسانے ۔ مرتضیٰ احمد خاں صاحب میکش کی یہ جدت قابلِ داد ہے کہ انہوں نے مذہبی کتابوں کے قصص یکجا کر کے اُردو زبان میں شائع کر دیئے ہیں گویا یہ ایک دلچسپ کتاب ہے جس کا ایک حصہ سے بھی آدمی کو واقف کر دیتی ہے۔ حجم ساڑھے تین سو صفحات کے قریب ہے اور نفیس کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ہر مسلمان کی زینت بننے کے قابل ہے۔ پتہ: تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔

(نقل فوٹو)

اطلاع نامہ بغرض اعلان اشاعت حسب دفعہ ۱۱ ایکٹ جائدادہائے مقروضہ ممالک متحدہ (ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۹۳۴ء)

بعدالت جناب اسپیشل جج صاحب بہادر پنڈت برج ناتھ زتشی درجہ دوم مقام لکھیم پور کھیری (اودھ)

انکمبرڈ مقدمہ نمبر ۵ سنہ ۱۹۳۷ء — ۲۵ نومبر سنہ ۱۹۳۸ء

مسماۃ رتن کنور وغیرہ . . . . قرضدار سائل ——— بنام ——— رام آدھین وغیرہ . . . . قرضخواہ فریق ثانی

چونکہ مسماۃ رتن کنور زوجہ بلبھدر سنگھ، گوبردھن سنگھ ولد گمانے سنگھ، بلبھدر سنگھ ولد گوبردھن سنگھ، پتال سنگھ و چندر بنسال سنگھ و اندر بکرم سنگھ ولد بلبھدر سنگھ ساکن بھندیرہ ضلع کھیری نے ایک درخواست حسب دفعہ ۴ ایکٹ جائدادہائے مقروضہ پیش کی ہے لہٰذا حسب دفعہ ۱۱ ضمن (۱) ایکٹ مذکور اطلاع دی جاتی ہے کہ اس جائداد کو جس کی تفصیل فہرست ہائے منسلکہ میں درج ہے درخواست دہندہ نے حسب دفعہ ۸ یا فریق ثانی نے حسب دفعہ ۱۰ ایکٹ مذکور کی جائداد ظاہر کیا ہے۔

اگر کوئی شخص جائداد مذکورہ کے متعلق کوئی دعوےٰ رکھتا ہو تو اس اشتہار کے گزٹ ممالک متحدہ میں شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے استحقاق کے بارہ میں عدالت ہٰذا میں اپنی درخواست پیش کرے۔

میرے دستخط اور عدالت کی مہر سے آج بتاریخ ۱۰ ؍ اگست سنہ ۱۹۳۸ء جاری ہوا۔

دستخط اسپیشل جج
درجہ دوم
ضلع کھیری

مہر عدالت

(نقشہ فہرست جائداد حسب ذیل ہے)

فہرست (ب)

قرضدار کی جائداد جو بہ استثناء حقوق مالکانہ متعلقہ اراضی حسب دفعہ ۶۰ ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء قرق اور نیلام ہو سکتی ہے

نمبر مسلسل	نوعیت جائداد	وسعت حیثیت درخواست دہندہ	کیفیت
۱	باغات نمبر ۲۲۹/۳٫۱۸ و ۳۰۵/۲٫۶۷ و ۳۳۲/۱ ایکڑ و ۳۳۳/۴٫۵ و ۳۳۴/۱٫۵ و ۳۳۵ و ۳۳۶/٫۷۶ و ۳۴۴/۳٫۴۴ و ۵۴۵/۲ ایکڑ و ۵۵۸/۳/٫۷۶ و ۵۶۰/۱/٫۳۰ و ۵۶۴/٫۶۰ و ۱۲۹۴/۱٫۱۷ و ۳۷۲/۸٫۳۵ و ۲۲۶/٫۷۳ و ۲۲۷/٫۷۶ و ۳۵۴/۱٫۱۹ اور ۳۱۸/۲/٫۳۵ واقع موضع بستولے پرگنہ بہوڑ ضلع کھیری		
۲	مکان مسکونہ واقع موضع پیریاگنگا		
۳	اور ایک چونے ایک منزل		
۴	رہن نامہ دخلی نوشتہ شیو سنگھ بحق رتن کنور ساکنہ ... تعدادی پندرہ سو روپیہ		
۵	رہن نامہ دخلی نوشتہ نرائن سنگھ بحق گوبردھن سنگھ سائل ۲؎ تعدادی بارہ سو روپیہ		
	جائداد جو مہاجناں نے اپنے کلیم حسب دفعہ ۱۰ انکمبرڈ اسٹیٹس ایکٹ میں دکھایا ہے۔		
۶	باغات نمبری ۲۲۶/٫۷۳ و ۳۵۴/۱٫۱۹ و ۲۳۷/٫۷۶ اور ۳۱۸/۲/٫۳۵		
۷	مکان مسکونہ واقع موضع پیریاگنگا		
۸	مکان مسکونہ واقع موضع بجندیڑ		
۹	مکان مسکونہ واقع موضع بستالے		
۱۰	پکا مکان واقع موضع گرں		
۱۱	حق مرتہنی دستاویز نوشتہ شیو سنگھ ولد بھگوت سنگھ تعدادی [illegible]		

دستخط

اسپیشل جج

درجہ دوم

ضلع کھیری

[illegible]

R. L. No. 1363.

قواعد

۱۔ "ھُمایُوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۲ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہُمایُوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۲ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہُمایُوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

The Title Page and Picture Printed at Half-Tone Press,
Dev Samaj Road, Lahore.

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۳۸ء

تصویر:- ——— وینس آف مائلو

چندہ سالانہ ۵ ششماہی ۳ (مع محصول) ——— قیمت فی پرچہ ۸

بزمِ ہمایوں

ہمارے مکرم دوست مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو سے بڑھ کر اُردو کا سرگرم اور بے تعصب کارکن کون ہوگا! اُنھوں نے مُدت تک سیاسیات بلکہ لسانی سیاسیات میں آنے سے پرہیز کئے رکھا، پچھلے سال وہ لکھنؤ تو تشریف لائے مگر اُنہوں نے لیگ میں شرکت نہ کی۔ وہ زبان کے مسئلے کو سیاسیات سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہتے تھے اور اس پر اُنہوں نے نیک نیتی سے عمل بھی کیا۔ اور اُردو کے مخالفین کو اپنے قول وفعل سے ثابت کر دیا کہ اُردو ہندو مسلمان دونوں کی مشترکہ زبان ہے۔

لیکن محض ایک طرف کی نیک نیتی سے کیا بنتا ہے اور دوسرا پہلے ہی سے اپنے دل میں پُورا فیصلہ کر چکا ہو تو ثبوت بھی سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہی اس اُردو کے معاملے میں ہوُا۔ مولوی صاحب کی معصومیت پر پہلی بجلی بھارتیہ ساہتیہ پرشد میں ڈھائی سال ہوئے گری جب گاندھی جی نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے، وہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ گاندھی جی ۱۹۳۴ء میں سیاسیات سے استعفا دے کر اچھوت ادھار اور ہندی پرچار میں مصروف ہو چکے تھے یہی اُن کے نزدیک سوراج حاصل کرنے کا سیدھا رستہ تھا اور اب بھی جب کہ وہ کانگرس کے چار آنے کے ممبر نہیں لیکن کانگرس کے کرتا دھرتا ہیں وہ کانگرسی حکومتوں کے ذریعے سے اچھوتوں کو ہندوؤں میں ملانے اور ہندی کو بڑھانے اور غریب اُردو کو گرانے میں منہمک ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب بھی ان ڈھائی سالوں میں فارغ نہیں بیٹھے۔ نہ محض اپنی عظیم الشان ڈکشنریوں کی تالیف میں غرق رہے بلکہ ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی محبوب اُردو کے لئے مارے مارے پھرا کئے۔ علی گڑھ میں اُردو کانفرنس منعقد کی، صوبے صوبے میں، شہر شہر میں انجمن کی شاخیں قائم کیں، اُردو مدرسوں کو امداد دی، لکھنؤ مسلم لیگ کو ذرا دُور ہی دیکھتے رہے کہ یہ اُردو کے حامی کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں، پھر کانگرسی لیڈروں اور وزیروں اور خود مہاتما جی سے ملاقاتوں کے چکر میں رہے، کہا کہلایا، سمجھایا، جلسے کئے مگر وہاں کان پر جُوں تک نہ رینگی کہ ہندوستان کا "قومی" پروگرام پہلے ہی سے مرتب ہو چکا تھا اور اُس میں اُردو کو دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔

آخر بہت سے صبر کے بعد مولوی صاحب نے پچھلے مہینے گاندھی جی کے نام "مسلمان اور ودیا مندر سکیم" کے متعلق ایک کھُلی چٹھی لکھی جو ملک کے بہت سے اخباروں میں چھپی۔ مولوی صاحب نے واقعی بہت صبر کیا۔ سیاسیات کے متعلق برسوں چُپ سادھی، کبھی بھولے سے بھی مسلمان اور اُردو کا ایک جا ذکر نہ کیا، بڑی نرمی سے اور دل موہ لینے والی دلیلوں سے سمجھایا کہ اُردو تو ہندو مسلمان دونوں کی بنائی ہوئی زبان ہے اِن دونوں قوموں کے اتحاد کی نشانی ہے، تمدنوں کے مِلاپ کی یادگار ہے بلکہ یہ ہندو مسلمانوں کی ایک جہتی اور وطنیت کی علمبردار ہے لیکن وہاں محض دیدوں اور رشیوں کے زمانے کی طرف مُنہ مڑ چکا تھا۔ سو کسی نے اس "مسلمانی" شورش کو نہ دیکھا نہ سُنا، سوراج کی دُھن تھی اس میں نری ایک زبان اور اُس کے ادب نری ایک قوم اور اُس کے کلچر کی گنجائش کہاں تھی؛

"ودیا مندر سکیم" "واردھا سکیم" کا ایک بچہ ہے جو سی پی میں پیدا ہوا ہے۔ "واردھا سکیم" گاندھی جی کے دماغ سے پیدا ہو کر کانگرسی خیال والوں کی گود میں پل رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ باوجود بعض نقائص کے "واردھا سکیم" کا مقصد اہلِ ملک کو تھوڑے سے تھوڑے عرصے میں تعلیم یافتہ اور خود دار شہری بنانا ہے اور وہ نیک نیتی پر مبنی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان ملکی اور نیک نیتی کے کاموں میں جب وہ حلقۂ عمل میں آجائیں مسلمانوں پر کوئی نہ کوئی آفت نازل ہو جاتی ہے۔ اس لئے مجبورًا اُدھر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک کمیٹی نے اگست میں واردھا سکیم کے متعلق اپنے خیال اور اندیشے کا اظہار کیا، اِدھر مولوی عبدالحق صاحب نے گاندھی جی کے نام ستمبر میں ایک کھلی چٹھی لکھی۔

کھلی چٹھی میں لکھا ہے کہ جنوری ۱۹۳۸ء سے سی پی کے مسلمان برابر شور مچا رہے ہیں لیکن ہائی کمانڈ کوئی توجہ نہیں دیتی۔ جنوری میں انجمن اُردو ناگپور کا جلسہ ہوا اور ایک قرارداد آنریبل وزیرِ تعلیم کی خدمت میں بھیجی گئی۔ پھر انجمن کے ایک رُکن نے معزول شدہ مسلمان وزیر کی معیت میں گاندھی جی سے ملاقات کی، گاندھی جی نے تسلیم بھی کر لیا کہ واقعی ودیا مندر نام بعض حیثیت سے قابلِ اعتراض ہے اور ایک عدہ بھی کیا۔ پھر مارچ میں مسلمانوں کا ایک عام جلسہ ناگپور میں ہوا۔ انجمن ترقیٔ اُردو نے بھی دوبارہ ایک جلسہ کیا۔ لیجسلیٹو اسمبلی کے مسلمان ممبروں نے بھی اپنے دستخطوں سے اعلان کر دیا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کے ایک وفد نے شری بوس صدر کانگرس سے ملاقات کی اور اُنہوں نے وفد کے مطالبات سے کامل اتفاق بھی ظاہر کیا۔ صوبے کے کانگرسی مسلمانوں کی ایک کانفرنس نے بھی ودیا مندر کے خلاف قرارداد منظور کی۔ اسی طرح ایجوکیشنل کانفرنس برار نے بھی ودیا مندر سکیم کے خلاف سخت رنج و افسوس کا اظہار کیا یعنی جہاں تک اس سکیم کا تعلق ہے باوجود شدید سیاسی اختلافات کے صوبے کے سب مسلمانوں نے یک آواز ہو کر اس کی مخالفت کی، غل مچایا، دُہائی دی کہ ہم کو اس سکیم کی کسی کمیٹی تک میں نہ لیا گیا لیکن اُدھر مصروفیت و مشغولیت نہیں بے پروائی و بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ملکی دھندوں کی اہمیت میں گویا اُردو زبان کو زبان بندی کا حکم مل چکا تھا!

مولوی صاحب ودیا مندر کی جگہ "پڑھائی گھر" کا سبک اور آسان "ہندوستانی" نام تجویز کرتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کے لئے اُردو اور نصاب کی کتابوں اور اُردو مدارس کے متعلق معقول مطالبے پیش کر کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"انڈین نیشنل کانگرس کا یہ دعوےٰ ہے کہ وہ اقلیتوں کی زبان و تہذیب کی محافظ ہے۔ آپ کو یہ سُن کر تعجب ہو گا کہ میری انجمن کا نمائندہ قصبہ پانڈھرنا (ضلع چھندواڑہ) کے مدرسے میں پہنچا تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے یہ دیکھا کہ اسکول کے شروع ہونے سے پیشتر ہندو اور مسلمان لڑکے سرسوتی کی مورت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کر رہے ہیں۔ مسلمان لڑکے ان مدرسوں میں پڑھ کر سلام تک بھول گئے ہیں اور اب وہ سلام کی جگہ "نمستے" اور "رام جی کی جے" کہتے ہیں۔ کیا زبان و تہذیب کی حفاظت کے یہی معنی ہیں؟

"مہاتما جی! ہم نے ہر جائز اور آئینی کوشش کر کے دیکھ لیا۔" "آپ سے یہ آخری گزارش ہے اور اگر اس کے بعد بھی کوئی شافی جواب نہ ملا تو میں آپ کو بصد عاجزی متنبہ کرتا ہوں کہ پھر مسلمانوں کیلئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہ رہے گا کہ وہ آپ ہی کے ہتھیار آپ کے مقابلے میں استعمال کریں۔"

یہ ہو گی ہندوستانی "قوم" کے اندر "قومیتوں کی ٹکر"! خدا اس مُلک کو بچائے!

بشیر احمد

جہاں نما

انسانی عمر پر غلامی کا اثر

اعداد وشمار جمع کرنے والوں نے مختلف ملکوں میں مردوں اور عورتوں کی عمر کے اوسط کے نقشے بنا رکھے ہیں۔ ان نقشوں سے عموماً بیمے کی کمپنیوں والے بہت کام لیتے ہیں کیونکہ انہیں دیکھ کر وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بیمہ کرانے والا اپنی موجودہ عمر کے بعد تقریباً کتنا عرصہ اور زندہ رہے گا۔ ذیل کے نقشے سے مختلف ملکوں کے اوسطِ عمر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ اعداد جمعیتِ اقوام کے سالانہ مجموعۂ اعداد وشمار بابت ۳۷-۱۹۳۶ء سے لئے گئے ہیں:۔

ملک	مرد	عورتیں
مصر	۳۱	۳۶
کینیڈا	۵۸٫۹۶	۶۰٫۷۳
ممالکِ متحدہ امریکا (سفید رنگ لوگ)	۶۰٫۷۲	۶۴٫۷۲
(غیر سفید فام)	۵۰٫۸۲	۵۳٫۷۴
ہندوستان	۲۶٫۹۱	۲۶٫۵۶
جاپان	۴۴٫۸۲	۴۶٫۵۴
جرمنی	۵۹٫۸۶	۶۲٫۸۱
آسٹریا	۵۴٫۴۷	۵۸٫۵۳
بلجیم	۵۶٫۰۰	۵۹٫۸۳
بلغاریہ	۴۵٫۹۲	۴۶٫۶۴
ڈنمارک	۶۲٫۰۰	۶۳٫۸
اسٹونیا	۵۳٫۱۲	۵۹٫۶۰
فن لینڈ	۵۰٫۶۸	۵۵٫۱۴

مُلک	مرد	عورتیں
فرانس	۵۴/۳۰	۵۹/۰۲
آئرلینڈ	۵۷/۳۷	۵۷/۹۳
اٹلی	۵۳/۷۶	۵۶/۰۰
لیٹویا	۵۵/۳۹	۶۰/۹۴
ناروے	۶۰/۹۸	۶۳/۸۴
نیدرلینڈز	۶۱/۹	۶۳/۵
انگلستان و ویلز	۶۰/۱۳	۴۴/۳۹
سکاٹ لینڈ	۵۶/۰۰	۵۹/۵
شمالی آئرلینڈ	۵۵/۴۲	۵۶/۱۱
سویڈن	۶۱/۱۹	۶۳/۳۳
سوئٹزرلینڈ	۵۹/۲۵	۶۳/۰۵
چیکوسلوویکیا	۵۱/۹۲	۵۵/۱۸
یورپی سوویٹ روس	۴۱/۹۳	۴۶/۷۹
آسٹریلیا	۶۳/۴۸	۶۷/۱۴
نیوزیلینڈ	۶۵/۰۴	۶۷/۸۸

مندرجۂ بالا اعداد وشمار پر ایک سرسری نظر ہی ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ تمام یورپی وامریکی ممالک، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ کا اوسطِ عمر ہندوستان سے بہت زیادہ ہے۔ جاپان کا اوسطِ عمر بھی ہندوستان کے مقابلے میں کافی زیادہ ہے۔ مصر کی حالت بھی ہندوستان سے اچھی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اکثر ممالک جن کا اوسطِ عمر ہندوستان سے اچھا ہے آزاد ہیں۔ کینیڈا، آئرلینڈ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھی عملاً آزاد ہی سمجھے جاتے ہیں۔ مصر کا شمار بھی ازلی غلاموں میں نہیں ہے اور اب بھی ہندوستان کے مقابلہ میں یہ ملک کافی آزاد ہے کیونکہ اپنے تقریباً تمام داخلی معاملات میں اسے خود مختاری حاصل ہے۔ حالات کے اس مشاہدے سے اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ درازیٔ عمر کا انحصار ایک بڑی حد تک کسی ملک کی سیاسی آزادی یا سیاسی غلامی پر ہوتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ بہ ظاہر یہ خیال عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے لیکن ہے درست معمولی سوچ بچار کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ جو اسبابِ درازیٔ عمر کا موجب ہوسکتے ہیں اُن میں سے بعض یہ ہیں:۔ اچھی غذا، اچھا گھر، اور مناسب کپڑے جو صحت کے بحال رکھنے میں مدد دیں۔ صحت

سانی کے اصول کا علم اور شہری و خانگی صفائی کے قواعد سے واقفیت ، ان اصُول و قواعد پر عمل پیرا ہونے کی معاشی استطاعت بچوں کی پیدائش سے متعلقہ ضروریات کا انتظام ، بیماری کے وقت طبی امداد حاصل کرنے کی سہولت ، وبائی امراض کو روکنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت وغیرہ ان سب باتوں کا انتظام اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ملک کی معاشی حالت اچھی ہو لیکن کسی قوم کے معاشی حالات اُس وقت تک اچھے نہیں ہو سکتے جب تک وہ کاملاً نہیں تو کم از کم ایک بڑی حد تک آزاد نہ ہو تعلیم کے بغیر کسی ملک کے لوگ صفائی اور صحت کے اصُولوں سے واقفیت نہیں بہم پہنچا سکتے لیکن غلام ملکوں کی تعلیم کا انتظام ہمیشہ بہت ناقص ہوتا ہے ۔ غیر ملکی حکمرانوں کا فائدہ ہی اسی میں ہے کہ وہ اپنے غلاموں کو زیادہ سے زیادہ عرصے تک بے خبر اور بے علم رکھیں ۔ اگر کوئی ملک چاہے کہ اس کا ہر فرد پڑھا لکھا اور اپنے نفع و نقصان کو پہچاننے والا ہو تو یہ مقصد بھی آزادی حاصل کرنے سے پہلے پورا نہیں ہو سکتا ۔ بات یہ ہے کہ اگر لوگوں کو صحت اور صفائی کے قواعد معلوم بھی ہوں تو اُن پر عمل کرنے کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کسی غلام ملک کے پاس کبھی اتنا روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی اس قسم کی ضروریات سے عہدہ برا ہو سکے ۔ شہری اور خانگی صفائی کے بلند معیار کو پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مُلک کے مالیات پر اہلِ ملک کو پُورا اختیار حاصل ہو لیکن یہ اختیار آزادی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ۔

ہمارا مدعا یہ نہیں کہ ملک کے محض آزاد ہو جانے ہی سے عمر کے اوسط میں اضافہ ہو جاتا ہے (اگرچہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ خیال بھی صداقت کے شائبہ سے خالی نہیں ہے) مگر ہم اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ وہ حالات جو درازیٔ عمر میں ممد و معاون ہوتے ہیں اسی صُورت میں پیدا ہو سکتے ہیں کہ ملک کم از کم معاشی طور پر کاملاً آزاد ہو ۔

ان معلومات کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ اہلِ ہند کو قبل از وقت موت سے بچنے کے لئے آزادی حاصل کرنی چاہئے حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے کوئی وجہ پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ۔

آزادی ہر انسان کا طبعی حق ہے ۔

ہندوستانیوں کا باہم انگریزی بولنا شرمناک ہے

پریزیڈنٹ سبھاش چندر بوس نے حال ہی میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا :-

"گزشتہ سال جب میں وائنا میں تھا ایک یورپین دوست نے مجھے چند اور ہندوستانی دوستوں کے ساتھ کھانے کے لئے مدعو کیا جب وہاں ہم سب باہم انگریزی میں گفتگو کرنے لگے تو ہمارا وہ یورپی دوست بہت حیران ہوا اور اس نے پوچھا کہ آپ لوگ آپس میں انگریزی زبان کیوں بولتے ہیں ۔ اس سوال پر ہم نے شرم سے اپنے سر جُھکا لئے ۔"

اِس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مدیرِ ماڈرن ریویو نے لکھا ہے کہ اگر تمام ہندوستانیوں کی کوئی ایک مشترک زبان نہیں ہے تو بعض

ہیں شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہندوستان دراصل ایک براعظم ہے اور اس کا رقبہ یورپ منفی روس کے برابر ہے۔ اگر کوئی شخص اس پر یہ اعتراض کرے کہ یورپ مختلف ملکوں یا خطوں میں منقسم ہے اور ہندوستان کے تمام صوبے ایک ہی ملک کے حصے ہیں تو یہ بھی درست نہیں۔ بلاشبہ موجودہ سیاسی حالات ہی نے ان صوبوں کو ایک سلسلے میں پرو دیا ہے لیکن بعد میں ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ یہ صوبے بالکل علیحدہ علیحدہ ملکوں میں تقسیم ہو جائیں۔

دراصل مدیرِ ماڈرن ریویو ہندوستانی زبان کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستانی نے ملک کے عام ذریعۂ تعلیم کی حیثیت اختیار کر لی۔ تو صوبجاتی زبانوں کی ترقی رُک جائے گی حقیقت یہ ہے کہ انہیں بنگالی زبان کی حفاظت کا خیال مضطرب کئے ہوئے ہے لیکن تعجب ہے کہ وہ دبی زبان سے انگریزی کی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنے کی حمایت بھی کرتے ہیں اور اس کو بنگالی کی ترقی کی راہ میں کسی قسم کی رُکاوٹ نہیں سمجھتے۔ یہ ہندوستانیوں کے ایک طبقے کی وہی تنگ دلانہ ذہنیت ہے جو انہیں پرائی بدشگونی کے لئے اپنی ناک کٹوانے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ انگریزی ہندوستان پر چھا جائے تو ہرج نہیں لیکن کوئی ہندوستانی زبان اگر ملک گیر حیثیت حاصل کر چکی ہو تو اُسے مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا چاہئے۔

مدیر ماڈرن ریویو نے ہندوستانی کی مخالفت کے جوش میں کانگرس کے قوم پرستانہ نصب العین کے بھی پرخچے اُڑا دیئے ہیں اور یورپ منفی روس کے مساوی براعظم ہندوستان کو کئی ملکوں میں تقسیم کر کے "متحدہ ہندوستان" کے خیال کو ایک خوابِ پریشاں ثابت کر دیا ہے۔ معلوم نہیں پاکستان کی تحریک کے متعلق مدیر ماڈرن ریویو کا کیا خیال ہے :

البتہ اپنے مضمون کے آخر میں مدیرِ ماڈرن ریویو نے کیا خوب کہا ہے :-

"کیا کانگرس والے واقعی انگریزی کے استعمال سے شرماتے ہیں۔ یا یہ بھی سو فیصدی سودیشی بن جانے کا ایک غیر شعوری ڈھونگ ہے؛ جب فی الواقع اس شرم کی جڑیں گہری چلی جائیں گی البشر طیکہ کبھی گئیں۔ تو کانگرس والے اپنی کتابیں، رسالے، اشتہار، اخبارات، مضامین اور خطبات وغیرہ انگریزی زبان میں لکھنا اور چھاپنا وغیرہ ترک کر دیں گے۔ اُس وقت خواہ وُہ دانائیں ہوں گے خواہ کسی ہندوستانی شہر یا گاؤں میں، وہ ایک دوسرے سے انگریزی زبان میں گفتگو کرنا قطعاً چھوڑ دیں گے۔"

سوویٹ روس میں اعلیٰ تعلیم اور بارزگاری

موسیو مولٹوف نے کُل رُوس کے اساتذہ کی انجمن میں تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ برطانیہ جرمنی، اٹلی، فرانس اور جاپان کی تمام یونیورسٹیوں اور ہائی سکولوں کے طلبہ کی مجموعی تعداد چار لاکھ سے کچھ ہی زیادہ ہے لیکن اکیلے سوویٹ روس میں ایسے طلبہ کی تعداد ساڑھے پانچ لاکھ

تک پہنچ گئی ہے۔

مولٹوف نے ایک اور اہم انکشاف کیا۔ اُس نے یہ کہہ کر کہ سرمایہ دار ملکوں میں گریجوئیٹوں، ریسرچ کرنے والوں، سائنس والوں اور ہر قسم کے علمی کام کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد بے روزگار ہے صلائے عام دی کہ اگر کوئی شخص روس میں ایک بھی ایسا سائنسدان یا ماہر فن یا پڑھا لکھا تلاش کر کے دکھائے جو بے روزگار ہو تو ہم اُسے بیش بہا انعام دیں گے (قہقہہ)

روسی یونیورسٹیوں اور ہائی سکولوں سے ہر سال ایک لاکھ فارغ التحصیل طلبہ اور ماہرین فن نکلتے ہیں لیکن بایں ہمہ ابھی کاروبار کے تمام شعبوں میں آدمیوں کی کمی ہے۔ پڑھے لکھے آدمیوں کے بیکار رہنے کا تصور ہی روس میں احمقانہ معلوم ہوتا ہے۔

مولٹوف نے بتایا کہ دوسرے ملکوں کے سکولوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی الگ الگ تعداد حسب ذیل ہے:۔

(۱) برطانیہ ——————— ۵۱۰۰۰

(۲) جرمنی ——————— ۷۴۰۰۰

(۳) اٹلی ——————— ۷۳۰۰۰

(۴) فرانس ——————— ۷۴۰۰۰

(۵) جاپان ——————— ۱۴۶۰۰۰

اس موقع پر مولٹوف نے روس کے موجودہ اعلیٰ نظام تعلیم کا مقابلہ عہد زار کے روس سے کیا۔ اُس زمانے میں نوّے اعلےٰ تعلیم گاہیں تھیں جن میں ایک لاکھ چھبیس ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ اب تعلیم گاہوں کی تعداد سات سَو ہے اور اُن میں ساڑھے پانچ لاکھ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ مولٹوف نے اس بات کی طرف حاضرین کو خاص طور پر متوجہ کیا کہ قدیم روس کی طرح آج کل کے طلبہ صرف امراء اور متوسط الحال طبقے کے بچوں پر مشتمل نہیں بلکہ اُن میں وہ تمام بچے شامل ہیں جو اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ روس کے اُن دُور اُفتادہ علاقوں میں جہاں زاروں کے عہد میں سَو فیصدی لوگ اَن پڑھ تھے اب بڑے بڑے سکول اور عظیم الشان یونیورسٹیاں روز افزوں ترقی حاصل کر رہی ہیں۔

روس کے تمام تعلیمی مصارف کا بار حکومت برداشت کرتی ہے اور عوام کے بچے اُس سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ روس میں اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم بھی پڑھے لکھوں کو ہندوستان کی طرح بے روزگاری کے عذاب میں گرفتار نہیں کرتی۔ اعلیٰ تعلیم اگر ملک کے نظام حکومت اور معاشی حالات سے ہم آہنگ ہو تو بے روزگاری کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

آہ غلام ہندوستان!

حامد علی خاں

" وینس آف میلو "

یورپ کا اُستادِ سیاست

عہدِ حاضر کے پیچیدہ واقعات کو سمجھنے میں گزشتہ تاریخِ عالم سے کافی مدد مل سکتی ہے۔ تاریخی واقعات میں بھی تناسخ کا عمل پایا جاتا ہے۔ ایک ہی قسم کا واقعہ کئی بار پیش آتا ہے اور ایک ہی قسم کی تحریک مختلف اوقات میں مختلف صُورتیں اختیار کرتی ہے۔ اگر تاریخِ عالم کا مجموعی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو ایک دَور کا عکس کسی اَور دَور میں نظر آئے گا، ایک زمانہ کی تحریک کسی اور زمانہ کی تاریخ کا شاخسانہ ہوگی اور ایک دَور کا قائد کسی دوسرے دَور کے قائد کا مثیل ہوگا۔

بیسویں صدی کی تاریخ بھی اس اصُول کی کئی مثالیں پیش کرتی ہے۔ جرمنی کا نسلی جہاد فلسطین میں فتنۂ یہود، ابنِ سعود کی تحریکِ اخوان، اور اٹلی کا سودائے قیصری یہ سب واقعات اسی اصُول کے شواہد ہیں۔ ہٹلر کی نازی تحریک کو سمجھنا ہو تو نیٹشے کے انسانِ اعلیٰ اور نارڈو کے فلسفۂ نسل سے واقفیت ضروری ہے اور مسولینی کے عزمِ جہانبانی کے وجوہ تلاش کرنا ہوں بلکہ سیاسیاتِ یورپ کا حل ڈھونڈنا ہو تو چار سَو برس پہلے کے اطالوی فلسفی میکی ویلی کے صحیفۂ سیاست Prince "حکمران" کی ورق گردانی کرنا چاہیئے۔

ایک زمانہ تھا کہ مسیحی دُنیا "خدا کی بادشاہت" کے خواب دیکھ رہی تھی۔ قرونِ وسطےٰ کے پاکباز اور مذہب کے دلدادہ مسیحی اس ساعت کے لئے چشم براہ تھے۔ جب تمام دُنیا پر مسیحی پرچم لہرانے والا تھا اور جب خشک و تر پر مذہب کا حکم جاری ہونے والا تھا سینٹ آگسٹائن اور دوسرے بزرگ بارہا پیشین گوئی کر چکے تھے کہ وہ وقت دُور نہیں جب گناہ دُنیا سے مِٹ جائے گا، باطل سرنگوں ہوگا اور حق کا علم سربلند ہوگا۔ ان الفاظ کا اطلاق آنے والی دُنیا ہی پر نہیں بلکہ موجودہ دُنیا پر بھی تھا۔ اس دَور کے اکابر کا عقیدہ تھا کہ بہت جلد دُنیا گناہ کی آلائشوں سے پاک ہو کر اس قابل ہو جائے گی کہ حضرت مسیحؑ اس میں آکر "خدا کی بادشاہت" کا اعلان کریں۔ اسی خیال کو گذشتہ صدی کے خوش اعتقاد شاعر ٹینی سن نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:۔

ایک خدا، ایک مذہب اور ایک سرشت
اور مستقبل کے دھندلکے سے ظاہر ہونے والا ایک واقعہ
جس کے لئے تمام کائنات کوشاں ہے!

اب زمانہ بدل چکا ہے۔ دُنیا میں لامذہبی کا دَور دَورہ ہے۔ انسانی فطرت بدی کی انتہائی گہرائیوں میں ڈُوب چکی ہے۔ قرونِ وسطےٰ

اور اُنیسویں صدی میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ فطرتِ انسانی ازل سے نیکی کی طرف راغب ہے۔ اب لوگ کہتے ہیں کہ گناہ انسانی سرشت میں داخل ہے اور نیک اعمال محض اتفاقیہ ہیں یا دھوکا دینے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ میکی ویلی کے زمانہ میں بھی پابند مذہب لوگوں کا دعوئے تقدس اتنی مرتبہ بے نقاب ہو چکا تھا اور جامۂ زہد اس طرح رُسوا ہو چکا تھا کہ مذہب پر سب اعتقاد اُٹھ گیا تھا۔ اخلاقی اُصول پایۂ اعتبار سے گر گئے تھے اور ان کی جگہ مادی مقاصد نے لے لی تھی۔ اگر میکی ویلی مذہب و اخلاق کے خلاف غیر معمولی جسارت سے کام لے کر آواز بلند کرتا ہے تو اس سے صرف یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کا بیباک ہاتھ ایک متزلزل عمارت کو گرا رہا ہے۔

"حکمران" پر ایک سطحی نظر ہی ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس کا مصنف شرافت، مذہب اور اخلاق کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ انتساب سے اختتام تک مطلب براری اور فریب کاری کے جذبات کار فرما نظر آتے ہیں۔ کتاب کا انتساب لورنزو میڈیچی کے نام سے ہے۔ لورنزو میڈیچی وہی شخص ہے جس نے فلورنس کی آزادی کو سلب کیا، اس کے وزیر جنگ نکولو میکی ویلی کو معزول و رسوا کیا، ایک مدت تک اس پر قید و بند کی سختیاں عاید کیں اور پھر اسے جلا وطنی میں افلاس کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ اب یہی جلا وطن میکی ویلی اپنے وطن کے غاصب لورنزو کو محسن اور سرپرست کہتا ہے اور عقیدت کے ثبوت میں اپنی کتاب پیش کرتا ہے۔

کتاب کی غرضِ تصنیف ایک خط سے ظاہر ہوتی ہے جو میکی ویلی نے اپنے معتمد دوست فرانسسکو ویٹوری کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے "میں بیکاری سے اُکتا گیا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ مفلسی میں کب تک مارا مارا پھروں گا۔ کاش یہ میڈیچی جانتے کہ میرا ابھی کوئی مصرف ہے۔ مجھے کسی کام پر لگا کر دیکھیں چاہے پتھر اُٹھانے ہی پر سہی۔ اگر وہ میرے کمال کے معترف نہ ہو جائیں تو میرا ذمہ۔ میری کتاب اگر اُن کی نظر سے گزری تو ضرور سمجھیں گے کہ میں نے پندرہ سال سیاسیات میں گزارے ہیں بھاڑ نہیں جھونکتا رہا۔ کون ہے جو میرے تجربہ سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہے گا۔"

میکی ویلی کا "حکمران" اطالیہ کی معاشرت اور اخلاق (یا بہ الفاظِ دیگر فقدانِ اخلاق) کا عمدہ نمونہ ہے اور دانایانِ فرنگ کی سیاسی بوالعجبیوں پر اچھی طرح روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے دورِ حاضر کے پیچیدہ سیاسی حالات سے آدمی کی دلچسپی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ عصرِ جدید میں مفتوحات اور نو آبادیات کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میکی ویلی کا اس کے متعلق ارشاد ہے:-

"اگر مفتوحہ علاقہ بہ لحاظِ زبان و قومیت فاتح کے وطن سے مشابہ ہے تو صرف اتنا کافی ہے کہ سابق شاہی خاندان کے بچہ بچہ کو قتل کر دیا جائے اور اس کا نام و نشان مٹا دیا جائے اور ملک کے آئین و قوانین کو برقرار رہنے دیا جائے اور اگر فاتح اور مفتوح میں زبان، قومیت اور طرزِ معاشرت کے لحاظ سے اختلاف ہو تو معاملہ دگرگوں ہے۔ اس صورت میں یا تو حکمران مفتوحہ علاقہ میں قیام اختیار کر سکتا ہے یا وہاں اپنی قوم کی نو آبادی قائم کر سکتا ہے لیکن اسے کسی صورت میں بھی محض چھاؤنیوں پر بھروسا نہیں کرنا چاہیئے۔"

اس ضمن میں نو آبادیات کے متعلق میکی ویلی کے ارشادات اس کے فلسفۂ سیاست کا اچھا نمونہ ہیں:۔

"نو آبادیات سے حکمران پر بار نہیں پڑتا اور نہ وہ مفتوح قوم کو ناگوار گزرتی ہیں اور جن لوگوں کو اس امر سے تکلیف ہوتی ہے افلاس اور انتشار کی وجہ سے فساد برپا نہیں کر سکتے کیونکہ فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ یا اسے پرچانا چاہئے یا کچل دینا چاہئے۔ اگر کسی شخص کو معمولی اذیت پہنچائی جائے تو وہ انتقام پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن اگر اسے تباہ و برباد کر دیا جائے تو وہ انتقام کے قابل ہی نہیں رہتا۔ اگر ظلم کیا جائے تو اس طرح کہ انتقام کا اندیشہ ہی نہ رہے"۔

مندرجہ بالا الفاظ جس شخص کے قلم سے نکلے ہوں اس کے متعلق کم سے کم یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتا۔

میکی ویلی مادّی طاقت کا زبردست حامی ہے۔ بانیانِ سلطنت کے متعلق وہ کہتا ہے کہ اگر ان کے پاس فوج اور اسلحہ ہیں تو ان کی ناکامی کا امکان بہت کم ہے۔ اس لئے جتنے مجتہد اور پیغمبر کامیاب ہوئے ہیں تلوار کے زور سے کامیاب ہوئے ہیں اور تمام غیر مسلح مجتہد تباہ کر دیئے گئے ہیں (غالباً وہ اہنسا کے اصول سے ناواقف تھا)۔

میکی ویلی کا مثالی حکمران، اس کا ممدوح اور اس کی کتاب کا "ہیرو" سیزر بورجیا قسم قسم کے کمالات کا مالک تھا اور اس کے کارہائے نمایاں خواہ ہمارے معیارِ اخلاق پر پورے نہ اُتریں لیکن دلچسپ ضرور ہیں اور ان سے اس زمانہ کی اخلاقی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ سیزر پاپائے اعظم الگزنڈر کا بیٹا تھا جس کے نام سے اطالیہ کا ہر فردِ بشر کانپتا تھا۔ مقدس باپ اور متقدر بیٹے نے مل کر ایک فہرست تیار کی تھی۔ یہ فہرست ان اشخاص کی تھی جو باپ بیٹے کی راہ میں حائل تھے یا جن کے مرنے سے ان کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ بیٹا ان بدنصیبوں کو قتل کر دیتا تھا یا زہر دے کر مار ڈالتا تھا اور مقدس باپ اس کے جُرم پر خطِ عفو پھیر دیتا تھا۔ سیزر کی تلوار اور اس کے سفید سفوف سے بڑے بڑے دلاور خوف زدہ تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنے لوگوں پر اس تلوار کی تیزی آزمائی گئی اور کتنوں پر اس سفوف کے اثر کا تجربہ کیا گیا لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ بیسیوں اُمراء اور عمائد اور ذی اقتدار پادری اس کے زخم رسیدوں میں تھے اور ترک شہزادہ جمؔ[1] کی جانِ عزیز بھی سیزر ہی کے سفوف کی نذر ہوئی۔

سیزر کی سیرت میں ظلم رانی اور بے ایمانی کے جذبات بدرجۂ کمال پائے جاتے ہیں اور میکی ویلی کے نزدیک انہی صفات کا ایک حکمران میں ہونا ضروری ہے "ایک حکمران کو انسانی اور حیوانی فطرت دونوں سے کام لینا چاہئے۔ صرف نیکی کا فرشتہ ہونا کافی نہیں، اس میں شیر اور لومڑی کے خواص بھی ہونا چاہئیں۔ شیر بہ آسانی فریب کا شکار ہو جاتا ہے اور لومڑی بھیڑیوں کے مقابلے میں بے بس ہوتی ہے۔ لیکن لومڑی جال میں نہیں پھنس سکتی اور شیر بھیڑیوں سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ان دونوں کے خواص کا امتزاج بہترین ہے"۔۔۔

یہ یورپ کے شاعر فلسفی اور اُستادِ سیاست کی انتہائی پرواز ہے۔ اس کے برعکس شاعرِ مشرق کہہ گئے ہیں ؏

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

---

[1] برادرِ سلطان بایزید ثانی سلطانِ عثمانی جو پاپائے روما کے پاس آکر پناہ گزین ہوا تھا اور جسے سیزر نے نظر بند کر دیا تھا۔

لیکن دانائے فرنگ اخلاقی قیود سے آزاد ہے، وہ خیر و شر کی اُلجھنوں میں پھنسنا نہیں چاہتا، وہ پہلے ہی اپنا فیصلہ دے چکا ہے "اگر کوئی شخص اخلاق کا بلند معیار قبول کرتا ہے اور اس پر پُورا اُترنا چاہتا ہے تو وہ جان لے وہ اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہے"۔

"ایک حکمران کے لئے نیک وصاف کا ہونا ضروری نہیں البتہ ان کا اشتہار دینا ضروری ہے۔ ان اوصاف کا ہونا اور ان کا ہمیشہ پابند رہنا نقصان کا موجب ہے لیکن لوگوں کے سامنے ان اوصاف پر فخر کرنا ہمیشہ مفید ثابت ہوتا ہے، دُنیا کی نظر میں رحمدل، پابندِ عہد، ہمدرد انسان، پابندِ شرع اور راستباز بن کر رہنا چاہئے لیکن اقتضاء وقت دیکھ کر ظالم، عہد شکن، لامذہب، دروغ گو اور انسانیت کا دشمن بننے میں بھی عذر نہ کرنا چاہئے"۔ اس طریقِ عمل کی منطقی دلیل ملاحظہ ہو:۔

"جو حکمران ہمیشہ شیر کی پیروی کرتا ہے اسے ایک نہ ایک دن اپنی غلطی پر افسوس کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ایک عقلمند حکمران کو ہر حال میں اپنے مواعید کا پابند نہیں رہنا چاہئے خصوصاً اس حالت میں جب معاہدات اور مواعید کا احترام اس کے مفاد کے خلاف ہو۔ اگر سب انسان نیک ہوتے اور نہیں اپنے وعدہ کا احترام ہوتا تو عہد شکنی جائز نہ ہوتی لیکن کیونکہ ہر حالت میں یہ امکان ہے کہ دُوسرا فریق معاہدہ کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس لئے معاہدہ کی پابندی لازم نہیں۔ ہر حالت میں عہد شکنی کے لئے کوئی معقول وجہ پیش کی جاسکتی ہے، ہر زمانہ کی تاریخ سے ایسے حکمرانوں کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو معاہدہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جو حکمران روباہی فطرت کا مالک ہے وہی کامیاب ہوتا ہے"۔

اس "تشبیب" کے بعد "گریز" قابلِ داد ہے۔

"عہدِ جدید کی ایک درخشاں مثال کو میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پاپائے اعظم الگزنڈر ششم (سیزر بورجیا کے "نامور" باپ) نے لوگوں کو دھوکا دینے کے سوا کچھ نہیں کیا اور نہ کبھی کسی اور بات کا خیال کیا۔ اس کے باوجود اسے فریبکاری میں کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی کیونکہ اس کے معاصرین میں کوئی بھی بلند بانگ دعوؤں اور جھوٹی قسموں میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا جادو ہمیشہ چل جاتا کیونکہ وہ فطرتِ انسانی کی کمزوری سے اچھی طرح واقف تھا اور فریب کاری میں ہمیشہ جرأت سے کام لیتا تھا"۔

فطرتِ انسانی کا حکیمانہ تجزیہ ملاحظہ ہو:۔

"پاسِ مذہب سے بڑھ کر کوئی وصف دُنیا کی نظر میں احترام حاصل کرنے کے لئے ضروری نہیں۔ اس لئے مذہبی جوش کا مظاہرہ ضروری ہے۔ انسان کے عقائد تجربہ کی بجائے مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ کسی چیز کے متعلق رائے قائم کرتے وقت ہاتھ سے زیادہ آنکھوں کا استعمال کرتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے۔ اس پر یقین کر لیتا ہے۔ اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس لئے حکمران کے جھوٹے اور مصنوعی جوش کے مظاہرے عوام پر اثر انداز ہونے میں ہمیشہ کامیاب ثابت ہوتے ہیں"۔

جن حکمرانوں نے مذہبی جوش کے مظاہرہ سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا اور اسے ہوسِ مُلک گیری کی تسکین کا ذریعہ بنایا ان میں

میکی ویلی کے ہم عصر فرڈیننڈ شاہ ہسپانیہ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نے حمایتِ دینِ مسیح کی آڑ لے کر غرناطہ کی اسلامی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ہسپانیہ کے گلی کوچوں کو مسلمانوں کے خُون سے لالہ زار بنا کر اپنے مذہبی جوش کا ثبوت دیا۔ اس نے توسیعِ سلطنت کے لئے مراکش پر حملہ کیا اور اس حملہ کو صلیبی جنگ کا نام دے کر مسیحی دُنیا سے خراجِ تحسین وصُول کیا۔ اس نے اپنی مسیحی و غیر مسیحی رعیت پر ہر قسم کا ظلم روا رکھا، ذاتی منفعت کے لئے ہر آئینِ انسانیت کی خلاف ورزی کی لیکن کسی کو اس محافظِ دینِ مسیح کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہ ہوئی ـــــ آہ! مذہب! تیرے نام سے کن کن گناہوں کو جائز قرار دیا جاتا ہے!

گناہ کی پُرزور وکالت کے بعد میکی ویلی اپنے فلسفۂ سیاست کو قومی رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے اور ان الفاظ پر اپنے تلخ وعظ کو ختم کرتا ہے :-

"آج اطالیہ کا کوئی نگہبان نہیں، ہمارے وطن میں آج ہر طرف بدنظمی ہے اور لوُٹ مار کا بازار گرم ہے، ہمارا وطن پارہ پارہ ہوگیا ہے، اغیار کے مظالم کا تختۂ مشق ہے، اس پر ہر قسم کی مصیبتیں لوٹ رہی ہیں، وُہ خدا سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے مظلوموں کے دادرس کسی کو بھیج کہ مجھے اس ظلم سے نجات دلائے۔ اطالیہ ایک رہبر کے لئے چشم براہ ہے جو اسے آزادی دلائے۔ اے عالی وقار لورنزو! تمہارے لئے یہ کام مشکل نہیں ہے۔ ہم ایک نیک مقصد کے لئے جد وجہد کر رہے ہیں اور تائیدِ ایزدی ہمارے ساتھ ہے، سب آثار ہمارے حق میں ہیں، لیکن جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ تمہیں پورا کرنا چاہئے کیونکہ خدا ہر بات آپ نہیں کرتا!"

ان الفاظ میں آزادی کی تڑپ ہے۔ آزادی کی سچی تڑپ لیکن کیا ہو اگر اس کے جذبۂ آزادی سے بھی وہی سلوک کیا جائے جو وہ دُوسروں کے لئے تجویز کرتا ہے۔

"آزاد ریاستوں میں امن اس طرح قائم ہو سکتا ہے کہ فاتح انہیں صفحۂ ہستی سے مٹادے یا بنفسِ نفیس ان پر حکومت کرے یا انہیں حکومتِ خود اختیاری دے دے اور خراج پر قناعت کرے، لیکن بہتر یہ ہے کہ انہیں نیست و نابود کر دے۔ اگر حکمران ایک آزاد قوم پر فتح پاتا ہے اور اس کے شہروں کو تباہ و برباد نہیں کر دیتا اور مفتوح قوم کو کُچل نہیں دیتا تو وہ خُود ایک دن کُچلا جائے گا اور تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ کیونکہ آزاد قوم کی روایات کو نہ حاکم کے احسانات بھلا سکتے ہیں نہ اس کے مظالم مٹا سکتے ہیں۔ اگر قوم کو منتشر نہ کر دیا جائے تو یہی روایاتِ آزادی ایک دن قومی انقلاب کا مرکز بن جائینگی"۔

آج یورپ پر میکی ویلی کا فلسفہ حاوی ہے اور سیاسی رہنماؤں کے دماغوں پر اس کے ارشادات مسلط ہیں۔ اخلاق کی جگہ منافقت اور ہمدردیٔ انسان کی جگہ وطنیت نے لے لی ہے۔ انصاف کو ذاتی مفاد اور اصُول کو وقتی مصلحتوں پر قربان کیا جاتا ہے

تہذیب زیردستوں پر ہنس رہی ہے، وہ تہذیب جس کی بنیاد کوتہ نظری اور خود غرضی پر ہے — مگر کارکنانِ قضا و قدر میکی ویلی اور اس کے پیرؤوں کا ماتم کر رہے ہیں اور حکیم مشرق کی صدا کانوں میں آرہی ہے ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

میکی ویلی کے مداحوں نے اس کی صاف گوئی پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے اور اس کے فلسفہ حکومت کی اکثر دُوراز کار توجیہیں پیش کی ہیں لیکن بے سُود۔ کسی ستم ظریف نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میکی ویلی کی کتاب حاکمِ وقت کی ہجو ملیح ہے لیکن اس نظریہ کو ماننے کے لئے واقعات سے چشم پوشی کرنا پڑے گی۔ خود میکی ویلی نے بطور کفارہ اپنی کتاب کا تتمہ لکھا ہے جس میں جمہور کو ظالم حکمران کی اصلاح اور اصلاح نہ ہونے کی صورت میں اس کے استیصال کے طریقے بتائے ہیں لیکن تیر کمان سے نکل چکا ہے دیکھیں کس کس کے دل و جگر کو چھیدتا ہے۔

"مُوسیٰ"

نیکی

نیکی کرو، نیکی کرو
نیکی کرو جتنی بھی ہو
ہر اِک وسیلے سے کرو
ہر اِک طریقے سے کرو
ہر شخص سے، کوئی بھی ہو
ہر وقت جب تم کر سکو
ہر اِک جگہ نیکی کرو
جس وقت تک تم کر سکو

جان ویزلی — حامد علی خاں

شکریہ جاپان

چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا
"ارضِ آفتاب" کی آتش فشانیوں کا
جنہوں نے بیدار کر دیا
خوابیدہ چین کو ــــ
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا

جس کے بم بار طیاروں نے
ہموار کر دیا سطح زمین کے ساتھ
خوبصورت شہروں کو،
اس دبی ہوئی راکھ سے،
چنگاریاں نکلیں،
جو جلا کر خاک کر دیں گی
جاپان کو،
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا

چین کمزور تھا۔ نحیف ولاغر
نیم گرسنہ اور نیم عریاں،
جاپان نے چھین لینا چاہا،
چین سے
زندہ رہنے کا حق۔ سانس لینے کا اختیار
چین متحد اور قوی ہو گیا
جاپان کے ظلم سے
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا

جنگ سے علیحدہ رکھنے کے لئے،
چینی مسلمانوں کو
مسجد بنائی ٹوکیو میں، جاپان نے
جب مسمار ہوتے دیکھا،
جاپان کے ہاتھوں
سینکڑوں مسجدوں کو،
بیدار ہؤا، صف آرا ہؤا،
چینی مسلمان،
چین شکریہ ادا کرتا ہے
جاپان کا

باری

سرگزشتِ دانہ

پہلے میں بویا گیا جوتے ہوئے اِک کھیت میں
کھو گیا برگ و نوائے زندگانی ریت میں

کچھ دنوں طاری رہا اعصاب پر یکسر جمود
خوابِ غفلت کا مرادف تھا طلسمِ ہست و بود

ابر کھیتوں میں لگا جس وقت موتی ڈولنے
راہ دی مجھ میں رطوبت کو مرے ماحول نے

آ کے قدرت نے صدائے قُم باذن اللہ دی
بے حس اعضائے بدن میں ولولوں کو راہ دی

دی شعاعِ مہر نے تابندگی ادراک میں
میٹھا میٹھا درد جاگ اُٹھا دلِ صد چاک میں

کوششِ روئیدگی نے پھر دیا چولا بدل
قلب کے پہلو سے شاخِ آرزو آئی نکل

اب یہ "کلّا" دل میں گھبرا کر سکوتِ ارض سے
قوّتِ نشو و نما کو لے کے طول و عرض سے

غرفۂ ہستی میں مصروفِ نظارہ ہو گیا
دامنِ عافیتِ دل پارہ پارہ ہو گیا

دھوپ کی گرمی سے جب آب و ہوا راس آ گئی
زرد پودے کے رگ و ریشہ پہ سبزی چھا گئی

کھیت کے آغوش میں پروان چڑھتا ہی رہا
تھا ترقی کے لئے میدان بڑھتا ہی رہا

رفتہ رفتہ نرم و نازک بالیاں آنے لگیں ۔۔۔ سبز پتّوں میں ہوا کے ساتھ لہرانے لگیں

بالیوں میں دودھیا دانے نظر آنے لگے ۔۔۔ مظہرِ جوشِ جوانی بن کے گدرانے لگے

ہوتے ہوتے ختمِ انجامِ شباب آ ہی گیا ۔۔۔ فصل پک جانے سے کھیتوں پہ عذاب آ ہی گیا

کھیت کو پامال کرنے پر تُلے دہقاں کے ہاتھ ۔۔۔ میری شہ رگ بھی کٹی اپنے جگر گوشوں کے ساتھ

آہ مَیں باندھا گیا۔ کوٹا گیا جھٹکا گیا ۔۔۔ صرصرِ موّاج کی امداد سے پھٹکا گیا

اُڑ گیا بھُوسا ہوا میں رہ گیا غلّے کا ڈھیر ۔۔۔ پھیر لایا اصل کی جانب مری قسمت کا پھیر

شعر کی دُنیا میں مستلزم ہے خرمن کو شرر ۔۔۔ مجھ کو بجلی تھی مگر سرمایہ داروں کی نظر

دوسری جانب مری تخئیل کا رُخ پھر گیا ۔۔۔ خود غرض چیلوں میں عنقائے تفکّر گھر گیا

ہاں تو مَیں کیا کہہ رہا تھا، سوچ لُوں، یاد آ گیا ۔۔۔ میں لباسِ اوّلیں میں ہو کے برباد آ گیا

محفلِ ہستی میں افسانہ در افسانہ ہُوں مَیں
آج کن تبدیلیوں کے بعد پھر دانہ ہُوں مَیں

شاد عارفی

دو فرلانگ لمبی سڑک

کچہریوں سے لے کر لا کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لمبی سڑک ہوگی، ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا ہوتا ہے، کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر، سڑک کے دو رویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اُداس سے درخت کھڑے ہیں، ان میں نہ حسن ہے نہ چھاؤں سخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ۔ سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے، متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں، نہ اس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے، نہ شگاف، سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے، اور اب اس پر کول تار بھی بچھی ہے، جس کی عجیب سی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں۔ لمبی لمبی، چوڑی چوڑی سڑکیں، بُرادے سے ڈھنپی ہوئی سڑکیں، سڑکیں جن پر سُرخ بجری بچھی ہوئی تھی، سڑکیں جن کے گرد سرو شمشاد کے درخت کھڑے تھے، سڑکیں ——— مگر نام گنانے سے کیا فائدہ اس طرح تو ان گنت سڑکیں دیکھی ہونگی، لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں اور کسی اپنے گہرے دوست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا، متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں، اور ہر صبح اپنے گھر سے جو کچہریوں کے قریب ہی ہے اُٹھ کر دفتر جاتا ہوں لا کالج کے پاس ہی ہے، بس یہی دو فرلانگ کی سڑک، ہر صبح اور ہر شام، کچہریوں سے لے کر لا کالج کے آخری دروازے تک کبھی سائیکل پر، کبھی پیدل۔

اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا، اس کی ہئیت میں تبدیلی نہیں آتی، اس کی صورت میں روکھا پن بدستور موجود ہے، جیسے کہہ رہی ہو مجھے کسی کی کیا پروا ہے، اور یہ ہے بھی سچ، اسے کسی کی پروا کیوں ہو؟ سینکڑوں، ہزاروں انسان، گھوڑے، گاڑیاں، موٹریں اس پر سے ہر روز گزر جاتی ہیں، اور پیچھے کوئی نشان باقی نہیں رہتا، اس کی ہلکی نیلی اور سانولی سطح اُسی طرح سخت اور سنگلاخ ہے جیسے پہلے روز تھی جب ایک یورشین ٹھیکیدار نے اسے بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے؟ یا شاید یہ سوچتی ہی نہیں، میرے سامنے ہی ان نو سالوں میں اس نے کیا کیا واقعات، حادثے دیکھے ہر روز ہر لمحہ کیا نئے تماشے نہیں دیکھتی، لیکن کسی نے اسے مسکراتے نہیں دیکھا، نہ روتے ہی، اس کی پتھریلی چھاتی میں کبھی ایک ہوک بھی پیدا نہ ہوئی۔

"ہائے، بابو، اندھے محتاج غریب فقیر پر ترس کرو رے بابا، اے بابو، خدا کے لئے ایک پیسہ دیتے جاؤ رے بابا،

کوئی بھگوان کا پیارا نہیں، صاحب جی میرے ننھے ننھے بچے بلک رہے ہیں، اسے کوئی تو ترس کھاؤ ان یتیموں پہ۔"

درجنوں گداگر اسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی اندھا ہے تو کوئی لنجا، کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک زخم ہے تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے چھوٹے بچے گود میں لیے حسرت بھری نگاہوں سے راہگیروں کی طرف دیکھتی جاتی ہے، کوئی پیسہ دے دیتا ہے، کوئی تیوری چڑھائے گزر جاتا ہے، کوئی گالیاں دے رہا ہے، حرامزادے، مسٹنڈے، کام نہیں کرتے، بھیک مانگتے ہیں۔

کام، بیکاری، بھیک،

دو لڑکے سائیکل پر سوار ہنستے ہوئے جا رہے ہیں، ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی بھکارن کی طرف دیکھ رہا ہے، اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے، ایک سست مضمحل کتا فٹن کے پہیوں تلے آ گیا ہے۔ اس کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہہ رہا ہے، اس کی آنکھوں کی افسردگی، بے چارگی، اس کی ہلکی ہلکی دردناک ٹیاؤں ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی، بوڑھا آدمی اب گدیلوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوشنما سیاہ رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے اپنے نوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی ہوئی جا رہی ہے، اس کی سیاہ ساڑھی کا نقرئی حاشیہ بوڑھے کی سرمیں آنکھوں میں چاند کی کرن کی طرح چمک رہا ہے۔

× × × × × × × × × ×

پھر کبھی سڑک سنسان ہوتی ہے، صرف ایک جگہ شیشم کے درخت کی چھدری چھاؤں میں ایک تانگے والا گھوڑے کو سستا رہا ہے گدھ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں، پولیس کا سپاہی آتا ہے، ایک زور کی ہیٹی، او تانگے والے، یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے کیا نام ہے تیرا، کردوں چالان؟ بجور، ہجور کا بچہ، چل تمانے، 'ہجور' یہ تھوڑا سے، اچھا جا تجھے معاف کیا۔

تانگے والا تانگے کو سرپٹ دوڑائے لئے جا رہا ہے، راستے میں ایک گورا آ رہا ہے، سر پر ٹیڑھی ٹوپی، ہاتھ میں بید کی چھڑی رخساروں پر پسینہ، لبوں پر کسی ڈانس کا سُر۔

کھڑا کر دو، کنٹونمنٹ

آٹھ آنے صاب

ول، چھ آنے

نہیں صاب

کیا بکتا ہے، ٹم . . . .

تانگے والے کو مارتے مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے، پھر تانگے والے کا چمڑے کا ہنٹر کام آتا ہے، لوگ اکٹھے ہو رہے

ہیں، پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے، حرامزادے، صاحب بہادر سے معافی مانگو، تانگے والا اپنی میلی پگڑی کے گوشے سے آنسو پونچھ رہا ہے، لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔

اب سڑک پھر سنسان ہے،

شام کے دھندلکے میں بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ کھمبوں کے قریب چند مزدور، بال بکھرے، میلے لباس پہنے باتیں کر رہے ہیں۔

بھتیا بھرتی ہو گیا

ہاں

تنخواہ تو اچھی ملتی ہو گی،

ہاں

بڑھئو کے لئے کما لائے گا، پہلے بیوی تو ایک ہی پھٹی ساڑھی میں رہتی تھی۔

سُنا ہے اجنگ شروع ہونے والی ہے

کب شروع ہو گی؛

کب؛ اس کا تو پتہ نہیں، مگر ہم گریب ہی تو مارے جائیں گے۔

کون جانے گریب مارے جائیں گے کہ امیر

ننھا کیسا ہے؛

بخار نہیں ٹلیا، کیا کریں، ادھر جیب میں پیسے نہیں ہیں، ادھر حکیم سے دوائی ــــ

بھرتی ہو جاؤ

سوچ رہے ہیں

رام رام

رام رام

پھٹی ہوئی دھوتیاں، ننگے پاؤں، تھکے ہوئے قدم۔ یہ کیسے لوگ ہیں، یہ نہ تو آزادی چاہتے ہیں نہ حریت۔ یہ کیسی عجیب باتیں ہیں۔ پیٹ، بھوک، بیماری، پیسے، حکیم کی دوائی، جنگ!

قمقموں کی زرد زرد روشنی سڑک پر پڑ رہی ہے۔

دو عورتیں۔ ایک بوڑھی، ایک جوان، اُپلوں کے ٹوکرے اُٹھائے، خچروں کی طرح ہانپتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جوان عورت کی چال تیز ہے۔

"بیٹی، ذرا ٹھہر تو"۔ بوڑھی عورت کے چہرے پر بے شمار جھریاں ہیں، اُس کی چال مدھم ہے، اُس کے لہجے میں بے کسی ہے۔

بیٹی، میں ذرا ٹھہر، میں تھک گئی ...... میرے اللہ

اماں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے، تُو تو باؤلی ہوئی ہے،

اچھا، بیٹی، اچھا بیٹی

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے، بوجھ کے مارے اُس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اُس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔

وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے، اپلوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے، کوئی اُس کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا، کوئی اُسے ایک لمحہ سستانے نہیں دیتا، وہ بھاگی ہوئی جا رہی ہے، اُس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں، اُس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں، اُس کی جھریوں میں غم ہے اور بھوک اور فکر اور غلامی، صدیوں کی غلامی!

تین چار نوخیز لڑکیاں، بھڑکیلی ساڑھیاں پہنے، باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے جا رہی ہیں۔

بہن، آج شملہ پہاڑی کی سیر کریں،

بہن، آج لارنس گارڈن چلیں

بہن، آج انارکلی

ریگل!

شٹ اَپ یُو فُول

× × × × × × × ×

آج سڑک پر سُرخ جلوان بچھا ہے، آر پار جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں، جا بجا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں، کسی بڑے آدمی کی آمد ہے، جبھی تو سکولوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے نیلی پگڑیاں باندھے سڑک پر دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہیں۔ اُن کے لبوں پر پپڑیاں جم گئی ہیں، ان کے گال دُھوپ کی شدت سے تمتما اُٹھے ہیں، اسی طرح کھڑے کھڑے وہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں، جب وہ پہلے پہلے یہاں سڑک پر کھڑے ہوئے تھے تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے، اب سب چُپ ہیں، چند لڑکے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے، اب اُستاد اُنہیں کان سے

پکڑ کر اُٹھا رہے ہیں، شفیع کی پگڑی کھل گئی تھی، اُستاد اُسے گھور کر کہہ رہا ہے، اوشفی، پگڑی ٹھیک کر، پیارے لال کی شلوار اُس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور ازاربند جوتیوں تک لٹک رہا ہے۔ "تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے، پیارے لال"

"ماسٹر جی، پانی"

پانی کہاں سے لاؤں، یہ بھی تم نے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے، دو تین منٹ اور انتظار کرو، بس ابھی چھٹی ہوا چاہتی ہے۔

دو منٹ، تین منٹ، آدھ گھنٹہ

ماسٹر جی، پانی

ماسٹر جی، پانی

ماسٹر جی، بڑی پیاس لگی ہے۔

لیکن اُستاد اب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے، وہ اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے پھر رہے ہیں، لڑکو ہُشیار ہو جاؤ، دیکھو جھنڈیاں اس طرح ہلانا، ابے تیری جھنڈی کہاں ہے، قطار سے باہر ہو جا، بدمعاش کہیں کا، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سواری آرہی ہے،

موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ، بینڈ کا شور، پتلی اور چھوٹی جھنڈیاں بید لی سے ہلتی ہوئی، سُوکھے ہوئے گلوں سے پژمردہ نعرے بڑا آدمی سڑک سے گزر گیا، لڑکوں کی جان میں جان آگئی ہے، اب وہ اُچھل اُچھل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔

خوانچے والوں کی صدائیں، ریوڑیاں، گرم گرم چنے، حلوا پوری، نان کباب،

ایک خوانچے والا ایک طرّے والے بابو سے جھگڑ رہا ہے، مگر آپ نے میرا خوانچہ اُلٹ دیا، میں آپ کو نہ جانے دوں گا، میرا تین روپے کا نقصان ہو گیا، میں غریب آدمی ہوں، میرا نقصان پورا کر دیجئے تو میں جانے دوں گا۔

× × × × × × × ×

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں بھنگی سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے، اُس کے مُنہ اور ناک پر کپڑا بندھا ہے، جیسے بیلوں کے مُنہ پر جب وہ کولھو چلاتے ہیں، وہ گرد و غبار میں اٹا ہوا ہے اور جھاڑو دیئے جا رہا ہے۔

میونسپلٹی کا پانی والا چھکڑا آہستہ آہستہ سڑک پر پانی چھڑک رہا ہے، چھکڑے کے آگے جُتے ہوئے دو بیلوں کی گردنوں پر زخم پیدا ہو گئے ہیں، چھکڑے والا سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کوئی گیت گانے کی کوشش کر رہا ہے، بیلوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی سڑک کا کتنا حصّہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بُڈھا گداگر مرا پڑا ہے، اُس کے میلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اُس کی کھلی ہوئی

بے نُور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔

خدا کے لئے مجھ غریب پر ترس کر جاؤ رے بابا

کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا، سڑک خاموش اور سنسان ہے، یہ سب کچھ دیکھتی ہے سُنتی ہے مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی، انسان کے دِل کی طرح بے رحم، بے حس اور وحشی ہے۔

انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اکثر میں سوچتا ہوں کہ اگر اسے ڈائنامیٹ لگا کر اُڑا دیا جائے، تو پھر کیا ہو، ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے، اس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہو گی، اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں، چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلّا چلّا کر کہوں، میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں، مجھے انسانوں سے نفرت ہے، مجھے انسانوں سے نفرت ہے، مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو، میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔

× × × × × × × ×

سڑک خاموش ہے اور سُنسان، بلند ٹہنیوں پر گِدھ بیٹھے اُونگھ رہے ہیں۔

یہ دو فرلانگ لمبی سڑک

کرشن چندر

اپنے سپاہیوں سے گیری بالڈی کا خطاب

سپاہیو! میں جو کچھ تمہیں پیش کر سکتا ہوں، ماندگی ہے، خطرات ہیں اور مشقت ہے ——— رات کو میدان میں کڑکڑاتی سرد ہوائیں اور دن کو دہکتے ہوئے سورج کی چلچلاتی دھوپ۔ نہ سر چھپانے کا ٹھکانا ہے، نہ گولی بارود ہے اور نہ خوراک۔ بلکہ جبری کوچ ہیں، خطرناک چوکیاں ہیں اور سنگینوں کے ساتھ توپخانوں کا مسلسل مقابلہ ہے۔ وہ جنہیں آزادی اور وطن عزیز ہے، میرے پیچھے آ سکتے ہیں۔

حامد علی خاں

تجلّیات

جچتے نہیں نگاہ میں سرو و سمن یہاں
کشتِ خیال میں ہیں ہزاروں چمن یہاں

میرے حریمِ دل میں ہے وہ نور موجزن
صد مہر و مہ بدوش ہے اک اک کرن یہاں

طاری ہے ایک رقصِ طرب فرش و عرش پر
خود مطربِ الست ہوا نغمہ زن یہاں

ہوں بادہ نوش میکدۂ ہست و بود کا
اک ساغرِ شکستہ ہے چرخِ کہن یہاں

کچھ اُٹھ کے چل دیئے تو کئی اور آ گئے
صبحِ الست سے ہے بپا انجمن یہاں

راہِ حرم نہیں ہے یہ ہے راہِ عاشقی
ہر گام پر ہیں سینکڑوں دار و رسن یہاں

باطل کی فوج تیرے مقابل ہے صف بہ صف
لا ذوالفقار و بازوئے خیبر شکن یہاں

یہ بزمِ لطف و عیش نہیں رزمگاہ ہے
زخموں کے لالہ زار سے ہے بانکپن یہاں

حسنِ عمل کی تیغ و سپر کبریا سے مانگ
ہے جنگ میں حریف ترا اہرمن یہاں

تاریکیوں کا ایک سمندر ہے موجزن
تاریکیوں میں غرق ہیں دشت و دمن یہاں

منزل ملے گی مشعلِ عرفاں سے اے اثر
کچھ کام آ سکے گی نہ شمعِ سخن یہاں

آثر صہبائی

ہندوستانی

ابھی ابھی مسٹر سی جی گریوز، پروپگینڈا آفیسر کرسچین سوسائٹی مدراس نے ایک مختصر سی کتاب "تاریخ ادبِ ہندی" بہ زبانِ انگریزی شائع کی ہے۔ دیباچہ میں آپ نے "ہندوستانی" کی نامکمل سی بحث بھی اُٹھائی ہے۔ آپ اُردو سے بھی کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں نے ایک خط اس سلسلے میں ان کو لکھا تھا جس کا جواب مجھ کو فوراً مل گیا۔ دونوں خطوط کے تراجم درج ذیل ہیں:-

ڈیر مسٹر گریوز،

کچھ دنوں سے ہندوستان میں "ہندوستانی" کا مسئلہ چھڑا ہؤا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ شمالی ہندوستان میں عام طور پر دو زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں یعنی ہندی اور اُردو۔ ہندی خاص طور پر ہندو قوم کی زبان ہے اور اُردو عام طور پر سب لوگوں کی مشترکہ زبان ہے لیکن مسلمانانِ ہند اس سے خصوصاً اس لئے وابستہ ہیں کہ ان کے طرزِ معاشرت، اخلاقیات اور مذہبی جذبات کی اس سے ترجمانی ہوتی ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ سیاسی تفرقہ کے ساتھ ہندی اور اُردو کا بھی جھگڑا پیدا ہوگیا ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ اُردو دُنیا کا ایک بڑا ادیب جو ایک زبردست مذہبی پیشوا بھی ہے اس بات کا مدعی ہے کہ ایک نئی زبان "ہندوستانی" کی طرح ڈالی جائے۔

ایک دفعہ کسی تقریب کے سلسلے میں جو ان سے میری ملاقات موضع او کھدی (ضلع مونگھیر) میں ہوئی تو اس "ہندوستانی" کا ان کو اس درجہ شیدائی پایا کہ خدا کی پناہ۔ آپ نے فرمایا کہ گذشتہ سال جب میں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم۔اے کا ممتحن ہؤا تو میں نے طلبہ سے اسی "ہندوستانی" پر رائے طلب کی تھی اور نتیجہ کے طور پر دیکھا کہ نوّے فی صدی طلبہ نے اس کے حق میں رائیں دیں۔ کسی منچلے نے فوراً دبیں کہہ دیا کہ "علی گڑھ" کے طلبہ آپ کے جذبات سے واقف تھے چنانچہ صرف نمبر حاصل کرنے کے لئے مصلحتہً انہوں نے ایسا کیا ہوگا!

چونکہ ابھی ابھی آپ کی کتاب "تاریخ ادب ہندی" میری نظر سے گزری ہے جس میں آپ نے سرسری طور پر اس ہندوستانی کا مختصر تذکرہ کیا ہے، مَیں آپ سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ آپ مہربانی فرما کر یہ بتائیں کہ یہ "ہندوستانی" کہاں تک ملک کے لئے مفید ثابت ہوسکتی ہے اور کہاں تک مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

نیازمند

ظفر احمد کوکب

مدراس

ڈیر مسٹر ظفر،

آپ کا خط ملا ۔ اگر بُرا نہ مانیئے تو آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ میں اس طرح کے اختلافی سوالات کے جواب دینے کا بالکل اہل نہیں ہوں۔ میں نے اپنی کتاب میں ہندوستانی کا جتنا تذکرہ کیا ہے وہ صرف مضمون کے تعارف کی غرض سے ہے۔ بہر حال چونکہ آپ نے اپنے سوال میں میرے لئے کافی دلچسپی پیدا کر دی ہے اس لئے اس کے متعلق تھوڑا بہت بھی لکھ دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ انسان کی خدمت ہم لوگوں کا فرض ہے ۔ میں جو کچھ لکھوں گا اپنی ذاتی رائے کی بنا پر لکھوں گا۔ ممکن ہے اس میں چند ایسی باتیں ہوں جو آپ کے حسبِ منشا ہوں لیکن اکثر نکات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو آپ کے جذبات کے خلاف ہوں، اس کے لئے اُمید ہے کہ آپ مجھے قابلِ معافی سمجھیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں فی الحقیقت اُردو اور ہندی سے مل کر کوئی ایک نئی زبان پیدا ہو جائے تو یہ ملک کی خوش قسمتی ہو گی ۔ نام سے کوئی بحث نہیں ۔ آپ اس کو "ہندوستانی" کہیئے یا "عربی"۔ الفاظ کے خزانوں کے لحاظ سے اپنی اپنی جگہ اُردو اور ہندی دونوں فخر کر سکتی ہیں ۔ اگر موجودہ ہندی پر زیادہ تر سنسکرت کا احسان ہے تو اُردو پر فارسی اور عربی دونوں کا ہے۔ یہ اصول کہ اُردو نویس بڑے بڑے عربی اور فارسی الفاظ اور ہندی نویس کڑے کڑے سنسکرت الفاظ ترک کر دیں، مجھ کو بالکل لچر سا معلوم ہوتا ہے ۔ حق یہ ہے کہ اُردو کی خوبصورتی فارسی اور عربی سے اور ہندی کی لچک سنسکرت اور بھاشا سے ہے، ہاں اگر یہ انتظام ہو سکے کہ ہندی اور اُردو کے تمام الفاظ ایک زبان میں جمع کر دیئے جائیں اور ان کا استعمال عام ہو جائے تو خیر اس طرح کی ایک زبان قابلِ قبول ہو سکتی ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ قابلِ عمل نہیں ۔

موجودہ "ہندوستانی" کی تحریک خلافِ عقل ہے ۔ زبان کو مصنوعی طور پر سہل بنانے سے تو بہتر یہ ہے کہ وہ بازاری زبان بولی اور لکھی جائے جو روزانہ ہم آپ شہروں کے بازاروں میں، کارخانوں میں اور ریل گاڑیوں پر ایک صوبہ والے کو دوسرے صوبہ والے سے بولتے ہوئے سنتے ہیں ۔ یہی ایک بہترین "ہندوستانی" ہو سکتی ہے۔ اگر پھر اس کے لئے اہتمام اور پروپگینڈا کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسی زبان تو ایک صدی سے اس ملک میں بولی جا رہی ہے، صرف ضرورت اتنی ہے کہ علمائے ادب اس کا فتویٰ دے دیں کہ ہر عامی جو زبان بھی جس طرح اُلٹ پلٹ کر بولتا ہے فصیح ہے۔

اگر زبان کو جُوں توں کر کے سہل بنانا ضروری ہو تو ظاہر ہے کہ ہندی سے زیادہ اُردو میں اس کی صلاحیت موجود ہے۔ اُردو کا طرح ہی اس لئے پڑی تھی کہ اکثر زبانوں کے اچھے الفاظ مصادر چھوڑ کر اس میں لے لئے جائیں۔ مثال کے طور پر اُردو میں "پوجا" اور "پرستش" دونوں رائج ہیں، "گل اندازی" اور "مٹی بھرنی" دونوں صحیح ۔ مگر اُردو میں چند الفاظ فارسی اور عربی سے مل کر اس طرح

بنے ہیں کہ اگر اُن کے لئے ہندی لفظ لایا جائے تو بالکل لچر ہوگا۔ مثلاً فارسی کے لفظ "چشم" اور عربی کے لفظ "عین" سے الفاظ "چشمہ" اور "عینک" بنے ہیں۔ ہندی میں لفظ "آنکھ" یا "نین" ہے۔ اگر ہندی نوازی کے پھیر میں آکر ہم "عینک" کی جگہ "نینک" لکھیں تو یقیناً فصاحت کا خون ہوگا۔ علاوہ اس کے اُردو میں چند ایسے الفاظ ہیں جن کے لئے آپ ہندی لا ہی نہیں سکتے۔ جیسے اگر پاجامے کے لئے دھوتی، مسجد کے لئے مندر اور نماز کے لئے پوجا لکھیئے تو مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی میں بھی چند ایسے الفاظ ہیں جن کے لئے فارسی یا عربی سے مدد نہیں لی جا سکتی لیکن ساتھ اس کے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندی کے ایسے الفاظ تو اُردو ہی سمجھے جاتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ وقتاً فوقتاً "السلام علیکم" کے بدلے "آداب عرض" کہا جائے تو ہرج نہیں۔ "محبت" کے لئے "پریم" اور "دل" کے لئے "ہردے" استعمال کیا جائے تو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے اُردو زبان کی ایک گونہ ترقی ہو سکتی ہے۔ ہاں مجھ کو یہ اچھا نہیں لگتا کہ اُردو میں لوگ "زلزلہ" کے بدلے "بھوئیں لمپ"، "امید" کے بدلے "آشا"، ہندوستان کے بدلے "ہندوستھان" لکھیں۔

ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے جس کو صحیح معنی میں براعظم کہا جا سکتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس میں قطعی اس کی ضرورت نہیں کہ ایک ہی زبان بولی اور لکھی جائے۔ اس سے سیاسی اتحاد میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ اُردو ایک ایسی زبان ہے کہ بغیر پڑھے لکھے ہر شخص بول سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے لیکن ہندی ایک ایسی چیز ہے کہ خصوصاً مسلمانوں کے لئے لکھنا تو کجا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ رسم الخط میں اس کو بڑی آسانی ہے اور خصوصاً طباعت کے معاملے میں۔ لیکن جو زبان عام طور پر ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے، وُہ اُردو ہے۔ اب رہا رسم الخط کا معاملہ تو اصل جھگڑا یہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اُردو چھاپنے کی سائنس کو ترقی دی جائے۔ لیکن ہر حرف کو علیحدہ لکھنے کو مَیں بُرا سمجھتا ہوں۔ اس میں انگریزی کی نقل ہوتی ہے۔ یوں بھی انگریزی میں چار قسم کے حروف ہیں۔ چھاپنے کے دو حروف ہیں ایک بڑے اور ایک چھوٹے، اس طرح لکھنے کے بھی دو۔

اخیر میں عرض ہے کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ آپ میرے خیالات معلوم کرلیں اور معاملہ طے ہو جائے۔ زمانہ کا انتظار کیجئے اور دیکھیئے کیا ہوتا ہے۔ اتنا یقین رکھیئے کہ ایک سو سال تک یہی اُردو قائم رہے گی۔ صرف فرق اتنا ہوگا کہ اس کشمکش میں اُردو کو ایک دو ہزار الفاظ ہندی کے مل جائیں گے اور جو کثرتِ استعمال سے عام ہو جائیں گے۔

آپ کا

سی۔جی گریوز

اُردو کا ماضی اور حال

۱۹۰۳ء میں

"اخبار انڈین مرر (Indian Mirror) کو ایک انگریزی اخبار کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ سینکڑوں پروفیسر اور ہزاروں اور آدمی اس بات کے نہایت خواہش مند ہیں کہ ایک ایسی زبان بنائی جائے یا ایجاد کی جائے جو تمام یورپین قوموں کے کام دے سکے۔ ایک جنٹلمین نے لنڈن کے ایک اخبار کو لکھا ہے کہ "یہ خیال ہندوستان میں پیدا ہوا اور یہاں بار آور ہوا۔ ہندوستانی (اُردو) اُس قسم کی زبان کا اعلےٰ نمونہ ہے جس کی یورپ میں اب ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے"۔ اس معاملہ میں تو ہندوستان شاباش کا مستحق ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے بعض ملکی بھائی اُس ترقی کو جو ہمارے مُلک میں زبان نے کی ہے روک کر ملک کو دس بیس پُشت پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔"

("زمیندار" ۔ ۸ رجون، ۱۹۰۳ء)

۱۹۳۸ء میں

سردار سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب نے اسمبلی کے ایوان میں ۵ رجولائی کو پہلی مرتبہ اُردو میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: —

"میری مادری زبان وُہی ہے جو تمام ہندوستان کی مادری زبان ہے، یعنی اُردو!"

("سول اینڈ ملٹری گزٹ" ۔ ۶ رجولائی، ۱۹۳۸ء)

حفیظ ہوشیارپوری

الاؤ پر، رات کا گیت

ہاں، آؤ — سینکو آگ سبھی ٹھنڈی راتیں ہیں سردی کی!
جیسے ہو دھڑکتا دل کوئی، ویسے ہیں یہ گھڑیاں جاتی!
گھر کی دیواروں سے باہر طوفان ہے باد و باراں کا،
ظالم ہیں سردی کے نشتر گُن گاؤ آگ کے احساں کا!
تم دیکھو لپکتے شعلوں کو اور ان میں نظر آئیں گے محل،
لیکن جب ڈھونڈو راجوں کو جھٹ اوجھل ہو جائیں گے محل!

ہاں، باہر رات ہے جوبن پر ہر سمت اندھیرا چھایا ہے،
شب کی دیوانی ناگن پر یہ کیسا جذبہ آیا ہے؟
پھنکارتی ہے ہر ہستی پر ہاں ہر ہستی کو ڈراتی ہے!
میں خوش ہوں اس کی مستی پر قدرت کے کھیل دکھاتی ہے!
لیکن تم دیکھو شعلوں کو دیکھو گے گزری شوکت کو!
ہاں تم دیکھو گے راجوں کو اور اُن کی بیتی حکومت کو!
تم کیا جانو کتنے سپنے اس جلتی آگ میں پنہاں ہیں،
جلتے ہیں پیڑوں کے ٹہنے لیکن سپنے بھی فروزاں ہیں،
آؤ، دیکھو یہ سپنے تم، جلدی ہی سویرا آ جائے گا،
پھر کام کرو گے اپنے تم، یہ جادو سب مٹ جائے گا!

میراجی

افسانہ نویس

شام کے سائے آہستہ آہستہ لمبے ہو رہے تھے۔ میری جیب میں صرف ایک اکنی تھی جو ابھی ابھی ہوٹل والے کی جیب میں پہنچنے والی تھی۔ میں میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ لیکن چائے کی ایک پیالی مجھے تسکین نہیں دے سکتی تھی۔ اس وقت میں بھوکا تھا روٹی کا بھی اور شہرت کا بھی۔ دُنیا میں میرا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ ایک رسالے کا کم سخن اور زردرُو ایڈیٹر اپنے رسالے میں میری کہانیاں شائع کیا کرتا تھا لیکن صرف اسی صُورت میں جب اس کے پاس کوئی اچھا مضمون یا افسانہ موجود نہ ہوتا تھا۔ ایک افسانہ کی قیمت مجھے صرف دو روپے ملتی تھی چاہے میرا افسانہ کتنا ہی لمبا کتنا ہی اچھا یا کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو۔

جنوری کی اس شام کو تیز و تُند ہوا چل رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا گھنٹیاں بجا رہی ہے۔ ان گھنٹیوں سے نہایت بے کیف آواز نکلتی تھی۔ میں ہوٹل میں بیٹھا نہایت آہستہ آہستہ اپنی پیالی ختم کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں کسی عجیب وغریب افسانے کا پلاٹ سوچ رہا تھا تاکہ دو تین دن کی روٹی کے لئے کچھ پیسے مل جائیں۔ اسی شام مجھے افسانہ مکمل کرنا تھا تاکہ دوسرے دن میں ایڈیٹر سے مل کر دو تین دن کے نفیس کھانے کے لئے کچھ پیسے حاصل کر سکوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس تن دہی سے اپنے پریشاں خیالات کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ سلیقے سے رکھے ہوئے سفید کاغذ میرے سامنے تھے۔ انہیں سیاہ کرنے کے لئے اگر مجھے کوئی خیال سُوجھتا تو میں اُچھل پڑتا۔

اس کشمکش اور بے تابی میں سوا چار گھنٹے گزر گئے اور مجھے کوئی اچھا پلاٹ نہ سُوجھا۔ میرا دماغ خالی تھا۔ طائرِ خیال کے پر بوجھل ہو رہے تھے اور مَیں تھک چکا تھا۔ آخر میں نے یہاں بیٹھ کر لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔ آخری اکنی جیب سے نکالی اور ہوٹل والے کے سامنے پھینک کر باہر نکل آیا۔ جب میں باہر آیا تو یکایک مجھے ایک فقرہ یاد آ گیا —— ایک ایسا فقرہ جو میں بیسیوں دفعہ سُن چکا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اس کا کہنے والا کون ہے —— "اگر کوئی آدمی خواہ وہ معمولی آدمی ہی کیوں نہ ہو اپنی زندگی کے تمام واقعات قلمبند کر لے تو اس کی لکھی ہوئی کتاب کا دُنیا کے بہترین ناولوں میں شمار ہوگا" —— کوئی دس منٹ تک میں اسی فقرے پر غور کرتا رہا۔ جب میں اپنے مکان کے قریب پہنچا تو میں نے دل ہی دل میں کہا کہ "میں کیوں نہ اس پر عمل کروں، کیوں نہ کسی آدمی کی زندگی کے حالات لکھ ڈالوں۔ سب سے پہلا "معمولی آدمی" جو مجھے مِلے اسے پکڑ لوں اور حالات پوچھ کر لکھ ڈالوں۔ میں تو کوئی "معمولی آدمی" نہیں۔ اس کے علاوہ میں اپنے افسانوں میں اپنے متعلق اتنا زیادہ لکھ چکا ہوں کہ اب کچھ مزید لکھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ مجھے فوراً

کسی اور آدمی کی تلاش کرنی چاہئے۔ ایسے آدمی کی جسے میں جانتا نہ ہوں۔ جو بالکل معمولی آدمی ہو۔ میں اس سے کہوں گا کہ جو جو واقعات تمہیں پیش آئے ہیں اور جو جو کچھ دنیا میں تم نے کیا ہے مجھے بتا دو، اور یہ کام مجھے آج شام ہی سرانجام دینا چاہئے . . . . میں کسی سے روپے پیسے کی خیرات نہیں مانگتا۔ لیکن اس کے بجائے کیوں نہ میں لوگوں سے ان کے حالاتِ زندگی کی خیرات مانگوں۔

یہ تجویز مجھے اتنی سادہ اور اتنی عجیب معلوم ہوئی کہ میں نے اسے فوراً عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں پھر اپنے گھر کی طرف سے وسطِ شہر کی طرف مڑا جہاں گہری شام ہوجانے کے باوجود کافی آدمی ملنے کی اُمید تھی۔ چنانچہ میں آوارہ پھرتا ہُوا شہر کے وسطی چوراہے کی طرف مڑا۔ تھوڑی دُور گیا تھا کہ مجھے ایک فقیر دکھائی دیا جو کسی راہگیر کی جیب پر ڈاکا ڈالنے کے لئے کوئی بہانہ سوچتا چلا آرہا تھا۔ وہ ہر راہگیر پر ایک گہری نگاہ ڈالتا تاکہ اُسے اپنی پسند کے مطابق کوئی آدمی مل جائے اور وہ پھر اُس سے اپنا سوال کرے۔ اُدھر میں بھی ایک ڈاکو کی طرح کسی ایسے آدمی کی تلاش میں گھوم رہا تھا "جو معمولی" ہو اور مجھے اپنے حالاتِ زندگی سے باخبر کرسکے۔

پہلا آدمی جو روشنی کے لیمپ کے نیچے سے گزرا بالکل تنہا تھا۔ ادھیڑ عمر کا تھا۔ لیکن میں نے اسے نہ روکا کیونکہ اس کا لکیردار چہرہ مجھے بہت عجیب و غریب معلوم ہُوا اور مجھے تو کوئی معمولی آدمی درکار تھا۔ اس کے بعد ایک نوجوان وہاں سے گزرا۔ اس نے ایک لمبا کوٹ پہن رکھا تھا لیکن اس کے ہوا میں اُڑتے ہوئے بالوں اور شرابی آنکھوں نے مجھے مایوس کردیا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ وہ ایک خیال پرست اور کج رو آدمی ہے، کوئی معمولی آدمی نہیں، تیسرا آدمی جو میرے قریب سے گزرا ایک بوڑھا تھا اس نے ڈاڑھی مونچھ منڈوا رکھی تھی، وہ ایک غمناک ہسپانوی گیت گنگناتا آرہا تھا۔ شاید اُسے اپنی جوانی اور محبت کا زمانہ یاد آرہا تھا۔ یہ آدمی بھی میرے لئے موزوں نہ تھا سو میں نے اسے نہ ٹھہرایا۔

جب میں ان واقعات کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے یاد نہیں آتا کہ اس وقت میں اپنے دل میں کس قسم کا غصہ محسوس کررہا تھا۔ ذرا خیال تو فرمائیے ایک عجیب قسم کا ڈاکو ——— ایک عجیب چور کس قدر اشتیاق و اضطراب سے پھر رہا ہے کہ کوئی ایسا اجنبی اس کے ہاتھ آجائے جس سے وہ اس کے حالاتِ زندگی پُوچھ کر اپنا عظیم الشان مقصد پورا کرلے۔ جو آدمی اس کے قریب آتے ہیں وہ اس کے معیار پر پُورے نہیں اُترتے۔ ان سب کے چہروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ معمولی آدمی نہیں ہیں۔ ان کی زندگیاں عجیب و غریب ہیں۔ اگر اس وقت کوئی مجھے ان بے شمار سطحی اور موٹی عقل والے عوام میں سے کسی کو بلا دیتا جن سے میں بخوبی واقف تھا اور جو متعدد بار مجھے خوش یا ناخوش کرچکے تھے تو میں اس شخص کو دُنیا کی قیمتی سے قیمتی چیز دینے کے لئے تیار ہوجاتا۔

لیکن ان دنوں میں بہت ضدی اور اولوالعزم تھا سو میں روشنی کے ایک بازاری لیمپ کے نیچے جو ہوا میں آنکھ جھپک رہا تھا بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اب بازار سنسان ہوچکے تھے اور ہوا ان لوگوں کو مایوس کرچکی تھی جو رات کو سفر کرتے ہیں کبھی کبھی کوئی تیز رفتار سایہ رات کے سکوت کو توڑتا تھا، یہاں تک کہ ایک سایہ اس لیمپ کے قریب سے گزرا جہاں میں بیٹھا تھا۔ میں

نے فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی آدمی ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ یہ نہ تو بوڑھا تھا نہ نوجوان، نہ بدصورت تھا نہ خوبصورت۔ اس کی آنکھیں پُرسکون اور مونچھیں اچھی حالت میں تھیں اور اس نے ایک نہایت عمدہ موٹا سا چغہ پہن رکھا تھا۔

جب وہ مجھ سے چند قدم آگے نکل گیا میں نے اسے شانے سے پکڑ کر ٹھہرا لیا۔ وہ میری طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا بلکہ وہ مجھے کوئی چور سمجھ کر مقابلہ کرنے پر تیار نظر آنے لگا۔ بہرحال میں نے اُسے فوراً نہایت ملائمت آمیز لہجے میں سمجھایا کہ "ڈرو نہیں میں کوئی قاتل یا خونی نہیں ہوں۔ نہ کوئی بھکاری یا ڈاکو ہوں۔ البتہ میں ایک عجیب قسم کا بھکاری ضرور ہوں۔ لیکن میں تم سے پیسے نہیں مانگتا۔ مجھے صرف ایک چیز درکار ہے اور اس کے دینے میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا ——— مجھے تمہاری زندگی کی کہانی درکار ہے"۔

یہ سُن کر اس آدمی کی آنکھیں فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ایک قدم پیچھے کی طرف ہٹ گیا۔ میں سمجھ گیا وہ مجھے کوئی پاگل سمجھ رہا ہے۔ سو میں نے بڑے نرم لہجے میں اس سے کہنا شروع کیا کہ "میں وہ نہیں جو تم مجھے خیال کر رہے ہو۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ البتہ پاگلوں کا سا آدمی ضرور ہوں ——— یعنی ایک افسانہ نگار۔ میں کل کے فاقے سے بچنے کے لئے آج ایک افسانہ لکھنا چاہتا ہوں۔ سو میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے متعلق مجھے کچھ بتاؤ کہ تم کون ہو کیا کرتے ہو تاکہ میں تمہارے متعلق کچھ لکھ کر اپنا افسانہ پورا کر دوں۔ درحقیقت مجھے تمہاری بھی ضرورت تھی اور تمہاری زندگی کے حالات کی بھی۔ براہِ مہربانی میرا سوال رد نہ کرنا۔ مجھے اُمید ہے کہ تم مجھ جیسے مصیبت زدہ آدمی کی ضرور مدد کرو گے۔ مجھے ایک تمہیں جیسے آدمی کی تلاش تھی۔ جو کچھ تم مجھے بتاؤ گے اس کی مدد سے میں ایک بہت بڑا "شاہکار" لکھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا ۔ ۔ ۔ ۔"

اجنبی کے دل پر میری باتوں کا بہت اثر ہوا۔ اب خوفزدہ نظروں کے بجائے وہ مجھے رحم کی نظروں سے تکنے لگا۔

"اچھا اگر تم واقعی میری زندگی کی کہانی سُننا چاہتے ہو تو سنو۔ میں تمہیں آسانی سے سُنا سکتا ہوں، کیونکہ یہ بڑی سادہ سی ہے"۔

"میں آج سے سینتیس سال پہلے پیدا ہوا۔ میرے والدین اچھی خاصی زندگی بسر کرتے تھے۔ بڑے ایماندار اور عزت مند تھے میرا باپ تجارت کرتا تھا اور ماں بھی گزارے کے لئے تھوڑا بہت کام کر لیا کرتی تھی۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چھ سال کی عمر میں مَیں نے سکول جانا شروع کیا، سولہ سال کی عمر میں سکول کی تعلیم سے فارغ ہو گیا۔ اس کے بعد باپ نے مجھے ریلوے کے دفتر میں ملازم کرا دیا۔ وہاں مجھے آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر سال میری تنخواہ میں تین روپے اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب میں پچاسٹھ برس کا ہو جاؤں گا تو مجھے تین ہزار روپیہ بونس مل جائے گا۔ باپ نے ایک جگہ میری نسبت کر دی۔ ایک سال بعد ہماری شادی ہو گئی، اس ایک سال کے عرصے میں ہم نے فضول راہ و رسمِ محبت بڑھانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ البتہ میں مہینے میں ایک بار یا دو بار ان کے گھر ضرور چلا جایا کرتا تھا۔ اب ہمارے دو بچے ہیں۔ لڑکے کی عمر دس سال ہے۔ میں اسے انجنیری کی تعلیم دلاؤں گا۔ لڑکی کی عمر نو سال ہے۔ اسے استانی بنانے کا ارادہ ہے۔ میں نہایت اطمینان و سکون کی زندگی بسر کر رہا ہوں مجھے کوئی فکر نہیں۔ ہر صبح میں چھ بجے اٹھتا ہوں۔ کوئی آٹھ بجے میں ایک دوست کے ہاں چلا جاتا ہوں جہاں اخبار پڑھتا ہوں اور دوسرے دوستوں سے موسم، جنگ اور اپنے دفتر کے افسروں کے متعلق باتیں ہوتی ہیں، دس بجے کھانا کھا کر دفتر چلا جاتا ہوں۔ سو یہ ہے میری زندگی کی

کی پوری کی پوری کہانی۔ اب مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اب سے دس منٹ پیشتر مجھے گھر پہنچ جانا چاہئے تھا۔"

اپنی زندگی کی کہانی سنا کر وہ چپکے سے چلتا بنا۔ جب میں نے اس کی اتنی سادہ بے کیف اور یکسانیت کے ساتھ گزرتی ہوئی زندگی کا تصور کیا تو میں لرز گیا۔ میرا دل ٹوٹ گیا اور میں اس قدر حسرت زدہ ہو گیا کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بالآخر میں وہاں سے بھاگ نکلا۔

اب میں نے پھر ادھر اُدھر آوارہ پھرنا شروع کیا۔ میں نے دل میں سوچا یہی ہے وہ مشہور "معمولی آدمی" ــــ موجودہ زندگی کا اصلی ہیرو، بڑی مشین کا چھوٹا پہیہ، بڑی دیوار کا چھوٹا پتھر ایک ایسا آدمی جسے زندگی کے معمولی دُکھوں سے بھی کوئی سروکار نہیں جسے وحشت آمیز خیالات نہیں ستاتے۔ میرا تو خیال تھا کہ اس قسم کا کوئی آدمی دُنیا میں ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اب میں اُسے اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ اور وہ اس لئے مجھ سے خوفزدہ ہو گیا ہے کہ وہ جھوٹی مسرت کی زندگی بسر کر رہا ہے لیکن اس نے میری بات تو سُنی ہی نہیں فوراً چل دیا ہے۔ یہ سوچ کر اور اُس کے متعلق آخری بار کچھ اور پوچھنے کے لئے میں دوڑا اور گھبرا کر اُس سے پوچھا "کیا درحقیقت تمہاری زندگی یہیں تک محدود ہے؟" "کیا تمہیں کبھی کوئی حادثہ پیش نہیں آیا؟ کیا کبھی کسی نے تمہیں قتل کرانے کی کوشش نہیں کی؟ کیا تمہاری بیوی نے کبھی تم سے غداری نہیں کی؟ کیا تم سے برتر آدمیوں نے کبھی تمہیں کچلنے کی کوشش نہیں کی؟ یا ۔ ۔ ۔ ۔ "

اجنبی نے جواب دیا ـــ "مجھے کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اگرچہ اس کا لہجہ نہایت ملائمت آمیز تھا۔ تاہم معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے تنگ آ گیا ہے۔

اس نے پھر کہا "جو جو باتیں تم نے مجھ سے کہی ہیں مجھے کبھی ان سے پالا نہیں پڑا۔ میری زندگی نہایت سکون، یکسانی اور باقاعدگی سے بسر ہو رہی ہے۔ نہ مجھے کبھی بڑی بڑی خوشیاں حاصل ہوئی ہیں نہ بڑے بڑے غم۔ میری زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہو۔"

میں نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "کیا سچ مچ؟ نہیں میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ذرا سوچو تو، شاید تمہیں کوئی بات یاد آ جائے، کیا تم مُردوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہو؟"

"معمولی آدمی" نے کہا "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا جو قابلِ ذکر ہو۔ یا کم از کم آج رات سے پہلے پہلے مجھے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ میری زندگی کا پہلا حادثہ میری اور تمہاری یہ ملاقات ہے۔ اگر سچ مچ تم کچھ لکھنا چاہتے ہو تو اسی کے متعلق لکھ لو۔"

اس کے بعد وہ مجھے کوئی جواب دینے کا موقع دیئے بغیر سلام کر کے چل دیا۔ میں کوئی ایک یا دو منٹ تک مسحور ہو کر وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔ اس شام کے بعد میں نے پھر کبھی عام لوگوں سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔

مہدی علی خاں

(ترجمہ)

پہلی اور آخری آرزو

بھرے جنگل ہوں پھرتے ہوں درندے جا بجا جن میں
نہ ملتا ہو گھنی بیلوں کے باعث راستا جن میں

کبھی جھاڑی میں چھپ کر ہاتھیوں کے کارواں دیکھوں
کبھی راتوں کو تاروں میں بہارِ لامکاں دیکھوں

تھکی ماندی طبیعت کو کبھی اِس طرح بہلاؤں
بہت اُونچے درختوں پر چڑھوں چڑھ کر اُتر آؤں

اندھیری رات میں سُنتا پھروں چیتوں کی آوازیں
فضا میں پَو پھٹے دیکھوں ابابیلوں کی پروازیں

کبھی بارش کے طوفانوں کو چیروں اپنے سینے پر
کبھی دریا کی لہریں پھاندتا جاؤں سفینے پر

کبھی ٹھنڈی زمیں پر لیٹ جاؤں گیت گاؤں میں
اور اپنی داستاں معصوم چڑیوں کو سناؤں میں

پرندوں کی قطاریں تیرتی جائیں مرے سر پر
درخت اپنے ملائم پھول برسائیں مرے سر پر

مجھے قدرت کی ہر تخلیق سے یوں پیار ہو جائے
کہ اِک جا پر ٹھہرنا میرے حق میں بار ہو جائے

گلابی تتلیوں کی جُستجو ہو مجھ کو راہوں میں
افق کے پاس اِک دھندلا سا گاؤں ہو نگاہوں میں

میرے پاؤں میں برقی قوتوں کا ایک طوفاں ہو
مرے آگے ستاروں تک پہنچ جانا بھی آساں ہو

بس چلتا جاؤں، گاتا جاؤں نامعلوم راہوں میں
کوئی بے نام سی دُنیا پھرے میری نگاہوں میں

اُفق کے لالہ گوں ساحل کو چوموں اور سما جاؤں
میں آنے والی نسلوں کے لئے رستہ بنا جاؤں

احمد ندیم قاسمی بی۔اے

"چاند نکلا"

(انتساب:- اپنی ایک عزیزہ محمودہ خاتون کے نام جو اس نظم کے وجود کی ذمہ دار ہیں۔)

چاند نکلا آسماں پر نور برساتا ہُوا
کم ضیا تاروں کو اپنی ضَو سے شرماتا ہُوا

تنگئ مشرق سے اُٹھتا آرہا ہے اِس طرح
جیسے زنداں سے رِہا ہو کوئی گھبراتا ہُوا

دولتِ تابندگی دیتا ہُوا ظلمات کو
اور ہوا پر ابر کے ٹکڑوں کو سرکاتا ہُوا

خامشی میں بجلیاں بھرتا ہُوا کُہسار کی
نیند میں کھوئے ہوئے ذرّوں کو چونکاتا ہُوا

اُٹھ رہا ہے دُور اُفق سے رفتہ رفتہ اِس طرح
جیسے آئے کوئی بیخود ٹھوکریں کھاتا ہُوا

اضطرابِ رُوح کو دیتا ہُوا اذنِ شگفت
زندگی کی خشکیوں پر کیف برساتا ہُوا

اپنی تابانی سے خود ہوتا ہُوا حیراں کبھی
جیسے شبنم کا ستارہ گُل پہ تھرّاتا ہُوا

روشنی دیتا ہُوا وادی کے خوش رو پھُول کو
برگ ہائے خشک کو کرنوں میں اُلجھاتا ہُوا

شاعری کو گدگداتا رُوح کی گہرائی میں
دِل کی گہری ظلمتوں میں برق چمکاتا ہُوا

حُسن کے معصُوم چہرے سی نقاب اُلٹے ہوئے
ذہنِ شاعر میں محبت کی قسم کھاتا ہُوا

تک رہا ہوں میں تجھے نو عمر بچوں کی طرح
اور تو گزرا چلا جاتا ہے کتراتا ہُوا

یا شریکِ حال ہو جا تو مری تنہائی میں
یا فلک سے ٹوٹ کر گر جا کسی گہرائی میں

فضل الدین اثر اکبر آبادی

قطعہ

کہہ رہا تھا کوئی یہ دن ڈھلتے — دِن مصیبت کے کیوں نہیں ٹلتے
اور بھی اہلِ حرص ہیں لیکن — دانے دانے کو یوں نہیں ڈُلتے
خون پیتے ہیں جو غریبوں کا — پھولتے ہیں، مگر نہیں پھلتے
دل ہی رکھا نہیں ہوس سے جُدا — ورنہ اس آگ میں نہیں جلتے
ہم تو اُس آستیں کے قائل ہیں — سانپ جس میں کبھی نہیں پلتے
جن کا دامن عمل سے خالی ہے — کفِ افسوس کیوں نہیں مَلتے

ٹھوکریں کھا رہے ہو کیوں حیرت
راہ کیوں دیکھ کر نہیں چلتے

عبد المجید حیرت

بیمارئ رُوح

(۱)

" فانی مسرتیں نہ اُسے نصیب ہیں اور نہ اُسے اُن کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ تو اپنے خیالات کے ویرانوں میں بس جانے والی مُورتوں کی محبت سے اپنی رُوح کو فروغ دیتا رہتا ہے۔ جھیل کے پانی میں منعکس آفتاب کی شعاعیں اگر بیل دار پودوں کی جوانی پر کھیلنے والی شہد کی زرد مکھیوں پر رقصاں نظر آتی ہیں تو اُسے کیا! ـــــ وہ اُنہیں صبح سے شام تک دیکھتا رہے گا اور دیکھنے کی کچھ بھی پروا نہ کرے گا ـــــ بایں ہمہ وہ قدرت رکھتا ہے کہ اُنہیں اشیاء کے ذریعہ سے زندہ انسان سے بھی زیادہ "حقیقی" مُورتیں یعنی لافانی مخلوق پیدا کر دے۔"

(شیلے)

ڈاکٹر آرام کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا اور اپنے سامنے لیٹے ہوئے مریض کے عجیب وغریب مرض پر غور و فکر کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اُس کی نگاہیں اُوپر اُٹھتیں اور اُن لاتعداد تصاویر کا سرسری جائزہ لیتی ہوئی جن سے کمرہ مزیّن تھا ایک ایسی ناتمام تصویر پر جا کر مرکوز ہو جاتیں جو ہنوز تصویرکشی کے چوبی چوکھٹے میں آویزاں تھی۔ کمرہ رنگا رنگ پردوں سے سجا ہُوا تھا۔ چوکھٹے کے نزدیک ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر مصوّر کا مُوقلم اور رنگ کے ڈبے یوں منتشر اور گرد آلود نظر آتے تھے گویا وہ مُدت سے استعمال نہیں کیے گئے۔ مریض کو ہوا سے محفوظ رکھنے کے لئے کھڑکیاں نہایت احتیاط کے ساتھ بند کر دی گئی تھیں۔ صرف ایک کچھ کھُلی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک سبک ریشمی پردہ آویزاں تھا جو برساتی شام کی نم آلود ہوا کی نرم نرم لہروں میں تھرّا رہا تھا۔ مریض کی حالت نہایت خوفناک مگر رحم طلب نظارہ پیش کر رہی تھی۔ وہ اپنے کوچ پر دراز تھا اور اُس کی جلد کی سطح میں سے اُس کی ہڈیاں صاف صاف نظر آ رہی تھیں۔

یکایک مریض اُٹھ بیٹھا اور ڈاکٹر کی طرف کچھ ایسی ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا گویا کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر اُس کی طرف متوجہ ہُوا تو مریض نے ایک پُرسکون مگر لرزتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا ـــــ

"آپ جانتے ہیں کہ میں ایک مصوّر ہوں۔ ایّامِ جوانی ہی سے میری یہ پُرجوش آرزو تھی کہ اپنے حریفوں پر سبقت لے جاؤں۔ اور اُن کے مقابلے میں صرف میری تصاویر کے خریدار ہی زیادہ نہ ہوں بلکہ فنّی مقابلوں اور نمائشوں میں بھی میں اُن سے بلند مرتبہ ثابت ہوں۔ لیکن اس سے پہلے کہ میری یہ آرزو پوری ہوتی مجھ پر ایک عجیب وغریب بیماری حملہ آور ہوئی اور آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر میرے حواس پر چھانے لگی۔ ایک قسم کا "جمالیاتی نشاط" میرے دل میں ڈوب کر رہ گیا اور مَیں حُسن کے لئے ایک زبردست

تشنگی محسوس کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود میری رُوح ایک ناممکن الحصول مجسمۂ حُسن و محبت کی طرف بے اختیار کھنچی جارہی ہے۔ جذبات و احساسات کے خوابیدہ چشمے اُبلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

میں متلاشی تھا حُسن کا ــــ حُسنِ مکمل کا!

تصور و تخیل جو بذاتِ خود مصور کے دِل کے لئے شیریں ہوتا ہے، میرے دل کے لئے ایک دُوسری دُنیا آباد کررہا تھا۔ ــــ خوابوں کی دُنیا! ــــ میں شب و روز اپنے دارالعمل میں ایک غیر شعوری و نیم مدہوشانہ حالت میں مصروفِ کار رہتا تھا لیکن اپنے تصور کی تخلیق کو ــــ اپنی تصاویر کو کاغذی سطح پر منتقل کرنے کے بعد فوراً چاک کر ڈالتا تھا ــــ وہ "حُسنِ مکمل" کی تصاویر ثابت نہ ہوتی تھیں! جمالِ مکمل کا نمونہ مستقل طور پر میرے دل کی آنکھوں کے سامنے موجود رہتا تھا لیکن میری تصاویر اُس کے مطابق نہ بن سکتی تھیں۔ دماغی خلا کے اندر غیر مرئی پردے پر" وہ تصویر" ہمیشہ رقصاں محسوس ہوتی تھی مگر افسوس میں اُسے سطحِ قرطاس پر منتقل نہیں کر سکتا تھا؟"

مصور کا سانس پھُولنے لگا ــــ وہ خاموش ہوگیا۔

(۲)

"جب وہ پہلی مرتبہ میری بصارت پر طلوع ہوئی تو وہ ایک حُور تھی مسرت کی ــــ جو محبت آفریں انداز میں یکایک جلوہ افگن ہوئی اور ایک حقیر سی ساعت کو ساری دُنیا کی زینت بخش گئی ــــ وہ ایک تصویر تھی رقصاں ــــ ایک مجسمہ تھی خنداں ــــ جس کا مقصدِ آفرینش تھا مدہوش کردینا ــــ چونکا دینا اور پھر لُوٹ لینا" (ورڈزورتھ)

اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہوئی۔ اُس کی آواز بھاری سی ہوگئی اور بھرّانے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی رُوح کی طنابیں کھنچ رہی ہیں۔ ڈاکٹر آگے جھکا ہوا تھا ــــ اُس کا ہاتھ ایک آبنوسی میز پر تھا جس پر تھرما میٹر اور چند خالی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں ــــ مصور نے کہنا شروع کیا ــــ

" ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں اپنے دریچے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہری ہری گھاس ــــ فاصلہ پر کلیسا کی بلند چوٹی اور غربا کی سینکڑوں جھونپڑیاں سب کچھ غروب ہونے والے آفتاب کی زرد شعاعوں میں ڈوبی ہوئی تھیں اور میں اُن کو کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ یکایک مجھے اپنی پشت کی طرف لباس کی لطیف سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ مُڑکر دیکھا تو اُسی چیز کو اپنے نزدیک پایا جس کی جستجو مجھ کو مُدت سے بیتاب کئے ہوئے تھی۔ میرے دِل میں بس جانے والی تصویر گوشت پوست کے سانچے میں ڈھل کر میرے سامنے آگئی تھی۔ "حُسنِ لانہایت" کا وہ پرتو جو میرے دماغ کی فضا میں سیک سیرِ خواب کی طرح پرّاں رہتا تھا۔ اب ایک حسین دوشیزہ کے متناسب قامت میں تبدیل ہوگیا تھا۔ جمالِ مکمل کا نمونہ جس کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھنے کی مجھے کوئی اُمید نہ تھی اب میرے سامنے تھا!!!

مگر کیا وہ میرے محبوب تصوّر کی ایک حقیقی زندہ تصویر تھی یا صرف میرے دلی احساسات کی ایک تخلیق اور میری دماغی نگاہوں کا ایک فریب؛ اُس کو دیکھ کر بلا شک وشبہ یقین نہ ہوتا تھا کہ یہ زندہ مخلوق ہے۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس کی حقیقت خواب سے زیادہ کچھ بھی نہیں ـــــ تصوّر کی ایک فریب دہ تخلیق ہے اور بس! ـــــ لیکن مشاہدہ یقین دلا رہا تھا ـــــ وہ میرے سامنے تھی اور تبسم بلب خراماں خراماں میری طرف آ رہی تھی۔ وہ پیازی رنگ کا مصفا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اُس کا نصف چہرہ جو پریشان گیسوؤں کے نیچے زیرِ نقاب تھا شرم وحیا اور دیگر عمیق احساسات کی وجہ سے گلابی نظر آ رہا تھا ـــــ وہ آئی اور ہلکے سے میرے شانوں کو چھو دیا۔ میرے متحیّر اور بے حس وحرکت جسم میں ایک تھرتھری دوڑ گئی کیونکہ جب دماغ شدید احساسات و توقعات کے زیرِ اثر ہوتا ہے تو ایک معمولی سا واقعہ بھی تصوّرات کی دُنیا میں آگ لگا سکتا ہے۔

وہ مترنم آواز میں بولی ـــــ "کیا براہِ مہربانی میری تصویر بنا دیں گے آپ؟"

میں نے ایک منٹ تک خاموش رہنے کے بعد جواب دیا:۔

"ضرور"

"کتنا معاوضہ لیں گے آپ؟"

"بہتر ہے کہ یہ معاملہ تصویر بن جانے کے بعد طے کیا جائے"

"پھر بھی کم از کم . . . ."

میں کھڑا ہو گیا اور اُس کی آنکھوں پر اپنی مرتعش نگاہیں جما کر بولا ـــــ

"میں آپ سے کچھ معاوضہ نہ لوں گا"

میں اُس کی طرف پُرشوق حالت میں دیکھتا رہا اور جواب کا منتظر رہا۔ خدا جانے احساسِ حیا تھا یا جذبۂ برہمی کہ اُس کے رخساروں پر سُرخی سی دوڑ گئی اور وہ بچینِ جبین رخصت ہونے لگی۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ زمین میرے قدموں کے نیچے سُکڑ رہی تھی۔ اس سے پیشتر کہ میں اُسے واپس بلاؤں وہ دروازے میں سے غائب ہو چکی تھی۔

کتنی جمیل مخلوق تھی وہ! حُسن کا ایک مجسمہ جس کی تراش خود "اشتر" دیوی کے ہاتھوں سرانجام ہوئی تھی۔ فردوسی حُسن کی تصویر کشی؛ ـــــ یہ میرے بس کی بات نہ تھی! کیا میں اُس کے دانتوں کی زیبائش ظاہر کرنے کے لئے عمیق ترین سمندروں میں غوطہ لگا کر موتی جمع کر سکتا تھا؟ کیا اُس کے رنگین رخساروں کی تصویر کشی کے لئے شفقِ شام کی سُرخیاں مستعار لے سکتا تھا؟ کیا میں ایسے زرین و نازک تار تیار کر سکتا تھا جو اُس کے لہراتے ہوئے بالوں کو ظاہر کر سکتے؟ ـــــ نہیں ـــــ کبھی نہیں۔ عناصرِ فطرت کو مجتمع کر کے اُس کی سی مورت بنانے کے لئے مجھے یقیناً خاتمِ سلیمانی کا مالک ہونا چاہیئے تھا۔

مصوّر کے رنگ دُھندلے ہوتے ہیں اور غیر دلکش! اُس کے ہاتھ میں استقلال ہوتا ہے نہ نزاکت! وہ ایسی دوشیزہ کی کوئی تصویر تیار نہیں کر سکتا جس کا جمال مادّی حدُود پر خندہ زن ہو۔ اُس کے چہرے کی تابناکی اور دل آویزی بزبانِ حال گویا تھی کہ اُس کی مالکہ اُفقِ مشرقی کے تالاب میں اُس وقت نہا کر آئی ہے جب کہ صبح اور رات ہم آغوش ہوتی ہیں۔ اُس کی شفاف اور چاند کو شرما دینے والی پیشانی کیوپڈ کی کمان کی طرح خمیدہ تھی ——— اُس کے یاقوتی لبوں کی نشوونما گلاب کی جوانیوں سے ہوئی تھی ——— اور اُس کا متناسب جسم؟ ——— آہ وہ تو یاسمین کے پھُولوں کا ایک ایسا گلدستہ تھا جو ابھی ابھی تیار کیا گیا ہو۔

تم دیکھتے ہو وہ سامنے ایک ناتمام تصویر آویزاں ہے ——— میں نے اُس کی تصویر بنانے کی کوشش کی لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک لاثانی حسین دوشیزہ ہے اور یہ مقدر ہے کہ تصویر کی صُورت میں بھی اُس کا کوئی ثانی پیدا نہ ہو۔ آہ زندگی کی وہ تازگی ——— جوانی کی وہ تبسّم آفرینی اور چہرے کی وہ محبت زا دلکشی، کاغذ کی مُردہ و بےحس سطح پر منتقل نہ کی جا سکی!

میں جب اُس کی تصویر بنانے بیٹھتا میرا ہاتھ کانپنے لگتا اور اُس کی صُورت ——— آہ اُس کی صُورت تصوّر کے حدود سے غائب ہو جاتی۔ میں یہ بھُول بھُول جاتا کہ "وہ کیسی معلوم ہوتی تھی" ——— اُس کی جمیل آنکھوں اور ناک کے درمیان کیا تناسب تھا ——— اُس کی حسین ٹھوڑی کی جسامت کیا تھی ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اُسے کرۂ بے ہوا" میں دیکھا ہے اور اس لئے کچھ بھی نہیں دیکھ سکا۔ اُس کی صُورت سطحِ دماغ سے اس طرح مٹ جاتی گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ میرے ہاتھوں نے "التجائے عاجز" تصویر تیار کی اور زرّیں تمغہ حاصل کیا ——— میرے ہاتھوں نے "سن رسیدہ بھکاری کی آخری جھُرّیاں" اور "آستانۂ اُمراء پر پھُولوں کے ہار" جیسے کامیاب نقوش تخلیق کئے ——— لیکن میرے یہی ہاتھ اب لرزاں تھے۔ کیا یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ میری بصارت میں فرق آگیا تھا یا اس لئے کہ خود "اُس کا" جمال شفاف تھا ——— اُس کا چہرہ لطیف تھا اور بے رنگ اور اُس کی مژگاں میں مادیت کے خطوط نہ تھے ——— یا اس لئے کہ اُس کا حُسن اس قدر خیرہ کُن تھا کہ میری آنکھیں عجزِ خموش ہو کر رہ گئیں اور دماغ کوئی تاثر قائم نہ کر سکا"

مصوّر بےدم ہو کر بستر پر گر پڑا۔

(۳)

"جب بیتاب و پُرشوق تصوّر سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی یہ نہ بتلا سکا کہ اُس کا "انداز" کیسا تھا تو میں ایک خواب کی گود میں گر پڑا۔ لیکن پھر بھی جس طرح بچے خواب میں مسکراتے ہیں اور بعض اوقات رونے لگتے ہیں اسی طرح میں گویا جاگ اُٹھا اُتنے ہی ہوش و حواس کے ساتھ جیسا کہ پہلے تھا۔"

"ثانی"

ڈاکٹر نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن مریض اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اُس نے یکایک کہنا شروع کیا:——

"اُس وقت مجھے محسوس ہونے لگا کہ اپنے "دار العمل" میں مجھے کوئی دلچسپی حاصل نہیں ہوتی۔ میں گھنٹوں کھڑکی میں بیٹھ

رہتا تھا اور جھیل کلنگ کے اِردگرد کے خوبصورت مناظر پر غور و فکر کیا کرتا تھا۔ اواخرِ جولائی کا واقعہ ہے کہ کھُلی ہوئی کھڑکی سے آنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے ایک رات مجھے تھپک تھپک کر سُلا دیا جس وقت میں گھبرا کر بیدار ہوا تو اندازہ نہ لگا سکا کہ میرے ہوش و حواس پر نیند کتنی دیر مستولی رہی ہے۔ دروازے کھُلے ہوئے تھے لیکن کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ یکایک لباس کی ایک ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی اور خدا جانے اُس میں میری روح نے کیا پا لیا کہ میں دروازے میں سے نِکلا، برآمدے کو طے کیا اور پھاٹک پر پہنچ گیا۔ آسمان پر پُورا چاند چمک رہا تھا اور سبزہ زاروں میں ایک طوفانِ نُور برپا تھا۔ سیاہ سایوں کے سامنے چمکتی ہوئی چیزیں نہایت سبک نظر آ رہی تھیں۔ مجھے یاد ہے میں نے دیکھا کہ کوئی چیز جھیل کلنگ کی طرف متحرک تھی۔ ایک ہی منٹ میں میں جھیل کے کنارے پہنچ گیا —— لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا سوائے لہروں کے جو کنارے سے ٹکرا رہی تھیں + سفید بادل کے ٹکڑے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ باہم ملتے اور مِل کر ایک بن جاتے۔ بادل کا کوئی شریر ٹکڑا چاند کے چہرے پر ہلکی سی نقاب ڈال دیتا اور مُسکراتا ہوا اُڑ جاتا۔ ستاروں کی آنکھوں میں خاموش قہقہے چمک رہے تھے۔ ہوا کی موجیں اِس قدر فرحت ناک و عطر بیز اور منظر اتنا خاموش و پُرسکون تھا کہ میں بے اختیار ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ مشکل سے پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے اپنی نگاہوں کو جھیل کی تابناک سطح پر مرکوز اور اپنے آپ کو ایک مدہوشانہ خواب میں ڈوبتے ہوئے پایا۔ میں نے ایک شکل دیکھی —— اُسی دوشیزہ کی شکل جسے پندرہ دن پہلے دیکھ چکا تھا اُس کی آنکھیں سایہ میں چمک رہی تھیں، اُس کا چہرہ چاند کی طرح درخشاں تھا —— وُہ اُسی تبسم زیرِ لب انداز سے میری طرف آ رہی تھی —— میں اُٹھا، اُسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں محبوس کر لینے کے لئے —— لیکن گرفت میں کچھ بھی نہ آیا، وہ غائب ہو چکی تھی! —— صرف جھیل میں چاند کے ضُوفشاں عکس کے گرد چھوٹی چھوٹی موجیں رقص کر رہی تھیں —— آہ میں نے غلطی سے چاند کو "اُس" کا چہرہ —— لہروں کو اُس کا تبسم اور موجِ صبا کو اُس کا لطیف و نازک تنفّس سمجھ لیا تھا؟ —— آہ غلطی سے!

(۴)

"دریا کے نزدیک سے وہ اپنی کشتی کھیتا ہوا گزرے گا —— ہنستا ہوا الفریڈ! غرق اپنے خیالاتِ سفر میں —— سر بگریباں —— غمزدہ و زرد رو بے کسوں کی طرح! —— مجروحِ افکار —— ہوش باختہ —— ناکامِ محبت!" (گرے)

ڈاکٹر کی صُورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دلچسپی محسوس کر رہا ہے۔ اُس نے دوا کی تازہ خوراک مریض کو دی۔ مصوّر کچھ دیر کھانسا —— پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تکیہ پر اپنا سر رکھ کر بے اختیار لیٹ گیا۔ ڈاکٹر نے پوچھا —— "لیکن تم اس تپِ لرزہ کا شکار کیسے ہوئے تھے" مصوّر نے چونک کر اپنی آنکھیں اُٹھائیں اور بولا —— "اس واقعہ کا جو کچھ اثر مجھ پر پڑا اُس کا اندازہ تم خود کر سکتے ہو۔ دراصل کے کاموں میں جو کچھ دلچسپی میرے لئے باقی تھی وہ بھی ضائع ہو گئی۔ دو مہینے گزر گئے اور میں بدستور اپنے خیالات میں غرق رہا۔ لوگ کہتے تھے مصوّر دیوانہ ہو گیا ہے —— ہاں وہ یہی کہتے تھے —— لیکن وہ دیوانگی کی قیمت سے ناآشنا تھے —— آہ کس قدر سکون و مسرّت ہے دیوانگی میں! —— دیوانگی ایک دوسرا نام ہے جمالیاتی نشاط کا —— دوسرا لفظ ہے فطری مسرّت کے لئے —— ایک تفسیر ہے دِل کے اُبلتے ہوئے طوفان پرور جذبات کی!

ایک شام میں غیر متوقع طور پر اور پوشیدہ طریقے سے اپنے مکان سے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں ایک اُونچے ٹیلے پر پہنچ گیا جس کے نیچے میری

نگاہوں کے سامنے حسین منظر پھیلا ہوا تھا۔ موسم صاف نہیں تھا۔ سفید و سیاہ بادل آسمان پر جمع ہو رہے تھے۔ میری نگاہ ایک ایسے سفید بادل پر جمی ہوئی تھی جس کے کناروں پر بادامی رنگ کی گوٹ سی لگی ہوئی تھی۔ یہ بادل پھیل رہا تھا ___ یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے تمام منظر گھوم رہا ہے۔ روشنی تاریکی میں محیط ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک دوسری دُنیا میں منتقل کر دیا گیا ہوں اور میرے پاؤں کے نیچے پتھریلی زمین ہے۔ مجھے سامنے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں نظر آ رہی تھیں اور سرد ہوا محسوس ہو رہی تھی۔ میں سخت زمین پر چلا جا رہا تھا کہ یکایک دا ہنے ہاتھ کو مڑا تو دیکھا کہ دہی دوشیزہ ایک بڑے پتھر پر بیٹھی ہوئی ہے ___ وہ رو رہی تھی۔ میں اُس کے پاس پہنچ گیا لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ میں اُس کے نزدیک بیٹھ گیا اور اس کے نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر رونے کی وجہ دریافت کی ___ اُس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا ___ صرف ایک بڑا سا آنسو اُس کی آنکھوں میں ظاہر ہوا جو کچھ دیر اُس کی پلکوں پر کانپ کر میرے ہاتھ کی پُشت پر گر پڑا ___ اُف، اس ایک قطرے کا التہاب! ___ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا + بارش کے بڑے بڑے قطرے گر رہے تھے، لوگ پناہ لینے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ ٹیلے سے نیچے اُترا اور اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ بعد کے واقعات کا مجھے ہوش نہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کہ میں پوری طرح بارش میں بھیگ گیا تھا اور راستے میں بیہوش ہو کر گر پڑا تھا ___ اور یہ کہ میرے تپ لرزہ کا بھی یہی سبب ہے۔"

ڈاکٹر نے پوچھا "تو تم اُس سے محبت کرتے تھے دیوانہ وار؟"

"نہیں مجھے اُس سے محبت نہیں تھی۔ مجھے اُس کے "حُسن" سے محبت تھی اُس کی "ذات" سے نہیں! لوگ خوبصورت تصویر سے محبت کرتے ہیں، نہ کہ کاغذ سے! ___ یاد رکھئے مصوّر حُسن کا عاشق ہے ___ صرف حُسن کا! خواہ وہ حُسن پہاڑی وادیوں اور سنگین چٹانوں میں ہو یا موسلادھار بارش اور بادل کی سماعت خراش و ہیبت ناک گرج میں ___ خواہ اُس آہستہ آہستہ بہنے والے دریا میں ہو جس کو ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں نے پگھلے ہوئے سونے میں تبدیل کر دیا ہے ___ یا کسی زندہ مخلوق کی معصومیت میں! ___ مصوّر حُسن کے لئے جیتا ہے اور حُسن کے لئے مرتا ہے۔ مجھے اُس کی فانی اور انسانی ذات سے محبت نہ تھی بلکہ اُس "جمالِ لانہایت" کی طلب تھی جو اُس کے گوشت پوست پر محیط تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس "جمال" کو چراؤں اور لافانی تصاویر میں محفوظ رکھ چھوڑوں"

"دوا کی اس خوراک نے شاید اثر کیا ہے کچھ" ڈاکٹر نے کہا اور تھرمامیٹر لگانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

مصوّر کا چہرہ جنوں انگیز مسرت سے سُرخ و درخشاں ہو گیا، اُس کا "انجام" قریب آ رہا تھا۔ اُس کی تقریر میں ایک قسم کی دیوانگی اور بے پناہ مسرت جھلک رہی تھی۔ وہ بولا "تم میری نبض کی جنبشوں کو شمار کر سکتے ہو لیکن قفسِ عنصری میں رُوح کی بیتابیوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اپنے تھرمامیٹر سے تم میرے درجۂ حرارت کا علم حاصل کر سکتے ہو لیکن محبت کی شدت سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ تم ایک جسم کو جو اسباب مرئی سے تکلیف میں مبتلا ہے اچھا کر سکتے ہو مگر رُوح کی بیماری کو دُور کر دینا تمہارے بس کی بات نہیں ___ آہ بیماریٔ رُوح! ___ یہ تکلیف کے بجائے راحت پہنچاتی ہے۔ دماغ کو کمزور کرنے کے بجائے روشن کرتی ہے ___ ہاں رُوح کی بیماری کو دُور کر دینا تمہارے بس کی . . . . . . "

یکایک مصوّر چُپ ہو گیا ___ اُس کی رُوح پرواز کر چکی تھی۔

عاصی عثمانی

جبریل و ابلیس

(حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظم "جبریل و ابلیس" ایک مختصر ڈرامے کی صورت میں)

کردار

جبریل ــــــــ **ابلیس** ــــــــ **اقبال**

مقام ــــــــــــ ہمالہ

زمانہ ۔ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو (چودھویں صدی میں علامہ نغمہ سرا ہیں)

(**پس منظر**:۔ ایک پُر فضا جنگل ہے۔ سبزہ زار، گُل بُوٹے اور تناور درختوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ پہاڑی ڈھلانوں پر کھڑے ہیں۔ پہاڑی نالے کا پانی شور مچاتا ہوا آبشار کی صورت میں گر رہا ہے۔ شام کی تاریکی بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ رنگِ شفق کوہسار پر کانپتا پھرتا ہے۔ خوش گلو پرندوں کی عبادت اثر راگنیوں کے درمیان اقبال، سوزِ درونِ کائنات، رزمِ خیر و شر اور قصۂ آدم کی رنگینی جیسے مسائل کی گہرائیوں میں کھوئے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ یکایک دُور سے ایک سامعہ نواز آواز توحید کا نغمہ گاتی قریب آتی ہوئی سنائی دیتی ہے)

اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو

[ابلیس (فرشتوں کا کبھی اُستاد تھا۔ اب راندۂ درگاہِ کبریائی) اُدھر آ نکلتا ہے۔ "اللہ ھُو" کی آواز سن کر ٹھٹکتا ہے اور پھر گویا حیرت سے کہتا ہے] آہ جبریل!

(اللہ ھُو کی آواز قریب آ جاتی ہے۔ حضرت جبریل نمودار ہوتے ہیں۔ ابلیس کو پہچان کر اُس کی طرف بڑھتے ہیں۔ صاحب سلامت کے بعد دونوں سبزۂ نوخاستہ کے فرشِ زمردیں پر آبشار کے پاس ہو بیٹھتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ گوشِ تخیل سے سنتے ہیں:۔)

جبریل ــــــــ ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بُو؟

ابلیس۔ ــــــــ سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

جبریل۔ ــــــــ ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو

ابلیس۔ ــــــــ آہ! اے جبریل! تُو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبُو

اب وہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے وہ عالمِ بےکاخ وکُو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درُونِ کائنات
اُس کے حق میں تقنطوُا اچھا ہے یا لا تقنطوُا؟

جبریل — کھو دیئے انکار سے تُو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو؟

ابلیس — ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پُو
دیکھتا ہے تُو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طُوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ مَیں کہ تُو؟
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طُوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جُو بجُو
گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پُوچھ اللہ سے
قصّۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہُو؟
مَیں کھٹکتا ہُوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تُو فقط اللہُ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو

شفق غائب ہو جاتی ہے، تاریکی اپنے دامن میں دُنیا کو چُھپا لیتی ہے۔ فرشتے جا چکے ہیں۔ ہمارا شاعرِ اعظم زیرِلب کچھ گنگناتا ہُوا اُٹھتا ہے، اور بادلِ ناخواستہ قیامگاہ کا رُخ کرتا ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

معذرت:۔ حضرت علامہ کی نظم کے محض ایک شعر میں معمولی سا تصرّف اس لئے کرنا پڑا کہ ڈرامے کے اسٹیج کو آسمان سے زمین پر لانا اس کے سوا ممکن نہ تھا۔ ہم صدقِ دل سے اس گُستاخی کے لئے اُن کی رُوح سے عذرخواہ ہیں۔

"اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں — کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بےکاخ وکُو"

میں یہاں کی بجائے وہاں اور یہ کی بجائے وہ کرنا پڑا۔"

نند کشور جھنگن ایم۔ اے

اُس جگہ جہاں شب و روز ماندہ خلیج میں سُست پانی رہتا ہے
میں نے بیکاری کے شغل کے طور پر سنہری ریت کا ایک ڈھیر جمع کیا
جُونہی میری نظر اُس پر پڑی ایک شاداب قطعۂ زمین پر ایک شہر کا
نہایت ہی روشن اور دلکش تصوّر میرے پیشِ نگاہ تھا۔

مجھے سوائے نفیس برجوں، گنبدوں اور میناروں کے جو
ہزاروں گھنٹیوں کی آواز سے گونج رہے تھے کچھ بھی
دکھائی نہ دیا۔ ان کے کلس فضائے نیلگوں میں سفید نظر آرہے تھے
اپنی خواہشات سے بیقرار ہزاروں انسان شعلہ کی طرح متحرّک ...
اِدھر اُدھر چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

اس سے قبل کہ میں کچھ سوچوں میں نے بے پروائی سے اس چھوٹے سے ڈھیر کو برابر کر دیا۔
اور ساتھ ہی عالمِ تصوّر کا وہ شہر بھی غائب ہو گیا۔
وہ تباہ ہو کر میرے پاؤں میں پڑا تھا۔
او خدا تُونے کتنی بستیاں دیکھیں جو
خاموش پہاڑ اور ماندہ خلیج کے کنارے آباد ہوئیں اور ویران ہوئیں۔

(ترجمہ) وامق

دُنیائے ادب

سنسکرت

سچّی دوستی:۔ جھوٹے دوست بہت ہیں
لیکن جب فطرت دو سعید روحوں کو دوستی کے مقدس رشتہ میں منسلک کردے
تو اس سے بیش قرار نعمت اور کیا ہو سکتی ہے؟

مصیبت کے وقت:۔ بیوی، ماں، بیٹے اور بھائی کے بجائے سچے دوست پر بھروسا کر!
زمانہ حقیقی دوستی کی مسرتوں کے جامِ شیریں کو مکدر نہیں کر سکتا۔
کوئی بدباطن اس خزانہ کو چرانے پر قادر نہیں صرف موت ہی اس رشتہ کو توڑ سکتی ہے۔

(پنچ تنتر)

جھوٹا اور بیوقوف آدمی:۔ دانا اور پاکباز آدمی کی دوستی ایک نعمت ہے۔
اسے حاصل کر!
جھوٹے اور دانا آدمی سے بڑی احتیاط کے ساتھ پیش آ!!
ایک بیوقوف اور سچا آدمی تیرے رحم کا مستحق ہے
لیکن ایک بیوقوف اور جھوٹے آدمی کے سایہ سے بھی بچنا لازم ہے!!!

افلاس:۔ ایک گداگر قبرستان میں گیا اور کہنے لگا
"مرنے والو! میری زندگی لے لو اور کم از کم ایک لمحہ کے لئے میرے سینہ سے افلاس کا بوجھ ہٹا دو

میں اب گھبرا گیا ہوں اور مجھے سکون کی تلاش ہے
تم اگرچہ مردہ ہو لیکن مجھ سے اچھے ہو"
مرنے والوں نے کچھ جواب نہ دیا
وہ جانتے تھے کہ موت افلاس سے بہتر ہے!

جاپانی

ایک سوال :- تم تنہا خزاں کے پہاڑ کو کیسے عبور کر سکو گی؛
وہ تو اس وقت بھی بڑا دشوار گزار تھا
جب ہم دونوں اکٹھے وہاں گئے تھے

(می نیا شو)

میری محبت :- میری محبت اُس گھاس کی طرح ہے جو پہاڑ کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے
اگرچہ یہ روز بروز بڑھ رہی ہے لیکن کسی کو اس کا علم نہیں

(کاکن شو)

گلِ لازوال :- دُنیا میں صرف انسان کا دل ہی ایک ایسا پھول ہے
جو کبھی نہیں مرجھائے گا

(کاکن شو)

وہ صبح :- میں جانتا ہوں کہ دن بہت جلد ختم ہو جائے گا
اور رات واپس آجائے گی
اس کے باوجود مجھے اُس صبح سے کتنی نفرت ہے جو
مجھے یہاں سے چلے جانے کا حکم دے گی

(ہیاکونن شو)

دو نظمیں :- اے تیزی سے گرنے والی شبنم!

کیا میں اس ذلیل زندگی کو تجھ سے دھو سکتا ہوں ؟

(باشو)

اے جھینگر !

تیری مسرور آواز سے

کسی کو شک بھی نہیں گزر سکتا کہ تو بہت جلد مر جائے گا

(باشو)

چلینی

عورت :- ایک ہشیار آدمی شہر آباد کرتا ہے

اور ایک ہشیار عورت اسے تباہ کرتی ہے

اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ہشیار عورت ایک منحوس پرندہ ہے !

زبان دراز عورت ایک ایسی سیڑھی ہے جو تباہی کی طرف لے جاتی ہے ۔

کیونکہ مصیبت آسمان سے نہیں آتی

اس کا باعث تو عورتیں ہیں !

خواجہ سراؤں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت قطعاً ناممکن ہے ۔

(شی کنگ)

حمید نظامی

مشو نالاں ز غم از تاریکیٔ شب ہا کہ می آید

کہ چوں انجم ز خون خویشتن داغ جہاں تابے کہ من دارم

(اقبال)

غزلیات

(۱)

آہ - مجبور زندگی میری — جو تمہاری - وُہی خوشی میری
کٹ گئی کیسی آنکھوں آنکھوں میں — اِک تماشا تھی زندگی میری
جو کبھی بار بار آتی تھی — وہ رُلاتی ہے اب ہنسی میری
اپنے ہاتھوں سے جو کیا مَیں نے — وُہی تقدیر بن گئی میری
چشم مخمور اور شرم آلود — دیدنی ہے یہ بےخودی میری
اب جھجکنے لگے وہ غیروں سے — اب تو کچھ کٹ گئی ذرا دبی میری

شاعر اِس کو خیال کہتے ہیں
خواب تھی خواب زندگی میری

آغا شاعر قزلباش دہلوی

(۲)

دے دے کو وہ بل روز نیا زُلفِ دوتا کو — کرتے ہیں اسیر اَور اسیرانِ بلا کو
دیکھو نہ کہیں مجھ کو نگاہوں سے گرانا — دیتے تو ہو آنکھوں میں جگہ شرم و حیا کو
ٹھہرے دلِ مضطر تو کریں وصل کی تدبیر — سینے سے جُدا ہوں تو اُٹھیں ہاتھ دُعا کو
منظور مِٹانا ہی مجھے ہے تو مٹاؤ — پہلے مری ہستی سے مرے نقشِ وفا کو
نازک ہے بہت حالتِ بیمارِ محبت — اب دخل ہے اس وقت دوا کو نہ دُعا کو

صدق جائسی

(۳)

جذبۂ دل کا اثر شاداں دکھائے گا تمہیں — مر گئے پر بھی وہ یاد اے دوست آئیگا تمہیں
پہلے جب تم رُوٹھتے تھے تو منا لیتا تھا وہ — اب جو رُوٹھو گے تو کون آکر منائے گا تمہیں
دین و دل، ایمان و جان و آبرو اُس کی طرح — اے ستمگر! کون سب کچھ کھو کے پائے گا تمہیں

عبدالراشد چشتی شاداں بی اے (مرحوم)

(۴)

حُسن اور پھر شباب کیا کہنا   اب بھلا اے جناب کیا کہنا
قطع کردی زبانِ شکوہ سرا   میرے حاضر جواب کیا کہنا
ساری دُنیا میں کردیا بدنام   آرزوئے خطاب کیا کہنا
خاک میں مِل گئے تپشؔ آخر
عاشقِ بُوتراب کیا کہنا

عبداللطیف تپش

(۵)

کہنے کو گُلوں کی وادی سے سَو حُسن کے دریا بہتے ہیں   لیکن ہیں یہ جلوے دو دن کے جو بزمِ چمن میں رہتے ہیں
مژگاں کے تصوّر سے کیا کیا۔ دیتی ہے لہُو رگ رگ دل کی   اللہ یہ کیسے نشتر ہیں جو خُون میں ڈُوبے رہتے ہیں
کیا پچھلے پہر کا عالم ہے اِک حُسن کا چشمہ پھُوٹا ہے   جو تارے اس میں رقصاں تھے وہ دھیمے دھیمے بہتے ہیں
گوہر کی چمک ہے شبنم میں، عنبر کی مہک ہے پھُولوں میں   دیکھو تو یہ جلوے کِس کے ہیں ہر شئے میں جو پنہاں رہتے ہیں
جانے سے ترے کیا کیف مِٹا کیا ہوش ہوا میخواروں کو   بیخود جو ہمیشہ رہتے تھے بیہوش وہ اب بھی رہتے ہیں
جو رنگ تھا دِل کے زخموں کا، محمودؔ وہی رنگینی ہے
ناسُور جو پہلے بہتے تھے ویسے ہی اب بھی بہتے ہیں

محمود علی خاں

(۶)

عشق کا سوز کیا ہوا، عشق کا ساز کیا ہوا   تُو ہی بتا کہ اے جگر تیرا گداز کیا ہوا
آہ نہ بن فغاں نہ بن آگ نہ بن، دھوُاں نہ بن   سینے سے جو نکل گیا راز وہ راز کیا ہوا
کعبۂ عشق چھوڑ کر پھرتا ہے تُو جو دربدر   تیری جبینِ شوق کا ذوقِ نماز کیا ہوا
طبعِ بلندِ عرشؔ اب فرش نشیں ہے کِس لئے
پستیوں میں نہاں تھا جو اب وہ فراز کیا ہوا

عرش ملسیانی بی۔اے

موٹا مسٹنڈا داماد

نلینی علی پور کا پوسٹ ماسٹر تھا۔

سہ پہر کا وقت نزدیک ہو رہا تھا۔ نلینی دفتر میں بیٹھا ہوا بے چین ہو رہا تھا۔ یہ آسن کا مہینہ تھا اور پوجا کے دن قریب تھے۔ اس نے چھٹی کی درخواست دی تھی مگر ہیڈ آفس سے اب تک کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

اگر پانچ بجے تک بھی اسے چھٹی مل جاتی تو وہ آج کے میل سے الہ آباد روانہ ہو جاتا جہاں اس کے خسر رہتے تھے اور جہاں وہ شادی کے بعد پہلی بار جا رہا تھا۔ چیزوں کی خریداری وغیرہ ختم ہو چکی تھی اور وہ انہیں اپنے بکس میں رکھ چکا تھا۔ ہر طرح کی تیاری ہو چکی تھی۔ صرف چھٹی ملنے کا انتظار تھا۔ لیکن اب تک چھٹی کا حکم نہیں آیا تھا۔

۴ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ——— ٹنگ، ٹنگ، ٹنگ۔ نلینی نے اشتیاق کے ساتھ ریسیور ہاتھ میں لیا۔

'ہلو'؛

نہیں یہ چھٹی کی اطلاع نہیں تھی۔ ایک منی آرڈر کے بارے میں کچھ گڑبڑی ہو گئی تھی اسی کے متعلق کچھ سوال تھا۔ مایوس نلینی واپس آیا اور اس نے اپنے آپ کو اپنی کرسی پر ڈال دیا۔ پھر فوراً ہی اس نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔ یہ اس کی بیوی کا تھا۔ وہ اسے پہلے کئی بار پڑھ چکا تھا اس کے باوجود اس نے ایک بار پھر پڑھا۔

جان سے پیارے!

آپ کے محبت نامہ نے میرے دل کو تسلی دی۔ شکر ہے آخر کار طویل جدائی کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ میرا دل آپ کے چاند جیسے مکھڑے کو دیکھنے کے لئے ترس رہا ہے۔ ہم لوگوں کی شادی کو دو سال گزر گئے۔ لیکن ایک دن کے لئے بھی اپنے شوہر کی خدمت کا موقع نہ ملا۔ فرصت ملتے ہی فوراً یہاں چلے آیئے۔ آپ کی فرقت زدہ بیوی اُمید کے سہارے جی رہی ہے۔ مجدی آج دیناج پور سے آئی۔ آپ کو چھٹی حاصل کرنے میں کتنے دن لگیں گے؟ کیا آپ پنچمی کے دن روانہ ہو سکیں گے؛ اب میں رخصت ہوتی ہوں۔ مجھے یاد رکھیئے ——— بھول نہ جایئے۔

صرف آپ کی

'سروجنی'

نلینی نے خط پڑھ کر پھر اسے جیب میں رکھ لیا۔

پانچ بجنے میں ایک یا دو منٹ رہ گئے تھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔
میں نے اپنا منہ ریسیور کے منہ میں ڈال دیا۔
"ہاں؟"

(۲)

رخصت! رخصت! رخصت! نلینی نے دو ہفتے کی رخصت حاصل کر لی تھی!
وہ الہ آباد جانے کے لئے بیتاب تھا۔ اسے دیناج پور والی مجدی سے بھی ملاقات کرنی تھی۔
شادی کے وقت نلینی کا بدن گول، نرم اور نازک تھا۔ اس کے گال پھولے ہوئے تھے اور اُس کے دونوں ہاتھ مکھن کی طرح نرم تھے۔ کنجا بالا (مجدی) برابر اس کی ہنسی اُڑایا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ دولہا بھائی کا نام نلینی یعنی سوسن ہے اور وہ سوسن کی طرح نازک ہیں۔
مذاق اور تمسخر کے ایک ہی لفظ میں نصیحت کے دس لفظوں سے بھی زیادہ اثر ہوتا ہے اور جب یہ لفظ ایک حسین عورت کی زبان سے ادا ہو اور وہ عورت بھی اور کوئی نہیں آپ کی سالی ہو تو پھر یہ سو گُن زیادہ قاتل ہو جاتا ہے۔
شادی کے بعد نلینی کلکتہ چلا آیا تھا اور اس کے سسر مع اہل و عیال کے الہ آباد چلے گئے تھے، جہاں وہ برسرِ روزگار تھے۔ بہرحال نلینی اپنی شریر سالی کی پھبتی اپنے دماغ سے بھلا نہ سکا۔
ایک دن پوسٹ آفس سے واپس آ کر وہ آرام کرسی پر دراز ہو کر سگرٹ پی رہا تھا کہ معاً اس کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اگر کوشش کرے تو اپنے عیب کو ضرور دُور کر سکتا ہے، اور اپنا بدن ایک تندرست مرد جیسا مضبوط اور قوی بنا سکتا ہے۔ وہ دوسرے ہی دن بازار گیا اور ایک جوڑا سینڈو ڈمبل خرید کر لے آیا اور پابندی سے روزانہ ورزش کرنے لگا۔ اس نے اپنی خوراک میں چینی دودھ، گھی اور چاول موقوف کر کے روٹی، انڈا، اور گوشت رکھا۔ ایک سال کی مشق میں اس کا جسم بہت مضبوط ہو گیا۔ اپنی مردانہ صورت میں اضافہ کرنے کے لئے اس نے داڑھی منڈوانا ترک کر دیا۔ وہ اپنے چند شکاری دوستوں کے ہمراہ دیہاتوں میں جا کر سُؤر اور بطاکا شکار بھی کھیلنے لگا۔
دو سال گزر چکے تھے اور اب وہ پہلا سا نلینی نہ تھا۔ اس کی پیشانی پر چربی کا نام و نشان نہ تھا۔ اس کی ٹھوڑی نکل گئی تھی اس کے ہاتھ پیر کی ہڈیاں خوب مضبوط ہو گئی تھیں۔ وہ سچ مچ اب نام کے بالکل برعکس تھا۔
اب وہ کنجا بالا سے مل سکتا تھا۔ صرف نام بدلنے کی ضرورت تھی۔

(۳)

دوسرے دن دو بجے سہ پہر کے وقت نلینی الٰہ آباد اسٹیشن پر اُترا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی دھوتی اور لانبا پنجابی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا لئے ہوئے تھا۔ اس کے دوسرے اسباب کے ساتھ بندوق کا ایک بکس بھی تھا کیونکہ چھٹی کے دوران میں اسے شکار کھیلنے کا خیال تھا۔

گاڑی سے اُتر کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کی پیشوائی کے لئے اسٹیشن پر کوئی نہیں آیا تھا۔ ایک دن پہلے اس نے ایک چار آنے والا تار اپنے سسر کے نام لگا دیا تھا۔ شاید یہ نہیں پہنچا۔

اس نے قلی کو آواز دی اور اپنا سامان لے کر اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ ایک گاڑی بان نے دریافت کیا "کیا تم مہندر بابو پلیڈر کا مکان جانتے ہو؟"

"ہاں، بابو آیئے"

نلینی سوار ہو گیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد گاڑی ایک مکان کے سامنے جس کا احاطہ وسیع تھا، رُکی۔ باہر والے کمروں کے برآمدے میں نو یا دس برس کی ایک لڑکی کھیل رہی تھی۔ قریب ہی ایک کنواں تھا جہاں ایک نوکر کرڈھائی مانجھ رہا تھا۔

گاڑی سے اُتر کر نلینی نے نوکر سے دریافت کیا "کیا مہندر بابو پلیڈر کا مکان یہی ہے؟"

"ہاں بابو"

"کیا وہ گھر میں موجود ہیں؟"

"نہیں وہ کدار بابو پلیڈر کے یہاں شطرنج کھیلنے گئے ہیں۔"

"اچھا جاؤ گھر میں جا کر کہو کہ ان کے داماد آئے ہیں۔"

یہ سنتے ہی لڑکی جو برآمدہ میں کھیل رہی تھی دوڑتی ہوئی اور اپنی آواز سے آسمان سر پر اُٹھاتی ہوئی اندر جا کر خبر کر آئی کہ دولھا بھائی ہیں۔

نوکر نے جس کا نام رام سرن تھا مسکراتے ہوئے کہا "کیا یہی دولھا میاں ہیں؟" پھر اس نے جلدی سے ہاتھ دھویا اور نلینی بابو کو جھک کر سلام کیا۔

پھر اس نے گاڑی سے سامان اُتارا۔ اتنے میں مختلف شکل و صورت اور مختلف قد و قامت کی لڑکیاں اور لڑکے 'داماد' کو دیکھنے کے لئے گھر سے باہر نکل آئے۔

رام سرن نلینی کو نشستگاہ میں لے گیا۔

ایک لڑکی آئی اور اس نے نلینی کو یہ کہتے ہوئے ایک گلاس پیش کیا "دولھا بھائی شربت پیجئے"
نلینی نے اسے چکھا تو دیکھا نمک ڈالا ہوا پانی تھا۔ اس نے گلاس زمین پر رکھ دیا۔ ایک پُرلطف مذاق!
کمرے کے ایک گوشے میں دروازہ کھلا، رام سرن نے پردہ ایک طرف کر دیا اور بولا "بابو، آیئے ناشتہ تیار ہے"۔
نلینی نے دیکھا، زنانخانہ کا ایک کمرہ تھا۔ وہ اس میں داخل ہوا۔ کمرے کے بیچ میں زمین پر ایک قالین بچھا ہوا تھا۔ اس پر چاندی کی رکابیوں، پیالوں اور گلاس میں انواع و اقسام کے کھانے اور پینے کی چیزیں چُنی ہوئی تھیں۔ نلینی چپ چاپ بیٹھ گیا اور اپنے سامنے کی چیزوں کو دیکھنے لگا۔
فوراً ہی دوسرے کمرے سے پازیب کی جھنکار کی آواز آئی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی دروازہ تک آئی اور کہہ گئی "مجدی آ رہی ہیں"۔
نلینی سمجھ گیا کہ کنچا بالا آ رہی ہے۔ اس نے داہنے بازو کی آستیں چڑھالی۔ کنچا بالا کو دیکھنا چاہئے کہ اب نلینی بابو کے بازو گول اور بھدے نہیں ہیں۔
پازیب کے جھنکار کی آواز قریب تر ہوئی۔
"اتنے زمانے کے بعد آپ نے ہم لوگوں کو یاد کیا!" —— یہ کہتے ہوئے ایک نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی مگر صرف ایک لمحہ کے لئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ہی تھا کہ وہ اپنی ساری سے ایک ہاتھ کا گھونگٹ بنا کر بے تحاشا کمرے سے بھاگی۔ نلینی نے دیکھ لیا، یہ کنچا بالا نہ تھی۔
بغل والے کمرے سے دو یا تین عورتوں کی گھبرائی ہوئی آواز نلینی کے کان میں آئی۔
"یہ کیا؛ تو بھاگ کیوں آئی؟"
"ارے ہم لوگوں کو بچاؤ! یہ اجنبی ہے"۔
"کیا کہہ رہی ہو تم —— اجنبی؟"
"کیا ہمارا سرت نہیں ہے؟"
"نہیں۔ یہ سرت کیوں ہونے لگا؟"
"تو یہ کون ہے؟"
"مَیں جانتی ہوں؟"
"آخر یہ ہے کون؛ کیا کوئی ٹھگ ہے؟"
"اُس کا بدن، اُس کے ہاتھ دیکھ کر تو اس کے ٹھگ ہونے میں تعجب نہیں معلوم ہوتا"۔

ایک لڑکے کی آواز سُنائی دی "وہ اپنے ساتھ ایک بندوق لایا ہے"۔

"کیا! ہم لوگ لُٹ گئے! رام سرن! رام سرن! تو کہاں چلا گیا ہے؟ دوڑ بابو کو جا کر خبر کر"

جلد جلد بھاگنے والے قدموں کی آہٹ اور پھر خموشی۔

اس درمیان میں نلینی کی نظر کتابوں کی الماری پر پڑی جو زیادہ فاصلہ پر تھی۔

'قانونی رپورٹ' کی جلدیں سجی ہوئی تھیں اور ان پر ایم۔ این۔ گھوش سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

فوراً سارا معاملہ روزِ روشن کی طرح نلینی کی سمجھ میں آگیا۔ اس کے خسر کا نام مہندر ناتھ 'بنرجی' تھا اور یہ صاحب مہندر ناتھ گھوش تھے۔ وہ غلطی سے کسی دوسرے شخص کے سُسر کے گھر میں گھُس پڑا تھا۔

نلینی دل ہی دل میں مُسکرایا اور چُپ چاپ کھانے سے فارغ ہوا۔

(۴)

رام سرن اپنے مالک کو واقعہ کی اطلاع دینے کے لئے بے تحاشا دوڑا۔ آج چھٹی کا دن تھا اور کدار بابو کے گھر میں بہت سے کھلاڑی جمع تھے۔ بڑے مہندر بابو اور چھوٹے مہندر بابو (نلینی کے سُسر) اور دُوسرے وکیل بھی موجود تھے۔

کھیل پُورے شباب پر تھا کہ رام سرن آنازل ہوا۔

اپنے مالک کو دیکھتے ہی وہ چلایا "بابو! بابو! فوراً گھر چلئے"۔

اس کا چہرہ خوفزدہ اور گھبرایا ہوا سا تھا۔ مہندر بابو نے دریافت کیا "کیا بات ہے، کیا کسی کی طبیعت خراب ہوگئی ہے؟"

"ایک ... چور .... گھر .... میں ... گھُس ... گیا ... ہے!"

سب لوگ حیرت سے متوجہ ہو گئے۔

مہندر گھوش بابو نے کہا "چور! دن کے وقت چور!"

"پرماتما جانے چور ہے ... یا ٹھگ ..... یا پاگل! وہ کہتا ہے 'مَیں بابُو کا داماد ہوں'"

اس پر ایک طویل قہقہہ ہوا جس میں ہر کسی نے حصّہ لیا۔ لیکن مہندر گھوش بابو بولے "وہ کب آیا؟ کیا کر رہا ہے؟"

"وہ تقریباً تین بجے آیا۔ ایک موٹا سا ڈنڈا اور ایک بندوق ساتھ لایا ہے۔ وہ اندر والے کمرے میں گھُس گیا اور وہاں ناشتہ صاف کر گیا۔ عورتیں بہت ڈر گئی ہیں"۔

"وہ بندوق اور لاٹھی لایا ہے؟ بدمعاش! گھر کس کی حفاظت میں چھوڑ آئے ہو؟" —— اور مہندر بابو دیوانہ وار باہر نکل کر لپکے۔

گھر پہنچ کر مہندر بابو نے چلا کر کہا "کہاں ہے وہ؟"

نلینی مالک مکان کو سلام کرتے ہوئے کمرے سے برآمدے میں نکل آیا اور بولا "کیا آپ مہندر بابو ہیں؛ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں"

مہندر بابو نے جو ذرا گھبرائے ہوئے تھے دریافت کیا "تم کون ہو؟"

"میرا نام نلینی کانتا مکرجی ہے - میں بابو مہندر بنرجی کا داماد ہوں - میں نے گاڑیبان سے کہا کہ مہندر بابو پلیڈر کے مکان تک پہنچا دو" وہ مجھے یہاں لے آیا! ابھی تھوڑی دیر ہوئی میں نے اپنی غلطی کو محسوس کیا - میں چلا گیا ہوتا - لیکن ایک آدمی آپ کے پاس بھیجا جا چکا تھا - میں جانے سے پہلے آپ سے معذرت طلب کرنے کے لئے ٹھہر گیا۔"

مہندر بابو کا غصّہ کافور ہو گیا - انہوں نے نلینی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بہت دیر تک قہقہہ لگاتے رہے - پھر انہوں نے کہا "مہندر بابو نام کے دو سرکاری وکیل ہونے کی وجہ سے مؤکلوں کے معاملہ میں بھی اکثر غلطی ہو جاتی ہے لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ داماد کے بارے میں غلط فہمی ہو گئی۔"

پھر اُنہوں نے نلینی کے لئے کرایہ کی گاڑی منگوائی اور وہ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی میں سوار ہو کر اپنے خاص سُسر کے یہاں جانے کے لئے رخصت ہوا۔

(۵)

اس دن سہ پہر کو کدار بابو کے مکان میں مہندر گھوش بابو کے چلے آنے کے بعد کھیل میں دلچسپی باقی نہ رہی - جتنے لوگ وہاں موجود تھے، سب نے یکے بعد دیگرے ٹھگوں کی تعجب خیز کہانیاں سُنائیں اور پھر آہستہ آہستہ مجلس برخواست ہوئی۔

بابو مہندر ناتھ بنرجی محلہ شاہ گنج میں رہتے تھے - گھر واپس آکر اُنہوں نے چائے اور اپنا حقہ منگوایا - نشستگاہ میں آرام کرسی پر لیٹ کر انہوں نے چائے ختم کی - ان کے نوکر نے حقہ پر بڑی سی چلم رکھی اور آہستہ آہستہ پنکھے سے اسے ہوا دینے لگا کہ تو اگرم ہو جائے - چائے ختم کر کے مہندر بابو نے حقہ کا پیچ مُنہ میں ڈالا اور بڑے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں -

اتنے میں فوراً ہی کرایہ کی ایک گاڑی احاطہ میں داخل ہوئی لیکن یہ ایک سرکاری وکیل کا مکان تھا یہاں لوگ برابر آتے اور جاتے ہیں - اس لئے اُن کے سکون میں کچھ خلل نہ ہوا - صرف انہوں نے آنکھیں کھول دیں -

لیکن ایک غیر مانوس آواز اُن کے کان میں آئی "کیا یہ مہندر بابو کا مکان ہے؟"

"ہاں بابو!"

"گھر میں اطلاع دو، جا کر کہو کہ بابو کے داماد آئے ہیں۔"

"داماد" کا لفظ سُن کر مہندر بابو کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کھڑکی کا پردہ اُٹھا کر دیکھا ایک موٹا تازہ آدمی موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لئے کھڑا تھا اور گاڑیبان گاڑی سے بندوق کا بکس اُتار رہا تھا۔

مہندر بابو چلاّتے ہوئے برآمدے میں آئے: "کون ہے؟" ان کے چہرے کا رنگ دیکھ کر نلینی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے مہندر بابو نے چلاّ کر کہا "بدمعاش! ٹھگ! یہاں سے نکل جاؤ! فوراً نکل جاؤ! دوسری جگہوں کا چکر لگاتے ہوئے میرے مکان میں آئے ہو! کیا سسر کہنے کے لئے تمہیں اور کوئی نہیں ملا! دغاباز! ڈاکو!"

اب ملازم اور دربان پہنچ چکے تھے۔ مہندر بابو نے حکم دیا۔ "اُس کو گھر سے باہر نکال دو! اس کو دھکّے دے کر باہر نکال دو!"

نوکروں نے نلینی پر حملہ کرنا چاہا۔ یہ دیکھ کر وہ اپنی لاٹھی اپنے سر پر گھمانے لگا اور بولا "خبردار! میں جارہا ہوں، اگر کسی نے مجھے چھُوا تو میں اس کی ہڈیاں چُور چُور کردوں گا۔"

نلینی کا انداز اور اُس کی لاٹھی دیکھ کر نوکر چُپ چاپ مبہوت کھڑے تھے۔

اس نے مہندر بابو کو مخاطب کرکے کہا "آپ غلطی کر رہے ہیں، میں آپ کا داماد نلینی ہوں۔"

یہ سُن کر مہندر بابو آگ بگولا ہوگئے۔ "تم اپنے سسر کو پہچانتے ہو، ٹھیک ہے نا؛ لیکن میں اپنے داماد کو نہیں پہچانتا ہوں؛ کیا میرا داماد تمہارے جیسا ڈاکو ہے؛ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں پولیس کو خبر کردُوں گا۔"

نلینی زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر گاڑی میں سوار ہوگیا اور اس نے گاڑی والے کو حکم دیا "اسٹیشن چلو"

(۶)

حُقّہ ختم کرکے مہندر بابو اندر کے کمرے میں گئے۔

ان کی بیوی نے ان کو دیکھتے ہی کہا "کیا تم اپنی عقل کھو بیٹھے ہو؛ تم نے اپنے داماد کو نکال باہر کردیا؛"

مہندر بابو سنجیدگی سے بولے "تم کس کو اپنا داماد سمجھ رہی ہو؛ وہ بدمعاش تو ٹھگ تھا!"

"تم کیسے جانتے ہو کہ یہ ٹھگ تھا؛"

اب مہندر بابو نے وہ تمام باتیں بیان کیں جنہیں وہ کدار بابو کے مکان میں سُن چکے تھے۔ ان کی بیوی نے کہا "ہاں، لیکن کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ٹھگ تھا۔ دونوں آدمیوں کا نام ایک ہے۔ ممکن ہے وہ غلطی سے ان کے یہاں چلا گیا ہو اس میں تعجب کیا ہے؛"

اپنی بیوی کی یہ بات سُن کر مہندر بابو سُست ہوگئے۔ بندوق اور لاٹھی دیکھ کر وہ اپنی عقل کھو بیٹھے تھے۔ انہیں اطمینان سے غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

کچھ توقف کے بعد اُنہوں نے کہا "اگر وہ ہوتا تو ایک دن پہلے ایک خط ضرور لکھ دیتا اور ہم لوگ اس سے ملنے کے لئے اسٹیشن جاتے

کیا ایک داماد اپنے سُسرال میں پہلی بار اسی طرح آتا ہے —— بغیر کچھ اطلاع دیئے ہوئے؟ یہ ضرور ٹھگ تھا، ہاں ٹھگ!"
"اُس کی آمد آمد کی خبر تھی۔ ہم لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ پُوجا سے پہلے آنے والا ہے، اگر یہ سچ ہے کہ اس نے صحیح تاریخ کی اطلاع نہیں دی تھی"۔

اپنے باپ کو اس طرح گھرے ہوئے دیکھ کر کنچن بالا بولی "وہ نلینی نہیں ہوسکتا، میں نے اسے دیکھا ہے"۔

مہندر بابو نے کہا "تم نے اسے دیکھا؛ بتاؤ، بتاؤ تم نے اسے کہاں سے دیکھا؟"

جس وقت شور اور ہنگامہ ہو رہا تھا میں اُوپر چلی گئی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تھا۔ ہم لوگوں کا نلینی مکھن کی طرح نرم ہے۔ میں نے تو ایک موٹا مسٹنڈا بدمعاش دیکھا"۔

مہندر بابو کو یقین ہوگیا "میں نے اسے ٹھیک پہچانا۔ کیا میں اپنے داماد کو نہیں پہچانتا ہوں، کیا وہ بنارس کا غنڈا معلوم ہوتا ہے؟ اس کی صورت تو ایک نازک اور خوش اندام شخص کی سی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مَیں نے اسے صرف ایک بار شادی کے دن دیکھا تھا —— لیکن کیا میں اس معاملہ میں غلطی کرسکتا تھا؟"

گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک نوکر آیا اور بولا "بابو ایک تار آیا ہے"۔

مہندر بابو نے تار پڑھا تو ان کا چہرہ سپید اور پژمردہ ہوگیا۔ یہ نلینی کا چار آنے والا تار تھا جو کل دیا گیا تھا۔

ایک مجرم کی طرح اور سر کھجاتے ہوئے مہندر بابو بولے "یہ تار ہے" "وہ واقعی ہمارا داماد تھا"

اُن کی بیوی بولی "تبھی میں کہتی تھی، اب اسے گھر واپس لانے کی کیا تدبیر ہوسکتی ہے؟"

"مَیں جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کیا تدبیر ہوسکتی ہے"۔ اُنھوں نے ڈرائیور سے جب وہ گاڑی لے کر باہر نکلا تو کہا اسٹیشن چلو" پھر دل میں سوچا "کلکتہ جانے کے لئے ابھی کوئی گاڑی نہیں ہے۔ وہ یقیناً اسٹیشن میں ٹرین کا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں اسے منت سماجت کر کے گھر واپس لانے کی کوشش کروں گا"

سُسرال واپس آکر نلینی نے اس واقعہ کا ذکر نہیں چھیڑا۔ اس نے دیکھا کہ سب لوگ متأسف اور نادم ہیں۔ یہ بہت کافی تھا۔ صرف ایک دن جب لوگ بابو مہندر گھوش کا تذکرہ کر رہے تھے اس نے کہا "بہرحال وہ خاطر مدارات جو مجھے دوسرے آدمی کے سُسرال میں نصیب ہوئی بہت سے لوگوں کو اپنے سُسرال میں بھی نصیب نہیں ہوتی!"

مسعود حسن شمسی دانا پوری

(پربھات کمار مکھوپادھیائے)

جہان کی حالت

زمیں ہے گرمائل شکایت تو محوِ فریاد آسماں ہے

یہی ہے بزمِ جہاں کی حالت کہیں ہے شکوہ کہیں فغاں ہے

بشر ہے صحرا کا اِک بگولا، قیام ہو کس طرح سے اس کو

پھرے نہ کیوں دربدر وہ ہر دم کہ تابعِ گردشِ زماں ہے

اِدھر ہے صحنِ چمن اور اِس میں ہوائے ہستی کے تند جھونکے

اُدھر ہے شاخِ کہن اور اُس پر غریب بلبل کا آشیاں ہے

قدم قدم پر ہے دامِ پنہاں، نگاہ رکھنا سنبھل کے رہنا

قفس ہے اے مُرغِ دل یہ تیرا جسے سمجھتا تُو گلستاں ہے

ہے شوقِ پرواز تجھ کو بیشک، مگر ہے محدود تیری وسعت

کہ ایک جانب ترے زمیں ہے تو دوسری سمت آسماں ہے

نگاہِ صیاد سے بچے گا کہاں تک آخر چمن میں رہ کر

کہ زد میں تیرِ قضا کی اے دِل بنا ہُوا تیرا آشیاں ہے

پڑھے گا ناشاد شوقِ دل سے ترے سوانح کو سارا عالم

یہ دردِ اُلفت کا ہے فسانہ یہ دردِ ہستی کی داستاں ہے

رام پرشاد ناشاد

درائے کارواں

برادرانِ نوجواں پکارو حرّیت کی جے!

مجاہدینِ حرّیت بڑھے چلو غرور سے
رُکے نہ اپنا کارواں چلا ہے تو چلا چلے
عبث ہے خوفِ ناکساں
غلط ہے فکرِ این و آں
جو دل میں ہے کرو عیاں

پکارو حرّیت کی جے برادرانِ نوجواں
رُکے نہ اپنا کارواں جھکے نہ ہند کا نشاں
دکھا دو اپنا حوصلہ
اچھالو نام قوم کا
کرو بلا کا سامنا

کلاہ کج کئے ہوئے نشان دوش پر دھرے
جہادِ حرّیت میں پیش پیش ہر جواں رہے
ہوا ہے تیز اگر۔ تو ہو
بھنور پہ ہے بھنور، تو ہو
فغاں ہے بے اثر۔ تو ہو

امیدِ دارِ وطن ہو، نازشِ چمن ہو تم
عصائے بیکساں ہو تم چراغِ انجمن ہو تم
غلام ہم رہیں تو کیوں؟
جفا و غم سہیں تو کیوں؟
نہ اب بھی کچھ کہیں تو کیوں

اُٹھو کہ بندگی کا رشتہ آج مل کے توڑ دیں
اُٹھو کہ پست ہمتی کی گردنیں مروڑ دیں
مٹا کے اپنی مفلسی
بسر کریں وہ زندگی
بڑھا دیں شان ہند کی

اُلٹ دو صفحۂ زمیں کو اپنے جوشِ عزم سے
بدل دو صورتِ زمانہ کو خروشِ رزم سے
فدا، تمہارے عزم کے
نثار، شان رزم کے
بنو چراغ بزم کے

عزیز ہے جو آبرو تو فکرِ حریت کرو
ہر ایک نوجوان کو اسی کی تربیت کرو
عبث ہے خوفِ باغباں
قفس کی توڑو تیلیاں
بساؤ اپنا آشیاں

وطن کے دشمنوں سے چھین لو عنانِ رہبری
انہیں نہ سر چڑھاؤ تم کہ ہے اسی میں بہتری
وطن کی فکر ہے اگر
نہ سمجھو ان کو راہبر
یہ راہبر ہیں پُرخطر

پکارو حُریت کی سب جے برادرانِ نوجواں
رُکے نہ اپنا کارواں جُھکے نہ ہند کا نشاں

ابراہیم ہوش کلکتہ

محفلِ ادب

بدحواسیاں

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ چند دوست بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بدحواسیوں کا ذکر چلا تو ایک نے کہا کہ بعض اوقات آدمی کے مُنہ سے نادانستہ انمل بے جوڑ الفاظ نکل جاتے ہیں اور دماغ کی غیر حاضری کے باعث حرفوں، لفظوں اور آوازوں کی ترتیب بگڑ جاتی ہے۔ مثلاً جنازے کی نماز کو نمازے کی جناز کہہ دیا یا "گھٹنے کی چوٹ" کو "چُٹنے کی گھوٹ" کہہ گئے۔ ایک دوست جن کو اپنی ہوشمندی کا بہت بڑا دعویٰ تھا کہنے لگے کہ صحیح الدماغ آدمی سے ایسی بدحواسی سرزد نہیں ہو سکتی۔ کوئی پاگل ہی ہوگا جس کی زبان قابو میں نہ ہوگی۔ اُن کو بہتیرا سمجھایا گیا کہ یہ ایک نہایت عامۃ الورود بات ہے۔ اس کو دماغ کے خلل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کو انگریزی میں Spoonerism کہتے ہیں کیونکہ ایک مشہور پروفیسر ڈاکٹر سپونر سے ایسی بدحواسیاں اکثر سرزد ہوا کرتی تھیں اور وہ نہایت قابل، فاضل اور عالی دماغ انسان تھے۔

لیکن ہوشمند دوست نہ مانے۔ انہیں اُسی وقت کہیں جانا تھا۔ اصرار کر رہے تھے کہ ایک تانگہ منگا دو۔ اتنے میں ہماری نشستگاہ کے آگے سے جو سرِ بازار واقع تھی۔ ایک خالی تانگہ گزرا۔ ہمارے ہوشمند دوست نے بے اختیار اُٹھ کر کھڑکی کا رُخ کیا۔ اور پکار کر کیا فرماتے ہیں "ارے بھئی کوچوان۔ ٹانگی خالہ ہے؟"

بس پھر کیا تھا۔ دوستوں نے قہقہوں پر دھر لیا اور ہمارے ہوشمند دوست بہت ہی کھسیانے ہوئے۔

ایک صاحب بھاگم بھاگ ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ گاڑی کے آنے کا وقت بالکل قریب تھا۔ اور ان کے اضطراب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ گھڑی ان کے پاس نہ تھی۔ رستے میں ایک خوش پوش جنٹلمین نظر آئے جن کی کلائی پر گھڑی بندھی تھی۔ ان صاحب نے آواز دے کر جنٹلمین کو ٹھیرا لیا اور فرمایا "حضرت معاف فرمائیے، آپ کی بجی میں کیا گھڑا ہے؟"

اب آپ خود ہی تصور فرمائیے کہ یہ فقرہ سُن کر اُس جنٹلمین پر کیا کیفیت طاری ہوئی ہوگی اور اس نے اِن صاحب کے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی۔

ایک دفعہ ہمارے مرحوم دوست مولانا حامد حسین بیدل شاہجہانپوری کے پاس ایک لکھنوی صاحب تشریف لائے اور مولانا سے نہایت نیازمندی کے ساتھ ملے۔ دورانِ گفتگو میں مولانا نے سوال کیا۔ آپ کا دولت خانہ لکھنؤ کے کس محلے میں ہے؟ لکھنوی صاحب نے جواب دیا "غریب خانہ حکیم متبری کے مہدے کے پاس ہے"۔ یعنی حکیم مہدی کے مقبرے کے پاس۔ مولانا ہنس دیئے اور فرمانے

تبری تو خیر۔ لیکن یہ "مہدا" تو اپنی مثال نہیں رکھتا۔

یک دفعہ ایک خضاب کے موجد تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے جو بعض احباب کے ساتھ موجد صاحب کا
لئے پھرتے تھے۔ کہنے لگے حضرت۔ یہ فلاں صاحب ہیں۔ انہوں نے ایک تیل ایجاد کیا ہے جو دو منٹ میں کال بالے کر دیتا
طلب کچھ سمجھ نہ سکا۔ تو آپ نے اپنے فقرے کو زیادہ صحیح کر کے ارشاد فرمایا "اجی بس دو منٹ میں بالے کال ہو جاتے ہیں"۔

اس قسم کی قولی بدحواسیوں کی مثالیں بے شمار ہیں لیکن آج کی تقریر میں میرا ارادہ زیادہ تر عملی بدحواسیوں کے تذکرے کا ہے۔

آپ کے پاس تار کا چپراسی آتا ہے۔ آپ پنسل اٹھا کر رسید کے کاغذ پر دستخط کر دیتے ہیں اور وہ کاغذ چپراسی کے حوالے کر کے
یکھو لیتے ہیں۔ لیکن بارہا یہ بدحواسی دیکھنے میں آئی ہے کہ رسید پر دستخط کر کے رسید کا کاغذ تو اپنے پاس رکھ لیا اور تار کا لفافہ اور
اسی کے حوالے کر رہے ہیں۔

کیا سگرٹ جلاتے وقت کبھی آپ کو یہ اتفاق نہیں ہوا کہ آپ دیا سلائی جلا کر اپنے منہ کے قریب لا رہے ہیں۔ حالانکہ سگرٹ ابھی
نہیں پہنچا۔

انگلستان میں بدحواسی کا یہ واقعہ بے حد مشہور ہے کہ ایک میم صاحبہ کسی دوسرے شہر کو جا رہی تھیں۔ شوہر ان کو ریلوے سٹیشن تک پہنچانے
نے میم صاحب کا سامان ریل گاڑی میں رکھ دیا۔ اب میم صاحب کا شوہر اور وہ قلی دونوں پلیٹ فارم پر کھڑے تھے اتنے میں انجن نے
ی میم صاحب نے بدحواس ہو کر قلی کا تو بوسہ لے لیا اور دو پنس نکال کر اپنے شوہر کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

میں عینک لگاتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوا کہ غسل خانے میں داخل ہو کر نہانے کا ارادہ کیا۔ تو عینک اتارنا بھول گیا اور یہ غلطی اس وقت
وئی جب چہرے پر پانی کا چھینٹا مار کر آنکھوں کو ملنے کی کوشش کی۔

ایک دفعہ کا واقعہ سن لیجئے اور یہ واقعہ عینک والوں کو اکثر پیش آتا ہے۔ دفتر جانے کے لئے کپڑے پہنے تو سامنے عینک کا کیس
۔ اس کو کھول کر دیکھا۔ تو عینک اس میں نہ تھی۔ اب تلاش شروع ہوئی۔ لکھنے کی میز۔ بستر غسل خانہ غرض جہاں جہاں عینک
کھنے کا گمان ہو سکتا تھا۔ کونا کونا دیکھ ڈالا۔ پتہ پتہ چھان مارا لیکن عینک کہیں نہ ملی۔ آخر گھر والی کو بلا کر اپنی یہ مشکل اس کے سامنے
ی تو گھر والی ہیں کہ کھلکھلا کر ہنس رہی ہیں اور بات نہیں کرتیں۔ عینک نہ ملنے سے کھسیانے تو ہو ہی رہے تھے۔ غصے میں آ کر
سنا دیں۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔ میں تو ایک گھنٹے سے عینک کے لئے پریشان ہو رہا ہوں اور تم ہو کہ ہی ہی ہی کئے جاتی ہو۔ آخر
نے کہا۔ اے ہے تم تو ہوا سے لڑتے ہو۔ عینک تو حضور کی آنکھوں پر چڑھی ہوئی ہے اور گھر بھر میں تلاش کر رہے ہیں۔ ڈھنڈورا
ل لڑکا بغل میں"۔ ہاتھ لگا کر جو دیکھا تو سچ مچ آنکھوں پر موجود تھی!

ایک نوجوان نے اپنی بدحواسی کا نہایت دلچسپ قصہ سنایا۔ وہ کہتا ہے کہ میں انٹرنس کے امتحان کا امیدوار تھا۔ جب امتحان

شروع ہؤا تو ایک دن کا ذکر ہے۔ مَیں رات کے دو بجے تک پڑھتا رہا۔ صبح سات بجے امتحان میں بیٹھنا تھا۔ کوئی ساڑھے چھ بجے میری آنکھ کھلی۔ جب گھڑی دیکھی تو بدحواس ہوگیا۔ سامنے کھونٹی پر کپڑے لٹک رہے تھے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ پٹ قمیص شلوار پہن ایک کوٹ اوپر سے ڈال امتحان کے ہال کی طرف بھاگ کھڑا ہؤا۔ اور عین اس وقت وہاں پہنچا جب تقریباً تمام طلبہ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر بعض نوجوانوں نے آوازے کسے "شریمتی جی۔ لڑکیوں کا امتحان دوسرے کمرے میں ہو رہا ہے"۔ کسی نے کہا "جانی ذرا ہمارے پاس تو آکر بیٹھو"۔ غرض طرح طرح کی بولیاں کانوں میں پڑنے لگیں۔ مَیں نے خفیف سا ہو کر سر جھکا لیا۔ سر کا جھکنا تھا کہ میرے ہوش کے طوطے اُڑ گئے۔ مَیں غلطی سے اپنی بہن کی سفید ریشمی قمیص اور شلوار پہن آیا تھا۔

پچھلے دنوں ایک دوست نے کسی جنٹلمین کا واقعہ سُنایا۔ آپ دفتر جانے کے لئے تیار ہوئے۔ تو پگڑی کہیں نظر نہ آئی بیوی کو بُلا کر پوچھا "کیوں جی۔ ہمارا دستار کہاں ہے؟" بیوی جی نے ہنس کر جواب دیا۔ دستارا؟ وہ تو آپ کے سر پر سج رہا ہے اور آپ کو معلوم ہی نہیں۔

آپ نے سر کو ہاتھ لگایا۔ تو سچ مچ پگڑی سر پر موجود تھی۔ اُس وقت آپ کیا فرماتے ہیں "واہ واہ۔ تم نے اچھا کیا۔ مجھے بتا دیا۔ نہیں تو شاید میں ننگے ہی سر دفتر چلا جاتا"۔

جلیل القدر اہلِ علم اور کالجوں کے پروفیسر چونکہ اپنے علمی شغلوں میں بہت زیادہ منہمک ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے دماغ دُنیا کے عام کاروبار سے بالکل بیگانہ اور غیر حاضر رہتے ہیں۔ ایک بہت بڑے پروفیسر کے متعلق ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ مَیں نہیں کہہ سکتا اس میں اصلیت بھی ہے یا نہیں۔ لیکن بدحواسی کا اس سے بہتر نمونہ شاید آج تک تصنیف بھی نہیں کیا گیا۔ پروفیسر صاحب کالج میں طلبہ کے ساتھ مغز زنی کرنے کے بعد چھڑی گھماتے ہوئے گھر کو چلے تو بیحد تھکے ہوئے تھے۔ آپ نے یہ پکّا ارادہ کر رکھا تھا کہ گھر پہنچتے ہی چھڑی کونے میں رکھ کر کپڑے اُتارے بغیر ہی بستر پر لیٹ جاؤں گا۔ اور جب تک دماغ تر و تازہ نہ ہو جائے گا۔ بستر سے نہ اُٹھونگا۔ اسی خیال میں غرق آپ گھر پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی دماغی ترتیب بدل گئی۔ آپ نے چھڑی کو تو بستر پر لٹا دیا۔ خود کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

ایک پروفیسر صاحب کالج سے اپنی موٹر کار میں سوار ہوئے اور گھر کو چلے۔ اس وقت آپ سگار پی رہے تھے اور بارش بہت زور شور سے ہو رہی تھی۔ جب گھر پہنچے اور اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک ہاتھ میں ہیٹ تھی اور دوسرے میں سگار۔ آپ نے ہیٹ تو کھڑکی میں سے باہر پھینک دی اور جلتے ہوئے سگار کو کھونٹی پر رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب سگار فرش پر گر پڑا تو آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہؤا۔ سگار کو وہیں چھوڑ کر باہر بھاگے۔ آپ کی ہیٹ سڑک پر کیچڑ و پانی میں لت پت پڑی تھی۔ اسے اُٹھا کر بھیگتے بھاگتے کمرے میں آئے۔ تو سگار کی وجہ سے قالین سُلگ رہا تھا۔"

ایک اور پروفیسر صاحب کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آپ اپنے دولتکدے کے کتب خانے میں تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں نوکر
اع دی کہ چھوٹی لڑکی بیہوش ہوگئی ہے۔ آپ گھبرا کر اُٹھے اور سیدھے ایک الماری کی طرف گئے تاکہ گلاب کے عرق کی بوتل ساتھ لیتے
۔ جھٹ پٹ بوتل نکالی اور وہاں پہنچے۔ جہاں بچی بیہوش پڑی تھی۔ آپ نے کاگ نکال کر بوتل کی بوتل بچی کے سر اور منہ پر انڈیل
اب دیکھتے کیا ہیں کہ بچی کا سر، منہ اور بستر اور تکیہ بلیک بلیک سیاہی سے تر بتر ہو رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب بدحواسی میں گلاب
سیاہی کی بوتل اُٹھا لائے تھے۔

ایک ڈاکٹر صاحب کا ملازم ہر روز دوپہر کے وقت گھر جا کر ڈاکٹر صاحب کے لئے ناشتہ دان میں کھانا لایا کرتا تھا اور ایک چھوٹے
رے میں میز پر رکھ دیا کرتا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ڈاکٹر صاحب اس کمرے میں داخل ہوتے اور کھانا تناول فرما لیتے۔
ایک دن کا ذکر ہے۔ نوکر کھانا لا رہا تھا کہ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ ایک تو غریب آدمی اپنے بعض تفکرات میں غرق تھا۔
ے پڑا مینہ، کچھ بدحواس سا ہو گیا۔ جب ڈاکٹر صاحب کے دفتر کے پاس پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ بارش کا پانی سڑک پر جمع ہو رہا ہے۔
نے اپنے جوتے اُتار کر ایک ہاتھ میں لے لئے اور دوسرے ہاتھ میں ناشتہ دان اُٹھائے پانی میں سے شپ شپ کرتا ہوا دفتر میں داخل
حواس بالکل پراگندہ ہو رہے تھے۔ اس نے ناشتہ دان تو دروازے کے پاس ہی پاانداز پر رکھ دیا۔ اور اپنے جوتے کھانے
رے کی میز پر لگا دیئے۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب اس کمرے میں داخل ہوئے۔ تو میز پر یہ "عجیب و غریب" کھانے کی چیز
آگ بگولا ہو گئے۔ بیچارے نوکر نے پاؤں پڑ کر معافی مانگی۔

انگلستان کے ایک نوجوان پروفیسر کا حال بیان کرتے ہیں کہ وہ نہایت خود فراموش اور غیر حاضر طبیعت کا آدمی تھا اور طالب علم
سے اکثر دل لگی کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پروفیسر صاحب فلسفۂ ازدواج پر ایک لیکچر تیار کر رہے تھے۔ بے شمار کتابیں
کھلی پڑی تھیں کہ اتنے میں نوکر نے ایک لفافہ لا کر دیا۔ پروفیسر صاحب نے اس کو کھول کر پڑھا تو اُس میں لکھا تھا:۔

"جناب پروفیسر صاحب تسلیم۔ آپ کی نیکی اور آپ کی علمیت میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن آپ کی میم صاحبہ آپ
کے علمی انہماک کی وجہ سے بہت آوارہ ہو رہی ہیں۔ چنانچہ فلاں بیرسٹر کے ساتھ اُن کا تعلق ہو چکا ہے محض خیر خواہی کی
وجہ سے آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آپ شام کے چھ سات بجے ہائیڈ پارک کے شمال مغربی
گوشے میں پہنچ جائیں، وہاں بیرسٹر صاحب کے اپنی میم صاحبہ کی خوش فعلیاں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔"

اِس خط کے نیچے کسی کا نام نہ تھا۔ بلکہ صرف یہ لکھا تھا۔ "آپ کا حقیقی خیر خواہ"

اس خط کو پڑھ کر پروفیسر صاحب کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔ غصہ و غیرت کے جوش سے ان کا سر دھم دھم کرنے لگا۔ کہاں کا لیکچر
کی تیاری۔ یہاں آبرو پر بن گئی تھی۔ شام ہونے میں ایک آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ یہ وقت پروفیسر صاحب نے انتہائی اضطراب میں بسر

یااور وقت مقررہ پر آپ ہائیڈ پارک کو روانہ ہو گئے۔ "خیر خواہ" نے جو مقام بنا رکھا تھا۔ اس پر جا کر کھڑے ہو گئے اور لگے انتظار کرنے کہ قطامہ اپنے آشنا کے ساتھ کب یہاں آتی ہے۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ باغ سیلانیوں اور تماشائیوں سے خالی ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ رات کے بارہ بج گئے۔

پروفیسر کے پیٹ میں بھوک سے آگ لگ رہی تھی اور عین اُس وقت جب وہ کسی ہوٹل کی تلاش میں اِدھر اُدھر اپنی نظریں دوڑا رہے تھے، دفعتہً آپ کو یاد آیا کہ میں تو ابھی کنوارا ہوں۔ میری تو شادی بھی نہیں ہوئی۔ پھر یہ بیوی کیسی اور اس کی آوارگی کیا معنی؟

پروفیسر صاحب اپنی بدحواسی پر لاحول پڑھتے ہوئے گھر کو روانہ ہوئے۔

سالک (ریڈیو ۲۳ جولائی) ——— شیرازہ

سڑے حیدری خاں

(ذیل کا ٹکڑا مولٰنا عبدالحلیم شرر کی مشہور تصنیف "گذشتہ لکھنؤ" سے لیا گیا ہے۔) شیرازہ

غازی الدین حیدر کے زمانے میں اس فن کا ایک بڑا کامل و اکمل شخص لکھنؤ میں موجود تھا جس کا نام حیدری خاں تھا۔ یہ صاحب اپنی وارفتہ مزاجی کی وجہ سے "سڑے حیدری خاں" مشہور تھے اور گولہ گنج میں رہتے تھے۔ غازی الدین حیدر کو ان کا گانا سننے کا بڑا شوق تھا مگر کبھی اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک روز سہ پہر کو غازی الدین حیدر ہوادار پر سوار دریا کنارے تفریح کو نکلے۔ رومی دروازے کے نیچے لوگوں نے دیکھا کہ "سڑے حیدری خاں" چلے جاتے ہیں۔ بادشاہ سے عرض کی قبلۂ عالم حیدری خاں یہی ہیں۔ بادشاہ کو تو اشتیاق تھا ہی۔ حکم دیا کہ "بلاؤ"۔ لوگ پکڑ لائے اور سامنے کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے کہا "اے میاں حیدری خاں کبھی ہمیں اپنا گانا نہیں سناتے؟" بولے "جی ہاں کیوں نہ سناؤں گا مگر مجھے آپ کا مکان نہیں معلوم ہے۔" بادشاہ بے اختیار ہنس پڑے اور کہا "اچھا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم خود تمہیں اپنے مکان پر لے چلیں گے۔" "بہت خوب" کہہ کر ساتھ ہو لئے۔ چھتر منزل کے قریب پہنچے تھے کہ حیدری خاں ہتھے سے اُکھڑ گئے اور بولے "میں چلتا تو ہوں مگر پوریاں اور بالائی کھلوائیے گا تو گاؤں گا۔" بادشاہ نے وعدہ کیا اور محل میں بیٹھ کے گانا سُننے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں کے بہت محظوظ ہوئے۔ وجد کا عالم طاری ہوا اور بے خود و بے تاب ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر حیدری خاں خاموش ہو گئے۔ بادشاہ نے پھر گانے کو کہا تو بولے "حضور یہ تمباکو جو آپ کے پیچوان میں بھرا ہوا ہے، بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے، آپ کس کی دکان سے منگواتے ہیں؟" غازی الدین حیدر خود بھی آشفتہ مزاج تھے اور سڑی مشہور تھے۔ اس سوال پر منغض ہوئے تو مصاحبوں نے عرض کیا "قبلۂ عالم! یہ سڑی تو ہئی ہے، ابھی تک یہی نہیں سمجھا ہے کہ کس سے باتیں کر رہا ہوں۔"

اب لوگ بادشاہ کے ایما سے حیدری خاں کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ پوریاں، بالائی کھلوائی۔ حقّہ پلوایا۔ آپ نے پاؤ بھر پوریاں، آدھ پاؤ بالائی اور ایک پیسہ کی شکر منگوا کے اپنی بی بی کو بھجوائی (جو اُن کا ہر جگہ معمول تھا) جب تک ان کاموں میں رہے۔ بادشاہ نے لذّت تاب

جام پئے۔ اور جب نشے کا زور ہوا تو پھر حیدری خاں کی یاد ہوئی۔ فوراً بلوا کے گانے کا حکم دیا۔ مگر جیسے ہی اُنہوں نے اپنا نغمہ شروع
۔ روک کے کہا "حیدری خاں سنتے ہو، اگر مجھے خالی خوش کیا اور رُلایا نہیں تو یاد رکھو کہ گومتی میں ڈبوا دوں گا۔" اب تو حیدری خاں کی
جگر میں آئی، سمجھے کہ یہ بادشاہ ہیں۔ کہا "حضور اللہ مالک ہے۔" اور جی توڑ کے گانے لگے۔ خدا کی قدرت یا یہ کہئے کہ حیدری خاں
ندگی تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں بادشاہ پر اثر ہوا۔ بے اختیار رونے لگے اور خوش ہو کے کہا "حیدری خاں مانگ کیا مانگتا ہے؟" عرض
جو "مانگوں گا دیجئے گا؟" بادشاہ نے وعدہ کیا اور حیدری خاں نے تین دفعہ قبولوا کے کہا "حضور یہ مانگتا ہوں کہ مجھے پھر کبھی بلوائیے گا نہیں
نہ گانا سنیئے گا۔" بادشاہ نے تعجب سے پوچھا "کیوں؟" عرض کیا "آپ کا کیا ہے مجھے مروا ڈالیئے گا۔ پھر مجھ سا حیدری خاں نہ پیدا ہوگا۔
آپ مر جائیں گے تو فوراً دوسرا بادشاہ ہو جائے گا۔" اس جواب پر غازی الدین حیدر نے ناراض ہو کر مُنہ پھیر لیا۔ یہ موقع پاتے
حیدری خاں اپنی جان لے کے بھاگے اور اپنے گھر آئے۔

(نیّرِ اعظم)

مرزا غالب کا آخری خط

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلّف برطرف
ایں قدر دانم کہ غالب نامِ یارے داشتم

بجومِ غم سے فراغ نہیں۔ عبارت آرائی کا دماغ نہیں، اگرچہ گوشہ نشین و خانماں خراب ہوں لیکن بحسب رابطۂ ازلی کثیر الاحباب
ں۔ اطراف و جوانب سے خطوط آتے ہیں۔ ادھر سے بھی ان کے جواب لکھے جاتے ہیں جو اشعار واسطے اصلاح کے آتے ہیں، بعدِ اصلاح
ج دیئے جاتے ہیں۔

ان صاحبوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ نہ میں نے انہیں نہ اُنہوں نے مجھے دیکھا ہے۔ محبت دلی و نسبت روحانی سہی لیکن مہاجان
دور دست کیا جانیں میرا حال کیا ہے۔ ہفتاد و یک سالہ عمر کی کتاب میں سے فصلِ آخر کی حقیقت یہ ہے کہ دس پندرہ برس سے
ضعفِ سامعہ اور قلتِ اشتہا میں مبتلا ہوا اور یہ دونوں علّتیں روز افزوں رہیں۔ حسِ حافظہ کا بُطلان علاوہ۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی
امراض بھی بڑھتے گئے۔ قصّہ مختصر اب سامعہ کا حال یہ ہے کہ ایک تختہ کاغذ کا مع دوات قلم سامنے دھرا رہتا ہے، جو دوست آتے ہیں،
پرسشِ مزاج کے سوا اور کچھ کہنا ہوتا ہے وہ لکھ دیتے ہیں۔ میں ان کی تحریر کا جواب زبانی دیتا ہوں۔ غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح کو آٹھ
ں بادام کا شیرہ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوئے کباب، نسیان حد سے گزر گیا۔ رعشہ، دوران
ضعفِ بصر یہ یارانِ نو آمدہ سے ہیں۔ میر تقی مرحوم کا مطلع وردِ زبان ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصّہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

خط تکیے ہیں یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں۔ آگے لیٹے لیٹے خط لکھتا تھا اب رعشہ یوں بھی نہیں لکھنے دیتا۔

صاحب اکمل الاخبار اور صاحب اشرف الاخبار نے جو ہمیشہ مجھ سے ملتے جُلتے رہتے ہیں اور میرا حال جانتے ہیں از روئے مشاہدہ میرے کلام کی تصدیق کر کے اسی اعتذار کو اپنے اخبار میں چھاپا ہے۔ کُل دیگر صاحبانِ مطبع اور راقمانِ اخبار اگر اسی عبارت کو اپنے اخبار کے اوراق میں درج کریں گے تو فقیر ان کا احسان مند ہوگا۔ اس نگارش کی شہرت سے مقصود یہ ہے کہ میرے احباب میرے حال سے اطلاع پائیں۔ اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں پہنچے تو تقاضا اور اگر نہ پہنچے تو شکایت نہ فرمائیں۔ میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہا اور خوشی خوشنودی سے کام کرتا رہا، جب بالکل نکما ہو گیا نہ حواس باقی نہ طاقت، پھر اب کیا کروں بقولِ خواجہ وزیر ع

میں وفا کرتا ہوں لیکن دِل وفا کرتا نہیں

اگر کسی کو میری طرف سے رنج و ملال ہو تو خالصاً للہ معاف فرمائیں۔ اگر جوان ہوتا تو احباب سے دُعائے صحت کا طلبگار ہوتا اب جو بوڑھا ہوں تو دُعائے مغفرت کا خواہاں ہوں۔ غالب

"دین و دنیا"

فیضِ اقبال

۱۹۲۵ء میں ایک روز شام کے وقت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا کہ علی بخش نے اطلاع دی کہ چند طالب علم ملنے کو آئے ہیں، جاڑے کا موسم تھا، ڈاکٹر صاحب بڑے کمرے میں بیٹھے تھے (بالعموم وہ شام کے وقت بستر پر بیٹھتے تھے اور ملاقاتی وہیں کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے) لڑکے اندر آئے، یہ اسلامیہ کالج کے طلبہ تھے، میں چونکہ اسلامیہ کالج میں ملازم تھا، اس لئے ان کی گفتگو سننا چاہتا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں وہ شام کے وقت وفد کی صورت میں کیوں حاضر ہوئے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا "کیوں بھئی کیسے آئے"؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ ایک مشاعرہ کرنے کا ارادہ ہے جناب والا اگر اس کی صدارت قبول فرمائیں تو عزت افزائی ہوگی اور لوگ بھی بہت جمع ہوں گے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "صدر" تو میں کسی مجلس یا جلسہ کا بننا نہیں چاہتا، البتہ "شعر بازی" سے تمہیں روکتا ہوں، اس وقت ہندوستان کو اور بالخصوص مسلمانوں کو "شعر بازی" کی ضرورت نہیں، اور نہ ہر شخص شعر کہنے کے قابل ہوتا ہے، لوگ شعر بازی کی طرف اسی لئے جلد متوجہ ہو جاتے ہیں کہ بغیر کاوش، مطالعہ اور محنت کے انہیں شہرت حاصل کرنے کی خواہش دامنگیر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت بہت کم ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں بقا کا عنصر موجود ہو، آپ نوجوان ہیں، آپ کو اس غلط روش پر ہرگز نہ چلنا چاہئے، ضرورت ہے نثر نگاروں کی جو

، اور مطالعہ کے بعد اُردو زبان میں مختلف موضوعوں پر کتابیں، رسالے، تراجم وغیرہ لکھیں اور اپنی قوم کو اور خود اپنے آپ کو
ائیں، ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا کم وبیش یہی ماحصل تھا، چنانچہ ان کی تقریر نے ان نوجوان شعراء کے جوش کو ٹھنڈا کیا اور
یکچرسُن کر بورڈنگ ہاؤس سدھارے۔

۱۹۲۵ء میں ایک نامور بزرگ لاہور میں تشریف لائے، ان کی لیاقت، وسعتِ علم اور بالخصوص فصاحت وبلاغت
لق عوام میں بہت مبالغہ آمیز باتیں مشہور تھیں۔ فنِ تقریر میں بہت کم لوگ ان کی ہمسری کر سکتے تھے اور انگریزی زبان،
، تلفظ اور ادب میں تو انہیں بلا کی دسترس حاصل تھی، میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب سے ان کی بہت تعریف کی، وہ بزرگ
نئے نئے وارد ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انگریزی فنِ تقریر میں ان کا پایہ مسلّم ہے، لیکن یاد رکھو کہ (انبیاء اور مصلحین
رچھوڑ کر) جو لوگ بے ضرورت اُٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں ان میں روحانیت کا فقدان ہوتا ہے

In people other than prophets and great national reformer too much of public speaking is very often a sign of spiritu poverty.

نی" حضرات کے متعلق تو یہ نظریہ بالکل صحیح ہے، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ بعض بڑے بڑے مقرروں کے متعلق بھی یہ نظریہ غلط نہیں
صاحب نے فرمایا۔ کہ انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں، مَیں بھی تقریروں کے مشغلہ میں کچھ عرصہ کے لئے بہت منہمک رہا
، بعد میں مَیں نے اسے بالکل ترک کر دیا۔

"معارف"

مائلو کا مجسّمۂ وینس

آج سے دو ہزار سال پہلے کے یونانی صنّاعوں نے بُت تراشی کی صنعت کو اس درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا کہ اس فن میں آج تک کوئی اُن کا ہمسر پیدا نہیں ہو
اس پرچہ میں وینس کے بُت کی جو تصویر شائع ہو رہی ہے اس کا صنّاع ایک قدیم یونانی بت تراش مائلو تھا۔ اگرچہ مائلو کے حالاتِ زندگی سے دنیا ناواقف
یکن اس کا یہ مجسمۂ بُت سازی میں قوّتِ اظہار کا بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ نا معلوم صنعت گر نے اس میں تناسبِ اعضاء اور سکونِ قلب کا اظہار جس دلآویزی
یا ہے وہ انتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے۔

حامد علی خاں

صنعت گر نقاش چیں رو صورتِ یارم ببیں
یا صورتے کش این چنیں یا ترک کن صورت گری

نا معلوم

اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بُتانِ آزری
ہر چند وصفت میکنم در حُسن از اں بالا تری
آفاق را گردیدہ ام، مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

خسرو

و محبت کی یونانی دیوی۔

مطبوعات

ریاض رضواں ۔ یہ حضرتِ ریاض خیرآبادی مرحوم کا دیوان ہے جو قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے کی توجہ اور اہتمام سے شائع ہوا ہے ۔ دیباچہ نگاروں میں یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی شامل ہیں ۔ ریاض غزل نگار اساتذۂ قدیم کے سلسلے کی ایک آخری چمکتی ہوئی کڑی ہیں ۔ ان کے بعد اب اس پُرانے رنگ کی شاعری ڈھونڈے سے بھی نہیں مِل سکتی ۔ شراب کے متعلق حضرتِ ریاض کے شعر خاص طور پر پُرلطف ہیں ملاحظہ فرمایئے :۔

وہ جانا مرا رُوٹھ کر میکدے سے ۔۔۔ صُراحی کا مجھکو وہ آواز دینا
توبہ سے ڈرایا مجھے ساقی نے یہ کہہ کر ۔۔۔ توبہ شکنی کے لئے اصرار نہ ہوگا
یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش ۔۔۔ سُن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

تغزل کا رنگ ملاحظہ ہو :۔

کبھی حرفِ محبت تا بہ لب آیا تھا چُپکے سے ۔۔۔ اُسی نے رفتہ رفتہ طُول کھینچا داستانوں میں
چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی ۔۔۔ تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی
کوئی مُنہ چُوم لے گا اس نہیں پر ۔۔۔ شکن رہ جائے گی یُونہی جبیں پر
اس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے ۔۔۔ جب چھم سے چلیں گود میں چُپکے سے اُٹھا لے

ایک دُوسرا رنگ ملاحظہ ہو :۔

یہ محشر ہے یہاں اب ہوش میں دیوانہ آتا ہے ۔۔۔ خداوندا مرے لب پر مرا افسانہ آتا ہے
بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خم رکھدیں ۔۔۔ جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

ریاض نے بہت پاکبازانہ زندگی گزاری لیکن اس کا ایک ایک شعر صہبائے شاعری کا ایک ایسا مست و طربناک جام ہے جسے پی کر رندانِ سیاہ مست بھی اگر افسردۂ انگور کو بھُول جائیں تو تعجب نہیں ۔ کتاب کا غذ کتابت ، طباعت اور جلد کے لحاظ سے نہایت نفیس ہے ۔ حجم تقریباً ۸۷۲ صفحات ، قیمت (عہ) ، پتہ :۔ دائرۃ الادب حیدرآباد (دکن) یا دفتر شاہکار گورکھپور +

مکاتیبِ مہدی ۔ مرتبہ محترمہ مہدی بیگم صاحبہ ۔ یہ کتاب " افاداتِ مہدی " کے مشہور مصنف جناب مہدی حسن صاحب افادی الاقتصادی کے خطوط کا مجموعہ ہے خطوط چونکہ آدمی کی زندگی کا ایک نہایت بے تصنع اور بے تکلفانہ مرقع ہوتے ہیں ، اس لئے مشاہیر کے خطوط سے عموماً

بہت دلچسپی لی جاتی ہے، اور ادب کی اس صنف کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ اُردو کتب کے ناشرین بھی اس باب میں اب بیش از پیش سرگرمی دکھارہے ہیں اور آئے دن اُردو زبان کے اُدبا کے مکاتیب کے مجموعے شائع ہونے لگے ہیں۔

مولوی مہدی حسن کوئی بہت بڑے عالم نہ تھے لیکن ادبِ اُردو اور مصنفینِ زبانِ اُردو سے انہیں بہت دلچسپی تھی اور اُردو زبان کی وقتی تحریکات کے سلسلے میں وہ خاصے وسیع المعلومات آدمی تھے۔ اُن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اُن کی کامیاب انشا پردازی اور شگفتہ اندازِ تحریر ہے۔ مکاتیبِ مہدی میں بھی قدرتی بے تکلفی کے ساتھ اندازِ بیان کی وہی شگفتگی ملتی ہے جو "افاداتِ مہدی" میں نظر آتی ہے۔ اس مجموعے کے خطوط مشاہیرِ اُردو کے نام ہیں لیکن مہدی بیگم صاحبہ نے وعدہ کیا ہے کہ اگر اہلِ ملک نے ان مکاتیب کی قدر کی تو وہ مہدی حسن مرحوم کے خانگی خطوط کو بھی ایک مجموعے کی صورت میں شائع کردیں گی۔ مہدی حسن ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"نج کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہیں ہوتا یعنی اظہارِ خیال میں صنعت گری طبع کی جگہ صرف آمدِ جذبات ہوتی ہے، اس لئے لٹریچر کا یہ ایک ایسا اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبۂ انشا پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے۔ اچھے اچھے بولنے والوں، چوٹی کے شاعروں کو دیکھا کہ دو سطریں سیدھی سادھی نہیں لکھ سکتے۔"

یہ خیال عام لوگوں یا قدیم اُدبا کے خطوط کے متعلق درست ہو تو ہو لیکن آجکل کے مشہور اُدبا کے غیر خانگی خطوط کے متعلق اب یہ خیال زیادہ درست نہیں رہا کیونکہ اکثر اُدبا خط لکھتے وقت یہ احتیاط ملحوظ رکھتے ہیں کہ ان کے چھپنے کی نوبت بھی ضرور آئے گی اور بعض حضرات خط لکھتے ہی چھاپنے کی نیت سے ہیں چنانچہ اُن کے ہر خط کا مسوّدہ ان کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصنفوں کی اس ہوشیاری یا پُرکاری سے خطوط کی اشاعت کا اصل مقصد بڑی حد تک فوت ہوچکا ہے۔

مہدی حسن صاحب کے خطوط میں خاصی بے تکلفی بلکہ شوخی موجود ہے، اس شوخی کے ڈانڈے کہیں کہیں عُریانی سے جاملے ہیں جو شاید کچھ ناگوار سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مہدی صاحب کے خطوط بالعموم نہ صرف خاصے دلچسپ ہیں بلکہ اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہیں کہ اُن سے آج سے پچیس تیس سال قبل کی ادبی زندگی کے حالات و کوائف کے متعلق قابلِ قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ خط اس قابل ہیں کہ اُردو کے ہر کتب خانے میں موجود رہیں۔ حجم بڑی تقطیع کے ۲۰۳ صفحات، کاغذ اور طباعت نفیس ہے۔ قیمت عہ، پتہ:۔ محترمہ مہدی بیگم صاحبہ بسنت پور ضلع گورکھپور +

ذکرِ غالب:۔ گزشتہ تین سال سے غالب کے متعلق گراں قدر تالیفات کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اُس میں تازہ ترین اضافہ مسٹر مالک رام ایم۔اے کی موسومہ بالا کتاب ہے۔ یہ مرزا غالب کی مختصر مگر جامع سوانحعمری ہے جو انگریزی اصطلاح میں "خارجی" نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور حق یہ ہے کہ اس طرز کے فنِ سوانح نگاری میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس سے پہلے جناب غلام رسول مہر بھی اسی "خارجی" انداز میں سوانح غالب کے متعلق اپنی بیش بہا کتاب شائع کرچکے ہیں، اُن کے بعد اسی موضوع پر ایک ایسی سیر حاصل اور پُراز

معلومات کتاب مرتب کرنا یقیناً مستحقِ تحسین و آفرین ہے۔ جناب مہر کی کتاب کو بوجہ اوّلیت وہ تمام مباحث جو صحیح طور پر حاشیۂ کتاب کا حصّہ تھے متن میں لینے پڑے تھے۔ اس سے اُن کی کتاب کی ضخامت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ مسٹر مالک رام نے سوانحِ غالب کو ایک مناسب حجم کی کتاب میں منتقل کر دیا ہے جس کی زبان دلکش اور سلیس ہے۔ کتاب کے حجم کو دیکھ کر شاید کسی کو شبہ ہو کہ سوانح میں انتخاب کیا گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مسٹر مالک رام کی کتاب "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" کی مصداق ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف تمام پہلا فراہم شدہ مواد اپنی کتاب میں درج کیا ہے بلکہ بعض نئے اور مفید انکشافات کا بھی اضافہ کیا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ اس اختصار میں مطالب کی فراوانی کے باوجود تحقیق کے انداز کو قائم رکھا ہے۔ حسنِ ترتیب اور نکھرے ہوئے اندازِ بیان کے لحاظ سے اس کتاب کو غالب کی سوانح عمریوں میں ایک مستقل حیثیت حاصل رہے گی۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ، دہلی۔ قیمت ۸ر۔

تجلیاتِ تخیّل۔ از جگیشور ناتھ صاحب ورما بیتاب۔ یہ مصوّری کے متعلق بارہ نکتہ آموز مضامین کا مجموعہ ہے۔ ذیل کے عنوانوں سے اس کے موضوع کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے:۔ ہند قدیم کی مصوّری، بُدھ مصوّری، مُغل مصوّری، راجپوت مصوّری وغیرہ۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۱۰۲ صفحات، قیمت مجلد عہ۔ پتہ:۔ رائے صاحب دیال اگروال پبلشر، الہ آباد (یو، پی)۔

سبدِ گل۔ یہ "بزمِ ادب" نیروبی (مشرقی افریقہ) کے جلسوں اور مشاعروں کے مضامینِ نظم و نثر کا ایک دلکش اور دلچسپ مجموعہ ہے۔ مشرقی افریقہ جیسے دُور دراز مقام میں بزمِ ادب اُردو کا قیام اور طباعت و کتابت کی ہزار ہا دُشواریوں کے باوجود اسکی روئدادوں کا ایک دلکش مجموعہ کی صُورت میں چھپ جانا اُردو زبان کی حیرت انگیز مقبولیت کا ایک روشن ثبوت ہے۔ بزمِ ادب میں غالب و اقبال وغیرہ مشہور شعرا پر تنقیدی مضامین بھی پڑھے جاتے ہیں اور مشاعروں میں تمام ہندوستانی بلا امتیاز مذہب و ملت حصّہ لیتے ہیں۔ غیر متعصب ہندو مسلمانوں کو اُردو سے جو محبت ہے اس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اپنی تفریح اور ذہنی ترقی کے لئے وطن سے دُور اُنھوں نے جو انجمن بنائی ہے اس میں خیالات و افکار کا ذریعۂ اظہار یہی اُردو زبان ہے۔ شعرا میں محمد حیات احقر اور بدرالدین بیدل جیسے ناموں کے ساتھ رام کشن شرما، دیوراج دیو، لکشمی نراین گردش اور دلیپ سنگھ غریب جیسے نام بھی نظر آتے ہیں۔ بزمِ ادب نیروبی کے کارپرداز ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ قیمت مجلد ایک شلنگ پچاس سینٹ۔ پتہ:۔ محمد شریف قریشی ناظمِ عمومی بزمِ ادب پوسٹ بکس ۱۰۱۳ نیروبی۔ مشرقی افریقہ۔

شعرا کا گراموفون ریکارڈ۔ گراموفون کمپنی لمیٹڈ نے ہمیں اپنا ایک ریکارڈ ۱۶۰۲۴ ریویو کے لئے بھیجا ہے جس میں حضرت جوش، حضرت تاجور، حضرت سیماب اور حضرت بیخود دہلوی نے اپنی ایک ایک غزل خود سنائی ہے۔ یہ ایک دلچسپ جدت ہے۔ یہ ریکارڈ سُنتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے، گویا ہم مشاعرے میں بیٹھے ہیں۔ اس ریکارڈ کی ایک تاریخی حیثیت رہے گی۔ ہر شوقین کان سے سن سکتا ہے

گراموفون کے پرانے ریکارڈ
اگر آپ کے پاس ہوں تو
ZED

بہار

SHIFA
Regd
رجسٹرڈ
شفا
معدہ کی جملہ تکالیف سے بے نیاز ہو جائیے۔ آرام اور تندرست زندگی کا صحیح لطف اٹھائیے۔ آپ کو معدے
کی کتنی دیرینہ تکلیف ہو "شفا" منٹوں میں زائل ہو گی مثلاً اجابت کی بے وقت تکلیف، ریح، باؤ گولہ، تناؤ، تخمہ، کھٹے ڈکار،
اشتہاء کاذب، بھوک کی کمی، منہ میں بدبو اور بد ذائقہ لیسدار رطوبات کا موجود ہونا، دل اور دماغ کا جگر اور معدہ کی
تبخیر کی وجہ سے متاثر ہونا، بے خوابی یا بد خوابی کا ستانا، مراق اور مالیخولیا کے دورے پڑنا، ہیضہ، بدہضمی، قے
اور دست اور سمندر کے سفر میں ایسی ہی جملہ تکالیف "شفا رجسٹرڈ" کے استعمال سے یقیناً دور ہو جاتی ہیں۔
غذا خوب سیر ہو کر کھائیے۔ "شفا رجسٹرڈ" کا ایک ماشہ اسے منٹوں میں ہضم کر کے جزو بدن بنا دیگا اور آپ کو دوبارہ
بھوک محسوس ہو گی۔ بدن کی رنگت کو سیب کی طرح نکھارنا اور خون کی لہر بدن میں دوڑا دینا اس کا اولین فعل
ہے کیونکہ ہضم کی صحت پر ہی بدن کی صحت کا دارو مدار ہے۔
"شفا رجسٹرڈ" وبا کے ایام میں بہترین محافظ۔ سمندر کے سفر میں بہترین رفیق اور مرض کی صورت میں بہترین معالج ہے
دیکھنے میں خوشنما۔ کھانے میں خوش ذائقہ۔ مقدار خوراک نہایت قلیل۔ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے لئے یکساں مفید اور
قیمت میں نہایت ارزاں ہے قیمت فی شیشی ۱۲؍ محصولڈاک ۳ شیشی تک۔ حمید فارمیسی [?] رجسٹرڈ لاہور سے طلب کریں
حج پر جانیوالوں کیلئے فی شیشی ۱۱؍ علاوہ محصولڈاک (۸ ستمبر سے لیکر ۳۰ دسمبر تک)

کمزور بچوں کی طاقت کے لئے
بچّوں کو
ڈونگرے کا بال امرت
دینا چاہئے
ملنے کا پتہ:- ہر بڑے دوا فروش کے ہاں بکتا ہے۔

ڈسٹرکٹ بورڈ ضلع لاہور

نوٹس

عوام کی آگاہی کے لئے نوٹس ہذا مشتہر کیا جاتا ہے کہ امسال میلہ منڈی مویشیاں و اسپاں کاہنہ نو تحصیل لاہور بتاریخ ۱۱ اکتوبر لغایت ۱۶ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء منعقد ہوگا۔ اس منڈی پر اعلیٰ قسم کے مویشی اور گھوڑے فروخت کے لئے لائے جاتے ہیں۔ لہٰذا زمینداروں اور بیوپاریوں کو اس موقع پر فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ عمدہ قسم کے جانوروں کو معقول انعام دیا جاتا ہے۔

لوگوں کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھا جاوے گا۔ اُن کی تفریح کے لئے طرح طرح کے کھیل مثلاً دوڑ کبڈی اور تماشے ہوں گے۔ لوگوں کے فائدے کے لئے سرکاری محکمہ جات مثلاً محکمہ زراعت اور محکمہ تعلیم وغیرہ کی طرف سے نمائشیں لگائی جاویں گی۔ دوکانات سینما، سرکس وغیرہ کے لئے جگہ کا ٹھیکہ ۹ ۱۰/۳۸ کو بوقت ۹ بجے صبح موقعہ پر دستخط کنندہ نیلام کریں گے۔ خواہش مند اصحاب موقعہ پر پہنچ کر بولی دیں۔

المشتہر

میاں محمد اقبال بی اے ایل ایل بی سکرٹری ڈسٹرکٹ بورڈ لاہور

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

۱- "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیار ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے ۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے ۔

۵- خلاف تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے ۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چ
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا ۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے ۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے ۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے

منیجر رسالہ ہمایوں
۲۳- لارنس روڈ- لاہور

The Title Page and Picture Printed at Half-Tone Press.
Dev Samaj Road, Lahore.